روزنامہ

قومی آواز

نئی دہلی

اردو بک سیلرز اور پبلشرز



شمع کے ادارے سے عمدہ کتابیں

عمدہ ناول

آگ اور دھواں	م۔ م۔ راجندر	۵ روپے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	۱ روپے
اندھیرے	اختر عادل ادیب	۵ روپے
اجالا	قیسی رام پوری	۵ روپے
پردیس	قیسی رام پوری	۸ روپے
عشق بلا خیز	سید قاسم محمود	۱۰ روپے
ہزار راتیں	ش۔ ظفر پوری	۱۰ روپے
جلن	کرشن گوپال عابد	۶ روپے
جذبۂ دل	میاں شاہد	۰ روپے
جانِ ذوقِ بہار	وحشی محمود آبادی	۸ روپے
کرنیں	شفیق الرحمٰن	۵ روپے
برہمن	کرشن گوپال عابد	۰ روپے
ننگا شہر	احمد شجاع پاشا	۶ روپے
نئے قدم	باجرہ نازلی	۸ روپے
پاگل	رئیس احمد جعفری	۱۰ روپے
پہلی لڑکی	رازدان ایم اے	۵ روپے
رام محمد ڈیسوزا	علی رضا	۷ روپے
زرینہ	رئیس احمد جعفری	۱۰ روپے
ظالم	سعید امرت	۶ روپے

دل چسپ افسانے:

نتھ کا بوجھ	واجدہ تبسم	۳۰ روپے
نتھ اترائی	واجدہ تبسم	۳۰ روپے
نتھ کا زخم	واجدہ تبسم	۳۰ روپے
فریب مسلسل	شفیق بانو	۶ روپے
مجھے تم سے محبت ہے	نفی نور	۷ روپے

تاریخی افسانے:

عجائب خانۂ عشق	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے
چاند کا خدا	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے
زاگ کا بدن	الیاس سیتاپوری	۱۰ روپے
اندر کا آدمی	الیاس سیتاپوری	۱۰ روپے
حرم سرا	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے
بالاخانے کی دلہن	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے

باتصویر فلمی کہانیاں:

بیراگ	۵ روپے
ستیم شوم سندرم	۵ روپے

بچوں کے لئے ناول:

ستاروں کے قیدی	ظفر پیامی	۴ روپے
خوفناک جزیرہ	سراج انور	۱۰ روپے
نیلی دنیا	سراج انور	۱۰ روپے

شعری ادب:

ہزار داستان — فراق گورکھپوری کے شعروں کا مجموعہ

عمدہ کشیدہ کاریاں:

ذوقیہ کشیدہ کاری	۱۶ روپے
بانو کشیدہ کاری	۱۵ روپے
زینت کشیدہ کاری	۱۳ روپے
فردوس کشیدہ کاری	۱۲ روپے
راسیہ کشیدہ کاری	۱۲ روپے
بہارہ کشیدہ کاری	۱۰ روپے
شمع کشیدہ کاری	۱۰ روپے

اسلامی کتب:

آئینہ عملیات	صوفی عزیز الرحمٰن مرحوم پانی پتی	۱۸ روپے
آثارِ نبوت	اعظمی	۴ روپے
اسلامی تاریخی کہانیاں	عبدالمومن الفاروقی	۴ روپے
انسانیت کا پیغام	وحید الزماں قاسمی	۴ روپے
اقوالِ زریں	مولانا مصطفےٰ حسن	ایک روپیہ
اصلاح الرسوم	مولانا اشرف علی تھانوی	۴ روپے
اسلامی آداب	وحید الزماں قاسمی	۴ روپے
اسلام کا تبلیغی نظام	مولانا عبدالقیوم	۲ روپے
اسلامی اخلاق	مصطفےٰ حسن	۳ روپے
اسلام اور فیملی پلاننگ	علامہ زید ابوالحسن فاروقی	۷ روپے
درسِ قرآن	مولانا فروغ احمد	۴ روپے
دعائے گنج العرش	مختار	۳ روپے
دربارِ رسالت کے فرمان	مولانا مصطفےٰ حسن	ایک روپیہ
حیات المسلمین	مولانا اشرف علی تھانوی	۵ روپے
ہمارے نبیؐ کی پاک بیبیاں	مولانا مصطفےٰ حسن	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
جنت کا راستہ	مفتی حفیظ الدین	۳ روپے
خدا کا انعام	وحید الزماں قاسمی	۲ روپے
کتاب الطہارت	مفتی حفیظ الدین	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
معجزات النبی	مولانا احتشام الحسن	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
معارف السنۃ	مولانا احتشام الحسن	۱۰ روپے
مجاہدینِ سسلی	وحشی مارہروی	۱۵ روپے
مدنی زندگی اور غزواتِ اسلام	مولانا عبدالقیوم	۲ روپے ۵۰ پیسے
عہدِ رسالت کی مقدس خواتین	ابد رضوی	۲ روپے
قرآن اور عورت	انور علی	۲ روپے ۵۰ پیسے
رسولِ خدا کے اخلاق	مولانا عبدالقیوم	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
شہیدِ اسلام	صادق حسین سردھنوی	۸ روپے
سیرۃ فخرِ دو عالمؐ	م۔ عطاء اللہ خاں	۸ روپے

روزنامہ

قومی آواز نئی دہلی

زبان سیاست

[illegible] نمبر

چیئرمین بنڈ مینجمنٹ کمیٹی

یشپال کپور

چیف ایڈیٹر

عشرت علی صدیقی



قیمت 20/-

بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ فون

ہماری خاص مطبوعات ایک نظر میں

EBH

اقبالیات

کلیاتِ اقبال اُردو (عکسی) صدی ایڈیشن ۲۰/..
اقبال بحیثیت شاعر رفیع الدین ہاشمی ۴۵/..
اقبال معاصرین کی نظر میں وقار عظیم ۵۰/..
اقبال فن اور فلسفہ ڈاکٹر نور الحسن نقوی ۷/۵۰
اقبال کی اُردو نثر عبادت بریلوی (زیر طبع)
فکرِ اقبال خلیفہ عبدالحکیم ۴۰/..
تصوراتِ اقبال مولانا صلاح الدین احمد ۱۵/..
بانگِ درا (عکسی) علامہ اقبال ۱۰/..
بالِ جبریل ” ” ۸/..
ضربِ کلیم ” ” ۸/..
ارمغانِ حجاز ” اُردو ” ۴/۵۰

غالبیات

دیوانِ غالب (عکسی) ڈاکٹر نور الحسن نقوی ۱۲/..
غالب: تقلید اور اجتہاد پروفیسر خورشید الاسلام ۳۰/..
غالب شخص اور شاعر مجنوں گورکھپوری ۱۵/..
اطرافِ غالب ڈاکٹر سید عبداللہ ۲۰/..
فلسفیِ غالب احمد رضا ۶/..

فیض

کلامِ فیض (عکسی) فیض احمد فیض ۲۰/..
نقشِ فریادی ” ” ۶/..
دستِ صبا ” ” ۶/..
زنداں نامہ ” ” ۷/۵۰
دستِ تہِ سنگ ” ” ۶/..

گھر (مجموعہ کلام) صلاح الدین پرویز ۴۰/..

ڈراما

اردو ڈراما کا ارتقاء عشرت رحمانی ۴۰/..
اردو ڈراما: تاریخ و تنقید ” ۲۰/..
یونانی ڈراما مترجم عتیق احمد صدیقی ۴۰/..
انارکلی مقدمہ ڈاکٹر محمد حسن ۹/..
آغا حشر اور اردو ڈراما انجمن آرا ۳۰/..

ادب و تنقید

احساس و ادراک ظہیر احمد صدیقی ۲۲/..
چہرہ پس چہرہ ابن فرید ۲۵/..
میں، ہم اور ادب ” ۲۰/..
غزل کا نیا منظر نامہ شمیم حنفی ۱۲/..
انیس شناسی ڈاکٹر فضل امام ۱۲/..
موازنۂ انیس و دبیر مقدمہ ڈاکٹر فضل امام ۱۲/..
شہرت کی خاطر نظیر صدیقی ۱۵/..
تنقیدیں پروفیسر خورشید الاسلام ۳۰/..
شناسا چہرے ڈاکٹر محمد حسن ۱۵/..
مضامینِ نو خلیل الرحمٰن اعظمی ۲۵/..
ادب میں جمالیاتی اقدار۔ ایک مطالعہ ظہیر احمد صدیقی ۱۰/..
اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی ۲۰/..
تنقیدی تناظر ڈاکٹر قمر رئیس ۲۰/..
ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ رشید حسن خاں ۲۵/..
مآثرِ عجم عظیم الحق جنیدی ۲۰/..
اُردو ادب کی تاریخ ” ۱۰/..
نثر، نظم اور شعر ڈاکٹر منظر عباس نقوی ۷/۵۰
ناول کا فن ابوالکلام قاسمی ۱۵/..

اسلوب سید عابد علی عابد ۲۰/..
تنقید اور احتساب وزیر آغا ۱۵/..
اردو شاعری کا مزاج ” ۴۰/..
تخلیقی عمل ” ۲۰/..
انسان اور آدمی محمد حسن عسکری ۱۰/..
ستارہ یا بادبان ” ۱۵/..
آج کا اُردو ادب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۱۶/..
بجنگ آمد کرنل محمد خاں ۲۰/..
مجموعہ نظم حالی مرتبہ ظہیر احمد صدیقی ۷/۵۰
نیا افسانہ وقار عظیم ۵/..
داستان سے افسانے تک ” ۲۰/..
جدید شاعری عبادت بریلوی ۲۵/..
غزل اور درسِ غزل اختر انصاری ۸/..
امراؤ جان ادا مقدمہ تمکین کاظمی ۱۲/..
مقدمہ شعر و شاعری مقدمہ وحید قریشی ۱۲/..
تنقیدی سرمایہ عبدالشکور ۲/۵۰
باغ و بہار سلیم اختر ۱۲/..
شعاعِ ادب شرافت حسین مرزا ۲/۷۵
اکبر کی طنزیہ اور ظریفانہ شاعری محمد زاہد ۱۵/..
نذیر احمد کی کہانی کچھ اُنکی کچھ میری زبانی } فرحت اللہ بیگ ۲/۷۵
منتخب ادبی خطوط مغیث الدین فریدی ۱/۲۵
امراؤ جان ادا تنقید و تبصرہ ابواللیث صدیقی ۳/..
آبِ حیات کا تنقیدی تحقیقی مطالعہ سید سجاد ۵/..
باغ و بہار کا تنقیدی تحقیقی مطالعہ ” ۱۲/..

ایجوکیشنل بک ہاؤس یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ

QAPN-14

تصاویر

نثر و اشاعت

اردو کتابوں کی اشاعت آزادی کے بعد	۴۵	ڈاکٹر خلیق انجم
بہار میں اردو ادب کی اشاعت	۵۱	ڈاکٹر عابد رضا بیدار
اردو میں جین، بدھ، سکھ اور ہندو مذہب کی کتابیں	۵۳	ڈاکٹر شارب ردولوی
آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کے علمی و ادبی رسائل	۶۱	ڈاکٹر مظفر حنفی
اردو میں اسلامی کتابیں	۷۱	اختر الواسع
لکھنؤ میں اردو کتابوں کی نشر و اشاعت	۸۱	نسیم انہونوی
اردو کے اشاعتی مسائل	۸۵	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی
بمبئی میں اردو کتابوں کی اشاعت	۸۹	سید شہاب الدین دسنوی
بچوں کے لیے کتابیں	۹۱	ڈاکٹر اطہر پرویز
الہ آباد کی اشاعتی سرگرمیاں	۹۳	ڈاکٹر جمل اجملی
ایک عہد آفریں ایجاد	۱۰۳	ڈاکٹر نور الحسن نقوی
علی گڑھ کی اشاعتی سرگرمیاں	۱۰۵	ڈاکٹر ابن فرید
اردو ادبی رسائل کے چند اہم خاص نمبر	۱۱۱	ڈاکٹر شمیم نکہت
اردو صحافت کے بنیادی مسائل	۱۰۹	جاوید حبیب
اردو مطبوعات کی تقسیم و فروخت کے مسائل	۱۲۳	ایس اے رحمٰن
حیدرآباد میں اردو مطبوعات	۱۲۳	وقار خلیل
کلکتہ کی اشاعتی سرگرمیاں	۱۳۹	علقمہ شبلی
ناشروں کے مسائل	۱۴۳	اسد یار خاں
سلاطین مغلیہ کے کتب خانے اور ان کا انتظام	۱۴۵	حاجی محمد زبیر
اردو کتابوں کی تقسیم و اشاعت کے مسائل	۱۵۳	انیس اعظمی
دیوبند کی اشاعتی سرگرمیاں	۱۵۷	نسیم اختر شاہ قیصر
میں کتاب ہوں	۱۶۳	اکمل اجملی
دہلی کی اشاعتی سرگرمیاں	۱۶۵	خواجہ ذکی احمد

غزلیں

کہتا ہے کون میر کہ بے اختیار رو	۱۷۱	میر تقی میر
صورت میں تو کہتا نہیں ایسا کوئی کیے	۱۷۱	مرزا محمد رفیع سودا
مدت یاد پر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا	۱۷۱	خواجہ میر درد
بیٹھ کر وہ جہاں اٹھتا ہے	۱۷۲	شیخ غلام ہمدانی مصحفی
کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں	۱۷۲	سید انشاء اللہ خاں انشاء
سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا	۱۷۲	خواجہ حیدر علی آتش
ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے	۱۷۳	مرزا اسد اللہ خاں غالب
بیمار محبت نے لیا تیرے سنبھالا	۱۷۳	شیخ محمد ابراہیم ذوق
تمہاری تمنا میں یا ب یک سی سے ہم	۱۷۳	حکیم مومن خاں مومن
یہاں نکیا بجر کی کائی تیرا الام ہم	۱۷۵	شاد عظیم آبادی
نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے	۱۷۵	حسرت موہانی
یہ عشق نے دیکھا ہے یہ عقل سے پنہاں ہے	۱۷۵	اصغر گونڈوی
خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا	۱۷۶	مرزا یاس یگانہ چنگیزی
اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا	۱۷۶	فانی بدایونی
جبکہ غم انساں سے جلا نہ سکا دل کو نہیں	۱۷۶	جگر مرادآبادی
تیری متاع حیات علم و ہنر سے سرور	۱۷۷	ڈاکٹر محمد اقبال
دل کی بساط کیا تھی نگاہ جمال میں	۱۷۷	سیماب اکبرآبادی
راز عالم سے ہے تنا کہ میرا راز جدا	۱۷۷	فراق گورکھپوری
سازگار ہے ہمدم ان دنوں جہاں اپنا	۱۷۸	اسرار الحق مجاز
زندگی تو تیرا ہی دھلکی ہوئی ہوگی	۱۷۸	مخدوم محی الدین
مرے قدم پاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا	۱۷۸	پرویز شاہدی
اپنے دامن میں مرے پونچھنے والے آنسو	۱۷۹	بسمل سعیدی
دیکھیے بھی تو بیمار ہو کے	۱۷۹	جمیل مظہری
عشق کی شرح مختصر کے لیے	۱۷۹	روش صدیقی
تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے	۱۸۱	قتیل شفائی
نہ دنیا یاد آئی ہے نہ دنیا ہے کا غم ہے	۱۸۱	سلام مچھلی شہری
ہر کسی سے کیوں مانگو جے کہ تم کو آتی ہے	۱۸۱	معین احسن جذبی
درد کوئی رات سے پہر کا آسرا	۱۸۲	جاں نثار اختر
جو دیکھتے ہو نقش قدم کہ ہونگے	۱۸۲	شمیم کرہانی
مری زندگی ہے ظالم تیرے غم سے آشکار	۱۸۲	شکیل بدایونی

ہمیں شعور جنوں ہے کہ جس چمن میں رہے	مجروح سلطانپوری	۱۸۳
کاکل گیسو والوں کی رات بسر ہوتی ہے	سنفر غلامی	۱۸۳
موت رو دینے سے ٹل نہیں سکتی	سکندر علی وجد	۱۸۳
زندگی دل پہ عجب سحر سا کرتی جائے	غلام ربانی تاباں	۱۸۴
یہ دنیا غالی تو ...	اعجاز صدیقی	۱۸۴
بلاتے کیوں ہو ...	کلیم عاجز	۱۸۴
تیری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے	خلیل الرحمٰن اعظمی	۱۸۵
شام رنگین ہے بہت درد ... مجھے	شہاب جعفری	۱۸۵
رات چپ چاپ ...	خورشید احمد جامی	۱۸۵
...	شہریار	۱۸۶
خاک و خوں کی ...	بانی	۱۸۶
دل تھا احساس بہت ...	ندا فاضلی	۱۸۷
داد فن بھی ...	فضا ابن فیضی	۱۸۷
اک گزارش ... کیجئے	مظہر امام	۱۸۷
ہمارے ...	نازش پرتاب گڑھی	۱۸۷
...	وحید اختر	۱۸۸
ایک بھی حرف نہ تھا ...	حسن نعیم	۱۸۸
اپنی کھوئی ہوئی جنت پا کے	بشیر بدر	۱۸۸
ہر کہانی ایک ...	شمیم حنفی	۱۸۹
مجھے ماحول ...	کمال احمد صدیقی	۱۸۹
اجالے ...	اعزاز افضل	۱۸۹
عشق پھر عشق ہے آشفتہ سری مانگے ہے	عنوان چشتی	۱۹۰
شاعری میں تم عشق کی ...	مسعود اختر جمال	۱۹۰
جسم میں بن کے ...	والی آسی	۱۹۰
لپٹ کے روئی ہوا ... ناخنوں سے	سلطان اختر	۱۹۱
بھلا کے اس کو بہت چین جی کو آئے گا	پرکاش فکری	۱۹۱
اس میں کوئی شکوہ نہ شکایت نہ گلہ ہے	افتخار امام صدیقی	۱۹۱
کب گرفتار کسی قید مکانی میں ہے	محسن زیدی	۱۹۲
حصار کرب سے باہر سکوں کہاں ہوگا	حیات لکھنوی	۱۹۲
آؤ تم یوں بیٹھے ہوں کیوں ... تنہا	سید شکیل دسنوی	۱۹۲

نظمیں

آواز شاعر	جوش ملیح آبادی	۱۹۵
اے سمندر	ن۔م۔ راشد	۱۹۶
میں ڈرتا ہوں مسرت سے	میرا جی	۱۹۶
نثار میں تیری گلیوں پہ	فیض احمد فیض	۱۹۷
گفتگو	سردار جعفری	۱۹۷
کبھی کبھی	ساحر لدھیانوی	۱۹۹
شکوہ	اختر الایمان	۱۹۹
سہمے ہوئے بیلے	وامق جونپوری	۲۰۰
پلستر	نریش کمار شاد	۲۰۰
مفاہمت	شاذ تمکنت	۲۰۰
پیاسا	امجد نجمی	۲۰۱
اداس رات	حرمت الاکرام	۲۰۱
یونہی سہی	قاضی سلیم	۲۰۳
دوسرا آدمی	زبیر رضوی	۲۰۳
داروں کے قیدی	مخمور سعیدی	۲۰۳
نئی حمد	عمیق حنفی	۲۰۴
آخری شہر جل چکا ہے	بلراج کومل	۲۰۴
نیا باب	راج نرائن راز	۲۰۴
آخری دن کی تلاش	محمد علوی	۲۰۵
دعا دیتے چلو	کمار پاشی	۲۰۵
ایک کیفیت	رفعت سروش	۲۰۷
درس غم	ساجدہ زیدی	۲۰۷
ایک کیفیت	کرامت علی کرامت	۲۰۷
دھڑکتی صدا	صلاح الدین پرویز	۲۰۸
رقص سکوت	اظہر عزیز	۲۰۸

مقالات

(الف)

موجودہ ادبی مسائل	پروفیسر آل احمد سرور	۲۱۱
نئی شاعری کے نقاد	پروفیسر احتشام حسین	۲۲۱
ادبی ڈرامے	ڈاکٹر اعجاز حسین	۲۲۵
اردو کے لسانی مسائل	خواجہ احمد فاروقی	۲۳۱
غالب اشعار کے آئینہ میں	ڈاکٹر محمد حسن	۲۳۹

عصر حاضر میں اردو طنز و مزاح	۲۴۳	ملک زادہ منظور احمد
اردو رسم خط بدیسی نہیں	۲۵۱	پروفیسر گوپی چند نارنگ
جدید ادبی تنقید	۲۵۵	شمس الرحمٰن فاروقی
جواہر لال نہرو کا ادبی مرتبہ	۲۶۱	پروفیسر جگن ناتھ آزاد
اردو شعر و ادب میں سائنس	۲۷۱	اندر جیت لال
اردو تحریک اور انجمن ترقی اردو ہند	۲۷۰	ایم حبیب خان
منشی نول کشور	۲۸۲	مولانا امداد صابری

مذہب

انسانیت کا منشور آزادی	۲۸۶	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

صحافت

مشترکہ قوم کے مشترکہ مسئلے	۲۸۹	موہن چراغی

موسیقی

میرا پیام محبت ہے جہاں تک پہنچے	۲۹۴	بیگم اختر

صحت

تندرستی ہزار نعمت ہے	۲۹۷	نورجہاں ثروت

خطاطی

فن خطاطی ایک قدیم فن ہے	۲۹۹	جلال الدین اسلم
اردو کا تاریخی ارتقا سیسہ کے حروف سے الیکٹرانک خطاطی تک	۳۰۳	جمیل نقوی

تعلیم

ابتدائی تعلیم کا نظریہ	۳۰۱	فیاض احمد فیاض نعمانی

مخطوطات

برطانیہ میں اردو مخطوطات	۳۰۷	سلیم الدین قریشی
جرمنی میں اردو مخطوطات	۳۲۳	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی

افسانے

نیا قانون	۳۲۹	سعادت حسن منٹو
لاجونتی	۳۳۷	راجندر سنگھ بیدی
جیا جری	۳۴۵	کرشن چندر
دو ہاتھ	۳۵۲	عصمت چغتائی
گرم راکھ	۳۵۹	سہیل عظیم آبادی
پہیہ	۳۷۱	غیاث احمد گدی
تین بوڑھے	۳۷۷	رام لعل
سب سے چھوٹا غم	۳۸۱	عابد سہیل
سنجی	۳۸۵	کلام حیدری
تسالین	۳۸۹	اقبال متین
ایک ڈال کے پنچھی	۳۹۲	رضوان احمد
ایک منٹ اور	۳۹۳	شارق

محفل بہ محفل

تعارف

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۳۹۷ المکتاب والا دہلی ۴۱۱ بک امپوریم پٹنہ ۴۲۰
ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ ۳۹۹ دانش محل لکھنؤ ۴۱۱ الہ آباد بک ہاؤس الہ آباد ۴۲۰
نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۴۰۱ حمن بک ڈپو دہلی ۴۰۲ واجد علی شاہ اکیڈمی لکھنؤ ۴۲۰
غالب اکیڈمی نئی دہلی ۴۰۲ صدیق بک ڈپو لکھنؤ ۴۱۳ پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز نئی دہلی ۴۲۰
کتب خانہ عزیزیہ نئی دہلی ۴۰۳ سلوجہ پرکاشن نئی دہلی ۴۱۴ مکتبہ ندوۃ العلماء لکھنؤ ۴۲۰
بہار اردو اکیڈمی پٹنہ ۴۰۴ کتب خانہ اشاعت الاسلام دہلی ۴۱۵ کتب خانہ حمیدیہ دہلی ۴۲۱
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۴۰۵ انجمن تہذیب نو الہ آباد ۴۱۶ ادارہ نشر و اشاعت دینیات دہلی ۴۲۱
ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی ۴۰۷ مکتبہ دین و ادب لکھنؤ ۴۱۷ مرکزی ادارہ تبلیغ دینیات دہلی ۴۲۲
کلچرل اکیڈمی گیا ۴۰۸ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ۴۱۷ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۴۲۳
استار پبلی کیشنز نئی دہلی ۴۰۸ مکتبہ الحسنات دہلی ۴۱۰ خدا بخش لائبریری پٹنہ ۴۲۰
صدیقی اشاعت گھر دہلی ۴۰۹ خورشید بک ڈپو لکھنؤ ۴۱۹ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۴۲۱
نصرت پبلشرز لکھنؤ ۴۱۰ الحوالیہ بک ڈپو دہلی ۴۱۶ کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی ۴۲۵
شاہ اجمل اشاعت گھر الہ آباد ۴۱۱ زمزم بک ٹرسٹ دہلی ۴۱۹ نئی روشنی پبلی کیشنز دہلی ۴۲۵

مکتبہ الرسالہ دہلی ۴۲۵

منزل بہ منزل

چند باتیں ۱۲

عرض مرتب ۱۴

سرورق اور اندرونی ابواب کی تزئین ... جلال الدین اسلم
کتابت ——— رہبر صدیقی
کتابت اور اشتہارات کی تزئین ——— مشکور حسین

... کی 1981 کی مطبوعات

قومی تہذیب کا مسئلہ (ڈاکٹر سید عابد حسین)۔ عابد صاحب کی اس تصنیف کو ترقی اردو بیورو نے دوبارہ شائع کیا ہے ہندوستانی تہذیب ... اور اس کے ارتقائی رخ کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے — ۹/۶۰

اصولِ تعلیم (خواجہ غلام السیدین) تعلیم جیسے اہم موضوع پر بنیادی کتاب جو پہلی بار ... میں شائع ہوئی تھی ... سے نایاب تھی ترقی اردو بیورو نے ... میں پہلے ایڈیشن کی تمام اغلاط درست کر دیا گیا ہے — ۲۲/-

اتر پردیش کے لوک گیت (مظہر علی فاروقی)۔ مصنف نے اس کتاب میں یوپی کے لوک گیتوں کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے ... درج کر دیے ہیں — ۲۹/۲۵

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار (مرزا جعفر علی لکھنوی)۔ تہذیب کے مٹتے ہوئے نقوش کو اس کتاب میں محفوظ کر دیا گیا ہے جس سے یہ ایک اہم تاریخی دستاویز بھی بن گئی ہے — ۲۷/-

ہمایوں نامہ (گلبدن بیگم مترجم عثمان حیدر مرزا)۔ مغلیہ سلطنت کے بانی محمد ظہیر الدین بابر کی بیٹی اور شہنشاہ ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم کی تصنیف کردہ وہ مشہور و معروف کتاب جو ہمایوں کے عہد کے چشم دید واقعات پر مبنی ایک اہم تاریخی دستاویز کا درجہ رکھتی ہے — ۶/۲۵

نئی اردو قواعد (ڈاکٹر عصمت جاوید)۔ لسانیاتی اصولوں پر مبنی اردو زبان کی پہلی توضیحی قواعد جس میں اردو زبان کے مختلف عناصر کو سائنٹفک انداز میں نہایت دیدہ ریزی کے ساتھ درجہ بند کیا گیا ہے — ۱۰/-

درسِ بلاغت۔ شائقین ادب اور بی اے اور ایم اے کے طلبا کے لیے علوم بلاغت پر ایک جدید اور مکمل کتاب۔ اس کتاب میں بیان، صنائع بدائع، عروض و قافیہ اور نظم و نثر کے اقسام جیسے اہم موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے — ۷/-

کیمیا کی کہانی (سید شہاب الدین دسنوی)۔ آسان اور عام فہم زبان میں کیمیا کے رموز و نکات اور اہم سائنس دانوں سے متعلق مفید معلومات پر مشتمل ایک اہم کتاب — ۷/۵۰

راست اور متبادل کرنٹ (ڈاکٹر محمد عبد الحفیظ انصاری)۔ A.C. اور D.C. کرنٹ پر اردو میں شائع ہونے والی پہلی جامع اور مکمل کتاب — ۱۵/-

دستوئیفسکی (ظ۔ انصاری)۔ ترقی اردو بیورو کی ۱۹۸۰ میں شائع ہونے والی کتابوں میں یہ وہ کتاب ہے جس کے مصنف جناب ظ۔ انصاری کو مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے ... روپے کا سب سے بڑا انعام دیا ہے۔ ظ۔ انصاری نے اپنی اس اہم کتاب میں عظیم روسی مصنف دستوئیفسکی کی شخصیت و سیرت کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے — ۸/۵۰

ہندوستانی مصوری (ایک خاکہ ڈاکٹر انیس فاروقی)۔ ہندوستانی مصوری کی فنی خصوصیات اور تاریخ پر ایک جامع باتصویر کتاب — ۱۰/-

نوریات (اندرے دستوگی)۔ OPTICS کے علم پر ایک معتبر اور مستند کتاب — ۳۲/-

اکبر سے اورنگ زیب تک (مترجم جمال محمد صدیقی)۔ عہد مغلیہ کی مستند تاریخ — ۲۱/۵۰

انتظامی قانون کے اصول (مترجم احمد مرزا)۔ قانون اور اس کے رموز و نکات پر ایک جامع و مکمل کتاب — ۲۸/-

اصولِ تعلیم اور عمل تعلیم (مترجم ڈاکٹر خلیل الرحمٰن سیفی پریمی)۔ تعلیم کے نظری و عملی پہلوؤں کا محاکمہ کرنے والی ایک اہم کتاب — ۱۶/۷۵

سخنورانِ گجرات (سید ظہیر الدین مدنی)۔ گجرات میں اردو شاعری کے فروغ و ارتقا کی ایک معتبر و مستند تاریخ — ۱۷/-

قدیم ہندوستان کی تاریخ (مترجم سید ... حسن نقوی)۔ قدیم ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کی ایک مستند تاریخ — ۲۴/۷۵

بچوں کی مسکان (سید فرحت)۔ بچوں کے لیے ہلکی پھلکی نظموں کا ایک دلچسپ مجموعہ — ۳/۷۵

گلستاں کی کہانیاں (مولفہ سید ... فیضانی)۔ شیخ سعدی کی مشہور کتاب گلستاں سے منتخبہ سبق آموز اور اخلاقی کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ — ۴/-

فرہنگ انسانیات ترقی اردو بیورو کی ایک تحریہ پیش کش جس میں انسانیات کی تقریباً تمام اصطلاحات (انگریزی سے اردو) درج کر دی گئی ہیں — ۴/۵۰

... 8 ...

چند باتیں

کتابیں تہذیب و ثقافت کا مظہر ہوتی ہیں۔ اردو زبان کے نام سے جو ثقافت وابستہ ہے اس کی حفاظت، بقا اور ارتقا اور اس کی آئینہ داری اردو کتابوں ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس لیے اردو کتابوں کی تصنیف، اشاعت، طباعت اور تقسیم کا اردو ثقافت سے گہرا تعلق ہے۔ مصنف سے قاری تک خیالات اور اقدار کی ترسیل کے لیے ان دونوں کے درمیان کی تمام کڑیاں جس نظام کے تحت مربوط ہیں یا ہو سکتی ہیں وہ ہماری ثقافت کی بقا کے لیے ایک بے حد اہم نظام ہے۔ دنیا اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں اس درمیانی نظام نے ایک باقاعدہ صنعت کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اردو میں بھی یہ صنعت ہے لیکن منتشر، غیر منظم اور بسا اوقات از کار رفتہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ ادیب، دانشور اور مصنف ایک طرف اور دوسری طرف قاری دونوں خسارے میں ہیں۔ یہ اردو کے لیے منجملہ دوسرے مسائل کے ایک بڑا مسئلہ ہے۔

مصنف کے مسودے سے لے کر قاری کے ہاتھ کتاب پہونچنے تک جو بڑے بڑے مرحلے درمیان میں ہیں ان میں کتابت، چھپائی اور تقسیم کے تکنیکی مرحلے اور بہت سے تجارتی مرحلے شامل ہیں ان سب مراحل کے الگ الگ مسئلے ہیں جن میں سے کچھ ایسے ہیں جن پر ہمارا قابو نہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ جن کا حل بازار کی معاشیات کی وجہ سے دشوار ہے اور کچھ ایسے ہیں کہ جن کو صنعت کے غیر منظم ہونے کی وجہ سے حل کرنے میں زحمتیں پیش آتی ہیں۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ چونکہ اردو ثقافت اب ہندوستان میں زوال پذیر ہے اس لیے اردو کتابی صنعت بھی دشواریوں میں مبتلا ہے۔ اردو کتابوں کے قاری کم ہیں اور جو ہیں بھی وہ اردو میں صرف مذہبی یا تفریحی کتابیں ہی پڑھتے ہیں یا پھر درسی کتابوں کی مانگ ہے۔ اردو قارئین میں قوتِ خرید کم ہونے کی وجہ سے زیادہ لاگت والی کتابوں کی کم کھپت ہے اور کتابوں کی لاگت کم رکھنے کی کوشش کی وجہ سے کتابت اور طباعت کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ کاغذ خراب استعمال کیا جاتا ہے اور مجموعی طور سے کتاب خراب تیار ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے بموجب اردو ثقافت کا معیار گرنے کی وجہ سے اردو کی علمی اور معیاری کتابیں پڑھنے والوں کی تعداد مختصر سے مختصر تر ہوتی جا رہی ہے اور یہ صنعت کم سے کم منافع بخش ہوتی جا رہی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ اس نقطۂ نظر میں کسی قدر صداقت ہو لیکن یہ پوری صداقت نہیں ہے زمانہ بدل رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اقدار تبدیل ہو رہی ہیں اردو ثقافت کو بھی اپنے کو جدید عہد کے سانچے میں ڈھالنا ہے اس سلسلے میں بعض دشواریاں ضرور درپیش ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اردو کتابوں کی اشاعت میں اضافہ ہوا ہے۔ تعداد کے لحاظ سے بھی اور موضوع کے لحاظ سے بھی۔ جو مسائل ہیں خاص طور سے کتابی صنعت کے جو مسائل ہیں وہ اس سے مختلف ہیں۔

ان مسائل پر غور کرنے کیلیے نیشنل بک ٹرسٹ نے جون ۱۹۷۷ء میں سری نگر میں اردو کے ممتاز ادیبوں اور دانشوروں کا ایک سمینار منعقد کیا تھا۔ اس سمینار نے بعض سفارشات کی تھیں جو بعد میں نیشنل بک ٹرسٹ نے کتابی شکل میں بھی شائع کر دی تھیں۔ یہ سفارشات اردو کی کتابی صنعت کے مسائل حل کرنے میں بہت مددگار ہو سکتی ہیں لیکن ابھی ان میں سے نہ تو کسی پر عمل ہوا ہے اور نہ عمل کرنے کی طرف کوئی قدم اٹھایا گیا ہے۔ سمینار کی سفارشات کی مجموعی تعداد ۲۱ تھی جن میں ایک اہم سفارش یہ تھی کہ "اردو کتابی صنعت کے فروغ کے لیے اردو ناشرین اور کتب فروشوں کی ایک کل ہند تنظیم کا قیام عمل میں لانا چاہیے اس تنظیم کو مرکزی حکومت سے مناسب مالی امداد ملنی ضروری ہے جن ریاستوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد خاصی ہے ان میں سے چند صوبوں میں اس تنظیم کی شاخیں قائم کرنی چاہئیں۔"

منجملہ دوسری سفارشات کے سمینار کی یہ سفارش اس نقطۂ نظر سے اہم ہے کہ اس تنظیم کے قیام کے بعد بہت سے دوسرے مسائل اس کے ذریعہ سے حل کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ دوسرے مسائل کی طرف توجہ اس لیے نہیں ہو سکتی کہ ان پر غور کرنے اور ان کو حل کرنے کا کوئی اجتماعی ذریعہ نہیں ہے لیکن سفارش کو دس سال بیت گئے ہیں اور اس طرف کوئی عملی قدم نہ اٹھایا گیا ہے اور نہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تنظیم کے قیام کے سلسلے میں پہلا قدم خود ناشرین اور کتب فروشوں کو اٹھانا چاہیے اور اس کے لیے بڑے ناشرین کو خاص طور سے توجہ کرنا چاہیے

[illegible] کے لیے [illegible]

طباعت کے سلسلے میں ایک بڑی دشواری لیتھو مشینوں کی ہے۔ لیتھو مشینوں کی درآمد مدت ہوئے بند ہو چکی ہے اور اردو کتابیں جو بڑی تعداد میں نہیں چھپتیں ان کے لیے آفسیٹ کی طباعت بہت مہنگی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں پہلا کام تو یہ کرنے کا ہے کہ آفسیٹ کی جو مختلف مشینیں اب بازار میں دستیاب ہیں ان پر اور لیتھو پر طباعت میں کتنا فرق ہے کیونکہ ابھی تک یہ بات محض قیاس اور اندازے سے کہی جاتی ہے کہ لیتھو کی چھپائی سستی اور آفسیٹ کی چھپائی مہنگی ہے۔ لیکن اس کے صحیح اعداد و شمار حتمی طور پر مہیا نہیں ہیں۔ بہرحال اُردو کتابیں آفسیٹ پر بھی چھپ رہی ہیں اور فروخت بھی ہو رہی ہیں۔ اس لیے اس سلسلے میں تفصیلی اور سائنسی طور پر جائزے کی ضرورت ہے۔ یہ کام مجوزہ تنظیم خود یا کسی معتبر ادارے کے ذریعہ کروا سکتی ہے۔ یہی حال کتابت کا ہے۔ اب ملک میں مختلف اردو اکادمیوں اور دوسرے اداروں نے کاتبوں کی تربیت کا بندوبست کر دیا ہے لیکن وہاں سے جو کاتب نکل رہے ہیں وہ ایسے معیار کے نہیں کہ جن کو فنکار قرار دیا جا سکے۔ ان کاتبوں کے باوجود کتابت کا مسئلہ باقی ہے۔ تنظیم اس سلسلے میں بھی کام کر سکتی ہے۔ اس سلسلے میں جدید ترین ایجاد "نوری نستعلیق" کا ذکر بھی بے جا نہیں ہوگا جس کو اردو طباعت کے لیے ایک انقلاب آفریں ایجاد قرار دیا جا رہا ہے۔ ابھی یہ مشین بہت مہنگی ہے اور کسی ایک ادارے کی استطاعت سے باہر ہے لیکن اجتماعی طور پر اس کے حصول کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

مالیات کا مسئلہ بھی اردو ناشروں کے لیے کم اہم نہیں ہے۔ ابھی تک اردو ناشروں نے بینکوں سے مدد لینے کا طریقہ نہیں اختیار کیا ہے۔ جدید صنعت میں بینک کی اہمیت یا تو ابھی تک اردو ناشروں پر واضح نہیں یا اس سلسلے میں دوسری دشواریاں ہیں۔ اس مسئلہ کو بھی اجتماعی طور پر حل کرنے کی کوشش کی جائے تو خاطر خواہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

اردو رفتہ رفتہ ایک بین اقوامی زبان بنتی جا رہی ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز انکشاف ہے کہ پاکستان اور ہندستان کے بعد دنیا میں اُردو کا تیسرا بڑا مرکز انگلستان ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انگلستان میں انگریزی کے بعد سب سے زیادہ اردو اخبارات ہی بکتے ہیں۔ انگلستان کے علاوہ خلیجی ملکوں میں اردو دانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اب آباد ہو گئی ہے جن میں سعودی عرب، کویت اور متحدہ عرب امارات خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں کے اردو داں طبقے کی قوتِ خرید بھی نسبتاً زیادہ ہے لیکن ہندستان سے ان ملکوں میں اردو کتابوں کی درآمد بہت کم تعداد میں ہے۔ اجتماعی طور پر اس بین اقوامی منڈی سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ غرض کہ اجتماعی طور پر اردو ناشرین اور اردو کتابی صنعت کے لیے بہت کچھ ممکن ہے اور اس سلسلے میں جس قدر جلد ممکن ہو سکے اقدام کرنا چاہیے۔

اردو بک سیلرز اور پبلشرز نمبر ترتیب دیتے وقت منجملہ دوسری باتوں کے یہ خیال بھی ذہن میں تھا کہ اس طرح اردو کتابی صنعت کے مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے کیونکہ یہ مسئلہ وقت کی ضرورت ہے۔

اردو ثقافت کی عمر ممکن ہے کہ بہت زیادہ نہ ہو لیکن اس کی بوقلمونی، اس کے جلوہ صد رنگ دوسری ثقافتوں کے صالح اثرات جذب کر لینے کی اس کی صلاحیت اور اس کی وسیع القلبی ایسے عناصر ہیں کہ جو اس کی بقا میں مددگار ہیں لیکن اس کے لیے جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اردو کتابی صنعت کو منظم کرنا اس جدوجہد کا ایک حصہ اور ضروری حصہ ہے اور اردو کے لیے نعرے بازی یا نت نئے مطالبات تراشنے سے زیادہ اہم حصہ ہے۔

محمد عثمان غنی

عرضِ مرتّب

مِٹا ہے کوئی عقیدہ تو خون تھوکا ہے
نئے خیال کی تکلیف اٹھی ہے مشکل سے

(فراقؔ)

۱۹۸۱ء کی ایک شام کا ذکر ہے قومی آواز دہلی ایڈیشن کے ایک خصوصی نمبر کے پروجیکٹ پر مسٹر کے سی کھنہ منیجر ایسوسی ایٹیڈ جرنلز لمیٹڈ سے مشورے ہو رہے تھے۔ اچانک خیال آیا کیوں نہ ہندوستان بھر کے اردو بک سیلرز اور پبلشرز پر ایک نمبر شائع کیا جائے۔ کھنہ صاحب کو یہ پروجیکٹ خود پسند آیا۔ بس پھر کیا تھا خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع ہو گئی کیونکہ موضوع اور موضوع پر اس طرح کام کرنے کی پہلی کوشش تھی اس نئے خیال کو عملی شکل دینے میں خون تھوکنے کی نوبت بھی آ گئی۔ بہر نوع جو بھی ہو سکا آپ کے سامنے ہے۔ ہم اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ تو ارباب نشر و اشاعت کریں گے۔ ہاں یہ تسلی ہی تسکین کے لیے کافی ہے کہ کسی اردو اخبار کے ادارے سے پہلی بار اردو نشر و اشاعت سے متعلق مکمل نہ سہی تو ایک موزوں نمبر ترتیب دینے کی کوشش کی گئی۔ اردو کی جب بھی کوئی نئی کتاب سج دھج کر سامنے آتی ہے تو سب سے پہلے نظر مصنف اور پھر موضوع کتاب پر پڑتی ہے۔ اگر اس سے زیادہ ہوا تو گیٹ اپ، کتابت یا قیمت کا ذکر کر دیا گیا۔ اس کتاب کے پیچھے مصنف کی عرق ریزی کے بعد بک سیلر اور پبلشر کی جو جاں سوزی شامل ہے اس پر کبھی بھی ہماری نظر نہیں جاتی۔ بک سیلر یا پبلشر ہمارے سامنے ہمیشہ زبان و ادب کے خادموں کے بجائے غاصب بنا کر پیش کیے گئے ہیں جبکہ ایک عالم شعر، نثر یا نقد پارے کو پوری سجاوٹ و شائستگی کیساتھ عوام کے ذوقِ نا تمام کے سامنے پیش کرنے کا سلیقہ بک سیلر یا پبلشر کو ہی ہوتا ہے۔ اداروں کی تو بات چھوڑیے کئی مصنف ایسے ہیں جنھوں نے اپنی مطبوعات کی اشاعت کے لیے بے دریغ سرمایہ خرچ کیا ہے مگر دیکھا یہی گیا ہے کہ پبلشر کی ذرا سی بے توجہی یا بک سیلر کی بے تعلقی سے اچھی سے اچھی کتابیں زیبِ دکاں کی بجائے زینتِ مکاں بن کر رہ گئیں۔ ہندوستان میں آج بھی اردو کی کتابیں نہ صرف ان گنت بلکہ اچھی چھپ رہی ہیں مگر کس کو اتنی فرصت ہے کہ ان پبلشروں یا بک سیلروں کی طرف داری تو کیا تعداد شماری تک کرے، قومی آواز نے پہلی بار یہ کوشش کی ہے۔ اب عقل متحیر رہے یا محوِ تماشائے لبِ بام۔ کام تو ایک انجام پا ہی گیا ہے۔

پہلے تو خیال تھا کہ قومی آواز کے روزانہ شمارے میں ایک خصوصی ضمیمہ کی شکل میں یہ نمبر پیش کر دیا جائے۔ مگر وہ کہتے ہیں نا کہ کام بڑھتا ہی گیا جوں جوں خیال آتے گئے ـــ موضوع در موضوع ـــ منزل در منزل ـــ منظر در منظر سلسلہ بڑھتا ہی گیا۔ موضوع کی مناسبت کے لحاظ سے اس نمبر کو پانچ مختلف حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ ”چہرہ بہ چہرہ“ کے تحت نہ صرف ناشرین کے البم سے چند انمول لمحات اکٹھا کیے گئے ہیں بلکہ چند یادگار تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں جن میں سے کچھ کو دیکھنے کے لیے اب آنکھیں ترستی ہیں۔ اور کچھ تا حال ہم میں موجود ہیں۔ اردو نشر و اشاعت

سے متعلق مباحث و مسائل پر مضامین 'لمحہ بہ لمحہ' کے تحت شامل کیے گئے ہیں جن میں ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر مظفر حنفی، پروفیسر اختر الواسع اور انور کمال حسینی (اے رحمن) کے مضامین نہ صرف چشم کشا ہیں بلکہ بحث کے دروازے بھی کھولتے ہیں۔ اردو صحافت کے کلیدی مسائل سے متعلق جاوید حبیب کا مضمون یقیناً ابہام و تفہیم کی نئی راہیں کھولنے میں معاون ثابت ہوگا۔ علاقائی اشاعتی سرگرمیوں پر ڈاکٹر ابن فرید، ڈاکٹر احمد اجملی، نسیم انہونوی، سید شہاب الدین دسنوی، علقمہ شبلی اور وقار خلیل نے اپنے اپنے علاقوں کی اشاعتی رفتار کا بھرپور نہ سہی بے خوف جائزہ ضرور لیا ہے۔

نشر و اشاعت کے علاوہ ادبی صحافت یا صحافتی ادب نے عام قارئین کی دلچسپی کے لیے مختلف مطبوعات سے تخلیقات کا ایک جامع انتخاب 'لہجہ بہ لہجہ' کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ نظم و نثر کے اس انتخاب میں صنف کی دنیائے شعر و ادب میں موجودگی کے بجائے اس کی تصنیف کی موجودگی کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ ہم اپنے اساتذہ کے سرمایۂ شعر و ادب کے نہ صرف محافظ بلکہ مہتمم بھی ہیں اور اسی اہتمام کو اس نمبر کے ورق ورق پہ پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں' کے مصداق میر تقی میر سے مخمور سعیدی تک کے شعری سرمایہ اور آل احمد سرور سے اندر جیت لال تک کے نثری شیرازے کو صدیوں کی چہار دیواری سے لمحوں کی چار سوئی میں سمونے کی ایک ناتمام کوشش کی گئی ہے۔ ہر انتخاب کے نیچے کتاب کا نام، پبلشر کا نام اور سن اشاعت درج کر دیا گیا ہے تاکہ دنیائے شعر و ادب کی تاریخ متعین ہو نہ ہو ترتیب تو مکمل ہو جائے۔ سن اشاعت سے اس بات کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک فن پارہ مختلف ادوار میں کس طرح لفظی و معنوی نشیب و فراز کا متحمل رہا ہے۔ غزلوں، نظموں، مقالوں، اور افسانوں کے انتخاب میں جو پہلی بات سامنے رکھی گئی ہے، وہ ہے تخلیق کی خود شناسی۔ منتخب تخلیق اپنے خالق کا خود تعارف کرا دے بس یہی کوشش کی گئی ہے۔ کہتا ہے کون میر کہ بے اختیار رو" میں جہاں شانِ میریت کو برقرار رکھنے کی جستجو کی ہے وہیں "لے کے چھپ جا کہیں، اے آرزوئے خواب مجھے" میں تجربے کی شہادت کو سامنے لانے کی آرزو بھی کی ہے۔ آتے جاتے لمحوں کی تلاش میں جو چہرے ابھی چند سالوں میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے ان میں جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، احسان دانش، ڈاکٹر اعجاز حسین، سجاد ظہیر، پروفیسر احتشام حسین، باقی، مسعود اختر جمال، جمیل مظہری، اسلم سعیدی، سلام مچھلی شہری، جاں نثار اختر، شمیم کرہانی، شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، اعجاز صدیقی، خلیل الرحمن اعظمی، خورشید احمد جامی، کرشن چندر اور سہیل عظیم آبادی کے زخم ابھی تک تازہ ہیں۔ ان کے قدموں کی آہٹ اس نمبر میں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔

تقسیم ہند کے بعد اردو کے اشاعتی ادارے تو بس گنتی کے رہ گئے ہیں مگر جو بھی ہیں پوری مستعدی سے اس سفر میں گامزن ہیں۔ چند ایسے ہی مشہور و مانوس اداروں کو 'محفل بہ محفل' کے تحت یکجا کیا گیا ہے۔ بیشتر اداروں نے اپنی روداد اشاعت ہمیں خود لکھ کر بھیجی ہے اور جنہوں نے باوجود یاد دہانی کے بھی نہیں بھجوائی ان کے بارے میں جو معلومات فراہم ہو سکیں شامل کر دی گئی ہیں۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ دہلی کی حیثیت ایک اشاعتی ادارہ سے زیادہ تحریکی مرکز کی ہے۔ اس لیے اسے الگ ایک مضمون کی شکل میں شامل کیا گیا ہے جس میں مضمون نگار ایم حبیب خاں نے انجمن کی ابتدا سے تاحال ایک سرسری جائزہ پیش کیا ہے جس سے انجمن کی کارگزاریوں کے مختلف اوجھل گوشے سامنے آئے ہیں ہمیں اس انکشاف میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ اردو کی موجودہ اکیڈمیوں میں صرف بہار اردو اکیڈمی نے اس پروجیکٹ میں دلچسپی لی مگر یو پی اردو اکیڈمی نے جو نہ صرف عمر بلکہ عمل میں بھی سن رسیدہ ہے بالکل خاموشی کا ثبوت دیا۔ چند اکیڈمیوں نے ہماری درخواست پر جواب دینے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ یہ صحیح ہے کہ یہ نمبر قومی آواز کے شعبۂ اشتہارات کا ترتیب کردہ ہے۔ پھر بھی ہم نے بہت سے اشاعتی تعارف ایسے بھی شامل کیے ہیں جن کے اشتہار اس نمبر میں موجود نہیں ہیں۔ ہم اردو اکیڈمیوں سے اس بات کے متمنی تو نہیں بالا متمنی ضرور تھے کہ وہ ہمیں اپنی مطبوعات کی فہرست (بشکل اشتہار اور تعارف (مفت) بھجوا دیں مگر وہ کہتے ہیں نا، ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا! ان اکیڈمیوں سے نہ ہمیں کوئی تعارفی خاکہ ملا اور نہ طباعتی جائزہ۔ بہرحال جو بھی تعارفی خاکہ ہمیں موصول ہوا 'محفل بہ محفل' کے تحت ترتیب وار شائع کر دیا گیا ہے۔ اشتہارات کی شکل میں اس نمبر میں تقریباً ۔۔۔ کتابوں کی فہرست شامل ہے جو قابلِ فخر نہ سہی قابلِ ذکر ضرور ہے۔

ایک [illegible] جو منزل بہ منزل میں حتی الامکان پوری کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس حصہ میں نہ صرف اردو پبلشروں [illegible] مشہور اخبارات، رسائل اور قلمکاروں کے پتے بھی شامل کر دیے گئے ہیں: تاکہ ناشرین ان قلم کاروں سے براہِ راست رابطہ قائم کرکے اپنی مطبوعات کی نکاسی میں مدد و مشورہ لے سکیں"

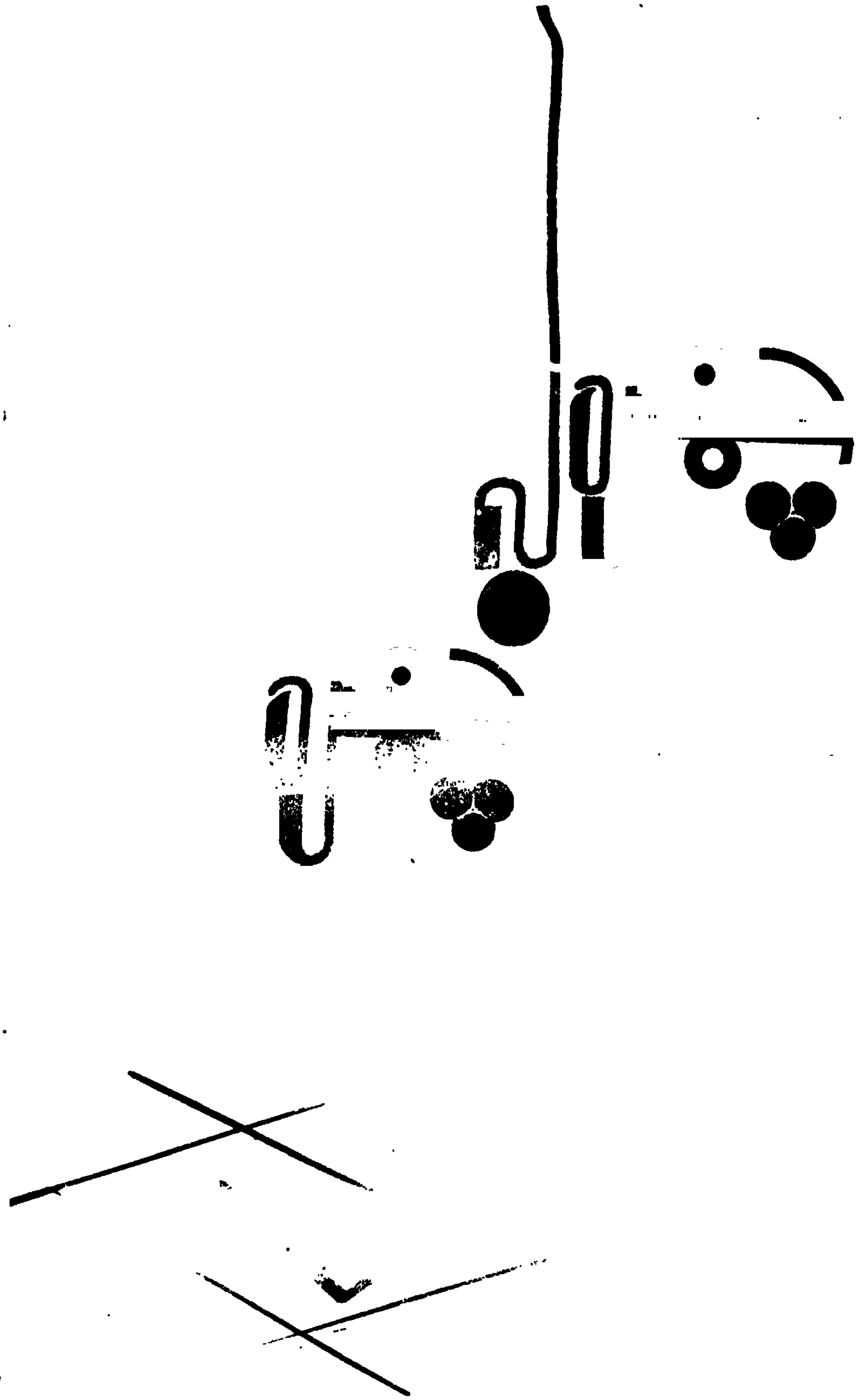
اس نمبر کی اشاعت میں امکانی حد تک جن حضرات نے تعاون دیا ہے ان میں مسٹر نسیم انہونوی، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر شمیم نکہت، ڈاکٹر [illegible] مسٹر محمود سعیدی، مسٹر اسد یار خاں مسٹر انور علی دہلوی، اور ایم حبیب خاں کے نام [illegible] ہم ان کے خلوص تعاون کی توہین نہیں کرنا چاہتے۔ بلکہ ہمیں اس بات کا فخر ہے کہ [illegible] قومی آواز کو اپنا اخبار سمجھ کر ہمارے اس پبلشرز نمبر کے لیے نہ صرف مضامین تحریر کیے بلکہ [illegible] معلوماتی چیزیں بھی مہیا کیں جن کے بغیر یہ نمبر واقعی نامکمل رہتا۔

مشفق محترم [illegible] (چیئرمین ایسوسی ایٹڈ جرنلس لمیٹڈ)، مسٹر عشرت علی صدیقی، چیف ایڈیٹر، مسٹر کے سی کھنہ (منیجر) کی رہنمائی، اور اپنے رفیق کار [illegible] (اسسٹنٹ ایڈیٹر)، مسٹر پی کے گپتا (ڈپٹی منیجر) کے مفید مشوروں مسٹر راجکمار (فورمین [illegible]) [illegible] اسسٹنٹ فورمین پروسس، مسٹر سمیر سنگھ (فورمین پریس)، کی انتھک محنت کا ذکر بھی ضروری ہے جن کے تعاون کے بغیر [illegible] مشکل ضرور تھا۔

اس نمبر کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر کے اسباب و علل کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے، ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا" کے تحت اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہم منزل منزل بھٹکتے پھرے اس امید پر کہ ہمارے اردو ناشرین اور کتب فروش ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔ ایک کاز کے لیے لڑیں، ایک متفقہ لائحہ عمل لے کر چلیں ورنہ ہماری حیثیت تو بقول اقبال ؎

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اطہر عزیز



بہار اردو اکیڈمی پٹنہ
نسیم بکڈپو لکھنؤ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
دار المصنفین اعظم گڑھ
غالب اکیڈمی نئی دہلی
خدا بخش لائبریری پٹنہ
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد
موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی
کتب خانہ اشاعت الاسلام دہلی
نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی
نئی روشنی پبلی کیشنز نئی دہلی
صدیقی اشاعت گھر نئی دہلی
انجمن تہذیب نو الہ آباد
دی کلچرل اکیڈمی گیا

نصرت پبلشرز لکھنؤ
ترقی اردو بورڈ نئی دہلی
ادارہ اشاعت دینیات نئی دہلی
مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی
مکتبہ ندوۃ العلماء لکھنؤ
مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ
ہجوم پبلی کیشنز نئی دہلی
مرکزی ادارہ تبلیغ دینیات دہلی
دائرہ شاہ اجمل اشاعت گھر الہ آباد



بہار اردو کمیٹی : پٹنہ میں مولانا حسرت موہانی کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر گورنر ڈاکٹر اخلاق الرحمان قدوائی خطاب کر رہے ہیں ۔



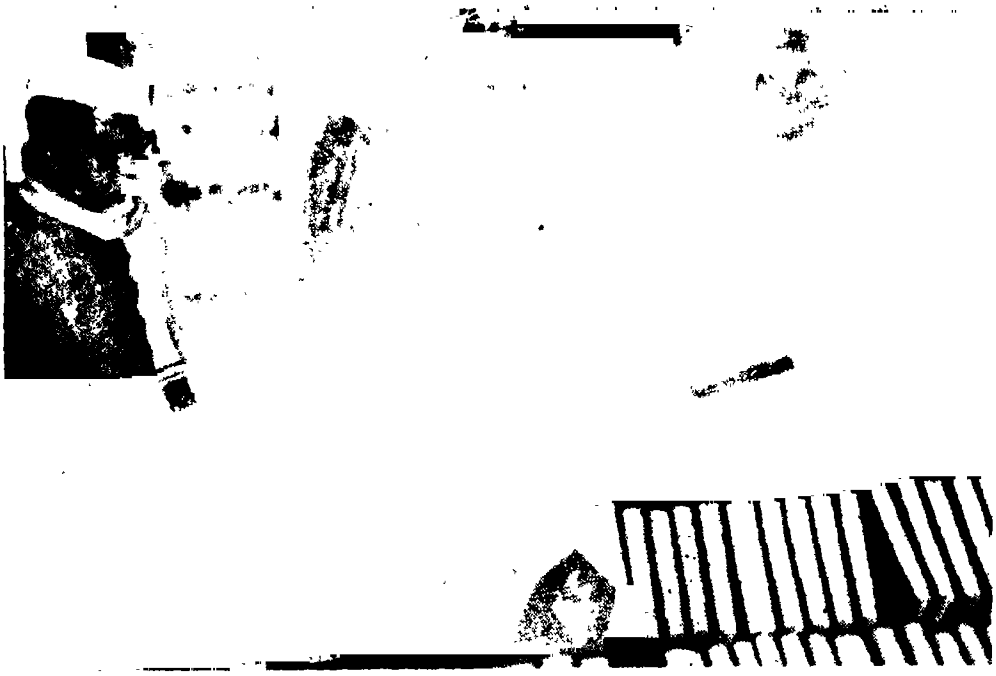
نسیم بک ڈپو لکھنؤ کی جانب سے اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے زیر اہتمام منعقدہ کتابوں کی نمائش میں سٹال دائیں سے بائیں مسٹر عمر انصاری، مسٹر نسیم انہونوی
مسٹر نعیم انہونوی، مسٹر اسد یار خاں



پانچویں عالمی کتاب میلہ دہلی میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی کے جنرل منیجر شاہد علی خاں



[illegible] سید خاں



۱۱ دسمبر ۱۹۸۰ء کو یوپی کے سابق گورنر شری گوپال ریڈی دارالمصنفین اعظم گڑھ میں سید صباح الدین عبدالرحمن کے ہمراہ



غالب اکیڈمی دہلی کی عمارت



خدا بخش لائبریری پٹنہ کی عمارت



ایئر کنڈیشنڈ پبلشنگ ہاؤس دہلی کے مالک مسٹر مجتبیٰ خاں





موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی کے مالک مسٹر پریم گوپال متل، مشہور شاعر کمار پاشی، ممتاز ادیب گوپال متل
حسین، مفتی صاحب اور ممتاز شاعر محمود سعیدی کے ہمراہ

شہزادہ مکرم جاہ اور شہزادی برکت ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں



کتب خانہ اشاعت الاسلام دہلی کے سینئر پارٹنر مسٹر منوہر لال سچدیو مسٹر پرنب مکرجی سے بہترین پبلشر کا انعام لیتے ہوئے



نیشنل بک ٹرسٹ کی کتابوں کی نمائش لکھنؤ میں



نئی دنیا نیشنل فورم کے زیر اہتمام غالب اکیڈمی دہلی میں ایک تقریب: شاہد صدیقی خطاب کر رہے ہیں۔ ڈائس پر (دائیں سے) محمد مصطفےٰ صدیقی راہی، احمد رشید شروانی، غلام نبی ممتاز
طارق انور اور طیب حسین



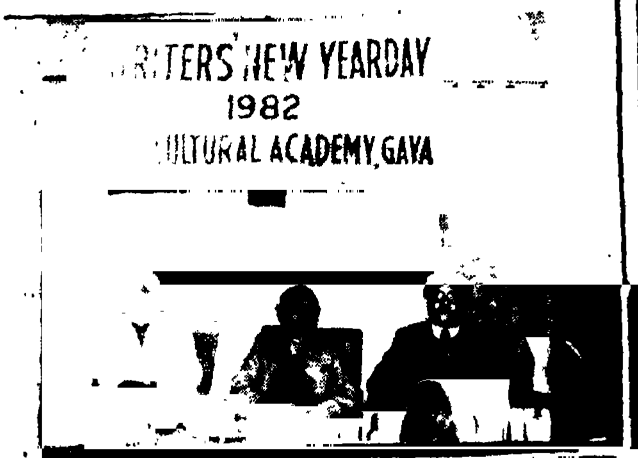
پانچویں عالمی کتابی میلے میں مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی کا ایک منظر



نصرت پبلشرز لکھنؤ کے شوروم کے افتتاح کا ایک منظر (دائیں سے بائیں) ادارہ کی مالک مسز نصرت صاحبہ، مسٹر بابا سہیل، پروفیسر نیر الحسن ہاشمی، مرزا جعفر حسین صاحب، پروفیسر شبیہ الحسن (افتتاح کی رسم انجام دیتے ہوئے) مسٹر حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر سلمان عباسی، مسٹر صباح الدین عمر اور ڈاکٹر شارب ردولوی۔



انجمن تہذیب نو، الہ آباد کے زیر اہتمام جشن افسانہ، ڈائس پر بائیں سے: ممتاز افسانہ نگار انتظار حسین، اقبال متین اور احمد یوسف، ڈاکٹر سید محمد عقیل شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی مائکروفون پر



ملٹی کلچرل اکیڈمی گیا میں ایک تقریب (دائیں سے بائیں) شاہد حمید نقیب، اکیڈمی کے سرپرست مسٹر کلام حیدری اور مسٹر نجم بانی

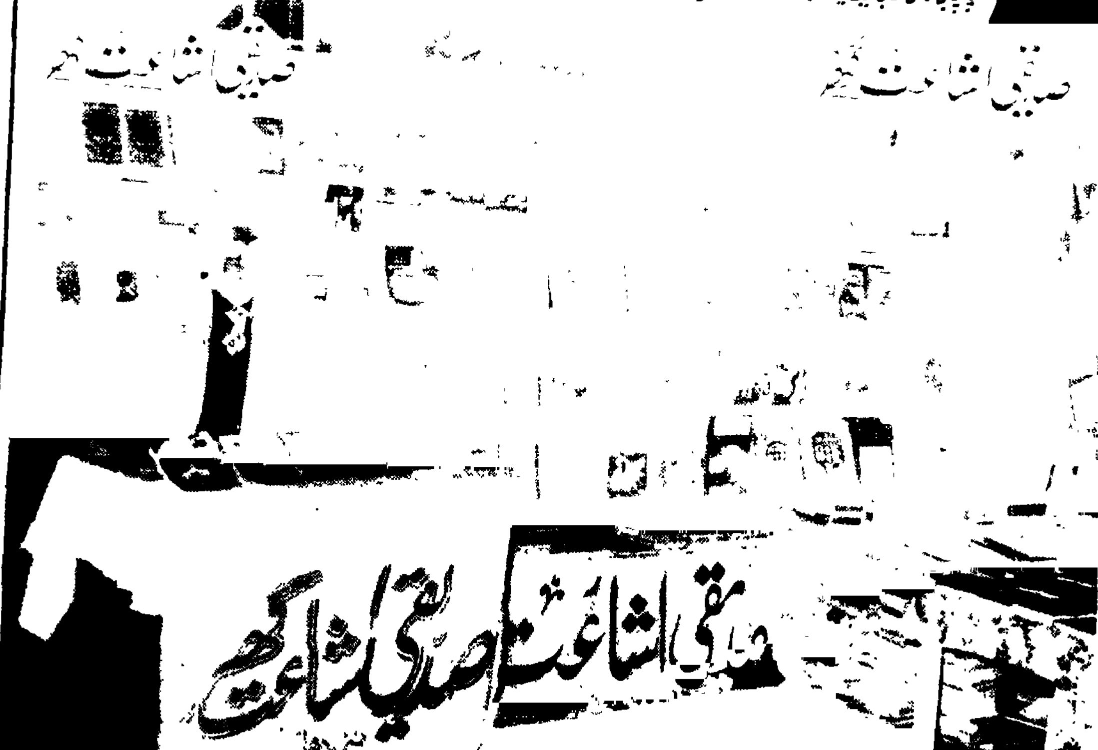


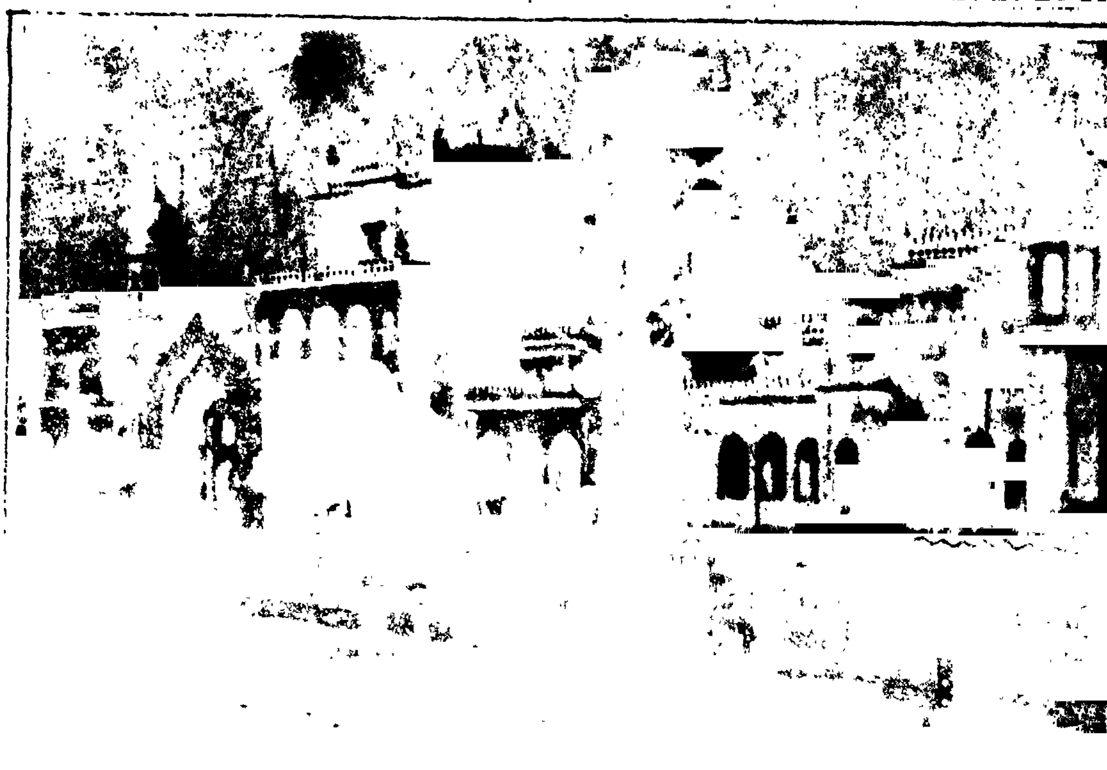
ادارہ اشاعت دینیات دہلی کا شوروم



ترقی اردو بیورو کے ڈائریکٹر شری کے کلر انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی میں بیورو کے کتابت تربیتی مرکز کے تربیت یافتگان کو انعام تقسیم کررہے ہیں۔

پانچویں عالمی کتاب میلے میں صدیقی اشاعت گھر دہلی کا اسٹال ۔۔۔ قائد مصطفی ۔۔۔

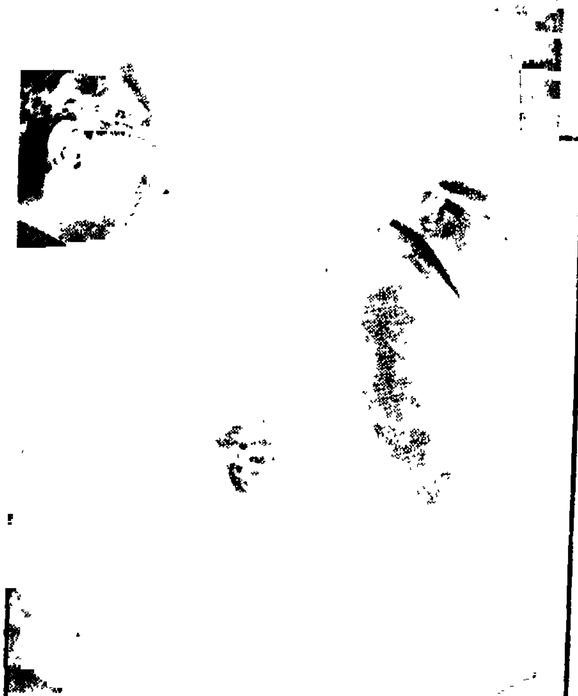




دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کی عالی شان عمارت



مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ کی عمارت



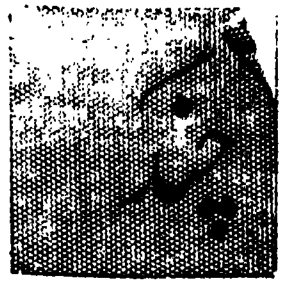
بلی اردو اکیڈمی کے چیئرمین لیفٹیننٹ گورنر ایس ایل کھرانہ کے ہمراہ اکیڈمی کے ممبر
مرکزی ادارہ تبلیغ دینیات کے سرپرست مسٹر انوار علی دہلوی

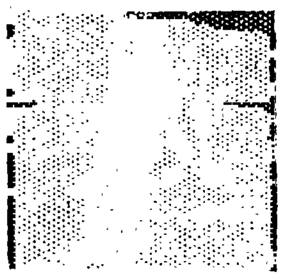


ستمبر ۱۹۸۲ میں جامعہ کے کانفرنس حیدرآباد میں: (دائیں سے) مسٹر محمود جاوید انجم،
مسٹر ناتھ ... مسٹر حبیب ... مسٹر اسرار احمد خوشنود چودھری (ایسوسی ایٹ ایڈیٹر
روزنامہ ... مسٹر ... ایڈیٹر جیلانی (... پیچھے کھڑے ہوئے) مسٹر حبیب الدین (نمائندہ قومی آواز
ذہنی ... مسٹر عبدالطیف قادری
ورشید قاسم الدین (ایڈیٹر ہفتہ ... دہلی)



... شاہ ... الہ آباد کے سالانہ عرس کا ایک منظر شاہ اجمل ... کے ... شاہ سید احمد اجمل سجادہ نشین ... اجمل ... شیدائی ہیں)





ایک یادگار دن —— جس کا دہلی والوں کو برسوں سے انتظار تھا!



۱۴ دسمبر ۱۹۸۰ء کو وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی روزنامہ قومی آواز دہلی ایڈیشن کا رسم اجرا ادا کرتے ہوئے۔ ان کے ہمراہ وزیر داخلہ گیانی ذیل سنگھ اور قومی آواز کے منیجنگ ڈائریکٹر شری یشپال کپور کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔



مسٹر یشپال کپور، مسز اندرا گاندھی، گیانی ذیل سنگھ، شری اوما شنکر دکشت، کرنل بشیر حسین زیدی، مسٹر محمد یونس اور تقریر کرتے ہوئے مسٹر عشرت علی صدیقی



وزیراعظم مسز گاندھی بھگوت گیتا کے اردو ترجمہ کی رسم اجرا ادا کر رہی ہیں



[illegible] ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے جو اس وقت صدر جمہوریہ تھے دہلی میں غالب اکیڈمی کا افتتاح کیا۔ دائیں جانب مسٹر ترگن سین سابق وزیر تعلیم۔ بائیں جانب غالب اکیڈمی
کے بانی حکیم عبدالحمید صاحب اور کنور مہندر سنگھ بیدی ہیں



فراق صاحب دین دیال ہاؤس دہلی کے ایک مشاعرہ میں



پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر ساغر نظامی، محترمہ ذکیہ سلطانہ نیر اور شہناز ساغر کی ایک یادگار تصویر



غالب اکیڈمی دہلی میں حکیم عبدالحمید صاحب ممتاز مصور صادقین صاحب کا استقبال کر رہے ہیں

فوٹو گروپ اراکین و ملازمین انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی



بیٹھے ہوئے (بائیں سے دائیں) بیگم حمیدہ سلطان، پروفیسر مسعود حسین، مفتی عتیق الرحمن، مسٹر مالک رام، ڈاکٹر خلیق انجم، پنڈت آنند نرائن ملا، ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم، مسز حیات اللہ انصاری،
مسٹر صلاح الدین، عبدالرحمن، مسٹر شہاب الدین دسنوی، بیگم سلطانہ حیات (پچھلی قطار بائیں سے) مسٹر ریاست حسین صدیقی، ڈاکٹر عبد ... ، ... ڈاکٹر ... صدیقی
پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر گیان چند جین، مسٹر راج بہادر گوڑ، مسٹر عابد علی خاں، مسٹر سہیل عظیم آبادی (مرحوم)، مسٹر سری واستو ... ، پروفیسر مختار الدین احمد ... (بائیں سے) مسٹر
... لال، مسٹر ... لال، مسٹر خلیق احمد، مسٹر شمیم احمد خاں، چودھری عبدالرحیم، مسٹر محمد ... خاں، مسٹر ... حبیب ... ، مسٹر اشتیاق حسین رضوی، بیگم تسنیم جہاں، ... خاں، مسٹر ... ، مسٹر
عتیق الرحمن



پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر اعجاز حسین مرحوم اور پروفیسر احتشام حسین مرحوم کی ایک یادگار تصویر



اردو کے ممتاز غزل گو فراق گورکھپوری کی آخری یادگار تصویر۔ انجمن ترقی اردو کے صدر دفتر اردو گھر میں وہ کلام سنا رہے ہیں



اردو کے ممتاز نقاد قاضی عبدالودود (بائیں جانب) بہار کے گورنر ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی کے ساتھ

ایک یادگار تصویر۔ سید سجاد ظہیر دہلی میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے۔ تصویر میں بائیں جانب بیٹھے ہوئے ارشد ... کھڑے ہیں





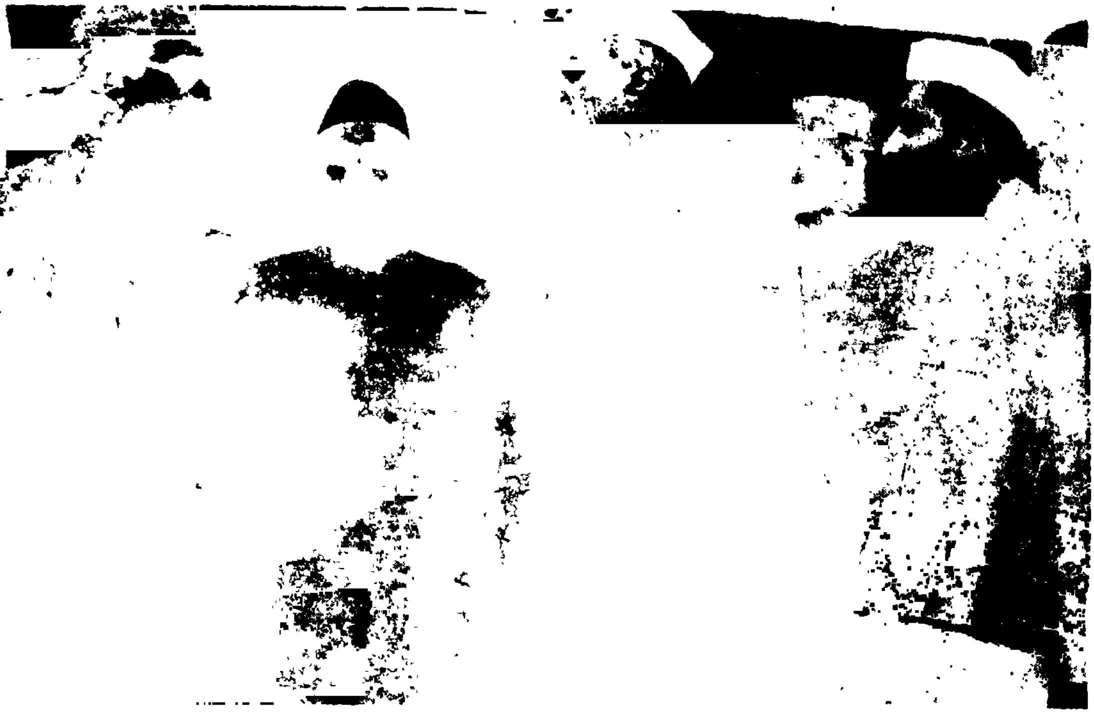
فیض احمد فیض، غلام ربانی تاباں اور کیفی اعظمی کے درمیان



ایک یادگار تصویر: خواجہ احمد عباس، سید سجاد ظہیر اور پرولستی رائے بیٹھے



سالِ نو کے موقع پر ایک مشاعرے میں دائیں سے بائیں: ڈاکٹر اجمل اجملی، بیگم ممتاز مرزا، سوویت محقق ڈاکٹر ظیلانوف، رئیس مرزا، غلام ربانی تاباں اور ڈاکٹر قمر رئیس



ایک یادگار تصویر۔ ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر پنڈت جواہر لال نہرو کا سواگت۔ اس تصویر میں کتب خانہ عزیزیہ دہلی کے بانی مولوی سمیع اللہ قاسمی مرحوم (بائیں سے دوسرے) بھی دیکھے جا سکتے ہیں



جوش ملیح آبادی کے ہمراہ ڈاکٹر شمیم نکہت، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی اور ڈاکٹر مغیث الدین فریدی



مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر مسٹر بدرالدین طیب جی خدا بخش لائبریری پٹنہ میں لکچر دیتے ہوئے

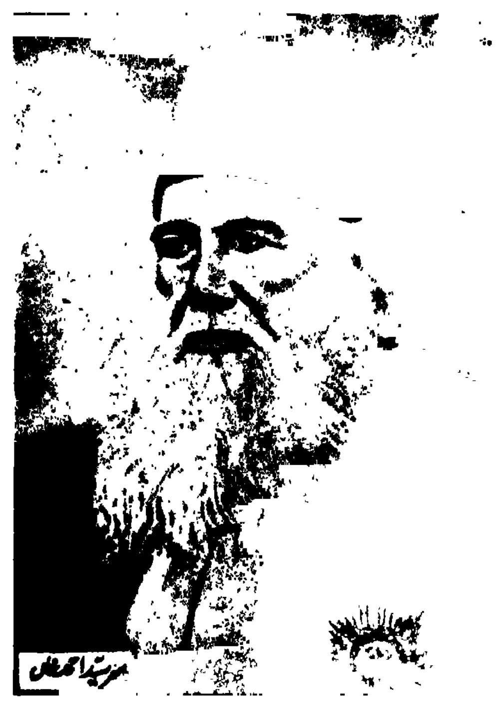
خاک ہو کے بھی مہکتے ہیں گلابوں کی طرح — چند چہرے جو مقدس ہیں کتابوں کی طرح



امیر خسرو



میر انیس



سر سید احمد خاں

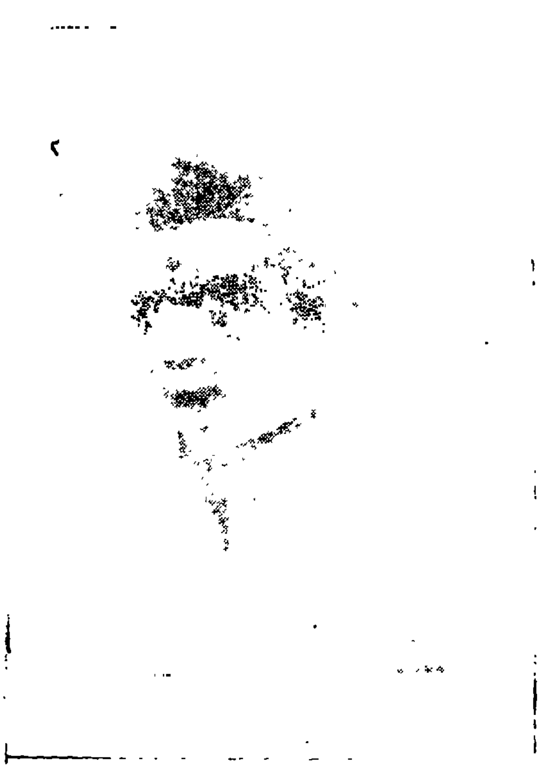


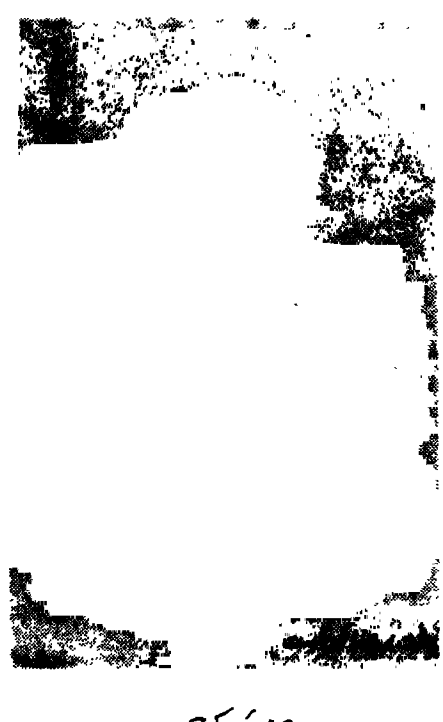
خواجہ الطاف حسین حالی





مولانا شبلی نعمانی





برج نرائن چکبست



منشی پریم چند



منشی نول کشور



مولانا ابوالکلام آزاد



مولوی عبدالحق



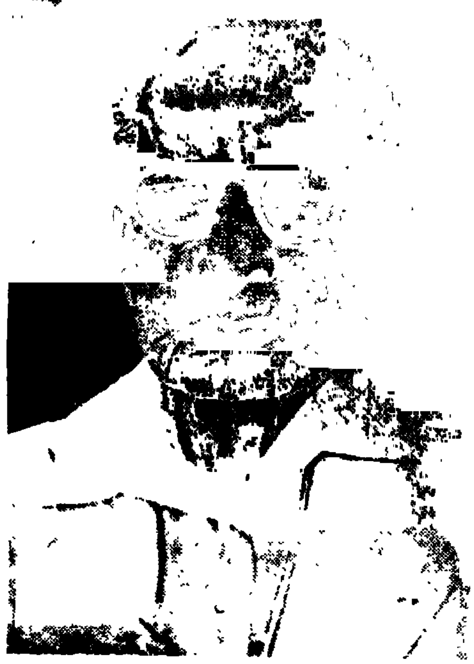
خواجہ حسن نظامی



نیاز فتحپوری



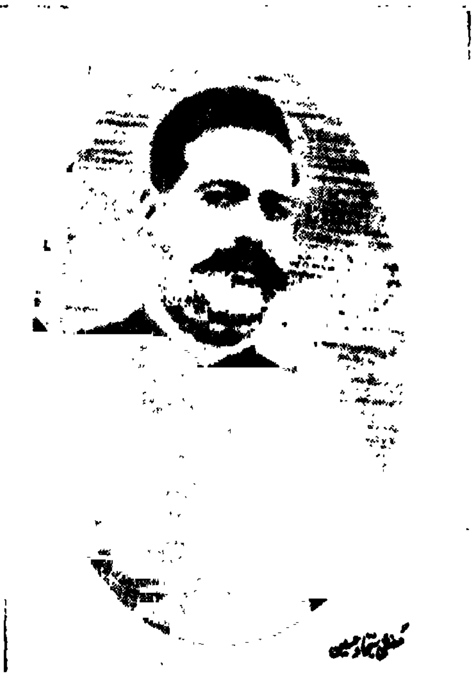
رشید احمد صدیقی



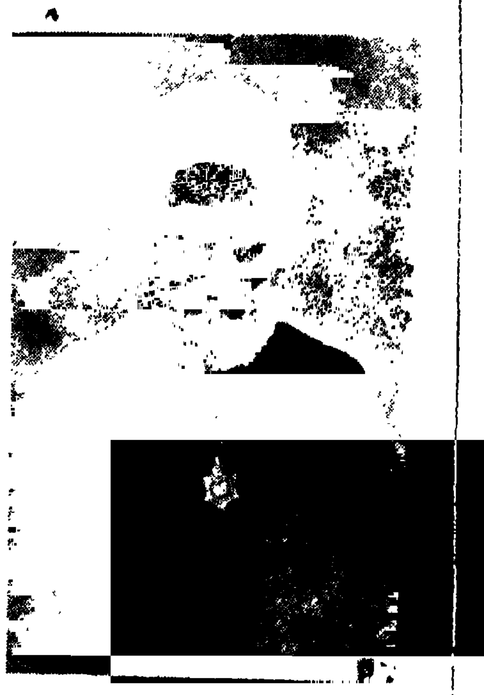
پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی



رتن ناتھ سرشار



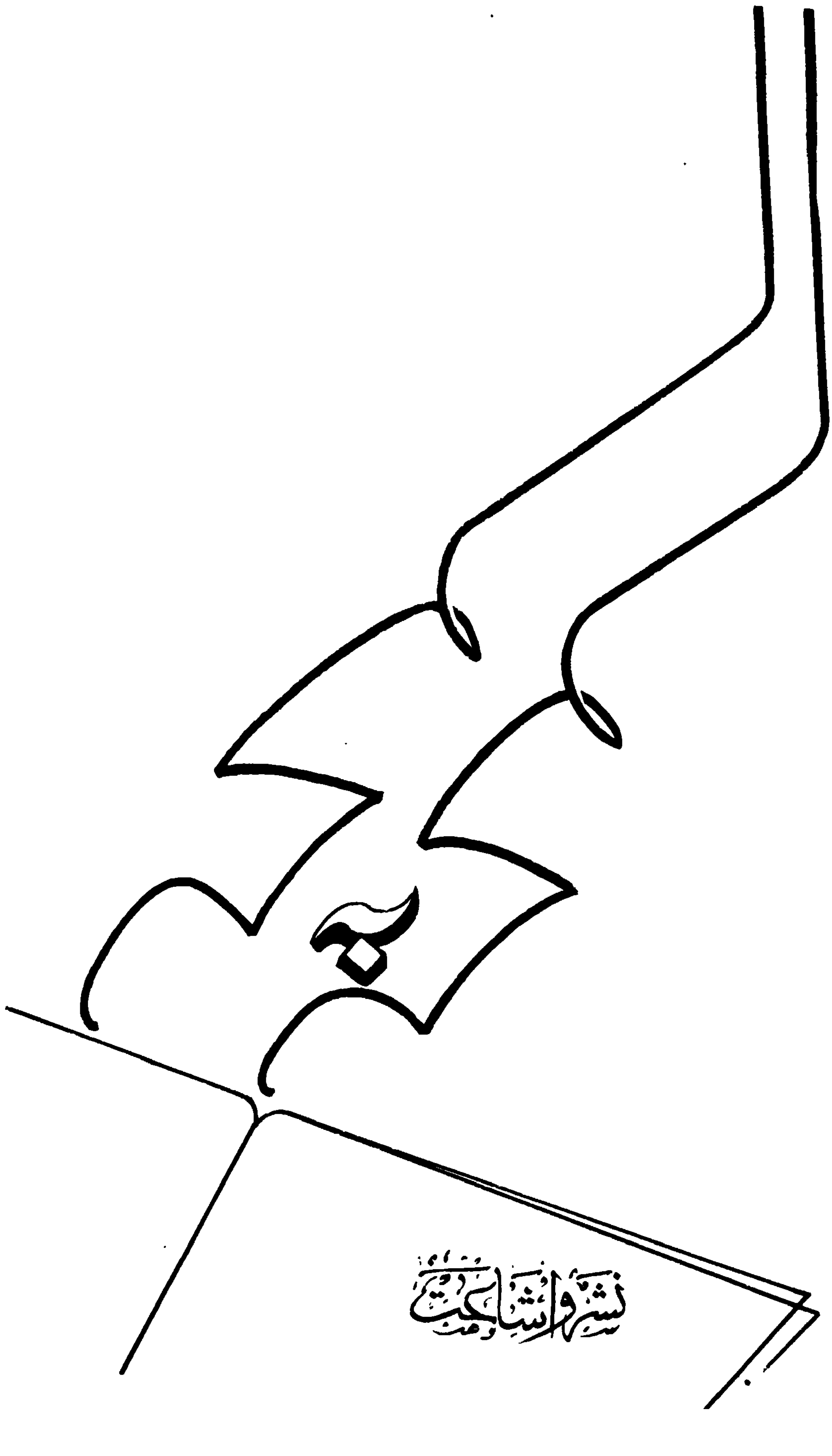
منشی سجاد حسین



اسمٰعیل میرٹھی



صفی لکھنوی


نشر و اشاعت

ڈاکٹر خلیق انجم
ڈاکٹر عابد رضا بیدار
ڈاکٹر شارب ردولوی
ڈاکٹر مظفر حنفی
اختر الواسع
نسیم انہونوی
ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی
سید شہاب الدین دسنوی

ڈاکٹر اطہر پرویز
ڈاکٹر اجمل اجملی
ڈاکٹر نور الحسن نقوی
ڈاکٹر ابن فرید
ڈاکٹر شمیم نکہت
جاوید حبیب
ایس ۔ اے ۔ رحمٰن

وقار خلیل
علقمہ شبلی
اسد یار خاں
حاجی محمد زبیر
انیس اعظمی
نسیم اختر شاہ قیصر
اکمل اجملی
خواجہ ذکی احمد

ڈاکٹر خلیق انجم



اردو کتابوں کی اشاعت آزادی کے بعد

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندستان کی آزادی کے اعلان کے ساتھ ہی ہندستان کی مشترکہ تہذیب اور اس کے سب سے بڑے نشان یعنی اردو زبان کا زوال شروع ہوگیا۔ آزادی ملنے کے کچھ ہی دن بعد اترپردیش کے پرائمری اسکولوں میں اردو کی تعلیم بند کردی گئی اور پھر بہار، مدھیہ پردیش اور راجستھان وغیرہ نے اترپردیش کی پیروی کی۔ آدھا پنجاب پاکستان میں شامل ہوگیا۔ باقی آدھے میں اردو کا چلن باقی رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ پنجابی کا استعمال بڑھنے لگا پھر ایک منزل وہ آگئی جب پنجابی کے مسئلے نے سیاسی رنگ اختیار کرلیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب تین حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ پنجاب ہریانہ اور ہماچل پردیش، اور زبان کے مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ پنجاب میں پنجابی ہریانہ اور ہماچل پردیش میں ہندی اور اردو کہیں بھی نہیں۔ یہ حل تینوں ریاستوں کے لوگوں کے لیے قابل قبول تھا کچھ عرصہ کے بعد ہماچل میں سہ لسانی فارمولے کے تحت چھٹی ساتویں آٹھویں کلاسوں میں اردو پڑھائی جانے لگی۔

شمالی ہند میں آزادی سے قبل ہر مذہب کے طالب علم اردو پڑھتے تھے لیکن آزادی کے بعد کچھ ایسا ماحول بنا دیا گیا کہ اردو تعلیم ایک مخصوص مذہب کے لوگوں تک محدود رہ گئی اور چونکہ اسکولوں میں اردو کی تعلیم ختم کردی گئی تھی اس لیے اس مذہب کے بچے بھی اردو تعلیم سے محروم رہنے لگے۔

آزادی کے بعد مہاراشٹر میں اردو کی حیثیت پر کوئی برا اثر نہیں پڑا لیکن وہاں اردو بولنے والوں کی تعداد پہلے ہی پانچ فیصد سے زیادہ نہیں تھی۔ جنوبی ہندستان میں سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر اردو کے خلاف کبھی تعصب نہیں برتا گیا لیکن وہاں آندھرا کے علاوہ کسی بھی صوبے میں اردو بولنے والوں کی تعداد تین فیصدی سے لے کر چھ فیصدی سے زیادہ نہیں۔

ہندستان میں یونیورسٹی سطح تک اردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے استعمال کرنے کا سب سے پہلا کامیاب تجربہ جامعہ عثمانیہ میں کیا گیا تھا۔ الحاق کے بعد ذریعہ تعلیم اردو سے بدل کر انگریزی کر دیا گیا اور اردو نواب حیدرآباد اور ان کی حکومت کی سرپرستی سے محروم ہوگئی جب ریاست کی دوبارہ تشکیل ہوئی تو رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی چونکہ اردو کی بہت بڑی آبادی دو تین ریاستوں میں اس طرح تقسیم ہوگئی اور ایک نئی ریاست یعنی آندھرا پردیش کو اس طرح تشکیل دیا گیا کہ اردو والے ہر ریاست میں ایک چھوٹی سی لسانی اقلیت بن کر رہ گئے۔

پورے ہندستان میں جموں و کشمیر واحد ریاست ہے جس نے اس زبان کو گلے سے لگایا اور اسے سرکاری حیثیت دی۔

اس پس منظر کے بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ آزادی کے بعد کس طرح اردو والے ایک چھوٹی سی لسانی اقلیت بن کر رہ گئے اور کس طرح انھیں ان کی مادری زبان سے محروم کر دیا گیا۔ اس صورت حال کا اثر براہِ راست اردو کی کتابی صنعت پر پڑا۔ کتابیں خریدنے والے ہی نہ رہے تو کتابیں چھاپنے اور بیچنے والے کہاں رہیں گے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں ہندستان کے دو سب سے بڑے پبلشر یعنی انجمن ترقی اردو ہند اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ برباد ہو گئے۔ ان دونوں کے کتب خانوں کو آگ لگادی گئی۔ پولیس ایکشن میں حیدرآباد کے دارالترجمہ عثمانیہ کو بھی نذر آتش کر دیا گیا۔ ان تینوں اداروں کی لاکھوں روپے کی کتابیں ختم ہوگئیں۔ بیس پچیس سال لگاتار جدوجہد کے بعد انجمن ترقی اردو اور مکتبہ جامعہ تو سنبھل گئے لیکن دارالترجمہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔

اردو کتابی صنعت کے بارے میں ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ اردو اور فارسی کتابوں کی سب سے زیادہ کھپت پنجاب میں ہوتی

مطبوعات خدا بخش لائبریری پٹنہ

۱۔ عربی مخطوطات کی مجمل فہرستیں	(۳ جلدیں) فی جلد	۱۰/-
۲۔ فارسی مخطوطات کی مجمل فہرستیں	(۳ جلدیں) 〃	۱۰/-
۳۔ مخطوطات کی مجمل فہرست	(۱ جلد)	۵/-
۴۔ خدا بخش لائبریری کے مخطوطات کی توضیحی فہرست	فقہی مخطوطات (۳ جلد)	۱۰۵/-
۵۔ 〃 〃 〃 〃 〃	فارسی شاعری (۴ جلد)	۱۴۰/-
۶۔ 〃 〃 〃 〃 〃	علوم قرآنی (۱ جلد)	۱۵/-
۷۔ 〃 〃 〃 〃 〃	حدیث (۱ جلد)	۱۰/-
۸۔ قاضی عبدالودود کا "معیار" ۱۹۳۶ء میں		۳۰/-
۹۔ خدا بخش لائبریری، ایک تعارف	اوکونر (انگریزی)	۱۰/-
۱۰۔ خدا بخش، سوانح اور کارنامہ	صلاح الدین خدا بخش و جادو ناتھ سرکار	۵/-
۱۱۔ تاریخچۂ پیدائش و وفات۔ معاصران	محمد سعید حسرت عظیم آبادی (م ۱۳۰۴ھ)	۵/-
۱۲۔ میری تنقید ایک بازدید	پروفیسر کلیم الدین احمد	۵/-
۱۳۔ صوفی لٹریچر عہد سلطنت میں	ڈاکٹر بروس لارنس (انگریزی)	۱۰/-
۱۴۔ اسلامی تقویم کی تشکیل نو	ڈاکٹر ہاشم امیر علی (انگریزی)	۱۰/-
۱۵۔ فارسی اور ہندستان	ڈاکٹر نذیر احمد	۱۰/-
۱۶۔ شمس البیان فی مصطلحات الہندستان	مرزا جان طپش دہلوی (م ۱۲۲۹ھ)	۵/-
۱۷۔ صحف ابراہیم	علی ابراہیم خاں خلیل (م ۱۲۰۸ھ)	۱۰/-
۱۸۔ مجمع النفائس	سراج الدین علی خاں آرزو (م ۱۱۶۹ھ)	۱۰/-
۱۹۔ باغ معانی	نقش علی (م ۱۱۷۶ھ)	۱۰/-
۲۰۔ مثنوی تصویر محبت۔ داستان رامچندر	شمس الدین فقیر دہلوی (م ۱۱۸۳ھ)	۵/-
۲۱۔ یوپی کانگرس کے پہلے اجلاس کا خطبہ صدارت	پنڈت موتی لال نہرو (م ۱۹۳۱ء)	۵/-
۲۲۔ فارسی ادبیات میں ہندستان کا حصہ (نئی تحقیقات کی روشنی میں)	ڈاکٹر امیر حسن عابدی	۵/-
۲۳۔ دیوان مصحفی: مصحفی کا نادر آٹھواں دیوان (عکسی اشاعت)		۵۰/-
۲۴۔ دیوان حافظ (عکسی اشاعت) حواشی پر ہمایوں اور جہانگیر کے دیوان سے نکالے ہوئے فالوں کے ساتھ ان کے اپنے خط میں		۱۰۰/-
۲۵۔ دیوان موبد۔ عہد شاہجہاں کے دانشور شاعر، دبستان مذاہب کے مصنف کا دیوان		۵۰/-
۲۶۔ فرہنگ آصفیہ پر تبصرہ: قاضی عبدالودود		۵/-
۲۷۔ خدا بخش لائبریری جرنل (سہ ماہی) ۲۰ شمارے (۱۹۷۷-۱۹۸۱ء) فی شمارہ پندرہ روپے	کل قیمت	۳۰۰/-
۲۸۔ صوفیہ کے مکتوبات و ملفوظات، پروفیسر سید حسن عسکری قیمت ۱۰/-		

مناسب تاجران کمیشن اور لائبریری کمیشن کے ساتھ ڈاک خرچ بھی لائبریری کے ذمے۔

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

تھی جب ۱۸۵۸ء میں غالب کی دستنبو شائع ہوئی تو تقریباً ایک سال بعد مطبع کے مالک اور غالب کے دوست اور شاگرد منشی شیو نارائن آرام نے غالب کو خوشخبری دی کہ دستنبو کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا ہے۔ غالب نے فوراً آرام کو خط لکھ کر پوچھا کہ کتابیں کس علاقے میں فروخت ہوئیں اور پھر اپنا قیاس بتایا کہ پنجاب میں ہوئی ہوں گی۔ منشی شیو نارائن آرام نے جواب میں غالب کے اس قیاس کی تصدیق کی آدھا پنجاب پاکستان میں چلا گیا اور آدھا اردو سے منکر ہوگیا۔ پورے شمالی ہند کی صوبائی حکومتیں اردو کی سرپرستی تو کیا کرتیں انھوں نے اس زبان کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کتابوں کی کہیں کھپت نہ رہی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو کی کتابیں چھپنا بالکل بند ہوگئیں۔ جاسوسی ناول اور سماجی اور تاریخی ناول ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوکر زندگی سے مفرور ذہنوں کی آسودگی کا سامان کرتے رہے۔ مذہبی کتابوں میں قرآن شریف کی فروخت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ البتہ یوسف زلیخا، یا داستان یوسف جیسی مذہبی کتابیں دیوناگری رسم الخط میں چھپنے لگیں۔ چونکہ شاعری کی خاص مانگ رہی ہے اس لیے پچھلے تیس سال میں سب سے زیادہ شاعری کے مجموعے چھپے ہیں۔ ان میں پبلشروں نے کم اور شاعروں نے زیادہ مجموعے چھاپے ہیں۔ بڑی بدنصیبی یہ ہوئی کہ اعلا درجے کی تحقیقی اور تنقیدی کتابیں چھاپنے والے ناشر نہیں رہے جن محققین اور نقادوں میں مالی استطاعت تھی۔ انھوں نے اپنی کتابیں خود چھپوا کر دیمک کے لیے غذا فراہم کی۔ آزادی سے قبل ہر ممکن ٹیکنیکل موضوع پر اردو میں کتاب چھپتی تھی۔ آزادی کے بعد یہ سلسلہ تقریباً ختم ہوگیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹیکنیکل واقفیت کے لیے اردو والوں کو دوسری زبانیں سیکھنی پڑیں۔

چونکہ اردو کتابی صنعت نفع بخش نہ رہی اس لیے بڑے سرمایہ داروں نے اس طرف متوجہ ہونا بند کردیا اور یہ کاروبار ان لوگوں کے ہاتھوں میں آگیا جو ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہے اور کوئی دوسرا کاروبار ان کے بس کا نہ تھا۔ تقریباً ساٹھ فیصدی اردو پبلشرز ایسے ہیں جن کے یہاں کوئی ملازم نہیں ہوتا یا صرف ایک آدمی ہوتا ہے جو پریس کاپی تیار کرتا ہے، پریس میں کتابیں چھپواتا ہے، جلد بنواتا ہے پھر کتابوں کے پیکٹ بنوا کر خود ڈاکخانے جاتا ہے اور پیکٹوں کو روانہ کرتا ہے۔ ایسے پبلشروں کی تعداد بھی کافی زیادہ ہے جو اردو پبلشنگ کو جز وقتی کام کے طور پر کرتے ہیں اور انھوں نے گھر ہی کو دفتر بنا رکھا ہے اور بیوی بچے اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ پچھلے تیس برسوں میں اردو کتابی صنعت میں سب سے بڑا نقصان مصنف کو ہوا۔ چونکہ اچھی کتابوں کے لیے پبلشر آسانی سے نہیں ملتے اس لیے بعض پبلشر یہ کتابیں اس شرط پر چھاپتے ہیں کہ وہ مصنف کو کوئی معاوضہ نہیں دیں گے اور مصنف ان شرائط کو تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہے۔

پچھلے دس برسوں میں اردو کے حق میں فضا سازگار ہوئی اور اچھی کتابوں کی کھپت شروع ہوگئی تو ان پبلشروں نے جعلی ایڈیشن چھاپنے شروع کیے۔ چونکہ پاکستانی کتابوں کی ہندستان میں بہت زیادہ مانگ ہے اس لیے ان پبلشروں نے بے شمار پاکستانی کتابوں کے جعلی ایڈیشن چھاپنے شروع کیے۔ یہ لوگ ہندستانی مصنفین کی کتابوں کے جعلی ایڈیشن چھاپنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ان جعلی پبلشروں کا طریقہ کار بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ یہ کتاب کی قیمت بہت زیادہ رکھتے ہیں اور ان پر کمیشن ۴۰ فیصد سے لے کر ۵۰ فیصد تک دیتے ہیں۔ کوئی کتاب بھی عموماً پانچ سو سے زیادہ نہیں چھاپتے۔ اور ہندستان میں بعض بک سیلر ان کے مستقل گاہک ہوتے ہیں جنھوں نے پبلشروں کو ہدایت دی ہوئی ہوتی ہے کہ جب بھی کوئی کتاب چھاپے پانچ دس یا پندرہ کی تعداد میں انھیں بھیج دے۔ بک سیلر کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے شہر کی لائبریریوں کو وہ کتاب ساڑھے بارہ فیصد کمیشن پر سپلائی کر دیتا ہے۔ پچھلے دس بارہ برسوں سے یہ تجارت بہت بڑے پیمانے پر کی جا رہی ہے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اس طرح کی سرگرمیوں کی روک تھام کی جائے۔ متوسط درجے کے پبلشر جو ایماندار بھی ہیں خاصی مصیبت میں ہیں اور یہ مصیبت خود ان کی لائی ہوئی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ اردو کتابوں کی مانگ پچھلے دس بارہ برس میں بڑھی ہے لیکن اردو کے پبلشر اور بک سیلر وہ جدید طریقے استعمال نہیں کر رہے ہیں جو کتاب کی فروخت کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً جدید انداز کا کیٹلاگ کوئی بھی پبلشر تیار نہیں کرتا۔ حد تو یہ ہے کہ انجمن ترقی اردو اور مکتبہ جامعہ کے کیٹلاگ

بھی ایسے لگتے ہیں جیسے ۵ برس پہلے کے پبلشرز کے ہوں۔ جنوبی ہند اور خاص طور سے حیدرآباد والوں کو یہ شکایت ہے کہ انھیں نئی کتابوں کی اشاعت کی اطلاع بہت دیر سے ملتی ہے اور کتاب سال بھر سے پہلے ہاتھ نہیں آتی۔ میں نے چند اردو پبلشروں سے ذاتی طور پر دریافت کیا کہ انھوں نے اپنے کاروبار کے لیے بینک سے کتنا قرض لیا۔ معلوم ہوا کہ کسی ایک نے قرض نہیں لیا۔ تو پبلشروں نے اس اطلاع پر حیرت کا اظہار کیا کہ ان کے کاروبار کے لیے بینک قرض بھی دے سکتا ہے۔

اردو پبلشروں کا قرض کا معاملہ کاغذ والوں سے رہتا ہے جو من مانے داموں پر خراب سے خراب کاغذ سپلائی کرتے ہیں۔ اردو پبلشرز یہ کاغذ لیتے پر اس لیے مجبور ہوتا ہے کہ وہ عام طور سے کاغذ نقد داموں پر نہیں خرید سکتا۔

پبلشر تبصرے کے لیے رسالوں کو اپنی کتابیں نہیں بھیجتے وہ سوچتے ہیں کہ اگر کتاب کی قیمت بیس روپے ہے تو دو کتابیں بھیجنے کا مطلب ہے چالیس روپے اور ڈاک خرچ علاوہ۔ وہ نہیں سوچتے کہ اگر وہ تبصرے کے لیے کتابیں بھیجیں گے تو کتابوں کی نکاسی جلدی ہوگی اور اس طرح ان کا پیسہ جلد واپس آجائے گا۔ اور اس سلسلے میں ان کے حساب لگانے کا طریقہ بھی مضحکہ خیز ہے کتاب پر درج قیمت سے اپنا حساب لگاتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ کتاب کی قیمت بیس روپے ہے لیکن وہ پبلشر کو سات روپے کی پڑی ہے۔ اب اگر وہ چودہ روپے کی دو کتابیں تبصرے کے لیے بھیجتا ہے تو چودہ روپے میں اسے اس رسالہ کا آدھا یا پورا صفحہ مل جاتا ہے۔ ہر کاروبار میں ایک مہینے دو مہینے کے قرض کی سہولیت دی جاتی ہے لیکن اردو میں ایک دن کی ممکن نہیں تمام پبلشروں کی ساکھ بگاڑنے میں ان کتب فروشوں اور پبلشروں کا ہاتھ ہے جو جعلی کتابیں چھاپتے اور بیچتے ہیں اور پیسہ کمانے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقے استعمال کرتے ہیں۔ اس صورت حال کا اثر ایماندار بک سیلروں پر برا پڑتا ہے۔

اسی سلسلے میں لائبریریوں کا ذکر بھی ضروری ہے آزادی کے بعد کافی عرصہ تک شمالی ہند میں لائبریریوں نے اردو کتابوں کی خرید بالکل بند کردی ہے جب اردو کے حالات بہتر ہونا شروع ہوئے تو لائبریری کے بجٹ میں اردو کا ذکر بھی آنے لگا۔ اور آہستہ آہستہ یہ بجٹ بڑھنے لگا۔ اگرچہ آج بھی لائبریریاں موجود ہیں جن کے پچاس ساٹھ ہزار کے سالانہ بجٹ میں سے اردو کو صرف دو سو یا ڈھائی سو روپے سالانہ ملتے ہیں۔ جن لائبریریوں میں اردو کی کتابوں کے لیے بجٹ اچھا خاصا ہے وہاں اس کے ساتھ بہت سے مسائل بھی ہیں۔ وزارت تعلیم نے انگریزی اور ہندی کی کتابوں کے لیے کمیشن مقرر کر دیا ہے کوئی لائبریری اس کمیشن سے زیادہ نہیں مانگ سکتی۔ اردو کے لیے کمیشن کی کوئی شرح مقرر نہیں کی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب لائبریری ٹینڈر مانگتی ہے تو بکسیلر ساڑھے بارہ فیصدی کمیشن سے لے کر ۳۳٪ اور بعض اوقات ۴۰ فیصدی تک کمیشن دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ایک دلچسپ لطیفہ بیان کردوں کہ انجمن ترقی اردو لائبریریوں کو ساڑھے بارہ اور بعض کو پندرہ فیصدی کمیشن دیتی ہے ایک لائبریری نے انجمن سے کمیشن کی شرح دریافت کی جو لکھ دی گئی بعد میں معلوم ہوا کہ ایک بکسیلر نے انجمن کی کتابوں کی شرح کمیشن چالیس فیصدی لکھی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بک سیلر عام طور پر لائبریریوں کو وہ کتابیں سپلائی کرتا ہے جو پچھتر فی صدی کمیشن پر مل جاتی ہیں۔ اس لیے دس پانچ کتابوں میں وہ نقصان برداشت کر لیتا ہے۔ اس لعنت سے نجات پانے کے دو طریقے ہیں۔ اردو پبلشر اور بک سیلر وزارت تعلیم سے مطالبہ کریں کہ اردو کتابوں کی بھی شرح کمیشن مقرر کی جائے۔ دوسرے ہندستان کے تمام پبلشر اور بک سیلر ایک ایسی تنظیم تشکیل دیں جو ان مسائل کا حل ڈھونڈے اور اس طرح کے فیصلے کرے جن کی پابندی تمام پبلشر اور بک سیلرز پر لازمی ہو۔

پچھلے تیس سالوں میں بعض سرکاری اداروں نے اردو کتابیں چھاپی ہیں۔ ان اداروں میں نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکیڈمی، ترقی اردو بورڈ اور پبلیکیشنز ڈویژن قابل ذکر ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ ان اداروں نے اردو کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے لیکن ان کی کتابیں فروخت کرنے کی تنظیم قابل اطمینان نہیں ہے۔ اسی لیے ان اداروں کی بیشتر کتابیں فروخت نہیں ہوتیں۔ ہندستان کے اکثر کتب فروشوں کو اس کا بھی علم نہیں کہ یہ ادارے کہاں ہیں اور انھیں کس پتے سے آرڈر بھیجا جائے۔

ان اداروں سے کتابیں خریدنا آسان نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں فروخت میں قطعی دلچسپی نہیں۔ میں ایک مثال دینا چاہتا ہوں کہ پبلیکیشن ڈویژن سے وہی شخص کتاب خرید سکتا ہے جو تین چار دن

کے لیے اپنا سب کام چھوڑ دے۔ سلسلے تین چار نام بھیجنے ہوتے ہیں کبھی ایسے لوگوں سے ملنا ہوتا ہے جو اکثر اپنی میزوں پر نہیں ہوتے۔ اسٹامپوں کی تصدیق کرانی ہوتی ہے۔ یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ آپ کتاب کا ناجائز استعمال نہیں کریں گے۔ یہ بھی ثابت کرنا پڑتا ہے کہ آپ یہ کتاب اپنے پڑھنے کے لیے نہیں فروخت کے لیے حاصل کر رہے ہیں۔ بہت کم بک سیلر ہیں جو اس پوری کارروائی کے متحمل ہو سکتے ہیں۔

کچھ لوگ یہ تجربہ کر کے ہی چھوڑ دیتے ہیں اور کچھ لوگ ایک دفعہ منزل پر پہنچ کر دوبارہ ادھر کا نام نہیں لیتے۔ ان میں سے ایک ادارے نے سول ایجنٹ مقرر کر رکھے ہیں۔ سول ایجنسی کے جہاں فائدے ہیں وہاں نقصانات بھی ہیں۔ میں آپ کی توجہ نقصانات کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ ایک بک سیلر جو کسی کتاب کا سول ایجنٹ بن جاتا ہے کوشش کرتا ہے کہ گاہکوں کو اور لائبریریوں کو براہِ راست کتابیں سپلائی کرے۔ جب کوئی بک سیلر ان کتابوں کا آرڈر دیتا ہے تو سول ایجنٹ ٹال مٹول کرتا ہے تاکہ اس بک سیلر کی تجارت پر بُرا اثر پڑے۔ ترقی اردو بورڈ نے حال ہی میں سول ایجنسی کا سسٹم ختم کر دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان کی فروخت پہلے سے کم سے کم دس گنا زیادہ ہو گئی ہے۔ یہ ادارے بعض اوقات سرکاری، سیاسی یا ذاتی تعلقات کے اثرات سے مجبور ہو کر بعض ایسی کتابیں چھاپ دیتے ہیں جن کی مانگ نہیں ہوتی اور یہ کتابیں ہمیشہ گودام کی زینت بنی رہتی ہیں۔ اس سے اردو مخالف ذہن کے افسروں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ اردو کتابوں کی مارکیٹ نہیں ہے۔ اس لیے اردو کتابوں کا چھاپنا بے سود ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ترقی اردو بورڈ نے چار جلدوں میں فرہنگ آصفیہ شائع کی ہے جس کی قیمت ڈیڑھ سو روپے ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا پہلا اڈیشن جو غالباً دو ہزار کی تعداد میں چھپا تھا ختم ہو گیا یا ختم ہونے والا ہے۔ ان اداروں کے سلسلے میں میری گذارش یہ ہے:

۱۔ کہ یہ ادارے صرف وہ کتابیں چھاپیں جن کی مانگ ہو یا جو واقعی چھاپنے کے قابل ہوں۔

۲۔ ان سب اداروں کی مطبوعات کی فروخت کا انتظام ان میں سے کوئی ادارہ اپنے ذمے لے لے جو ہر بڑے شہر میں بک ڈپو قائم کرے جہاں ان اداروں کی ہر زبان میں چھپنے والی کتابوں کی فروخت کا انتظام ہو۔

۳۔ اردو اخباروں اور رسالوں میں ان بک ڈپوز کی معقول پبلسٹی کی جائے۔

پچھلے چار پانچ برسوں میں اتر پردیش، بہار، مہاراشٹر، کرناٹک وغیرہ میں اردو اکیڈمیاں قائم کی گئی ہیں اور بعض دوسرے صوبوں میں ان کے قیام کا اعلان کیا گیا ہے۔ یہ تمام اکیڈمیاں مصنفوں کو کتابیں چھاپنے کے لیے مالی مدد دیتی ہیں۔ اس مالی مدد کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ بعض بہت اچھی کتابیں پڑھنے کو مل جاتی ہیں لیکن اس کا ایک نقصان یہ ہے کہ بعض تیسرے اور چوتھے درجے کے مصنف ذاتی یا سیاسی دباؤ ڈال کر مالی مدد حاصل کر لیتے ہیں اور اپنے کلامِ بلاغت نظام سے اردو ادب کی رسوائی کا سبب بنتے ہیں۔ مالی مدد سے چھاپی جانے والی یہ کتابیں عام طور سے مصنف کے گھر کی زینت بنی رہتی ہیں اور انھیں بک سیلروں کی دکانوں تک پہنچنا نصیب نہیں ہوتا۔ اس طرح بے شمار اعلا درجے کی کتابوں کو دیمک چاٹ رہی ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ مصنف کتاب چھپوا تو سکتا ہے لیکن بیچ نہیں سکتا کیونکہ بک سیلروں کے تینوں اور فروخت کے طریقوں سے وہ بالکل ناواقف ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں میری سفارش یہ ہے کہ جو کتاب چھاپنے کے قابل ہو اسے خود چھاپیں اور اسے حکومت اس ادارے کے سپرد کر دے جس کے بارے میں میری تجویز ہے کہ وہ پورے ہندستان میں بک ڈپوز کا ایک جال بچھائے گا۔

پچھلے تیس برسوں میں بچوں کے ادب کا حال بہت بُرا رہا ہے۔ کافی عرصے تک تو بچوں کی کتابیں چھپنا بند رہیں اور جب چھپنا شروع ہوئیں تو ہر لحاظ سے ان کا معیار پست رہا۔ بعض سرکاری اداروں نے بچوں کے لیے چند کتابیں چھاپی ہیں لیکن ایک تو ان کی قیمت بہت زیادہ ہے اور دوسرے ان میں سے بیشتر قدیم ہندستان کی کہانیوں پر مبنی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قدیم ہندستان کی کہانیاں بے سود ہیں لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ قدیم زندگی کے مقابلے میں جدید زندگی زیادہ اہم ہے۔ یہ کتابیں ہر موضوع پر ہونا ضروری ہیں اور ان کا سستا ہونا اور بھی ضروری ہے۔ ہر معیار اور ہر عمر کے بچوں کے لیے کتابیں تیار کرنے کا کام ترقی اردو بورڈ اور نیشنل بک ٹرسٹ جیسے اداروں کو بڑے پیمانے پر کرنا چاہیے۔

آزادی کے بعد سے لے کر اب تک اردو کی نصابی کتابوں کا مسئلہ بڑا تشویشناک رہا ہے۔ تقریباً تمام صوبے اپنی علاقائی زبانوں میں نصاب کی کتابیں چھاپ رہے ہیں لیکن جموں کشمیر، بہار، مہاراشٹر اور دہلی کو چھوڑ کر کوئی بھی صوبائی حکومت اردو کی نصابی کتابیں چھاپنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اترپردیش حکومت پچھلے دو تین سال سے اس طرف متوجہ ہوئی ہے لیکن بہت بددلی کے ساتھ۔ اترپردیش میں نصاب کی بیشتر کتابیں فراہم نہیں ہوتی ہیں اور جو فراہم ہوتی ہیں وہ طالب علموں تک ستمبر یا اکتوبر کے مہینے میں پہنچتی ہیں جب والدین علاقائی زبان کا کورس خرید کر بچے کو دے دیتے ہیں۔ دہلی میں یہ مسئلہ کافی حد تک حل ہو گیا ہے۔ لیکن ایک دو کتابوں کے بارے میں ہر سال شکایت رہتی ہے۔ نصابی کتابوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اردو طالب علموں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ اس لیے کتابیں کم تعداد میں چھاپی جاتی ہیں اور چونکہ کتابیں کم تعداد میں چھاپی جاتی ہیں اس لیے ان کی قیمت زیادہ ہوتی ہے اسی وجہ سے پرائیوٹ پبلشر نصابی کتابیں چھاپنے میں دلچسپی نہیں لیتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی نصابی کتابوں کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے مرکزی حکومت کوئی کمیٹی مقرر کرے۔

میں آخر میں اردو پریس کا ذکر کروں گا۔ لیتھو اردو کے لیے سب سے بڑی نعمت بھی ہے اور سب سے بڑی لعنت بھی۔ نعمت اس لیے ہے کہ اگر لیتھو نہ ہوتا تو آزادی کے بعد سے اب تک اردو میں جو کتابیں چھپی ہیں ان میں سے بیشتر نہ چھپتیں اور دوسرے لفظوں میں لیتھو پریس ہی اردو کی بقا کا ضامن رہا ہے۔ کیونکہ اسی کی وجہ سے سستی ترین کتابیں چھپ جاتی ہیں لیکن اسی کی وجہ سے اردو طباعت کا معیار بلند نہیں ہو پاتا۔ آزادی کے بعد لیتھو پریس کا امپورٹ بند کر دیا گیا چالیس چالیس پچاس پچاس سال سے جو مشینیں چل رہی ہیں وہ دم توڑ چکی ہیں۔ عام پبلشر آفسیٹ سے کتاب نہیں چھپوا سکتا۔ کیونکہ لیتھو سے چھپی ہوئی کتاب کی قیمت اگر چار روپے ہوتی ہے تو آفسیٹ سے چھپی ہوئی کتاب کی قیمت دس روپے ہو جاتی ہے۔

کتابت کا مسئلہ ہمیشہ سے رہا ہے اس کا حل ترقی اردو بورڈ نے یہ نکالا ہے کہ دہلی بہار اور سری نگر میں کتابت سکھانے کے مرکز قائم کیے ہیں۔ اترپردیش اکیڈمی نے بھی لکھنؤ میں ایسا ہی ایک اسکول قائم کیا ہے۔ پریس کے سلسلے میں میری گزارش یہ ہے کہ ابھی پندرہ بیس سال تک اردو پبلشر اس قابل نہیں ہو سکتے کہ آفسیٹ سے کتابیں چھپوائیں، اس فن کے ماہرین کی ایک کمیٹی بننی چاہیے جو لیتھو مشین کو اتنا بہتر بنا دے کہ وہ آفسیٹ سے مقابلہ کرنے لگے۔ میرا عقیدہ ہے کہ یہ کام مشکل ضرور ہے مگر ناقابل عمل نہیں۔ ٹائپوگرافی کی سفارش میں اس لیے نہیں کروں گا کہ نسخ اور نستعلیق میں کون انداز اپنایا جائے اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہوا ہے۔

اردو کے چند قدیم اخبار

دریائے لطافت۔	کانپور۔	ہفتہ وار۔	۱۸۶۵ء
کارنامہ۔	لکھنؤ۔	" ۔	"
مخزن العلوم۔	بریلی۔	ماہانہ۔	"
گیاونی پترکا۔	لاہور۔	ماہانہ۔	"
پنجابی اخبار۔	" ۔	ہفتہ وار۔	"
طلسم کرتان۔	بنگلور۔	" ۔	"
گلدستۂ شعرا۔	فتح گڑھ۔	ماہانہ۔	"
میرٹھ گزٹ۔	میرٹھ۔	ہفتہ وار۔	"
دل کشا۔	فتح گڑھ۔	" ۔	"
آئینۂ ہند۔	بریلی۔	" ۔	"
مظہر العجائب۔	رڑکی۔	" ۔	"
آگرہ لا جنرل۔	آگرہ۔	" ۔	"
روضۃ الاخبار۔	بمبئی۔	" ۔	"
رسالہ انجمن پنجاب۔	لاہور۔	ماہانہ۔	"
اکمل الاخبار۔	دہلی۔	ہفتہ وار۔	۱۸۶۶ء
چراغ دہلی۔	دہلی۔	" ۔	"
اخبار سائنٹفک سوسائٹی۔	علی گڑھ۔	" ۔	"
دبدبہ سکندری۔	رامپور۔	" ۔	"
انجمن فیض عام۔	گوجرانوالہ۔	ماہانہ۔	"
خیر خواہ پنجاب۔	"	ہفتہ وار۔	"

ڈاکٹر عابد رضا بیدار

بہار میں علم وادب کی اشاعت



ایک مدت قبل بہار سے باہر اردو حلقہ جن ناموں سے مانوس تھا، ان کی تعداد ہاتھ کی انگلیوں سے بھی برابر نہ تھی. فضل حق آزاد، شہباز، شاد عظیم آبادی نصیر حسین خیال، عرش گیادی اور اثر عظیم آبادی ـــــــ یہ پہلا عہد تھا، اور اس عہد میں شاد عظیم آبادی کے گھر کے پریس یا اپنچ والوں کی، معرکہ آرائی سے قطع نظر کی جائے تو طباعت واشاعت کا اصل محور قاضی عبدالودود کے والد کا پریس اور اس کا احمدیہ حنفی آرگن، تحفہ حنفیہ. ایک طرف چھپا ہوا ملتا ہے تو دوسری طرف صادقپور کی (وہابی) روایت پوری توانائی کے ساتھ آمادہ پیکار ملتی ہے، یہ سلسلہ (بحمداللہ!) آج بھی جاری ہے. لیکن فریق کسی قدر بدل گئے ہیں. بریلوی نمایندگی اس وقت ادارہ شرعیہ کے ہاتھ میں ہے، اور صادقپور کی جانشینی کا حق اہل حدیث کے ہاتھ میں ہے جن کا مرکز نقل در بھنگہ ہے. ان دونوں سے ہٹ کر خلافت اور جمعیتہ علماء کے زعیم ابوالمحاسن سجاد کی یادگار امارت شرعیہ اپنے آرگن 'نقیب' کے علاوہ ضروری موضوعات پر کتابچے بھی نکالتی رہتی ہے، کام زیادہ تر پھلواری شریف سے ہوتا ہے، لیکن مرکز رشد و ہدایت مونگیر رہتا ہے. جماعت اسلامی اکثر ریاستوں کی مانند یہاں بھی نشر واشاعت میں سرگرم عمل ہے اور کل ہند یا کل ریاستی اجتماعات کے موقع پر اس کے کتابچے منظر عام پر آتے ہیں. جماعت کے حلقہ طلبا کا ایک آرگن 'رفیق' کے نام سے ماہانہ پابندی کے ساتھ، پٹنہ سے شائع ہوتا ہے، دینی کاموں میں، ان جماعتوں اور گروہوں کو چھوڑ کر افراد میں ایک نمایاں کام جو کئی سال قبل شایع ہوا تھا، اور اپنی ضخامت اور دیدہ زیب طباعت کا گہرا تاثر چھوڑ گیا تھا 'اللہ نور السموات والارض' نامی کتاب ہے.

بات ادب سے شروع ہو کر دینی سلسلے تک پہونچ گئی پھر پیچھے لوٹتا ہوں، پہلے عہد کے بعد جو نام سامنے آئے ان میں قابل ذکر عبدالمالک آروی ہیں اور ان کا طاق بستاں آرہ' اور ان کے ساتھ ڈاکٹر سید محمود کا نام بھی فوراً ہی سامنے آجاتا ہے، جو نیاز فتحپوری کے ہمکار "خواب کی دنیا" اور اقبال کی شاعری' کے مصنف اور اس عہد کے معروف اہل قلم ہیں. صحافی کی حیثیت سے سلطان احمد، محقق کی حیثیت سے قاضی عبدالودود، ناقد کی حیثیت سے کلیم الدین احمد، شاعر کی حیثیت سے جمیل مظہری، (اجتبی رضوی کو جب کسی نے قابل اعتنا سمجھا اور نہ اب!) افسانہ نگار کی حیثیت سے سہیل عظیم آبادی اور مورخ کی حیثیت سے سید حسن عسکری اس دوسرے عہد کے ممتاز ترین نام رہے. ناشر کی حیثیت سے اقبال بک ڈپو کے سوا کوئی قابل ذکر نام سامنے نہیں آیا، اس عہد کے فارسی محققوں میں سید حسن اور شاہ عطاء الرحمن کا نام قابل ذکر ہے، ناقد اور افسانہ نگار اختر اورینوی اور افسانہ نگار شکیلہ اختر کا نام اس فہرست میں جوڑا جاسکتا ہے اس عہد میں یاس عظیم آبادی، یگانہ چنگیزی میں تبدیل ہو کر لکھنؤ جا بسے، دسنہ کے سید سلیمان نجیب نجیب اشرف اور صلاح الدین نے دار المصنفین بسایا اور گیا کے ریاست علی ندوی بھی ایک مدت تک درسگاہ شبلی سے وابستہ رہے، اس عہد کے ادبی رسائل میں قاضی عبدالودود کا معیار (۱۹۳۶ء) اور عظیم الدین احمد کلیم الدین احمد کا معاصر (۸۲ / ۱۹۴۰ء) قابل ذکر ہیں.

آزادی کے بعد جو مزید نام سامنے آئے ان میں شاعروں

میں پرویز شاہدی اور کلیم عاجز، نفسیاتی افسانہ نگاروں میں پروفیسر محسن سائنسی شعر میں پروفیسر عبدالحمید شمس اور صحافیوں میں عوامی جمہوریت کے ایڈیٹر احمد فاطمی (مرحوم) اور سنگم کے ایڈیٹر غلام سرور، الکلام اور اب نقیب کے ایڈیٹر شاہد رام نگری قابل ذکر ہیں، اور ناشروں میں کلام حیدری کی کلچرل اکیڈمی گیا کو چھوڑ کر اب بہار میں خدا بخش لائبریری اور بہار اردو اکیڈمی کے سوا کوئی اہم نام نہیں ملتا نئی نسل میں شمیم احمد کا ایڈیٹنگ کا کام، وہاب اشرفی، اور لطف الرحمٰن کا تنقیدی کام اور اکمل یزدانی (پورنیہ) کا تہذیبی کام اور محمد حسنین کا انشائیہ قابل توجہ ہیں۔ فضل امام واقف اروی ثم عظیم آبادی کے ذکر کے بغیر یہ تذکرہ مکمل نہ ہوگا، جو خوبصورت نعت گو ہیں، اور باکمال استاد شاعر لیکن ان کا اصل کمال ان کی نثر میں ظاہر ہوتا ہے جس کے پڑھنے سے بے ساختہ اسلوب سامنے آتا ہے جس کے وہ بانی بھی ہیں اور خاتم بھی۔

"جہاں تک اردو کی تدریس کا سوال ہے تو مجھے کہنے دیجیے کہ بچہ صرف اپنی مادری زبان کے ذریعے بہتر تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ دنیا کی مرئی اور غیر مرئی اشیا سے بچے کا ذہنی رشتہ صرف مادری زبان کے ذریعے ہی قائم ہوتا ہے۔ جن بچوں نے تعلیم مادری زبان کے ذریعے حاصل کی ہے وہ زندگی میں زیادہ کامیاب رہے ہیں۔ جن پبلک اسکولوں کا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہوتا ہے وہاں نہ صرف بچوں میں بے جا گھمنڈ پیدا کیا جاتا ہے بلکہ تعلیم کچھ اس انداز سے دی جاتی ہے کہ بچوں کا ذہنی رشتہ اپنے ملک سے زیادہ دوسرے ملکوں کی تہذیب و تمدن سے قائم ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ ہندستان میں رہتے ہیں لیکن ان کے سوچنے کا انداز دوسرے ملکوں کے بچوں کا ہوتا ہے۔ متوسط طبقے کے بچے اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا پسند نہیں کرتے لیکن اگر ہم کوشش کریں اور ایسے اردو میڈیم اسکول قائم کریں جن کا معیار دوسرے اچھے اسکولوں سے کسی طرح کم نہ ہو تو ہمیں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔"

(حیات اللہ انصاری)



- ڈاکٹر شارب ردولوی

اردو میں جین، بدھ، سکھ اور ہندو مذاہب کی کتابیں

مجھ سے فرمائش کی گئی تھی کہ میں اسلام کے علاوہ مذاہب کے بارے میں اردو زبان میں جو کتابیں ملتی ہیں ان پر ایک مضمون لکھوں لیکن اس موضوع پر ڈاکٹر محمد عزیر کا بہت اچھا مقالہ شائع ہو چکا ہے، جو اب نایاب ہے لیکن جس تفصیل سے انہوں نے جائزہ لیا ہے اس سے الگ ہٹ کر کوئی چیز لکھنا اس وقت ممکن نہیں تھا۔ وہ کتاب بھی فوری طور پر مجھے کہیں نہ مل سکی جس کی روشنی میں کسی نئی صورت پر غور کیا جا سکتا۔ اس لیے میں نے اپنے مطالعہ کو صرف چند مذاہب تک محدود رکھا ہے اور وہ بھی صرف ان کتابوں کے ذکر تک جو دہلی کی دو تین لائبریریوں میں مل سکیں۔ اس مضمون کی حیثیت صرف اشارات کی ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف میں ضروری سمجھتا ہوں۔ (شارب ردولوی)

اردو ہمیشہ مشترکہ کلچر اور قومی یکجہتی کی زبان کہلائی ہے۔ آج بھی اس کے اس کردار پر شاید ہی کسی کو شبہ ہو۔ یہ غیر منقسم ہندوستان میں بھی ملک کے طول و عرض پر سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان تھی اور منقسم ہندوستان میں بھی سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے حالانکہ تیس سال تک نفرت اور ملامت کا شکار رہی ہے اور اب بھی کسی سرکاری سرپرستی یا قانونی تحفظ سے محروم ہے۔

ہندوستان مختلف زبانوں اور مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہے یہاں ہر چند میل پر زبان، اس کا لب و لہجہ اور انداز بدل جاتا ہے۔ یہاں کے بیشتر صوبے ذو لسانی اور سہ لسانی ہیں ریاستوں کی لسانی تقسیم کے باوجود یہ دوہری شکل موجود ہے۔ اسی طرح ایک جگہ کی تہذیب، کھانا پینا، لباس اور رسم و رواج دوسری جگہ سے بہت حد تک مختلف ہیں۔ زبانوں اور تہذیبوں کی یہ رنگا رنگی کسی دوسری جگہ شکل سے دیکھنے میں آئے گی۔ اس لسانی اور تہذیبی اختلاف کے باوجود قوس و قزح کے رنگوں کی طرح اپنی انفرادیت باقی رکھتے ہوئے سب شیر و شکر رہے ہیں۔ اس کی اصل وجہ وہ وسیع النظری، رواداری اور پاس جذبات ہے جو اس سرزمین کے خمیر میں شامل ہے۔

ہندوستان کی اسی مشترک تہذیب سے اردو وجود میں آئی۔ وسیع النظری، رواداری، باہمی محبت و احترام اور نامذہبیت اسے صوفی اور سنتوں سے وراثت میں ملی جنھوں نے نہ صرف اس کی خشت اول کے رکھنے کا کام کیا تھا بلکہ اس کے ارتقا اور کردار کی تعمیر میں اہم کام انجام دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ یہ زبان دکن کا پتھریلا علاقہ ہو یا دوآب کی نرم سرزمین، مشرق کی مرطوب آب و ہوا ہو یا مغرب کی ریتلی زمین ہر جگہ محبت اور بھائی چارے کی زبان بن کر اس طرح پھیلی کہ گھروں اور بازاروں پر چھا گئی۔ ہندوستان میں بہت سی زبانیں ہیں جو قابل فخر علمی و ادبی اثاثہ رکھتی ہیں لیکن وہ تمام زبانیں اپنے احاطوں میں محصور ہیں اور اپنے احاطے سے نکلنے کے بعد اس وقت تک 'اجنبی' ہی رہتی ہیں جب تک کوئی 'محرم' نہ مل جائے۔ سوائے اردو زبان کے جس کے لیے نہ صوبائی حد بندی کی کوئی حیثیت ہے اور نہ تہذیبی، لسانی یا مذہبی حدود کوئی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے بولنے اور سمجھنے والے بہت بڑی تعداد میں ہر ریاست، ہر مذہب اور ہر عقیدے کے لوگوں میں مل جاتے ہیں۔ اس کی اس [illegible] کا بنیادی سبب اس زبان کا کردار ہے۔ جو ہمیشہ [illegible] رہا ہے اور جس نے ہر چیز کو کشادہ دلی، خندہ پیشانی اور وسیع النظری کے ساتھ قبول کیا

ہے۔ یوں تو اس کے کردار کے مطالعہ کی بے شمار جہتیں ہیں جن سے قومی یکجہتی اور سیکولر نقطہ نظر کی نشاندہی ہوتی ہے۔ خاص طور پر رواداری، انسان دوستی، جذباتی ہم آہنگی اور قوم پرستی کے جذبات میں اس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے جس کی مثالوں سے اردو نثر و نظم کا دامن بھرا ہوا ہے۔ اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ اس زبان کی تراش خراش اور اظہار و اسلوب کے نئے پیرائے تلاش کرنے اور بنانے کا کام ہر مذہب، ہر عقیدے اور ہر علاقے کے لوگوں نے کیا ہے۔ اس اختلاف عقائد نے رواداری، دوسروں کے جذبات کا احترام اور انسان دوستی کے جذبات کو بڑھایا۔ ہندو شعرا نے حمد و نعت اور منقبت لکھیں، اسلامی عقائد، اسلامی فلسفے تصوف اور اسلامی تلمیحات کو اپنے کلام میں بڑی خوبصورتی اور لطیف پیرایۂ بیان کے ساتھ پیش کیا تو مسلمان شعرا نے کرشن بھگتی کے گیت لکھے، رام چندر جی اور دوسرے مذہبی بزرگوں کے بارے میں نظمیں لکھیں اور ہندو فلسفے اور ویدانت کے نکات کو نظم کیا۔ اردو کے اس بنیادی کردار کی نشاندہی کے لیے یہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

کوئی خالق، باری، رب، مولا، رحمان، رحیم، اللہ، تنکری
کوئی الکھ روپ، کرتار کہے، نرنکار، نرنجن، نردھاری
کوئی رام رام کہہ کر سمرے کوئی بولے شیو شیو، ہری ہری
کوئی دانو، دیت، دیوائل، کوئی راچھس، دیوت، جن، پری
کل عالم تیری یاد کرے تو صاحب سب کا سچا ہے

(نظیر اکبرآبادی)

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

(اقبال)

متھرا کہ نگر ہے عاشقی کا — دم بھرتی ہے عاشقی اسی کا
پیغام حیات جاوداں کا — ہر نغمہ کرشن بانسری کا

(حسرت موہانی)

کرتا ہے یہ دو زباں سے اکثر — حمدِ حق و مدحتِ پیمبر
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے — یعنی یہ مطیعِ پنجتن ہے

(دیاشنکر نسیم)

ان اشعار سے اس رواداری، یکجہتی، دوسرے مذاہب کا احترام اور وسیع النظری کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے جو اردو تہذیب نے پیدا کی ہے۔ اردو میں مختلف مذاہب کے بزرگوں اور پیشواؤں کے بارے میں جتنا لکھا گیا ہے ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں مشکل سے نظر آئے گا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ تحریریں صرف اس مذہب یا عقیدے کے ماننے والے لوگوں کی ہی نہیں ہے اس لیے کہ کسی عقیدے کے ماننے والے تو اپنے بزرگوں کے بارے میں احترام و عقیدت کا اظہار کرتے ہی ہیں یہ کوئی بڑی بات نہیں کہ مسلمانوں نے اسلام یا پیغمبر اسلام کے بارے میں لکھا ہو یا ہندوؤں نے کرشن جی، رام چندر جی یا دوسرے دیوتاؤں اور دیویوں کے لیے عقیدت کا نذرانہ پیش کیا ہو۔ اردو میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جہاں اسلام، پیغمبر اسلام، آئمہ یا شہدائے کربلا کی شان میں نعت و منقبت اور سلام و مراثی مسلمان شعرا نے لکھے ہیں وہیں ان کے شانہ بہ شانہ اسی صف میں برج نرائن چکبست، دیاشنکر نسیم، نانک لکھنوی، دوارکا پرشاد افق، تلوک چند محروم، منوہر سہائے انور، بشیشر پرشاد منور لکھنوی اور نہ جانے کتنے غیر مسلم شعرا نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ہندو دھرم یا دوسرے مذاہب کے سلسلے میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی تصانیف کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے جن میں سے بعض مثالیں اوپر دی جاچکی ہیں۔ اس طرح اردو زبان نے سارے ملک میں یگانگت، محبت، رواداری اور احترام کی فضا پیدا کی۔

اس کے علاوہ اردو زبان کا ایک بہت بڑا کارنامہ اس میں پایا جانے والا مذہبی ادب ہے۔ اس موقع پر میں صرف چند مذاہب کی بعض اہم کتابوں اور تراجم کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔ اس میں میں نے اسلامی کتب اور عیسائیت سے متعلق کتابوں اور قرآن و بائبل کے تراجم کو شامل نہیں کیا ہے اس لیے کہ اسلام اور عیسائیت پر اردو میں اتنی کتابیں ہیں کہ ان دونوں پر الگ الگ مضامین لکھنے کی ضرورت ہے۔ ہندو مذہب کی کتابوں کی تعداد بھی بے شمار رہی اور اس پر بھی الگ مضمون لکھا جانا چاہیے تھا لیکن میں نے اسے

اس لیے شامل کر لیا کہ اس طرح اردو کی وسعت ہمہ جہتی اور رنگا رنگی کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

اردو میں یوں تو مختلف النوع موضوعات پر بے شمار کتابیں ملتی ہیں وہ خواہ فلسفہ ہو یا منطق طب ہو یا نجوم سائنسی علوم ہوں یا شعر و ادب لیکن اس میں مختلف مذاہب، ان کے اصول ان کے صحیفے، اور پیشواؤں کے بارے میں جو کتابیں ملتی ہیں وہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں اتنی کثیر تعداد میں شکل سے ملیں گی۔ اردو زبان کی وسعت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس میں پایا جانے والا مذہبی ادب کسی مذہب کے مطالعے کے لیے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیتا ہے۔ بعض مذہبی صحیفوں کے تراجم اردو میں اتنی کثرت سے ملتے ہیں کہ شاید اتنے تراجم کسی دوسری ہندوستانی زبان میں نہ ہوئے ہوں گے۔

اردو میں ہندو مذہب سے متعلق ترجمے اور تصانیف کی تعداد بہت بڑی ہے جس کا ذکر بعد میں آئے گا لیکن جین مذہب جس کے بانی بھگوان مہاویر سوامی تھے اور جو ہندوستان کا ایک قدیم مذہب ہے اس کے بارے میں بھی تقریباً ایک سو چالیس (۱۴۰) کتابیں اردو میں مل جاتی ہیں۔ ان میں بعض کتابوں میں مشکل الفاظ کے معنی حاشیے پر دے دیے گئے ہیں اور متن کو اسی زبان میں اردو رسم خط میں لکھ دیا گیا ہے۔ لیکن بیشتر کتابیں سلیس و شگفتہ زبان میں تصنیف یا ترجمہ کی گئی ہیں۔

جین مذہب کی اہم کتابوں میں 'جین پوجن سنگرہ' ہے جسے جین مندروں اور جین دھرم کے ماننے والوں کے یہاں صبح و شام عبادت کے طور پر پڑھا جاتا ہے۔ اس پوجن سنگرہ کے کئی ایڈیشن اردو میں شائع ہو چکے ہیں اس میں سو سے زائد پوجن ہیں۔ کہیں انھیں اردو میں ترجمہ کر دیا گیا ہے اور کہیں حاشیے پر مشکل الفاظ کے معنی لکھ دیے گئے ہیں۔ اس میں ہر پوجا ایک عنوان کے تحت درج ہے اور منظوم ہے مثلاً دیو شاستر گرو پوجا' بیس برہمان پوجا' آکر تم چیالیہ کوارکھ' وغیرہ۔

اس کے علاوہ شیو برت لال جی کی دو کتابیں 'اہنسا دھرم' اور 'جین دھرم' کے نام سے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں بہت اچھی اردو نثر میں ہیں۔ ان میں جین دھرم کے بنیادی فلسفے اور اس کے اصولوں کو پیش کیا گیا ہے۔ 'اہنسا دھرم' دگمبر اور سویتامبر جین فرقوں کے قدیم اور مستند و مقدس نوشتہ جات کے مطابق لکھی گئی ہے۔ اس میں بھگوان مہاویر کی پیدائش' حالاتِ زندگی' ۔ یا صفت' پرچار' اندر بھوتی' ذات پات' جیوا جیو' فلسفہ' سمیک درشن' سمیک گیان' سمیک چرتر' معراج اور موکش وغیرہ کے بارے میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

'جین دھرم' میں 'تیر تھنکروں' کا ذکر ہے۔ جینی عقیدے کے مطابق جنھیں ایشور کہتے ہیں۔ یہ تیر تھنکر 'پورن گرو' مرشد کامل اور 'سروگیتہ' یعنی ہر جگہ موجود ہیں۔ مہرشی شیو برت لال جی نے تیر تھنکروں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے اور ان کے لیے مرشد کامل کی مثال دی ہے اور لکھا ہے کہ مرشد کامل میں خدا و رسول دونوں کی ذات پوشیدہ ہوتی ہے اس کے لیے انھوں نے مولانا روم کی شاعری سے مثالیں دے کر اپنی بات کو ثابت کیا ہے مثلاً ایک جگہ تیر تھنکروں کی عظمت اور ان کے اندر ذات خداوندی کا جلوہ ہونے کے سلسلے میں مولانا روم کے یہ دو شعر لکھے ہیں۔

چوں تو کردی ذات مرشد را قبول
ہم خدا در ذاتش آمد ہم رسول

در بشر روپوش کردست آفتاب
فہم کن واللہ عالم بالصواب

(مولانا روم)

اسی طرح لالہ بھولا ناتھ جین نے سلیس نثر و نظم میں 'مرقع عبرت' تحریر کیا ہے یہ کتاب جین مذہبی قصوں اور تاریخ سے ماخوذ ہے اس میں سکمال کمار کا قصہ بیان کیا گیا ہے اس کی کہانی کو نثر اور منی مہاراج اور سکمال کمار کی گفتگو کو نظم میں لکھا گیا ہے۔ نظم کے لیے مسدس کی ہیئت اختیار کی گئی ہے مثلاً منی مہاراج جب سکمال کمار کو خواب غفلت سے بیدار کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے۔

خواب غفلت سے مجھے آکر جگایا آپ نے
بندۂ احساں مجھے اپنا بنایا آپ نے

مطبوعات دارالمصنفین

سیرۃ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ		۸/-
سیرت عائشہ رضی		۱۴/-
حیات شبلی		۳۶/-
امام رازی		۱۶/-
حضرت خواجہ معین الدین چشتی		۱۰/-
حضرت ابوالحسن ہجویری		۱۰/-
مقالات شبلی	اول	۱۰/-
مقالات شبلی	دوم	۵/-
〃	سوم	۷/-
〃	چہارم	۸/-
〃	پنجم	۶/-
〃	ششم	۱۰/-
〃	ہفتم	۵/-
〃 (زیر طبع)	ہشتم	۹/-
خطبات شبلی		۷/-
شعر العجم	حصہ اول	۱۰/-
〃	دوم	۱۱/-
〃	سوم	۸/-
〃	چہارم	۱۲/-
〃	پنجم	۱۰/-
کلیات شبلی اردو		۵/-
مکاتیب شبلی	اول	۱۴/-

مکاتیب شبلی	دوم	۱۱/-
شعر الہند	اول	۲۰/-
〃	دوم	۱۸/-
گل رعنا		۲۲/-
انتخابات شبلی		۹/-
اقبال کامل		۱۶/-
غالب مدح وقدح کی روشنی میں (اول)		۱۸/-
〃 〃	(دوم)	۱۶/-
مقالات عبدالسلام		۱۹/-
صاحب المثنوی (مولفہ قاضی تلمذ حسین صاحب)		۲۱/-
نقوش سلیمانی طبع دوم عکسی		۲۵/-
خیام (سید سلیمان ندوی)		۲۵/-
مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام		۱۲/-
دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات		۲۰/-
دروس الادب مولانا سید سلیمان ندوی (اول)		۱/-
〃 〃	(دوم)	۲/-
ارض القرآن	حصہ اول	۱۳/-
〃	حصہ دوم	۱۰/-
رحمت عالم (مولانا سید سلیمان ندوی)		۳/۲۵

خطبات مدارس (مولانا سید سلیمان ندوی)		۸/-
تعلیم القرآن (مولانا محمد اویس نگرامی)		۸/-
جمع تدوین قرآن	〃	۴/-
الفوز العظیم (مولانا [illegible])		۳/-
خریطۂ جواہر (مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی)		۲/-
صلیبی جنگ (سید صباح الدین عبدالرحمٰن)		۲/-
مقالات سلیمان	جلد دوم	۱۷/-
تذکرہ محدثین	اول	۱۷/-
دین رحمت		۱۰/-
حیات سلیمان		۳۲/-
مقالات سلیمان	حصہ سوم	۱۷/-
تذکرۃ المحدثین	〃 دوم	۱۹/-
عربوں کی جہاز رانی		۹/-
رعایتی قیمت پر کتابیں		
سیرۃ النبی ﷺ حصہ چہارم (تقطیع خورد)		۱۸/-
〃 پنجم	(〃)	۱۰/-
〃 ششم	(〃)	۱۷/-
ایجنسی کی کتابیں		
محمد علی کی ڈائری	حصہ اول	۱۲/-
〃 حصہ دوم (مولانا عبدالماجد دریابادی)		
یادوں کی دنیا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں		۲۱/-
اردو غزل	〃	۳۰-

دارالمصنفین کا ماہنامہ معارف

معارف کی سالانہ قیمت ۲۰ روپے اور فی پرچہ ایک روپیہ ۷۰ پیسے
نمونے کا پرچہ ایک روپیہ ۷۵ پیسے کے ٹکٹ بھیجنے پر روانہ ہوگا۔
رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے اس میں تاخیر نہیں ہوتی
اگر کسی صاحب کے پاس مہینہ کے آخر تک نہ پہنچے۔ دوسرے
مہینے کے پہلے ہفتہ میں اطلاع دے کر منگوالیں۔ ورنہ بعد میں
بہ قیمت بھیجا جائیگا۔

معارف کے پرانے پرچے

معارف کے پرانے پرچے بھی مل سکتے ہیں لیکن [illegible] نہیں ہیں
مستقل خریداروں یا عام شائقین کو جن پرچوں کی ضرورت ہو وہ
کے لیے خط و کتابت کر سکتے ہیں۔

مکتبہ دارالمصنفین اعظم گڑھ

[illegible] N-87

مطبوعات دار المصنفین

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ حصہ اول	۲۶/-	تاریخ صقلیہ (اول) دوم	۱۸/-	عہد مغلیہ مسلمان اور ہندو مؤرخین کی نظر میں	۲۲/-
سیرۃ النبیؐ حصہ دوم	۱۸/-	تاریخ اندلس حصہ اول	۱۹/-	ہندستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں حصہ اول	۱۰/-
〃 〃 سوم	۳۶/-	تاریخ فقہ اسلامی	۱۹/-	اسلامی علوم و فنون ہندستان میں	۲۰/-
〃 〃 چہارم	۳۶/-	اسلام اور عربی تمدن	۱۷/-	ہندستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں حصہ دوم	۸/-
〃 〃 پنجم	۱۰/-	اسلام کا سیاسی نظام	۱۳/-	ہندستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں	۷/-
〃 〃 ششم	۳۶/-	ہماری بادشاہی	۸/-	ہندستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی	
〃 〃 ہفتم	۱۲/-	مقدمات رقعات عالمگیر		رواداری (حصہ اول)	۷/-
خلفائے راشدین	۱۶/-	بزم تیموریہ اول	۲۰/-	بزم تیموریہ دوم	۱۲/-
مہاجرین حصہ اول	۱۸/-	بزم مملوکیہ	۱۴/-	بزم تیموریہ سوم	۱۳/-
〃 〃 دوم	۱۴/-	بزم صوفیہ	۲۵/-		
		ہندستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک	۳۱/-	صوفی امیر خسرو	۸/-
سیر الانصار 〃 اول	۱۷/-	مختصر تاریخ ہند	۸/-	عرب و ہند کے تعلقات	۳۰/-
〃 〃 دوم	۱۳/-	ہندستان کی کہانی	۴/-	مولانا محمد علی کی یادیں	۱۱/-
سیر الصحابہ ششم	۱۳/-	تاریخ سندھ	۱۷/-	برکلے	۴/-
〃 ہفتم	۱۲/-	ہندستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	۲۰/-	مکالمات برکلے	۶/-
سیر الصحابیات	۷/-	ہندستان عربوں کی نظر میں حصہ اول	۱۶/-	فہمِ انسانی	۶/-
اسوۂ صحابہ اول	۱۳/-	〃 〃 〃 حصہ دوم	۱۶/-	مآل و مشیت	۶/-
〃 دوم	۱۶/-	گجرات کی تمدنی تاریخ	۱۳/-	حکمائے اسلام حصہ اول	۲۰/-
تابعین	۲۲/-	ہندستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے	۳۶/-	〃 〃 حصہ دوم	۱۴/-
اہل کتاب صحابہ و تابعین	۷/-	ہندستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے	۱۴/-	طبقات الامم	۶/-
تبع تابعین اول	۱۸/-	ہندستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے		انقلاب الامم	۸/-
اسوۂ صحابیات دوم	۴/-	تعلقات پر ایک نظر	۱۰/-	افکار عصریہ	۱۴/-
تبع تابعین دوم	۲۰/-	مقالات سلیمان حصہ اول (تاریخی)	۱۸/-	الفاروق	۲۰/-
تاریخ اسلام اول	۱۷/-	کشمیر سلاطین کے عہد میں	۱۸/-	الغزالی	
تاریخ اسلام دوم	۱۵/-	ہندستان امیر خسرو کی نظر میں	۶/-	المامون (زیر طبع)	
〃 سوم	۱۸/-				
〃 چہارم	۱۹/-				
تاریخ دولت عثمانیہ اول	۲۰/-				
تاریخ دولت عثمانیہ دوم	۲۰/-				

اس اسیر دام دنیا کو چھڑایا آپ نے
منزل مقصود کا رستہ بتایا آپ نے
آپ ہی کشتی مری ساحل پہ لائیں گے حضور
رحم کر کے میری بگڑی کو بنائیں گے حضور

جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا کہ جین مذہب سے متعلق بہت سی کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں یہاں پر ان ہی چند اہم کتابوں کے نام ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں تاکہ ان کی نوعیت کے بارے میں کچھ اندازہ ہو سکے۔ جین قانون، چمپت رائے جین، جین دھرم و پرماتما، بابو رشبھ داس جین، جین مت سار، لالہ سندر لال جین، موکچھ مارگ پراکاشک، پنڈت ٹوڈرمل جین، جین سماج، لالہ دیپ چند جین، اور اس طرح کی بہت سی کتابیں جین مذہب اور اصولوں سے متعلق اردو میں موجود ہیں۔

بودھ مذہب کی زیادہ کتابیں اردو میں دستیاب نہیں ہو سکیں ممکن ہے کہ جو کتب خانے میرے پیش نظر رہے ان میں بودھ مذہب کی کتابوں کا اچھا ذخیرہ نہ رہا ہو لیکن دوسری کتابوں میں بھی بودھ مذہب کی کتابوں کے حوالے کم نظر آئے۔ بودھ مذہب ہندوستان کا قدیم مذہب ہے اور یہیں سے ساری دنیا میں پھیلا ہے لیکن رفتہ رفتہ خود اس سرزمین پر اس کا اثر کم ہوتا گیا ممکن ہے کہ اردو میں اس کی کتابیں کم ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہو۔

بودھ مذہب بھی دوسرے مذاہب کی طرح کئی فرقوں میں منقسم ہے لیکن گوتم بدھ کے اقوال سے مرتب کیے ہوئے اصولوں کو سب ہی مانتے ہیں جو بودھ مذہب کا سب سے بڑا صحیفہ ہیں یہ بودھ صحیفہ تین حصوں میں ہے پہلا حصہ یا کتاب 'دنے پٹک' کہلاتی ہے جس میں اصول فقہ بیان کیے گئے ہیں اس کا دوسرا حصہ یا کتاب 'سوتا پٹک' ہے جس میں بودھ تعلیمات اور تیسرے حصے 'ابھی دھم پٹک' میں بودھ فلسفے کو پیش کیا گیا ہے۔ عبادت اوامر اور نواہی کے لحاظ سے 'سوتا پٹک' بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسی 'سوتا پٹک' کا ایک حصہ 'دھم پد' کہلاتا ہے جو 'سوتا پٹک' کا پانچواں حصہ ہے جسے سوتا پٹک میں 'کھودک نکائے' یعنی مختصر مجموعے کا نام دیا گیا ہے۔ دھم پد میں ۲۶ باب اور ۴۲۳ اقوال ہیں۔

دھم پد کا اردو میں منظوم ترجمہ بشیشر پرشاد منور لکھنوی نے کیا ہے منور صاحب کو منظوم ترجمہ کرنے کا جو ملکہ حاصل ہے وہ دوسرے شاعروں کے یہاں مشکل سے ملے گا انھوں نے بہت سی مذہبی کتابوں، نظموں اور صحیفوں کے منظوم ترجمے کیے ہیں دھم پد بھی ان کے کامیاب ترجموں میں سے ایک ہے۔ دھم پد میں موت، حیات، جرم سزا، صداقت، غصہ، جھوٹ، سکھ، اور اسی طرح بہت سے موضوعات پر پد ہیں جو دو مصرعوں یا دوہوں کی شکل میں ہیں۔

اردو میں سکھ مذہب کی بھی بہت سی کتابیں ہیں سکھ مذہب میں سب سے زیادہ اہمیت 'گورو گرنتھ صاحب' کو حاصل ہے۔ گرنتھ صاحب ان کا مذہبی صحیفہ ہے جس میں کئی گوروؤں کی بانیاں اور بعض دوسرے بزرگوں کا کلام درج ہے۔ اس میں ۱۴۳۰ صفحات ہوتے ہیں۔ گرنتھ صاحب اردو رسم خط میں بھی ملتا ہے اور اس کا ترجمہ اور تشریح بھی اردو میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ گرنتھ صاحب کے بعض حصوں کے الگ الگ اور ایک سے زائد ترجمے بھی اردو میں ملتے ہیں مثلاً جپ جی جو سری جپ جی صاحب کے نام سے مشہور ہے اس کا منظوم اردو ترجمہ دل محمد صاحب نے بڑی عام فہم اور سلیس زبان میں کیا ہے اس کے علاوہ اس کا ایک ترجمہ 'وردحق' کے نام سے بھی ملتا ہے یہ بھی منظوم ترجمہ ہے اور اسے ماسٹر لال سنگھ آنند خالق نے نظم کیا ہے جس میں ادبی شان بھی ہے۔ مثلاً دو اشلوک ملاحظہ ہوں ؎

حمد میں رطب اللساں انساں ہیں گو بے شمار
ہیں حدود ذکر سے باہر صفات کردگار (پوڑی،
جس نے پیدا کی ہے اپنے حکم سے یہ کائنات
ہر زمانے میں ہے لافانی فقط اس کی ہی ذات

(پوڑی ۲۷)

اس کے علاوہ ڈاکٹر خواجہ عبدالحی صاحب نے صدق صفا کے نام سے سری جپ جی صاحب کا ترجمہ اردو نثر میں کیا ہے اور ڈاکٹر جیت سنگھ سیتل نے 'کلام نانک' کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔

جپ جی صاحب کے علاوہ سکھمنی صاحب یعنی پانچویں گورو، گورو ارجن دیو صاحب کی بانی کا منظوم ترجمہ دل محمد صاحب نے اردو میں کیا ہے۔ گوردبانی محلہ ۹ یعنی گرو تیغ بہادر صاحب کی بانی بھی اردو میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں تمام مشکل اور نامانوس الفاظ کے معنی حاشیے پر درج کر دیے گئے ہیں تاکہ اردو جاننے والوں کو اس کے پڑھنے اور سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ اس کے علاوہ بہت سی کتابیں سکھ مذہب تاریخ اور گورو ؤں کی سوانح سے متعلق اردو میں لکھی گئی ہیں ان میں سے چند اہم کتابوں کے نام درج ذیل ہیں گورونانک مرتبہ گورونانک فاؤنڈیشن، گورو بابا نانک (مضمون) رائے بہادر کنہیا لعل، سوانح عمری گورو گوبند سنگھ، دولت رائے آریہ، انتخاب از سوانح عمری شری گورو گوبند سنگھ جی مہاراج لال دولت رائے۔ سوانح عمری گورو گوبند سنگھ دوارکا پرشاد افق، گورو گوبند سنگھ جی کا دکن کا سفر، ڈاکٹر گنڈا سنگھ صاحبزادوں کا جیون برداں، ڈاکٹر گنڈا سنگھ، سکھوں کے دس گورو، جوالہ دت شرما، تاریخ گورو خالصہ، گیانی گیان سنگھ باباؤں کے اشلوک، رتن سنگھ۔ اس طرح کی اور بھی کتابیں ہیں جو سکھ مذہب کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔

ہندو مذہب کی بے شمار کتابیں اردو میں موجود ہیں اور جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے کہ ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان پر ایک الگ مضمون کی ضرورت تھی اس لیے کہ ہندو مذہب سے متعلق شاید ہی ایسی کوئی کتاب ہو جس کا اردو ترجمہ نہ ہوا ہو۔ مذہبی صحیفوں کے علاوہ مذہبی رہنماؤں بزرگوں اور سنتوں کے اقوال اور تعلیمات سے متعلق کتابوں کے ترجمے بھی وافر تعداد میں ملتے ہیں۔

ہندو مذہب میں سب سے زیادہ اہمیت شریمد بھگوت گیتا کی ہے۔ جو نہ صرف ہندو مذہب کے پورے فلسفے کو پیش کرتی ہے بلکہ انسانی زندگی، اعمال، جزا و سزا وغیرہ کا بھی احاطہ کر لیتی ہے۔ گیتا کے ترجمے اور تفسیریں دنیا کی بیشتر زبانوں میں مل جاتی ہیں لیکن اردو میں اس کے ترجمے جس تعداد میں ملتے ہیں اتنے شاید کسی دوسری زبان میں نہ ہوں یہ ترجمے نظم و نثر دونوں میں ہیں اور ان ترجموں کے کرنے والوں میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ بھگوت گیتا کے جن ترجموں کی اب تک نشاندہی ہو چکی ہے ان کی تعداد ۲۹ ہے جس میں ۱۳ نثری ترجمے ہیں اور ۱۶ منظوم ہیں۔ ان میں چار ترجمے مسلمان مترجمین کے کیے ہوئے ہیں مثلاً دل کی گیتا ترجمہ دل محمد، بھگوت گیتا ترجمہ خلیفہ عبدالحکیم شری مد بھگوت گیتا ترجمہ حسن الدین احمد، بھگوت گیتا یا نغمۂ خداوندی ترجمہ محمد اجمل خاں۔

بھگوت گیتا کا سب سے قدیم اردو ترجمہ منشی کنہیا لال عرف الکھ دھاری کا بتایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جو ترجمے ملتے ہیں ان میں چند اہم ترجموں کے نام درج ذیل ہے۔ بھگوت گیتا منشی شیام سندر لال، بھگوت گیتا منشی دیوی پرشاد سرور، بھگوت گیتا مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور، شریمد بھگوت گیتا موسوم بہ فلسفۂ الوہیت رائے بہادر پنڈت جانکی ناتھ مدن سرچشمۂ عرفان منشی جگناتھ پرشاد عارف شریمد بھگوت گیتا رہسیہ لوکمانیہ بال گنگادھر تلک۔ شریمد بھگوت گیتا، شانتی نرائن گیتا امرت معروف بہ اکسیر روح چودھری روشن لال گیتا گیان معروف بہ روح معرفت چودھری روشن لال گیان پرکاش معروف بہ نور ہدایت چودھری۔ روشن لال بھگوت گیتا (جس ترجمے کا ذکر گارساں دتاسی نے کیا ہے)، شریمد بھگوت گیتا، دوارکا پرشاد افق، بھگوت گیتا مخزن اسرار پنڈت دینا ناتھ مدن، شریمد بھگوت گیتا معروف بہ غذائے روح پنڈت پربھو دیال عصر اعاشق لکھنوی، بھگوت گیتا منظوم موسومہ بہ نسیم عرفان منشی بشیشر پرشاد نور لکھنوی، فلسفۂ گیتا سورج نرائن مہر دہلوی اس کے علاوہ منشی رام سہائے تمنا، ستیہ پرکاش مہتاب پسروری، لچھمن پرشاد صدر لکھنوی (فیضی کی گیتا کا ترجمہ) الم مظفر نگری، رائے بہادر شنکر دیال جج لکھنؤ، رائے برج موہن دیال احقر لکھنوی اور خوشتر وغیرہ نے بھی گیتا کے منظوم ترجمے کیے۔ خوشتر کا ترجمہ مثنوی کی ہیئت میں اور احقر لکھنوی اور رائے بہادر شنکر دیال کے ترجمے مسدس میں ہیں۔ ان تراجم سے مثالیں دینی بہت مشکل ہیں پھر بھی بعض مثالیں صرف

ترجمے کی خوبیوں کا اندازہ کرنے کے لیے درج ذیل ہیں۔
دوسرے ادھیائے کے ۴۷ ویں اشلوک کا ترجمہ دل محمد صاحب نے اس طرح کیا ہے۔

تجھے کام کرنا ہے اور مرد کار
نہیں اس کے پھل پر تجھے اختیار
کیے جا عمل اور نہ ڈھونڈ اس کا پھل
عمل کر عمل کر نہ ہو بے عمل

ساتویں ادھیائے کے ساتویں اشلوک کا ترجمہ منور لکھنوی اس طرح کرتے ہیں۔

یہ امر ہے طے شدہ دھننجے
مجھ سے بڑھ کر نہیں کوئی شے
کچھ بھی میرے سوا نہیں ہے
میں ایک ہوں دوسرا نہیں ہے

راماین بھی اسی طرح ہندو مذہب کی ایک بہت اہم کتاب ہے اس کے دو متن بالمیکی راماین اور تلسی راماین کی شکل میں ملتے ہیں ان دونوں کے ترجمے اردو میں موجود ہیں جن کی تعداد تقریباً ۱۲ ہے۔ راماین بالمیکی، منور لکھنوی، راماین بھاکھا تلسی داس، ستیارام جیورے بھائی۔ راماین اردو نثر، بہاری لال، راماین منظوم، خوشتر، راماین تلسی کرت، فرحت، راماین یک قافیہ دوارکا پرشاد افق، راماین منظوم دوارکا پرشاد افق، راماین مسدس افق، راماین رادھے شیام، راماین مسدس تمنا راماین کا ایک سین چکبست اور اس طرح راماین کے کئی اور اردو ترجمے مسدس اور مثنوی کی ہیئتوں میں ملتے ہیں ان میں سے بعض ترجموں کے تین تین چار چار ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

ہندو مذہب کی ایک اور اہم کتاب مہابھارت کے بھی اردو میں بہت سے ترجمے مل جاتے ہیں ان میں چند اہم ترجموں کے نام حسب ذیل ہیں مہابھارت (بطرز ناول)، سکھ دیو سنگھ شوق۔ سری رام کرت مہابھارت منشی سری رام ماتھر (جہازی سائز کی تین جلدوں میں)، مہابھارت سبھا پرب، جوالہ پرشاد بھارگوا، مہابھارت گدا پرب جوالہ پرشاد بھارگوا، مہابھارت مثنوی طوطا رام شایاں یہ مہابھارت فیضی کی مہابھارت سے ماخوذ ہے شایاں نے ۱۸۳۶ء میں یہ ترجمہ کیا اس میں تقریباً دس ہزار اشعار ہیں۔ مہابھارت دوارکا پرشاد افق۔

اس کے علاوہ بے شمار کتابیں ہندو مذہب سے متعلق اردو میں لکھی گئی ہیں جن میں بعض اہم کتابیں یہ ہیں۔ سری کرشن جی کی کرامتوں سے متعلق لچھمن پرشاد صدر کی بے نقط مثنوی سدا ما چرا اہم ہے جس میں ۱۰۰۱ بے نقط اشعار ہیں۔ منور لکھنوی نے درگا سپت ستی، کمار سمبھو، سوامی چیتن آنند جی، وویک منی، اور مہرشی سوامی دیانند سرسوتی کی تعلیمات پر مبنی 'آریہ ابھی ونے' کا منظوم ترجمہ کیا۔ دوارکا پرشاد افق نے رام پدا ستت، رام استت، کرشن استت، دیوی استت، اور بہت سی استتیاں اور مہا دیو چالیسا وغیرہ کا منظوم ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے درگا درشن، بجرنگ ونے، کرشن سداما، رام نام مالا، سناتن دھرم اپدیش وغیرہ نام کی کتابیں نظمیں اور رسالے تحریر کیے۔

متذکرہ کتابوں کے علاوہ ہندو مذہب اور اس کے بارے میں بے شمار کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں یہاں ان حوالوں اور ناموں کے ذکر کرنے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ اس بیش بہا خزانے کا کچھ اندازہ لگایا جا سکے جو مختلف مذاہب کے بارے اردو میں موجود ہے اس جائزے کے پیش نظر میرے خیال میں کہنا غلط نہ ہو گا کہ ہندوستان کی تہذیبی رنگا رنگی مذہب کی بوقلمونی، انسان دوستی، رواداری اور یکجہتی کی تصویر اردو زبان میں نظر آتی ہے کسی دوسری زبان میں نہیں ملتی۔

ڈاکٹر مظفر حنفی



آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کے ادبی و علمی رسائل

۱۹۴۷ء سے [illegible] پاس غیر منقسم ہندوستان میں جن ادبی رسائل کی اہمیت مسلمہ تھی ان میں بیشتر لاہور یا ان شہروں سے نکلتے تھے جو [illegible] پاکستان کے حصے میں آئے۔ [illegible] رسائل میں ادبی دنیا، [illegible] خیال، ادب لطیف، "سویرا"، "نقوش"، "عالمگیر"، "ہمایوں" وغیرہ شامل تھے۔ آزادی ہند کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں سے نکلنے والے قدیم ادبی رسائل میں "ساقی" (دہلی)، "نگار" (لکھنؤ)، "شاعر" [illegible]، "افکار" (بھوپال) وغیرہ [illegible] ایسے تھے جنھیں اردو کے ادبی دنیا [illegible] کیونکہ [illegible] "شاہراہ" (دہلی) [illegible] کا "مصور" (بمبئی)، سردار جعفری کا "نیا ادب" (بمبئی)، کوثر چاندپوری کا "جادہ" (بھوپال) حالات کی ناسازگاری کے باعث دم توڑ چکے تھے۔ دو ایک سال بعد ہی شاہد احمد دہلوی "ساقی" کو کراچی لے گئے۔ چونکہ ادب جغرافیائی سرحدوں کا پابند نہیں ہوا کرتا اس لیے سرحد کے دونوں طرف بسنے والے قلمکاروں کی تخلیقات عام طور پر ہند و پاک کے ادبی رسائل میں بیک وقت شائع ہوتی رہیں۔ اردو رسائل کے اس جائزے میں صرف ان پرچوں کا ذکر شامل ہے جو ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں جاری ہوئے۔ اور ان میں بھی ڈائجسٹ مذہبی، فلمی اور جاسوسی رسالوں کو عام طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ موضوع سے خارج ہیں۔ سہولت کی غرض سے اس جائزے کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک، دوسرا دور ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۰ء تک اور تیسرا دور ۱۹۷۱ء سے تاحال پھیلا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلے دور میں وہ رسائل بھی شامل ہوں گے جو آزادی ہند سے قبل جاری ہوئے تھے اور بعد میں بھی ان کا سلسلۂ اشاعت منقطع نہیں ہوا۔

"نگار" (لکھنؤ): نیاز فتح پوری کی ادارت میں بھوپال آگرہ اور بعد ازاں لکھنؤ سے شائع ہوتا رہا۔ علمی و ادبی پرچوں میں اعلا ترین معیار کا حامل تھا اور اپنے تنقیدی مضامین کے علاوہ مذہبی روشن خیالی اور موضوعات کے تنوع کی بنا پر ایک بڑے حلقے میں مقبول تھا۔ نیاز فتحپوری نے اس رسالے کے کئی خاص نمبر اس پایے کے نکالے کہ آج تک انھیں ادبی دستاویزات کی سی حیثیت حاصل ہے۔ آزادی کے دس بارہ سال بعد نیاز پاکستان چلے گئے۔ جہاں یہ "نگار پاکستان" کے نام سے کراچی سے تاحال شائع ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اس کے چند شمارے اکبر علی خاں کی ادارت میں رامپور سے شائع ہوئے۔ پھر کئی سال کے التوا کے بعد [illegible] مہمند نے اسے از سر نو دہلی سے شائع کیا لیکن اس وقت تک اس کی ماہیت تبدیل ہو چکی تھی۔ اور اسے عوامی دلچسپی کی حامل تخلیقات سے مزین کر کے تصویروں کے ساتھ خوبصورت گٹ اپ میں شائع کیا جاتا تھا۔ آج کل اس کی ادارت ک۔ع۔ مہمند اور مخمور سعیدی نے سنبھال رکھی ہے۔

"ساقی" (دہلی): شاہد احمد دہلوی کا مشہور ادبی رسالہ جس نے اردو کو کرشن چندر اور کئی دوسرے اہم لکھنے والوں سے پہلی بار روشناس کرایا اس کے لکھنے والوں میں ترقی پسندوں کی کثرت تھی۔ آزادی کے دو ایک سال بعد ہی شاہد احمد اسے کراچی لے گئے۔

"افکار" (بھوپال): صہبا لکھنوی کی ادارت میں نکلتا تھا اور ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کے آرگن کا فریضہ انجام دیتا تھا۔ بھوپال میں منعقدہ انجمن ترقی پسند

مصنفین کی پہلی کانفرنس سے متعلق اس کا خاص نمبر بڑی اہمیت کا حامل ہے چار پانچ سال بعد صہبا لکھنوی اسے بھی کراچی لے گئے۔

"شاہراہ" (دہلی) : مختلف اوقات میں پرکاش پنڈت، ظ۔ انصاری، ساحر لدھیانوی، مخمور جالندھری، نشتر خانقاہی وغیرہ کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ ترقی پسند تحریک کی ترویج و ترقی میں اس رسالے کا کردار بہت اہم ہے۔ اس کی خصوصی اشاعتوں میں "ناولٹ نمبر" بطور خاص قابل ذکر ہے۔ تحریک کے زوال کے ساتھ ساتھ یہ بھی رو بہ انحطاط ہوتا گیا اور ۱۹۶۰ء کے قریب اس کی اشاعت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"ساحل" (بھساول) : اس کے مدیر مزاح نگار شاعر قمر بھساولی ہوا کرتے تھے۔ یہ بھی ترقی پسندوں کا ترجمان تھا۔ ۱۹۴۸ء کے قریب مرحوم ہو گیا۔

"شاعر" (بمبئی) : مختلف ادوار میں سیماب اکبر آبادی، اعجاز صدیقی، تاجدار احتشام وغیرہ کی ادارت میں آگرہ اور بمبئی سے نکلتا رہا تاحال جاری ہے اور اب اس کی ادارت افتخار امام صدیقی کے سپرد ہے۔ اپنے معیاری مضامین اور اعلا تخلیقات کیلئے مشہور ہے۔ اس کی خصوصی اشاعتوں میں "کرشن چندر نمبر" "ہمعصر ادب نمبر" "قومی یک جہتی نمبر" اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے خاصے وقیع سمجھے جاتے ہیں۔ مختلف فنکاروں پر خصوصی گوشے شائع کرنا اس کا امتیاز ہے۔

"آجکل" (دہلی) : سرکاری رسالہ ہے مختلف ادوار میں اس کی ادارت کے فرائض جوش ملیح آبادی، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، شہباز حسین وغیرہ نے انجام دیے، موجودہ مدیر راج نرائن راز ہیں۔ اس پرچے نے بھی کئی اہم خاص نمبر نکالے ہیں۔

"سب رس" (حیدر آباد) : مختلف ادوار میں محی الدین قادری زور، اکبر الدین صدیقی، مغنی تبسم، وقار خلیل وغیرہ کی ادارت میں شائع ہوتا رہا ہے۔ دکنیات اس رسالے کا خاص موضوع ہے اور اپنے تحقیقی مقالات کیلئے مشہور ہے۔ تاحال جاری ہے۔

"بیسویں صدی" (دہلی) : خوشتر گرامی پہلے لاہور سے نکالا کرتے تھے۔ بعد ازاں دہلی منتقل ہو گئے۔ غالباً ہندستان میں سب سے زیادہ باقاعدگی کے ساتھ نکلنے والا اور سب سے زیادہ کثیر الاشاعت ادبی ماہنامہ ہے۔ ہلکی پھلکی تخلیقات کے باعث عوام میں بیحد مقبول ہے۔ آج کل اس کے مدیر رحمٰن نیر ہیں جو اسی ادارے سے ایک فلمی پرچہ "روبی" بھی نکالتے ہیں۔

"چندن" (کانپور) : نریش کمار شاد اور ساحر ہوشیارپوری اس کے مدیران تھے اور اپنے زمانے کا وقیع ادبی رسالہ تھا۔ سال دو سال ہی زندہ رہ سکا۔ کچھ عرصے بعد وشو ناتھ درد نے دہلی سے اس کا احیا کیا لیکن زیادہ دنوں تک وہ بھی نہ چلا سکے۔

"صبا" (حیدر آباد) : مشہور شاعر سلیمان اریب کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اور ترقی پسند تحریک کا آرگن تھا۔ اس کے خاص نمبروں میں "مخدوم محی الدین نمبر" اپنی اہمیت کے اعتبار سے یاد رکھا جائیگا ۱۹۶۹ء کے آس پاس سلیمان اریب کے انتقال کے بعد یہ بھی مرحوم ہو گیا۔

"نئے چراغ" (کھنڈوہ) : مظفر حنفی مدیر اعلا حسن رضا، حسن بشیر، قاضی انصار اور حباب ہاشمی نائب مدیر تھے۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۰ء تک ہی جاری رہ سکا۔ اپنے دور کے تمام اہم فنکاروں کی تخلیقات ہر نظریاتی حد بندی سے بالاتر رہ کر شائع کرتا تھا۔

"تحریک" (دہلی) : گوپال متل، مخمور سعیدی اور پریم گوپال متل کی ادارت میں کم و بیش تیس سال نکلتا رہا اور حال ہی میں اس کا سلسلۂ اشاعت منقطع کر دیا گیا ہے اس کی مجلس ادارت میں کچھ دنوں تک تمکین کاظمی بھی شامل رہے۔ ترقی پسند تحریک کے عہد شباب میں یہ ہندستان کا واحد رسالہ تھا جو تصویر کے دوسرے رخ کی نمائندگی کرتا رہا۔ اس کے "بیس سالہ ادب نمبر" اور "پچیس سالہ ادب نمبر" بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

"تعمیر" (پٹنہ) : سہیل عظیم آبادی نکالتے تھے۔ اس میں ادبی تخلیقات کے علاوہ مختلف فنون لطیفہ اور تہذیب و ثقافت سے متعلق مضامین کو بھی سلیقے سے شائع کیا جاتا تھا۔ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا۔

"جامعہ" (دہلی) : ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب، ضیاء الحسن فاروقی، مسعود حسین خاں اس کے مدیران ہیں اور عبد اللطیف اعظمی مدیر معاون۔ اس میں بیشتر لکھنے والے

جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ میں سے ہیں. مختلف علوم سے متعلق مضامین کو اس پرچے میں جگہ ملتی ہے. تاحال جاری ہے.

"نکہت" (الٰہ آباد): عباس حسینی اس کے مدیر تھے اور اپنی ہلکی پھلکی تخلیقات کی وجہ سے عوام میں خاصا مقبول تھا. آگے چل کر اسے جاسوسی پرچہ بنا دیا گیا.

"پگڈنڈی" (امرتسر): امریک آنند کی ادارت میں پندرہ بیس سال تک شائع ہوتا رہا. تلوک چند محروم اور منٹو پر گرانڈیل خاص نمبر شائع کیے.

"صبحِ نو" (پٹنہ): وفا ملک پوری کی ادارت میں پچیس تیس سال تک نکلتا رہا. آخری دور میں مدیر معاون کی حیثیت سے علیم اللہ حالی بھی اس کی مجلس ادارت میں شامل ہو گئے تھے. بہار کے مقبول عام پرچوں میں سے ایک تھا.

"کردار" (بھوپال): ۱۹۵۳ء میں نفتی صدیقی نے جاری کیا. تقریباً تین سال تک زندہ رہا. اس کا خاص نمبر اس دور میں بہت مقبول ہوا تھا.

"سوغات" (بنگلور): محمود ایاز کا پرچہ تھا. پہلے دور میں اس کے آٹھ دس شمارے نہایت سلیقے کے ساتھ نکلے. گرما گرم مباحث اس کے صفحات پر جگہ پاتے رہے. حلقۂ اربابِ ذوق اور ترقی پسند تحریک سے متعلق تمام اہم فنکار اس کے لیے لکھتے تھے. "سوغات" کا جدید نظم نمبر آج بھی ایک اہم ادبی دستاویز سمجھا جاتا ہے. آٹھ دس سال کے وقفے کے بعد محمود ایاز نے اس کے چھ سات شمارے اور بھی شائع کیے جن میں جدیدیت اور ترقی پسندی سے متعلق کافی فکر انگیز تحریریں شائع ہوئیں.

"نئی نسلیں" (لکھنؤ): اس کی مجلس ادارت میں م. نسیم، انور صدیقی، شبنم سبحانی وغیرہ شامل تھے. اردو میں اسلامی ادب کے اس رجحان کا نمائندہ تھا جس کی سربراہی کراچی سے ماہر القادری "فاران" کے ذریعے کر رہے تھے. پانچ سات برس ہی جاری رہ سکا. حال ہی میں دہلی سے "نمائندہ نئی نسلیں" کے نام سے دوبارہ اس کا اجرا ہوا ہے.

"معیار" (میرٹھ): ابوالمجاہد زاہد ایڈٹ کرتے تھے. یہ بھی اسلامی ادب کی ترجمانی کرنے کی کوشش کرتا تھا. سال دو سال کے بعد کساد بازاری کا شکار ہو گیا.

"خیال" (کامٹی): اس کی ادارت فیض انصاری کے سپرد تھی. آخری دور میں زبیر رضوی اور محمود ہاشمی بھی اس کی مجلس ادارت میں شامل ہو گئے تھے. اس نے ہندوستان میں اردو رائٹرس گلڈ کے قیام کی کوشش کی تھی.

"محور" (دہلی): نرنید نشچل کا دو ماہی رسالہ تھا جس کے دس بارہ شمارے ہی شائع ہو سکے. اس پر جدیدیت کا رنگ غالب تھا. محمود ہاشمی بھی اس کی مجلس ادارت میں شامل تھے.

"نگارش" (امرتسر): مہندر باوا کی ادارت میں نکلتا تھا. اس پرچے نے بھی کئی ضخیم خاص نمبر شائع کر کے اپنی اہمیت تسلیم کرا لی تھی. ان میں "ناولٹ نمبر" بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے.

"شاہکار" (الٰہ آباد): محمود احمد ہنر اس پرچے میں ہند و پاک کے تمام ادبی رسائل کی بہترین تخلیقات کا انتخاب شائع کیا کرتے تھے. کم و بیش پچیس سال تک باقاعدگی سے نکلتا رہا اور ہنر کی وفات کے ساتھ یہ بھی مر گیا. اس کے "فراق نمبر" اور "احتشام حسین نمبر" خصوصی اہمیت کے حامل ہیں. دو ایک سال تک یہ بنارس سے بھی نکلا.

مندرجہ بالا پرچوں کے علاوہ پہلے دور کے رسائل میں کلکتہ کا "معاون" (مظہر امام)، جالندھر کا "راہی" (بلدیو متر بجلی)، بریلی کا "آواز" (ماجد ادیب)، لکھنؤ کا "فروغِ اردو"، دہلی کا "فنکار" (پرکاش پنڈت)، ناگپور کا "نباض" (شارق نیازی)، کلکتہ کا "فانوس" (ڈائجسٹ)، بمبئی کا "نوارت" (نازش پرتاپگڈھی اور طرفہ قریشی)، علی گڑھ کا "ادیب" اور "درس" (قمر رئیس)، لکھنؤ کا "نیا دور" (خورشید احمد)، دہلی کا "شعلہ و شبنم" (امل جین)، گیا کا "سہیل" (ادریس سنبھاروی)، کلکتہ کا "عکاس" (نعیم الحق)، کانپور کا "شاہد" (ن۔ پرویز)، الٰہ آباد کا "ماہِ سرور" (گوری شنکر اختر)، الٰہ آباد کا "پروین" (بدر الٰہ آبادی)، دہلی کا "نورِ جہاں" (دشو ناتھ درد)، دہلی کا "نشانِ ہند" (سرور تونسوی)، دہلی کا "انیسِ ادب" (کبیر کوثر)، پٹنہ کا "مبصر" (قاضی عبدالودود)، دہلی کا "آریہ ورت" (اظہار اثر)، دہلی کا "جمالستان" (شہزادہ تبسم) وغیرہ بھی اس لائق ہیں کہ مضمون میں جگہ پائیں. دو اور ماہنامے

"مستانہ جوگی" اور "رہنمائے تعلیم" اسی دور میں دہلی سے نکلا کرتے تھے جن میں سے اول الذکر ابھی زندہ ہے۔ مذہبی نوعیت کے پرچوں میں لکھنؤ کے "الفرقان" (منظور نعمانی) دہلی کے "برہان" (سعید احمد اکبر آبادی) اور اعظم گڑھ کے "معارف" (صباح الدین عبدالرحمن) کا تذکرہ بھی لازمی ہے کیونکہ ان پرچوں میں کچھ تحقیقی اور علمی مضامین بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ خواتین کے لیے بھی اس دور میں کچھ ایسے پرچے نکلتے رہے جن کا ذکر ناگزیر ہے۔ ان میں دہلی کا "خاتون مشرق" (مستحسن فاروقی) ناگپور کا "کرن" (شفیقہ فرحت) لکھنؤ کا "حریم" (نسیم انہونوی) اور دہلی کا "بانو" (زینب دہلوی) شامل ہیں آخر الذکر پرچہ اب "شمع" کے ادارے سے زینت کوثر دہلوی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب دہلی سے ہفت روزہ پرچہ "آئینہ" بڑے طمطراق سے شائع ہوا تھا اس کے نقاب پوش اڈیٹر ظ۔ انصاری تھے جنھوں نے کئی سال بعد یہی پرچہ کھلے عام بمبئی سے بھی چند ماہ تک نکالا۔ تکمیل گفتگو کیلیے ڈاکٹر عابد حسین کے ہفتہ وار "روشنی" (دہلی) اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے ترجمان "ہماری زبان" کا نام بھی لیا جانا چاہیے جو مختلف اوقات میں آل احمد سرور، پروفیسر مسعود حسین خاں اور خلیق انجم کی ادارت میں علی گڑھ اور بعد ازاں دہلی سے شائع ہوتا رہا اور بفضلہ ابھی جاری ہے اسی ادارے سے سہ ماہی جریدہ "اردو ادب" بھی شائع ہوتا رہا ہے جس نے کئی اہم خاص نمبر نکالے ہیں۔ اپنے تحقیقی اور لسانیاتی مضامین کی اہمیت کے پیش نظر انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (بمبئی) کا ترجمان "نوائے ادب" (نظام الدین گوریکر) اور ہندستانی پرچار سبھا (بمبئی) کا "ہندستانی زبان" (عبدالستار دلوی) بھی ناقابل فراموش ہیں۔

دوسرا دور وہ ہے جب اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کم و بیش زوال آشنا ہو چکی تھی اور ہمارے ادب میں جدیدیت کا رجحان سر ابھارنے لگا تھا۔ ان کے اسباب کی تفصیل میں جائے بغیر یہاں صرف ایسے رسائل کا مختصر تذکرہ کر دینا برمحل ہوگا جو بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں منظر عام پر آئے۔

"شب خون" (الہ آباد) : ۱۹۶۳ء کے لگ بھگ ڈاکٹر اعجاز حسین کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا لیکن چھ سات شماروں کے بعد ہی اعجاز صاحب اس کی ادارت سے دستکش ہو گئے اور بعد ازاں بحیثیت مدیر پرچے پر مختلف لوگوں کے نام شائع ہوتے رہے لیکن دراصل از ابتدا تا حال اس کی ترتیب و تہذیب میں شمس الرحمان فاروقی کا ہاتھ رہا ہے۔ ہندستان میں جدیدیت کو فروغ دینے کا سہرا اسی رسالے کے سر بندھتا ہے۔ مختلف اوقات میں ترقی پسندوں سے جدیدیوں کی جنگیں "شب خون" کے صفحات پر ہی لڑی گئیں۔ پانچ سات سال تک باقاعدگی سے شائع ہونے کے بعد یہ اہم رسالہ بے قاعدگی کا شکار ہو گیا اور اب کہیں تین چار ماہ بعد اس کے دیدار ہوتے ہیں۔ آج کے کئی اہم نئے قلمکاروں کی بلند قامتی اسی جریدے کی مرہون منت ہے۔

"سنگم" (جموں) : اپنے زمانے کے مشہور افسانہ نگار موہن یاور اس کے اڈیٹر تھے۔ اور ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ ۱۹۶۳ء کے آس پاس اس کا سلسلۂ اشاعت منقطع ہو گیا۔

"تخلیق" (دہلی) : وشوناتھ درد نکالتے تھے بعد ازاں دت بھارتی کے نام سے نکلتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی مجلس ادارت میں بانی بھی شامل تھے۔ خاصی ضخامت کے باوجود اس کی قیمت صرف چار آنے رکھی گئی تھی۔ اس پرچے کا "نئی تخلیق نمبر" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

"تلاش" (دہلی) : وشوناتھ درد نے اس پرچے کے چودہ پندرہ شمارے بڑے اہتمام سے شائع کیے۔ ۱۹۶۲ء کے آس پاس بند ہو گیا نئے لکھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ اس کے ساتھ تھا۔ اس کا خاص نمبر بہت پسند کیا گیا تھا۔

"کتاب" (لکھنؤ) : عابد سہیل نے جاری کیا تھا اس پرچے نے ترقی پسندی اور جدیدیت کی آویزش کو کم کرنے کا قابل قدر کارنامہ انجام دیا۔ اس دور میں جب ان دونوں رجحانات کو ایک دوسرے کا مخالف سمجھا جاتا تھا "کتاب" کے صفحات دونوں کے لیے فراخدلی کے ساتھ کھلے تھے اس کی خصوصی اشاعتوں میں افسانہ نمبر اور سالنامے لائق ذکر ہیں۔ افسوس کہ سو شمارے نکال کر عابد سہیل کی ہمت جواب دے گئی۔ بہرحال اس پرچے نے ادبی تاریخ کے ایک خاص موڑ پر بیحد اہم کردار ادا کیا ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

"شاخسار" (کٹک) : بزرگ شاعر امجد نجمی اور ان کے شاگرد کرامت علی کرامت نکالتے تھے۔ یہ دو ماہی رسالہ تھا اور خاصا ضخیم

ہوا کرتا تھا۔ اس رسالے میں بھی قدیم و جدید کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ ساتویں دہائی کے نصف آخر میں یہ پرچہ بھی دم توڑ گیا۔ اس میں شائع ہونے والے جدیدیت سے متعلق کچھ مضامین آج بھی حوالے کا کام دیتے ہیں۔

"اقدار" (پٹنہ): مظفر ژنگانوی نے جاری کیا اور چار پانچ شمارے چھاپنے کے بعد اسے اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے جہاں اس کے چند اور شمارے منظر عام پر آئے۔ خوبصورت اور معیاری رسالہ تھا جس میں جدیدیت کی حمایت بڑے جوش و خروش کے ساتھ کی جاتی تھی۔

"مزاج" (بھوپال): ابتداً اس رسالے کے مدیران میں عیسیٰ صدیقی، شمیم احمد اور فضل تابش جیسے ترقی پسند شامل تھے لیکن یہ رسالہ بھی انتہا پسندی کے ساتھ جدیدیت کی پشت پناہی کرتا رہا۔ مدھیہ پردیش کے صف اول کے معیاری جریدوں میں اسے شمار کیا جاتا تھا۔ افسوس کہ سات آٹھ شماروں کے بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

"گفتگو" (بمبئی): سردار جعفری اس کے ایڈیٹر ہیں ظاہر ہے کہ اسے ترقی پسند تحریک کا مبلغ ہونا چاہیے اس کے باوجود "گفتگو" کے صفحات کچھ جدید فنکاروں کے لیے بھی کھلے رکھے گئے ہیں پندرہ بیس سال کی مدت میں اس کے بمشکل پندرہ سولہ ہی شمارے منظر عام پر آئے ہیں۔ اس رسالے میں بھی ترقی پسندی اور جدیدیت سے متعلق گرماگرم بحثیں اور مضامین شائع ہوئے۔ حال ہی میں اس کا "غزل نمبر" منظر عام پر آیا ہے جو خاصا ضخیم اور وقیع ہے۔

"آہنگ" (گیا): پہلے اس کی ادارت کلام حیدری کے سپرد تھی آج کل نوشابہ حق ترتیب دیتی ہیں۔ اس میں بھی ہردو رجحانات رکھنے والے قلمکاروں کی تخلیقات شائع کی جاتی ہیں اور غالباً ضخامت کی مناسبت سے یہ ادبی رسائل میں سب سے سستا پرچہ ہے۔ حال ہی میں اس کا "فکشن نمبر" تب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ اس کی خصوصی اشاعتوں میں "احتشام حسین نمبر" بھی لائق ذکر ہے۔

"مریخ" (پٹنہ): پروفیسر عبدالمغنی نکالتے تھے چند ہی شمارے منظر عام پر آ سکے۔ یہ پرچہ جدیدیت کا کٹر دشمن تھا اور اس رجحان کے خلاف اپنے مضامین کیلیے یاد رکھا جائے گا۔

"شب رنگ" (الہ آباد): ڈاکٹر عقیل رضوی ترتیب دیتے تھے دو چار شمارے ہی شائع ہوئے لیکن گٹ اپ اور معیاری مضامین کی وجہ سے اب تک یاد کیے جاتے ہیں۔ اس رسالے نے بھی جدیدیت کے طوفان کا سامنا کرنے کی بھرسک کوشش کی۔

"سریتا" (دہلی): مشہور ہندی رسالے "سریتا" کا اردو روپ تھا جو چند سال جاری رہ کر بند ہو گیا اس کی ادارت وشوناتھ کے سپرد تھی۔ عام دلچسپی کی حامل کہانیاں اور شعری تخلیقات اس میں شائع ہوتی تھیں اس پرچے نے خاتون تخلیق کاروں سے متعلق ایک اچھا خاص نمبر بھی نکالا تھا۔

"شیرازہ" (سرینگر): جموں و کشمیر کی آرٹ اور کلچرل اکیڈمی کا سارہ ہے جس کی ترتیب و تدوین محمد یوسف ٹینگ کرتے ہیں ہر نوع کی تخلیقات اور ادبی و ثقافتی مضامین اس میں جگہ پاتے ہیں خصوصاً کشمیر کی تہذیب اور وہاں کے فنکاروں کے بارے میں مضامین اس کی انفرادیت متعین کرتے ہیں

"پونم" (حیدر آباد): زیر تصرہ دہائی کے نصف اول میں ناصر کرنولی کی ... میں جاری ہوا تھا اس رسالے کے صفحات پر بھی ترقی پسندوں اور جدید لکھنے والوں کے مابین خاصی خیال انگیز بحثیں چھڑیں۔ خاصا خوبصورت جریدہ تھا افسوس کہ زیادہ دن جاری نہ رہ سکا۔

"افسانہ" (الہ آباد): مشہور کہانی کار بلونت سنگھ نکالتے تھے غالباً پندرہ بیس شمارے ہی منظر عام پر آئے۔ لیکن جیسا نام سے ظاہر ہے اس پرچے میں صرف افسانے ہی جگہ پاتے تھے۔ لیکن اس دور کے نقریباً سبھی بہترین افسانہ نگار اس کے لکھنے والوں میں شریک تھے۔

"تحریر" (دہلی): مشہور محقق [illegible]
جو ابھی چند سال پہلے [illegible]
تنقیدی مضامین شامل [illegible]
کہ متعلقہ سہ ماہی میں انتقال [illegible] کے بعد
میں "وفیات" کے تحت مالک رام تفصیل سے اظہار خیال کیا کرتے تھے۔

"خاتونِ دکن" (حیدر آباد): صلاح الدین نیّر اس کے ایڈیٹر تھے ہلکا پھلکا ادبی پرچہ تھا اور عوام میں خاصا مقبول رہا دس بارہ سال جاری رہ کر کساد بازاری کا شکار ہوا۔

"شگوفہ" (حیدر آباد): مصطفیٰ کمال کی ادارت میں اب تک نکل رہا ہے پہلے ڈیڑھ ماہی تھا اب ماہنامہ ہوگیا ہے ہندوستان کا واحد ایسا جریدہ ہے جس میں صرف طنز و مزاح نگاروں کو جگہ ملتی ہے۔

"عصری ادب" (دہلی): یہ سہ ماہی رسالہ ڈاکٹر محمد حسن ترتیب دیتے ہیں اور بے قاعدگی کے ساتھ ہی سہی، پچھلے تقریباً بارہ تیرہ سال سے نکل رہا ہے ترقی پسند تحریک کا ترجمان ہے لیکن نئے لکھنے والوں کیلئے بھی اپنے صفحات بعض اوقات کھلے رکھتا ہے۔

"کلن" (ممبئی): شمس کنول کی ادارت میں ممبئی سے شائع ہوتا تھا۔ مواد کے اعتبار سے خاصا تجرباتی پرچہ تھا۔ اس کا انفرادی جرأت مندی اور بیباکی میں مضمر تھی متنازعہ موضوعات پر دو ٹوک لہجے میں گفتگو کرنا اس پرچے کی خصوصیت تھی۔ دس بارہ سال ہی چل سکا

"آواز" (دہلی): سرکاری رسالہ ہے جس میں آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہونے والی تخلیقات کا انتخاب بھی شائع کیا جاتا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف اصحاب نے ایڈیٹری کے فرائض انجام دیے۔

"اسلام اور عصر جدید" (دہلی): ڈاکٹر عابد حسین نے جاری کیا ان کی وفات کے بعد ضیا الحسن فاروقی مدیر مقرر ہوئے موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے مسائل اور اسلامی فکر کا روشن خیالی سے تجزیہ کرنا اس پرچے کی خصوصیات ہیں۔

مندرجہ بالا رسالے اپنی اہمیت و افادیت کے اعتبار سے متقاضی تھے کہ ان کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا جائے۔ اس دور کے کچھ اور قابل ذکر پرچے درج ذیل ہیں:

کلکتہ کا ... (عاجز انصاری) ممبئی کا ... (سید عبدالسمیع بوبیرے) دہلی کا "سرخ" (سیفی پریمی اور شہرت قادری) دہلی کا "گہوارہ" (امیر آغا قزلباش) کلکتہ کا "عکاس" پٹنہ کا "مطالعہ" (کلیم الدین احمد) دہلی کا "ماہِ نو" (ساحر ہوشیارپوری) سلطانپور کا "شمع ادب" حیدر آباد کا "آنچل" پٹنہ کا "وادی" (غیاث احمد گدی) دربھنگہ کا "توازن" آرہ کا "معیار"، کانپور کا "آب و رنگ" (سنتوکھ امرتسری اور ضیا حسنی) بھوپال کا "آذر" (افسر صہبائی) ممبئی کا "نقش کوکن" (میمونہ دلوی) سہارنپور کا "رنگ محل" (مصطفیٰ آرٹسٹ) آسنسول کا "آئندہ" جمشید پور کا "تشکیل" (شعیب شمر اور شمس زیدی) کلکتہ کا "آیات" (کامل اختر) مہوکا "ہم رنگ" (وقار واثقی) اندور کا "شاخیں" سرینگر کا "تعمیر" چنڈی گڑھ کا "پاسبان" مظفرپور کا "سریر" وغیرہ۔

اس دوران شائع ہونے والے ادبی ہفت روزہ اور پندرہ روزہ پرچوں میں ممبئی کا "دورِ حیات" (تیغ مظہر لحسن) کلکتہ کا "آثار" (شہزاد منظر) حیدر آباد کا "رنگ آوردہ" (محمود خاور) کلکتہ کا "آبشار" (ابراہیم ہوش) رامپور کا "جوہر" (سلطان اشرف) ... کا "سالار" (مجیب دایانہ) لدھیانہ کا "نوائے وقت" (سنتوش صحرائی) گیا کا "مورچہ" (کلام حیدری) وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں کیونکہ ان میں اکثر ادبی تخلیقات اور معیاری مضامین بھی شائع کیے گئے۔ کچھ اردو اخبارات بھی اپنی ہفتہ واری اشاعتوں میں خصوصی ادبی ضمیمے شائع کرتے ہیں جن میں "اردو ٹائمز" (ممبئی) "ملاپ" (دہلی، "تیج" ویکلی (دہلی) اور "قومی آواز" (دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، ممبئی) وغیرہ شامل ہیں۔

آخری دور کے پچھلے دس گیارہ سالوں میں متعدد ماہنامے اور سہ ماہی رسالے مختلف مقامات سے شائع ہونا شروع ہوئے جن میں سے مندرجہ ذیل نے بطور خاص امتیازی حیثیت و شہرت پائی۔

"غالب نامہ" (دہلی): سرکاری ... ایوانِ غالب کی جانب سے شائع ہوتا ہے وقتاً فوقتاً اس کے مدیران میں یوسف حسین خاں، نثار احمد فاروقی اور نذیر احمد شامل رہے ہیں سہ ماہی رسالہ ہے عام طور پر تحقیقی اور تنقیدی مضامین اس میں شائع ہوتے ہیں جن میں غالبیت کا غلبہ ہوتا ہے۔

"نشانات" (مالیگاؤں): یہ خوبصورت ادبی جریدہ سلطان سبحانی اور سید عارف وغیرہ کی ادارت میں منظر عام پر آیا تھا ترقی پسند اور جدید دونوں حلقوں کے لکھنے والے اس کے ساتھ قلمی تعاون کرتے تھے اس پرچے نے اپنی معیاری تخلیقات نثر و نظم اور خوبصورت انداز پیشکش کی وجہ سے تیزی کے ساتھ ادبی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا لیکن مدیران کی باہمی چپقلش

اسے دس بارہ شماروں کے بعد لے ڈوبی۔

"سویرا" (دہلی): اس خوبصورت رسالے کی مجلس ادارت میں نشترؔ خانقاہی اور مودود صدیقی شامل تھے۔ بطور خاص ایسی ادبی تخلیقات شائع کرتا تھا جن میں عوام کی دلچسپی کا وافر سامان ہو۔ آٹھ دس شماروں کے بعد بند ہوگیا۔

"عصری آگہی" (دہلی): پچھلے چند سالوں سے قمر رئیس نکالتے ہیں اس کے وسیلے سے ترقی پسند تحریک کو ادبی محاذ پر دوبارہ بحال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اپنی سماجی معنویت پر اصرار کی روش اور خاص سیاسی نظریے کے حامل تنقیدی مضامین کے باعث انفرادی شان رکھتا ہے۔

"الفاظ" (علیگڑھ): ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ کی جانب سے شائع ہوتا ہے اس کے مدیر اطہر پرویز ہیں قدیم و جدید ہر مکتبِ خیال کی تخلیقات شائع کرتا ہے۔ اس کی خصوصی اشاعتوں میں "افسانہ نمبر" حصہ اول و دوم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

"کتاب نما" (دہلی): شاہد علی خاں اس کے مدیر اعلا اور دلی شاہجہانپوری ایڈیٹر ہیں اس رسالے میں تازہ ترین اردو مطبوعات پر تبصرے شائع کیے جاتے ہیں۔ اپنے خاص نمبروں کے لیے بھی اس پرچے کو بڑی شہرت حاصل ہے خصوصی اشاعتوں میں "دبیر نمبر"، "عابد حسین نمبر" وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

"فن اور شخصیت" (بمبئی): صابر دتّ نکالتے ہیں۔ اور یہ رسالہ صرف خاص نمبر شائع کرتا ہے۔ اب تک شائع ہونے والے نمبروں میں مہندر ناتھ، جاں نثار اختر، فیض، کملیشور کی حیات و خدمات کا احاطہ کیا جاچکا ہے۔ علاوہ ازیں اس کا ضخیم "غزل نمبر" بھی اہمیت اور افادیت کا حامل ہے۔

"گلفشاں" (دہلی): "بیسویں صدی" کے ادارے سے شائع ہوا تھا۔ مخمور سعیدی ایڈیٹر تھے اور شمع افروز زیدی اسسٹنٹ ایڈیٹر، انتہائی خوش سلیقگی کے ساتھ خوبصورت چھپتا تھا ادبی تخلیقات میں اکثر پاکستانی ادب کا ایسا انتخاب بھی شامل ہوتا تھا جس میں عام قارئین کی دلچسپی کا سامان ہو۔ نو دس شماروں کے بعد بند کردیا گیا۔

"سطور" (دہلی): سہ ماہی رسالہ ہے جو کمار پاشی کی ادارت میں نکلتا ہے۔ نئے ادب کی ترجمانی کا دعویدار ہے خصوصی اشاعتوں میں "نیا افسانہ نمبر" اور "محمد علوی نمبر" اہمیت کے حامل ہیں

"زبان و ادب" (پٹنہ): بہار اردو اکیڈمی کی جانب سے سہیل عظیم آبادی اور رشین مظفرپوری ترتیب دیتے تھے سہ ماہی پرچہ ہے لیکن بے قاعدگی کا شکار ہے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کی کثرت ہوتی ہے لیکن تخلیقات بھی شائع کرتا ہے۔ شاد عظیم آبادی پر اس کے خاص نمبر نے ادبی حلقوں کو متوجہ کیا تھا۔

"معیار" (دہلی): سہ ماہی پرچہ ہے لیکن تاحال تین چار شمارے ہی منظرِ عام پر آسکے ہیں اور سالانہ ایک شمارے کا اوسط بیٹھتا ہے۔ ضخامت اور معیار ہر دو اعتبار سے دبیز ہوتا ہے۔ شاہد ماہلی اس کے مدیر ہیں پہلے شمارے کی مجلس ادارت میں بلراج مینرا ان کے شریک کار تھے۔

"نقد و نظر" (علیگڑھ): گذشتہ دو تین سال سے نکل رہا ہے اسلوب احمد انصاری اس کے مدیر ہیں۔ تازہ مطبوعات پر مفصل تبصرے کرنا اس کا امتیازی وصف ہے۔

"تعمیر ہریانہ" (چنڈیگڑھ): ہریانہ سرکار کا اردو رسالہ ہے کچھ دنوں تک اس کی ادارت کے فرائض کشمیری لال ذاکر نے بھی انجام دیے۔ موجودہ مدیر اعلا انل راز داں ہیں اور مجلس ادارت میں راجیندر ولتس، سلطان انجم اور مدن راہی شامل ہیں۔ ہریانہ کے شعرا اور وہاں کی تہذیب و ثقافت سے متعلق مضامین خصوصیت کے ساتھ شائع کرتا ہے اس کے "میرا پہلا افسانہ نمبر" اور "منشی نول کشور نمبر" نے خاصی شہرت پائی۔

"جواز" (مالیگاؤں): اس کے مدیر سید عارف ہیں اور نشاط انور ان کے معاون۔ تاحال اس کے سولہ شمارے منظرِ عام پر آئے ہیں حالانکہ یہ اس کی اشاعت کا پانچواں سال ہے اپنی بیباک پالیسی اور مضامین کے معیار کے اعتبار سے انفرادی شان رکھتا ہے ہند و پاک کے صفِ اول کے کم و بیش تمام لکھنے والے اس کے قلمی معاونین میں شامل ہیں۔

"شعور" (دہلی): بلراج مینرا نکالتے ہیں سال دو سال میں کوئی ایک اشاعت ہی منظرِ عام پر آتی ہے لیکن اتنی معیاری اور ایسی ضخیم کہ بے قاعدگی کی تلافی ہوجاتی ہے تاحال پانچ شمارے

ہی ہماری نظر سے گزرے ہیں. اکثر ناقدین کو احساس ہے کہ میزا اسے خود نمائی کا وسیلہ بناتے ہیں اس کے باوجود اس میں شامل مضامین کے بلند معیار پر شبہ نہیں کیا جا سکتا.

"اندازے" (الہ آباد) : ترقی پسند نقاد سید عقیل رضوی کی نگرانی میں شائع ہوتا ہے اور تازہ تازہ مطبوعات پر تبصروں تک محدود ہے ان تبصروں میں بھی نظریاتی پسند و ناپسند کو بڑا دخل ہوتا ہے.

"مناظر" (ممبئی) : ادارت بلراج ورما کے سپرد ہے مدیران خصوصی ہر شمارے میں بدل جاتے ہیں تین شمارے منظر عام پر آچکے ہیں یہ شمارہ خاصا ضخیم اور معیاری ہے.

"اظہار" (ممبئی) : باقر مہدی اور فضیل جعفری مل کر نکالتے ہیں. جدید اور ترقی پسند فنکاروں کی تخلیقات شانہ بہ شانہ شائع کرتا ہے. اپنے بیباک اور واشگاف مضامین اور معیاری تخلیقات کے لیے مشہور ہے.

"تیز گام" (دہلی) : شاہد پرویز اور عتیق الرحمان نے نکالا تھا خوبصورت اور عمومی دلچسپی کا پرچہ ہوتا تھا اس نے واجدہ تبسم پر ایک خاص نمبر بھی شائع کیا تھا تین چار شمارے ہی منظر عام پر آسکے لیکن اپنی انفرادیت کا نقش چھوڑ گیے.

"شناخت" (بھوپال) : ظفر صہبائی اس کے مدیر اعلا تھے اور مدیران معاون میں اقبال مسعود، سکندر ضمیہ وغیرہ شامل تھے تین چار شمارے ہی نکال سکے لیکن معیار خاصا بلند تھا اور ہندستان کے اکثر اہم لکھنے والوں کی قلمی معاونت اس پرچے کو اہم بناتی تھی.

مندرجہ بالا رسائل کے علاوہ پچھلی دہائی میں شائع ہونے والے ادبی اور علمی جریدوں میں مالیگاؤں کا "ہم زبان" (سلطان سبحانی) گیا کا "مقاہیم" (سرور عثمانی) ہزاری باغ کا "کوہسار" (مناظر عاشق ہرگانوی) پونہ کا "اسباق" (نذیر فتح پوری) دالمباڑی کا "آشیاں" (ایم یعقوب) بھیونڈی کا "تخلیق نو" (اختر کاظمی، خلیق نصرت) ممبئی کا "امکان" (خواجہ عبدالغفور) بدایوں کا "روشن" (اسعد بدایونی) میرٹھ کا "روشی" (رونق زیدی) کلکتہ کا "شہود" (شہود آفاقی) پٹیالہ کا "پرواز ادب" (کرم سنگھ) آسنسول کا "پہچان" (نعیم اشفاق) کانپور کا "زبان ہند" (شارق ایرانی) ناگپور کا "فیروز" (طرفہ قریشی) رانچی کا "ابلاغ" (احمد سجاد) کٹیہار کا "خوشبو" (شفق) احمد آباد کا "ذخیرہ" (قیوم کنول) پٹنہ کا "خدا بخش جرنل" (عابد رضا بیدار) دہلی کا "اردو دنیا" (شہباز حسین) لکھنؤ کا "خبرنامہ" (علی جواد زیدی) بھوپال کا "اوصاف حمیدہ" (انسر صہبائی) اودے پور کا "نخلستان" (ریاست فاروقی) لکھنؤ کا "صبح ادب" (مسعود عثمانی) دہلی کا پندرہ روزہ "چنگاری" (جمیل احمد) وغیرہ قابل ذکر ہیں

اس فہرست میں دہلی کے "روبی" (رحمان نیر) "شمع" (یونس دہلوی) "فلمی ستارے" (انیس دہلوی) اور حیدر آباد کے "فلمی تصویر" (غوث احمد خاں) کو بھی جگہ ملنی چاہیے کیونکہ ان پرچوں کا تقریباً نصف حصہ ادبی تخلیقات پر مشتمل ہوتا ہے.

آخر میں اعتذار کے طور پر عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ مضمون ہندستان میں ۱۹۴۷ء کے بعد نکلنے والے علمی وادبی رسائل کا ایک سرسری جائزہ ہے جو محض یادداشت کے سہارے عجلت میں قلمبند کیا گیا ہے. اسے تحقیقی مقالہ نہ تصور کیا جائے کیونکہ ہو سکتا ہے مقامی اہمیت کے حامل کچھ پرچوں کا تذکرہ ہونے سے رہ گیا ہو ہفت روزہ اخباروں اور ڈائجسٹ کی شکل میں نکلنے والے بہت سے مقبول عام پرچوں کا ذکر بھی اس میں نہیں کیا جا سکا. خالصتاً مذہبی رسائل بھی میرے موضوع کے دائرے سے باہر کی چیز تھے اور بچوں کے لیے نکلنے والے رسالوں کو بھی اس مضمون میں جگہ نہیں مل سکی. ساتھ ہی غیر ضروری طوالت سے بچنے کی کوشش میں اکثر پرچوں کے بارے میں یہ وضاحت بھی نہیں کی گئی کہ وہ کب جاری ہوئے اور بند ہوگئے یا ابھی نکل رہے ہیں عام طور پر ہمارے ادبی پرچوں کے لیے مقسوم ہو چکا ہے کہ زیادہ سے زیادہ سال دو سال نکلنے کے بعد دم توڑ دیتے ہیں یہی انجام مذکورہ بالا فہرستوں میں شامل رسائل میں سے اکثر کا ہوا. اس کے باوجود اگر کسی رسالے کے چند ہی شماروں نے ادبی دنیا میں بازگشت پیدا کی ہے تو اسے شمولیت کا مستحق گردانا گیا ہے. امید ہے میری نیت پر شبہ نہ کیا جائیگا

*

اختر الواسع



اُردو میں اسلامی کتابیں

سب سے پہلے اس بات کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ اس مضمون کی تیاری میں راقم الحروف نے اپنے اساتذہ مشفق محترم پروفیسر شبیہ الحق کے مضمون "برصغیر میں فقہ اسلامی کے ارتقا کا ایک جائزہ" اور جناب ڈاکٹر محمد سالم قدوائی کے مضمون "قرآن کے اردو تراجم و تفاسیر" سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔
(ا - و)

اردو گو دنیا کی علمی زبانوں میں سب سے کم سن ہے لیکن اس میں اسلام سے متعلق کتب و رسائل کی تعداد کافی ہے ہندستان میں اسلامی علوم کا رواج ویسے تو نویں اور دسویں صدی عیسوی ہی میں شروع ہو گیا تھا اور تیرھویں صدی میں اردو بھی جنم لے چکی تھی۔ اس نے کچھ زمانے بعد شاعری میں مقبولیتِ عام و خاص کی سند بھی حاصل کر لی تھی لیکن اسلامی علوم و فنون کے میدان میں شمالی ہند میں خاص کر شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے تراجم قرآنی نے اسے معتبر و مقبول بنایا جنوبی ہند میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی کتاب "معراج العاشقین" اپنی قدامت کے اعتبار سے وہاں اردو زبان کی مقبولیت کی علامت کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔

جب تک مطابع کا قیام نہیں ہوا تھا اردو میں مذہبی کتب کے قلمی نسخے تیار کیے جاتے رہے اور ان کی بڑی تعداد آج تک خدا بخش لائبریری پٹنہ رضا لائبریری رام پور، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور دیگر کتب خانوں میں موجود ہے اور تحقیق اور اصل ماخذ کی حیثیت سے صاحبانِ علم و دانش کی توجہ کا مرکز ہے۔

آزادی سے قبل کے ہندستان میں لاہور، دہلی، لکھنؤ، کلکتہ، بمبئی اور کانپور کے مطابع نے بڑی تعداد میں مذہبی کتابوں کو شائع کیا۔ خاص طور سے لکھنؤ تو مولانا عبدالحلیم شرر کے بقول "ہندستان میں بغداد و قرطبہ اور نیشاپور و بخارا کے مثل تھا۔" اس دور میں جن مطابع نے امتیازی مقام اسلامی کتابوں کی طباعت و اشاعت میں پیدا کیا، ان میں نول کشور پریس لکھنؤ، مطبع مجتبائی اور مطبع مصطفائی دہلی، مطبع نظامی، مطبع انتظامی اور مطبع قیومی کانپور کے نام سب سے اہم ہیں۔ اس کے علاوہ دار المصنفین اعظم گڑھ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، ندوۃ المصنفین دہلی، دار الترجمہ حیدر آباد نے اردو میں اسلامی علوم و فنون کو جس محنت، وقتِ نظر اور اہتمام کے ساتھ مقبول بنانے کے لیے کام کیا، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس زمانے میں مجلسِ تحقیقات و نشریاتِ اسلام لکھنؤ، ادارۂ الفرقان لکھنؤ، ادارہ اشاعتِ دینیات دہلی اور بہت سے دوسرے ادارے مذکورہ بالا اداروں کے ساتھ اردو میں اسلامی کتابوں کی اشاعت کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں

آزادی کے بعد اردو پر جو مصیبت پڑی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اس دور میں اردو ... تہذیب و ثقافت، علمی مضامین کی زبان تو رہی لیکن وسیلۂ معاش نہ رہی۔ ملک کی تقسیم کا بھی سب سے زیادہ اثر اردو پر اس اعتبار سے بھی پڑا کہ ملک کی تقسیم کے نتیجے میں اردو قاریوں کی بڑی تعداد ہندستان سے

ہجرت کرگئی پھر دونوں ملکوں کے درمیان جو تناؤ رہا ہے اس نے اردو میں اچھی کتابوں کی اشاعت و فروخت کے امکانات کو زبردست نقصان پہنچایا۔ زبان کا رشتہ جب پیٹ سے کاٹ دیا گیا تو اس کے نتیجے میں ان لوگوں نے جن کی پچھلی کم سے کم دو صدیوں سے اردو مادری زبان تھی بہ جبر و اکراہ یا بر بنائے مصلحت اردو کو خیر باد کہا اور ان کی نئی نسلوں کا اردو سے تعلق کمزور ہوتا چلا گیا اور تاہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔

لیکن اس کے باوجود بھی یہ بات کم حوصلہ افزا نہیں کہ اردو کے بڑے بڑے اشاعتی ادارے اپنی ہمت کے بل پر کسی نہ کسی طرح گاڑی کھینچ رہے ہیں۔ اس وقت بھی اردو میں کتابیں منظرِ عام پر آرہی ہیں۔ اب جہاں تک اردو میں اسلامی کتابوں کا معاملہ ہے، ان کی فہرست اتنی طویل ہے کہ کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں ہم نے اسلامی علوم و فنون کے مختلف موضوعات پر شائع ہونے والی اہم کتابوں کے تذکرے کو شامل کیا ہے۔

ترجمہ، تفسیر و دیگر علومِ قرآنی

قرآن مجید مسلمانوں کے لیے کتابِ ہدایت اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ چوں کہ اس کی اصل زبان عربی ہے اس لیے اس کے مطالب و مفاہیم کو سمجھنے کے لیے اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس کے ترجمے مقامی زبانوں میں ہوں اور مشکل مقامات کو سمجھنے کے لیے تفسیریں لکھی جائیں نیز قرآن فہمی کے مزید شوق نے دیگر علومِ قرآنی پر بھی کما حقہٗ دسترس کے لیے کام کرنے پر مجبور کیا۔ اس وقت یہ بات بڑے فخر سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو زبان کو یہ سعادت حاصل ہے کہ قرآن مجید کے ترجموں کی تعداد اس میں سب سے زیادہ ہے۔ ہندوستان میں علومِ قرآنی کے ایک ماہر ڈاکٹر سالم قدوائی کا دعوا ہے کہ "اردو میں قرآن مجید سے متعلق کتب و رسائل کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ اس میں قرآن مجید کے ترجمے، تفسیریں، اصولِ تفسیر، تجوید، تعلیماتِ قرآن، فضائلِ قرآن، تخریجِ آیات، ناسخ و منسوخ، معارفِ قرآن، مباحثِ قرآن، تاریخِ جمع و ترتیب قرآن، تاریخِ تفسیر و مفسرین وغیرہ شامل ہیں۔"

اردو زبان میں تاریخی ترتیب کے لحاظ سے شاہ مراد اللہ انصاری کی پارۂ عم کی تفسیر و ترجمہ جو "تفسیر مرادیہ" کے نام سے موسوم ہے اور ۱۱۸۵ھ میں تصنیف ہوئی اولیت رکھتی ہے۔ یہ ۱۲۴۷ھ میں ہگلی سے شائع ہوئی۔ تفسیر مرادیہ کی اولیت کے باوجود جو شرف و قبولیت شاہ ولی اللہ دہلوی کے بیٹے شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کو حاصل ہوئی اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ شاہ عبدالقادر صاحب کے بڑے بھائی شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ بھی خوب ہے۔ شروع زمانے کے تراجم میں سید شاہ حقانی صاحب کا ترجمہ شاہ حقانی جو ۱۱۰۲ھ کا ہے۔ ترجمہ شریف خاں دہلوی ۱۲۱۶ھ اور ترجمہ امانت اللہ ۱۲۰۸ھ بھی لائق ذکر ہیں۔

بعد کے زمانے میں جب اردو علمی ادبی زبان کی حیثیت سے اپنا لوہا منوا چکی اور اس کا مقابل کوئی نہ رہ گیا تو ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ جو زبان و بیان کے اعتبار سے بہت شستہ سلیس اور ادبی ہے، بہت نمایاں ہے گو اس پر علما کو کافی اعتراض ہوا لیکن پھر بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جدید اردو نثر کے معمارِ اعظم سرسید احمد خاں کی تفسیر القرآن اردو کے اسلامی سرمائے اور خاص کر علوم قرآنی میں سائنسی اندازِ نظر کی پہلی کوشش ہے۔ عام روش سے ہٹ کر ہونے کی وجہ سے اس تفسیر کی سخت مخالفت ہوئی۔

مولانا اشرف علی تھانوی ایک جید اور ہمہ صفت عالم دین تھے۔ انھوں نے مختلف اسلامی موضوعات پر کتابیں لکھ کر اردو کے دامن کو مالا مال کیا۔ علوم قرآنی میں بھی ان کی تفسیر بیان القرآن بڑی خوبیوں والی ہے اور اسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس میں قرآن کا اردو ترجمہ ... آسانی سے ہر کسی کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کے بعد اردو میں قرآن پاک کا جو ترجمہ سب سے زیادہ مقبول ہوا وہ شیخ الہند مولانا محمود ... ترجمہ ... نے شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کو ... نظامی صاحب نے اپنے ترجمہ میں شاہ رفیع ... ترجمہ کا متن دے کر پھر اپنا ترجمہ مع تشریحی و توضیحی عبارات

ساتھ جو قوسین میں دی گئی ہیں لکھا ہے اس کے علاوہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے ایک ترتیلی اردو ترجمہ بھی ترتیب دے کر شائع کیا۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی ترجمان القرآن اپنے لہجے کی ندرت، مزاج کی انفرادیت اور عالمانہ شان کے اعتبار سے اردو میں خاصے کی چیز ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تفسیر ماجدی دورِ جدید کی تفسیروں میں اپنے فلسفیانہ اور علمی اندازِ فکر ونظر اور مولانا کے اپنے مخصوص اسلوبِ نگارش کی وجہ سے بڑی اہم ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن عصرِ جدید کے انکشافات واکتشافات کے درمیان قرآن فہمی کی قابلِ استحسان کوشش ہے۔

ان کے علاوہ اس باب میں تفسیر مظہری از قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر فتح المنان از عبدالحق حقانی، تفسیر مواہب الرحمٰن از مولانا سید امیر علی، تفسیر ثنائی از مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا حمیدالدین فراہی کی تفسیر کے حصے، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی روح القرآن، جلالین کا اردو ترجمہ کمالین، تفسیر ابنِ کثیر خاص مشہور اور اہم ہیں۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا عبدالدائم جلالی، مولانا فتح محمد کے تراجم بھی بہت مشہور رہے ہیں۔ قرآنِ پاک کے منظوم تراجم میں کیف بھوپالی کا ترجمہ جو ابھی صرف نو پاروں تک محدود ہے، بہت خوب ہے اور اسے حیدرآباد کے ولا اکیڈمی نے جناب حسن الدین احمد آئی۔ اے۔ ایس ریٹائرڈ کے زیرِ اہتمام شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ سورۂ یوسف کا منظوم ترجمہ بھی کتابی صورتوں میں شائع ہو چکا ہے۔

علومِ قرآنی پر شاہ ولی اللہ صاحب کی "الفوز الکبیر" کا اردو ترجمہ، قاضی مظہرالدین بلگرامی صاحب کی "عیون العرفان فی علوم القرآن" مولانا سخاوت علی جونپوری کی "الناسخ والمنسوخ" مولوی عبدالحق دہلوی کی "البیان فی علوم القرآن" سرسید کی "التحریر فی اصول التفسیر"، ریورنڈ احمد شاہ کی "مفتاح القرآن" مولانا عبدالرشید نعمانی اور مولانا عبدالدائم جلالی کی ۶ جلدوں پر مشتمل "لغات القرآن" (پہلے چار حصے مولانا نعمانی اور باقی دو حصے مولانا جلالی کے ہیں)، مولانا زین العابدین میرٹھی کی "قاموس القرآن"، علامہ انور شاہ کشمیری کی "مشکلات القرآن"، مولانا سید سلیمان ندوی کی "ارض القرآن" مولانا حفظ الرحمٰن کی "قصص القرآن" مولانا عبدالماجد دریابادی کی "ارض القرآن یا جغرافیۂ قرآنی" اور "اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں" مولانا سید احمد اکبرآبادی کی "فہم القرآن" اور "وحیِ الٰہی" مولانا اسلم جیراجپوری کی "تاریخ القرآن" مولانا محمد منظور نعمانی کی "قرآن آپ سے کیا کہتا ہے"، ڈاکٹر میر ولی الدین کی "قرآن اور تصوف" "قرآن اور تعمیرِ سیرت" اور "رہنمائے قرآن" مولانا مودودی کی "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات" عوام وخواص میں خاصی مقبول رہی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی فاضل مصنفین نے قرآن کریم کے مختلف گوشوں اور تعلیمات پر کام کیا ہے، جس کا اس مختصر مضمون میں احاطہ بڑا مشکل ہے۔

احادیث نبی کریم صلعم

قرآن مجید کے بعد مسلمانوں کے لیے سب سے اہم دینی ماخذ حدیث رسول کریم صلعم ہے۔ فقہ اسلامی کے چار بنیادی ماخذ میں سے یہ دوسرے نمبر پر ہے۔ حدیث کی اہمیت اس لیے بھی قرآن کریم میں اجمال ہے اور حدیث اس کی تشریح وتوضیح ہے اس طرح قرآن کی سب سے پہلی تفسیر بھی حدیث ہے۔ پھر حدیث "شعورِ نبوتؐ" کا وہ کامل نمونہ ہے جو ہماری زندگیوں میں روشن چراغ کی حیثیت سے قدم قدم پر ساتھ دیتا ہے۔

احادیث کے چھ مجموعے جو "صحاحِ ستہ" کے نام سے جانے جاتے ہیں سب سے زیادہ معتبر رہے ہیں۔ اردو میں بھی صحیح بخاری صحیح مسلم، شمائل ترمذی، سنن نسائی، سننِ ابوداؤد اور سننِ ابن ماجہ کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ امام اعظم ابوحنیفہ کی مسند، موطا امام مالک وغیرہ کے ترجمے اور شرح منظرِ عام پر آئے ہیں۔ ان کے علاوہ حدیث کے ایک اہم مجموعہ "مشکوٰۃ" کے کئی ترجمے اور شرح چھپے ہیں۔ محدث المنذری کے مجموعے "الترغیب والترہیب" کا ایک انتخاب اردو میں ترجمہ اور حواشی کے ساتھ تین جلدوں میں مولانا عبداللہ دہلوی نے کیا جو ندوۃ المصنفین سے

شائع ہو چکا ہے۔ اسی ادارے نے مولانا سید بدر عالم مدنی کی پانچ جلدوں میں مرتبہ "ترجمان السنۃ" شائع کیا ہے۔ "ریاض الصالحین" کا ترجمہ "زادِ سفر کامل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مولانا بدر عالم کی طرح مولانا محمد منظور نعمانی کی "معارف الحدیث" چھ جلدوں میں اور مولانا محمد یوسف صاحب کی "حیاۃ الصحابہ" آج بھی بہت مقبول ہیں۔

علمِ حدیث پر بھی کافی کام ہوا ہے اس سلسلے میں اردو میں تازہ ترین تصنیفات میں مولانا محمد تقی امینی کی "حدیث کا درایتی معیار"۔ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کی "محدثینِ عظام اور ان کے علمی کارنامے" اور ڈاکٹر محمد سالم قدوائی کی کتاب "علم حدیث اور چند اہم محدثین" قابلِ ذکر ہیں۔ ان سے قبل مولانا مناظر احسن گیلانی کی "تدوینِ حدیث" اور دوسری بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

فقہِ اسلامی

اردو علمی و عوامی زبان کی حیثیت سے جس وقت منظرِ عام پر آئی یہ وہ زمانہ تھا جب پروفیسر مشیر الحق کے بقول "ہندستان سے مسلم حکومت ختم ہو چکی تھی" اور "یہ وہ دور ہے جب عدالتوں سے اسلامی شریعت کو بہت حد تک دیس نکالا مل چکا تھا" "لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کے گھروں میں فقہ اور شریعت کا رواج باقی تھا" اب شرعی رہنمائی کا کام حکومت کے بجائے علماء کے ذمہ آگیا انھوں نے جو فتوے دیے وہ جب جمع کر کے شائع ہوئے تو اردو میں اسلامی فقہ پر ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا جو شرعی رہنما ہونے کے ساتھ ہی ساتھ کل کے مورخ اور محققین کے لیے ایک اہم ماخذ کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور جو خود مذہبی رجحانات اور ان کے جدید ہندستان میں ارتقاء کی سچی تصویر ہے۔ اس سلسلے میں فتاوٰی امدادیہ مولانا اشرف علی تھانوی، فتاوٰی نذیریہ مولانا نذیر حسن محدث دہلوی، فتاوٰی رشیدیہ مولانا رشید احمد گنگوہی اور فتاوٰی رحیمیہ مفتی سید عبد الرحیم لاجپوری اور فتاوٰی دیوبند بہت اہم ہیں۔

فتاوٰی کے مجموعوں کے علاوہ اردو زبان میں فتاوٰی عالمگیری اور ہدایہ کا مولوی امیر علی کا ترجمہ، شرح وقایہ کا ترجمہ "نور الہدایہ" از مولوی وحید الزماں لکھنوی، در المختار کا ترجمہ "غایۃ الاوطار" از مولوی خرم علی، عقد الجید کا ترجمہ "سلکِ مروارید" از محمد احسن صدیقی نانوتوی، قدوری کا ترجمہ "ضروری" از مولوی عبد العزیز، منیۃ المصلی کا ترجمہ "صلوٰۃ الرحمان" از عبد الرحمان حسام الدین بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر مشیر الحق کا خیال ہے کہ "فقہ کی کوئی بھی ایسی اہم کتاب نہ تھی جس کا اردو ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔ اس طرح ہندستانی مسلمانوں کا واسطہ عربی اور فارسی زبانوں سے ختم ہو جانے کے باوجود فقہی ادب سے ختم نہ ہو سکا"۔

خواتین کے لیے ترتیب دی گئی مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب "بہشتی زیور" جس میں پیدائش سے موت تک کے تمام مسائل کا حنفی فقہ کی رو سے شافی و کافی جواب دے دیا گیا ہے بڑی مقبول رہی ہے۔ اسی طرح بچوں کے لیے مفتی کفایت اللہ کا رسالہ "تعلیم الاسلام" جو سوال و جواب کے روپ میں کئی حصوں میں ہے بہت اہم ہے۔

اس کے علاوہ صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانی کا رسالہ "فقہ حنفی کی تاریخی حیثیت" مولانا اشرف علی تھانوی کا رسالہ "الحیلۃ الناجزہ" ما سلامت علی خاں کا "کتاب الاختیار" کا ترجمہ "اسلامی قانون میں فوجداری" مولانا عبد السلام ندوی کا "القضا فی الاسلام" کا ترجمہ "طریقۂ شہادت اور فصل مقدمات کے اسلامی اصول اور قوانین کی تشریح" مولانا مجیب اللہ ندوی کی کتاب "فقہ اسلامی اور دورِ جدید کے مسائل" بھی قابلِ ذکر ہیں فقہ اسلامی کے باب میں مولانا محمد تقی امینی کی کتابیں "فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر"، "اسلام کا زرعی نظام" "احکامِ شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت" اردو میں بنیادی اور فکر انگیز ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سیرت و تاریخ

نبی آخر الزماں صلعم کی سیرتِ طیبہ مسلمانوں کے لیے ہمیشہ حرزِ جاں

رہی ہے۔ تاریخ کا یہ سب سے انوکھا اور عجیب معاملہ ہے اور شاید اس کی دوسری نظیر نہیں کہ مسلمانوں کے پاس اپنے پیغمبر صلعم کی زندگی کا تمام تفصیلات سند کے ساتھ موجود و محفوظ ہیں۔ آپ کی زندگی، فضائل و عادات، روزمرہ کے معاملات، غزوات، لوگوں کے ساتھ دیہ اور برتاؤ، چلنے سونے، بیٹھنے، بات کرنے، کنگھی کرنے تک کی تمام تفصیلات پوری جزئیات کے ساتھ موجود ہیں۔ آپ کے قول و عمل اور مشاہدات غرض ہر چیز کا ریکارڈ جمع ہے اور آپ کی شخصیت کا کمال و تمام کے ساتھ جائزہ لیا جا سکتا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ سے زیادہ کسی کی شخصیت پر بھی شاید سب سے زیادہ دنیا کی تقریباً تمام زندہ زبانوں میں کتابیں تصنیف کی گئیں۔

اردو یہاں بھی کیسے پیچھے رہ جاتی سب سے پہلے میلاد کی کتابیں سامنے آئیں، پھر سرسید نے "خطبات احمدیہ" سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کے جواب میں تصنیف کی۔ مولانا شبلی کی "سیرت النبیؐ" (چھ جلدیں) جو ان کے بعد ان کے لائق و فائق شاگرد اور جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے مکمل کی ایک سنگ میل ہے۔ اس کے بعد تو سیرت نبی اکرم صلعم پر ہر علمی و تاریخی انداز سے کام کا سیلاب آگیا۔ قاضی سلیمان منصور پوری کی "رحمۃ اللعالمین"، مولانا سید سلیمان ندوی کی "رحمت عالم" اور "خطبات مدراس"، مولانا مناظر احسن گیلانی کی "النبی الخاتم الانبیا"، ملا واحدی کی "حیات سرور کائنات" ماہر القادری کی "در یتیم" نعیم صدیقی کی "محسن انسانیت"، مفتی محمد شفیع کی "سیرت خاتم الانبیا" مولانا عبد الصمد رحمانی کی "پیغمبر عالم"، مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی "سیرت المصطفےٰ" مولانا محمد میاں کی "محمد رسول اللہ" راشد الخیری کی "آمنہ کا لال"، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کی "نبی عربی" اور "سیرت طیبہ" محمد حسین احسان کی "سرکار دو عالم" خواجہ عبد الحی کی "ہمارے رسولؐ" مقبول احمد سیوہاروی کی "محمد رسول اللہ" اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔

ابھی حال ہی میں مولانا سید ابو الحسن ندوی کی کتاب "نبی رحمت" اور مولانا سید ابو الاعلا مودودی کی "سیرت سرور عالم" دونوں کتابیں اردو قارئین تک پہنچی ہیں۔

اس کے علاوہ صحابۂ کرام اور دیگر ائمہ و بزرگوں کی زندگی اور کارناموں پر بھی تفصیلی کام اردو میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اس میں مولانا شبلی کی "الفاروق" مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی "صدیق اکبر" مولانا سید سلیمان ندوی کی "سیرت عائشہ" دار المصنفین سے شائع ہوئی۔ "سیر الصحابہ" "سیر الصحابیات" "سیر الانصار" مولانا شبلی کی "المامون"، "الغزالی"، مولانا ابو العرفان ندوی کی "ائمہ اربعہ"، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی سیرت خلفائے راشدین اور دیگر اسلامی مشاہیر پر شائع ہوئی کتابیں، اور دیگر اداروں سے اولیاء اللہ و بزرگان اسلام پر جو کتابیں شائع ہوئیں ان کی تفصیل بیان کرنا یہاں ممکن نہیں۔ ان کے علاوہ وہ تمام تراجم ہیں جو کہ عربی و فارسی زبانوں سے اردو میں ان موضوعات پر کیے گئے اور زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئے۔

اسلامی تاریخ سے مسلمانوں اور خود غیر مسلموں کو بھی بڑی دلچسپی رہی ہے۔ اس موضوع پر بھی اردو میں بہت سی اہم کتابیں شائع ہوئیں۔ ان میں اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی "تاریخ اسلام" مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی "تاریخ اسلام" مولانا محمد اسلم جیراجپوری کی "تاریخ الامت" مولانا عبد الحی صاحب کی تصنیف اور مولانا ابو العرفان ندوی کی ترجمہ کردہ کتاب "اسلامی علوم و فنون ہندستان میں" مولانا ریاست علی ندوی کی "تاریخ اندلس" پروفیسر خورشید احمد کی کتابیں "اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں" (ترجمہ) "حضرت ابوبکر صدیق کے سرکاری خطوط"، "تاریخ زدہ"، "حضرت عثمان کے سرکاری خطوط" "فاروق اعظم کے سرکاری خطوط"، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی "تجدید و احیائے دین"، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی چار جلدوں پر محیط "تاریخ دعوت و عزیمت" مولوی محمد عبد الرحمان کی "تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر"

مطبوعات کتب خانہ اشاعت الاسلام (رجسٹرڈ) دہلی

قرآن شریف

چوب قلم۔ ہندوستان میں پہلی بار خوبصورت سات رنگوں میں مطبوعہ آرٹ پیپر پر مخمل کی جلد سے مزین مع رحل بکس حوالہ ۷۸۶ ہدیہ ۱۵۰۰/ روپے

قرآن شریف معریٰ

حوالہ نمبر ۲۰۰۳ مجلد ریگزین ۲۵/-	قرآن شریف حوالہ نمبر ۴۴۳ زرد مصری کاغذ مجلد ریگزین ۱۰۰/-	وظائف رضویہ ۱۰/۵۰
" ۱۰۰۳ " سنہری ۳۵/-	" ۴۴۴ سفید کاغذ چوب قلم کلاں ۵۵/-	مناجات مقبول کلاں مترجم ۱۰/۵۰
" ۱۲۰۳ " " ۴۰/-	" ۴۴۵ زرد مصری " ۹۰/-	حزب الاعظم (کلاں) " ۹/۵۰
" ۳ ریگزین ۲۶/-	" ۳۲۵ تین رنگی چھپائی چوب قلم ۳۲۵/-	دلائل الخیرات کلاں مترجم ۱۰/۵۰
" ۱۲۶ حافظی " ۲۱/-	" ۳۳۶ چوب قلم کروموآرٹ ۲۰۰/-	مجموعۂ وظائف ۹/۵۰
" ۲۲۲ " " ۲۰/-	" ۳۳۷ " آفسیٹ پیپر ۲۰۰/-	سولہ سورہ کلاں ۱۰/۵۰
" ۲۰۳ مجلد ریگزین ۱۹/-	قرآن شریف ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی	" نہ سورہ " ۴/۵۰
" ۵۳ مجلد ۱۸/-	حوالہ نمبر ۱۸ دو رنگی چھپائی سبز خار ریگزین جلد ۳۰/-	" دو سورہ (کلاں) ۴/۵۰
" ۶۲ " ۱۷/-	" SS/۸۱ سنہری جلد ولایتی کاغذ ۴۰/-	کتاب الحج مع ضروری معلومات ۹/-
" ۷۲ " ۱۶/-	" ۲۸۱ سہ رنگی چھپائی ۴۵/-	رہنمائے حج ۹/-
" ۲۳ حمائل ریگزین ۱۸/-	" ۶۴ دو رنگی چھپائی ریگزین جلد ۲۵/-	عورتوں کا حج و عمرہ ۵/-
" ۱۲۳ " ۱۷/-	" ۲۶۴ سہ رنگی سنہری جلد ۴۰/-	عورتوں کی نماز ۳/-
" ۱۳ پلاسٹک ۱۶/-	" ۵۵۵ دو ترجمہ دو رنگی چھپائی ریگزین جلد ۳۸/-	طریقۂ حج پلاسٹک کور ۵/-
" ۱۹ ریگزین ۱۲/-	" ۳۳۶ حافظی فتح محمد جالندھری ریگزین ۳۰/-	رہنمائے عمرہ و زیارت ۲/۵۰
" ۱۱۹ پلاسٹک ۱۴/-	" ۲ حمائل شریف ریگزین دو رنگی چھپائی ۳۲/-	نماز شریف مترجم بالتصویر ۲/-
" ۲۴ پلاسٹک کور ۹/-	" ۴۸ " " ۱۸/-	سلیمی نماز قاری نعام الٰہی ۴/۵۰
" ۲۵ " ۹/-	قرآن شریف ترجمہ مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی	قصص الانبیاء (کلاں) ۱۸/-
" ۲۵ بٹوازپ ۱۴/-	حوالہ نمبر ۲۲۲ دو رنگی چھپائی ریگزین جلد ۳۰/-	" (درمیانہ) ۱۴/-
" ۳۹ پلاسٹک کور ۱۰/-	" ۱۲۲۲ چوب قلم " " ۳۸/-	نقش سلیمانی مکمل مجلد ۱۵/-
" ۲۶ حافظی پلاسٹک کور ۱۱/-	" ۲۲ " " " ۳۸/-	رکن دین ۱۰/۵۰
" ۲۶ بٹوازپ ۱۵/-	حوالہ نمبر ۴۰۸ عربی متن انگریزی عبداللہ یوسف علی ۱۵۰/-	خطبہ علمی ۲/۵۰
حوالہ نمبر ۴۴۳ پلاسٹک کور ۱۱/-	" ۱۰۸ " " ۷۵/-	میلاد اکبر ۴/۵۰
" SS/۴۴۷ پلاسٹک کور ۱۴/-	" ۸ " انگریزی پکتھال اور فتح محمد جالندھری ۵۰/-	خطبات الاحکام مجلد ۱۲/-
" " بٹوازپ ۱۶/-	" ۲۰۸ " پلاسٹک ۲۷/-	خطبۂ حمیدیہ ۳/-
" ۳۳۳ چوب قلم کلاں مجلد ریگزین ۸۰/-	" ۳۰۸ صرف انگریزی پکتھال ۲۴/-	احکام نکاح ۳/۵۰

کتب خانہ اشاعت الاسلام (رجسٹرڈ) چوڑی والان دہلی ۱۱۰۰۰۶

QAPN-52

مطبوعات کتب خانہ اشاعت الاسلام (رجسٹرڈ) دہلی

الف لیلیٰ ہزار داستان	۱۲/-	سٹینڈرڈ ڈکشنری بابائے اردو مولوی عبدالحق	۹/-	ہندی اردو ٹیچر	۱/۵۰
زین المجالس مجلد	۹/-	سٹوڈنٹ " "	۳/-	اردو انگریزی عربی ٹیچر	۶/۵۰
تجرید بخاری شریف "	۲۴/-	پاپولر " "	۹/-	ہندی عربی "	۶/۵۰
مسلم شریف اردو دو جلدیں	۴۸/-	فیروز اللغات جامع کلاں	۷۵/-	اردو دو مہینے میں	۱۰/-
بہشتی زیور بہشتی مجلد	۳۰/-	جدید فیروز اللغات	۲۴/-	—— انگریزی مطبوعات ——	
نقش روحانی	۲/۵۰	جامع اللغات	۹/۷۵	فور کمپینین آف اسلام	۱۶/-
مولود سعدی	۲/۵۰	لغات فیروزی	۲۱/-	فائیو ہیروز آف اسلام	۲۱/-
چھ باتیں	۲/۵۰	پریکٹیکل انگریزی اردو ڈکشنری	۲۴/-	سوانح حضرت عائشہؓ	۶/-
موت کا منظر پلاسٹک کور	۱۵/-	پاپولر اردو انگریزی "	۲۴/-	" خالد بن ولیدؓ	۸/۲۵
مسلمان خاوند	۳/۵۰	جیم آکسفورڈ انگریزی "	۱۱/۲۵	سوانح حضرت محمدؐ (کلاں)	۲۵/-
مسلمان بیوی	۳/۵۰	نیو ماڈل اردو انگریزی	۱۱/۲۵	" " خورد	۶/-
اسم اعظم	۳/-	ٹوئنٹیتھ سنچری انگریزی ہندی	۳۶/-	" " ابوبکرؓ	۶/-
احادیث رسول	۳/-	ہینڈی " "	۱۲/-	" " عمرؓ	۶/-
مسنون دعائیں مجلد	۳/-	عربی انگریزی لغات پاکٹ	۲۴/-	" " عثمانؓ	۶/-
اعمال قرآنی (مولانا اشرف علی تھانویؒ)	۵/-	" " (کلاں)	۶۵/-	" " علیؓ	۶/-
اقوال زریں	۳/-	انگریزی عربی "	۴۵/-	طریقۂ فاتحہ	۶/-
آمنہ کا لال	۴/-	" " پاکٹ	۲۴/-	آیۃ الکرسی	۶/-
سیدہ کا لال	۶/-	پاپولر اسٹرشیڈ انگریزی تلگو	۲۴/-	شافعی ترتیب الصلوٰۃ	۶/-
فاطمہ کا لال	۵/-	" آکسفورڈ	۱۸/-	الحزب الاعظم	۸/۲۵
گنجینۂ عملیات	۴/۵۰	آکسفورڈ جیم "	۱۰/۵۰	سینٹ آف جیلان	۸/۲۵
آئینۂ عملیات (اندرجال)	۱۰/-	اسمارٹ اردو انگریزی لیٹر رائٹنگ	۴/-	خطبات الاسلام	۸/۲۵
تذکرۃ الاولیا	۲۴/-	اسمارٹ اردو انگریزی ٹیچر	۱۰/-	قرآنک ایڈوائسس	۸/۲۵
چار ستارے	۶/-	خط وکتابت اردو	۴/-	چالیس حدیث	۲/۲۵
بہار شریعت مکمل ۲ جلد	۱۰۵/-	عربی اردو بول چال	۳/-	الحجاج بن یوسف	۶۵/-
چین وبنگال کا جادو	۳/-	اردو ہندی ٹیچر	۱/۵۰	مناجات مقبول	۱۲/-

کتب خانہ اشاعت الاسلام (رجسٹرڈ) چوڑیوالان دہلی ۱۱۰۰۰۶

QAPN-52

قاضی زین العابدین اور مفتی انتظام اللہ شہابی کی "تاریخ ملت" فلپ حتی کی "ہسٹری آف دی عربس" کا سید ہاشمی فرید آبادی نے نامکمل ترجمہ "تاریخ ملت عربی" کے نام سے کیا اور اسی مصنف کی ایک اور ملخص کتاب کا ترجمہ "عرب اور اسلام" کے نام سے سید مبارز الدین رفعت نے کیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" اس موضوع پر ایک عالمانہ تصنیف ہے۔

سیرت اور تاریخ کے موضوع پر بھی مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ بہت سی کتابیں موجود ہیں، یہاں ان تراجم کا تذکرہ بھی نہیں ہے جو عام طور پر عربی و فارسی سے اردو میں تاریخ و سیرت کے موضوع پر کیے گئے۔

تصوّف

تصوّف کا اثر ہندستانی اسلامی معاشرہ پر بہت گہرا رہا ہے اور یہ روایت آج بھی چلی آ رہی ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ صوفیائے کرام کی کوششوں کا اشاعتِ اسلام میں بڑا دخل رہا ہے۔ ہندستان میں تصوّف کے تقریباً تمام مکاتب فکر کے نمایندے موجود ہیں۔ اس لیے صوفیانہ لٹریچر کی اشاعت بھی یہاں خوب ہوئی۔ اس میں ملفوظات کے مجموعوں اور تذکروں کی کثرت ہے جو کہ مختلف مشائخ کی صحبتوں میں رہ کر ان کے حالات زندگی کو بیان کر کر ترتیب دیے گئے۔ اس کے علاوہ بعض مشائخ کی کتابوں کے ترجمے بھی اردو میں شائع ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر شیخ عبدالقادر جیلانی کی کتاب "غنیۃ الطالبین" داتا گنج بخش کی "کشف المحجوب" فریدالدین عطار کی "تذکرۃ الاولیا" امام غزالی کی "کیمیائے سعادت"، شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی "اخبارالاخیار" خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات کا مجموعہ "افضل الفوائد"، چراغ دہلی کے ملفوظات کا مجموعہ "خیر المجالس"، "ملفوظات رزاقیہ"، "روضۃ الاقطاب"، "ملفوظات مولانا محمد الیاس"، "صحبتِ اولیاء"، "صحبت اہل دل" "حکایات الصالحین" "ضیاء القلوب" "ارشاد السالکین"، "صحائفِ معرفت" وغیرہ۔

ان کے علاوہ تصوّف کی تاریخ اور مسائل پر بھی بہت فکر انگیز اور علمی کتابیں اردو میں تصنیف کی گئیں ان میں پروفیسر خلیق احمد نظامی کی "تاریخ مشائخ چشت"، مولانا اسلام الحق مظاہری کی "تاریخ مشائخ ہند قدیم" سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی "بزم صوفیہ" مولانا عبدالماجد دریابادی کی "تصوف اسلام" مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی "تذکرہ واحسان و تصوف و سلوک"، مولانا محمد منظور نعمانی کی "تصوّف کیا ہے؟" سید احمد عروج قادری کی "اسلامی تصوّف"، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی "چشتی تعلیمات اور عصرِ حاضر میں ان کی معنویت" خاص طور پر اہمیت کی حامل ہیں۔

ان کے علاوہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے تذکروں اور سوانح، نیز تراجم کی بڑی تعداد اور بھی ہے ان میں مولانا روم کی مثنوی اور دیوانِ حافظ کے تراجم بھی بہت مقبول ہیں۔ مثنوی اور دیوانِ حافظ کے تراجم کے پروجیکٹ پر جناب قاضی سجاد حسین صاحب نے بڑی توجہ دلچسپی اور محنت سے حال میں کام کیا ہے۔

دیگر موضوعات

ان بڑے موضوعات کے علاوہ بھی اردو میں اسلامی علوم و فنون نیز دعوت فکر کی سطح پر بڑی اہم کتابیں سامنے آئی ہیں۔ ان میں ایک تو وہ لٹریچر ہے جو جماعتِ اسلامی، تبلیغی جماعت، جمعیۃ العلماء اور جمعیۃ اہلحدیث کے متوسلین نے نظریاتی بنیاد پر شائع کیا ہے اور دوسرا وہ ذخیرہ ہے جو دینی مدارس کے علماء اور جدید تعلیمی درسگاہوں کے دانشوروں نے فکری و علمی موضوعات پر پیش کیا ہے اس میں جماعتِ اسلامی کی طرف سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کثیر تصانیف شائع ہوئی ہیں جن میں "الجہاد فی الاسلام"، "خطبات"، "تفہیمات" "تنقیحات"، "پردہ" اور "خلافت و ملوکیت" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا صدرالدین اصلاحی مولانا جلال الدین انصر عمری، مولانا محمد یوسف اصلاحی، وحیدالدین خاں، نجات اللہ صدیقی، مولانا سید حامد علی، مولانا سید حامد علی کی تصانیف ان کے "ادارۂ شہادتِ حق" نے الگ بھی چھاپی ہیں، مائل خیرآبادی اور عروج قادری وغیرہ کی تصانیف بھی اس سلسلے کی اہم کڑی ہیں۔

تبلیغی جماعت کے سلسلے میں "تبلیغی نصاب" مرتبہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی، "چھ باتیں"، "تبلیغی تحریک کی ابتدا اور اس کے بنیادی اصول" از میاں جی محمد عیسیٰ "حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت" از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور "حیات الصحابہ" از مولانا محمد یوسف صاحب بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

جمعیۃ العلماء نے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی تصنیفات نیز "علماء ہند کے شاندار ماضی" از مولانا محمد میاں وغیرہ کے ذریعہ اردو کی اسلامی کتابوں کے ذخیرہ میں اضافہ کیا ہے۔ جمعیۃ اہلحدیث نے بھی اس سلسلے میں بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ انھوں نے امام ابن تیمیہ ان کے متوسلین شیخ محمد بن عبدالوہاب اور مذہبی امور پر کافی کتابیں اپنے نقطۂ نظر کے تحت باقاعدہ تصانیف یا تراجم کے روپ میں اردو قارئین کی نذر کی ہیں۔

ان کے علاوہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی اور پروفیسر مشیر الحق کی مرتبہ "فکر اسلامی کی تشکیل جدید"، مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی "اسلام میں غلامی کی حقیقت"، مولانا ظفیر الدین کی "اسلام کا نظام عفت و عصمت"، مولانا حفظ الرحمٰن کی "اسلام کا اقتصادی نظام"، حامد الانصاری غازی کی "اسلام کا نظام حکومت"، پروفیسر خلیق احمد نظامی کی "تاریخی مقالات" اور "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات"، مولانا محمد تقی امینی کی "عروج و زوال کا الٰہی نظام" اور "مقالات امینی"، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی "ارکان اربعہ" "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" اور "اسلام اور غیر اسلامی تہذیب" مولانا محمد منظور نعمانی کی "اسلام کیا ہے؟" اور "دین و شریعت" بھی بہت مقبول ہیں۔

ان اسلامی کتابوں کے علاوہ اردو میں شائع ہوئی ان کتابوں کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جو نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ارکان و مسائل و احکامات کے سلسلے میں تصنیف کی گئیں۔ ان کے علاوہ وہ سفرنامے بھی کافی اہم ہیں جو اردو میں حج کے سفر کے بعد آج تک بڑی تعداد میں لکھے گئے ہیں۔

پھر یہ سب کچھ نثر تک ہی محدود نہیں، بلکہ شعرائے کرام نے بھی قرآن و حدیث کے جزوی منظوم تراجم بھی کیے ہیں۔ نعت، منقبت اور شہدائے کربلا کی یاد میں کہے گئے مرثیے بھی اردو کے اسلامی لٹریچر کا اہم جز ہیں

آخر میں اس بات کا اعتراف کر لینا ضروری ہے کہ راقم الحروف اردو میں اسلامی کتب کے بحر ذخار سے نہ تو خود کوئی خاص استفادہ کر سکا اور نہ ہی قارئین کے لیے کوئی خاص معلومات و مواد بھی فراہم کرنے میں کامیابی پا سکا۔ لیکن یہ منتشر معلومات اور اردو میں اسلامی کتب کے ذخیرے سے یکجا کیے گئے یہ اجزائے پریشاں اور بے ربط تحریر اس بات کا ہمیں بہر طور احساس دلاتی ہے کہ اردو باوجود علمی زبانوں میں اپنی کمسنی اور موجودہ دور میں اپنی مظلومی و بیکسی کے ہر موضوع پر اسلامی لٹریچر کی امین ہے اور بلاشبہہ اسے عالم اسلام بلکہ دنیا کی کسی بھی زبان میں موجود اسلامی لٹریچر کے مقابلے میں پورے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔

"سیرۃ النبی اول تا ششم کے اس ضخیم اور عظیم الشان کارنامے کی مثال اردو میں یا کسی اور زبان میں کیا ہوتی، عربی میں ملنا مشکل سی ہے۔ سید سلیمان ندوی کا یہی ایک کارنامہ انھیں سلیمان اعظم بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ زندگی بھر وہ کچھ اور نہ کرتے، تنہا یہی اپنی یادگار چھوڑ جاتے جب بھی ان کا نام نامی رہتی دنیا تک روشن رہتا۔ رسول کریمؐ کے ممتاز سیرۃ نگاروں کی صف اول میں انھیں جگہ ملتی اور حشر میں اپنے جد اعلا کی نگاہ کرم اور شفقت کے روبرو سہیلی اور قسطلانی اور زرقانی کے زمرہ میں وہ بھی محشور ہوتے لیکن سیرۃ النبی کے جلو میں تو ایک پورا لشکر بھی ہے۔ رحمت عالمؐ اور ارض القرآن سیرت عائشہؓ اور خطبات مدراس، نقوش سلیمانی اور خیام، عرب و ہند کے تعلقات اور حیات شبلی چھوٹی بڑی نئی پرانی دینی علمی ادبی درجنوں کتابوں کے مصنف اور بیشمار مقالات کے راقم کو کوئی اردو خواں بھلانا چاہے تو بھی کیسے بھلا سکتا ہے۔" (مولانا عبدالماجد دریا بادی)

انجمن کی اہم مطبوعات

انتخاب کلام میر	مولوی عبدالحق	۹/-
اردو ساہتیہ کا اتہاس (ہندی)	احتشام حسین	۷/۲۵
اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ	مولوی عبدالحق	۴/-
اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے	عنوان چشتی	۱۴/-
آزادی کے بعد کی اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ	بشیر بدر	۳۰/-
اقبال کے نثری افکار	عبدالغفار شکیل	۱۰/۵۰
اردو میں تمثیل نگاری	منظر اعظمی	۳۰/-
انتخاب سعید شہیدی	سعید شہیدی	۴/-
انتخاب کرشن موہن	کرشن موہن	۱۰/-
انتخاب سکندر علی وجد	سکندر علی وجد	۱۰/-
اردو شاعری میں خودداری	سلام سندیلوی	۶/-
بھگوت گیتا (ترجمہ)	محمد اجمل خاں	۳/۵۰
تذکرہ گلشن سخن	مرتبہ سید مسعود حسین رضوی	۸/-
تاریخ ادبیات تاجکستان	ترجمہ کبیر احمد جائسی	۱۳/-
تقویم ہجری و عیسوی	زیڈ، اے ڈیسائی	۶/۵۰
خسرو کا ذہنی سفر	ظ۔ انصاری	۱۰/-
دیوان اثر	کامل قریشی	۱۸/-
دہلی کے اردو مخطوطات	مرتبہ صلاح الدین	۱۲/-
سب رنگ	مخمور سعیدی	۵/-
سرسید کی صحافت	اصغر عباس	۱۵/-
سخن مختصر	معین احسن جذبی	۴/-
صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات	مرتبہ عتیق صدیقی	۱۵/-
صحیفۂ خوشنویسان	احترام الدین احمد شاغل	۱۲/-
غالب	خورشید اسلام	۱۸/-
فائز دہلوی اور دیوان فائز	مرتبہ مسعود حسین رضوی ادیب	۱۲/-
فن شاعری (بوطیقا)	ترجمہ عزیز احمد	۶/۵۰

اردو، عربی، فارسی کی تمام مطبوعات ہم سے طلب کریں

قومی یکجہتی اور سیکولرازم	ترجمہ شمیم حنفی	۳/۵۰
کلام سودا	ترتیب خورشید اسلام	۸/۵۰
کچھ ذرے کچھ تارے	آنند نرائن ملا	۳/۵۰
گاندھی نہرو کی راہ پر	سید عابد حسین	۵/۵۰
گلکرسٹ اور اس کا عہد	عتیق صدیقی	۲۰/-
مرزا محمد رفیع سودا	خلیق انجم	۲۵/-
مسافت شب	زبیر رضوی	۱۰/-
نقش صدا	رفعت سروش	۵/-
اذان ظفر	خلیل الرحمن اعظمی	۱۰/-
نیاز فتحپوری	امیر عارفی	۱۵/-
ہجر کے موسم	شہریار	۱۰/-
یم بہ یم	مظفر حنفی	۱۰/-
یادگار حالی	بیگم صالحہ عابد حسین	۱۳/-

یہ کتابیں بھی ہم سے طلب کیجئے

کتاب شناسی	ظ۔ انصاری	۲۵/-
نظیر نامہ	مرتبہ شمس الحق	۴۰/-
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	۹/-
تمرتا	صلاح الدین پرویز	۴۰/-
اردو افسانہ روایت اور مسائل	گوپی چند نارنگ	۷۵/-
نئی نظم نئے دستخط	مرتبہ شاہد ماہلی	۱۵/-
ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ	ڈاکٹر صادق	۴۰/-
اسپارٹاکس (ڈرامہ)	ترجمہ انیس اعظمی	۱۸/-
غالب اور سرور	ایم حبیب خاں	۱۲/-
دیوان غالب	مرتبہ مالک رام	۱۲/۵۰
تذکرہ	ابوالکلام آزاد مرتبہ۔ مالک رام	۲۵/-
حصار آب	حیات لکھنوی	۱۰/-

پتہ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر راؤز ایوینیو نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

QA.PN-8

نسیم انہونوی

لکھنؤ میں اردو کتابوں کی نشرواشاعت

مجھے یاد ہے کہ درسی کتب کے ساتھ ہی مجھے ناولوں کے مطالعہ کا شوق تقریباً سنہ۲ئ سے ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ناول نہایت ہی معمولی رف کاغذ پر شائع ہوا کرتے تھے۔ اور ان پر عموماً اس پتلے کاغذ کا کور رہتا تھا جس سے پتنگ بنتے تھے۔ ان ناولوں پر جو قیمتیں طبع ہوا کرتی تھیں ان سے بہت ہی کم قیمت پر فروخت ہوا کرتے تھے۔ تاجرانہ نرخ ناولوں کا جزو کے حساب سے ہوا کرتا تھا مثال کے طور پر ۹۶ صفحات کا ناول چھ پیسے میں ملتا تھا۔ حالانکہ قیمت اس پر ایک روپیہ چھپی ہوا کرتی تھی۔

اس زمانے میں نولکشور کا چھاپہ خانہ ہندستان کا سب سے بڑا چھاپہ خانہ تھا جس میں اردو اور فارسی کی صدہا بیش بہا کتب، قرآن پاک تفاسیر اور ضخیم ضخیم علمی ادبی اور مذہبی کتابیں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی ناول بھی چھپتے تھے۔ اسی طرح فروخت ہوتے تھے جس طرح میں نے اوپر لکھا ہے یہ عظیم الشان ادارہ کچھ عرصہ قبل دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک بھائی نے راجہ رام کمار بکڈپو کے نام سے اور دوسرے نے تیج کمار بکڈپو کے نام سے علیحدہ علیحدہ کام شروع کیا۔ لیکن نولکشور بکڈپو کی شان رفتہ رفتہ ختم ہو گئی، ورثہ میں جو کتب ملی تھیں، ان کے ختم ہونے کے بعد اشاعتی رفتار بہت ہی سست ہو گئی۔ نسبتاً تیج کمار بکڈپو اب بھی اردو کی اچھی اور کافی کتابیں شائع کر رہا ہے۔

نولکشور کے بعد بھارگو اسکول بکڈپو بہت قدیم اور نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ یہ اشاعتی ادارہ ۱۸۹۲ء میں قائم ہوا تھا۔ اس ادارے سے بنارس ہندو یونیورسٹی اور الہ آباد ایجوکیشنل بورڈ کی نصابی کتب شائع ہوتی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ کافی تعداد میں ناول بھی شائع ہوتے تھے۔ لیکن افسوس ۱۹۵۷ء میں یہ عظیم اشاعتی ادارہ ختم ہو گیا۔

ان اداروں کے بعد دلگداز پریس خصوصیت سے قابل ذکر ہے، جس سے اردو کے مشہور مورخ اور ناول نگار مولانا عبدالحلیم شرر کی ایسی تصانیف اور تالیفات شائع ہوئی تھیں جنھیں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی۔ اور میرا خیال ہے کہ دور سابق میں نولکشور بکڈپو کے بعد دلگداز پریس ہی کا نمبر تھا جس کی مطبوعات کی فہرست لمبی چوڑی تھی۔

نولکشور بکڈپو کے زمانہ شباب میں لکھنؤ کے اور جو ادارے اردو کی کتابیں شائع کر رہے تھے ان میں عاصی پریس تاریخی ناولیں شائع کرتا تھا۔ مرزائی پریس سے مذہبی کتب کی اشاعت ہوتی تھی۔ مکتبہ تیغ بہادر نے بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی سی کتابیں چھاپی تھیں۔

اسی دور میں مہادیو پرشاد ناولوں کے سب سے بڑے پبلشر تھے جنھوں نے سیکڑوں ناول چھاپے تھے۔ ان میں رسوا صاحب کے ناول قابل ذکر ہیں۔ افسوس کے اس ادارے کا اب کوئی وجود باقی نہیں رہا۔

ایک اشاعتی ادارہ جنٹلمین بکڈپو کے نام سے امین آباد میں ہیجانی ناولیں شائع کیا کرتا تھا، لیکن اب اس کا نام بھی کسی کو یاد نہیں۔

منسارام نامی ایک صاحب نے شرر تخلص رکھ کر چھوٹی چھوٹی کتابیں اور بازاری ناولیں چھاپنا شروع کیا تھا۔ کوئی مستقل دکان بھی نہ تھی۔ اس لیے فٹ پاتھ پر ہی ان کی کتابیں فروخت ہوتی تھیں۔

الناظر پریس مشہور لیڈر مولانا ظفر الملک کی ملکیت تھا۔ اس سے کافی علمی ادبی کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ کچھ کتابیں اب بھی دستیاب ہیں۔ لیکن ادارہ ختم ہو گیا۔

۱۹۴۸ء میں انوار بکڈپو کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا آفس پہلے وکٹوریہ اسٹریٹ پر تھا۔ اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں یہ ادارہ امین آباد پارک میں منتقل ہوگیا۔ اور آج تک اسی جگہ قائم ہے۔ ابتدا میں اس ادارے سے علمی و ادبی کتب شائع ہوتی تھیں۔ ۱۹۲۶ء سے منشی فاضل، منشی کامل وغیرہ اور مکاتب اسلامی کی کتب شائع ہونا شروع ہوئیں۔ ۱۹۳۰ء سے ہائی اسکول، انٹر اور یونیورسٹی نصاب کی کتابیں چھپنے کا سلسلہ قائم ہوا جو اب تک قائم ہے۔ اس ادارے کا شمار مقتدر اشاعتی اداروں میں ہے۔ فروغ اردو نام کا ایک اور اشاعتی ادارہ جو انوار بکڈپو ہی کی ایک شاخ ہے ۱۹۶۵ء سے برابر ادبی تنقیدی کتب شائع کر رہا ہے۔

صدیق بکڈپو بھی قدیم ترین اشاعتی ادارہ ہے۔ جس کی بنیاد ۱۹۱۷ء میں پڑی۔ اس ادارے نے مختلف مباحث پر کافی کتابیں ایک عرصہ تک شائع کیں۔ لیکن بعد میں اشاعت کا سلسلہ بند ہوگیا۔ بکڈپو ابھی تک قائم ہے اور اردو کی قدیم مطبوعات کا مرکز ہے۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت کا بکڈپو جو کہ میں شعراء اور ادباء کی نشست کا اڈہ تھا خواجہ صاحب کو لکھنؤ کی بیگماتی زبان پر کافی عبور حاصل تھا۔ انہوں نے لکھنؤ اور اس کی تہذیب و ثقافت پر متعدد کتابیں لکھیں اور شائع کی تھیں۔ افسوس کے ان کے انتقال کے ساتھ ہی ادارہ ختم ہوگیا۔

یوسفی پریس فرنگی محل اب موجود نہیں لیکن ۴۴ - ۴۵ سال قبل اس نے اکثر کتابیں شائع کی تھیں۔

خود میرا ادارہ نسیم بکڈپو کے نام سے ۲۸ء میں قائم ہوا۔ اس نے اب تک اردو کے سو سے زائد مصنفین، مؤلفین اور مترجمین کی ایک ہزار سے زائد کتابیں شائع کی ہیں جن میں علمی ادبی، شعری تنقیدی، تاریخی اور نصابی کتب کے ساتھ ہی سماجی جاسوسی۔ مہماتی اور تاریخی ناول اور بچوں کی کہانیاں شامل ہیں۔

اودھ بکڈپو کے نام ایک ادارہ ۲۸ء میں قائم ہوا۔ یہ ادارہ تقریباً ۴۰ سال قبل قائم ہوا تھا۔ اس نے خان محبوب طرزی کے چند ناول شائع کیے تھے۔ اب اس کا کوئی وجود نہیں۔

اردو کے بہترین خطاط جواد صاحب کا نظامی پریس بھی اس زمانے میں بہت مشہور تھا۔ اس نے بہت سی کتابیں اثنا عشری فرقے سے متعلق شائع کی تھیں۔ نظامی پریس ابھی تک موجود ہے۔ اور فرقے کی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی کسی حد تک جاری ہے۔ اس کا قیام ۱۹۲۸ء میں ہوا تھا۔

کتب خانہ قادریہ بھی ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے جو چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کرتا رہا ہے۔

مکتبۂ الفرقان مولانا منظور صاحب نعمانی کی ذات گرامی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس ادارہ کا قیام ۱۹۳۴ء میں عمل میں آیا تھا۔ اب تک اس نے کافی مذہبی کتب شائع کی ہیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

مکتبۂ اسلامی گوئن روڈ ۱۹۴۱ء سے اشاعت کا کام کر رہا ہے اس نے بچوں اور خواتین کے لیے مذہبی اور اصلاحی کتابیں شائع کی ہیں۔

دانش محل ایک بہت مشہور ادارہ ہے۔ جو نسیم صاحب کی ملکیت ہے۔ اس کا قیام ۱۹۴۲ء میں ہوا تھا۔ اس نے پہلے متعدد ادبی کتابیں شائع کی ہیں۔ لیکن اب اشاعتی سرگرمی کم ہوگئی ہے۔

۱۹۴۶ء میں کتابی دنیا کے نام سے اظہر نگرامی صاحب نے ایک اشاعتی ادارے کی بنیاد ڈالی تھی جس سے افسانوی ادب کی کافی کتابیں شائع ہوئیں۔ ادارہ قائم ہے۔ لیکن اشاعتی سرگرمیاں ختم ہوگئیں۔

مکتبہ دین و دانش کافی عرصہ سے بچوں کے لیے مذہبی، معلوماتی اور تاریخی کتب کی اشاعت کر رہا ہے۔

ہلال بکڈپو مکتبۂ رزاقی کانپور کی ایک شاخ ہے۔ چند سال سے یہ کچہری روڈ پر قائم ہے۔ یہ بھی مذہبی کتب کی اشاعت کر رہا ہے۔

مکتبۂ دین و ادب کے نام سے ۱۹۷۱ء میں ایک ادارے کا قیام چند سال قبل میں آیا ہے۔ اس نے بھی مختلف مباحث پر اب تک کافی کتابیں شائع کی ہیں۔

نصرت پبلشر کا قیام ۱۹۷۰ء میں عمل میں آیا۔ اس نے ترقی پسند مصنفین کی بہت سی کتابیں بڑے سلیقے سے شائع کی ہیں۔

خورشید بکڈپو کا قیام ۱۹۷۰ء میں عمل میں آیا۔ اس نے زیادہ تر مذہبی کتابیں شائع کی ہیں۔ کچھ عرصے سے نصابی کتب بھی شائع کر رہا ہے اس کے مالک خورشید صاحب ہیں۔

مجلس تحقیقات ونشریات اور ادارہ ثقافت اسلامیہ دو نہایت معیاری اشاعتی ادارے ہیں جن کا تعلق مولانا علی میاں کی ذات گرامی سے ہے اور موصوف کی بہی بلند پایہ معیاری مذہبی کتب ان اداروں نے شائع کی ہیں اور برابر شائع کر رہے ہیں۔

مکتبہ فردوس ایک نیا ادارہ ہے۔ لیکن چند ہی برسوں میں اس نے کئی معیاری مذہبی اور علمی کتب شائع کی ہیں۔

کتاب نگر کے نام سے پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب نے ایک ادارہ اپنی تصانیف وتالیفات کی اشاعت کیلیے قائم کیا تھا۔ کافی علمی و ادبی کتابیں شائع ہوئیں۔ کسی حد تک یہ سلسلہ ابھی تک قائم ہے۔

مکتبہ تعلیمات اسلام کی زندگی مختصر تھی۔ چند کتابیں بچوں کے لیے شائع کیں اور عربی تعلیم حاصل کرنے کی معاون کتب چھاپیں۔ عرصہ ہوا ادارہ ختم ہوگیا۔

دارالاشاعت اسلامیہ چوک لکھنؤ سے بھی چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں۔

احباب پبلشرز نے اثنا عشری فرقے کی مذہبی کتب کے علاوہ بیسک ریڈرس بھی شائع کی ہیں۔ ادارہ کا کام ابھی تک جاری ہے۔

اثنا عشری فرقے کی مذہبی کتابیں شائع کرنے والے دیگر اداروں کے نام حسب ذیل ہیں۔

الواعظ پریس مدرستہ الواعظین۔ العلم بکڈپو۔ نورالمطابع مکتبہ ایمان۔ امامیہ مشن۔ مجاہد بکڈپو۔ صادق بک ڈپو۔ کتب خانہ اثنا عشری۔ شاندار بکڈپو۔ کتب خانہ باقریہ۔ محبوب بکڈپو۔ نظارہ بکڈپو۔ عفرانیہ مشن۔ المنتظر پبلشر۔

ذکی کاکوروی نے مرکز ادب اردو نام کا ایک ادارہ اپنی تصانیف اور تالیفات کی اشاعت کے لیے قائم کیا۔ جس سے اب تک کافی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

۱۹۷۱ء سے اردو سماج پبلی کیشنز کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ اب تک کافی علمی ادبی اور افسانوی کتب شائع کر چکا ہے۔ اس کے روح رواں ڈاکٹر سلمان عباسی صاحب ہیں۔

اردو کے مشہور شاعر ہی نہیں استاد جناب عمر انصاری صاحب کا ادارہ فردوس ادب بھی قابل ذکر ہے جس نے متعدد شاندار شعری کتب شائع کی ہیں۔

اترپردیش اردو اکیڈمی ایک سرکاری ادارہ ہے جو اردو کی ترقی کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس ادارے نے بھی متعدد علمی اور ادبی کتابیں شائع کی ہیں۔

ان اشاعتی اداروں کے ساتھ ہی پچاسوں شعراء اور ادباء نے اپنی تصانیف وتالیفات کی خود ہی اشاعت کی۔ ان کے ناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس لیے میں نے انہیں نظرانداز کر دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت سے پہلے بھی زیادہ تعداد میں اردو کتب کی اشاعت ہو رہی ہے۔ مگر معیار طباعت گرتا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد کچھ ایسی مخالف ہوا چلی کہ لوگوں نے کتابت اور طباعت وغیرہ کا فن حاصل کرنا چھوڑ دیا۔ سن رسیدہ کاتب اس عرصہ میں اکثر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ چند اچھے خوش نویسوں نے اپنا دائرہ کار شادی کارڈس لکھنے تک محدود کر دیا۔ چند اردو اکیڈمی اور قومی آواز سے متعلق ہو گئے۔ جو عام ناشرین کتب کے مقابلے میں زیادہ اجرت دے سکتے ہیں۔ اس طرح کاتبوں کے ساتھ ہی لیتھو مشین کا کام کرنے والے اور پلیٹ ساز بھی کم ہوتے چلے گئے۔ گو ادھر چند سال سے پھر اردو کا چرچا ہونے لگا ہے۔ اور اکثر لوگوں نے کتابت کا کام سیکھنا بھی شروع کر دیا ہے۔ لیکن اس میں ابھی تک کوئی بھی فنکار کہلانے کا مستحق نہیں بن سکا۔

اس سے بھی بڑی دشواری یہ ہے کہ لیتھو پریس کی مشینیں جو کبھی جرمن سے بن کر یہاں آیا کرتی تھیں عرصہ دراز سے نہیں آرہی ہیں۔ اس لیے بھی کہ انہیں درآمد کرنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ اور اس لیے بھی کہ غیر ملکی صنعت کاروں نے گذشتہ پچاس برسوں میں بہت ہی تیز رفتار مشینیں تیار کرنے لگے ہیں۔ اور اب لیتھو کے چھکڑے جیسی مشینیں کون تیار کرے۔ لکھنؤ میں اس

وقت ۷۰۔۸ پریس ہیں لیکن ان میں وہی پرانی مشینیں چل رہی ہیں جو ۱۹۳۰ء سے پیشتر مشینیں امپورٹ ہوئی تھیں۔ ان کی حالت نا… ہے اور اس طرح انہیں چلایا جارہا ہے جس طرح کسی ضعیف آدمی کو دواؤں اور انجکشنوں کے ذریعہ زندہ رکھا جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ حکومت ہند اگر واقعی اردو کو ترقی دینا چاہتی ہے تو پنجاب کے مشین سازاداروں کو آرڈر دے کر نئی مشینیں تیار کرائے۔

لکھنؤ میں بجلی کا مسئلہ بھی پریس کے لیے دشواری کا باعث ہے۔ زیادہ تر پریس شہر کے مغربی حصے میں ہیں جہاں بجلی کا ہمیشہ ہی فقدان رہتا ہے۔ اکثر کئی کئی روز تک پریس پاور نہ ملنے کے باعث بند رہتے ہیں۔

چونکہ اردو پڑھنے کا شوق بڑھا ہے لیکن اردو پڑھنے والے کم ہیں اس لیے عام کتابیں اتنی کم تعداد میں چھپتی ہیں کہ انہیں آفسیٹ مشینوں پر چھاپنا دشوار ہے۔ ویسے لکھنؤ آفسیٹ پریس ہیں مگر دہلی وغیرہ کی طرح افراط نہیں ہیں۔ صرف ایک ہی پریس ہے اور وہ بھی زیادہ تر سرکاری یا ایسے کام چھاپتا ہے جو لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں۔

> "مولانا ابوالکلام آزاد بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے "ارمغان فرخ" کے نام سے ایک گلدستہ نکلتا تھا جس کی ماہانہ طرحوں پر کلکتہ میں جو مشاعرے ہوتے تھے اسی زمانے کی کہی ہوئی غزلیں اس گلدستہ میں شائع ہوتی تھیں۔ مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوقی رامپوری کلکتہ میں مقیم تھے انھیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ مولانا جو غزلیں مشاعروں میں سناتے ہیں وہ انہی کی ہوتی ہیں ایک دن مولانا مسجد سے نکل رہے تھے۔ نادر شاہ خاں نے روک لیا اور کہا کہ ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے میں بیمار ہوں اور وہ غزل کے لیے تقاضا کررہے ہیں چند شعر اسی وقت کہہ دو۔ انھوں نے زمین بتائی "یاد نہ ہو" "شاد نہ ہو" مولانا نے ایک کتب فروش کی دکان پر بیٹھے بیٹھے چھ شعر کہہ دیے نادر شاہ خاں بولے اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیے۔ مولانا نے بے توقف کہا ؎
>
> وعدۂ وصل بھی اک طرفہ تماشائی کی ہے بات
> میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو
>
> نادر شاہ خاں نے کہا کہ صورت سے تو تم بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی۔"



قرآن مجید عکسی حوالے ۵ چکنا کاغذ مجلد رنگین ہدیہ ۔۱۴

المنجد (مفتاح اللغات) ستر ہزار کے قریب الفاظ محاورات، ضرب الامثال اور جدید عربی اصلاحات کا مجموعہ، باتصویر سائز ۲۰×۳۰/۸ رنگین جلد صفحات ۱۳۰۰ کے قریب قیمت ۔/۷۵

جدید فیروز اللغات اردو عکسی، ستر ہزار کے قریب اردو الفاظ محاورات، ضرب الامثال اور جدید اصطلاحات کا مجموعہ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ چکنا کاغذ قیمت ۔/۲۵

کلیات اقبال عکسی (صدی ایڈیشن) جاوید اقبال صاحب صاحبزادہ علامہ اقبال کے زیر نگرانی تصحیح شدہ نسخہ بہترین کتابت، چکنا کاغذ قیمت ۔/۱۸ بال جبریل ۔/۷ بانگ درا ۔/۸ ضرب کلیم معہ ارمغان حجاز ۔/۸ شکوہ جواب شکوہ ۔/۱

مجموعہ خطب دوازدہ ماہی عکسی (خطبات الاحکام) (مولفہ مولانا اشرف علی تھانویؒ) ۔ ہر خطبہ کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ سائز ۲۰×۲۶ قیمت پیپر بیک ۔/۱۱٫۵۰ مجلد ۔/۱۲٫۵۰

بہشتی ثمر عکسی (بچوں کا بہشتی زیور) مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مایہ ناز کتاب بہشتی زیور سے بچوں کے لیے آسان اور عام فہم مسائل کا مجموعہ قیمت اول ۔/۵ دوم ۳/۷۵

شرح اسماء الحسنیٰ اللہ تعالیٰ کے ۹۹ ناموں کے ورد کے ذریعہ آپکی بیماریوں اور مصیبتوں کا علاج فضائل اسم اعظم اور وظائف ۔/۱۱

آمدنامہ عکسی سائز ۲۳×۳۶/۱۶ صفحات ۲۴ قیمت ۔/۱٫۲۵

شاہنامہ اسلام اول عکسی سائز ۱۷×۲۷/۸ قیمت ۔/۱۰

خانہ کعبہ پر ناپاک حملہ مصنف م۔ افضل خانہ کعبہ پر مرتدوں کے ناپاک حملہ کی پوری داستان، موقع پر موجود حاجیوں کے انٹرویو ـــــــ قیمت ـــــ ۔/۵

QA|PN-19

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی



اردو کے اشاعتی مسائل

حبیب تنویر نے اپنے مشہور ڈراما آگرہ بازار میں ایک تاجر کتب کا کردار پیش کیا ہے جس کی دکان پر اہل علم کا ایک مجمع لگا ہوتا اور جہاں عصری مسائل پر بحث و مباحثہ ہوتا یہ بات افسانوی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ تاجر کتب بے علم تاجر نہیں ہوتے تھے۔ ان کی دکان ایک تہذیبی ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ آزادی سے پہلے دہلی میں آغا شاعر قزلباش کے صاحب زادے آغا سرخوش قزلباش کی ایک دکان اردو بازار میں تھی جس کا نام "نگارستان بک ایجنسی"، تھا۔ یہاں ادیبوں اور شاعروں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ پھر وہ پاکستان چلے گئے تو کتب خانہ عزیزیہ کے مولانا سمیع اللہ نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ یہ چھوٹی سی دکان برسوں ادیبوں اور شاعروں کا مرکز رہی۔ جہاں جوش ملیح آبادی سے لے کر استاد رسا تک شام کو تشریف فرما نظر آتے۔ بہت سے لوگ ان شعراء کو دیکھنے اردو بازار سے گزرا کرتے تھے۔ لکھنؤ میں ایک زمانے میں یہی حال حافظ محمد صدیق اور ان کی دکان صدیق بک ڈپو کا تھا۔ یہ ادارہ ہم عصر ادیبوں کی آوازوں سے گونجا کرتا تقسیم کے بعد حالات بدلے ادیب اور شاعر بکھر گئے تو لکھنؤ میں دانش محل نے اس بزم کو آراستہ کیا۔ احتشام صاحب، سرور صاحب ڈاکٹر محمد حسن کے علاوہ کتنے ادیب اور شاعر تھے جو یہاں رونق افروز رہا کرتے تھے۔ بمبئی میں مکتبہ جامعہ کی چھوٹی سی دکان شاہد علی خاں کی وجہ سے ایک تہذیبی انجمن بن گئی تھی۔ پھر جب علی گڑھ میں مکتبہ جامعہ نے اپنی شاخ قائم کی تو بزمی صاحب کی آمد اور ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ میں اسد یار خاں کی بزم آرائیوں نے شہرت حاصل کی۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کتابوں کی دکان کی حیثیت ایک تہذیبی انجمن کی حیثیت رہی ہے۔ چائے کی پیالیوں کی کھنکھناہٹ کے درمیان بڑے بڑے ادبی معرکے ہوتے ہیں جن کا ذکر کبھی کبھی سننے میں آتا ہے۔ یہاں مختلف نظریات اور خیالات کے شاعر اور ادیب بیٹھتے اور اپنی اپنی بولیاں بولتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ادیب اور شاعر جس شہر میں جاتے ہیں وہ ایسی مرکزی دکانوں کی تلاش کر لیتے لیکن اردو کی زبوں حالی نے اردو کی کتابوں پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔ یہاں تک کہ دہلی کے اردو بازار میں بھی اب آہستہ آہستہ کتابوں کی دکانیں پیچھے ہٹتی جا رہی ہیں۔ حالی پبلیشنگ ہاؤس کی جگہ اب بجلی کے سامان کی دکان نے لے لی ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب لوگ یہ پوچھیں گے پھر اردو بازار ہی کیوں؟

اب جو ذرا بہت رونق ہے وہ کتابوں کی دکانوں کی نہیں اشاعتی اداروں کی ہے۔ یوں تو ہندستان میں اشاعتی اداروں کی اچھی خاصی تعداد ہے لیکن زیادہ تر ایسے ادارے ہیں جو غیر ادبی اشاعتی کاروبار کرتے ہیں۔ بڑے اشاعتی اداروں میں مکتبہ جامعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ، انجمن ترقی اردو (ہند) ترقی اردو بورڈ نیشنل بک ٹرسٹ، شمع بک ڈپو، نسیم بک ڈپو، ہند پاکٹ بکس، مکتبہ الفاظ، ناولستان وغیرہ طباعتی سرگرمیوں میں برابر حصہ لے رہے ہیں۔

مکتبہ جامعہ نے آزادی کے بعد سے درسی کتابوں کے ساتھ ادبی و معیاری کتابیں شائع کی ہیں، اور اردو کے صف اول کے ادیبوں کی خدمات حاصل کی ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور جامعہ کے ادیبوں کے علاوہ دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی خدمات حاصل کیں ان میں عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر

فیض احمد فیض، خورشید الاسلام، رشید حسن خاں، قمر رئیس ڈاکٹر محمد حسن کے نام قابل ذکر ہیں۔

انجمن ترقی اردو، ایک زمانے میں اردو کا اہم ترین ادارہ تھا۔ اس لیے اس سے اردو والوں نے بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ اس کے پاس وسائل کی بھی کمی نہیں۔ اس ادارے نے قاضی عبد الغفار اور پروفیسر آل احمد سرور کی رہنمائی میں بڑے زور شور سے کام کیا۔ پھر یہ ادارہ دہلی منتقل ہوا تو خیال ہوا کہ اب اس کی اپنی عمارت ہوگی۔ اپنا کل وقتی جنرل سکریٹری ہوگا تو پھر اس کی اڑان کا کیا مقابلہ ــــ لیکن شاید دہلی کی آب و ہوا اس کو راس نہ آئی۔ انھوں نے جو کتابیں شائع کی ہیں، وہ انجمن کے اپنے معیار کے پیش نظر کچھ زیادہ قابل فخر نہیں ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ انجمن ترقی اردو کے ارباب حل و عقد اس کے بارے میں غور کریں، اور ان حالات کے اسباب کی طرف غور کریں، اور اس آکاس بیل کو اتار پھینکیں جو ادارہ کی سرسبزی اور شادابی کو ختم کر رہی ہے۔ بہر حال جو ہمارے یہاں اردو پر وقت پڑا ہے اس کی جھلک انجمن ترقی اردو میں بھی نظر آرہی ہے۔ اب تو اس سے زیادہ ترقی اردو بورڈ نے کام کیا ہے جس کی عمر شاید ابھی دس سال سے زیادہ نہیں ہے۔ عام طور پر سرکاری ادارے رسمی فرائض انجام دیتے ہیں لیکن ترقی اردو بورڈ نے اپنی تمام مجبوریوں اور رکاوٹوں کے باوصف غیر معمولی کام کیا۔

اردو ادب کی تاریخ میں دارالترجمہ، حیدرآباد کے ساتھ ترقی اردو بورڈ کا بھی نام آئے گا حالانکہ اسے یکسوئی کے ساتھ کوئی سربراہ نہیں مل سکا لیکن اس کے پبلیکیشنز انچارج اپنی ذمہ داریوں کو نباہتے رہے۔ اور دفتری قیود و بند کے باوجود اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ اس ادارے سے ممتاز ادیب اور دانشور وابستہ رہے ہیں۔ جیسے ڈاکٹر عبد العلیم، حیات اللہ انصاری اور شمس الرحمٰن فاروقی۔ فاروقی صاحب نے بڑے زور و شور سے کام کیا، لیکن پھر کھائیوں اور ندی نالوں نے انھیں روک دیا۔ شاید سرکاری افسروں کو یہ ترقی پسند نہیں آئی۔

تاہم ترقی اردو بورڈ نے جو خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ترقی اردو بورڈ کو ممتاز ادیبوں اور دانشوروں کی خدمات حاصل رہی ہیں۔ پروفیسر محمد مجیب ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر تارا چند، خواجہ غلام السیدین، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، رشید حسن خاں، ڈاکٹر سلامت اللہ خاں ڈاکٹر ظ۔ انصاری، اختر انصاری، گیان چند وغیرہ۔ نے کتابیں لکھی بھی اور ترجمہ بھی کی ہیں۔

دہلی میں شمع بک ڈپو نے بڑا شاندار طباعتی معیار قائم کیا لیکن ان کا معاملہ ادبی ذوق کا کچھ ایسا تھا کہ انھوں نے سستے رومانی ناول چھاپے اور ایسی کتابوں کی اشاعت کی جو ماہنامہ شمع کی ترجمانی کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے سنجیدہ، علمی، ادبی کتابیں کبھی شائع نہیں کیں۔ اگر حافظ محمد یوسف دہلوی اور یونس دہلوی ایک اشاعتی ادارہ قائم کرتے تو وہ یقیناً اس کام کو بڑے پیمانے پر کرسکتے ہیں اور اردو کی ادبی اشاعت کو بڑا سہارا ملے۔ ان کے پاس شمع، بانو اور کھلونا جیسے کثیر الاشاعت رسالے ہیں جو ان کتابوں کی فروخت میں ممد و معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔ یہ بہت بڑی ادبی، تہذیبی اور لسانی خدمت ہوگی۔

علی گڑھ کو بعض اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یونیورسٹی کا اپنا پبلی کیشنز ڈویژن ہے۔ لیکن اس کی زیادہ تر توجہ درسی کتابوں کی طرف اور تحقیقی مقالوں کی اشاعت کی طرف رہتی ہے۔ علی گڑھ میں ادبی کتابوں کی اشاعت کی ذمہ داری ایجوکیشنل بک ہاؤس نے سنبھال رکھی ہے ویسے تو اس ادارے کی عمر ۵۶ سال ہے۔ لیکن پچھلے دس پندرہ سال سے اس ادارے نے معیاری ادبی کتابیں شائع کرکے ایک مثال قائم کی ہے۔ اسے بڑے ادیبوں کی سرپرستی حاصل ہے۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس نے جن ادیبوں کی کتابیں شائع کی ہیں ان میں قابل ذکر ہیں علامہ اقبال، فیض احمد فیض، وزیر آغا، قرۃ العین حیدر، رشید حسن خاں، نورالحسن نقوی، قمر رئیس، ابن فرید، ظہیر احمد صدیقی، عتیق احمد صدیقی

منظر عباس نقوی، وحید قریشی، حسن عسکری، محمد حسن، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، وقار عظیم، شمیم حنفی، خورشید الاسلام خلیق احمد نظامی، اطہر پرویز، عبادت بریلوی، خلیل الرحمٰن اعظمی، فضل امام، اختر انصاری، عبدالقادر سروری وغیرہ۔

ایجوکیشنل بک ہاؤس نے اردو کے کلاسیکی ادب کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے۔ اس سلسلے کے تحت کلاسیکی ادب کی اہم کتب شائع کی ہیں۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کی قیمتیں کم ہیں۔

ان کتابوں کو مستند ادیبوں نے ایڈٹ کیا ہے۔ یہ تمام کتب بہت خوبصورت آفسٹ سے ایک سیٹ کی شکل میں شائع کی گئی ہیں۔

جماعت اسلامی کی کتابوں کا اشاعتی سلسلہ تو رام پور سے شروع ہوا تھا۔ اب وہ دہلی اور دوسرے مقامات سے بھی کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ لیکن ان کا میدان مذہب ہے۔ تاہم انھوں نے ابن فرید اور انجم نعیم کی ادارت میں جو رسالہ "نئی نسلیں" شائع کیا ہے وہ بڑی حد تک ادبی ہے۔

بمبئی سے کُتب پبلشرز نے اردو کی کتابوں کا کام شروع کیا تھا۔ اس کے بعد تو ہند پبلشرز نے کچھ کتابیں شائع کیں اور یہ ادارہ دیکھتے دیکھتے مقبول ہوگیا۔ یہ زمانہ تھا جب بمبئی میں سلطان حسین نے بڑی اچھی کتابیں شائع کیں۔ اس کے بعد سے تو بمبئی میں نئے نئے ادارے بنتے اور بگڑتے رہے۔

حیدر آباد میں ادارہ اشاعت اردو نے بڑے پیمانے پر کام شروع کیا تھا۔ بڑی اچھی اچھی کتابیں شائع کیں۔ پھر نفیس اکیڈمی قائم ہوئی لیکن تقسیم ہند کے بعد یہ ادارہ پاکستان منتقل ہوگیا۔ اب آندھرا پردیش اکیڈمی اچھا خاصا کام کر رہی ہے۔ لیکن ان کی اشاعتی سرگرمیاں حیدر آباد کے ادیبوں تک محدود رہتی ہیں۔ اس وقت اس بات کی ضرورت ہے کہ حیدر آباد یو پی کے نقش ادب پر چلتے ہوئے اپنی سرگرمیوں کو کل ہند حیثیت دے کر اپنے وقار میں اضافہ کرے۔

سرکاری اداروں میں نیشنل بک ٹرسٹ نے بھی بہت اچھی کتابیں شائع کی ہیں۔ اس ادارے نے مختلف زبانوں کی اہم کتابوں کو اردو میں منتقل کیا۔ "آدان پردان" کے تحت انھوں نے ہندستان کی اہم کتابیں اردو میں بھی شائع کی ہیں۔ یہ کام اردو میں صرف نیشنل بک ٹرسٹ کر رہا ہے۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

اردو میں نئی کتابوں کی اشاعت کی جو گہما گہمی نظر آرہی ہے اس میں ریاستی اکیڈمیوں کی انعامی پالیسیوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ مصنفین اپنی کتابیں خود چھپواتے اور اسے انعام کے لیے پیش کرتے ہیں۔ اکیڈمی ان کتابوں کی چھپائی کے لیے بھی امداد دیتی ہے اور انعام سے بھی نوازتی ہے۔ اس طرح کتابوں کی طباعت کے اخراجات کو بڑی حد تک سہارا ملتا ہے۔

البتہ ایک اہم مسئلہ کتابوں کی فروخت ہے۔ کتابوں کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ انفرادی خریدار پہلے بھی کم تھے اور اب تو اور کم ہوگئے ہیں۔ زیادہ تر فروخت لائبریریوں کے ذریعہ ہو رہی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اردو لائبریریوں کی تعداد بڑھائی جائے۔

یہ کام حکومت اور اردو اکیڈمیاں بھی کر سکتی ہیں۔ اور پرائیویٹ اور پبلک اداروں کو بھی لائبریریوں کی تعداد بڑھانے میں اپنا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ ضرورت ہے کہ ہر محلے میں لائبریریوں کے قیام کی کوشش کی جائے۔ اس طرح کتابوں کی فروخت کو بڑا سہارا ملے گا۔

اردو زبان پر بُرا وقت پڑا ہے۔ اور اس کا ہر طرح مقابلہ کرنا چاہیے۔ زبان کو زندہ رکھنا تہذیب کو زندہ رکھنا ہے اور بغیر تہذیب کے قومیں زندہ نہیں رہ سکتیں یہ کام ہم اردو والوں کو کرنا ہے۔

"مولانا شبلی نعمانی نے ہمارے زمانہ کے پہلے مصنف ہیں جنہوں نے اپنی تالیفات میں فصاحت بیان اور سلاست عبارت اور لٹریچر کی تمام خوبیوں کے ساتھ اعتدال اور بے تعصبی اور انصاف کا لحاظ رکھا اور شاعرانہ خیالات اور ایشیائی مذاق کے موافق مبالغہ اور استعارہ، عبارت آرائی اور تصنع سے پاک اور بلاغت سے فلسفیانہ طرز پر سوانح عمری اور لائف کے لکھنے کا طریقہ جاری کیا۔"
(نواب محسن الملک)

ہماری چند اہم کتابیں

قرآن و حدیث

آسان تفسیر تیسواں پارہ (ابوسلیم محمد عبدالحی) ۲۵/۰
راہ عمل۔ جلیل احسن ندوی ۱۵/۰
یاایہا الذین آمنوا کا ترجمہ اور تفسیر۔ خالد تنویر ۱/۰
یاایہا الناس کا ترجمہ اور تفسیر ابوسلیم محمد عبدالحی ۱۵/۰
قوم یہود اور ہم (قرآن کی روشنی میں) عبدالکریم پاریکھ ۱/۰
لغات القرآن۔ عبدالکریم پاریکھ ۱۵/۰
فضائل القرآن۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی ۷/۰
قرآن بائیبل اور سائنس ترجمہ منہاج الدین مینائی ۲/۰

سیرت و تاریخ

حیات طیبہ۔ ابوسلیم محمد عبدالحی ۸/۰
تاریخ زوال ملت اسلامیہ علامہ اکبر شاہ خاں ۱۸/۰
شمائل رسول۔ شیخ یوسف بن اسمٰعیل ۸/۰
گلدستہ نبویؐ۔ نفائس جہلمی ۱۰/۰

عام دینی کتابیں

آؤ دین سیکھیں۔ ابوسلیم محمد عبدالحی ۹/۵۰
اسلام کی تعلیم " " ۶/۰
دین کی باتیں " " ۶/۰
جمعہ کے خطبے " " ۱۴/۰
دین کی خدمت " " ۵/۰
اسلامی فقہ مکمل جلد۔ مولانا مجیب اللہ ندوی ۴۵/۰
دین کی حفاظت۔ ابوسلیم محمد عبدالحی ۵/۰
کیا ہم مسلمان ہیں۔ شیخ محمد قطب ۱۰/۰
ایک ہی منزل۔ ابن عرفان ۶/۰
کتاب الصوم۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی ۷/۵۰
رسول اللہ صلعم کا طریقہ نماز۔ مولانا سلیمان قاسمی ۸/۰

اصلاح معاشرہ و خواتین کیلیے

اخلاق و معاشرت۔ ابوسلیم محمد عبدالحی ۷/۰
حقوق و فرائض شعبہ تصنیف مکتبۃ الحسنات ۱۱/۰

اسلامی آداب حکیم محمود ظفر سیالکوٹی ۱۰/۰
گھریلو جھگڑے۔ ڈاکٹر ابن فرید ۷/۰
زندگی کا سلیقہ " " ۵/۵۰
بچے کی تربیت " " ۱۳/۰
ہم کیسے رہیں " " ۶/۰

دعوت و تبلیغ اور متفرق کتابیں

اعتراف عظمت۔ عین الحسین نون ۱۲/۰
آؤ عربی پڑھیں۔ مولانا محمد ایوب اصلاحی ۱۵/۰
علم و عمل۔ محمد عاصم نعمانی ۹/۰
آواگمن کا تحقیقی جائزہ۔ ابومحمد امام الدین رامنگری ۵/۰
محلوں کے اندھیرے (اصلاحی معاشرتی ناول) ایس فضیلت ۴/۰

جاسوسی کہانیاں

خونی وصیت۔ ایس فضیلت ۴/۰
آخری لاش " ۴/۰
سرخ جزیرہ " ۳/۷۰
ٹوبی گڑھی کے بھوت شعیب مینائی ۴/۰
تصویر اور خنجر " ۲/۵۰
بھیانک سایہ " ۲/۰
حسن کے کارنامے۔ محمود عالم ۳/۵۰

بچوں کیلیے دلچسپ کہانیاں اور افسانے

گلستاں ۳/۰
کعبہ مرے آگے ۲/۰
شہزادہ مراد ۲/۳۰
جدید قصہ چہار درویش ۱/۰
نیلا پیوند ۱/۵۰
جنت کا شہزادہ ۱/۴۰
آسیبی مکان ۱/۴۰
اندھا سانپ ۱/۰
سونے کی تھالی ۱/۰
سونے کا پیالہ ۱/۰

سڑک کا بادشاہ ۱/۰
تلوہ ۱/۰
توبہ ۱/۵۰
نئی روشنی ۱/۵۰
اندھی شہزادی ۱/۵۰
وعدہ ۱/۵۰
بیوقوف بادشاہ ۱/۵۰
رحم دل بادشاہ ۱/۰
نقلی نوٹ ۱/۰
مرغی کے انڈے ۱/۰
ہائے ہائے ۱/۰
احمق میاں ۱/۰
چھوٹے میاں ۱/۵
اچھی کہانیاں ۱/۵۰
آپا کی شادی ۱/۵۰
جمے شاہ ۱/۵۰
انصاف ۱/۵۰
معصوم جھوٹ ۱/۵۰
عقلمند بادشاہ ۱/۵۰
بادشاہ کا خواب ۱/۵۰

ہندی مطبوعات

قرآن مجید ہندی اردو اور انگریزی ترجمہ سیپارہ
ترجمہ۔ محمد فاروق خاں ۵/۰
جمعہ کے خطبے۔ محمد عبدالحی ۲۵/۰
دین کی باتیں " ۹/۰
حدیث مالا ۵/۰
آؤ دین سیکھیں۔ محمد عبدالحی ۱۰/۰
حضرت محمدؐ کی حیات طیبہ ۱۰/۰
اسلامی ترانے ۱/۴۰
دعائیں (پاکٹ سائز) محمد عبدالحی ۲/۰
نبیوں کے حالات " ۲/۸۰
حضرت موسیٰ ؑ " ۱/۶۰
قرآنی قصے " ۲/۲۵
اسلام ایمان اللہ کے نبی آخرت ۹/۰
اسلام کی تعلیم۔ محمد عبدالحی ۵/۰
نماز " ۱/۲۵
اسلامی تاریخ " ۷/۰
کبھی آپ نے سوچا " ۰/۶۰
عبادت " ۰/۸۵
کلمہ طیبہ " ۰/۸۰

مکتبہ الحسنات ۳۹۰۰ پہاڑی املی، جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶

سید شہاب الدین دسنوی



بمبئی میں اردو کتابوں کی اشاعت

بمبئی شہر اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے ہندستان میں امتیازی مقام رکھتا ہے۔ آبادی کے اعتبار سے اس شہر میں ایک چھوٹا سا ہندستان سمایا ہوا ہے۔ یہاں کے لوگوں میں مذہب، زبان، تہذیب، رنگ و نسل کی ایسی بوقلمونی نظر آتی ہے جس سے سارے ملک کی نمائندگی ہو جاتی ہے۔ یوں تو اکثریت کی زبان مراٹھی اور دوسری بڑی زبان گجراتی ہے مگر ان کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسی ہندستانی زبان ہو گی جس کے بولنے والے چھوٹی یا بڑی تعداد میں یہاں نہ بستے ہوں۔ ان زبانوں میں اردو یا ہندستانی کو خاص اہمیت حاصل رہی۔ یہی وہ مشترکہ زبان ہے جس میں دوسری زبان کے بولنے والوں کے سامنے اظہار خیال کیا جا سکتا ہے۔ بمبئی فلم سازی کا مرکز ہے۔ حقیقت یہ ہے سنسر بورڈ کی سرٹیفکیٹ پر زبان کے اندراج سے قطع نظر، فلموں نے اردو یا ہندستانی کو رواج دینے میں جتنا اہم رول ادا کیا کسی اور ذریعے نے شاید ہی کیا ہو۔ اردو غزل کی دیکھا دیکھی گجراتی، یہاں تک کہ مراٹھی میں بھی غزلیں کہی جانے لگیں۔ ایک مشہور گجراتی غزل گو شاعر شیدا نے تو باقاعدہ "غزل منڈل" کو رواج دے دیا ہے جس کے تحت مختلف مقامات پر مشاعرے ہوتے ہیں۔

بمبئی میں اردو کا رواج کب سے ہوا، یہ لمبی داستان ہے جو نجیب اشرف ندوی مرحوم کے مقالہ "بمبئی میں اردو" میں پڑھی جا سکتی ہے۔ ایک مدت تک بمبئی بلکہ مہاراشٹر میں اردو "ہندستانی" کے نام سے پکاری جاتی رہی۔ جس سے مراد وہی سیدھی سادی اردو زبان تھی جو فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔ انجمن اسلام کے ہائی اسکول کو جو سو برس پہلے قائم ہوا تھا "ہندستانی" کی تعلیم کا اسکول کہا جاتا تھا۔ اسکولوں کے طلبا اور شمالی ہندستان سے آئے ہوئے مدن پورہ، مومن پورہ، بھنڈی بازار وغیرہ محلوں میں بسے ہوئے باشندے اور کوکنی مسلمان (جو گھروں میں یا مراٹھی کی شیلی زبان استعمال کرتے ہیں) اردو کتابوں کے طلبگار ہوئے تو ان کی ضروریات کا بیشتر حصہ شمالی ہندستان کے چھاپہ خانوں سے پورا ہوتا رہا۔ خود بمبئی شہر میں بھی بعض اردو پریس قائم ہوئے جن سے اردو کتابوں کی اشاعت کا کام ہوتا رہا مگر بہت محدود پیمانے پر۔

۱۸۵۴ء میں بمبئی سے اردو کا "کشف الاخبار" ہفتہ وار شائع ہوا پھر وقتاً فوقتاً روزنامے، ہفتہ وار، ماہناموں کی اشاعت ہونے لگی اور ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ روزناموں میں اجمل، خلافت، ہلال، الہلال، آفتاب، انقلاب، اردو ٹائمز، ہندستان اور قومی آواز کے نام سامنے آتے ہیں۔ انقلاب، قومی آواز اور اردو ٹائمز آفسیٹ پر چھپتے ہیں باقی لیتھو میں۔

بمبئی کی طباعت اور اشاعت کی تاریخ میں کریمی پریس کا بڑا اہم مقام ہے۔ عبدالکریم پوربندری نے بمبئی میں یہ پریس قائم کر کے وہی خدمت انجام دی جو لکھنؤ میں منشی نول کشور نے۔ عبدالکریم پوربندری بڑے با ذوق تھے۔ وہ بہترین خوشنویسوں کی خدمات حاصل کرتے اور بڑے اہتمام سے کتابیں چھاپتے۔

یہاں ایک بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اردو کے باقاعدہ اشاعتی اداروں کی تعداد ہمیشہ کم رہی اور آج بھی کم ہے۔ پہلے پریس ہی کتابیں چھاپ کر پبلشر اور بک سیلر کا کام بھی کرتے تھے البتہ ہر شہر میں کتب فروش ضرور ہوتے تھے۔ بمبئی میں بھی یہی صورت حال رہی۔ یہاں اردو کے پریس اور کتب فروش کئی رہے مگر پبلشر بہت کم ہوئے۔ محمد علی روڈ، جس کا سلسلہ ابراہیم رحمت اللہ روڈ سے ملتا ہے اسے دلی کے "اردو بازار" کی حیثیت حاصل ہے۔ منارہ مسجد کے سامنے کریمی بک ڈپو، کریمی پریس کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا ہے۔ عبدالکریم پوربندری نے ۱۸۹۰ء میں اپنا قیمتی کتب خانہ الماریوں کے ساتھ جو انجمن اسلام کو دے دیا تھا وہ اب کریمی لائبریری کے نام سے مشہور ہے۔

اس ذخیرے میں بیسیوں کتابیں کریمی پریس کی شائع کی ہوئی ہیں جن میں سے شاید کوئی کتاب بھی اب کریمی بک ڈپو میں نہیں ملے گی۔ اس سے ذرا سے فاصلے پر تاج آفس ہے جسے تقسیم سے چند سال قبل پنجاب کے محمد نذیر نے قائم کیا تھا اب اس کے مالکان سیفی برادرس ہیں۔ یہاں سے قرآن مجید اور اس کے اردو تراجم کے علاوہ کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اس کے باوجود اسے کتب فروشوں کی فہرست میں رکھنا زیادہ مناسب ہوگا مکتبہ اسلامی، شرف الدین و اولادہ، علمیہ بک ڈپو، حنیف بک ڈپو، اقبال بک ڈپو، رحیمیہ بک ڈپو، سلطانیہ بک ڈپو اور مکتبہ جامعہ اس وقت بھی بمبئی کے مشہور کتب فروش ہیں۔

سنہ ۱۹۴۷ سے پہلے سلطانیہ بک ڈپو نے بہت سی اردو کی کتابیں شائع کیں جن میں زیادہ تر ناول، افسانے اور شعری مجموعے تھے۔ ان کے مصنفین میں عادل رشید، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ تھے۔ سلطان حسین صاحب کے پاکستان چلے جانے کے بعد اس کا اشاعتی پروگرام گویا ختم ہوگیا۔

پچھلی عالمی جنگ اور ہندستانی فلم سازوں کی وسعت نے بمبئی شہر اردو کو اہم مرکز بنادیا مختلف علاقوں سے ادیب اور شعرا کھنچ کر یہاں اکٹھے ہوگئے ان کی وجہ سے اردو کا وقار یہاں بلند ہوگیا۔ پھر بھی درسی کتابوں کی اشاعت کے سوا کوئی مستقل اور باقاعدہ دارالاشاعت یہاں قائم نہ ہوسکا۔ ادیبوں اور شعرا کو دلی اور لکھنؤ اور کچھ عرصے تک لاہور کے پبلشنگ ہاؤس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا پڑا جو پبلشنگ ہاؤس بمبئی میں قائم ہوئے ان میں سے قابل ذکر ایک تو "کتب پبلشرس" تھے جسے ایک پارسی فیروز مستری نے کافی بڑے سرمائے سے قائم کیا تھا۔ اس کے مشیروں میں سردار جعفری، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس وغیرہ تھے۔ اس ناشر کی طرف سے جو کتابیں شائع ہوئیں وہ طباعت اور تزئین کے لحاظ سے معیاری تھیں لیکن وہ اکثر متراجم تھیں اس لیے زیادہ مقبول نہ ہوئیں۔ ناشر کو کافی نقصان اٹھانا پڑا اور ادارہ بند ہوگیا۔

ساغر نظامی صاحب نے "ادبی مرکز" کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا جو کچھ ہی دنوں بعد ان کے آل انڈیا ریڈیو، دلی سے وابستہ ہوجانے پر بند ہوگیا۔

انجمن اسلام کا ایک شعبۂ اشاعت "ادبی پبلشرس" کے نام سے قائم ہے جو بنیادی طور پر اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ "نوائے ادب" اور انسٹی ٹیوٹ کے رفقا یا اسکالر کی تصنیفات کی اشاعت کا ذمہ دار ہے۔ عام طور پر اس کی کتابیں تحقیقی ہوتی ہیں۔ اس ادارے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی کتابیں نسخ ٹائپ میں چھپتی ہیں۔

"ہندستانی بک ٹرسٹ" کا قیام پبلشر کی حیثیت سے آنجہانی لالہ یودھ راج کے عطیات کی مدد سے عمل میں آیا۔ لالہ جی کا پہلا شوق تو اردو اور ہندی رسم خط میں دیوان غالب کا ایک اعلا ایڈیشن شائع کرنے کی حد تک تھا جو سردار جعفری کے مرتب کردہ دیوان غالب سے پورا ہوگیا۔ مگر اس کے بعد بعض دوستوں کے مشورے سے انھوں نے ایک قاعدہ ٹرسٹ قائم کرکے اشاعت کا پروگرام مرتب کرکے یہ سلسلہ آگے بڑھایا۔ اس ادارے کی اعلا معیار کی ٹائپ میں چھپی ہوئی کتابیں باذوق لوگوں میں کافی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئیں۔ اس کا دیوان غالب شاید اردو کی پہلی کتاب ہے جسے تمام ہندستانی زبانوں کی مطبوعات کے مقابلے میں بہترین طباعت کا نیشنل ایوارڈ حکومت ہند کی طرف سے ملا ہے۔ بدقسمتی سے لالہ جی اور ان کے بعد دوسرے ٹرسٹی نام دیو شنکر کے انتقال کے بعد یہ ادارہ بند ہوگیا۔

علامہ سیماب اکبرآبادی کی یاد میں اعجاز صدیقی مرحوم نے ماہنامہ "شاعر" کا اجرا کیا اور اس کے ساتھ مکتبہ قصر الادب کی بھی بنیاد ڈالی۔ کچھ کتابیں شائع ہوئیں مگر اس ادارے کا دائرۂ عمل محدود ہے۔

زیادہ تر بمبئی میں صورت یہ رہی ہے کہ ادیب یا شاعر خود ہی ایک ادارہ قائم کرکے پبلشر بن جاتا ہے جس کی دو تین کتابیں چھپ کر بازار میں آجاتی ہیں (اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے یہ ترکیب اب عام ہوتی جارہی ہے) اس کے بعد وہ سلسلہ ختم ہوجاتا ہے۔

بمبئی ایک بہت بڑا کاروباری شہر ہے تجارت کی سوجھ بوجھ رکھنے والے یہاں کے لوگ مٹی کو بھی سونا بنادیتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باوجود اب تک بڑے پیمانے پر یہاں کوئی دارالاشاعت قائم نہیں ہوتا ہے؟ غالباً اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ بمبئی میں اردو کی طباعت دلی اور لکھنؤ کے مقابلے میں بہت مہنگی ہوتی ہے لیتھو پریس اپنی افادیت کھوچکا ہے اور آفسیٹ کی چھپائی اس شہر میں اسی وقت ممکن ہے جب تعداد اشاعت ۵۰۰۰ سے زیادہ ہو اور عام اردو کتابیں اتنی تعداد میں چھپتی نہیں ہیں اس صورت حال نے بڑا نقصان پہنچایا ہے اس کا حل نکل جائے تو اب بھی اردو کتابوں کی اشاعت کا میدان بمبئی میں خاصا وسیع ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر اطہر پرویز



بچوں کے لیے کتابیں

اردو میں بچوں کے ادب کی اہمیت آزادی سے پہلے نہ ہونے کے برابر تھی۔ بچوں کے باقاعدہ ادیب دو تین سے زیادہ نہ تھے لے دے کے مکتبہ جامعہ اور دارالاشاعت لاہور ہی ایسے ادارے تھے جو بچوں کے لیے کتابیں چھاپا کرتے تھے۔ گلاب سنگھ لاہور اور انجمن حمایت الاسلام کی کوششیں درسی کتابوں تک محدود تھیں۔ یہ زمانہ اردو ادب کے لیے بہت اچھا تھا اردو زبان ہندستان کے گوشے گوشے میں داخل نصاب تھی لیکن بچوں کے ادب کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جا رہی تھی۔ آزادی کے بعد مکتبہ جامعہ کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ پیام تعلیم کا دوبارہ اجرا ہوا اور یہ محض بچوں کا رسالہ ہو کر سامنے آیا کھلونا پابندی سے نکل رہا تھا غنچہ بجنور بھی شائع ہونے لگا پھر لکھنؤ سے کلیاں کی اشاعت ہوئی۔ حکومت ہند نے بھی بچوں کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انعامی مقابلوں کا اعلان کیا۔ چنانچہ اب اس محفل میں رونق نظر آنے لگی۔

اس کام میں حکومت ہند کے قائم کردہ "ترقی اردو بورڈ، نیشنل بک ٹرسٹ"، چلڈرن بک ٹرسٹ" بھی پیش پیش رہے۔

"مکتبہ جامعہ" نے "مکتبہ پیام تعلیم" کے نام سے ایک ضمنی ادارہ قائم کیا، اس کے ذریعہ بچوں کی اچھی اچھی کتابیں شائع ہونے لگیں۔ انہوں نے بچوں کی دلچسپی اور ان کی ضرورت کے لیے مختلف قسم کی کتابیں شائع کیں۔ ان میں معلومات کی کتابیں بھی تھیں اور مذہبی کتابیں بھی، اور قصے کہانی بھی۔ انہوں نے عبدالواحد سندھی" ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین وغیرہ کی کتابوں کے نئے اڈیشن چھاپے۔ قدسیہ زیدی مرحومہ کی کتابوں کو شائع کیا بزمی بھارتی کی نظموں کا مجموعہ شائع کیا۔ اس زمانے میں اس ادارے سے رشید حسن خاں کی کتاب" اردو کیسے لکھیں" شائع ہوئی جس سے بچوں کو صحیح املا لکھنے کی طرف متوجہ کیا گیا یہ کتاب پہلے پیام تعلیم میں قسطوار شائع ہو کر مقبول ہو چکی تھی۔

بچوں کے ممتاز شاعر شفیع الدین نیر نے اپنا ذاتی ادارہ نیر اینڈ سنز قائم کیا اور اپنی تمام کتابیں جو پچاس سے زیادہ ہیں، اسی ادارے سے شائع کیں۔

ترقی اردو بورڈ نے بچوں کی کتابوں کا ایک اشاعتی پروگرام بنایا اس کے لیے ایک خصوصی پینل کی تشکیل دی جس میں بچوں کے لیے لکھنے والوں کو بھی رکھا اور ان کے مشورے سے کتابیں لکھوائیں ـــــ اس سلسلے میں انہوں نے ایک اہم کام یہ کیا کہ اردو ادب کے علاوہ بھی غیر ملکی کلاسیکس کی اہم کتابوں کو بچوں کے ممتاز ادیبوں سے آسان زبان میں لکھوایا چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے "چار درویش کا قصہ (باغ و بہار) للی پٹ کا سفر (گلیور ٹریولز)، شریف زادہ (مرزا ہادی)، فسانہ عجائب (رجب علی بیگ سرور)، حاتم طائی کا قصہ (آرائش محفل) الفوح کا خواب (توبۃ النصوح)، ننی جل پری (اینڈرسن)، رابنسن کروسو (ڈینیل ڈیفو) لوزن کی کہانیاں (مہجور) شائع کیں۔ ترقی اردو بورڈ نے بچوں کے ممتاز ادیبوں سے کتابیں لکھوائیں۔ سید محمد ٹونکی، محمد ندیم صالحہ عابد حسین، غلام حیدر، جگن ناتھ آزاد، شفیع الدین نیر اور اطہر پرویز وغیرہ کی کتابیں اس ادارے سے شائع ہوئیں پنچ تنتر کی کہانیاں اور الف لیلہ کی کہانیوں کے سٹ اس ادارے سے شائع ہو کر مقبول ہوئے۔

نیشنل بک ٹرسٹ نے بھی اس کام میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ دراصل بچوں کی کتابوں کو آفسیٹ سے چھاپنے کا سلسلہ نیشنل بک ٹرسٹ نے ہی شروع کیا، اور اب تو تمام بڑے پبلشر فوٹو آفسیٹ سے ہی کتابیں چھاپتے ہیں۔

نیشنل بک ٹرسٹ نے ڈاکٹر ذاکر حسین، قدسیہ زیدی،

سعیدہ خورشید عالم، صالحہ عابد حسین وغیرہ کی کتابوں کے خوبصورت اڈیشن شائع کیے۔

پچھلے سال مجلس اشاعت ادب دہلی نے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (N C E R T) کے تعاون سے بچوں کی کتابوں کا ایک خوبصورت باتصویر اشاعتی سلسلہ شروع کیا ابھی اس کا پہلا سٹ منظر عام پر آیا ہے جو چارلس ڈارون (اطہر پرویز)، دنیا کی بہترین کہانیاں (شہریار)، تاریخ عالم کی کہانیاں (حفیظ عباسی)، سورج کا اڑن کھٹولہ (مسز شہناز خاں)، سرسید کا خواب (نورالحسن) پر مشتمل ہے۔

اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے نئے اشاعتی پروگرام کا اعلان کیا ہے جس میں دنیا کے عظیم سائنس داں، پرند اور جانور، سمندر کی دنیا، دنیا کے بسنے والے، خلا کا سفر جیسے موضوعات پر کتابیں شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے اگر ان کی تمام کتابیں جو ۱۶ کی تعداد میں ہیں شائع ہو جائیں گی تو یقیناً بچوں کے ادب میں اضافہ ہوگا۔

"شمع بک ڈپو" سے بھی چھوٹی سائز میں بچوں کے لیے کتابیں شائع ہو رہی ہیں لیکن جس طرح بعض لوگ اپنے بچوں کو درست معلومات فراہم کرنے سے دلچسپی لیتے ہیں ادارہ ہذا بچوں کی ہلکی پھلکی جنوں پریوں اور مافوق الفطرت کہانیاں دیتا ہے۔

راقم الحروف نے بھی پبلشر نہ ملنے کی وجہ سے اپنا ایک چھوٹا سا ادارہ قائم کیا تھا اردو گھر ——— جس کے ذریعہ اپنی تمام انعام یافتہ کتابیں شائع کیں۔ اس ادارے سے دوسری زبانوں کی بچوں کی کتابیں شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ سعید احمد صدیقی کی بہت اچھی کتاب "لو ایک کہانی سنو" باتصویر شائع ہوئی۔

آج بھی بچوں کی کتابوں میں ایک بڑی کمی بری طرح کھٹکتی ہے اور وہ ہے ان میں تصویروں کا نہ ہونا۔ اردو کی کتابیں صاف ستھری تو چھپنے لگی ہیں لیکن تصویروں کی کمی محسوس ہوتی ہے اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ باتصویر کتابوں سے لاگت بہت بڑھ جاتی ہے جس سے کتابوں کی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے یوں بھی اردو پڑھنے والوں کی قوت خرید بہت کم ہے اور اگر بچوں کی کتابوں کی قیمت پانچ روپے سے زیادہ ہو تو انھیں کون خرید سکے گا اور جو لوگ خرید سکتے ہیں وہ اپنے بچوں کو انگریزی کتابیں پڑھانا پسند کرتے ہیں۔

اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ جگہ جگہ بچوں کی لائبریریاں قائم کی جائیں ——— جہاں بچوں کو پڑھنے کے لیے کتابیں مل سکیں۔ اس طرح کتابوں کی قیمت کے بڑھ جانے کا بچوں اور ان کے والدین پر اثر نہ پڑے گا اور کتابوں کی نکاسی میں بھی سہولت ہوگی۔

اردو کے چند قدیم اخبار

اردو گائیڈ	کلکتہ	روزانہ	۱۸۵۸
برق خاطف	بمبئی	ہفتہ وار	"
اودھ اخبار	لکھنؤ	"	۱۸۵۹
تاریخ بغاوت ہند	آگرہ	ماہانہ	"
شمس الاخبار	مدراس	پندرہ روزہ	"
طلسم حیرت	مدراس	"	"
نسیم جون پور	جون پور	ہفتہ وار	"
بامداد	بمبئی	ماہانہ	"
گلدستہ شعرا	لکھنؤ	پندرہ روزہ	"
کورٹ گزٹ	کوئٹہ	ہفتہ وار	۱۸۶۰
رفیق ہند	کلکتہ	"	"
منظور الاخبار	سورت	"	"
شعلۂ طور	کان پور	"	"
بریلی انسٹی ٹیوٹ پرچہ	بریلی	"	"
خیر خواہ خلق	اجمیر	"	"
ترنان	مدراس	مہینہ میں تین بار	"
صبح صادق	مدراس	عشرہ وار	"
گنج شائیگاں	لاہور	ماہانہ	"
مجمع البحرین	پٹیالہ	ہفتہ وار	"
مفید الانام	فتح گڑھ	ہفتہ وار	"
محب رعایا	اٹاوہ	"	"
وکٹوریہ گزٹ	سہارنپور	"	"

ڈاکٹر اجمل اجملی

الہ آباد کی اشاعتی سرگرمیاں

گنگا اور جمنا کی بانہوں میں لپٹا الہ آباد عرصہ دراز سے علم و فن کا مرکز رہا ہے۔ اس وقت بھی یہاں علم و آگہی کا ڈیرا تھا جب اس کا نام پریاگ تھا اور اس کے بعد بھی یہاں کے سرچشمۂ علم و فن کا فیض جاری رہا جب اس کے پڑوس میں الہ آباد کے نام سے اکبر نے ایک نیا شہر بسایا۔ بزرگوں سے سنتے آئے ہیں اور روایات مسلسل بتاتی رہی ہیں کہ یہاں تین دریا ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اسی لیے اسے سنگم کہا گیا ہے۔ گنگا اور جمنا کی اجلی اور نیلی دھاریں آج بھی شہر کے شمال وجنوب میں محوِ خرام نظر آتی ہیں لیکن تیسرا دریا نظر نہیں آتا البتہ اس کا نام ضرور مشہور ہے۔ اسے سرسوتی کہا جاتا ہے، اور روایت یہ ہے کہ یہ دریا زمین کے نیچے بہتا ہوا خاموشی کے ساتھ آتا ہے اور گنگا و جمنا کی لہروں سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ ہندو صنمیات میں سرسوتی علم کی دیوی کا نام ہے۔ اب اگر آپ مذہبی معتقدات کو ذرا دیر کے لیے پس پشت ڈال دیں تو آسانی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ نظر نہ آنے والا دریا سرسوتی دراصل علم کی علامت ہے۔ یعنی الہ آباد یا پریاگ وہ جگہ ہے جہاں گنگا اور جمنا کے ساتھ علم کا دھارا بھی بہتا رہا ہے اور علم کا دھارا مجرد ہوتا ہے یعنی حقیقت اور ٹھوس حقیقت ہونے کے باوجود نظر نہیں آتا۔ گویا بزرگوں نے اس خوبصورت علامت کے سہارے اس بستی کی علمی اہمیت اجاگر کی ہے۔

یہاں یہ موقع نہیں کہ تاریخ کے صفحات الٹے جائیں اور اس دھرتی پر علوم و فنون کا جو ارتقاء ہوا ہے اس کی عہد بہ عہد داستان سنائی جائے۔ ویسے بھی میں تحقیق کا آدمی نہیں، لیکن دارا گنج، جھونسی اور خود شہر میں مندروں اور آشرموں کی شکل میں حد تک یہ کے آثار بکھرے ہوئے ہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ شری رام جب بن باس پر نکلے تھے تو انھوں نے پریاگ کے سامنے ہی گنگا پار کی تھی اور محض اس لیے کہ وہ اپنے زمانے کے اس عظیم ترین عالم سے رخصت لینا چاہتے تھے جو پریاگ میں مقیم تھا۔

مسلمانوں کے قدم ہندستان میں آئے تو یہاں کی علمی محفلیں بھی از سرِ نو منظم ہوئیں۔ الہ آباد بہت جلد صوفیائے کبار اور علمائے کرام کی آماجگاہ بن گیا۔ اس دور کی یاد دلاتے ہیں کچھ دائرے جو آج بھی علم و ادب کا مرکز بنے ہوئے ہیں، اور کچھ نام جو ہماری تہذیبی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں مثلاً شاہ محب اللہ الہ آبادی رح، شیخ محمد افضل رح، شیخ خوب اللہ الہ آبادی رح، شاہ محمد فاخر رح اور شاہ محمد اجمل رح الہ آبادی۔

انگریزوں کے دور میں تہذیب کی بساط الٹی اور کاٹھ کے دیوں اور بیل گاڑیوں نے بجلی کے قمقموں اور ریل گاڑیوں کے لیے جگہ خالی کی تو ان تبدیلیوں کو بھی اس شہر نے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ انگریزوں نے بھی اس کی جغرافیائی و سیاسی اہمیت سے زیادہ اس کی علمی اہمیت پر زور دیا چنانچہ شمال مشرقی ہندستان میں پہلی یونیورسٹی الہ آباد میں ہی قائم کی گئی جو آج بھی ملک میں علم و دانش کا ایک اہم گہوارہ سمجھی جاتی ہے۔

اب اگر آپ اس پس منظر کو سامنے رکھیں تو بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ پریاگ والہ آباد میں ہر دور میں آسمان علم و دانش کے رخشندہ ستاروں کا اجتماع اس بات کا ثبوت ہے کہ ہر دور میں یہاں علم و دانش کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری رہا ہوگا۔ ظاہر ہے چھاپہ خانوں کے دور

سے پہلے خطاطی اور فنِ کتابت و نقل نویسی کے ذریعے یہ کام انجام دیا گیا ہوگا جس کے نقوش آج بھی اہلِ دوائر کے نجی کتب خانوں، پبلک لائبریری اور آثار قدیمہ کے محافظ خانوں میں موجود ہیں، کہیں خستہ حالی کے عالم میں اور کہیں نسبتاً بہتر صورتِ حال میں۔ دائرہ شاہ اجمل کے سجادہ نشین حضرت شاہ سید احمد اجملی مدظلہٗ العالی کے نجی کتب خانے میں خود مجھے ان جواہر پاروں کی زیارت کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان میں کلام پاک کے مختلف نادر نسخے، ولی، میر تقی میر، سودا اور دوسرے سربرآوردہ شعراء کے دواوین، مختلف تذکرے، اس خانوادہ کے ممتاز رجال کی تصانیف اور اس دور کی اہم تصانیف کی نقلیں شامل ہیں۔ دائرہ شاہ رفیع الزماں کی رفیع المنزل لائبریری میں بھی اس طرح کے مخطوطات موجود ہیں۔

چھاپہ خانوں کا چلن عام ہوا تو یہاں کی اشاعتی سرگرمیوں کی رفتار بھی تیز ہو گئی کہ اب انھیں دوڑنے کے لیے صنعتی انقلاب کی خاص برکت یعنی پہیے مل گئے تھے۔ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں تحقیق کے فن سے تقریباً ناآشنا ہوں اس لیے وثوق کے ساتھ یہ نہیں بتا سکوں گا کہ چھاپہ خانے الہ آباد کب پہنچے اور ہاتھ کی لکھائی نے چھپائی کا روپ پہلے پہل کب دھارا۔ البتہ قیاس یہ کہتا ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ایسا ہوا ہوگا۔ میں نے یہاں کی بعض لائبریریوں میں یہاں سے شائع ہونے والے گلدستے دیکھے ہیں جن میں ان شعراء کا کلام محفوظ ہے جو اس دور میں اس سرزمین پر سانس لے رہے تھے۔

زمانہ آگے بڑھا اور اخبار و جرائد کے ابھرنے کی رفتار تیز ہوئی تو اس شہر نے بھی اپنی زندگی کا ثبوت دیا۔ ۲۰ ویں صدی کی دوسری دہائی میں یہاں سے ایک رسالہ "نئی روشنی" نکلتا نظر آتا ہے جس میں اس دور کے اہم ادیبوں اور شاعروں کے رشحاتِ قلم چھپا کرتے تھے۔ ان میں لسان العصر اکبر الہ آبادی، مولانا سید نذیر احمد الہ آبادی، مولانا بیخود الہ آبادی اور بعض دوسرے لوگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ "نئی روشنی" الہ آباد سے نکلنے والا پہلا جریدہ تھا یا اس کے کچھ مورث بھی تھے، یہ بات بھی میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا، البتہ یہ ضرور عرض کروں گا کہ اس میں متذکرہ بالا ممتاز شعراء کی تخلیقات کی مسلسل اشاعت اس بات کی ضامن ہے کہ اسے اپنے حلقۂ اثر میں خاصی مقبولیت حاصل رہی ہوگی۔

روزناموں کی اشاعت کے سلسلے میں دو اہم نام ایسے ہیں جنھیں تاریخ نگار نظر انداز نہیں کر سکتا، ویسے اسی جگہ یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ روزناموں کو الہ آباد کی سرزمین کبھی راس نہیں آئی۔ اخبار بڑے طمطراق سے نکلے، مقبول ہوئے، کچھ دنوں آن بان کے ساتھ زندہ بھی رہے، مگر دھیرے دھیرے سوکھتے چلے گئے اور ایک دن بند ہو گئے۔ ہاں تو میں جن دو ناموں کی اہمیت کی بات کر رہا تھا وہ ہیں خادم اور العزیز۔ اتفاق سے یہ دونوں روزنامے ایک ہی جگہ سے نکلے اور ایک ہی زمانے میں اشاعت پذیر ہوتے۔ یہ جگہ ہے دائرہ شاہ اجمل اور زمانہ ہے دوسری دہائی کے اواخر اور تیسری دہائی کے اوائل کا۔ خادم کے ایڈیٹر تھے مولوی حفیظ صاحب جو الہ آباد کے ایک سربرآوردہ قوم پرست رہنما تھے اور اسے جن معتبر قلم کاروں کا تعاون حاصل تھا ان میں مولوی سید کبیر احمد اور مولوی محمد متین شمسی مرحومین قابلِ ذکر ہیں۔ میرے والد حضرت شاہ سید احمد اجملی اس کے منیجر تھے۔ اس ٹیم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سیاست میں اس کا جھکاؤ قوم پرستی کی طرف رہا ہوگا، تہذیبی اور علمی سطح پر اس نے روشن خیالی کی تبلیغ کی ہوگی، اور اتحادِ ملکی و قومی کو اپنی سرگرمیوں کا محور قرار دیا ہوگا۔ اس اخبار کی کچھ کاپیاں میری نظر سے گزری ہیں، اس دور کو دیکھتے ہوئے اس کا معیارِ صحافت خاصا بلند محسوس ہوتا ہے۔ لکھائی اور چھپائی بھی اچھی تھی، مگر نہ جانے کیوں زیادہ دنوں زندہ نہ رہ سکا۔

روزنامہ العزیز خادم کے برعکس مقامی اخبار تھا۔ اس نے طویل عمر پائی۔ اس کے مدیر تھے شاہ حفیظ عالم جنیدی جو مشہور قوم پرست رہنما مولانا فاخر الہ آبادی کے برادر نسبتی تھے۔ یہ ایک نیم سنجیدہ اور نیم مزاحیہ اخبار تھا۔ اس میں مقامی سیاست پر بڑے چٹپٹے مضامین چھپا کرتے تھے۔ مجھے آج بھی اس میں شائع ہونے والی ایک نظم یاد ہے جو بے حد مقبول ہوئی تھی۔ "ٹاٹ کا پردہ" اور "ٹاٹ کا پردہ" ردیف و قافیہ تھا اور اس نظم میں ایک مقامی رہنما کا

مضحکہ خیز کیریکیچر پیش کیا گیا تھا۔ اس میں کارٹون بھی ہوا کرتے تھے اور یہ بھی خاصے مقبول تھے۔

ان دو روزناموں کے بعد اس محاذ پر ایک عرصے تک الہ آباد کی فضا خالی خالی نظر آتی ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ اخبار نکلے ہوں، مگر نہ اپنی شناخت قائم کر سکے نہ اپنے دور پر کوئی خاص اثر ڈال سکے اس لیے ان کا ذکر بھی عام نہ ہو سکا۔

البتہ تقسیم وطن کے آس پاس پھر اس محاذ پر رونق نظر آئی۔ اس وقت کے روزناموں میں شفق، سویرا، نیا اخبار اور ہمارا اخبار کے نام قابل ذکر ہیں۔ شفق مسلم لیگ کا اخبار تھا اور جیسا کہ ہونا چاہیے تھا مسلم لیگی سیاست کا ترجمان تھا۔ اس کی وہ سرخی آج بھی یاد آتی ہے، جو قیام پاکستان کے اعلان کے بعد صفحۂ اول کی زینت بنی تھی۔ اس نے لکھا تھا "بٹ کے رہا ہندوستان۔ لے کے رہے پاکستان"۔ "قائداعظم زندہ باد" مگر تقسیم وطن کے بعد قائداعظم زندہ باد کا نعرہ لگانے والا یہ اخبار خود اپنی موت مر گیا۔

'سویرا' محی الدین عرفان اور اکرم الہ آبادی نے مل کر نکالا تھا۔ یہ قوم پرست دانشوروں کا ترجمان تھا، مہاتما گاندھی کی شہادت کے موقع پر اس نے ایک خاص نمبر نکالا تھا جو اپنی سنجیدگی اور مضامین کی وسعت و گہرائی کی وجہ سے خاصا پسند کیا گیا تھا مگر کچھ دنوں بعد مالی دشواریوں کی بنا پر سویرا شام کے ڈھلتے سورج کی طرح غروب ہو گیا۔

نیا اخبار بھی اسی زمانے میں نکلا۔ اس کے مدیر اسرار احمد کریوی ایک منجھے ہوئے صحافی تھے۔ اسی ادارے سے طفیل احمد جمالی بھی وابستہ تھے جنھوں نے پاکستان جا کر خاصی شہرت حاصل کی۔ ان دونوں صحافیوں کے قلم میں بلا کا زور تھا۔ تقسیم وطن کے فوراً بعد کی جذباتی فضا میں ظاہر ہے اس زور قلم میں جذبات کی شدت نے بھی خاصی رنگ آمیزی کر دی تھی۔ ان باتوں کی وجہ سے جہاں اسے عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی، وہیں حکومت بھی اس کی تحریروں پر توجہ دینے لگی اور اس طرح ایک وقت وہ آیا جب اس اخبار کو بند کر دیا گیا۔ مگر دوسرے ہی دن ہمارا اخبار کے نام سے یہ ایک بار پھر بازار میں آ گیا۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ دنوں جاری نہ رہ سکا اور آخر ایک شام یہ دکان بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔

بہت دنوں بعد آگے پیچھے دو روزناموں نے سکوت کو توڑنے کی کوشش کی، یہ تھے پیغام اور قائد، مگر دونوں ہی شعلۂ مستعجل ثابت ہوئے۔ پیغام سے عثمانی صاحب وابستہ تھے جو اب قومی آواز کے ادارے میں ہیں اور قائد سے ریاض احمد قدوائی جو ان دنوں سوویت خلیج اطلاعات سے وابستہ ہیں۔

روزناموں کی طرح الہ آباد سے ہفت روزہ اخبار بھی نکالے گئے۔ میرے ذہن میں چند نام بعض شخصیتوں کے حوالے کے ساتھ محفوظ ہیں۔ مثلاً ۱۹۴۸ء میں ولی شاہ جہاں پوری آئینہ نکالتے تھے، ولی صاحب اب مکتبہ جامعہ میں ہیں اور کتاب نما کے ایڈیٹر ہیں۔ یہ نیم ادبی اور نیم سیاسی پرچہ تھا۔ آزادی کے فوراً بعد نعیم صدیقی نے نیا دور کے نام سے ایک سیاسی ہفت روزہ نکالا تھا جس میں کام کرنے والوں میں ڈاکٹر مجاور حسین اور سعید سہروردی قابل ذکر ہیں۔ ایک اور ہفت روزہ جسے قدرے مقبولیت حاصل ہوئی حسن منزل سے روزگار کے نام سے نکلتا تھا۔ اس میں سیاست اور ادب کے ساتھ نفسیات اور دوسرے علوم پر بھی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کے ایڈیٹر اور مالک ایک ڈاکٹر صاحب تھے، جن کی زندگی کا چراغ گل ہوا تو یہ رسالہ بھی بند ہو گیا۔

ان دنوں اخبار کے نام سے الہ آباد میں سناٹا ہے۔ کچھ دنوں سے ایک پندرہ روزہ 'اضطراب' کی صورت میں پابندی کے ساتھ ہاتھوں میں آ رہا ہے، لیکن اس کا قد اتنا چھوٹا ہے کہ اب تک کوئی خاص اثر نہیں ڈال سکا حالانکہ اس کے مدیر زاہد حسین خاں خاصے قد آور انسان اور صحافی ہیں۔ ہم اس اخبار کی بلند قامتی کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے آپ کو رسالوں اور کتابوں کی دنیا میں لے چل رہے ہیں جہاں خاصی بھیڑ بھاڑ نظر آتی ہے۔

الہ آباد کا انڈین پریس ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے۔ اب تو یہاں اردو کا کام تقریباً نہیں کے برابر ہے۔ لیکن

ایک زمانہ تھا جب یہاں سے کتابیں بھی شائع ہوتی تھیں اور ایک رسالہ بھی۔ رسالے کی اہمیت اس لیے بھی تھی کہ اس کے مدیر حامد علی صاحب تھے جو پروفیسر ضامن علی مرحوم کے بھائی تھے، وہ خود بھی خاصے پڑھے لکھے اور ذہین آدمی تھے۔

رسالہ 'ادیب' انڈین پرنٹنگ پریس الٰہ آباد کی ملکیت میں شائع ہونے والا اردو کا ایک بلند معیار مصور رسالہ تھا، جو جنوری ۱۹۱۰ء سے جون ۱۹۱۳ء تک شائع ہوتا رہا۔ یکے بعد دیگرے اس کے تین ایڈیٹر ہوئے ــ نوبت رائے نظر لکھنوی، پیارے لال شاکر میرٹھی اور حسیر عظیم آبادی۔

انڈین پریس ہی کی طرح ہندستانی اکیڈمی بھی پہلے اردو اور ہندی کا سنگم تھی مگر اب صرف ہندی کے لیے وقف ہو چکی ہے۔ اکیڈمی کی طرف سے ادبی اور علمی تماہی رسالہ 'ہندستانی' شائع ہوتا تھا جس کے مدیران گرامی میں مولانا اصغر گونڈوی اور مولانا کیفی چریا کوٹی جیسی عظیم المرتبت ہستیاں شامل تھیں۔ آزادی سے بہت پہلے باقاعدگی کے ساتھ نکلنے والے اس رسالے میں جگہ حاصل کر لینا کسی ادیب و شاعر کی اہمیت کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ رسالے کے علاوہ یہاں سے بہت ساری کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ مجھے ڈاکٹر اویس احمد ادیب کی کتاب "نذیر احمد ــ اردو کا پہلا ناول نگار" اور ڈاکٹر اعجاز حسین کے "انتخاب آتش" کے نام آج بھی یاد ہیں۔

اسی زمانے میں ادارۂ انیس اردو کی طرف سے ماہنامہ 'انیس' شائع ہوتا تھا، جس کے نگراں حافظ غازی پوری اور مدیر ممتاز حسین تھے۔ یہ خالص ادبی رسالہ تھا جس میں غزلیں کم ہلکی پھلکی رومانی نظمیں زیادہ شائع ہوتی تھیں۔ نثر میں بھی رومانی افسانوں کا پلڑا بھاری نظر آتا۔ یہ وہی ادارۂ انیس اردو ہے جس نے آزادی کے بعد دوبارہ کروٹ لی تو مفتی فخر الاسلام صاحب کی نگرانی میں یکے بعد دیگرے تقریباً ۸ کتابیں شائع کر دیں۔ ان کتابوں میں فراق گورکھپوری کی کتاب اندازے، ان کا مجموعۂ کلام گل نغمہ، ڈاکٹر اعجاز حسین کے مضامین کا مجموعہ ادب اور ادیب، جناب مجنوں گورکھپوری کی تصنیف دوش و فردا اور جگن ناتھ آزاد کی کتاب اقبال اور اس کا عہد خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک خاص بات یہ تھی کہ اس ادارے نے بزرگوں کے ساتھ ساتھ نوجوان ادیبوں کی کتابیں بھی شائع کیں۔ چنانچہ راقم الحروف کی دو کتابیں 'اردو سے ہندوؤں کا تعلق' اور 'شاعر آتش نوا'، اسلام رومی کے ڈراموں کا مجموعہ چاندنی اور انگارے اور اسلام بیگ چنگیزی کی کتاب "ایشیائی بیداری" اور اردو شعراء" بھی اسی ادارے نے چھاپی۔

ادارۂ انیس اردو کی گفتگو کرتے ہوئے میں بہت آگے نکل آیا ہوں۔ ماہنامہ انیس اور ان کتابوں کے درمیان خاصا وقفہ حائل ہے اور اس وقفے کی داستان اس لیے نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اس بیچ بہت سارے رسالے شائع ہوئے اور ان میں بعض نے تو ادارے کی حیثیت حاصل کر لی تھی، مگر یہاں میں آپ کا تعارف ایک ایسے انسان سے کرانا چاہتا ہوں جس نے یکہ و تنہا وہ کام انجام دیا جو بڑے بڑے ادارے نہ انجام دے پائے۔ اس انسان کا نام تھا مولوی جلال الدین زینبی۔

مولوی جلال الدین زینبی کا انوار احمدی پریس ایک انوکھی شان کا مالک تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے انھوں نے سیکڑوں کتابیں، چھاپی ہوں گی۔ زیادہ تر فارسی ادب کے شاہکار چھاپتے رہے مگر اردو کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ بے حد پڑھے لکھے اور باذوق انسان تھے۔ اس لیے خود ہی شاعروں کے کلام اور ادیبوں کی نثری تخلیقات سے انتخاب کرتے اور سستی قیمتوں کے ساتھ شائع کر دیتے۔ ہم میں کتنے لوگوں کو ظہیر فاریابی، خاقانی، قاآنی، نظیری، عرفی، جامی، ابوالفضل، اور فیضی نیز میر، غالب، آتش، مومن اور انشا کے وجود کا علم مولوی جلال الدین زینبی کے یہاں سے چھپی کتابیں پڑھ کر ہوا۔

کتابوں کی اشاعت کا ایک اور ادارہ الہ آباد پبلشنگ ہاؤس تھا، جہاں سے 'پروین' کے نام سے ایک ماہنامہ بھی نکلتا تھا۔ بحر الہ آبادی رسالے کے مدیر تھے اور سید محمد ہاشم اشاعت گھر کے نگراں۔ اس ادارے نے افسانوی ادب پر خصوصی توجہ دی عادل رشید کے زیادہ تر ناول اسی ادارے سے شائع ہوئے۔ اسی گروہ کے ایک اور ادیب و شاعر محی الدین عرفان نے

ایک ماہنامہ جھنکار کے نام سے نکالا تھا جس سے ابو محمد سحر اور ذاکر فتح پوری بھی وابستہ تھے۔

۱۹۴۷ میں بلونت سنگھ اور ولی شاہ جہاں پوری کی ادارت میں 'فسانہ' نکلا جسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ فسانہ اس لیے بھی یاد آتا ہے کہ کرہ ہیں واقع اس کے دفتر میں اکثر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے بھی ہوا کرتے تھے۔

ٹھیک اسی زمانے میں گنگا، جمنا اور سرسوتی کے اس سنگم سے ایک رسالہ شروع ہوا جس کی شان ہی نرالی تھی۔ 'الہ آباد کلچرل سوسائٹی' اور اس کا رسالہ نیا ہند محض ایک انجمن اور ایک ماہنامہ نہیں ایک تحریک کے دو روپ تھے اور اس تحریک کی روح رواں تھے پنڈت سندر لال جو ہماری تحریک آزادی کے قافلہ سالار، گاندھی جی کے چیلے اور ہندو مسلم ایکتا کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ اس رسالے کی نرالی شان یہ تھی کہ ایک ہی مضمون ایک ہی زبان میں لیکن دو رسم خط میں شائع ہوتا تھا۔ ایک ہی صفحے پر بائیں جانب دیوناگری رسم خط میں اور دائیں جانب اردو رسم الخط میں۔ یہ رسالہ مہاتما گاندھی کی تحریک اردو ہندی ہندستانی کا نقیب تھا۔ سریش رام بھائی، بشمبر ناتھ پانڈے اور ڈاکٹر مجیب رضوی اور محمود احمد ہنر اس ادارے سے وابستہ تھے۔ نیا ہند کے ادارے نے بعض اہم کتابیں بھی شائع کیں جو سیاسی اور لسانی مسائل اور قومی یکجہتی سے متعلق تھیں۔

الہ آباد میں انجمن روح ادب کے نام سے کچھ بڑے لوگوں نے ایک انجمن ترویج اردو کے لیے قائم کی تھی۔ اس میں سر تیج بہادر سپرو، قاضی خورشید احمد، ابو احمد، پروفیسر ضامن علی، رادھے ناتھ کول گلشن، امرناتھ جھا، پرتھوی ناتھ شوق، آغا علی خاں، ہائیکورٹ کے بعض اردو نواز وکلا اور جج صاحبان شامل تھے۔ سربرآوردہ شخصیتوں کی وجہ سے اس انجمن کو حیدرآباد اور محمود آباد نیز رام پور جیسی ریاستوں سے بھی بھرپور مدد ملتی رہی۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اس انجمن نے بیشتر سرمایہ مشاعروں کے انعقاد پر خرچ کیا، البتہ چراغ محفل فصاحت کے نام سے ایک وقیع کتاب ضرور شائع کی جس میں زبان و ادب کے مسائل پر عالمانہ مضامین شامل ہیں۔ اسی کتاب میں پروفیسر ضامن علی صاحب کا ایک طویل مضمون "شعرائے الہ آباد" شائع ہوا جو الہ آباد کی شعری تاریخ مرتب کرنے کی غالباً پہلی کوشش تھی۔ خوشی اس کی ہے کہ ایک بار پھر اس انجمن نے کروٹ لی ہے۔ اپنی ایک عمارت جو تقسیم وطن کے بعد ادھوری رہ گئی تھی مکمل کر لی ہے اور اس طرح الہ آباد میں اردو والوں کو ایک گھر مل گیا ہے، مگر مشاعرہ بازی کی دیمک آج بھی اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے

تقسیم وطن کے آس پاس کچھ اور رسالے بھی سامنے آئے۔ ان میں انیس الرحمن جیسے مستند صحافی کا سیاسی ماہنامہ 'نئی زندگی'، تیغ الہ آبادی مرحوم کا رسالہ کرن، نشیمن اور بعض دوسرے رسائل شامل تھے، مگر یہ سبھی شعلۂ مستعجل ثابت ہوئے۔

الہ آباد ہی میں کیا پورے شمالی ہندستان میں اردو کی تعلیم و ترویج کے لحاظ سے الہ آباد یونیورسٹی کا اردو ڈیپارٹمنٹ اپنی ایک الگ اہمیت رکھتا ہے۔ ہندستان کی یونیورسٹیوں میں یہ پہلی یونیورسٹی تھی جہاں اردو کا آزاد شعبہ قائم ہوا۔ پروفیسر ضامن علی وہ پہلے استاد تھے جنھیں پروفیسر بنایا گیا اور ڈاکٹر اعجاز حسین وہ پہلے اسکالر تھے جنھیں ڈی لٹ کی ڈگری ملی۔ اس شعبے نے بھی اشاعت اردو کی طرف توجہ کی۔ الہ آباد یونیورسٹی اردو میگزین اور شعبۂ اردو کے طالب علموں کی انجمن کا رسالہ نیساں اس لحاظ سے قابل ذکر ہیں کہ دور حاضر کے بعض بے حد اہم اور ممتاز ادیبوں اور نقادوں مثلاً پروفیسر احتشام حسین، وقار عظیم، ممتاز حسین، گیان چند جین، سید محمد عقیل، حسن عسکری، سبط حسن، مجتبیٰ حسین وغیرہ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز انہی رسالوں کے ساتھ کیا۔ رسالوں کے علاوہ کچھ کتابیں بھی اس ادارے سے شائع ہوئیں جن میں ڈاکٹر نیر مسعود کا تحقیقی مقالہ "رجب علی بیگ سرور" خاصی اہمیت رکھتا ہے۔

یونیورسٹی کے قریب ہی کتابستان واقع تھا۔ کتابستان ویسے تو مکتبہ تھا، مگر اسے اردو کے ایک مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ پروفیسر نعیم الرحمن کے قائم کردہ اس ادارے کو ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی سرپرستی حاصل تھی۔ متعدد اہم کتابیں اس ادارے سے شائع ہوئیں، جن میں احتشام صاحب

کے مضامین کا پہلا مجموعہ تنقیدی جائزے بھی شامل ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اس دھرتی پر اگنے والے بعض رسالے محض رسالے نہ تھے، بلکہ بجائے خود ایک ادارہ اور ایک تحریک بن گئے تھے۔ ان میں کارواں، نکہت اور شاہکار خاص طور پہ قابل ذکر ہیں۔

کارواں ڈاکٹر اعجاز حسین کا رسالہ تھا جس طرح ڈاکٹر صاحب کی ذات پوری ادبی دنیا کی ایک محبوب ترین ذات تھی اسی طرح ان کا یہ رسالہ بھی بے حد مقبول تھا۔ الہ آباد سے باہر جیسے ہی اس ادبی رسالے نے اپنی شناخت قائم کی اور پڑھنے والوں کا ایک بہت بڑا حلقہ بنا یا وہ کارواں تھا جو پہلے شعاع اردو کے نام سے نکلتا تھا۔ اس رسالے نے اردو دنیا کو لاتعداد نوجوان شاعروں اور ادیبوں سے متعارف کرایا۔ کارواں پبلشنگ ہاؤس بھی تھا جس سے اعجاز صاحب کی بیشتر تصانیف شائع ہوئیں احتشام صاحب، آصف جاہ کاروانی اور بعض دوسرے ادیبوں کی کتابیں بھی اسی ادارے نے چھاپیں۔ اس زمانے میں اعجاز صاحب نے اپندر ناتھ اشک کے ساتھ مل کر ہمالیہ پبلشنگ ہاؤس بھی قائم کیا تھا، مگر یہ زیادہ دن چل نہیں سکا۔ اعجاز صاحب اور کارواں کی یاد آتی ہے، تو قلم بہکنے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی ترویج و اشاعت میں اعجاز صاحب کا جو حصہ رہا ہے اس کے بھرپور جائزے کے لیے ایک مضمون نہیں ایک پوری کتاب درکار ہے۔ اس لیے قلم کو روکتے ہوئے میں ایک اور رسالے نکہت اور نکہت پبلیکیشنز کی بات کرنے جارہا ہوں۔

آزادی کے فوراً بعد سامنے آنے والا یہ نیم ادبی رسالہ نکلا تو دیکھتے دیکھتے شمع، جمالستان اور بیسویں صدی جیسے مقبول رسالوں کا حریف بن گیا۔ اس کی امتیازی شان یہ تھی کہ عام پسند مباحث و مسائل کے ساتھ ساتھ اس کی ادبی بنیاد بھی خاصی مضبوط تھی نوجوان ادیبوں کا ایک پورا گروہ اس سے وابستہ تھا جس میں تیغ الہ آبادی جو بعد میں مصطفےٰ زیدی کے نام سے مشہور ہوئے، اسرار ناروی (طغرل فرغان اور ابن صفی)، راہی معصوم رضا، شاہد اختر، سلام مچھلی شہری، مجاور حسین (ابن سعید)، جمال رضوی (شکیل جمالی)، ذکی انور، نازش پرتاپگڈھی، شبنم نقوی، نافع رضوی، ملک زادہ منظور احمد وغیرہ خاص طور پہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے مدیر اعلا تھے عباس حسینی جن کی شخصیت میں بلا کی جاذبیت ہے۔ نکہت افراتفری کے اس دور میں ایک تحریک بن کر ابھرا۔ نکہت کلب کی بھی بڑی دھوم ہوتی تھی کل ہند کانفرنسیں کی گئیں اور الہ آباد کے باہر بھی ایک بڑا حلقہ اس سے وابستہ رہا۔

نکہت کے ساتھ ہی اس ادارے سے جاسوسی اور رومانی ناول بھی باقاعدگی کے ساتھ ہر ماہ شائع ہوتے تھے۔ اس ادارے نے خاص طور پر پورے ہندستان و پاکستان میں جاسوسی ادب کو مقبول بنانے اور ادبی حلقوں میں اسے وقیع بنانے میں بہت بڑا رول ادا کیا ہے اور اس کی وجہ تھا ابن صفی (اسرار ناروی) کا زور قلم۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جاسوسی ادب کی تاریخ میں ابن صفی اور جاسوسی دنیا کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ رومانی دنیا میں شاہد اختر (راہی)، ابن سعید (مجاور حسین)، اور شکیل جمالی (جمال رضوی) کے کئی بلند پایہ ناول شائع ہوئے۔ پھر نکہت پبلیکیشنز کا سلسلہ شروع ہوا تو کرشن چندر کے کئی ناول بھی اس ادارے نے شائع کیے۔ طلسم ہوشربا کے انتخاب پر مبنی طلسمی دنیا اور شرر کی طرز کے تاریخی ناول، تاریخی دنیا کے نام سے نکالے گئے مگر انھیں وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، اس لیے کچھ دن بعد بند ہو گئے۔ اس ادارے سے معصوم رضا راہی اور جناب وامق جون پوری کے مجموعے اور ڈاکٹر مجاور حسین کی کتاب اردو شاعری میں قومی یکجہتی بھی چھپ کر مقبول ہو چکی ہے۔

جاسوسی ناولوں کا دور آیا تو بہت سے رسالے نکلے اور بہت سے ادارے قائم ہوتے جس میں ایم۔ ایل پانڈے کا ادارہ قابل ذکر ہے۔ اس نے دیوناگری رسم خط میں اردو کے کلاسیکی ادب کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا مگر گھاٹے کا سودا ثابت ہوا۔

اس دور کا تیسرا اہم رسالہ شاہکار تھا۔ شاہکار ڈائجسٹ تھا، اور برسوں باقاعدگی کے ساتھ نکلتا رہا۔ آج تو ہندستان و پاکستان سے بڑے شاندار ڈائجسٹ نکل رہے ہیں، مگر شاہکار کی شان ہی الگ تھی، صورت سے قلندر نظر آنے والا یہ رسالہ

دل کے لحاظ سے بڑا غنی تھا اور اپنے مدیر محمود احمد ہنر ہی کی طرح ظاہری آن بان سے بے نیاز مگر ٹھوس علمیت کا حامل تھا۔ افسانوی ادب پر خصوصی توجہ تھی چنانچہ آج بھی اگر پچھلی دو تین دہائیوں کے افسانوں کا انتخاب دیکھنا ہو تو صرف اسی رسالہ پر اکتفا کر سکتے ہیں۔

اردو ادب میں جدیدیت کی تحریک شروع ہوئی تو ترقی پسند تحریک کی ہی طرح الہ آباد اس کی آماجگاہ بنا اور تحریک کا رسالہ شب خون سامنے آیا۔ شروع میں اسے ڈاکٹر اعجاز حسین اور پروفیسر احتشام حسین کی سرپرستی حاصل رہی، مگر بعد میں ان دونوں بزرگوں نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی نگرانی میں اس نے اپنے عہد کی شاعری اور افسانوی ادب پر خاصا گہرا اثر ڈالا۔ لب و لہجے میں تبدیلی آئی، موضوعات بارے سوچنے کا ڈھنگ بدلا مگر جس تیزی کے ساتھ یہ رسالہ عروج پر پہنچا تھا اسی تیزی کے ساتھ زوال پذیر بھی ہوا۔ نکل آج بھی رہا ہے مگر اب اس میں وہ دم خم باقی نہیں رہا ہے۔

شب خون کے ادارے سے بہت ساری کتابیں بھی نکلیں ان کی ایک کتاب "نئے نام"، جو شاعروں کی تخلیقات پر مشتمل تھی خاصے دنوں موضوع بحث بنی رہی۔

شب خون کے زمانے میں ہی ڈاکٹر سید محمد عقیل کی نگرانی میں شب رنگ جاری ہوا جو ترقی پسند اقدار کا ترجمان تھا مگر مخالفوں کی ریشہ دوانیاں اسے کھا گئیں۔

اشاعتی اداروں میں کچھ ایسے اہم ادارے بھی شامل تھے جن کی توجہ نصابی کتابوں کی تیاری پر مرکوز رہی۔ ان میں رام نرائن لال بکسیلرز، لالہ رام دیال، بینی مادھو بھارگو اپبلشرز اور بینی پرشاد کے نام قابل ذکر ہیں۔ ہر چند کہ ان کی کاوشیں نصابی کتابوں کی اشاعت پر مرکوز رہیں ان لوگوں نے وقتاً فوقتاً بعض کلاسیکی کتابیں بھی چھاپیں مثلاً مسدس حالی، مقدمۂ شعر و شاعری، امراؤ جان ادا، ہماری شاعری، واردات اور پریم چند کے دوسرے مجموعے۔ مومن پر جناب ضیاء احمد بدایونی کی مشہور کتاب بھی رام نرائن لال نے چھاپی تھی اور لالہ رام دیال نے نشیمن کے نام سے کچھ دنوں ایک ماہنامہ بھی نکالا۔

اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں یہاں کے بعض پریس ملک کے طول و عرض میں مشہور ہوئے ان میں اسرار کریمی پریس، نامی پریس، سلیمی پریس اور حمید قیصر کا پریس خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ حمید قیصر نے کچھ ادبی کتابیں بھی شائع کی ہیں۔

رسالوں کا یہ تذکرہ نامکمل رہے گا اگر اردو ساہتیہ کا ذکر نہ کیا جائے۔ اردو کا یہ رسالہ دیوناگری رسم خط میں چھپتا تھا۔ بلونت سنگھ اس کے مدیر تھے اور ضیاء الاسلام اس کے نگراں۔ ہندی دنیا میں اردو ادب کو مقبول بنانے میں اس رسالے نے خاصا رول ادا کیا بعد میں ڈاکٹر جعفر رضا نے بھی اسی انداز کا ایک رسالہ نکالا تھا مگر وہ زیادہ دن نہ چل سکا۔

اس وقت الہ آباد میں جو ادارے اردو کی اشاعت کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں ان میں نکہت پبلیکیشنز اور مکتبہ شب خون کے علاوہ ساحل مانک پوری کی سوسائٹی رائٹرز گلڈ، انجمن تہذیب نو اور شاہ اجمل اشاعت گھر کا نام لیا جا سکتا ہے۔ رائٹرز گلڈ نفیس کتابیں چھاپ رہا ہے، زیادہ توجہ پاکستانی ادب کی اشاعت پر ہے۔ انجمن تہذیب نو کی طرف سے ایک معیاری رسالہ انداز نکلتا ہے جس میں عموماً نئی کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ اس وقت ڈاکٹر عقیل کی نگرانی میں یہ الہ آباد کی سب سے فعال ادبی انجمن ہے۔ اس سے جو اہل قلم وابستہ ہیں ان میں ڈاکرعلی ... فاطمی، نصر قریشی، نظام اسرار گاندھی جیسے لوگ شامل ہیں جن کی ... اور انجمن کے سکریٹری ذوالفقار صدیقی کی ذات اس بات ... ضمانت ہے کہ یہ انجمن بلندی کی نت نئی منزلیں ... تک یہاں سے خاصی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ... کے تنقیدی مقالات کے مجموعے، سماجی تنقید اور ... عمل اور تنقید اور عصری آگہی نیز غیاث احمد گدی او ... نوجوان افسانہ نگاروں کے مجموعے قابل ذکر ہیں۔

شاہ اجمل اشاعت گھر نے بھی اس میدان میں قدم ... اور اسے اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے لیے ابھی بہت کچھ ... نے کچھ مذہبی کتابیں شائع کی ہیں، پروگرام ... پروگرام پورا ہو سکے۔ اس کے نگراں اکمل ... جعفر عسکری مل کر "مادری زبان" ... کر رہے ہیں جو اردو مورچہ کا ترجمان ...

نا انصافی ہوگی اگر یہاں بعض ایسی کاوشوں کا ذکر نہ کیا جائے جو انفرادی ہونے کے باوجود اہمیت رکھتی ہیں۔ الہ آباد اہم ادیبوں اور شاعروں کا مرکز رہا ہے۔ بہت سے لوگوں نے اپنی کتابیں نجی طور پر شائع کیں، ان میں مولانا شفق عماد پوری، نوح ناروی، فراق گورکھپوری، ڈاکٹر مسیح الزماں، بسمل الہ آبادی، اردو کے آخری ریختی گو شاعر شید ادریابادی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنھوں نے اپنی کئی نگارشات شائع کرکے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا۔

تو یہ ہے الہ آباد کی اشاعتی سرگرمیوں کا ایک سرسری سا جائزہ۔ میں نے محض یادداشت کے ذریعے یہ داستان بیان کی ہے۔ لغزشیں بھی ہوں گی اور کچھ اہم ادارے چھوٹ بھی گئے ہوں گے یہ بشریت کا تقاضا ہے، مگر مجھے یہ اطمینان ضرور ہے کہ ان سطور کے مطالعے سے آپ اس الہ آباد کی اشاعتی سرگرمیوں سے ایک حد تک آشنا ضرور ہو جائیں گے جس نے ہر دور میں کاروانِ علم و آگہی کو آگے بڑھایا ہے۔

ڈاکٹر نورالحسن نقوی



ایک عہد آفریں ایجاد

تقسیم ملک کے بعد اردو پر جو مایوسی کے بادل چھا گئے تھے وہ اب دھیرے دھیرے چھٹتے نظر آتے ہیں اردو دشمنی کی لے اب ذرا دھیمی پڑی ہے اور اس زبان کی اہمیت کا اب اہل وطن کو احساس ہو چلا ہے۔ ملک کی مختلف ریاستیں اب اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے پر آمادہ نظر آتی ہیں لیکن اردو کی ترقی کے راستے میں اب بھی کئی دشواریاں ہیں ان میں سے ایک بڑی دشواری طباعت کا مسئلہ ہے۔ لیتھو کی طباعت بھدی ہے اور آفسیٹ گراں۔ کاتب کی ناز برداری دونوں میں مشترک ہے اب سے کچھ عرصے قبل یہ کہا گیا ہے کہ اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ اردو طباعت میں ٹائپ کو رواج دیا جائے۔ اس کی کوششیں بھی ہوئیں مگر اسے قبول عام حاصل نہ ہو سکا اس کا اصل سبب یہ تھا کہ اردو قارئین کی نظروں میں خوبصورت خط نستعلیق بسا ہوا تھا اور ٹائپ میں صرف خط نسخ کی گنجائش تھی جس میں جوڑ کم ہوتے ہیں۔

(خط نسخ کا نمونہ)

[illegible]

(نوری نستعلیق کا نمونہ)

[illegible]

لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس پیچیدہ مسئلے کا حل دریافت ہو گیا اور خط نستعلیق کو نئی زندگی مل گئی۔ احمد مرزا جمیل اور مطلوب الحسن سید کی سولہ برس کی لگاتار کوشش کامیاب ہوئی اور کمپیوٹری کتابت و برقی طباعت کا ایک ایسا طریقہ ایجاد ہو گیا جس پر دنیا کی ترقی یافتہ زبانیں بھی رشک کریں گی۔ ہند و پاک کی دوسری زبانوں کا تو ذکر ہی کیا اب اردو طباعت نے بڑی بڑی زبانوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یہ بات بے شک کہی گئی ہے کہ اب اردو جیٹ کی رفتار سے سفر کرے گی۔

ڈرٹے اور باریک بہت سے مختلف سائز کے حروف بہترین کتابت

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کے ساتھ کمپیوٹر میں داخل کر دیے گئے ہیں اس دیو قامت مشین پر ایک ساتھ ستر آدمی ٹائپ کر سکتے ہیں اور یوں ایک منٹ میں سات ہزار الفاظ ٹائپ کیے جا سکتے ہیں جو عبارت ٹائپ کی جائے وہ ایک پردے پر نظر آتی رہتی ہے اس سے تصحیح کا کام آسان ہو جاتا ہے۔

طباعت کی دشواریوں کے سبب اردو اخبارات ابھی تک بہت پیچھے تھے مگر اب رات کے تین بجے تک کی خبریں صبح پانچ بجے ہمارے سامنے ہوا کریں گی اور پانچ سو صفحات کی کتاب جو برسوں میں چھپتی ہے صرف چند روز میں تیار ہو جایا کرے گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کاتب کے نخروں سے نجات مل جائے گی۔

نوری نستعلیق

کمپیوٹر سے کتابت

پرویں رقم عہد اقبال کے مائیہ ناز خطاط تھے اقبال نے کہا تھا کہ پرویں رقم میرے اشعار کی کتابت نہیں کریں گے تو میں شعر کہنا ترک کر دوں گا مگر اب جس خطاط کی کتابت

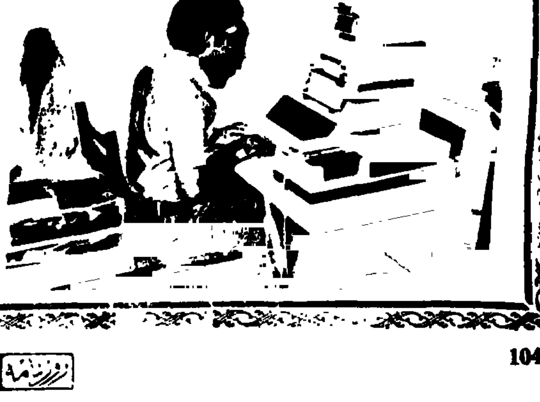
کمپیوٹر میں داخل کر دی جائے وہ مجبور ہے کہ مشین کا بٹن دبتے ہی جس کتاب کی کہیے کتابت شدہ درج کر دے۔

"پرویں رقم میرے اشعار کی کتابت نہیں کریں گے تو میں شاعری ترک کر دونگا": علامہ اقبال

کتابت کے اس طریقہ کو ابھی صرف روزنامہ جنگ لاہور نے ہی اپنایا ہے جس کی اشاعت لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس مشین کی قیمت بہت زیادہ ہے لیکن ظاہر ہے کہ چند گھنٹے اخبار چھاپنے کے بعد خالی تو نہ بیٹھتی ہوگی۔ اس اضافتی جن کی طرح جو یاد، جیسے ایک کام کرنے دوسرا کام مانگتا ہے۔ یہ مشین بھی ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب مانگتی ہے امید ہے اس طریق طباعت سے چھپی ہوئی کتابیں مقبول ہونگی اور اس کا چلن عام ہوگا۔

اردو اب جھٹ کی رفتار سے سفر کرے گی

ہمارے وسائل اس کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم سر دست اس کمپیوٹر کو حاصل کر سکیں لیکن یہ ناممکن نہیں کہ مستقبل قریب میں سرکاری یا نیم سرکاری ادارے باہمی اشتراک اور حکومت کے تعاون



سے اسے درآمد کر لیں اور ہمارے یہاں بھی اردو طباعت میں ایک انقلاب رونما ہو جائے۔

بھدی اور بدنما کتابوں نے بھی اردو کی مقبولیت کو نقصان پہنچایا ہے اب خوبصورت اور تیز رفتار طباعت کا عہد ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے تو ہمیں بھی اس کے خیر مقدم کے لیے کمر بستہ ہو جانا چاہیے۔ ملک کی اردو اکیڈمیز ابھی تک صرف لیتھو کی طباعت میں مالی مدد دیتی ہیں اور ایسی کتابوں کی پیداوار میں معاون ہوتی ہیں جنھیں دیکھ کر طبیعت بے مزہ ہوتی ہے۔ کوئی مصنف آفسیٹ کی طباعت کا بوجھ برداشت کرنے کو تیار ہو تو اردو اکیڈمیز کو اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب ... ایک ... جو ناظر حسین کی ہے اور خود بھی حسین ہوتی ہے اس کو وہ مختلف زاویوں سے دیکھتے اس سلسلے میں ان کی تخیل نہ جانے انھیں کہاں لے جاتی۔

ایک دن کا واقعہ میں کبھی بھی نہیں بھول سکتا

بابائے اردو ایک سال گرمیوں کا موسم ... میں گزار رہے تھے بازار کے ایک بہت بڑے درخت کے نیچے انہوں نے ایک خیمہ لگا دیا اس خیمے میں رہتے تھے دن بھر اس درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے کام کرتے رہتے تھے چنار کا درخت انہیں بہت پسند تھا جو کوئی ملنے آتا اس کے سامنے ... کے درخت کی تعریف کرتے ... میں بھی ... میں ایک دن صبح کو میں وہاں پہنچا تو دیکھا ایک صاحب ان کے پاس بیٹھے ہیں ... پہنچا تو کہنے لگے۔ "بھئی ... کا درخت ... دکھا رہا ہوں"

میں نے کہا جی ہاں مولوی صاحب! یہ تو واقعی دیکھنے ہی کی چیز ہے

پھر ان صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "کیوں صاحب آپ نے یہ چنار کا درخت دیکھا"

انہوں نے جواب دیا "جی ہاں صاحب بہت خوب ہے"

بابائے اردو نے کہا "نہیں صاحب ابھی آپ نے نہیں دیکھا ... دیکھیے"

وہ صاحب پھر بولے "نہایت ہی خوبصورت درخت ہے"

انہوں نے پھر کہا "نہیں صاحب ابھی آپ نے نہیں دیکھا"

اب وہ بیچارے کچھ سٹپٹا سے گئے بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی حیران تھے کہ بابائے اردو چنار کے اس درخت میں کون سی چیز انھیں دکھانا چاہتے ہیں کہ بابائے اردو نے کہا: آپ ... درخت کو ... دیکھیے۔ لیٹ کر دیکھیے کھڑے ہو کر دیکھیے تب اس کے حسن کے ... پہلو آپ کو نظر آئیں گے۔ مجھے اس بات پر بے اختیار ہنسی آ گئی اور میں نے کہا مولوی صاحب ... اس کا کسی وقت ... دیکھیں گے آج ... تو ... وہ صاحب بھی ہنسنے لگے اور بابائے اردو کو بھی ہنسی آ گئی۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر ابن فرید

علی گڈھ کی ادبی اشاعتی سرگرمیاں



اب سے پچیس سال پہلے جب میں علی گڑھ طالب علم کی حیثیت سے آیا تھا تو علی گڑھ میں علمی و ادبی مرتبہ کی بڑی بڑی شخصیتیں تھیں جن کی تحریروں کے خواستگار ہند و پاک کے نامور رسائل و جرائد تھے۔ ان کی تصانیف شائع کرنے کے بڑے بڑے اشاعتی ادارے متمنی رہا کرتے تھے لیکن خود علی گڑھ کا یہ حال تھا کہ اس کے نام سے منسوب بازار مسلم یونیورسٹی مارکیٹ یا شمشاد مارکیٹ میں ادبی کتب کی کوئی دکان نہیں تھی۔ یونیورسٹی پبلشرز کے نام سے بحال ڈاکٹر فوزی کریمی نے ایک مختصر سی دکان ضرور کھول رکھی تھی لیکن اس کا بھی دم واپسیں آ پہنچا تھا۔ ادبی رسائل کی سیل کا دستور نظر نہیں آتے تھے اگر کسی کتب فروش نے کبھی غلطی سے کوئی رسالہ منگوا لیا تو دھول گرد اور دیمکوں نے اس کے سرورق کے نقش و نگار ہی بدل دیے اگر از راہِ ہمدردی کسی دکاندار سے پوچھ لیا کہ بھائی آپ معیاری ادبی رسائل و کتب کیوں نہیں منگواتے؟ تو وہ زہر خند کے ساتھ کہتا: صاحب، علی گڑھ کی کچھ روایتیں ہیں اور ان میں سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اہلِ ذوق کتب و رسائل خرید کر نہیں پڑھتے۔

ان دنوں "علی گڑھ میگزین" (اردو، بڑے) آب و تاب اور پابندی سے شائع ہوتا تھا لیکن اس کا قیمتاً ملنا ایسا راز تھا جو مجھ پر آج تک منکشف نہ ہوا۔ جامعہ اردو سے ایک رسالہ "ادیب" کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا تھا جس کا مطمح نظر اپنے امیدوارانِ امتحان کی درسی ضرورتیں پوری کرنا تھا مگر کتابوں کی دکان پر یہ بھی دستیاب نہ تھا۔ بعض طلبا اپنی امنگ کو پورا کرنے کے لیے پندرہ روزہ یا ہفتہ وار اخبارات بھی نکال رہے تھے۔ ان میں حلقۂ طلبائے اسلامی کے پندرہ روزہ "تعمیر" کی اشاعت سب سے زیادہ تھی۔ احمد رشید شیروانی "دوست" چھاپتے تھے جس کا سیاسی موقف اشتراکی تھا اور تلخی کلام کی وجہ سے شوخ مزاج طلبہ میں "دشمن دوست" مشہور تھا۔ شہریار پندرہ روزہ "غالب" شائع کرتے تھے۔ علی گڑھ کی ادبی روایتی زندگی کی چھاپ اس پر نمایاں تھی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم اور ڈاکٹر نذیر احمد نے اس محفل میں ایک علامیہ "علیگڑھ فکر و نظر" کا اضافہ کیا، افسوس کہ یہ معیار ان کے رخصت ہوتے ہی دم توڑ گیا۔ لیکن بازار میں ان میں سے بھی کوئی اخبار یا رسالہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اکتوبر ۱۹۵۹ء میں میں نے "ادیب" کی اعزازی ادارتی ذمہ داری سنبھالی تو اس معیار کو بلند کرنے کی امکانی کوشش کی۔ رسالہ کا ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں پُرجوش استقبال کیا گیا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ علی گڑھ میں اس کا ایک بھی خریدار نہ تھا۔ اس مدت کے دوران مجھ پر یہ راز بھی کھلا کہ علی گڑھ میں دو اشاعتی ادارے "ادبی دنیا" اور "انڈین بک ہاؤس" بھی ہیں جو کبھی کبھی ادبی کتابیں چھاپ دیا کرتے ہیں مگر ان کے دفاتر ان کے مالکوں کے گھر اور ان کے سیل ڈپو ان کی سواریاں تھیں۔ البتہ یونیورسٹی مارکیٹ میں جو کتب فروش تھے وہ صرف ایسی ادبی کتابیں شائع کرتے تھے جو نصابی ضرورتوں کے کام آ سکیں۔ سرسید بک ڈپو جامعہ اردو کا اشاعتی ادارہ تھا اور اب بھی ہے، اس نے جو کتاب شائع کی اسے نصاب میں ضرور رکھا خواہ اس کی نصابی اہمیت کچھ بھی نہ ہو۔ اب یہ صورتِ حال بدل چکی ہے۔ انجمن ترقی اردو اور یونیورسٹی پبلیکیشن ڈویژن ایسے اشاعتی ادارے ہیں جہاں عام گاہک نہیں پہنچتا۔ انجمن کا مرکزی دفتر دہلی منتقل ہو چکا ہے۔ لیکن اس کا ڈپو اب بھی علی گڑھ میں ہے۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس جو ۱۹۲۵ء سے قائم ہے شروع میں نصابی کتابیں اور کبھی کبھی ادبی کتابیں شائع کرتا رہا ہے۔ اس نے ۱۹۶۷ء سے باقاعدہ علمی، ادبی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کر دیا۔ ادارہ ہذا کے مالک اسد یار خاں صاحب نے اس کے ساتھ ساتھ دو ماہی ادبی رسالہ "الفاظ" بھی شائع کرنا شروع کر دیا۔ ہر چند میں نے سمجھایا کہ یہ گھاٹے کا سودا ہے۔ ناحق آپ ہلکان ہوں گے لیکن ملنے تو وہ جو سود و زیاں کا لحاظ کرتا ہو۔ وہ کہنے اور کر ڈالنے

علم و ادب کی دنیا میں گراں قدر اضافہ

ADVANCED TWENTIETH CENTURY DICTIONARY
English into English and Urdu

یہ لغت انگریزی زبان کے ۵۰۰۰۰ متداول الفاظ اور ۲۵۰۰۰ محاوروں کی وضاحت پر مشتمل ہے۔ اس میں معانی کے ہر پہلو کی بہت آسان لفظوں میں تشریح اور بے شمار مترادفات کا فرق متعین کیا گیا ہے۔ ہر جگہ ان متبادل اُردو الفاظ کے ساتھ خاص احتیاط برتی گئی ہے کہ یہ متوازی الفاظ صرف بے جان ترجمہ نہ رہنے پائیں۔ جدید سائنسی علوم اور علمی اصطلاحات کی جابجا تشریح؛ اور تصویروں کی دل کشی نے اس کی افادیت بڑھا دی ہے۔ مثالی کتابت و طباعت۔ نہایت عمدہ سفید کاغذ۔ سائز: ۲۰×۳۰/۸ صفحات: ۸۰۸۔ قیمت: طلبا ایڈیشن -/۳۰ روپے، ڈی لکس ایڈیشن -/۳۵ روپے

GEM POCKET TWENTIETH CENTURY DICTIONARY
English into English and Urdu

جیبی سائز کی یہ جدید ترین لغت اسکول، کالج، دفتر اور گھر میں روزمرہ استعمال ہونے والے ایسے سولہ ہزار (تعداد) انگریزی الفاظ کے اُردو معانی پر مشتمل ہے۔ یہ جامع اور مستند لغت یقیناً اس قابل ہے کہ ہر وقت ساتھ رکھی جائے۔ بہترین کتابت و طباعت۔ عمدہ کاغذ۔ سائز: ۲۰×۳۰/۳۲ صفحات: ۴۸۰ قیمت: ۵۰/۷ روپے

CONCISE TWENTIETH CENTURY DICTIONARY
English into English and Urdu

انگریزی الفاظ کے انگریزی اور اُردو مترادفات کا یہ انمول خزینہ اسکول اور کالج کے اساتذہ اور طلبا کے لیے یکساں مفید ہے۔ مختلف علوم و فنون کی جدید ترین اصطلاحات اور ساٹھ صفحات پر مشتمل "دفتری اصطلاحات کی لغت" نے اس خزینے کو عہدِ حاضر میں قوتِ گفتار کا اہم ترین ماخذ بنا دیا ہے۔ جلی ٹائپ اور روشن کتابت۔ معیاری طباعت۔ نفیس کاغذ۔ سائز: ۲۰×۳۰/۸ صفحات: ۵۵۰
قیمت: -/۱۸ روپے۔

جدید عصری لغت
(اُردو بالتصویر)

پچاس ہزار سے زائد الفاظ و محاورات کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے والی اس لغت میں — الفاظ کے مختلف معانی — محلِ استعمال — تذکیر و تانیث — اور معیاری تلفظ درج کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ ابتدائی درجات سے ایم۔ اے تک کے نصابات میں آنے والے مشکل الفاظ کا خصوصی لحاظ کیا گیا ہے اور تصاویر کے ذریعے بھی اسما کی جا بجا وضاحت کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے یہ لغت تہذیب و تاریخ کی اہم ترین علامتوں کا البم بھی بن گئی ہے۔ فوٹو آفسیٹ کی پرکشش طباعت۔ مونو ٹون کی جاذبِ نظر تصاویر۔ سائز: ۲۰×۲۶/۱۶ صفحات: ۸۴۰
قیمت: -/۲۱ روپے

GEM POCKET TWENTIETH CENTURY DICTIONARY
Urdu into English

اسکول، کالج، دفتر اور گھر میں استعمال ہونے والے اُردو کے تقریباً سولہ ہزار اہم اور بنیادی الفاظ کے انگریزی معانی کا یہ خزانہ ہر وقت آپ کی جیب میں رہ سکتا ہے۔ یہ جامع اور مستند لغت یقیناً اس قابل ہے کہ ہر وقت ساتھ رکھی جائے۔ آفسیٹ کی عمدہ کتابت و طباعت۔ مضبوط سفید کاغذ۔ سائز: ۲۰×۳۰/۳۲ صفحات: ۴۸۰ قیمت: ۵۰/۷ روپے۔

STANDARD TWENTIETH CENTURY DICTIONARY
Urdu into English

تقریباً پچاس ہزار اُردو الفاظ و محاورات کی آسان تشریح اور موزوں ترین انگریزی متبادل مہیا کرنے والی یہ مستند ترین لغت عہدِ حاضر کا ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ ہر شعبۂ زندگی کی لفظیات کا یہ بیش بہا خزانہ صحیح تلفظ اور لب و لہجے کا مکمل راہ نما بھی ہے۔ اُردو الفاظ پُرکشش خطِ نستعلیق میں اور انگریزی الفاظ جلی ٹائپ میں لکھے گئے ہیں۔ بہترین طباعت۔ نفیس کاغذ۔ سائز: ۲۰×۳۰/۸ صفحات: ۶۸۰۔
قیمت: طلبا ایڈیشن -/۳۰ روپے۔ ڈی لکس ایڈیشن -/۳۵ روپے

جیبی تعلیم اللّغات
(اُردو بالتصویر)

اُردو کے بیس ہزار سے زیادہ الفاظ کے معانی پر مشتمل یہ لغت اُردو پڑھنے اور پڑھانے والوں کی ایک بہترین دوست ہے کیونکہ اس کے تمام الفاظ پر اعراب لگائے گئے ہیں تاکہ صحیح تلفظ کیا جا سکے۔ اور ہر اسم کی تذکیر و تانیث بھی درج کی گئی ہے۔ تمام اہم مقامات اور اشیا وغیرہ کی ان گنت تصاویر نے اس لغت کو مزید اہم اور یادگار بنا دیا ہے۔ آفسیٹ کی عمدہ کتابت و طباعت۔ گلیز کاغذ۔
سائز: ۲۰×۳۰/۳۲ صفحات: ۴۹۶۔ قیمت: ۵۰/۷ روپے

تعلیمی عربی اُردو — اُردو عربی لغت

یہ لغت عربی زبان کی معتبر ترین قدیم و جدید لغات سے کشید کیا ہوا ایک ایسا عطر مجموعہ ہے جس کی مہک سے عربی کے طلبا اور علما دونوں ہی محظوظ ہو سکتے ہیں۔ عرب ممالک کی روزمرہ زبان کا مکمل احاطہ کرنے والی اس لغت کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں: عربی الفاظ کے اُردو معانی — اور اُردو الفاظ کے عربی معانی — دونوں شامل ہیں۔ عربی سے اُردو اور اُردو سے عربی میں ترجمہ کرنے والوں اور ان نوجوانوں کے لیے جو عرب ممالک میں ملازمت یا سیاحت کے لیے جانا چاہتے ہیں، ان کے لیے یہ لغت خضرِ راہ کا درجہ رکھتی ہے۔ صاف ستھری روشن کتابت و طباعت۔ سفید عمدہ کاغذ۔ سائز: ۱۸×۲۲/۱۶۔ صفحات: ۴۸۰۔ قیمت: -/۱۵ روپے۔

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۳۱۰۸۔ گلی عزیز الدین وکیل ڈاکٹر مرزا احمد علی مارگ، لال کنواں، دہلی۔۶

Educational Publishing House

3108, Vakil Street, Dr Mirza Ahmad Ali Marg, Lal Kuan, DELHI-110006

نوٹ: ہر قسم کی ادبی، اصلاحی اور مذہبی کتب کے لئے ہم سے رجوع کریں۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

QA/PN-23

والے انسان ہیں۔ اسرار یار خاں نے معیاری ادبی کتابیں دیدہ زیب کتابت اور شاندار گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایجوکیشنل بک ہاؤس نے طباعت کے لیے نہ صرف معتبر نام پیدا کیا ہے بلکہ اس ادارے نے ہر سال ایک یا دو انعامات بھی حاصل کیے ہیں۔ یہ انعامات عموماً اول انعام ہوتے ہیں۔ صرف ہندستانی ہی نہیں غیر ملکی مصنفین آرزومند رہتے ہیں کہ ان کی کتابیں اس ادارے سے شائع ہوں۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس کی ہر مطبوعہ کتاب کو ہر ملک کی کوئی نہ کوئی اکیڈمی انعامات عطا کرتی ہے۔

"الفاظ" دو ماہی ادبی رسالہ بھی ایجوکیشنل بک ہاؤس سے ۱۹۷۶ء سے شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالہ کو ایجوکیشنل بک ہاؤس نے مسلسل خسارے کے باوجود شائع کیا۔ اس ادارہ نے اپنی ساکھ اور اشاعتی کارکردگی کے ذریعہ اسے اتنا مقبول بنا دیا کہ اس کے قارئین ہر نئے شمارے کے لیے بے چینی سے منتظر رہتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء سے جب سے ڈاکٹر اطہر پرویز اور ڈاکٹر نذیر الحسن نقوی نے اس کی ادارت سنبھالی ہے اس کا ہر شمارہ خاص شمارہ ہوتا ہے۔ ہر شمارے میں کسی ممتاز ادیب یا شاعر کے لیے ایک گوشہ وقف ہوتا ہے اور ٹائیٹل پر اس فنکار کی تصویر ہوتی ہے۔ ۱۹۸۱ء میں "الفاظ" نے دو حصوں میں افسانہ نمبر شائع کیا ہے۔ اس خصوصی نمبر میں پرانے اور نئے افسانہ نگاروں کے ساٹھ سے اوپر افسانے شامل ہیں۔ ان میں سے کئی افسانے اپنے فنکاروں کے نمائندہ افسانے قرار دیے جائیں گے۔ مدیران نے "الفاظ" کو نئی زندگی عطا کی ہے۔ اس کی پالیسی غیر سیاسی اور غیر جانبدارانہ ہے اور اس کے صفحات ہر مکتب خیال کے اصحاب قلم کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کا افسانہ نمبر پانچ ہزار سے زیادہ تعداد میں شائع ہو چکا ہے۔ "الفاظ" کی ایک عطا یہ بھی ہے کہ اس نے اردو ادبی صحافت میں علی گڑھ کے نام کا اس وقار کے ساتھ اضافہ کیا ہے کہ یہ رسالہ ہندستان کا صف اول کا رسالہ شمار کیا جاتا ہے۔ مکتبہ الفاظ نے اپنا ایک اشاعتی پروگرام بنایا ہے۔ اس ادارے سے چند کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

"الفاظ" ہی کی وجہ سے علی گڑھ کی زمین اردو صحافت کے لیے اتنی ہموار ہو گئی ہے کہ گزشتہ چند سالوں میں یہاں سے اچھے معیاری رسائل شائع ہونے لگے ہیں اور کتابوں کی تو پیدا ہر دکان پر علی گڑھ کے باہر سے شائع ہونے والے ادبی اور عام صحافتی رسائل و اخبارات سیل کاؤنٹر پر نظر آتے ہیں اور معقول تعداد میں فروخت ہوتے ہیں۔ علی گڑھ سے شائع ہونے والے رسائل حالانکہ خاصی تعداد میں مفت اٹھائے جاتے ہیں، سیل کاؤنٹر سے بھی اچھی خاصی تعداد میں فروخت ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج علی گڑھ کے قارئین نے علی گڑھ کی روایت کے برخلاف علی گڑھ کی ایک قدیم روایت کو توڑ دیا ہے۔

گزشتہ سال چند بزرگوں اور چند نوجوانوں نے مل کر ایک ششماہی رسالہ "دائرے" کے نام سے اجرا کیا۔ پہلا شمارہ پچھلے سال شائع ہوا تھا۔ اس سال دوسرا شمارہ منظر عام پر آ رہا ہے۔ ان باحوصلہ حضرات نے دوسرے شمارے کو بنانے سنوارنے میں خاصی محنت کی ہے۔ یقین ہے کہ اس محنت کا پھل بھی میٹھا ہوگا۔ ۱۹۸۱ء سے دائرے نے اشاعت کتب کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے۔ ان کی شائع کردہ پہلی کتاب "بارش" جو منظور ہاشمی کا مجموعہ کلام ہے بازار میں آ چکی ہے۔

تین سال سے پروفیسر اسلوب احمد انصاری ادبی تنقید، ششماہی جریدہ "نقد و نظر" کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔ اس کے پہلے شمارہ کے اداریہ میں موصوف نے اعلان کیا تھا کہ ہر شمارہ میں علامہ اقبال پر ایک مضمون ہوگا لیکن گزشتہ دو شماروں سے انھوں نے خصوصی مطالعہ کی طرف توجہ دی ہے اور رشید احمد صدیقی و فانی بدایونی پر دو خصوصی شمارے شائع کیے ہیں۔ "نقد و نظر" کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے قلمی معاونین کا حلقہ صرف چند حضرات تک محدود رکھا ہے جن میں سے بیشتر یہاں کی یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی سے متعلق ہیں۔

"نمائندہ نئی نسلیں" جو "اصلاحی نسلیں" لکھنؤ کی تجدید ہے ۱۹۸۰ء سے دہلی سے شائع ہو رہا ہے۔ اسے واقعتاً ادبی پرچہ بنانے کے لیے اس کی ادارتی ذمہ داریاں میرے اور راشم نعیم کے سپرد کر دی گئی ہیں۔ اس طرح اسے بھی اہل علی گڑھ اپنا ہی رسالہ شمار کرتے ہیں۔ اس رسالہ نے چند ماہ میں اپنی جگہ بنا لی ہے اور یہاں کے

ادبی حلقوں میں اس کی خاصی پذیرائی ہے "نئی نسلیں" تعمیری اور صالح ادب کا نمائندہ ہے اور زندگی کے ساتھ ادب میں بھی مثبت قدروں پر اصرار کرتا ہے کیونکہ جس طرح تخریب میں منفی قدریں کارفرما ہوتی ہیں اسی طرح ذہن و زندگی کی تعمیر کے لیے مثبت قدریں ناگزیر ہوتی ہیں۔ ہم نے ابھی سے اس کے خاص نمبر کا منصوبہ تیار کرنا شروع کر دیا ہے، جو "جدید ادبی ذہن" کے موضوع پر ہوگا۔

دینی و دعوتی کتابوں کی اشاعت کے لیے یہاں کریسنٹ پبلشنگ کمپنی بھی قائم ہے۔ اس ادارے نے پندرہویں صدی ہجری کی تقریب کے وقت پر دو افسانوی مجموعے اور ایک تنقیدی مضامین کا مجموعہ شائع کیا تھا۔ یہ تینوں کتابیں بہت خوبصورت شائع ہوئی ہیں اور ان کا ادبی معیار بھی لائق ستائش ہے۔ سنا ہے کہ اس ادارہ نے اب ادبی کتابیں شائع کرنے کا منصوبہ ترک کر دیا ہے۔ البتہ ایک اور اشاعتی ادارہ "ادارہ فن و ادب" عالم وجود میں آ رہا ہے جس کے سامنے بڑا پرحوصلہ اشاعتی پروگرام ہے۔ ہماری نیک خواہشات اس کے ساتھ ہیں۔

"ہم قدم" طلبہ کا صحافتی پندرہ روزہ ہے جو پہلے بھی شائع ہوتا تھا لیکن ۱۹۸۱ء سے یہ آفسیٹ پر باتصویر شائع ہو رہا ہے۔ اس کی رنگین طباعت اور ادارتی سلیقہ مندی نے اسے جمے جمائے پرانے ہفتہ وار اور پندرہ روزہ اخبارات کے شانہ بہ شانہ کھڑا کر دیا ہے اس نے متوازن اور بردبارانہ تحریروں کے ذریعہ اپنی الگ راہ بنائی ہے اسی وجہ سے بعض ممتاز اور معتبر اخباروں پر اسے فوقیت دی جاتی ہے

"ترجمان" علی گڑھ سے شائع ہونے والا پرانا اخبار ہے شائع ہوتا رہتا ہے۔ اس کے مالک و مدیر ڈاکٹر فوق کریمی ہیں اس میں عام طور سے مقامی خبریں ہوتی ہیں اور لیتھو پر چھپتا ہے۔ "احتساب" مولانا تقی امینی کے زیر ادارت پندرہ دن کے وقفہ سے شائع ہوتا ہے اس کا مرکز توجہ دینی مسائل و افکار ہیں۔ شہر سے کچھ اور ہفتہ وار اور پندرہ روزہ اخبارات نکلتے ہیں لیکن کبھی کبھار اچانک اپنی جھلک دکھاتے ہیں اور اوجھل ہو جاتے ہیں۔ "علی گڑھ میگزین" (اردو) جو پہلے سال بہ سال شائع ہوتا تھا، پندرہ بیس سال سے تین چار سال بعد شائع ہوتا ہے تو علیگ حضرات سجدۂ شکر کرتے ہیں۔ "فکر و نظر" اپنے اولین دور میں جس پابندی سے شائع ہوتا تھا اب اس کی وہ روایت

نہ رہی۔ "ادیب" ایک عظیم نقاد کی کوششوں سے ۱۹۶۸ء میں بند ہو گیا تھا۔ گزشتہ دو سال سے یہ پھر شائع ہونے لگا ہے۔ مگر اسے عمداً علمی و ادبی اسٹیج سے ہٹا دیا گیا ہے اور نصابی رسالہ بنا دیا گیا ہے جسے خریدنے کے لیے جامعہ اردو کا ہر امیدوار پابند ہے اس طرح غیر امیدوار اس سے فیض نہیں حاصل کر سکتا۔

ادبی اشاعتی دنیا میں بھی کچھ وفیات ہوئی ہیں۔ ان کا ذکر بھی ہو جائے تو تذکرے کا حق ادا ہو جائے گا۔ ڈاکٹر مختار حسین احمد کے زیر ادارت "مجلہ علوم" سالانہ شائع ہوتا تھا جس کی مدت ششماہی تھی لیکن گزشتہ دس سال سے اس کا کوئی شمارہ شائع نہیں ہوا ہے۔ حالانکہ یہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام شائع ہوتا تھا۔ "تیر و تیشہ" کے نام سے ایک پندرہ روزہ بڑی آب و تاب سے گزشتہ سال ۱۹۷۹ء شائع ہونا شروع ہوا تھا صحافتی دنیا میں بہت مقبول ہوا لیکن اچانک یہ فلمی رسالہ بن گیا اور پھر دو شماروں کے بعد بند ہو گیا "ادبی دنیا" اور "انڈین بک ڈپو" تو چند سال زندہ رہے "مکتبہ ماورا پبلشرز" کی وفات ایام طفولیت ہی میں ہو گئی۔ یہ ادارہ تین کتابیں ہی شائع کر سکا۔ ہم ان سب کے ایصال ثواب کے لیے دست بدعا ہیں۔

"تہذیب الاخلاق" پھر سے شائع ہونے لگا ہے۔ اس کے مدیر اعلیٰ سید حامد اور مدیر مسئول قاضی معزالدین ہیں۔ "الفاظ" کے مینیجنگ ایڈیٹر احمد سعید خاں خود کے لیے کوئی رسالہ نکالنے کے لیے سوچ رہے ہیں لیکن یہ ابھی تک اعلان نہیں بنا ہے۔ اس لیے اسے دروغ برگردن راوی بھی کہا جا سکتا ہے۔ شہر سے ایک ادبی رسالہ "نئے نقوش" کی اشاعت کا اعلان ہوا ہے کسی صاحب کی زبانی یہ بھی سنا ہے کہ کوئی صاحب "ماورا" کا اجرا کرنے والے ہیں۔ خدا کرے یہ ہوائی کسی دشمن نے نہ اڑائی ہو۔ بہرحال ان سب آنے والی روحوں کے لیے ادبی فرشتے پر پھیلائے کھڑے ہیں۔ راشد شاذ "تجدید" کے اجرا کی تیاری کر رہے ہیں۔

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نے اپنی ایک شاخ یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ میں ۱۹۶۸ء میں قائم کی تھی۔ ادبی کتب کے مرکز کے علاوہ یہ ادارہ اپنے ساتھ اپنی روایتیں بھی لایا ہے جن میں سے

ایک یہاں کی نشستیں ہیں جن کے پیر مغاں بزمی بھارتی ہوتے ہیں۔ یہاں معروف غیر معروف چھوٹے بڑے میزبان مہمان ادیب و شاعر دو پہر اور شام کو جمع ہو جاتے ہیں اور "ادبی گرم بازاری" دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس مکتبہ نے علی گڑھ میں اردو کتابوں کی فراہمی کے ساتھ ساتھ ادبی چھپائی بھی شروع کر دی ہے۔

بعض اصحاب تصنیف اپنی کتابوں کے لیے کسی اشاعتی ادارے کا سہارا نہیں لینا چاہتے۔ اس لیے وہ اپنی کتاب خود چھاپتے ہیں یہ مابعین کبھی کبھی آرائش و زیبائش کے لیے کتاب پر کسی اشاعتی ادارہ کا نام بھی چھاپ دیتے ہیں جو زیب داستان کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ ان اصحاب و خیالی اشاعتی اداروں کی تعداد صبح و شام بدلتی رہتی ہے اس لیے ان کی فہرست تیار کرنا اعتباری جمع و تفریق سے کم مشکل کام نہیں ہے۔

علی گڑھ اب سے پندرہ سال پہلے اہم ادبی مرکز شمار کیا جاتا تھا آج یہ اہم اشاعتی مرکز بھی بن چکا ہے۔ یہاں اگر ایک طرف باصلاحیت اہل قلم کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، تو یہاں سے شائع ہونے والی کتب اور رسائل و اخبارات بھی ادبی و صحافتی دنیا میں امتیازی مقام بناتے جا رہے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ اب جب ہم علی گڑھ میں ادب کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو رجائیت کی شادابی نمایاں ہوتی ہے۔

"پروفیسر رشید احمد صدیقی کی کوئی کتاب باقاعدہ تحقیق و تلاش کا نتیجہ نہیں ہے لیکن ان کی ہر کتاب میں پتے کی باتیں ملتی ہیں "ملفوظات و مضحکات" ایک طرح آپ بیتی کی یادداشت ہے۔ آپ بیتی کی سرایت غلط ثابت ہوسکتی ہے مکتوبات سے کوئی طالب علم بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح طنز و ظرافت کے موضوع پر اس سرسری نظر میں بھی ایسے گہرے اور بصیرت افروز تاثرات ملتے ہیں کہ ان کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوسکتی یہی حال زبان اردو پر ایک نظر کا ہے جو دراصل ان کے ایک لیکچر کا عنوان ہے۔ اس میں اردو زبان کی تاریخ نہیں ہے لیکن اس کے مزاج کا ایک حیرت انگیز احساس ہے وہ بعض چونکانے والے فقرے لکھتے ہیں جن میں حقیقت کچھ سمٹ کر رہ جاتی ہے مثلاً حالی کی کے ... شاعر ... جیسے کہ کوئی شاعر بڑا نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ معقول آدمی نہ ہو مگر ان میں حقیقت کی جو کرن ہے وہ بھی کم نظر فریب نہیں ہے۔"

(پروفیسر آل احمد سرور)

ڈاکٹر شمیم نکہت



اردو ادبی رسائل کے چند اہم خاص نمبر

یہ بتانا مشکل ہے کہ اردو رسائل نے کب سے خصوصی نمبروں کی اشاعت شروع کی اور ابتدا میں ان کی کیا نوعیت تھی۔ لیکن پرانے اشتہارات اور رسائل کی فائلوں کو دیکھنے سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ عام طور پر ہر رسالہ سال میں ایک خاص نمبر ضرور نکالتا تھا جسے سالنامہ کہا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ خاص نمبروں کی طرف لوگوں کی توجہ بڑھنے لگی اور رسائل بعض مخصوص موقعوں پر خصوصی شمارے شائع کرنے لگے۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر بڑے اہتمام اور تیاری کے ساتھ خاص نمبروں کی اشاعت ہونے لگی۔

خاص نمبروں کی اشاعت کے چلن میں اضافہ کا سبب ادبی بھی تھا اور کاروباری بھی کسی خاص موضوع یا شخصیت کے بارے میں اس زمانے کے اہم اہل قلم حضرات کے مضامین اکٹھا کر کے شائع کرنا ایک ادبی کام تھا۔ اس طرح ایک موضوع، صنف، شاعر یا ادیب کے بارے میں اچھے مضامین جمع ہو جاتے جو تفصیلی مطالعہ میں معاون ہوتے۔ ان نمبروں سے کاروباری مقصد بھی حل ہوتا تھا اس لیے کہ ان کی قیمت زائد ہوتی دوسرے عام شمارے جس ماہ شائع ہوتے ہیں ان کی فروخت کی حد صرف اسی ماہ تک رہتی ہے لیکن خاص شمارے ہمیشہ اپنا ایک بازار رکھتے ہیں۔ خاص شماروں کے نام پر اشتہارات بھی زائد مل جاتے ہیں۔ ناشر کے لیے خاص نمبروں کی اشاعت میں فائدے کا یہ بھی ایک پہلو ہے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو خاص نمبروں سے قاری اور ناشر دونوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ اس لیے رفتہ رفتہ خاص نمبروں کی اشاعت میں اضافہ ہونے لگا یہاں تک کہ آج کے زمانے میں بعض رسائل نے خاص نمبروں کی اشاعت میں ایسی مہارت پیدا کر لی ہے کہ وہ خاص نمبروں کے رسالے ہی ہو کر رہ گئے ہیں۔

اردو رسائل کے خاص نمبروں کا مطالعہ یقیناً بہت دلچسپ ہوگا جس کی طرف ابھی کسی کی نگاہ نہیں گئی اس لیے کہ خاص نمبروں کے مطالعہ سے ادب کے رجحانات و لسانیات اور زبان کی تبدیلی کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے دوسرے یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ کب کون سے موضوعات یا اشخاص زیادہ مقبول رہے جن کے بارے میں خصوصی نمبر شائع کیے گئے۔ اصناف ادب پر مثلاً غزل نمبر۔ افسانہ نمبر۔ ناولٹ نمبر۔ تنقید نمبر۔ نظم نمبر وغیرہ کی اشاعت کی ابتدا کب سے ہوئی یا کس زمانے تک کسی ایک طرح کے نمبروں کی اشاعت پر زیادہ زور تھا۔ ادبی شخصیتوں پر خاص نمبروں کی اشاعت کا آج بے حد رواج ہے آئے دن کسی نہ کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں ایک نیا نمبر ہمارے سامنے آتا ہے لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ اشخاص پر اس طرح نمبروں کی اشاعت کب سے شروع ہوئی اور پہلا رسالہ کون سا تھا جس نے کسی شاعر یا ادیب پر خاص نمبر شائع کیا اور اس خاص نمبر کے مشمولات کیا تھے۔ میرے خیال میں یہ ایک بہت دلچسپ موضوع ہے اور اس موضوع پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ اس کوشش سے بعض اہم چیزیں سامنے آئیں۔

اس وقت خاص نمبروں کی گفتگو میں ان تمام باتوں کا احاطہ ممکن نہیں ہے جس کا اظہار اوپر کی سطروں میں کیا گیا ہے میرے پیش نظر گذشتہ چند برسوں میں شائع ہونے والے بعض خاص نمبر ہیں جن تک میری گفتگو کا دائرہ محدود ہے ان نمبروں کے انتخاب میں بھی کسی اہتمام کا دخل نہیں ہے جو نمبر موجود تھے اور جو آسانی سے مل گئے ان کا ذکر

کر دیا گیا ہے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ خاص نمبروں کی اہمیت کی طرف توجہ مبذول کرائی جا سکے اور آئندہ تاریخ زمانہ اور رسائل کو سامنے رکھ کر کوئی کام کر سکے۔

اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ اردو رسائل اکثر خاص نمبر شائع کرتے رہے ہیں جن میں بعض رسائل کے خاص نمبر اب تاریخی اہمیت حاصل کر چکے ہیں۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ اب ان رسائل کی اشاعت بند ہو چکی ہے۔ ایسے رسائل میں ماہنامہ نگار لکھنؤ۔ ماہنامہ کتاب لکھنؤ۔ ماہنامہ تحریک دہلی وغیرہ شامل ہیں نیاز فتحپوری نے نگار کے بعض بہت اہم نمبر شائع کیے جن میں مومن نمبر مصحفی نمبر اور خدا نمبر وغیرہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح کتاب لکھنؤ نے اپنی دس سالہ حیات میں تقریباً ہر سال افسانہ نمبر شائع کیا۔ اس کے علاوہ نئی ہندی کہانی نمبر شائع کیا جس میں فنیشور ریتو سے امرکانت تک ہندی کی بارہ بہترین کہانیوں کا انتخاب اور جدید اردو ہندی افسانہ نگاری پر ٹھاکر پرشاد سنگھ اور عابد سہیل کے مقالات شائع کیے یہ اردو میں پہلا نمبر تھا جو ہندی کہانی کے بارے میں شائع ہوا۔ کتاب نے علی عباس حسینی نمبر بھی بڑے اہتمام سے شائع کیا جس میں حسینی صاحب کے فن و شخصیت پر آٹھ مقالات اور ان کی پہلی اور دوسری کہانی کے علاوہ ان کی نمائندہ کہانیاں، غسل خانہ میں، گھومتی، سیلاب کی راتیں، اور گناہ بے لذت شامل ہیں ۱۹۶۴ء میں کتاب کا منتخب افسانہ نمبر شائع ہوا۔ جسے رام لعل اور عابد سہیل نے ترتیب دیا تھا جس میں ۱۹۶۲ء کے ستائیس بہترین افسانوں کا انتخاب اور اردو افسانہ پر وزیر آغا کا مقالہ شامل ہے ماہنامہ کتاب نے اردو میں پہلی بار مراٹھی کہانی نمبر شائع کیا جسے نور پرکار نے ترتیب دیا تھا۔ اس نمبر میں مراٹھی کی بیس نمائندہ کہانیوں کے علاوہ مراٹھی ادب پر چار مقالے بھی شامل ہیں ۱۹۶۷ء میں کتاب کے شوکت تھانوی نمبر کو احمد جمال پاشا نے مرتب کیا اردو طنز و مزاح اور شوکت تھانوی کے مطالعے کیلیے یہ نمبر بیحد اہم ہے۔ اس میں شوکت تھانوی پر مولانا عبدالماجد دریاآبادی احتشام حسین، ابراہیم جلیس، محمد طفیل، نسیم انہونوی وزیر آغا کے مضامین کے علاوہ شوکت تھانوی کے افسانوں خاکوں ڈراموں اور نظموں کا اچھا انتخاب بھی شامل ہے۔ ان نمبروں کے علاوہ کتاب کے سالنامے اور خاص نمبر اپنے ادبی تنقیدی اور تحقیقی معیار کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ کتاب کا آخری شمارہ ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا جسے الوداعی شمارہ کا نام دیا گیا تھا کتاب کا وہ الوداعی شمارہ بھی خاص نمبر کی اہمیت رکھتا ہے جس کے دو حصے تھے ایک حصے میں ادب میں عصری آگہی کے موضوع پر ڈاکٹر سید محمد عقیل، ڈاکٹر شارب ردولوی، رضیہ سجاد ظہیر، انور عظیم اور اقبال مجید کے مقالات ہیں اور دوسرے حصے میں گوشۂ سجاد ظہیر ہے اس کے علاوہ مضامین نظمیں اور غزلیں وغیرہ ہیں۔

ماہنامہ تحریک دہلی نے بھی بہت سے خاص نمبر شائع کیے ہیں جن میں غالب نمبر میں غالب کی شاعری اور فن کی نئی جہتیں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تحریک کا بسمل سعیدی نمبر بسمل صاحب کی شخصیت اور فن کا ایک اچھا تنقیدی جائزہ ہے۔ اس نمبر میں بسمل صاحب کی شخصیت اور فن پر سولہ مضامین کے علاوہ متاعِ فن کے عنوان سے ان کی شاعری کا بہت اچھا انتخاب شامل ہے۔

تحریک کا سب سے اہم نمبر اس کا سلور جوبلی نمبر تھا جس میں تقریباً آٹھ سو صفحات تھے جس میں پندرہ تنقیدی مضامین ۴۵ نظمیں پاکستانی ادب پر وزیر آغا، انور سدید اور جاوید انور کے مضامین۔ ۲۵ افسانے ۸۴ شعراء کی غزلیں ساجدہ زیدی کا ڈرامہ "ممتا کی آگ" کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں اور غیر ملکی زبانوں کے بڑی تعداد میں تراجم شامل ہیں تحریک کا یہ نمبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۷۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا اسے گوپال متل نخمور سعیدی اور پریم گوپال متل نے ترتیب دیا۔

"اردو ادب" انجمن ترقی اردو ہند دہلی کا سہ ماہی رسالہ ہے" اردو ادب" نے بعض اہم نمبر شائع کیے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں اردو ادب کا حسرت نمبر شائع ہوا تھا جسے آل احمد سرور نے مرتب کیا تھا اس نمبر میں حسرت کی شاعری اور زندگی پر

گیارہ مضامین تھے۔ جن میں آل احمد سرور، ضیا احمد بدایونی، قاضی عبدالودود مجنوں گورکھپوری، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر یوسف حسین خان اور احتشام حسین کے نام شامل ہیں۔

۱۹۸۲ء میں حسرت صدی کے موقع پر اردو ادب نے پھر حسرت نمبر شائع کیا ہے جس میں ۱۲ تنقیدی مضامین ہیں شروع میں تین مضامین عتیق صدیقی صاحب کے ہیں جو ۴۵ صفحات پر محیط ہیں۔ اس کے بعد دو مضامین راج بہادر گوڑ کے ہیں۔ عتیق صدیقی نے حسرت کے عہد، مشاہدات زندان، اور حسرت کی سیاسی زندگی کے آخری ۲۵ سال پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ راج بہادر گوڑ ڈاکٹر حامدی کاشمیری اور ڈاکٹر خلیق انجم کے مضامین بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ نمبر ڈاکٹر خلیق انجم نے ترتیب دیا ہے۔

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ محکمہ اطلاعات ورابطۂ عامہ یوپی سے شائع ہونے والا اردو ماہنامہ ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں جو نمبر شائع کیے ہیں ان میں احتشام حسین نمبر خاصی اہمیت رکھتا ہے جس میں احتشام صاحب کی شخصیت ان کی تنقید نگاری اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ نیا دور کا مولانا عبدالماجد دریا بادی نمبر بھی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ نمبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس نمبر میں مولانا کی زندگی اور خدمات پر ۲۱ مضامین اور منظوم خراجِ عقیدت شامل ہے۔ منشی نول کشور نمبر نیا دور کا ایک بہت اہم نمبر ہے جس میں اردو کے اس عظیم ناشر اور ان کی اردو خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں تقریباً ۲۷ ادبی اور تنقیدی مضامین منشی نول کشور ان کی مطبوعات اور مختلف پہلوؤں پر شامل ہیں۔ یہ پہلا نمبر ہے جو کسی اردو پبلشر کے بارے میں شائع ہوا۔ اس نمبر کے مرتب امیر احمد صدیقی صاحب ہیں۔ نیا دور نے ۱۹۸۱ء میں بہادر شاہ ظفر نمبر شائع کیا۔ اس میں بہادر شاہ ظفر کی شاعری جنگ آزادی کے لیے ان کی قربانی اور ان کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر مقالات شامل ہیں۔

ماہنامہ شعاعِ ادب سیتا پور نے نوجوان ادیب ڈاکٹر احراز نقوی کے سانحہ رحلت پر احراز نمبر شائع کیا جس میں احراز نقوی کے بارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ پروفیسر شہرت بخاری۔ پروفیسر آغا سہیل، شکیب رضوی۔ پروفیسر علی رضا حسینی ابوالحسن نغمی۔ ڈاکٹر میمونہ انصاری اور بہت سے ادیب اور شعرا کے مضامین شامل ہیں۔

اردو رسائل میں "فن اور شخصیت" اس لیے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ وہ صرف خاص نمبر ہی شائع کرتا ہے اب تک اس کے کئی ضخیم نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ یہ رسالہ صابر دت کی ادارت میں بمبئی سے شائع ہو رہا ہے۔

"فن اور شخصیت غزل نمبر" اس نمبر میں ولی دکنی سے لے کر جدید عہد کے شعراء تک کی غزلوں کا انتخاب ہے۔ انتخاب کو گیارہ ابواب میں تقسیم کیا گیا شروع میں غزل کے بارے میں حالی سے لے کر فیض تک بہت سے اہم شعراء اور ناقدین کی رائیں پیش کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ غزل کا سفر ولی سے لے کر ترقی پسند تحریک تک کے عنوان سے جاں نثار اختر کا مضمون شامل ہے۔ فن اور شخصیت کملیشور نمبر ہندی کے کسی ادیب اور افسانہ نگار پر اردو کا پہلا نمبر ہے۔ یہ نمبر کملیشور کے فن اور شخصیت پر مختلف زبانوں کے ادیبوں اور ناقدوں کی طرف سے نذرِ عقیدت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نمبر میں کملیشور کی بہترین کہانیاں بھی شامل ہیں۔ فن اور شخصیت کا ایک اور اہم نمبر جاں نثار اختر نمبر ہے۔ اس میں جاں نثار اختر کی نظم گوئی کے بارے میں ۱۳ مضامین۔ غزل گوئی کے بارے میں ۱۸ مضامین اور رباعیات پر ۱۲ مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ جائزے، خاکے اور جاں نثار اختر کی غزلوں رباعیات اور فلمی نغموں کا انتخاب بھی دیا گیا ہے۔

ماہنامہ شاعر بمبئی اردو کے قدیم رسالوں میں ہے جو گذشتہ نصف صدی سے برابر شائع ہو رہا ہے۔ شاعر نے اب تک بہت سے اہم خصوصی شمارے شائع کیے ہیں جن کی دستاویزی اہمیت ہے۔ شاعر کے ناولٹ نمبر میں ۱۴ ناولٹ ہیں اور اردو ناول کی عظمت کی تلاش" کے عنوان سے ڈاکٹر محمد حسن کا مقالہ شامل ہے۔ شاعر کے

اہم خاص نمبروں میں کرشن چندر نمبر کا نام سرِ فہرست ہے جس میں کرشن چندر کی زندگی، شخصیت افسانہ نگاری۔ ناول نگاری، طنز و مزاح اور ان کے فن کے مختلف پہلوؤں پر ۸۵ تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ "غالب نمبر" بھی شاعر کا ایک اہم نمبر ہے جس میں غالب کے فکر و فن پر تقریباً چالیس مضامین کے علاوہ غالب پر لکھے گئے کچھ ڈرامے مزاحیہ مضامین منظوم خراج عقیدت غالب کے مشکل اشعار کی تشریح اور غالب کی نثر و نظم کا بہت اچھا انتخاب شامل ہے۔ "ہم عصر اردو ادب نمبر" بھی شاعر کا ایک خصوصی شمارہ ہے جس میں ہم عصر اردو تنقید، ہم عصر اردو تحقیق ہم عصر اردو نظم ہم عصر اردو کہانی ہم عصر اردو غزل، ہم عصر اردو طنز و مزاح، ڈرامہ اور ناول وغیرہ پر تنقیدی مضامین اور اس اصنافِ ادب کا انتخاب شامل ہے۔ کچھ عرصہ پہلے شاعر کا خلیل الرحمن اعظمی نمبر شائع ہوا ہے جس میں ۲۴ مضامین خلیل الرحمن اعظمی کی شاعری اور شخصیت سے متعلق ہیں ایک شمارہ ۱۹۸۰ء کے نام شاعر کے خاص نمبروں میں انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو میں اس طرح کا نمبر پہلی بار شائع ہوا ہے جس میں ۱۹۸۰ء میں انتقال کرنے والے ادیبوں اور شاعروں پر تنقیدی مضامین خاکے منتخب تخلیقات ۱۹۸۰ء میں منعقد ہونے والے سیمنار کانفرنسیں اور دوسرے علمی و ادبی پروگرام، انعامات و ایوارڈ وغیرہ کی تفصیلات ۱۹۸۰ء کی اہم مطبوعات اور غالب اقبال پریم چند، حسرت، فانی اور آغا حشر صدی کے سلسلے میں نذرانۂ عقیدت شامل ہے۔ شاعر کے تازہ ترین "افسانہ نمبر" میں افتخار امام نے بیشتر جدید اور اچھے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو یکجا کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ افسانہ پر تنقیدی مضمون اور ناقدین اور افسانہ نگاروں کی افسانہ سے متعلق گفتگو شامل ہے۔

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ بھی بہت عرصہ سے شائع ہو رہا ہے اور اب تک اس کے بہت سے خصوصی نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ فروغ اردو کا جگر مرادآبادی نمبر جگر کی شخصیت اور شاعری کا ایک اچھا تنقیدی جائزہ ہے۔ فروغ اردو نے اپنے زمانے کے ایک مقبول ناول نگار خان محبوب طرزی پر بھی ایک مخصوص نمبر شائع کیا ہے۔ جس میں ان کی ناول نگاری اور شخصیت پر بہت سے مضامین شامل ہیں۔ "احتشام حسین نمبر" فروغ اردو کا ضخیم ترین نمبر ہے جس میں احتشام صاحب کے بارے میں جو بھی مل سکا یکجا کر دیا گیا۔ تنقیدی مضامین منظوم نذرانۂ عقیدت تعزیتی قرار دادیں، اخباروں کے تعزیتی اداریے اور خبریں تاثراتی مضامین اور تصاویر وغیرہ۔ احتشام صاحب کے بارے میں یہ نمبر ایک اہم دستاویز کی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں احتشام صاحب کے مضامین کی ایک فہرست سنہ اشاعت اور رسائل کے ناموں کے ساتھ بھی دی گئی ہے۔

آہنگ گیا سے شائع ہونے والا اردو کا اہم رسالہ ہے جو کلام حیدری صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ آہنگ نے بہت سے خاص نمبر شائع کیے ہیں۔ احتشام صاحب کے انتقال پر آہنگ نے بھی ایک خاص نمبر شائع کیا تھا۔ جس میں منظوم خراج عقیدت کے علاوہ احتشام صاحب کی یاد میں منعقدہ حلقۂ ادب کے دو روزہ ادبی اجلاس پر رپورتاژ ہے۔ جسے احمد یوسف صاحب نے لکھا ہے۔ اس نمبر میں ۲۴ تنقیدی مضامین ہیں۔ جن میں احتشام صاحب کی بعض غیر مطبوعہ تحریریں مثلاً سفرِ روس کی ڈائری کا پہلا ورق، ان کی چند غیر مطبوعہ غزلیں، ا۔ ح نورِ ازل کے نام سے لکھی ہوئی ان کی نظمیں، احتشام صاحب کے خطوط اور عبدالقوی دسنوی صاحب کا ترتیب دیا ہوا احتشام صاحب کی کتابوں مضامین اور دیباچوں کا سنہ طباعت کے اعتبار سے اشاریہ شامل ہے۔ آہنگ نے حال ہی میں "فکشن نمبر" شائع کیا ہے جس کی مدیر نوشابہ حق صاحبہ ہیں۔ اس نمبر کا افتتاحیہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے نیا افسانہ روایت سے انحراف اور مقلدین کے لیے لمحۂ فکریہ کے عنوان سے تحریر کیا ہے اس کے بعد جدید افسانہ پر تین تنقیدی

مطبوعات کلچرل اکیڈمی

تنقید و تحقیق

۱۔ زاویۂ نگاہ ۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی ۔/۲۰
۲۔ انتخاب کلام میں ۔ محمد متقی ۔/۷ر
۳۔ معیار و مسائل ۔ شاہ مکیل احمد ۔/۵
۴۔ احتشام حسین نمبر ۔ مرتبہ کلام حیدری ۔/۲۵
۵۔ شاد کی نثر نگاری ۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی ۔/۴۰
۶۔ ضمیر ۔ کلام حیدری ۔/۱۰
۷۔ عکس ۔ نثار احمد صدیقی ۔/۱۰
۸۔ برملا ۔ کلام حیدری ۔/۱۵
۹۔ نئے افسانے کا سلسلۂ عمل ۔ مہدی جعفر ۔/۳۰
۱۰۔ کلیات وحید ۔ ایم ایم مصطفیٰ ۔/۱۵

افسانے

۱۱۔ بے نام گلیاں ۔ کلام حیدری ۔/۸
۱۲۔ بابا لوگ ۔ غیاث احمد گدی ۔/۸
۱۳۔ صفر ۔ کلام حیدری ۔/۱۰
۱۴۔ الف لام میم ۔ ؍؍ ۔/۱۵
۱۵۔ روشنائی کی کشتیاں احمد یوسف ۔/۱۵
۱۶۔ مُردے ۔ ترجمہ شاہد احمد دہلوی ۔/۱۰
۱۷۔ سائنس کی تقدیر ۔ ترجمہ شیخ صلاح الدین ۔/۱۰
۱۸۔ فکشن نمبر ۔ مرتبہ کلام حیدری ۔/۳۵
۱۹۔ شاہی کنیز ۔ رحمٰن حمیدی ۔/۱۰
۲۰۔ ارتقا سیریز ۔ مرتبہ کلام حیدری ۔/۱۲

شاعری

۲۱۔ درخشاں ۔ حفیظ بنارسی ۔/۵
۲۲۔ لوٹے راز ۔ مظہر شمسی ۔/۵
۲۳۔ لمحوں کا سفر ۔ ڈاکٹر نرمدیشور پرشاد ۱۰/
۲۴۔ والٹ وہیٹ مین ۔ ڈاکٹر عبدالرؤف ۔/۵
۲۵۔ نقش نامعتبر ۔ قیم الحق گیاوی ۔/۱۲

متفرقات

۲۶۔ اپنی تلاش میں ۔ کلیم الدین احمد ۔/۲۰
۲۷۔ فرزدار ۔ کلام حیدری ۔/۳۰

زیر طبع

۱۔ جنت نہیں چاہئے (ناول) ۔ کلام حیدری
۲۔ اصول نقد ۔ ؍؍
۳۔ مطالعۂ جمیل مظہری ۔ مرتبہ ؍؍
۴۔ ہم سفر ۔ نثار احمد صدیقی
۵۔ ادبی مباحثے ۔ ؍؍ ؍؍
۶۔ نئے افسانے کا سفر ۔ مرتبہ کلام حیدری

دی کلچرل اکیڈمی، جگجیون روڈ، گیا

QA/PN-48

مضامین ہیں۔ افسانوں کے انتخاب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور ہر حصہ میں شامل افسانوں کا کسی ایک ناقد نے جائزہ لیا ہے۔ اس نمبر میں ۲۹ افسانے شامل ہیں۔

ماہنامہ عصری آگہی دہلی کا "افسانہ نمبر" بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ دراصل اس نمبر میں پریم چند صدی کے سلسلے میں منعقدہ سیمنار کے مضامین مباحث اور افسانوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اسی لیے اس کا ایک حصہ پریم چند سے متعلق ہے۔ جس میں حیات اللہ انصاری اور اصغر علی انجینیر کے مضامین ہیں دوسرے حصے میں اردو کے جدید افسانے کی تفہیم و تنقید پر ۸ مضامین اور دس افسانے ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس اس رسالہ کے ایڈیٹر ہیں۔

ماہنامہ الفاظ علی گڑھ نے ایک ضخیم "افسانہ نمبر" دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ اس کی جلد دوم کا ایک حصہ مشہور پاکستانی افسانہ نگار انتظار حسین کے افسانوں اور ان کے تنقیدی جائزے کے لیے مخصوص ہے جس میں انتظار حسین کے افسانہ سفر منزلِ شب، وہ جو کھوئے گئے اور آخری آدمی، کا تجزیہ کیا گیا ہے اس حصہ کے اختتام پر ڈیڑھ بات اپنے افسانہ پر کے عنوان سے انتظار حسین کا مضمون ہے اس کے علاوہ افسانہ کی تنقید پر پانچ مضامین اور جا ئیلہ افسانہ نگاروں کے اور افسانے شامل ہیں۔

بہار اردو اکیڈمی نے اپنے رسالہ "زبان و ادب" کا "شاد عظیم آبادی نمبر" شائع کیا جس میں ۱۲ تنقیدی مضامین شاد کی شاعری اور فن سے متعلق شائع کیے گئے ہیں۔ اسکے علاوہ نوادرات اور تبرکات کے تحت شاد کی غیر مطبوعہ غزلیں۔ نظمیں اور مضامین شامل ہیں۔

ماہنامہ آج کل دہلی پبلیکیشن ڈویژن سے شائع ہونے والا اردو کا بہت پرانہ رسالہ ہے جس کے پہلے ایڈیٹر جوش ملیح آبادی تھے اور اب جو راج نرائن راز کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ اپنے اس طویل دورِ اشاعت میں آجکل نے بہت سے خاص نمبر شائع کیے جن کی تاریخی حیثیت ہے۔ ۱۹۶۸ء میں آج کل کا "اردو نمبر" شائع ہوا جس میں اردو زبان اس کی مختلف شعری و نثری اضاف، صحافت، اشاعت، تعلیم وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں آج کل کا جدید ہندستانی شاعری نمبر شائع ہوا جس میں اردو، اڑیہ، آسامی، بنگالی، پنجابی، تلگو، تامل، سندھی، کشمیری، کنڑ، گجراتی، مراٹھی، ملیالم، اور ہندی کی شاعری کا جائزہ لیا گیا۔ اس میں ان زبانوں کی جدید شاعری کے نمونوں کے ترجمے بھی شامل ہیں ۱۹۷۲ء میں آج کل نے ایک اور "اردو نمبر" اور "ضمیمہ اردو نمبر" شائع کیا۔ اس کا انداز گذشتہ اردو نمبر سے مختلف تھا۔ اس میں اتر پردیش بہار۔ مہاراشٹر مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، میسور، مغربی بنگال، تامل ناڈو، راجستھان، گجرات، پنجاب، ہریانہ، ہماچل جموں کشمیر اور دہلی میں اردو زبان اور اس کے مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آج کل نے ۱۹۷۵ء میں انیس صدی کے موقع پر "انیس نمبر" اور ۱۹۷۷ء میں "خواجہ حسن نظامی نمبر" شائع کیے۔ ۱۹۸۰ء میں آج کل نے ایک بہت دلچسپ خاص نمبر شائع کیا جو شاید اپنی نوعیت کا اردو میں پہلا نمبر تھا۔ جس میں پرندوں چرندوں اور درندوں کے بارے میں اہم معلومات مع تصاویر کے شائع کی گئیں ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں آج کل کا "پریم چند نمبر" شائع ہوا اور ۱۹۸۱ء میں حسرت موہانی نمبر "حسرت نمبر" میں حسرت کی زندگی اور ان کی سیاسی خدمات کے بارے میں ۶ اہم مضامین شامل ہیں اس کے علاوہ ان کی شاعری پر چار مضامین اور آخر میں اردوئے معلیٰ کے مضامین کی ایک فہرست شامل اشاعت ہے آجکل کے خاص نمبروں میں خواتین نمبر بھی بہت اہمیت رکھتا ہے یہ نمبر عورتوں کے بین الاقوامی سال ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا جس میں عورتوں کی عام حیثیت ان کی سماجی اور ادبی زندگی میں خدمات اور ان کے متعلق دیگر مسائل کا جائزہ لیا گیا۔ ۱۹۸۱ء میں آج کل نے مشہور افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی پر ایک خاص نمبر شائع کیا جس میں ان کی سوانح اور شخصیت فکر و فن اور شاعری اور صحافت سب کا تفصیلی جائزہ شامل ہے۔

ادبی رسائل کے ان خاص نمبروں کے علاوہ بہت سے اہم نمبر شائع ہوئے ہیں جن سب کا احاطہ کرنا ایک مضمون میں ممکن نہیں ہے اس کے باوجود کتاب نما دہلی کا "نئی نظم کا سفر نمبر" مرتبہ خلیل الرحمن اعظمی، سوغات بنگلور کا "جدید نظم نمبر" مرتبہ محمود ایاز، صباحیہ رایا کا "مخدوم نمبر" مرتبہ سلیمان اریب نگارش امرتسر کا "افسانہ نمبر" اور "ناولٹ نمبر"، شاہکار الٰہ آباد کا "فراق گورکھپوری نمبر"، "ناولٹ نمبر" اور "احتشام حسین نمبر" تخلیق دہلی کا "نئی تخلیق نمبر"، پگڈنڈی امرتسر کا "تلوک چند محروم نمبر" اور "منٹو نمبر"، زبان ہند کانپور کا "دیانرائن نگم نمبر"، صبح نو پٹنہ کا "علی عباس حسینی نمبر"، سطور دہلی کا "نیا افسانہ نمبر" اور "محمد علوی نمبر" سب رس حیدر آباد کا "غالب نمبر"، "شگوفہ" حیدر آباد کا "طنز و مزاح نمبر"، "گفتگو" کا "ترقی پسند ادب نمبر" مرتبہ سردار جعفری عصری ادب دہلی کا "پاکستانی ادب نمبر" اور "خواتین نمبر" مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن اردو ادب اور رسائل کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جانے والے نمبر ہیں۔

تنقیدی و تحقیقی رجحان رکھنے والے رسالوں کے علاوہ دوسرے اردو رسائل بھی اپنے خاص نمبر شائع کرتے رہے ہیں۔ عام طور پر یہ خاص نمبر سالنامے اور افسانہ نمبر تک محدود ہوتے تھے۔ لیکن اب ان رسائل کے نمبر بھی بعض خاص اشخاص اور موضوعات پر شائع ہونے لگے ہیں۔ اس سلسلے میں ماہنامہ روبی دہلی کا منٹو نمبر ماہنامہ بیسویں صدی دہلی کا ساحر لدھیانوی نمبر، کرشن چندر نمبر اور "پاکستانی ادب" نمبر ماہنامہ شبستان کا "غالب نمبر" اور ماہنامہ فلمی ستارے دہلی کا ساحر لدھیانوی نمبر ماہنامہ ہما دہلی کا "غالب نمبر" "اردو نمبر" اور "اقبال نمبر" اہمیت رکھتے ہیں۔ ان خصوصی شماروں میں بھی ان شخصیات اور موضوعات کے بارے میں عام دلچسپی کا مواد مل جاتا ہے۔

اس جائزے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو رسائل کے خاص نمبروں نے بلاشبہ زبان و ادب کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ان نمبروں نے تنقید کے معیار کو بلند کیا ہے اور قاری کے ذوق کو سنوارا ہے ●●●●●

جاوید حبیب



اردو صحافت کے بنیادی مسائل

۱۹۸۲ء میں اردو صحافت کا جائزہ لیا جائے تو بیک وقت کہا جاسکتا ہے کہ صورت حال افسوسناک بھی ہے اور حوصلہ افزا بھی اور درحقیقت یہ تضاد ہی اردو صحافت کا کلیدی مسئلہ ہے۔

خوش گوار پہلو

اردو صحافت کے حوصلہ افزا پہلوؤں کا سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو نظر آتا ہے کہ نہ صرف اردو اخبارات کی تعداد ہی بڑھتی جارہی ہے بلکہ اخبارات کی اشاعت میں بھی نمایاں اضافہ ہورہا ہے۔ آفسیٹ کی طباعت کی سہولت اور عام رواج نے اردو صحافت میں نئی جان ڈال دی ہے۔ طباعت کا معیار بلند ہوا اخبارات و رسائل کی ظاہری شکل خوش رنگ بلکہ رنگا رنگ ہوگئی ہے بعض اخبارات اور رسالے اپنے گٹ اپ، ٹائیٹل اور طباعت کے اعتبار سے کسی بھی ہندستانی زبان کے اخبارات و رسائل کے مقابلے پر رکھے جاسکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ سرکاری اشتہارات کی پالیسی میں نئی تبدیلیوں سے بہر حال اردو صحافت کو فائدے ہوئے ہیں (باوجود اس کے کہ اشتہارات میں جانبداری اور امتیاز کی شکایت اردو اخبارات کا بہت قدیم، عام اور مرغوب "مشغلہ" ہے)

ہندستان میں اردو صحافت ہی نہیں بلکہ اردو زبان کی بقا ترقی، ترویج و اشاعت بھی ایک نزاعی مسئلہ ہے اور آزادی کے بعد سے آج تک یہ سوال حل طلب ہے کہ اردو کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اردو کا مستقبل تاریک ہے یا روشن عرض کرنا یہ ہے کہ جو زبان خود اپنے وجود کی بقا، مستقبل کے تحفظ اور ملک میں (اپنے وطن میں) اپنی دستوری اور سرکاری حیثیت کے تعین کی کش مکش کا ۳۴ سال سے مسلسل شکار ہو اس زبان کی صحافت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ بین اقوامی صحافت یا ملک کی دیگر زبانوں کی (جن کی دستوری حیثیت متعین ہے اور جو مرکزی یا صوبائی سطح پر سرکاری زبان کی حیثیت میں ہوں) صحافت کے معیار پر پوری اترے بجائے خود ایک سنگین زیادتی ہے۔ حیرت تو اس پر ہے کہ اردو زبان کی صحافت بچی رہی اور مزید حیرت اس پر ہے کہ بہ حال بعض اعتبار سے ترقی کی طرف گامزن ہے۔

اس پس منظر کے ساتھ اردو صحافت کے چند بنیادی مسائل کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔

تاریخی

تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو اردو صحافت کا ایک کردار باقی ہے وہ ہے مدافعت — آزادی سے پہلے اردو صحافت کو نو آبادیاتی نظام اور انگریزی اقتدار سے نبرد آزمائی کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب و تمدن، ثقافت غرض شرقیت کی مدافعت کرنی پڑی۔ آزادی کے بعد اردو صحافت کو بدقسمتی سے "مسلم صحافت" کا رول ادا کرنا پڑا اور چند اخبارات کو چھوڑ کر (جن میں چند وہ اخبارات بھی شامل ہیں کہ جو اردو میں شائع ہوتے ہیں لیکن جن کی زبان، بیان، انداز اردو مزاج سے الگ ہے اور وہ اپنے تجارتی مقاصد کے تحت ایک خاص ڈھنگ سے اپنی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہیں اور اردو دشمنی میں اور اردو والوں کے مفاد کے خلاف زہر اگلنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ وضاحت کی ضرورت نہیں تقسیم وطن کے برے اثرات کچھ اس طرح بھی رونما ہوئے ہیں) عام طور پر اردو اخبارات کو آزادی کے بعد اردو تہذیب و تمدن اور اقلیتی حقوق اور سطائیت اور جارحانہ فرقہ پرستی کی مدافعت کا فریضہ انجام دینا پڑتا ہے۔ اس طرح آج بھی اردو صحافت مدافعت کی تاریخی روایت پر قائم ہے اور اس طرح کسی بھی دوسری زبان کے لیے مدافعت کا یہ رول ادا کرنا نہ لازمی ہے اور نہ ان کو اس کی ضرورت۔

نفسیاتی

اردو صحافت کا مستقبل اردو زبان سے وابستہ ہے اور جب اردو زبان کے مستقبل کے تعلق سے بھرپور کشمکش فضا میں موجود ہے اور سیاست کے آتار چڑھاؤ اور ماحول کے سرد و گرم نے اردو زبان پر تشویش اور بے یقینی مسلط کر رکھی ہے تو لازماً اردو صحافت میں بھی بے یقینی، اضطراب، تشویش، اندیشے، وسوسے، واہمے، مفروضے اور ایک ان دیکھے خوف کا احساس برقرار رہتا ہے اور مستقل ٹکراؤ اور بے چینی کی کیفیت، منفیت، تعمیری رویوں کو کھلتی اور جذباتیت، گھٹن اور منفی رویوں کا باعث بنتی ہے اور اردو اخبارات کی اس کیفیت کو سمجھے بغیر اس کرب مسلسل اور درد لا دوا کا علاج ممکن نہیں ہے۔ اس نفسیاتی بحران نے اردو صحافت پر بہت برے اثرات مرتب کیے ہیں اور شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر پوری اردو صحافت اس خطرناک نفسیاتی دائرے میں بند ہوگئی ہے اور دائروں میں ہمیشہ کے لیے محصور ہو جانا نہ افراد کے لیے مفید ہوتا ہے نہ اخبارات کے لیے۔ افسوس کہ اردو صحافت اور اردو قارئین دونوں اسی دائرے میں قید ہو گئے ہیں یا قید کر دیے گئے ہیں۔

قارئین

اردو کے قارئین کی تقسیم کئی طرح سے کی جا سکتی ہے مثلاً مذہبی بنیاد پر اس طرح کہ ۱۹۴۷ء میں اردو کے مسلم اور غیر مسلم قاری میں جو تناسب تھا آج ۱۹۸۲ء میں اس میں زمین و آسمان کا فرق آگیا ہے اور بات کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو بدنصیبی یہ ہے کہ پنجاب، ہریانہ، دہلی، جموں کو چھوڑ کر ہر جگہ اردو کے غیر مسلم قارئین کی تعداد برائے نام رہ گئی ہے اور ان علاقوں کے بھی غیر مسلم اردو قارئین کی نئی نسل اردو سے ناواقف ہے۔ اس کے برخلاف علاقائی بنیادوں پر اگر اردو قارئین کا تجزیہ کیا جائے تو دلچسپ اور امید افزا بات یہ ہے کہ شمالی ہند سے زیادہ جنوبی ہند کی ریاستوں میں آزادی کے بعد اردو کی ترقی ہوئی ہے اور لاکھوں نئے اردو قاری ان ریاستوں میں آزادی کے بعد پیدا ہوئے ہیں اور اردو سے عملاً دلچسپی اور کالجوں تک اردو تعلیم کا رواج تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اردو قارئین کا یہ عنصر اردو صحافت کے لیے نعمت ثابت ہوا ہے لیکن اس کے مزاج، نشو و نما اور سماجی حالت میں اور اردو کے شمالی ہند کے پرانے قارئین کے مزاج، نشو و نما، سماجی اور اقتصادی حالت میں کافی نمایاں فرق ہے اور اردو صحافت کو اس نئی جہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

دانشورانہ، علمی اور تعلیمی اعتبار سے اگر درجہ بندی کی جائے تو دلچسپ بات سامنے آتی ہے کہ انگریزی داں اردو قاری اردو اخبارات کے تعلق سے احساس کمتری کا شکار ہے اور اردو اخبارات اور رسائل اس کی ضرورت اور عادت نہیں بن پاتے بلکہ ایک خاص قسم کی تحقیر آمیز رائے اور خواہ مخواہ کی عصبیت وہ اردو اخبارات و رسائل سے رکھتے ہیں اس طرح وہ اپنی مادری زبان کی صحافت کو اپنی علمیت اور دانشوری سے دور رکھتے ہیں (مادری زبان سے نفرت اور بے تعلقی بھی علمیت اور دانشوری کا نشان بن جائے سوائے عبرت پکڑنے کے کیا کیا جا سکتا ہے۔) یہ سب سے زیادہ نقصان دہ گروہ ہے کہ جو اردو صحافت کو نقصان پہنچاتا ہے۔

اردو کا اصل قاری وہ ہے جس کی مادری زبان اردو ہے اور بدقسمتی اور خوش قسمتی سے وہ دوسری زبانوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا یا یوں کہیے کہ اس کی مجبوری ہے کہ وہ اردو زبان پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ اردو اخبارات، رسائل اسی غالب عنصر کی وجہ سے آج ہزاروں کی تعداد میں چھپ رہے ہیں۔ اب مجبوری یہ ہے کہ اردو کا یہ حقیقی اور اصل قاری دیگر زبانوں سے واقف نہیں ہے اور جدید "علم و دانش" سے ہم رشتہ نہیں اور اس کی علمیت مستحکم نہیں لہٰذا وہ چاہتا ہے اردو اخبار ہلکا پھلکا ہو۔ چٹخارے دار ہو۔ سیدھا سادا ہو اور چونکہ معیاری صحافت، فنی معاملات، آرٹ، ادب، ثقافت اور تنقید سے زیادہ اسے دلچسپی فسادات، آر۔ ایس۔ ایس، پاکستان، اسرائیل سے ہے اور چونکہ وہ سماجی، تعلیمی، مذہبی، اقتصادی اور سیاسی بدحالی سے دوچار ہے لہٰذا چاہتا ہے کہ اسے تسکین دی جاتی رہے۔ اس کے زخموں کو جذباتی مرہم دیا جاتا رہے یا پھر فلمی دنیا سے اسے باخبر رکھا جا سکے۔ نتیجہ اردو اخبارات قاری کی وجہ سے

اور اردو قاری اپنے اخبارات کی وجہ سے اپنی دنیا میں مگن رہ کر بھی زندہ ہیں — اردو کے قاری کو روزیا ہر ہفتے ۵۰ پیسے اور ایک روپے میں ایک اخبار مل جاتا ہے نہ جسے وہ چائے خانے میں نہ صرف خود پڑھ سکتا ہے بلکہ صبح سے شام تک بیسیوں لوگوں کو اس میں شریک کر سکتا ہے۔ ایک اخبار کے سہارے وہ اپنے ۵، ۶ گھنٹے گزار سکتا ہے بے رحمی اور تعصب کا بدلہ لے سکتا ہے، آر۔ ایس۔ ایس، اسرائیل، سیاسی جماعتوں کو برا کہہ کر تسکین حاصل کر سکتا ہے اور اپنی جذباتی آسودگی کا سامان پیدا کر سکتا ہے۔ غرض کہ اردو صحافت کا اہم ترین مسئلہ اس کے قارئین کا ذوق، علمی معیار، سماجی اور اقتصادی حالت بھی ہے اور دونوں ایک دوسرے پر اپنے اثرات ڈال رہے ہیں۔ تجارت کا تقاضہ یہ ہے کہ قاری کو باشعور بنانے اور اس کے ذوق کو بلند کرنے سے باخبر بنانے کے بجائے قارئین کے غلط اور صحیح ہر قسم کے جذبات کی تسکین اور کبھی کبھی ان کے بھڑکے ہوئے جذبات کو جذباتیت، افواہ بازی اور عامیانہ انداز سے اخبارات کی اشاعت آسانی سے بڑھائی جا سکتی ہے۔ جب تک یہ روش چلتی رہے گی اردو صحافت اپنے حصار میں بند رہے گی۔

ملکیت

حالیہ جائزوں کے مطابق اردو کے ۹۰ فی صد اخبارات ذاتی یا نجی یا ایک فرد کی ملکیت کے اخبارات ہیں۔ دوسری قسم میں جماعتی اور اداروں کی ملکیت کے اخبارات ہیں اور تیسری قسم میں مشترکہ ملکیت کے اخبار ہیں۔

ذاتی ملکیت کے زمرے میں آنے والے اخبارات چھوٹے شہروں سے لے کر دارالسلطنت تک سے شائع ہوتے ہیں اخبار کی ملکیت کی آزادی کے حق کو اردو والوں نے جس فراخدلی سے استعمال کیا ہے۔ اس کی مثال شاید کسی دوسری زبان میں آزادی سے نہ مل پائے۔ ذاتی ملکیت کے چند روزناموں، ہفتہ واروں اور ماہناموں کو چھوڑ کر عام طور پر ایک ہی شخص مالک بھی ہوتا ہے، ایڈیٹر بھی ہوتا ہے، مینیجنگ ایڈیٹر بھی ہوتا ہے، سرکلیشن منیجر بھی ہوتا ہے۔ نامہ نگار بھی ہوتا ہے، پروف ریڈر بھی ہوتا ہے اشتہارات کی فراہمی بھی کرتا ہے۔ اور بہت سے افراد تقسیم کا کام بھی خود اپنے ہی ذمے لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض لوگ کتابت بھی خود ہی کر لیتے ہیں۔ اس طرح اردو اخبارات میں مالک سے لے کر ایڈیٹر اور ایڈیٹر سے ہاکر تک ایک ہی شخص کام کر سکتا ہے۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے ہر شہر اور قصبے سے اخبارات نکل رہے ہیں بند ہو رہے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ذاتی مفادات یا ذاتی ضرورتوں کے تحت نکلنے والے ایسے بیشتر اخبارات اردو کی خدمت کے نام پر نکلتے اور حکومت کے سوتیلے سلوک کے دشنام پر بند ہوتے ہیں۔ اس قسم کی انفرادی صحافت سے اخباروں کی تعداد میں اضافے کے علاوہ اردو صحافت کو شاید ہی کوئی دوسرا فائدہ پہنچا ہو۔ البتہ نقصانات اس کے بے اندازہ ہیں بہت سے باصلاحیت افراد کہ جو اچھے ایڈیٹر، نامہ نگار، صحافی، منیجر، کاتب اور ہاکر بن سکتے ہیں اپنی صلاحیتوں کو گڈمڈ کر کے "شہید صحافت" بنے ہوئے ہیں اور بنتے رہتے ہیں۔

ایسے افراد ناکام ہو کر جب بڑے اخبارات کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں تو پھر ان کی انا متصادم ہوتی ہے اور تشنج کا شکار بنتے ہیں اور پھر اس سے باصلاحیت لوگوں کا استحصال بھی بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر ملکیت کے انفرادی حق کا استعمال اور ایڈیٹر کہلانے کے شوق کو کسی اور مفید کام میں لگایا جائے تو شاید انفرادی طور پر بہت سے اخبارات کے مالکان اور ایڈیٹرس کو اور اجتماعی طور پر اردو صحافت کو مصیبت سے نجات مل سکے۔

وسائل کی کمی

وجہ کچھ بھی ہو یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو کے چند اخبارات و رسائل کو چھوڑ کر زیادہ تر اخبارات و رسائل کے پاس مالی اور مادی وسائل کی کمی ہے نتیجے کے طور پر ان کے پاس باقاعدہ اور مروجہ معیار کے مطابق نہ تو دفتر ہوتا ہے اور نہ مکمل اور باضابطہ کوالی فائیڈ اور شعبہ جاتی اسٹاف ہوتا ہے۔ ۳، ۴ افراد کا کام ایک ہی شخص سے لیا جاتا ہے۔ کہنے کو تو — سب ایڈیٹر، چیف ایڈیٹر، نامہ نگار خصوصی سبھی ہوتے ہیں لیکن عملاً

زیادہ تر کام اردو صحافی کا جو ہے وہ ہے ترجمہ کرنا، تلخیص کرنا یا چربہ اتارنا۔

چوں کہ اردو کی خبر رساں ایجنسیاں نہیں ہیں لہٰذا ہندی اور انگریزی کے ٹیلی پرنٹر کی خبروں کا ترجمہ، انگریزی ہندی اور عربی خبارات کا ترجمہ کرنا ہی اصل کام اردو صحافی کو کرنا پڑتا ہے۔

مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے اخبارات میں نہ تو حوالے کی لائبریری ہوتی ہے نہ ہر شہر میں باقاعدہ نامہ نگار ہوتے ہیں۔ چند روزناموں کو چھوڑ کر مستقلاً فوٹو گرافر، کارٹونسٹ اور تبصرہ نگاری کوئی روایت نہیں ہے۔

وسائل کی کمی کی وجہ سے اوریجنل مضامین، رپورٹنگ اور تبصرے سے اردو اخبارات خالی نظر آتے ہیں۔ جب تک کہ حکومت کی طرف سے انتظام نہ ہو اردو کا کوئی اخبار اپنے خصوصی نمائندے شہر شہر نہیں بھیج سکتا۔ اسی لیے عام طور پر سیلاب، فسادات، انتخابات، بین الاقوامی کانفرنس، سیمینار، غیر ملکی مہمانوں کے دوروں اور بڑی تقاریب کی خبریں بھی براہِ راست اردو کے اخباروں کو اپنے ذاتی نامہ نگاروں کے ذریعہ نہیں مل پاتیں۔

وسائل کی کمی کی وجہ سے اردو اخبارات ان اداروں کی نمائندگی کی فیس ادا نہیں کر پاتے جن کے ذریعہ انھیں اشتہارات اطلاعات اور دیگر سہولتیں دستیاب ہو سکیں۔ یہاں تک کہ بعض روزنامے ٹیلی پرنٹر کی سروس بھی نہیں لے پاتے۔

وسائل کی کمی کی وجہ سے عام طور پر اردو اخبارات اور رسالے معاوضہ نہیں دے پاتے۔ لہٰذا باصلاحیت لوگ اردو صحافت سے دور ہی رہنے میں عافیت سمجھتے ہیں اور اردو اخبارات کے مطابق کل وقتی صحافیوں کے بجائے کالجوں کے اساتذہ یا شاعروں، ادیبوں یا بے روزگار نوجوانوں یا ریٹائرڈ انگریزی داں حضرات کو جز وقتی طور پر ملازم رکھتے ہیں اور ان سے ترجمہ کراتے اور اخبارات کے صفحات بھرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اردو کے صحافیوں کے لئے نہ تو صحافتی تربیت لازم ہے اور نہ جز وقتی کام کرنے والے باقاعدہ صحافی بن پاتے ہیں اس صورت حال کی وجہ سے اردو کی صحافت کو کبھی کبھی ترجمے اور قینچی کی صحافت بھی کہہ دیا جاتا ہے کیونکہ انگریزی، ہندی کے اخبارات، پاکستان کے اردو اخبارات اور عرب ممالک کے عربی اخبارات کی مدد سے آج کام بہت آسانی سے نکل آتا ہے۔ یہاں تک کہ آفسیٹ کی طباعت کی وجہ سے کبھی کبھی کتابت کا خرچ بھی بچا لیا جاتا ہے۔

میں نے غیر رسمی طور پر چند بنیادی مسائل کی طرف ہلکے سے اشارے کئے ہیں اردو اخبارات اور اشتہارات، اردو اخبارات اور اردو خبر رساں ایجنسی، اردو اخبارات کے لیے اردو میں تار دینے کی سہولت، اردو صحافیوں کے ایکری ڈی ایشن کا مسئلہ، اردو اخبارات کے ساتھ سرکاری اور غیر سرکاری تجارتی اداروں کا اشتہارات کے سلسلے میں امتیازی سلوک، حکومت اور اردو اخبارات کو سہولتیں اور اردو صحافیوں کی قربانی اور ایثار اور مجاہدانہ اسپرٹ کے مسائل کے علاوہ اردو اخبارات میں مالکان، مینجمنٹ، صحافیوں، ادارتی عملے اور کاتبوں کے تنازعات جیسے مسائل کو نہیں چھیڑا ہے اس لیے نہیں کہ ان مسائل کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ اس لیے کہ ہم رسمی مسائل سے ہٹ کر بھی کچھ سوچیں۔ کہ کبھی رسوم اور روایات کو توڑنا ہی سب سے اہم مسئلہ بن جاتا ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ صحافت جدید دنیا میں ایک فن ہی نہیں بھرپور تجارت ہے اور تجارت میں قسمت کے علاوہ کامیابی کی بنیاد تجارتی اصولوں کی سختی سے پابندی پر ہوتی ہے۔ اردو صحافت کو یا تو رضاکارانہ خدمت خلق سمجھا جائے تو پھر نہ کوئی مسئلہ ہے اور نہ شکایت اور تشویش کی ضرورت لیکن اگر اردو صحافت تجارت کے باضابطہ اور ہمہ گیر عالمی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر محض کشف و کرامات یا عجز و انکسار یا صرف اردو کی خدمت کے حوالے دے کر ہی زندہ رہنا چاہتی ہے تو بات الگ ہے بصورت دیگر صحافت کے مروج طریقوں پر چل کر ہی اردو صحافت کی حالت کو بہتر بنایا جا سکتا ہے —— اور سوال یہ نہیں کہ اردو صحافت کی موجودہ حالت کا ذمے دار کون ہے سوال یہ ہے کہ کون ہے جو اس صورتِ حال کو بدلنا چاہتا ہے؟

★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★

ایس اے۔ رحمٰن

اردو مطبوعات کی تقسیم و فروخت کے بنیادی مسائل

انسانی زندگی مسائل کا مجموعہ ہے اور ان میں ایک مسئلہ زبان کا بھی ہوتا ہے۔ اردو ہمارے ملک کی ایک مقبول اور زندہ زبان ہے جو ہندستان کے ہر گوشے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ہر زندہ زبان کے مسائل ہوتے ہیں اردو کے بھی اپنے مسئلے ہیں بلاشبہ اردو ایک شیریں زبان ہے ایک وقیع زبان ہے۔ ایک بڑی زبان ہے جس طرح زندہ رہنے کے لیے مسلسل کوشش و کاوش کرنا پڑتی ہے اسی طرح ایسی ہی جہد مسلسل نے اردو کو بھی زندہ و تابندہ رکھا ہے۔

طباعت و اشاعت اور ہر زندہ زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے اور اردو بھی طباعت و اشاعت کی دنیا میں فرومایہ نہیں ہے۔ اردو مطبوعات کا ذخیرہ بے حد وسیع ہے لیکن زندگی کے ہر میدان کی طرح اس میدان میں بھی مسائل سے مفر ممکن نہیں۔ یوں تو طباعت و اشاعت کے سلسلے میں جو مسائل سامنے آتے ہیں وہ سب ناشرین کے لیے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں مثلاً کتابت کا سلسلہ اور اس کے بعد چھپائی میں زیادہ سے زیادہ وقت لگنا لیکن کتاب کی اشاعت کے بعد جو سب سے بڑا مسئلہ سامنے آتا ہے وہ ہے تقسیم اور فروخت کا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو میں کتابوں کی نشر و اشاعت کو کبھی بھی باقاعدہ صنعت کے طور پر برتا نہیں گیا ہے۔ اردو میں کتابوں کی اشاعت ہمیشہ محدود پیمانے پر رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اردو میں کتابوں کا منظم کاروبار کرنے والے تجارتی ادارے چند ہی ہیں جن کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ادارے اردو کتابوں کی فراہمی اور تقسیم کو بطور صنعت کے برت رہے ہیں۔ آج کے دور میں اردو کے اشاعتی پروگراموں اور مطبوعات کی نکاسی کو دیکھتے ہوئے اردو پبلشنگ کو ایک بڑی صنعت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

اس بات سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اردو ہندستان کی نہ صرف مقبول بلکہ اہم زبانوں میں سے ایک ہے اگرچہ اردو کو کشمیر، ہماچل اور بہار کے علاوہ ملک کی کسی اور ریاست میں پہلی یا دوسری علاقائی زبان کا درجہ حاصل نہیں ہے مگر آئین میں اردو کو بھی دوسری علاقائی زبانوں کی طرح تمام مراعات کا مستحق قرار دیا گیا ہے اردو اپنے محدود وسائل کے باوجود دنیا کی ان بڑی زبانوں میں سے ایک ہے جن کا لٹریچر بے حد وقیع ہے۔ کون سا ایسا موضوع ہے کہ اس پر اردو میں کتابیں لکھی اور شائع نہ کی گئی ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ علمی ادبی اور فنی کتابوں کی اشاعت اگر محدود ہے تو مذہبی کتب کا دائرہ کار بہت پھیلا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود ایک سرسری جائزے سے بھی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اردو مطبوعات کی فروخت دوسری ہندستانی زبانوں کی مطبوعات کے مقابلے میں کم ہوتی ہے اور اسی وجہ سے اردو کتابیں محدود تر تعداد اشاعت میں شائع کی جانے لگی ہیں۔ یوں کہیے کہ تعداد اشاعت سمٹ کر سیکڑوں میں آگئی ہے اور ان کی نکاسی کی مدت میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ یقیناً اردو کتب کا یہ محدود پھیلاؤ اردو کی کتابی صنعت کو باوقار نہیں بناتا۔ اس بات سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اردو بلا لحاظ مذہب و عقیدہ تمام ہندستان کی مشترکہ زبان ہے۔ آئین نے بھی اسے تمام مراعات کا حقدار قرار دیا ہے لیکن حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے یا یوں کہیے کہ کر دیے گئے کہ اردو کو ایک خاص مذہب کے لوگوں کی زبان سمجھا جانے لگا اور جد و جہد آزادی میں انقلاب زندہ باد کا نعرہ دینے والی اور قومی یکجہتی کی نمائندہ اس میٹھی زبان کو ہر ممکن طور پر نظر انداز کیا جانے لگا۔ دفتروں میں اس کا چلن کم ہوتے ہوتے نہیں کے برابر ہو گیا اور اس طرح روزگار سے اس زبان کا ناتہ ٹوٹ گیا ظاہر ہے جب اردو کا تعلق معاش سے نہ رہا تو پھر اردو جاننے والوں کی اہمیت بھی کم ہو گئی۔ زندگی میں سب سے بڑا مسئلہ معاش کا ہے اور جب ایک خاص زبان پڑھ

کر روزگار نہیں مل سکتا تو اس خاص زبان کی طرف کیوں توجہ دی جائے۔ کسی زبان کی زندگی اس وقت مستحکم ہوتی ہے جب اس کے ساتھ روزگار وابستہ ہوتا ہے۔

اس بات کو ماننے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ آج اردو بڑی حد تک ایک خاص طبقے کی زبان بن کر رہ گئی ہے اور یہ طبقہ اقتصادی طور پر بہت پچھڑا ہوا ہے۔ ان کے ہاں بچوں کی تعلیم کا رواج کم سے کم ہے کیونکہ زیادہ تر بچوں کو کم عمری میں ہی کسی نہ کسی کام سے لگا دیا جاتا ہے تاکہ ان کی مختصر آمدنی بھی گھر کے اخراجات کو پورا کرنے کے کام میں آ سکے۔ یہی بچے بڑے ہو کر سماج کے ذمہ دار رکن بنتے ہیں اور کیونکہ عموماً تعلیم یافتہ نہیں ہوتے اس لیے کتابوں سے ان کی دلچسپی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دوسرے محدود وسائل اور کم آمدنی ہونے کی وجہ سے اردو بولنے والوں کو زندگی کے دوسرے مسائل اس قدر الجھائے رکھتے ہیں کہ علم و تعلیم سے دلچسپی ہونے کے باوجود وہ کتابیں خریدنے پر زیادہ رقم خرچ نہیں کر سکتے اور ویسے بھی زندگی کی دوسری ضروریات کی طرح کتابیں بھی مسلسل مہنگی ہوتی جا رہی ہیں۔ لیتھو سے آفسیٹ کی جانب بڑھتے قدم بھی اردو کتابوں کی فروخت پر اثر ڈال رہے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر صنعت کی طرح اردو کی کتابی صنعت کی بنیاد بھی ڈیمانڈ اور سپلائی پر ہے۔ ظاہر ہے جب اردو میں کتابوں کی بھرپور ڈیمانڈ ہی نہیں ہے تو سپلائی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو مطبوعات (ان میں اخبارات اور رسائل وغیرہ بھی شامل ہیں) کے کم بکنے یا تیزی سے نہ بکنے کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں:

۱۔ اردو والوں میں پڑھنے لکھنے کا زیادہ شوق نہ ہونا
۲۔ اردو والوں کا معاشی طور پر کمزور ہونا
۳۔ اردو کتابوں کا عموماً جاذب نظر نہ ہونا
۴۔ اردو مطبوعات کی بھرپور پبلسٹی نہ ہونا
۵۔ ناشر اور کتب فروشوں میں تعاون کا نہ ہونا

معاشی کمزوری اور تعلیم سے دوری کے سلسلے میں وضاحت کی جا چکی ہے لیکن آج کے مہنگے دور میں کتابوں کی بڑھتی قیمتیں اردو والوں کی قوت خرید پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی ہلکے گٹ اپ اور معمولی کتابت و طباعت والی کتابیں بھی اکثر و بیشتر خریدار کو اپنی طرف مائل نہیں کرتیں۔

لیتھو گرافی یقیناً ایک کارآمد اور سستا طریقۂ طباعت رہا ہے لیکن آج جب جدید فن طباعت کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے صرف مہنگائی کے خیال سے اردو کو لیتھو تک محدود رکھنا زبان کو نئی زندگی سے بچانا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لیتھو سے چھپی ہوئی کتاب کی قیمت کسی دوسرے طریقۂ طباعت سے چھپی ہوئی کتاب کی قیمت سے کم ہو سکتی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ لیتھو میں جدید فن طباعت کی خوبیاں نہیں مل سکتیں اور آفسیٹ یقیناً مہنگا طریقۂ طباعت ہے اور اردو کی تعداد اشاعت کیونکہ بہت محدود ہوتی ہے اس لیے اس طریقۂ طباعت کی وجہ سے اردو کتاب خاص طور پر مہنگی ہو جاتی ہے تو کیوں نہ ایسی درمیانی راہ اختیار کی جائے کہ فن طباعت کی خوبیاں بھی ملیں اور کتاب زیادہ مہنگی بھی نہ ہو۔ میری رائے میں جب تک ٹائپوگرافی اردو کے لیے پسندیدہ نہیں ہوتی اس وقت تک الہ آباد سے چھپنے والے رسائل اور کتابوں کی طرح اگر ون ڈائنگ طریقۂ طباعت کو اپنا لیا جائے تو یہ طریقہ لیتھو سے قدرے مہنگا مگر آفسیٹ سے بہت سستا رہے گا کیونکہ ون ڈائنگ کی کتابت آفسیٹ کی کتابت سے کم اجرت میں ہوگی اور نیگیٹو کا خرچ پورے طور سے بچے گا۔ اس طرح چھپنے والی کتاب آفسیٹ کی کتابوں کی طرح جاذب نظر ہوگی اور قیمت مقابلتاً کم رہے گی۔ البتہ درسی کتب اور ان کتابوں کو آفسیٹ سے ہی چھاپنا چاہیے جن کی تعداد اشاعت پانچ ہزار یا زیادہ ہو۔ اس طرح اہم کتابوں کے ری پرنٹ بھی آفسیٹ سے چھپنے چاہئیں کیونکہ اس طرح نہ صرف کتابت کے اخراجات کی بچت بلکہ سب سے بڑی بات یہ کہ وقت بھی بچے گا۔

اس طرح جب اردو کتابیں موضوع کے اعتبار سے اہم اور فن طباعت و پیش کش میں جاذب نظر ہونے کے ساتھ ساتھ مناسب قیمت کی ہوں گی تو امید کی جا سکتی ہے کہ ان کی فروخت بڑھے گی۔

یہ بات صحیح ہے کہ اردو ناشر اپنی مطبوعات کی تشہیر کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ اردو کے گنے چنے اداروں کے ٹریڈ جنرل ہیں، وہ بھی محدود حلقے میں رہتے ہیں۔ اردو والے اپنے گاہکوں کے سچے قیمتی اثاثے کی طرح چھپائے رکھتے ہیں جبکہ ان کی تشہیر ہو تو لوگوں کا رابطہ

ایک دوسرے سے بڑھے گا اور تجارت کو فروغ ہوگا۔ اس کے علاوہ ٹریڈ جرنلز کو بھی اپنی مطبوعات تک محدود رکھا جاتا ہے کہ اس وجہ سے ریسپونس بھرپور نہیں ملتی۔ اگر کڑی سے کڑی جڑتی رہے اور تمام اردو ادارے ایک دوسرے سے رابطہ رکھیں تو ان کی مطبوعات کی بھی تشہیر ہو اور مطبوعات کی فروخت مسلسل ہوتی رہے لیکن اس کے لیے سب سے زیادہ ضرورت آپس کے تعاون کی ہے جس کا ہمارے ہاں فقدان ہے۔

یہ سچ ہے کہ اردو ادارے آپس میں بہت کم تعاون کرتے ہیں اور خاص طور سے بعض مستحکم اداروں کا رویہ تو اکثر غیر دوستانہ ہوتا ہے۔ کچھ بڑے کتب فروش تو ناشر کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ مال نہ صرف ادھار دے بلکہ کمیشن بھی زیادہ دے اگر کوئی ناشر یہ بات نہیں مانتا تو اس کے مال کی نکاسی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی اس سلسلہ میں میں ذاتی تجربات بیان کرنا چاہوں گا۔

بارہ تیرہ سال پہلے میں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر اردو کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا اور یہ طے کیا تھا کہ ادھار کا کام کسی طرح بھی نہیں کریں گے یعنی نہ تو کاغذ ادھار لیں گے نہ چھپائی ادھار کرائیں گے اور نہ کتابیں ادھار بیچیں گے جہاں تک ادھار لینے کا تعلق تھا اس پر تو ہم عمل کر سکے لیکن ادھار دیے بغیر کام نہ چل سکا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ادھار دینے کے بعد مقررہ وقت پر اگر مال کی قیمت مانگنے جاؤ تو کوئی کوئی بک سیلر تو اس طرح پیش آتا کہ جیسے کوئی اجنبی ان کے سامنے قصہ حاتم طائی کا ایک سوال لے کر آ کھڑا ہوا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاروبار محدود سے محدود تر ہوتا گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۸ء میں چھپی ہوئی کتابیں کے ایک ایک ہزار کے ایڈیشن ۱۹۸۰ء تک بھی مکمل طور سے فروخت نہیں ہو سکے تھے۔ ایسا نہیں کہ اس میں کتابیں مجھ سے نو آموز کی ہی تھیں بلکہ اس میں ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر خلیق انجم اور رئیس احمد جعفری جیسے بڑے ادیبوں کی تخلیقات بھی تھیں۔ جب ہم نئے ادیبوں کی ہمت افزائی کی بات کرتے ہیں تو پھر ناشروں اور کتب فروشوں میں بھی بھرپور تعاون ہونا چاہیئے کہ ایک مضبوط زنجیر بن جائے۔ تجارتی معاملات صحیح بنیادوں پر ہونے چاہئیں اور لین دین میں کبھی بے ضابطگی نہیں آنی چاہیے۔

اکثر قلمکار اور خاص طور سے شعرائے کرام اپنی تخلیقات خود شائع کرتے ہیں۔ کتب فروشوں سے ایسے لوگوں کو بھرپور تعاون ملنا چاہیے کیونکہ یہ لوگ سرمایہ کاری کے بغیر ہی بک سیلر کو نفع کمانے کا موقع دیا کرتے ہیں۔

کوئی بھی چیز ہو بھرپور پبلسٹی ہی اسے مقبول بناتی ہے۔ دوسری ایک اہم بات ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر کسی کی مطبوعات کو تشہیر کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ تشہیر کی افادیت کو سمجھتے ہیں وہ اپنے کام کو وسعت دیتے رہتے ہیں۔ کتابوں پر تبصرے بھی تشہیر کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں اور وہ فروخت کو بڑھانے میں مدد دیتے ہیں اس کا مجھے یقین ہے کیونکہ میں نے بھی اکثر کتابیں ان کے بارے میں تبصرے پڑھ کر ہی خریدی ہیں۔ علمی، ادبی، رسائل و جرائد کی تعداد اشاعت اگرچہ کم ہوتی ہے لیکن ان میں شائع ہونے والے تبصروں کی اپنی اہمیت ہوتی ہے جو بلاشبہ کتاب کی فروخت پر اثر ڈالتے ہیں۔ اسی لیے اپنے آرڈر فارم اور گتے چنے کتب فروشوں تک محدود نہ رہ کر اردو ناشروں کو پبلسٹی کے زیادہ سے زیادہ ذرائع اپنانے چاہئیں آپس میں زیادہ سے زیادہ تعلقات بنائے رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو پورا تعاون دینا چاہیے۔

اردو کتب و رسائل کی تقسیم کا مسئلہ اس وجہ سے بھی توجہ طلب ہے کہ شاید چند ہی ایسے ناشر اور کتب فروش ہوں گے جن کے ہاں آرڈر کی فوری تعمیل ہوتی ہوگی۔ سرکاری اداروں میں تو عموماً اس لیے لاپرواہی برتی جاتی ہے کہ کارکنوں کو نفع نقصان سے کوئی غرض نہیں ہوتی لیکن جب پرائیویٹ اداروں میں وقت پر آرڈر کی سپلائی نہیں ہوتی تو تعجب ہوتا ہے۔ بہار کے ایک بک ایکسپورٹر نے جب یہ بتایا تو بہت حیرت ہوئی کہ وہ اردو بازار کے ایک دکاندار سے پچیس ہزار کی کتب کہیں باہر بھیجنے کے لیے خریدنا چاہتے تھے تو اس دکاندار نے یہ کہہ کر لاپرواہی سے رخ بدل لیا۔ "ارے صاحب کون فہرستیں بنائے گا۔ کون بازار سے کتابیں اکٹھی کر کے لائے گا"۔ جب کہ تجارت کا پہلا اصول یہ ہے کہ گاہک پر پوری توجہ دو اور جب ایک بڑے آرڈر کی سپلائی کا سوال بھی ہو جس میں منافع بھی معقول مل سکتا ہے۔ یقیناً یہ قلندری اردو بکسیلر کا ہی مزاج ہو سکتی ہے!

رسائل کی تقسیم میں بھی اچھے اچھے ادارے باضابطگی نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی خاص اخبار یا رسالے کا خریدار بننے کے بجائے لوگ اسے بازار سے نقد خریدنا پسند کرتے ہیں۔ اپنا ہی ایک واقعہ بیان کروں۔ میں ایک ایڈیڈ اردو ادارے کے ہفت روزہ پرچے کا خریدار برسوں سے چلا آرہا تھا اور یہ ہفت روزہ مجھے پابندی سے ملا کرتا تھا لیکن جب اس ادارے کا دفتر دہلی منتقل ہوگیا تو اس کے شمارے پابندی سے ملنا بند ہوگئے کسی مہینے چار شماروں میں سے ایک ملا کبھی دو۔ یاددہانی کے لئے خط لکھے لیکن جواب ندارد۔ جب سالانہ خریداری کی تجدید کا وقت آگیا۔ یاددہانی کے لیے ادارے سے خط آیا۔ میں نے تفصیلی فہرست بھیج دی کہ مندرجہ ذیل شمارے نہیں ملے ہیں۔ اور ان کے لئے میں بار بار لکھ چکا ہوں۔ اب جب تک یہ شمارے نہیں ملیں گے میں خریداری کی تجدید میں دلچسپی نہیں لوں گا۔ اس خط کا جواب بھی فوراً ملا کہ ہم مذکورہ شماروں کو جلد بھجوانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ یہ خط لے کر میں ادارے کے دفتر میں پہنچ گیا تاکہ مطلوبہ شمارے دستی حاصل کرلوں وہاں پتہ چلا کہ خط کے مضمون کا شماروں کی فراہمی سے کوئی تعلق نہیں مجھے بتایا گیا کہ دفتر میں سامان اس طرح سے ادھر ادھر پڑا ہے کہ کوئی چیز بھی آسانی سے نہیں مل سکتی تو پھر پرانے شماروں کی تو بات ہی کیا ہے لیکن امید رکھنی چاہیئے کہ جب بھی دفتر میں ترتیب و تنظیم آجائے گی تو مطلوبہ شماروں کی فراہمی شاید ہوجائے۔ یہ دیکھتے ہوئے میں نے اپنی خریداری کی تجدید نہ کی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک میرے خریدار نہ بننے سے کوئی فرق نہیں پڑا ہوگا لیکن اگر مجھ جیسے اور بھی بہت سے ہوں اور وہ بھی کسی نہ کسی وجہ سے خریداری قائم نہ رکھ سکیں تو کیا یہ چیز ایسے جریدوں کے لیے صحت مند ثابت ہوگی۔ بلکہ جب خریداری کم ہوگی تو تعداد اشاعت گھٹے گی اور اس کا اثر اخراجات پر پڑے گا۔

قارئین سے رابطہ اور ان کے خطوں کا جواب دینا بھی ہر ادارے کی اخلاقی اور تجارتی ذمہ داری ہے۔ لیکن اکثر ادارے اس مسئلہ پر شاید کوئی توجہ نہیں دیتے۔

اسی طرح اکثر دوسرے پرائیویٹ اداروں میں بھی خریدار یا قاری سے خط و کتابت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ جب کہ خط و کتابت رابطہ کو مضبوط بنائے رکھتی ہے انگریزی کے ادارے اسی لیے کامیاب اور مقبول ہیں کہ وہاں سے معمولی بات کا جواب ملنے میں بھی دیر نہیں ہوتی۔ کسی اردو ادارے کو اس کی فروگزاشت سے آگاہ کیا جائے تو اس کے ذمہ دار ناراض ہوجائیں گے اور جب کسی انگریزی ادارے کو اس کی غلطی بتائی جائے تو وہاں سے شکریہ کا خط ملے گا۔

اس شکایت کا اظہار میں نے اس نقطۂ نظر سے کیا ہے کہ اردو مطبوعات اور رسائل کی تقسیم پر خاص نگاہ رہنی چاہیے۔ خریدار اور قاری کی معمولی سی شکایت کو پوری توجہ ملنی اور اس کے ازالے کی کارروائی فوری طور پر ہونی چاہیے۔ آرڈر کی سپلائی میں بھی دیر نہیں ہونا چاہیے تاکہ مطلوبہ مال دینے والے کو جلد سے جلد مل جائے اور وہ اسے جہاں بھیجنا چاہتا ہے وہاں وقت پر بھیج سکے۔

سرکاری اشاعتی اداروں میں اردو مطبوعات کی تقسیم کا مسئلہ اس لیے ناقص ہوتا ہے کہ ایک تو ہر متعلقہ سکیشن میں اردو جاننے والا اسٹاف نہیں ہوتا اور دوسری ایک وجہ ڈسٹری بیوٹر سسٹم بھی ہے۔ شکایت سننے میں آتی ہے کہ ڈسٹری بیوٹر من مانی کرتا ہے اور کبھی کبھی کاروباری رقابت کی بنا پر دوسرے بک سیلرز اس سے تعاون نہیں کرتے کیونکہ شاید ڈسٹری بیوٹر سے انہیں اتنا کمیشن نہیں ملتا جتنا وہ براہ راست مال خرید کر حاصل کرسکتے ہیں۔ نفع کی شرح زیادہ ہوگی تو یقیناً دلچسپی بڑھے گی جن سرکاری اداروں نے ڈسٹری بیوٹر سسٹم ختم کردیا ہے، وہاں میری معلومات کے مطابق سالانہ فروخت میں معقول اضافہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے اشاعتی اداروں کو زبان کے پیش نظر اسٹاف رکھنا چاہیے۔ ہر زبان کی مطبوعات کے لیے الگ الگ ٹورنگ ایجنٹ ہونے چاہئیں جنھیں تنخواہ کے ساتھ ساتھ ایک مقررہ رقم سے زیادہ کے آرڈر حاصل کرنے پر کچھ مزید کمیشن بھی دیا جانا چاہیے تاکہ اس طرح ان کی دلچسپی بڑھے گی اور وہ بھرپور توجہ کریں گے۔

اردو کتابوں کی فروخت پر مسلسل بڑھتا ہوا ڈاک خرچ بھی اثر انداز ہوا ہے۔ اگر مطبوعہ کتابوں کے لیے ڈاک خرچ کی شرح قدرے کم ہو تو بھی کتابوں کی بکری بڑھ سکتی ہے۔ ایک شخص کو کسی کتاب کی ضرورت ہے وہ اسے ناشر سے منگاتا ہے تو وہ کتاب ڈاک خرچ

کے ساتھ ڈیوڑھی قیمت بلکہ کبھی کبھی دوگنی قیمت میں پڑتی ہے جبکہ اس کی مطلوبہ کتاب مقامی بک سیلر کے پاس مل جائے تو لیں کتاب کی قیمت ہی دینی پڑتی ہے۔ بڑھتے ہوئے ڈاک خرچ کی وجہ سے ہی اکثر مقامی کتب فروش کتابیں نہیں منگواتے کیونکہ ڈاک خرچ کا بار اٹھا کر ان کا منافع کم ہو جاتا ہے اور ان کے پاس وہی کتابیں ملتی ہیں جن کا ڈاک خرچ ناشر برداشت کرلے۔

ایسے حالات کے پیش نظر اگر اردو کی کتابی صنعت محدود ہونے کی وجہ سے کم اہمیت کی حامل ہے تو حیرت کی بات نہیں۔ لیکن اب حکومت کی بھی کافی توجہ مل رہی ہے۔ ترقی اردو بورڈ کا قیام عمل میں آچکا ہے اور وہ گزشتہ کئی برسوں سے اہم اور ضروری موضوعات پر طباعتی خوبیوں سے بھرپور علم و ادب، تاریخی اور معلوماتی موضوعات پر کتابیں شائع کر رہا ہے۔ ہندوستان کی اکثر ریاستوں میں اردو اکیڈمیاں قائم کی جاچکی ہیں اور انہوں نے بھی کسی نہ کسی حد تک اردو کتابوں کی اشاعت کا بار اٹھا رکھا ہے۔ انفرادی پبلشنگ بھی بڑھ رہی ہے اور اردو ناشرین بھی اپنے اشاعتی پروگرام میں اضافہ کررہے ہیں۔ اردو میں پاکٹ بکس کا چلن بھی ہو چکا ہے اور کچھ اداروں نے اس سلسلے کے تحت بھی عمدہ اور معیاری کتابیں مناسب قیمتوں پر شائع کی ہیں۔ اکثر ہندوستانی یونیورسٹیوں کے اردو شعبے بھی تصنیف و تالیف کے ساتھ طباعت و اشاعت کی ذمہ داریاں اٹھائے ہوئے ہیں اور ان شعبوں نے اگرچہ بہت زیادہ کتابیں شائع نہیں کی ہیں مگر جو کچھ بھی انہوں نے شائع کیا ہے ان کی علمی اور ادبی اہمیت مسلّم ہے۔ لیکن اردو مطبوعات کی محدود فروخت کے لیے صرف حالات ہی بنیاد نہیں ہیں بلکہ خود اردو والوں کی عدم توجہ اور لاپرواہی بھی اس کے لیے ذمہ دار ہے۔ اچھے ادبی علمی اور معلوماتی رسالے نکلتے ہیں اور بند ہو جاتے ہیں۔ وجہ صرف یہی ہے کہ انھیں خریدار نہیں ملتے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ معمولی سے کچھ زیادہ اردو پڑھا لکھا شخص اکثر ادیب یا شاعر بن جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہ اپنا حق سمجھتا ہے کہ اردو کا ہر اخبار اور رسالہ اسے اعزازی طور پر ملے اور دوسرے اردو رسالوں کو اتنے اشتہارات بھی نہیں ملتے کہ جس کی آمدنی سے رسالے کے متعلقہ ضروری اخراجات برداشت کیے جاسکیں۔ سرکاری اشتہارات حاصل کرنے کے لیے ایک خاص مدت تک اس رسالے کا شائع ہوتے رہنا ضروری ہوتا ہے اور اکثر اس مدت کے پوری ہونے سے پہلے ہی ناشر پر اتنا مالی دباؤ پڑ چکا ہوتا ہے کہ رسالے کے بند ہونے کی نوبت آجاتی ہے۔ اتنی جلدی بند ہونے والے رسالے کچھ ایسے نئے ادیب بھی نکالتے ہیں جو اپنا نام بطور قلم کار اور ایڈیٹر کے چھپا ہوا دیکھنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اسی لیے ایسے ادیبوں کا خلوص اردو کے لیے کم اور اپنے "معتبر" ہونے کے لیے زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ سب ہی لوگ اس ذہن سے رسالے نکالتے ہیں۔ اردو ادب کی خدمت کے لیے بھی بہت سے لوگ اس کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں لیکن صرف ایک آدمی یا چند آدمی ایسی بڑی ذمہ داری کو آسانی سے نہیں نباہ سکتے۔ ماہنامہ "کتاب" ہمارے بہت اچھے رسائل میں سے ایک تھا۔ ہمارا دانشور طبقہ اسے پسند کرتا تھا۔ اپنی تخلیقات کی اشاعت کے لیے اسے بہتر سمجھتا تھا لیکن اس کے باوجود کتاب کو ایسی مارکیٹ نہ مل سکی کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا۔ اس طرح اردو کے کسی بھی علمی اور ادبی رسالے کو لیجیے وہ بس چل ہی رہا ہوگا۔ حد یہ ہے کہ سرکاری رسالوں کی اشاعت محدود رہتی ہے "آجکل" اپنی کتابت و طباعت اور انتخاب مضامین میں بے حد اہمیت رکھتا ہے لیکن اس کی تعداد اشاعت بھی اتنی نہ ہوگی کہ اسے مشہور فلمی رسالے شمع کی تعداد کا دسواں حصہ بھی کہا جاسکے۔ شمع اردو کا وہ رسالہ ہے جس کی تعداد اشاعت پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ آخر یہ اتنا بکتا کیوں ہے! دراصل "شمع" کے پڑھنے والے اردو کے ہر طبقہ سے متعلق ہیں اور تقریباً سب ہی لوگ اسے خرید کر دیکھتے اور پڑھتے ہیں کیونکہ اسے وہ لوگ بھی خریدتے ہیں جو قطعی طور پر پڑھنا نہیں جانتے اور تصویریں دیکھ کر کام چلا لیتے ہیں تو دراصل یہ شمع کی "فلمیت" ہے جو اسے مقبول عام بنائے ہوئے ہے ورنہ اسی ادارے سے ایک ویکلی نیوز میگزین "آئینہ" بھی شائع ہوا تھا جو تقریباً سوا سال ہی چل سکا۔ آئینہ اردو میں اپنے انداز کا منفرد ویکلی تھا۔ اور اس میں ایسی اہم تصاویر کی اشاعت بھی ہوتی تھی جو دنیا میں سب سے پہلے "آئینہ" میں ہی چھپی تھیں۔ شمع ایک بڑا ادارہ ہے لیکن اسے بھی حالات سے مجبور ہو کر آئینہ کو بند کرنا پڑا۔ اگرچہ اس کے لیے کہا گیا کہ کارکنوں کے عدم تعاون کی وجہ سے آئینہ کی اشاعت بند کی جارہی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ

اصل وجہ تعدادِ اشاعت تھی جسے کارکنان کے عدم تعاون کی بنیاد مل گئی۔ شمع کے ادارے سے اور بھی اردو رسائل نکلتے ہیں لیکن کوئی بھی شمع کی تعداد اشاعت کو چھو نہیں سکا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اداروں نے ان کے پھیلاؤ کے لیے کوشش نہیں کی ہوگی لیکن دراصل دوسرے جریدوں میں وہ عوامی کشش نہیں جو شمع کے فلمی چہروں میں ہے۔ اردو کا دوسرا مقبول رسالہ روبی ہے اور اس کی مقبولیت کی وجہ بھی فلم ہی ہے البتہ بیسویں صدی کو استثنا ہے کیونکہ یہ فلمی نہ ہوتے ہوئے بھی محض افسانوں کے سہارے اپنی معقول تعداد اشاعت رکھتا۔ اگر ہر اردو دوست یہ طے کرلے کہ وہ ہر ماہ اردو کا ایک معیاری رسالہ خریدے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ علمی اور ادبی رسالوں کو بھی زندگی نہ ملے۔

ایک دقت یہ بھی ہے کہ ہمارا جو طبقہ استعداد رکھتا ہے کہ کتابیں اور رسالے خرید کر پڑھ سکے، وہ اردو مطبوعات کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دیتا۔ صبح سویرے وہ انگریزی اخبار پڑھتا ہے اور دوسری دلچسپی کے لیے انگریزی مطبوعات سے حظ اٹھاتا ہے کیونکہ کسی بھی متوسط یا اونچے گھر میں انگریزی اخبار کا آنا اور انگریزی کتابوں کا موجود ہونا ایک امتیاز بخشتا ہے کیونکہ عموماً یہ انگریزی کتابیں سجا کر رکھی جاتی ہیں تاکہ آنے والے مہمان پر صاحب خانہ کی عظمت اور علمیت کا رعب پڑ سکے۔ سب کے لیے تو نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ بھی سچ ہی ہے کہ انگریزی کتابوں کے اکثر خریدار ان کتابوں کو گھر میں لاکر سجا تو دیتے ہیں لیکن کبھی کھول کر نہیں دیکھتے اب اگر ان کے گھر آنے والا اتفاقاً پوچھ لے کہ بھئی کیسی رہی یہ کتاب تو جواب ہوگا 'یار بہت مصروف ہوں' وقت ہی نہیں ملا ہے اسے پڑھنے کا' اور اسی جواب کی توقع دو سال بعد بھی موصوف سے رکھنی چاہیے۔

میں خریدنے کی اس عادت کو برا نہیں کہوں گا کیونکہ چاہے فیشن کے لیے سہی لیکن کتابیں خریدی تو جاتی ہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اردو کی بھی دو کتابیں ضرور خریدیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اردو کی کتابیں مہنگی ہوتی ہیں لیکن انگریزی کی تو اس سے بھی مہنگی ہوتی ہیں لیکن جب اردو کتابوں کی تعداد اشاعت بڑھے گی تو یقیناً قیمتیں بھی بتدریج کم ہوں گی۔

اردو کتابوں کی قیمتوں کے پیش نظر میں اپنی ایک بات کو دہرانا چاہوں گا اردو والوں کا بڑا طبقہ اقتصادی طور پر پسماندہ ہے پھر بھی بہت سے لوگ دلچسپی بھی رکھتے ہیں کہ وہ اردو کتابیں خریدیں لیکن پسندیدہ کتاب کی زیادہ قیمت کو دیکھتے ہوئے وہ اس کی خرید کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر حکومت تھوڑی سی توجہ دے تو اردو والوں کا یہ مسئلہ آسانی حل ہو سکتا ہے ایک تو یہ کہ کاغذ کی قیمتیں کم کی جائیں یا خصوصیت سے اردو والوں کو سبسیڈائزڈ قیمتوں پر کاغذ فراہم کیا جائے تاکہ اردو کتابوں کی قیمتیں جو کاغذ کی قیمتوں کی وجہ سے زیادہ چڑھتی ہیں وہ قابو میں آجائیں۔

اس کے علاوہ حکومت نے کچھ ایسے ادارے قائم کر رکھے ہیں جہاں اردو کتابوں کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کیا جاتا ہے ان اداروں کی شائع کردہ کتابوں کی قیمتیں مہنگے کاغذ کے پیش نظر زیادہ ہی ہوتی ہیں۔ اب اگر یہ تبدیلی لائی جائے کہ یہ ادارے بجائے خود کتاب چھاپنے کے پرائیویٹ پبلشروں کے منتخب کتابوں پر سبسیڈی دیں تو لامحالہ اردو کتابوں کی قیمت کم ہو جائے گی اور اس طرح انکی فروخت زیادہ ہونے کے امکانات بڑھیں گے۔ اس کے علاوہ پرائیویٹ پبلشروں کے ذرائع تقسیم اور فروخت ہر طرح سے بہتر اور منظم ہوتے ہیں کیونکہ اس کام سے ہی ان کا نفع نقصان وابستہ ہوتا ہے۔ ان کی کوشش ذاتی فائدے کے لیے ہوتی ہیں اس لیے ان میں زیادہ شدت اور خلوص ہوتا ہے جس کی وجہ سے شائستگی اور ضابطوں میں کوئی جھول نہیں آتا۔

اردو پبلشنگ کو ایک کامیاب صنعت بنانے کے سلسلے میں ایک تجویز یہ بھی ہے کہ اردو ناشروں اور کتب فروشوں کی ایک فیڈریشن بنائی جائے۔ جس کے عہدیدار وہ مخلص اردو دوست ہوں جو اردو کتابوں کی اشاعت اور پھیلانے میں تن من سے لگے رہیں اور اردو کتاب ہندستان کے کسی بھی حصے میں شائع ہو اس کی اطلاع فیڈریشن کو فوراً ملنی چاہیے اور فیڈریشن کا اپنا ایک ٹریڈ جرنل ہونا چاہیے جس کے ذریعہ اردو اشاعتی دنیا کو زیادہ سے زیادہ معلومات ملتی رہے اس طرح ادیب، ناشر، کتب فروش اور قاری کا رابطہ بنا رہے گا اور منظم کوششوں کی بدولت خریداروں کا حلقہ بھی بڑھتا رہے گا۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ علمی اور ادبی کتابوں کے مقابلے میں ناول زیادہ تیزی سے بکتے ہیں اور یہ بات کسی قدر صحیح بھی ہے کیونکہ ناول کی فروخت فوری اور تیزی سے ہوتی ہے لیکن علمی

اور ادبی کتابوں کی سیل آہستہ روی سے ہوتی ہے۔ اردو کی کتابی صنعت کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ علمی اور ادبی کتابوں بلکہ ناولوں سے مذہبی کتب کا دائرہ کہیں زیادہ وسیع ہے اور ان کی فروخت عام علمی اور معلوماتی کتابوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ندوۃ المصنفین دہلی، ندوۃ العلماء لکھنؤ کا اشاعتی ادارہ تحقیقات و نشریات اسلام اور دیوبند کے کئی اشاعتی ادارے اردو میں اسلامی معلوماتی اور تاریخی کتابوں کی اشاعت کرتے ہیں اور ان کتابوں کا معیار طباعت و اشاعت بھی اچھا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے اردو ترجمے بھی بہت سے ادارے شائع کرتے ہیں اور ان کی پذیرائی ملک کے ہر حصے میں ہوتی ہے مذہبی کتابوں کے بعد یہ کہانیاں، ناول اور افسانے ہی ہوتے ہیں جو قدرے زیادہ تعداد میں چھپتے اور پڑھے جاتے ہیں کیونکہ یہ ظاہر ہی ہے کہ علمی، ادبی اور تکنیکی کتابوں سے بہرہ مند ہونے والوں کی تعداد محدود ہی ہوتی ہے یہ سچ ہے کہ اردو کتابوں کی صنعت میں ہی نہیں بلکہ پورے اردو سماج میں اردو فکشن نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے اور یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ جس لٹریچر کو ہم "چیپ" کہتے ہیں، وہی مارکیٹ میں بکتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ رومانی، مہماتی اور جاسوسی کہانیاں اور ناول پڑھ کر کچھ ذہنی تفریح ملتی ہے جس سے قاری اپنی زندگی کے تفکرات سے کچھ دیر کے لیے نجات پا لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں ہلکا پھلکا ادب پہلے بھی مقبول تھا اور آج بھی پسند کیا جاتا ہے اور اردو کتابی صنعت میں بڑی اہمیت کا حامل ہے جو اپنے محدود وسائل اور ذرائع کے باوجود مسلسل ترقی پذیر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جاسوسی اور مہماتی ادب (اگر اسے ادب کہنے کی اجازت دی جائے) تو قدیم داستانوں کا ایک پالشنڈ روپ ہے۔ داستانیں اپنے زمانے میں مقبول تھیں اور آج ان کی جگہ ان چیزوں نے لے لی ہے۔ ابن صفی کے جاسوسی ناول شمع سے کم نہیں بکتے۔ شمع تو صرف اردو اور ہندی میں چھپتا ہے جبکہ ابن صفی کا جاسوسی دنیا اردو اور ہندی کے علاوہ بنگالی اور شاید گجراتی میں بھی شائع ہوتا ہے۔ اردو بلٹز بھی اپنی سنسنی خیز سرخیوں اور گرما گرم خبروں کی وجہ سے اپنی مارکیٹ رکھتا ہے کیونکہ انگریزی اور ہندی کے منظم کاروبار کی بدولت اسی انداز پر چلنے کی وجہ سے اردو بلٹز کو بھی استحکام مل گیا ہے۔

پبلک لائبریریوں میں بھی اردو کے لیے بہت محدود بجٹ ہوتا ہے کیونکہ اکثر لائبریریوں میں اردو جاننے والا اسٹاف نہیں ہوتا اس لیے کوئی دلچسپی نہیں لیتا، کتابیں وقت پر خریدی نہیں جاتیں اور اس طرح بجٹ لیپس ہو جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طرف بھی توجہ دی جائے۔ سرکار ایسا انتظام کرے کہ نہ صرف اسکولوں اور کالجوں میں اردو تعلیم کا معقول انتظام ہو بلکہ اردو کی مطبوعات بھی معقول تعداد میں خریدی جاتی رہا کریں۔ اردو اساتذہ نہ صرف خود کتابیں خریدیں بلکہ اپنے طلبا میں بھی شوق پیدا کریں تاکہ وہ اردو کتابیں خرید کر پڑھیں۔

اکثر ناشر یہ سوچتے ہیں کہ کتابیں چونکہ لائبریریاں ہی خریدتی ہیں اس لیے کتاب کی قیمت اتنی رکھی جائے کہ تھوڑی تعداد میں بکنے پر ہی لاگت وصول ہو جائے۔ اس بنا پر بھی کتاب کی قیمت کچھ زیادہ ہی ہو جاتی ہے اس طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے کہ کتاب کی قیمت لاگت کے پیش نظر طے ہونی چاہیے تاکہ لائبریریوں کی سپلائی بھی زیادہ ہو۔ یوں تو ہندستان میں ہی اردو پھیلی ہوئی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کشمیر کو اس میں برتری حاصل ہے۔ سرینگر جہاں اردو پبلشنگ پر اہم سمینار ہوتے رہے ہیں، اردو کتابوں کے لیے ایک بہت بڑی مارکیٹ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اردو ذریعہ تعلیم بھی ہے اور اردو پڑھنے والوں کو روزگار کی سہولتیں بھی حاصل ہیں۔ اگر اس طرف مزید توجہ دی جائے تو یقیناً اردو کتابوں کی کھپت اور بھی زیادہ ہو سکتی ہے ضرورت اپروچ کی اور تعاون کی ہے۔ یہاں کی کلچرل اکیڈمی نے اردو کے لیے بہت کام کیا ہے اور کشمیری ادب کے اردو میں ترجمے شائع کیے ہیں لیکن تقسیم کی کڑیاں یہاں بھی مکمل نہیں ہیں کیونکہ اکیڈمی کی کتابیں بھی تمام اردو کتب فروشوں کے پاس نہیں ملتیں اور میں سمجھتا ہوں کہ بہت سے ایسے بھی کتب فروش ہوں گے جنھیں یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ کشمیر میں کوئی ایسی اکیڈمی بھی ہے جس نے اردو میں کشمیری ادب کی ترویج کی ہے۔

پاکٹ بکس کو لیجیے۔ انگریزی میں بے حد مقبول ہیں، ہر مشہور اور قیمتی کتاب کے پاکٹ بکس ایڈیشن ملتے ہیں لیکن اردو میں ان کی تعداد محدود رہتی ہے اور اس کی بڑی وجہ اقتصادی بدحالی اور تعلیم کی کمی ہے۔ جب تک اس طرف توجہ نہیں دی جائے گی اس

وقت تک نہ تو لوگوں کی عادتِ مطالعہ میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے اور نہ ہی کتابوں کی فروخت بڑھ سکتی ہے۔ فکشن اگرچہ تیزی سے بکتا ہے لیکن اس کی مانگ بھی جلد ہی ختم ہو جاتی ہے جبکہ تنقید، سوانح اور علمی کتابوں کا دائرہ اس لحاظ سے زیادہ پھیلا ہوا ہے کہ ان کی فروخت چاہے دھیرے دھیرے ہی لیکن مستقل طور پر ہوتی رہتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہندستان میں شائع ہونے والی اردو مطبوعات کی کھپت صرف ہندستان تک ہی محدود ہے۔ اردو چونکہ ہندستان کی اہم زبانوں میں سے ایک ہے اس لیے اردو مطبوعات کے قاری اور پسند کرنے والے غیر ملکوں میں بھی موجود ہیں۔

اردو کتابوں کے ایک امپورٹر نے نیشنل بک ٹرسٹ کے زیر اہتمام سری نگر (کشمیر) میں ہونے والے اردو پبلشنگ کے سمینار میں کہا تھا "غیر ممالک میں اردو کتب کی مارکیٹ کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک مارکیٹ وہ ہے جہاں اردو کتب کو ہندستانی نسل کے لوگوں کے لیے یا اردو زبان بولنے والوں کے لیے درآمد کیا جاتا ہے۔ ان میں انگلینڈ، کناڈا، مارشس، فیجی اور وسط مشرق کے کئی ممالک ہیں کیونکہ ان ممالک میں ہندستانیوں کی تعداد کافی ہے۔ اس لیے یہاں بہت بڑی تعداد میں اخبارات، رسائل اور دیگر مطبوعات کو ہندستان سے برآمد کیا جاتا ہے۔ کئی ممالک میں ہمارے یہاں کی مذہبی اور درسی کتب کی مانگ بھی ہے لیکن ناول یا افسانوی ادب جو زیادہ تر آفریح کے لیے پڑھا جاتا ہے، ایسے ممالک میں کافی تعداد میں فروخت ہوتا ہے۔ انگلینڈ اور کناڈا جیسے ممالک میں تو سرکاری ادارے اور لائبریریاں بھی منتخب اردو کتب ہر سال بڑی تعداد میں منگواتی ہیں۔

غیر ملکی مارکیٹ کے دوسرے زمرہ میں آتے ہیں وہ ممالک جہاں ہندستانی یا پاکستانی نسل کے لوگ تو بہت کم تعداد میں ہیں، لیکن وہاں کے کئی تعلیمی ادارے، یونیورسٹیاں اپنے FOREIGN LANGUAGES DEPTS. میں ہندستان کی مطبوعہ اردو کی ہر مستند کتاب کو باقاعدگی سے منگواتے ہیں، جرمنی جاپان اور امریکہ جیسے ممالک میں کئی اداروں میں اردو کو ایک اہم غیر ملکی زبان کا مقام حاصل ہے ان کے تعلیمی پروگراموں میں اردو ایک الگ مضمون کا درجہ رکھتی ہے تحقیق اور ڈاکٹریٹ کے لیے کئی طالب علم ایسی اردو لائبریریوں کا استعمال کرتے ہیں مغربی جرمنی کی کئی یونیورسٹیوں میں جن میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے ساؤتھ ایشین انسٹی ٹیوٹ کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے جہاں اردو کی ہر مستند اور معتبر کتاب کی ایک ایک جلد مستقل طور پر باقاعدگی سے منگوائی جاتی ہے اسی طرح امریکہ کی کئی یونیورسٹیوں کے لیے لائبریری آف کانگریس کی طرف سے ہندستان کی تقریباً ہر نئی کتاب کو ۱۰ سے ۲۰ جلدوں تک خریدا جاتا ہے تاکہ وہاں کی ایسی لائبریریاں کسی اچھی ہندستانی کتاب سے محروم نہ رہیں۔ ایسے اداروں میں اگرچہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہوتی لیکن کچھ بھی وہاں اردو کے پروفیسر ہوتے ہیں۔ جو اردو کتب کی اچھی لائبریری کو MAINTAIN کرتے ہیں ایسی کئی لائبریریوں میں اردو کتب کا ذخیرہ شاید ہندستان کی کسی بھی اچھی لائبریری سے زیادہ اہم اور بہتر ہوگا۔ اس طرح سے اردو کتب کی درآمد کے لیے ایسے کئی ممالک ہزاروں روپے ہر ماہ خرچ کرتے ہیں"

اس وضاحت سے ظاہر ہے کہ اردو مطبوعات کی مارکیٹ غیر ملکوں میں بھی موجود ہے اس لیے اردو کتب و رسائل کی زیادہ سے زیادہ تقسیم و فروخت کے لیے ضروری ہے کہ ناشرین اور کتب فروش آپس میں بھرپور تعاون کریں۔ اپنی مطبوعات کی بھرپور تشہیر کریں اور اپنی مطبوعات کو کتابت و طباعت کی خوبیوں سے مالا مال رکھیں تاکہ اردو مطبوعات دوسری زبانوں کی مطبوعات سے کسی بھی طرح کم تر معلوم نہ ہوں۔

"۱۹۰۴ء میں مولانا ابوالکلام آزاد پہلی مرتبہ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے لاہور آئے تو خواجہ الطاف حسین حالی بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ مولانا وحید الدین سلیم مرحوم مولانا کو لے کر خواجہ صاحب مرحوم کی خدمت میں پہنچے تو پوچھا کہ خواجہ صاحب اس لڑکے کی عمر کتنی ہوگی؟ انہوں نے فرمایا کہ چودہ پندرہ برس کے ہوں گے سلیم نے کہا کہ یہ لسان الصدق کے ایڈیٹر ہیں خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ان کے والد صاحب ایڈیٹر ہوں گے جب معلوم ہوا کہ یہی ایڈیٹر ہیں تو متحیر رہ گئے اور بہت شفقت فرمائی اس وقت سے مولانا کے ساتھ گہرے روابط پیدا ہو گئے۔"

وقار خلیل



حیدر آباد اور اردو مطبوعات

(سرسری جائزہ)

آزادی سے پہلے حیدر آباد کو علم و ادب، تہذیب و ثقافت میں اہم مرکز کا مقام حاصل رہا ہے۔ آصفی حکمرانوں نے دکن میں قطب شاہی ادبی و کلچر روایات کو مزید روشن کیا، جامعہ عثمانیہ کا قیام آصفی آخری حکمراں حضور نظام میر عثمان علی خاں آصف سابع کا برصغیر کے علمی و ادبی افق پر بے نہایت عہد ساز کارنامہ قرار دیا گیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ اور دار الترجمہ کی بدولت حیدر آباد کو اردو بنیاد کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ملک کے نامور دانشور اور مشاہیر اہل قلم عہد عثمانی میں تصنیف و تالیف اور تراجم میں لگے رہے۔ دار الترجمہ کی علمی، سائنسی اور فنی مطبوعات نے اردو زبان کو مغربی زبانوں کے برابر کا درجہ عطا کیا۔ طب، سائنس اور سرفنی موضوعات پر اہم کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ دائرۃ المعارف نے دینی، مذہبی اور دیگر علوم پر عربی، فارسی کی اہم مطبوعات کے اردو تراجم سے زبان کو وسعت دی۔

جامعہ عثمانیہ کے ساتھ ساتھ اورنگ آباد دکن میں کل ہند انجمن ترقی اردو نے اپنی علمی و اشاعتی سرگرمیوں کو حکومت نظام کی مالی اعانت سے آگے بڑھایا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انجمن کے پلیٹ فارم سے کئی اہم کتابیں شائع کیں۔ ڈاکٹر زور نے عثمانین اہل قلم اصحاب کو ادارہ ادبیات اردو کے مرکز پر یکجا کیا۔ مخدوم نے ٹیگور پر کتاب لکھی، میر حسن نے مغربی تصانیف کے اردو تراجم کی تکمیل کی۔ ان دونوں نے ڈرامہ "ہوش کے ناخن" کا مسودہ مکمل کیا اور پھر ڈاکٹر زور نے کوآپریٹو طریق پر سرمایہ اکٹھا کر کے سرکار دربار کی اعانت سے بے نیاز ان کتابوں کو ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔ پھر کیا تھا عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا، اساتذہ، اور حیدر آباد کے اہل قلم اصحاب نے کسی جھجک اور احساس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تصنیف و تالیف کو اپنا منصب بنایا۔ دکن کی ادبی دنیا ڈاکٹر زور کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکے گی کہ انھوں نے حیدر آبادیوں میں لکھنے کی صلاحیتوں کی عملی طور پر حوصلہ افزائی کی۔ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے اب تک (۳۱۷) کتابیں ادب، زبان، کلچر، سیاست، تحقیق، تنقید، ادب اطفال، خواتین کے موضوعات اور طنز و مزاح نیز فکشن پر چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں جن میں دینیات پر تحقیقی مطبوعات، عہد آصفی کے شعراء کا تذکرہ، تذکرہ مخطوطات ۵ جلدیں، تاریخ گولکنڈہ، حیدر آبادیات اور تعلیم بالغان کے باب میں مطبوعات قابل ذکر ہیں۔ اس ادارہ نے اپنے شعبۂ امتحانات اور ماہنامہ "سب رس" (مجریہ ۱۹۳۸ء) کے ذریعہ برصغیر کے ادبی ماحول کو متاثر کیا ہے۔ چند روز ہوئے اس ادارہ کی گولڈن جوبلی تقاریب کا جناب محمد ہدایت اللہ نائب صدر جمہوریہ ہند نے افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر زور، ادارہ اور حیدر آباد کی علمی و ادبی روایات اور خدمات کو سارے ہندوستان کے لیے مثالی قرار دیا ہے۔

سالار جنگ میوزیم کے بانی یوسف علی خاں سالار جنگ نے سلسلۂ یوسفیہ کے ذریعہ دکنیات کے اہم کلاسکی نثر و نظم کے ذخیرہ کو کئی مطبوعات کے ذریعہ شائع کر کے نمایاں خدمت انجام دی جن میں کلیات محمد قلی قطب شاہ، مرتبہ ڈاکٹر زور کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ دکن کے شعرا۔ ابن نشاطی، ملا وجہی، غواصی، نصرتی اور ہاشمی بیجاپوری پر تحقیقی کام ارباب حیدر آباد کے اسکالروں ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، پروفیسر سید محمد، پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی، ڈاکٹر حفیظ قتیل، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر محمد علی اثر، ڈاکٹر غلام عمر خاں اور ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے منصوبہ بند پروگرام کے تحت انجام دے کر دکنیات کو تاریخ ادب اردو کا اہم باب بنا دیا ہے۔ ان دکنی مطبوعات کی اہمیت برصغیر میں برقرار ہے۔

ذیل میں حیدر آباد کے چند اشاعتی اداروں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کی محدود مگر مفید علمی و ادبی سرگرمیوں کے باعث یہاں ادب، زبان، شعر اور فکشن کی روایات عصری تقاضوں اور ترقی پسند رجحانات کے ساتھ فروغ پا رہی ہیں۔

ریاستی انجمن ترقی اردو نے ریاست میں اردو کے تعلیمی کردار کو بنائے رکھنے میں اپنی سرگرمیوں کو آگے بڑھاتے ہوئے شاہد صدیقی، خورشید احمد جامی اور ادب اطفال کے موضوع پر کتابیں بھی شائع کی ہیں۔ اس کا یہ سلسلہ اب چند سال سے منقطع ہے۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی، حکومت کا ایک ادارہ ہے۔ جس کا مقصد تلگو ادب اور کلچر کی نشوونما ہے۔ اس اکیڈمی نے اردو کی چند مفید اور اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ جن میں حیدرآباد کے شاعروں اور نثرنگاروں پر مہ انتھالوجیز ہدور دکنی لغت کے علاوہ تلگو افسانے اور شاعری کے اردو انتخابات قابل ذکر ہیں۔

تلگو اردو ثقافتی اکیڈمی نے سائنسی، تاریخی اور معلوماتی اردو کتابوں کی اشاعت کے کام کو آگے دکھایا جس کی تصانیف میں دستور ہند کا اردو ترجمہ پروفیسر ہارون خان شیروانی اور ڈاکٹر محشر عابدی کی سائنسی مطبوعات قابل ذکر ہیں

لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ چند اہم تاریخی، علمی اور چند توصیفی کتابوں کی اشاعت کے باعث حیدرآباد کی ادبی دنیا میں یاد رہے گا۔ دکن کے نامور مورخ مولوی شمس اللہ قادری کے فرزند پدم شری احمد اللہ قادری نے اس انسٹی ٹیوٹ کے ذریعہ مفید علمی کاموں کو آگے بڑھایا تھا مگر اب یہ ادارہ جمود کا شکار ہوگیا ہے۔

شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے پروفیسر مسعود حسین خاں کے زمانے میں "اردوئے قدیم" ششماہی مجلہ اور مطبوعات کے ذریعہ زبان و ادب کی اہم خدمت انجام دی، یہ سلسلہ پھر آغاز ہو تو اچھا ہے۔

ریاست میں اردو اکیڈمی کے قیام سے اردو کے مصنفوں، شاعروں اور لکھنے پڑھنے کا کام کرنے والوں کو نیا حوصلہ ملا۔ اکیڈمی کی جزوی اشاعتی اعانت کے باعث چھ سال کے عرصہ میں سیکڑوں اچھی بری کتابیں منظر عام پر آگئی ہیں، جن میں علمی، فنی، تحقیقی اور تخلیقی نیز شعری مطبوعات شامل ہیں۔ کتابوں کا کاروبار کرنے والوں نے زیادہ کمیشنوں پر مصنفین سے کتابیں خرید کر اپنے کام کو کل ہند بنایا۔ کاتبوں اور مطبعوں نے بھی اجرتوں میں اضافہ کردیا۔ آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے اپنے طور پر مطبوعات کی اشاعت کو بھی محسوس کیا نصف درجن کتابیں اس نے چھاپیں اور اوسطاً ایک سال میں ایک کتاب منظر عام پر آئی۔ جن میں علم عروض پر پروفیسر ابوظفر عبدالواحد کی کتاب ادبی اہمیت کی حامل ہے۔ چند شعری مجموعے اور تلگو زبان و ادب پر تعارفی کتاب جسے ریاست کے اردو دوست وزیر مسٹر یم باگا ریڈی نے سپرد قلم کیا ہے قابل ذکر ہے۔

ریاستی اردو اکیڈمی ایک ماہنامہ "قومی زبان" بھی شائع کر رہی ہے جس کی ادارت اکیڈمی کے ڈائرکٹر سکریٹری مسٹر چندر سری واستو کے سپرد ہے، مسٹر سری واستو کی ایک کتاب "اردو ہے جس کا نام" اپنے طور پر منظر عام پر آتی ہے۔ اس کتاب کو ریاست میں اردو تحریک کا ایک رخی مطالعہ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اکیڈمی ریاستی شعراء کا ایک تذکرہ شائع کرنے چلی ہے۔

ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جس کے بانیوں میں ڈاکٹر زور اور مہدی نواز جنگ کے اسمائے گرامی ملتے ہیں "ڈاکٹر میر ولی الدین، پروفیسر ہمایوں کبیر، اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کی مطبوعات شائع کی ہیں۔ اسی انسٹی ٹیوٹ کی نگرانی میں اردو انسائیکلوپیڈیا کا مسودہ ترقی اردو بورڈ نے تیار کرایا ہے جس کی ادارت پروفیسر فضل الرحمٰن کے سپرد کی گئی تھی۔ اس انسٹی ٹیوٹ سے ریسرچ کا کام ابتداً جس سرعت سے ہوتا رہا اب وہ سرگرمی مفقود نظر آتی ہے۔

جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے "ادبی ٹرسٹ" قائم کرکے حیدرآباد میں کل ہند معیار کے شاعروں کو ادب، زبان اور تعلیم کے مقاصد کا ذریعہ بنایا۔ ادبی ٹرسٹ کی طرف سے مخدوم کا کلیات "بساط رقص" شائع ہوا۔ ریاست اور بیرون حیدرآباد کے اہل قلم اصحاب بشمول کرشن چندر کی کتابیں اسی ادبی ٹرسٹ سے شائع ہوئیں۔ درجنوں مصنفوں کو کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی اعانت دی گئی۔ کتابوں کی فروخت کے لیے ایک بک اسٹال بھی کئی سال تک کارکرد رہا۔ روزنامہ "سیاست" نے اپنی ابتدا ہی سے اردو زبان، تعلیم اور ادب کی نشر و اشاعت کو آگے بڑھایا۔ "سیاست" میں ملک کی نئی مطبوعات پر ہر ہفتہ سیر حاصل خصوصی تبصروں کا سلسلہ برقرار ہے۔ ادبی دنیا کی خبریں بھی اس کے کالموں کی زینت بنتی ہیں۔ ادارۂ سیاست نے اپنے اشاعتی سلسلے کو قائم کرکے اب تک ۸ مطبوعات کو منظر عام پر لایا ہے۔ جن میں مخدوم کی نثر کا انتخاب "بکھی کے پیچھے چھوکرا" اور حیدرآباد کی تہذیبی اور ثقافتی روایات پر مبنی مطبوعات "حیدرآباد نگینہ صورت گران دکن، دکن دیس، شہر حیدرآباد کو مواد اور حیدرآبادیات

کی وجہ سے کافی مقبولیت حاصل ہے۔ نئے روزنامہ "منصف" نے اپنی ادبی ہفتہ واری اشاعت میں رفتارِ ادب پر تبصرہ اور مطالعہ کا مستقل سلسلہ شروع کر کے ادبی کتب کے مطالعہ کو قاری کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ "ولا اکیڈمی" جناب حسن الدین احمد کا کارنامہ ہے۔ اس ادارہ نے ۵۰ سے زائد کتابیں شائع کر کے حیدرآباد میں اپنی اہمیت کو منوایا ہے۔ انگریزی شاعری کے تراجم پر اب تک ۵ اکتابیں "ساز مغرب و مشرق" اور "اردو الفاظ شماری" نے ادبی دنیا میں شہرت پائی ہے۔ جناب احمد زبان و ادب کی خدمت میں سرگرم رہتے ہیں اور مستقبل میں اچھی توقعات کی تکمیل ممکن نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے ادارہ "شعر و حکمت" کے ذریعہ جدید نشر و اشاعت کو آئینہ دکھایا ہے اور دو درجن سے زائد کتابیں شائع کی ہیں۔ اسی طرح "زندہ دلانِ حیدرآباد" نے ظرافتی ادب کو عوام سے روشناس کرنے میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا ہے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد اور ماہنامہ "شگوفہ" کی طرف سے طنز و مزاح کو صنفِ ادب کا اعتبار ملا۔ اسٹیج ڈراموں کی اشاعت میں "نگاہ پبلیکیشنز" نے جناب مسیح قمر کی نگرانی میں مختصر مفید کتابوں کو منظرِ عام پر لا کر خود کو متعارف کروایا ہے۔ نئے شاعروں کے فورم "حلف" اور "پیکر پبلیکیشنز" نے چند اچھی شعری تخلیقات شائع کی ہیں جنہیں جدید ادب کے قاری پسند کرتے ہیں۔ ان کی مطبوعات کا نمایاں وصف حسنِ ترتیب اور صوری گٹ اَپ رہا ہے۔ "اقبال اکیڈمی" اقبالیات پر سیمیناروں اور مباحثوں کے ساتھ ساتھ سہ ماہی "اقبال ریویو" اور چند مطبوعات کے ذریعہ مفید خدمات انجام دے رہی ہے۔

مسیحی ادب کی نشر و اشاعت کا کام "ہنری مارٹن اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کے ڈائرکٹر ڈاکٹر دی بھجن طالب شاہ آبادی انجام دے رہے ہیں جس کی طرف سے مسیحی اردو شعراء کے انتخاب کلام اور تذکرے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ جناب نذیر الدین احمد نے "دکن کے انشورقا نواب بہادر یار جنگ" پر اب تک ۲۵ سے زیادہ کتابیں شائع کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ انفرادی طور پر تصنیف و تالیف بھی ایک ادارہ کے برابر انجام دی جاسکتی ہے۔ نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری کے اسٹڈی سرکل "حلقۂ اربابِ ذوق" کے ادبی اجلاس میں ہر ماہ نئی مطبوعات پر حاصل خصوصی تبصرے سنوائے اور پھر سہ ماہی "مبصر" میں شائع ہوتے ہیں جس سے ادبی کتابوں کے مطالعہ میں ہماری

کو ترغیب ہوتی ہے۔

حیدرآباد کے تجارتی اشاعت گھروں "نیشنل بکڈپو"، "حامی بکڈپو"، "ایاس ٹریڈرس"، "معیار بکڈپو"، "ادبی مرکز"، "اعجاز پرنٹنگ پریس" کا ذکر بنیادی اہمیت کا حامل یوں ہے کہ ان ناشرین نے معیاری علمی و ادبی، مذہبی و درسی کتابوں کی اشاعت اور نکاسی میں مخلصانہ طور پر اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے۔ درجنوں صف اول کے مصنفوں کی کتابیں حامی بکڈپو، نیشنل بکڈپو، ادبی مرکز، اعجاز پریس اور ایاس ٹریڈرس نے شائع کی ہیں۔

نجی طور پر ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں کی طرف سے ادبی کتابوں کی اشاعت اور فروخت کے کام کو جواں سال صحافی اور شاعر محمود خاور نے "شاہی پبلی کیشنز" کے ذریعہ آگے بڑھایا۔ خاور دکن کے نامور غزل گو شاعر خورشید احمد جامی کے تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اب دونوں دو پاکستان منتقل ہو گئے ہیں۔ ان کے اشاعتی ادارہ نے تقریباً تین درجن مطبوعات شائع کیں جن میں "برگِ آوارہ" (شاعری، خورشید احمد جامی)، "شعار مجموعۂ کلام حسن نعیم"، "پہچان کا درد" (حمید الماس) اور "حیدرآباد کرناٹک نژاد تامل ناڈو" کے کئی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی مطبوعات شامل ہیں۔ "شالیمار پبلی کیشنز" کی مطبوعات کو یوپی، آندھرا کی اردو اکیڈیمیوں نے ادبی انعام کا مستحق بھی قرار دیا ہے۔ اب شالیمار پبلی کیشنز کا کام ان کے بھائی انور مسعود انجام دے رہے ہیں۔

"پارس پبلی کیشنز" کی طرف سے بچوں کے ادب پر ملک کے نامور مصنف اور کئی قومی ادبی انعامات حاصل کرنے والے ادیب صفدر حسین کی کتابیں شائع ہو کر عوامی مقبولیت کا سبب بنیں۔ ویسے صفدر حسین نے اپنے طور پر بھی ادبِ اطفال، سائنس، سوانح اور ٹکنیکل موضوعات پر تصنیف و تالیف کو مشرقِ وسطیٰ میں رہتے ہوئے بھی جاری رکھا ہے۔

غرض اوسطاً ہر روز ایک کتاب حیدرآباد میں تیار ہوتی اور منظرِ عام پر آتی ہے۔ نکاسی کی رفتار بہ نسبت تلگو مطبوعات بہت کمزور ہے پھر بھی ۵۰۰ کی تعداد میں چھپی کتاب دو سال کے عرصہ میں جیسے تیسے فروخت ہو جاتی ہے۔

****

"اور اللہ کی عبادت کرو۔
اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ
اور ماں باپ، قرابت داروں، یتیموں اور محتاجوں
رشتہ داروں، ہمسایوں، پاس بیٹھنے والوں اور
مسافروں اور جو لوگ تمہارے قبضے میں ہوں سب کے ساتھ احسان کرو۔"
(قرآن)

مطبوعات غالب اکیڈمی

غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات ۔ ڈاکٹر یوسف خاں

گزشتہ چالیس سال میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے غالب اور اقبال کے متعلق جو کچھ سوچا اور سمجھا ان کی روح کو اس میں نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۵/-

غالب اور آہنگ غالب ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں

غالب پر بہت زیادہ وہاں اور فکر انگیز تصنیف ہے اس میں غالب کی شخصیت کا ایک الوکھے انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ ۱۶/-

فیضان غالب ۔ عرشی ملسیانی

یہ کتاب ... کے اہل ... شاگرد ... کے تعارف ... حالات اور ان کے اردو و فارسی کلام کے انتخاب پر مشتمل تاریخی حیثیت کی ایک کتاب ... تالیف ہے ۲۲/-

غالب اور فن تنقید ۔ اشفاق حسین عارف

یہ تالیف مرزا غالب کے ان خطوط پر مشتمل ہے جو ان کے فن پر روشنی ڈالتے ہیں ۲۵/-

غالب اور ذکا ۔ ضیاءالدین احمد شکیب

یہ کتاب مرزا غالب کی زندگی کے آخری دس برسوں کی بعض کھوئی ہوئی کڑیوں کی بازیافت ہے اور ذکا نیلوری کی نظم و نثر غالب کی اصلاحوں کے ساتھ ماحول تاریخی پس منظر اور روابط کے تجزیے کی روشنی میں مطالعہ غالب کے نئے مناہج و امکانات کی نشاندہی کرتی ہے ۶/-

تلمیحات غالب ۔ محمود نیازی

ان تلمیحات کی تشریح و توضیح کا مجموعہ ہے جنھیں غالب نے اپنے اردو کلام میں نہایت منفرد انداز میں اپنایا ہے اس کتاب میں وہ تلمیحات بھی شامل ہیں جو غالب نے خود اختراع کی ہیں یہ کتاب غالب فہمی کی کوشش میں ایک اہم اضافہ ہے۔ ۶/-

نقش غالب ۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری

یہ کتاب مرزا غالب کے اردو اور فارسی شاعری اور ان کے خطوط ان کے افکار اور فن کی میزان پر پرکھنے کی سعی کے ساتھ ساتھ غالب کی ابہام و تفہیم کے سلسلے میں ایک نہایت وقیع کوشش ہے۔ ۱۲/-

سرل غالب ۔ دیوناگری رسم الخط میں ایک عمدہ تالیف

اس کتاب میں غالب کے ۲۲۲ اشعار جو آسانی سے سب کی سمجھ میں آسکتے ہیں دیوناگری رسم الخط میں پیش کیے گئے ہیں غالب کی ایک عمدہ تصویر کے ساتھ نفیس پیش کش ۲/۵۰

نوائے سروش (انگریزی)

(Whispers of the Angel)

غالب کے ۱۲۰ منتخب اشعار کا دلکش انگریزی ترجمہ جو دہ معروف و باذوق حضرات کے ترجموں کا انتخاب چار آرٹ پینٹنگز کے ساتھ ... ۶/-

اقبال کی تیرہ نظمیں ۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری

اس کتاب میں اقبال کی تیرہ نظموں کا متن اور ان کا بھرپور تنقیدی جائزہ شامل ہے ۲۰/-

حافظ اور اقبال ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں

اس کتاب میں مصنف نے دونوں عارفوں کی فکری مماثلت اور اختلاف کو بڑی جامعیت کے ساتھ نمایاں کیا ہے حافظ اور اقبال کے کلام پر ایسی مدلل بحث نہ اردو میں ملتی ہے اور نہ فارسی میں۔ ۲۵/-

اقبال مقالات اور مطالعات (انگریزی) ۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری

پندرہ مضامین پر مشتمل انگریزی زبان میں علامہ اقبال کی فکر و نظر کا عمیق تنقیدی جائزہ اقبالیات پر غالب اکیڈمی کی ایک عظیم پیش کش۔ ۹۵/-

روح اقبال ۔ (صدی ایڈیشن) ڈاکٹر یوسف حسین خاں

اس میں مصنف نے اقبال کی فکر اور شاعری کا بالکل انوکھے انداز ... کیا ہے یہ کتاب اردو زبان کے تنقیدی ادب میں قابل قدر اضافہ ہے (زیر طبع دوسرا ایڈیشن)

اسنائے مومن ۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ۲۵/- یہ تالیف مومن خاں مومن کے ان فارسی خطوط کا مجموعہ ہے جو اس دور کی معاشرت کو سمجھنے کیلئے بڑی اہمیت کے حامل ہیں

غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

QAPN-5



علقمہ شبلی

کلکتہ کی ادبی اشاعتی سرگرمیاں

اردو کی کسی علمی اور ادبی کتاب کو اردو کی مناسب ناشر مل جائے تو یہ ایک معجزہ ہے۔ یہ بات عام طور سے سارے ملک کے لیے کہی جا سکتی ہے، لیکن اس کا اطلاق کلکتہ پر کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ کلکتہ میں اردو کا ایک بھی اشاعت گھر ایسا نہیں ہے جو علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت کی طرف توجہ دے۔ اردو کے جو دو چار پبلشر ہیں وہ صرف مذہبی اور درسی کتابیں شائع کرتے ہیں، کیونکہ ان کتابوں کی اشاعت منافع بخش ہے۔ اور لگا ہوا سرمایہ منافع کے ساتھ جلد واپس آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے افکار کے مسودے کی تکمیل کے بعد یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کے سامنے جو سب سے حوصلہ شکن مسئلہ در پیش ہوتا ہے، وہ اس کی اشاعت کا ہے۔ اردو ادیبوں اور شاعروں کی اکثریت مالی مشکلات سے دوچار رہتی ہے اور گزر بسر مشکل سے ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں اپنے شوقِ فضول کی تکمیل کے لیے کتابیں چھپوانا دیوانگی سے کم نہیں۔ مگر یہ دیوانگی بیشتر ادیبوں کا مقدر رہی ہے۔ جب مصنف کسی طرح کتاب کی اشاعت کے لیے مالی انتظام کر لیتا ہے، تو دوسرے مراحل اس کے صبر کا امتحان لینے کے لیے سامنے آجاتے ہیں۔ اردو کتابوں کے لیے کتابت کا مسئلہ کم اہم نہیں، اچھے کاتب کا ملنا کوئی آسان کام نہیں آج کے مشینی دور میں، جہاں ہر کام میں سطحیت راہ پا گئی ہے، معیاری، صحیح اور دیدہ زیب کتابت ایک تصوراتی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ کاتب حضرات کی مجبوریوں سے انکار نہیں، لیکن ان کی وعدہ خلافیوں اور ستم ظریفیوں کا کوئی جواب نہیں۔ کتابت کے مرحلے سے گزرنے کے بعد پریس کا چکر بھی کچھ کم روح فرسا نہیں اور جب اس مرحلے سے گزر کر کتاب کسی طرح پریس سے آجاتی ہے تو مصنف سرشاری کی کیفیت محسوس کرتا ہے لیکن یہ دیرپا نہیں ہوتی، کیونکہ جب کتابوں کی فروخت کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو ہوش ٹھکانے لگ جاتے ہیں۔ اور اتنا پاپڑ بیلنے کے بعد بھی بے چارہ شاعر یا ادیب ایک لقمۂ تر کی صورت دیکھنے کے لیے ترستا ہی رہتا ہے۔

ان دشواریوں کے باوجود کلکتہ کے ادیب اور شاعر اپنے بل بوتے پر کتابیں شائع کرتے رہے ہیں۔ اب صورت حال کچھ بدل گئی ہے۔ اردو اکیڈمیوں کے قیام سے اشاعت کے لیے کچھ مالی امداد مل جاتی ہے، لیکن دوسرے مراحل اپنی جگہ پر ہیں اور ان کو کامیابی سے سر کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

——— آزادی کے بعد کلکتہ میں ادبی کتابوں کی اشاعت میں پیش رفت ہوئی ہے۔ ان میں سے سوائے دو ایک کے ساری کتابیں مصنف نے خود شائع کی ہیں۔ اور ان کی نکاسی اور فروخت میں بھی ان کی شخصی کوششوں ہی کا زیادہ دخل ہے۔

اردو نثر کے ادبی مرکزوں میں کلکتہ کا شمار ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر نگاری کی داغ بیل ڈالی، مگر آج ہمارے یہاں نثر لکھنے والوں کی بڑی کمی ہے ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے پھر بھی گذشتہ تین دہائیوں میں نامساعد حالات کے باوجود نثری کتابوں کی اشاعت غیر اطمینان بخش نہیں کہی جا سکتی۔

افسانوی تصنیفات میں سرفہرست ل احمد اکبرآبادی کے مجموعے "ملاحظاتِ نفسی" (۱۹۵۹ء) "زندگی کے کھیل" اور "دن رات" (۱۹۶۵ء) اور "صبح و شام" (۱۹۶۶ء) ہیں۔ علامہ جمیل مظہری کی مشہور تصنیف "شکست و فتح" بھی کلکتہ ہی سے شائع ہوئی ان کے علاوہ دوسرے قابل ذکر افسانوں کے مجموعے "راہ کا کانٹا" (شانتی رنجن بھٹاچاریہ) "پھول وانی" (جاوید نہال)

"لیل ونہار" (نشاط الایمان)، "چند اور کرن" (شمس صابری)، "تاریخ کا ورق" (ظفر اوگانوی)، "پانچ افسانے اور انشائیے" (شاہ مقبول احمد)، "روٹھے سورج کا کرب" (عابد ضمیر) اور "اندھی گلی میں صبح" (فیروز عابد) یہاں سے اشاعت پذیر ہوئے۔ ناولوں میں جان عالم سیف کے تاریخی ناول "آخری شکست" اور "روپ متی" اور صغری بیگم سبزواری کا ناول "موت کا سایہ" کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ کمال احمد کی تصنیف "دو ڈرامے تحریبانی ڈرامے" کی واحد کتاب ہے۔ جو کلکتے سے شائع ہوئی۔

تنقیدی اور تحقیقی کتابوں میں ل احمد اکبر آبادی کی تصنیف "ادبی تاثرات" ایک اہم حیثیت کی حامل ہے۔ اس میں ادب کے مختلف مسائل پر نئے زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی دوسری تصنیف "رومی فکر اور مفکر" بھی مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر عبدالرؤف کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ "تلاشِ عیار" کئی سال پیشتر شائع ہوا ہے۔ مضامین کے دوسرے مجموعے "نقوشِ افکار" (ظہیر انا شاد) اور "لفظ و پیکر" (ایم اے نصر) ہیں جو آزادی کے بعد شائع ہوئے "فسانے سے وحشت تک" سید لطیف الرحمن کی ایک اہم کتاب ہے اس میں بنگال کے دس ممتاز شاعروں کی زندگی اور ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کی دوسری تصنیف "غالب اور ان کے معترضین" غالب صدی کے موقع پر شائع ہوئی۔ "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ڈاکٹر جاوید نہال نے بنگال کے ایک صدی کے اردو ادب کا جائزہ لیا ہے، اور فورٹ ولیم کالج اور اس کے انشاپردازوں کا خصوصی مطالعہ پیش کیا ہے، شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے "بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات" کے ذریعہ کچھ ایسے ارباب اردو کو پہلی بار سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ جن سے کم لوگ واقف تھے۔ صفیر بلگرامی کے فکر وفن کے جائزے کے لیے ڈاکٹر ظفر اوگانوی کی دو تصنیفات "جلوۂ خضر" اور "غالب کے ایک عظیم المرتبت شاگرد صفیر بلگرامی — حیات و خدمات" کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔ جنم جے متزا ارمان کے تذکرہ "نسخۂ دلکشا" کو رئیس انور رحمان نے ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔ مولانا آزاد کو جاننے اور سمجھنے کے لیے عبدالرزاق ملیح آبادی کی تصنیف "ذکر آزاد" کا مطالعہ ناگزیر ہے ان کے علاوہ "بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعرا" (مشتاق احمد) "کنور — ایک عظیم بنگالی شاعر" (ابوبکر جیلانی) اور "ترقی پسند تحریک اور اردو نظم" (یوسف تقی، کلکتے سے شائع شدہ) قابل ذکر تصنیفات ہیں۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی "مختصر تاریخ بنگلہ ادب" (دو حصوں میں) علی گڈھ سے شائع ہوئی ہے۔ مشتاق احمد نے نواب محمد آزاد کی تصنیف "نوابی دربار" کو تصحیح و تحشیہ کے بعد شائع کیا ہے۔ مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے ۱۹۸۱ء میں چار مشاہیر اردو آغا حشر، پریم چند، حسرت موہانی اور وحشت کلکتوی کی صدی تقریبات کے موقع پر ایک ضخیم مجلہ "سوغات" شائع کیا جس میں ان مشاہیر کے فکر وفن پر مضامین شامل ہیں۔

اردو میں شاعروں کی تعداد نثر نگاروں سے ہمیشہ زیادہ رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ شعری مجموعے نسبتاً زیادہ شائع ہوتے رہے ہیں۔ کلکتہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ پرویز شاہدی کا دوسرا مجموعہ "تثلیثِ حیات" ۱۹۶۶ء میں کلکتہ سے شائع ہوا، پہلا مجموعہ "رقصِ حیات" مکتبہ شاہراہ دہلی نے شائع کیا تھا۔ علامہ جمیل مظہری کی مثنوی "آب و سراب" بھی کلکتہ سے شائع ہوئی۔ ان کے علاوہ دوسری شعری تصانیف جو کلکتے سے شائع ہوئیں، وہ "نگارخانۂ الفت" (شاکر کلکتوی) "فریاد و جواب فریاد" (جوان سندیلوی) "طلوع سحر" اور "بکھری کرنیں" (نواب دہلوی) "اجالوں کے گیت" (حرمت الاکرام) "تیر و نشتر" (سوز سکندر پوری) "نکہت و نغمہ" (ناظر الحسینی) "شعلۂ رنگیں" (حرم محمد آبادی) "الہام سحر" اور "نے و نغمہ" (آرزو سہارنپوری) "جامِ جم" (منتظر حیدری) "رنگ و بو" (خرد غوث پوری) "مینارۂ نور" (نظام الدین نظام) "کیف و اضطراب" (سید لطیف الرحمن) "زخم صدا" اور "ان پڑھ آندھی" (اعزاز افضل) "بے چہرہ لمحے" (علقمہ شبلی) "اجنبی خدا" (شمیم انور) "لفظوں کی بکھیر میں" (غلام حسین ایاز) "خار و خس" (رضا مظہری) "حرفِ آگہی" (ناظم سلطان پوری) "بڑا بانورا" (احسن شفیق) "چند یادیں" (کنول ڈبائیوی) "جوگی شاعر پریت پرایا"

دامان شام نگری) اور "سرابوں کے درمیان" (نور پیکر) ہیں۔ اشک امرتسری کا انتخاب کلام "سیل اشک"، علقمہ شبلی اور اعزاز افضل نے مرتب کیا اور مغربی بنگال انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔ ستار شاہدی نے بقا نظامی کا کلام "صہبائے بقا" مفید حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ آمر امیری کی مساعی سے "مثنوی رنجیت رانی رمیعنا" مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی۔ قمر صدیقی کا مجموعہ "تجلیات قمر" ان کے چھوٹے بھائی جمال احمد صدیقی نے اسی سال شائع کیا ہے۔ ان مجموعوں کے ساتھ "جندگی کا میلا" کا خصوصی ذکر ضروری ہے۔ کلکتہ میں ایک خاص طرح کی اردو گھروں میں بولی جاتی ہے —— ابراہیم ہوش کا یہ مجموعہ اسی کلکتوی اردو کا واحد نمائندہ ہے۔ الرعبدالرؤف —— نے واسٹ و ٹمٹیس کی نظموں کا ترجمہ اردو میں کیا ہے اس کے دو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ احسن مفتاحی نے حافظ شیرازی کی کچھ غزلوں کا ترجمہ "قند شیراز" کے نام سے شائع کیا ہے۔ "تارے زمین کے" اور "پھول آنگن کے"، بچوں کی نظموں کے دو مجموعے یہاں سے شائع ہوئے دونوں علقمہ شبلی کی تصنیف ہیں —— "ساحلوں کا سمندر" (قیصر شمیم) اور "دائرہ در دائرہ" (رونق نعیم) دو ایسے مجموعے یہاں شائع ہوئے جن میں شاعروں کا کلام اردو کے ساتھ دیو ناگری رسم خط میں بھی ہے۔

آزادی کے بعد کلکتہ سے وحشت کلکتوی کے کچھ خطوط کا مجموعہ "مکاتیب وحشت" کے نام سے شائع ہوا۔ احمد سعید ملیح آبادی کی دو تصنیفات "اللہ کے گھر میں" اور "آج کا پاکستان" یہیں سے شائع ہوئیں۔ ان کا شمار سفر نامے میں کیا جا سکتا ہے۔ سالک لکھنوی کی کتاب "پس شعر" میں مختلف شعرا کے اشعار کی تشریح ہے جو انہوں نے خاص انداز سے کی ہے۔ "سائنس آج اور کل" نامی کتاب اطہر سعید نے بچوں کے لیے لکھی ہے اور مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے شائع کی ہے۔

یہاں کے اشاعتی اداروں میں ... بک ڈپو، شرف انیڈ سنز، کتب خانہ ... صدیقیہ بک ڈپو، حاجی عبد الستار اینڈ سنز، حاجی سعید اینڈ سنز، نور بک ڈپو، کتابستان، کتاب محل، جاوید بک ڈپو اور ستار بک ڈپو قابل ذکر ہیں۔

یہ ہے مغربی بنگال میں ادبی اشاعتی سرگرمیوں کا مختصر جائزہ ... اس میں پیش نظر رہا ہے کہ آزادی کے بعد مغربی بنگال سے شائع ہونے والی ادبی کتابوں کا ذکر آجائے اور ... کہ اردو میں شائع ہونے والی ادبی کتابوں کا ... یہ ماضی و حال کی تاریخ اور مستقبل کا اشاریہ بھی ہے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

نام شاعر	سال ولادت	مقام ولادت	سال وفات	مقام وفات	عمر
امیر خسرو دہلوی	۱۲۵۳ء	پٹیالی ضلع ایٹہ	۱۳۲۵ء	دہلی	۷۲ سال
ولی دکنی	۱۶۶۸ء	اورنگ آباد	۱۷۴۴ء	[illegible]	[illegible]
مرزا رفیع سودا	۱۷۱۳ء	دہلی	۱۷۸۱ء	لکھنؤ	[illegible]
خواجہ میر درد	۱۷۲۰ء	دہلی	۱۷۸۵ء	دہلی	[illegible]
میر تقی میر	۱۷۲۳ء	آگرہ	۱۸۱۰ء	لکھنؤ	[illegible]
میر حسن	۱۷۲۶ء	دہلی	[illegible]	[illegible]	[illegible]
نظیر اکبر آبادی	۱۷۳۵ء	دہلی	۱۸۳۰ء	[illegible]	[illegible]
مصحفی	۱۷۵۰ء	امروہہ مراد آباد	۱۸۲۴ء	لکھنؤ	[illegible]
انشاء	۱۷۵۶ء	مرشد آباد	۱۸۱۷ء	لکھنؤ	[illegible]
بہادر شاہ ظفر	۱۷۷۵ء	دہلی	۱۸۶۲ء	رنگون	[illegible]
آتش	۱۷۷۷ء	فیض آباد	۱۸۴۷ء	لکھنؤ	[illegible]
ناسخ	۱۷۸۶ء	فیض آباد	۱۸۳۱ء	لکھنؤ	[illegible]
ذوق	۱۷۸۹ء	دہلی	۱۸۵۴ء	دہلی	۶۵
مرزا غالب	۱۷۹۶ء	آگرہ	۱۸۶۹ء	دہلی	۷۳
مومن	۱۸۰۰ء	دہلی	۱۸۵۱ء	دہلی	۵۱
میر انیس	۱۸۰۱ء	فیض آباد	۱۸۷۴ء	لکھنؤ	۷۳
مرزا دبیر	۱۸۰۳ء	دہلی	۱۸۷۵ء	لکھنؤ	۷۲
نسیم لکھنوی	۱۸۱۱ء	لکھنؤ	۱۸۴۳ء	لکھنؤ	۳۲
محسن کاکوروی	۱۸۲۶ء	کاکوری	۱۹۰۵ء	مین پوری	[illegible]
اختر (واجد علی شاہ)	۱۸۲۷ء	لکھنؤ	۱۸۸۷ء	کلکتہ	۶۱
امیر مینائی	۱۸۲۹ء	لکھنؤ	۱۹۰۰ء	حیدر آباد	۷۲
داغ دہلوی	۱۸۳۱ء	دہلی	۱۹۰۵ء	حیدر آباد	۷۴
محمد حسین آزاد	۱۸۲۳ء	دہلی	۱۹۱۰ء	دہلی	[illegible]

اسد یار خاں

ناشروں کے مسائل



اردو زبان و ادب پر جو بُرا وقت پڑا ہے اس سے جو تہذیبی نقصان پہنچا ہے اس کا اندازہ شاید آئندہ نسلیں ہی لگا سکیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے اردو کو مدرسوں سے خارج کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد غیر معمولی طور پر کم ہوگئی اور یہ تعداد ہر سال اور زیادہ کم ہوتی جا رہی ہے اور شاید ایک دن ایسا آئے جیسے آج کل عربی اور فارسی جاننے والے نظر آتے ہیں۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اردو کتابوں کی فروخت بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے اب بھی انفرادی طور پر خریدنے والے دو چار نظر آتے ہیں جو کتابیں بھی نظر آ رہی ہیں وہ لائبریریوں کی وجہ سے —— اور بدقسمتی سے ہندستان میں ایسی لائبریریوں کی تعداد بہت کم ہیں جو اردو کتابیں خریدتی ہیں۔ پھر یہ بات بھی کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ اردو کی کتابیں خریدنے والی لائبریریوں میں اکثریت ان کی ہے جو سستے رومانی اور جاسوسی ناول خریدتی ہیں کیونکہ ان کے پڑھنے والے زیادہ ہیں۔ بڑی عمر کے لوگ ہیں جو ریٹائر زندگی گزارتے ہیں اور اپنا وقت کاٹنے کے لیے کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں ظاہر ہے کہ ان کا وقت رومانی اور جاسوسی ناولوں سے ہی کٹ سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ادبی کتابوں کے پڑھنے والے معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور ایسی کتابوں کی فروخت بھی اسی نسبت سے ہو رہی ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ اردو نشر و اشاعت کا کاروبار نہ صرف یہ کہ منافع بخش نہیں بلکہ سراسر زیاں ہے۔

اس کے بعد بھی اگر یہ کاروبار چل سکتا ہے تو درسی کتابوں کی مدد سے۔ جو ادارے درسی کتابیں چھاپتے ہیں ان کو —— تھوڑا سہارا ملتا ہے اور وہ کبھی کبھار ادبی کتابیں چھاپ لیتے ہیں لیکن درسی کتابوں کا سہارا بھی اب اٹھ رہا ہے۔ یہ کام اب سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اپنے ہاتھوں میں لیتے چلے جا رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ سرکاری ادارے درسی کتابیں تو ضرور چھاپیں گے لیکن وہ اس کی آمدنی سے غیر درسی یا ادبی کتابیں نہیں چھاپیں گے کیونکہ یہ ان کے دائرۂ عمل سے باہر ہے اور اس آمدنی کا فائدہ صرف دفتر میں کام کرنے والے کارکنوں پر خرچ ہوگا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ادارے جو درسی کتابوں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں وہ اب نجوراً ادبی کتابیں چھاپنے سے قاصر ہیں مکتبہ جامعہ اور ایجوکیشنل بک ہاؤس اس کی نمایاں مثال ہیں مکتبہ جامعہ نے ہندستان میں اردو کی اشاعت میں نمایاں حصہ لیا ہے اور اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ ہندستان کی مختلف ریاستوں کی درسی کتابیں بھی چھاپتے تھے۔ لیکن اب جب کہ درسی کتابوں کا کام تقریباً ختم ہوگیا ہے انھوں نے بھی اس ادبی خدمت کے لیے مجبوراً پریس کی طرف رخ کیا ہے اور پریس کی آمدنی سے وہ آج ادبی اور تعلیمی کتابیں شائع کر رہے ہیں۔

درسی کتابوں کا معاملہ صرف سرکاری اداروں ہی کا نہیں ہے اب تو دوسرے ادارے بھی یہ کام کرنے لگے ہیں۔ یونیورسٹیوں نے اپنے اپنے پبلی کیشن ڈویژن قائم کر لیے ہیں —— جامعہ اردو کا اپنا اشاعتی ادارہ ہے —— ان سے متعلق ادیب اور شاعر اپنی کتابیں چھپوانے کے لیے ہمارے جیسے اداروں کی طرف دیکھتے ہیں کیونکہ یونیورسٹی کے ادارے ہوں یا جامعہ اردو جیسے پرائیویٹ ادارے —— یہ غیر درسی کتابیں چھاپنے سے حتی الوسع گریز کرتے ہیں۔

اب ایک اور اہم مسئلہ کتابوں کی طباعت کا ہے۔ کاغذ کے دام اتنے بڑھ گئے

ہیں کہ شاید ہی کسی چیز کے بڑھے ہوں۔ جو ۔۔۔ آٹھ دس سال پہلے چالیس روپے رِم ملتا تھا وہ اب ایک سو چالیس میں مل جائے تو بھی غنیمت ہے۔ کتابت کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی شرح تو بڑھ گئی ہے لیکن اچھے کاتبوں کی قلت ہے کیونکہ جب اردو پڑھنے والے نہ ہوں گے تو کاتب کہاں سے آئیں گے۔ اس قلت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہینوں میں کتابت ہوتی ہے۔ پھر پریس کی دشواریاں ــــ ایک کتاب سال بھر سے پہلے نہیں چھپ سکتی ہے۔ اس پر جو بار بار خرچ آتا ہے بعض اوقات تو وہ کتابت اور طباعت کے اخراجات سے بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ جس کتاب کی قیمت پہلے دو روپے تھی وہ اب بیس روپے ہو گئی ہے۔

طباعت کے معاملہ میں ایک پریشانی یہ ہے کہ لیتھو کے نئے پریس بننا بند ہو گئے۔ پرانی مشینیں اتنی خراب ہو گئی ہیں کہ ان کی چھپائی پڑھنی مشکل ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مجبوراً آفسیٹ کی طرف رخ کرنا پڑتا ہے جس پر خرچ بہت زیادہ آتا ہے۔ اردو کے ناشر آفسیٹ سے چھپوانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ البتہ اس میں امید کی کرن ون ڈائنگ کی شکل میں نظر آتی ہے جس میں طباعت کا حسن بھی ہے اور اخراجات بھی نسبتاً کم ہو جاتے ہیں کیونکہ طباعت تو آفسیٹ مشین سے ہوتی ہے البتہ نگیٹو بنانے کا خرچ بچ جاتا ہے اس کی کتابت کے نرخ آفسیٹ کی بہ نسبت کم ہوتے ہیں لیکن یہ کام پورے ہندستان میں صرف الہ آباد کے دو پریسوں میں ہوتا ہے۔ اگر کچھ بڑے ادارے ون ڈائنگ طباعت کا انتظام کر دیں تو مجھے یقین ہے کہ طباعت کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جائے گا۔

ون ڈائنگ طباعت پر میں اس لیے بھی زور دینا چاہتا ہوں کہ لیتھو پریس ایک ایک کر کے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ نئی لیتھو مشینوں کے آنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا اس لیے اگر حکومت یا اس سے متعلق اردو ادارے جیسے ترقی اردو بورڈ یا ریاستی اردو اکیڈمی انجمن ترقی اردو اپنے اپنے پریس قائم کر لیں اور اردو ناشروں کو طباعت کی سہولتیں فراہم کریں تو اردو کی کتابوں کے چھپنے میں آسانی ہو گی یہ طے ہے کہ ہم اردو والے اپنی کتابیں پانچ سو اور ہزار سے زیادہ نہیں چھپواتے۔ اس لیے کاروباری آفسیٹ کے چھاپے خانے اردو کتابوں کی چھپائی کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ حکومتی ادارے اگر چاہیں تو بڑی آسانی سے پریس قائم کر سکتے ہیں۔ چند سیمناروں اور کانفرنسوں پر جو خرچ آتا ہے اس سے بھی کم میں پریس لگائے جا سکتے ہیں۔

پاکستان میں "جنگ" نے کمپیوٹر کے ذریعہ کتابت کا بہت اچھا انتظام کر لیا جس سے کتابت کا مسئلہ حل ہو گیا ہے ایک اعلا درجے کے خطاط کی تحریر سے کمپیوٹر نے ٹائپ تیار کر دیا ہے جس میں نستعلیق تحریر ہوتی ہے اور جوڑوں کا بھی پتہ نہیں چلتا اس میں ایک سہولت یہ ہے کہ یہی تحریر مختلف ٹائپ میں چھپ جاتی ہے جلی اور خفی ہر قلم سے۔ یہ نستعلیق ٹائپ جگہ بھی نہیں گھیرتا اور صاف ستھرا چھپتا ہے اس میں تو خیر بہت خرچ آئے گا اگر اس وقت ون ڈائنگ طباعت کا بھی انتظام ہو جائے تو اردو طباعت کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو سکتا ہے۔

ــــــــ غالب اکیڈمی نے کتابت کا اسکول قائم کر کے ایک بہت بڑا کام کیا ہے۔ ایسے کتابت کے اسکول ہر ریاست میں قائم ہونا چاہئیں۔ اس سے کچھ سہارا ملے گا۔ مجھے امید ہے کہ انجمن ترقی اردو، ترقی بورڈ اور ریاستی اکیڈمیاں ان مسائل پر ہمدردانہ غور کریں گی اس وقت اردو کے ناشروں کی مدد کرنا ادیبوں اور شاعروں کی بالواسطہ مدد کرنا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مسائل پر یہ ادارے ناشروں کے ساتھ مل بیٹھ کر غور کریں اور ان کے حل تلاش کریں ورنہ بہت جلد ایسا وقت آئے گا کہ یہ ناشر اپنا کاروبار بند کرنے پر مجبور ہو نگے۔

●●●●●●●●●●●●●●●●

"سر سید لکھتے ہیں کہ جس زمانے میں میری عمر گیارہ برس کی تھی میں نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور بڈھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ والدہ کو بھی خبر ہو گئی تھوڑی دیر بعد جب میں گھر میں آیا تو انہوں نے نہایت ناراض ہو کر کہا کہ اس کو گھر سے نکال دو۔ جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے۔ یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں ہے۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور سڑک پر لا کر چھوڑ دیا۔ اسی وقت میری خالہ کے گھر سے جو بہت قریب تھا دوسری ماما نکلی اور خالہ کے پاس لے گئی انہوں نے کہا: "دیکھو آپا جی تم سے بہت ناراض ہیں۔ تم کو کوٹھے پر ایک مکان میں چھپا دیتی ہوں وہاں سے باہر نہ نکلنا ورنہ ہم سے بھی ناراض ہو جائیں گی میں تین دن تک وہاں چھپا رہا۔ تیسرے دن خالہ صاحبہ مجھے والدہ کے پاس لے گئیں۔ تاکہ قصور معاف کرائیں۔ انہوں نے کہا اگر اس نوکر سے قصور معاف کرا لے گا تو میں بھی معاف کر دوں گی۔ جب میں نے ڈیوڑھی میں جا کر نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تب قصور معاف ہوا۔"

(اقتباس کتاب "حیات جاوید" سے)

حاجی محمد زبیر

شاہانِ مغلیہ کے کتب خانے اور اُن کا نظام

شاہانِ مغلیہ کا تین سو سالہ دورِ حکومت ہندستان کی علمی اور ادبی تاریخ کا ایک روشن اور تابناک باب ہے۔ اُن کی ادب نوازی اور معارف پروری نے اس ملک کی ساکت علمی فضا میں زندگی اور حرکت پیدا کر دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک طرف اورنگ جہاں بانی ان کے زیرِ قدم تھا تو دوسری طرف اقلیمِ سخن بھی ان کے زیرِ نگیں تھی۔ دور دور سے ادیب عالم اور شاعر مشتاق ہو کر یہاں آتے تھے اور اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے تھے۔ تاریخ و ادب پر حقیقتاً اس سے بڑھ کر اور کوئی ظلم نہیں ہو سکتا کہ اُن کے کارناموں کو صرف ان کی رزمی زندگی میں دیکھا جائے یا میدانِ جنگ میں تلاش کیا جائے۔ اس مضمون میں ہم ان کی علمی زندگی کے ایک ایسے پہلو پر غور کرنا چاہتے ہیں جو اب تک تشنۂ تفسیر و تعبیر ہے یعنی ان کے کتب خانے اور ان کا انتظام۔

شاہانِ مغلیہ کے کتب خانے : سلطنتِ مغلیہ کے بانی ظہیر الدین محمد بابر کو علم و ادب کا ذوق اپنے باپ سے ورثہ میں ملا تھا۔ علم دوست باپ نے اس کی تعلیم کے لیے شیخ فرید بابا قلی اور مولانا عبداللہ جیسے متبحر علماء کو منتخب کیا تھا۔ ان بزرگوں کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ بابر کی وہ فطری صلاحیتیں جو علم و ادب کی طرف راغب تھیں یکدم اجاگر ہو گئیں۔ بارہ برس کی عمر میں وہ تخت پر بیٹھا اور جب تک وہ زندہ رہا بے رحم رشتہ داروں اور ناسازگار حالات کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہا لیکن پھر بھی علم و ادب کے ذوق کا یہ عالم رہا کہ میدانِ جنگ میں جب بھی فرصت ملی تو بیاض نکالی اور شعر پڑھنے بیٹھ گیا۔ طبیعت کو موزوں پایا تو اس بیاض میں اور اضافہ کر لیا۔

جب بابر نے اپنے وطن کو خیرباد کہا اور ہندستان کا رخ کیا تو اپنے اسلاف کے کتب خانوں سے ایسے بیش بہا نوادر کو منتخب کر کے ساتھ لے آیا جو اس کو کہیں حاصل نہ ہو سکتے تھے۔ وہ اپنے آبا کا ملک چھوڑ سکتا تھا لیکن علوم و فنون کے یہ ذخائر اُسے چھوڑنے گوارہ نہ تھے۔ ان ذخائر میں بیشتر مصوری اور نقاشی کے نوادر تھے۔ بقول مارٹن ہندی آرٹ نے اُن کا بہت گہرا اثر قبول کیا۔ بابر کے اس ذخیرہ سے عہدِ مغلیہ کے پہلے کتب خانے کی بنیاد پڑی۔

بابر کی محبوب کتابیں قرآن پاک، گلستان سعدی، شاہنامہ فردوسی، مثنوی نظامی، مثنوی خسرو، ظفر نامہ یزدی اور طبقات ناصری تھیں۔ بابر نامہ میں اس نے ان کتابوں کا متعدد جگہ ذکر کیا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ اس نے ان کتابوں کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ بابر کم از کم تین زبانوں (عربی، فارسی اور ترکی) سے واقف تھا۔ اس کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس نے حافظؔ اور سعدیؒ اور اپنے معاصر مولانا جامیؔ کے افکار و طرزِ ادا سے بہت اثر لیا تھا۔ رامپور کے کتب خانے میں بابر کا دیوان بھی موجود ہے۔

بابر خود صاحبِ تصنیف تھا۔ فنِ عروض پر ایک رسالہ لکھا تھا۔ خواجہ عبیداللہ احرار کی ایک کتاب "رسالہ والدیہ" کو اس نے ترکی نظم میں منتقل کیا تھا اور اس کمال کے ساتھ کہ مصنف کا کوئی خیال ایسا نہ تھا جو پوری وضاحت اور نفاست کے ساتھ اس میں نہ آ گیا ہو۔

ہندستان میں بابر کو کل پانچ سال رہنا نصیب ہوا اور یہ مدت بھی بیشتر میدانِ جنگ میں بسر ہوئی لیکن علمی ذوق کا یہ حال تھا کہ جب کسی مہم کے دوران میں کوئی کتب خانہ ملتا تو فوراً اپنے بیٹے ہمایوں کے سپرد کر دیتا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں بابر کو پنجاب کے افغان امیر غازی خان کا کتب خانہ دستیاب ہوا۔ یہ امیر علم دوست تھا اور کتابوں کا بڑا شوقین تھا۔ بابر نے اس کتب خانہ میں سے کچھ کتابیں منتخب کر کے ہمایوں اور کامران کے پاس بھیج دیں۔ کتابوں کے معاملے میں بابر کا ذوق اس قدر اعلا تھا کہ یہ کتبخانہ اس کو پسند نہ آیا اور لکھا۔ "مجھے اس میں اتنی اچھی کتابیں نہیں ملیں جتنی میں توقع کرتا تھا۔"

نفاست بابر کے خمیر میں تھی۔ کتابوں کے حاشیوں کو مزین کرنے کا رواج سب سے پہلے اسی کی بدولت ہوا۔ پھر خط بابری ایجاد کیا اور اس خط میں قرآن کا ایک نسخہ لکھ کر مکہ معظمہ کو بھیجا۔ یہ اس شخص کا علمی ذوق تھا جس کو زندگی میں بہت کم دن ایسے ملے تھے کہ جب کسی دشمن کا مقابلہ کرنا یا اپنے گئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی نہ پڑی ہو۔

ہمایون، اقلیم سیاست میں نہ سہی لیکن اقلیم ادب میں تو یقیناً اپنے باپ کا سچا جانشیں تھا۔ شاعری ہو یا ریاضیات، فلکیات ہو یا نجوم اس کا ذہن سب پر یکساں حاوی تھا۔ تذکرۂ بخاری میں لکھا ہے:

"باوجود کثرت مشاغل جہانبانی شغل بتحصیل علوم سخن دانی نمودہ"

ہندستان میں گو بہادر شاہ اور شیر شاہ کی پیہم نبرد آزمائیوں نے ہمایون کی زندگی وبال کر دی تھی لیکن مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ جنگی مہمات میں بھی کتابیں اس کے ساتھ رہتی تھیں۔ مراعات سکندری کے مصنف نے لکھا ہے کہ اس کا باپ (جو ہمایون کے کتب خانہ کا مہتمم تھا) ہمہ وقت کتابوں کو بادشاہ کے حضور میں پیش کرنے میں مامور رہتا تھا۔ بادشاہ کو کتابوں کے مطالعہ کا ایسا شوق تھا کہ پیہم کتابوں کا مطالبہ کرتا رہتا تھا۔ تزک جہانگیری میں ہمایون کے کتب خانہ کے مہتمم نظام کا جو باز بہادر کے لقب سے مشہور تھا ذکر ملتا ہے۔

کاؤنٹ نوئیر نے لکھا ہے کہ ہمایون جب شکست کھا کر ہندستان سے جا رہا تھا تو اس وقت چند نادر کتابیں اس بے سروسامانی کے عالم میں بھی اس کی رفیق سفر تھیں۔

دہلی کے پرانے قلعہ میں شیر شاہ نے ایک نشاط گاہ شیر منڈل کے نام سے بنوائی تھی۔ جب ہمایون دوسری مرتبہ دہلی کے تخت پر آیا تو اس نے عشرت گاہ کو کتب خانہ میں تبدیل کر دیا۔ یہ کتب خانہ ہیئت ریاضی اور نجوم میں بے نظیر تھا۔ اسی کتب خانہ کی سیڑھیوں سے گر کر ہمایون نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

اکبر کے متعلق عام طور سے مشہور ہے کہ وہ جاہل محض تھا۔ لیکن یہ سراسر غلط ہے اور یہ غلط فہمی ابوالفضل کی عبارت نہ سمجھ سکنے کے باعث پیدا ہوئی ہے۔ ابوالفضل نے اکبر کے لیے اُمّی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس زمانہ میں اُمّی کا لفظ اصطلاحاً اس شخص کے لیے استعمال ہوتا تھا جو عربی سے ناواقف ہو۔ اس سے مقصود ایسا شخص نہیں تھا جو علم سے بالکل ہی نابلد ہو۔ اگر کوئی شخص دنیا کی تمام زبانوں سے واقفیت رکھتا ہو لیکن عربی زبان نہ جانتا ہو تو اس زمانہ کی مروجہ اصطلاح میں اُمّی کہا جا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ ابوالفضل اکبر کو پیغمبرانہ اوصاف سے متصف کرنا چاہتا تھا اس لیے ضروری تھا کہ اسے اُمّی بھی کہا جائے۔ جدید تحقیقات یہ ہے کہ اکبر پڑھا لکھا انسان تھا۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ وہ مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ کا دلدادہ تھا اور نہایت روانی کے ساتھ دونوں کے اشعار سناتا تھا۔ اس کی علم نوازی اور قدر دانی کی شہرت سے ہندستان اور بیرون ہندستان کے بہترین دماغ دربار شاہی میں جمع ہو گئے تھے۔ یہ لوگ دن رات معدن جان سے جواہر نکالتے اور شاہ کے حضور میں نذر گزرانتے تھے۔

اکبر نے جو کتب خانہ قائم کیا تھا وہ بقول ایک مشہور مورخ اسمتھ اس قدر قیمتی تھا کہ اس سے پہلے اتنے قیمتی کتب خانہ کا وجود نہیں ملتا۔ ابوالفضل نے لکھا ہے:

"و گیتی خداوند از دفور آگہی کتابخانہ را بر چند گونہ فرمودہ برخی درون شکوی و قدری باشد و لختی بیرون و در ہر کدام را چند لختی گردانیدہ نمودہ علم و نام و راموافق اندر آن پایہ قرار دادہ و دانہ دگر گونگی نظم و نثر و ہندی و فارسی و یونانی و کشمیری و عربی ترتیب یافت، بدان شمط نظر در آوردند۔ روز بروز کاردانان آگاہ دل آنرا بموقف عرض ہمایون رسانند و ہر کتابی را از آغاز تا انجام شنوند و روز کہ بدانجا رسد بشمارہ آن بخامہ بقلم گوہر بار نقش کنند و بعدد اوراق خوانندہ را نقد از سرخ و سفید بخشش شود۔ کم کتابی مشہور بود کہ در محفل ہمایون نگزرد و کدام داستانہای باستانی و غرائب علوم و نوادر حکم کہ ایزد ۔۔۔"

پیشوائے دانش منشاں انصاف گرامی نباشد، از مکرر شنودن ـــــ ملال نگیرد و بفراوان خواہش نباشد، ہموارہ از اخلاق ناصری، کیمیائے سعادت، قابوس نامہ، مکتوبات شرف منیری، گلستاں، حدیقہ، مثنوی معنوی، جام جم، بوستان، شاہنامہ، خمسہ شیخ نظامی، کلیات خسرو و مولانا جامی، دیوان خاقانی و انوری و دیگر تاریخ نامہا در پیش گاہ حضور برخوانند۔"

قلعہ آگرہ میں ثمن برج کے قریب کا کمرہ کتب خانہ کے لیے مخصوص تھا۔ اس میں کتابوں کی کل تعداد چوبیس ہزار تھی، جن کی قیمت کا اندازہ چونسٹھ لاکھ روپیہ کیا جاتا تھا۔ اس کتب خانہ میں برابر اضافے ہوتے رہتے تھے۔ اہل قلم جو کتابیں لکھتے ان کا ایک نسخہ شاہی کتب خانہ میں ضرور بھیجتے اور فتوحات میں جو کتابیں ملتیں ان کو کتب خانہ میں داخل کر دیا جاتا۔ ۱۵۹۵ء میں جب فیضی کا انتقال ہوا تو اس کی ۴۳۰۰ منتخب قلمی کتابیں شاہی کتب خانہ میں شامل کر دی گئیں اور اس اضافے نے اکبر کے کتب خانہ کی اہمیت اور حیثیت بڑھادی۔

اکبر کا کتب خانہ صرف مخطوطات پر مشتمل تھا۔ وہ چھپی ہوئی کتابیں رکھنا پسند نہ کرتا تھا۔ جیسوٹ مشن JESUIT MISSION نے ایک مرتبہ کچھ چھپی ہوئی کتابیں اکبر کی خدمت میں پیش کیں اس نے مشن کا دل رکھنے کے لیے شاہی کتب خانہ میں داخل کرنے کا حکم دیدیا لیکن بعد کو یہ سب کتابیں خارج کرادیں۔

اکبر کے کتب خانہ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مصنفین کے دست خاص کے لکھے ہوئے نسخے موجود تھے۔ علمائے عصر اور علمائے ماضی کی خود نوشت کتابوں نے اکبر کے کتب خانے کو دنیا کے کتب خانوں میں ایک امتیازی حیثیت دیدی تھی۔

اکبر کو کتابوں کے خوش خط لکھوانے اور ان کو مصور کرانے کا بڑا شوق تھا۔ دربار کے خوشنویس اور مصور اپنے فن سے کتب خانہ کی زینت بڑھاتے اور اکبر سے انعام و اکرام پاتے۔ خواجہ عبدالصمد شیریں قلم اپنے فن میں یکتائے روزگار سمجھا جاتا تھا۔ اس نے عہد اکبری کی بہت سی تصانیف کو خط نستعلیق میں لکھا اور ایسی دیدہ زیب تصاویر سے مزین کیا کہ جس نے دیکھا وہ محو حیرت ہو گیا۔ خواجہ عبدالصمد نے کہانیوں کی ایک کتاب داراب نامہ کو الفاظ کی بجائے تصاویر میں مرتب کر کے اکبر کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

اکبر نے داستان امیر حمزہ کو ۱۴۰۰ تصاویر سے آراستہ کرایا۔ خمسہ نظامی، شاہنامہ وغیرہ کو نہایت پاکیزہ خط میں لکھوا کر مصور کرایا۔ اس کے حکم سے مہابھارت کا فارسی ترجمہ رزم نامہ کے نام سے کیا گیا جس میں تمام معرکوں کی تصاویر بنوائی گئیں۔ یہ ترجمہ پانچ سال میں مکمل ہوا اور دس ہزار روپیہ اس پر صرف ہوا۔ رزم نامہ کا وہ نسخہ جے پور کے کتب خانہ میں ہے۔ سنسکرت کی اور کتابوں کے بھی فارسی میں ترجمے ہوئے اور فارسی و عربی کی بہت سی کتابیں سنسکرت میں منتقل کی گئیں۔ ان سب کتابوں کو عمدہ نستعلیق میں لکھوایا اور تصویروں سے مزین کرا کے کتب خانہ میں داخل کیا گیا۔ شاہی کتب خانہ میں پندرہ ہزار ایسے قلمی نسخے تھے جن کو اکبر نے دوبارہ خوشخط لکھوایا تھا۔

جہانگیر نے علم و ادب سے شیفتگی اور مطالعہ سے دلچسپی ورثہ میں پائی تھی۔ باپ کے کتب خانہ کے علمی نوادر نے ان صلاحیتوں کو اور اجاگر کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ علم و سخن کے آسمان پر ماہتاب بن کر چمکا۔ "ایک تنقید نگار کی حیثیت سے اس کی نگاہ جس قدر باریک بیں اور صحیح تھی اس کا اندازہ لگانا محال ہے۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ جہانگیر نے اپنی تزک میں جس شاعر کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے وہ حرف آخر ہے۔ جہانگیر کو جو کتب خانہ وراثت میں ملا تھا اس نے اس کی امتیازی شان کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس میں قابل قدر اضافے بھی کیے۔ جہانگیر کا کتب خانہ نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا اور علم و ادب، شعر و شاعری کے بہترین نوادر اس میں جمع تھے۔ کتابوں کی فراہمی اور نگہداشت میں بھی وہ اکبر ہی کی مثل تھا۔ مکتوب خاں کتب خانہ کا مہتمم تھا۔ جہانگیر کو سفر میں بھی کتابوں کی جدائی گوارا نہ تھی اور کتب خانہ کا ایک حصہ سفر میں ساتھ رکھتا تھا۔ جب وہ گجرات پہونچا تو اس نے اپنے سفری کتبخانہ میں سے وہاں کے علما اور مشائخ کو چند کتابیں عطا کیں

اور ان پر گجرات پہونچنے اور کتاب دینے کی تاریخ اپنے قلم سے تحریر کی۔

جہانگیر کتابوں پر اپنے ہاتھ سے اکثر نوٹ بھی لکھا کرتا تھا مرزا کامران کے دیوان کا پہلا ورق جو دستیاب ہوا ہے اس پر جہانگیر کے قلم کے کچھ نوٹ درج ہیں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے کتب خانہ میں ترکی دیوان کا ایک صفحہ موجود ہے جس پر جہانگیر کے دست خاص کی یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

اللہ اکبر

پنجم آذر سنہ ۱۰ داخل کتابخانہ

این نیاز مند درگاہ الہی

نور الدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ

سنہ ۱۰۱۴ھ

شاہجہاں کی ذہنی ذکاوتیں علم و ادب کی بجائے فن تعمیر میں جلوہ گر نظر آتی ہیں لیکن پھر بھی اس کا عہد علمی سرگرمیوں سے خالی نہیں۔ شاہجہاں بہت بڑا عالم و فاضل تھا۔ اس کی علمی قابلیت اور سخن فہمی کا اندازہ "عمل صالح" سے ہوتا ہے اس کے دربار میں ہر ملک کے علما فضلا حاضر ہوتے اور شاہجہاں خود ان کے مذاکرات علمیہ میں شریک ہوتا تھا۔ اہل فن کی قدردانی اور ارباب علم کے ساتھ اس کی فیاضیاں بے مثل تھیں۔

شاہجہاں کا کتب خانہ نہایت شاندار تھا۔ ایک جرمن سیاح سنہ ۱۰۴۲ھ میں ہندوستان آیا تھا وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے: "شاہجہاں کے کتب خانے میں چوبیس ہزار کتابیں ہیں جن کی جلدیں نہایت اعلا ہیں" شاہجہاں فن خطاطی میں ایسا کمال رکھتا تھا کہ اُسے پیغمبر خطاطی کہا جاتا ہے اور اسی لیے اس کے کتب خانے کے مہتمم اکثر خوش نویس تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر بچپن ہی سے علما اور فضلا کی صحبت میں رہنے کا شائق تھا اور اسی زمانہ سے اس کو کتابیں جمع کرنے کا شوق ہو گیا تھا۔ وہ حکمرانی کے مشاغل کے باوجود کتب بینی کا والہانہ ذوق رکھتا تھا۔ عالم گیر کو علوم دینیہ سے فطری لگاؤ اور رغبت تھی۔ اس خاص رجحان اور دلچسپی نے شاہی کتب خانہ کی نوعیت بدل دی تھی اور عالمگیر کا کتبخانہ مذہبی کتابوں کے لیے مخصوص ہو گیا تھا جس کے لیے اطراف عالم سے کتابیں حاصل کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ کتبخانہ میں کتابوں کی تعداد معاصر تاریخوں میں نہیں ملتی لیکن اس کی وسعت کا اندازہ فتاوائے عالمگیر کی تالیف سے ہو سکتا ہے۔

فتاوائے عالمگیری اورنگ زیب کے عہد کا ایک فقہی کارنامہ ہے اس کی تدوین کے لیے علما اور فضلا کا ایک بورڈ مقرر کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب آٹھ سال میں مکمل ہوئی۔ اور اس پر لاکھوں روپیہ صرف ہوا۔ اس تالیف سے عالمگیر کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ فتاویٰ کا ہر صفحہ خود پڑھوا کر سنتا، اور حوالوں کا اصل کتابوں سے مقابلہ کرتا۔ اس سلسلہ میں حدیث و فقہ کی اَن گنت کتابوں سے استفادہ کیا گیا تھا اور یہ سب کتابیں شاہی کتب خانہ میں موجود تھیں۔ حقیقتاً عالم گیر کا کتب خانہ مذہبی علوم و فنون کے ذخیروں سے مالا مال تھا۔

عالم گیر مہمات کے دوران میں کتابوں کا خاص خیال رکھتا تھا اور نادر کتابوں کو فوراً اپنے کتب خانے میں منتقل کرا دیتا تھا۔ نواب حبیب الرحمان خاں شیروانی مرحوم کے کتب خانے میں مثنوی گرئے چوگاں کا ایک نسخہ موجود ہے جو عالم گیر نے فتح گولکنڈہ کے مال غنیمت میں حاصل کیا تھا۔

کتب خانوں کا نظام: شاہان مغلیہ نے اپنے کتب خانوں کے انتظام کے سلسلے میں ایک مخصوص محکمہ قائم کیا تھا جو مندرجہ ذیل عملہ پر مشتمل تھا۔

مہتمم، تحویلدار، کاتب، حاشیہ نگار، مصور، جلد ساز، وراق، محافظ۔

مہتمم: یہ عہدہ اپنی ذمہ داریوں کے اعتبار سے بہت اہم تھا۔ کتب خانے کے تمام عملہ کی نگرانی کی کتابوں کی فراہمی کا بندوبست اور ان کی نگہداشت، غرض جملہ امور کا انتظام مہتمم ہی کے سپرد تھا۔ موجودہ زمانہ میں جو فرائض لائبریرین کے ہیں تقریباً وہی کام دور مغلیہ میں مہتمم کے ذمہ تھا۔ بادشاہ کے حضور میں مطلوبہ کتابیں پیش کرنے کا شرف بھی مہتمم کو ہی حاصل تھا۔

تحویلدار: جب کوئی کتاب شاہی کتب خانہ میں داخل کی جاتی تو اس کو تحویلدار کے حوالہ کیا جاتا تھا۔ وہ اس کتاب

پر پہلے شاہی مہر لگاتا پھر اپنی مہر لگاتا۔ اور اس مہر کے نیچے تحویل کا سنہ لکھ کر اپنے دستخط کرتا تھا۔ کتاب کی ذمہ داری اسی کی ہوتی تھی۔ بعض اہم کتابوں کے سلسلہ میں یہ احتیاط برتی جاتی تھی کہ جب تحویلدار بدلا جاتا تو نئے تحویلدار کو اپنی تحویل میں لینے کی تاریخ درج کرنی پڑتی تھی۔ بعض کتابوں پر ایک ہی بادشاہ کے عہد میں مختلف تحویلداروں کے دستخط اور تحویل کی تاریخیں ملتی ہیں۔ غرض کتابوں کی حفاظت کے لیے بڑی کوشش کی جاتی تھی۔ عام طور پر کتابیں شاہی کتب خانے سے ضائع نہیں ہوتی تھیں لیکن پھر بھی تاریخ میں چند واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی کتب خانے بھی "کتاب چور" سے محفوظ نہ تھے۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ ہمایوں کا دیوان اکبر کے کتب خانے میں تھا لیکن وہاں سے ضائع ہوگیا۔

کتاب کی نوعیت اور اہمیت کے مطابق اس کے رکھنے کی تحویلدار کو ہدایت کی جاتی تھی۔ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ترکی دیوان کا ایک صفحہ موجود ہے جس پر جہانگیر نے داخل کتب خانہ کرنے کے حکم کے ساتھ ساتھ لکھا ہے: "خاصہ اول" یعنی اس کو اول درجہ کی کتابوں میں رکھا جائے۔

کاتب: مغلیہ دور میں کاتب کا اہتمام خاص طور سے کیا جاتا تھا۔ عہد مغلیہ سے قبل جو کتابیں لکھی گئیں وہ خط شکست میں تھیں۔ اس عہد سے پہلے کوئی کتاب خط نستعلیق میں نہیں ملتی۔ مغل بادشاہوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں نفاست، خوبصورتی، دلآویزی کا خیال تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کتابیں خط شکست کے بجائے خط نستعلیق میں لکھوائیں۔ بابر نے خود خط بابری ایجاد کیا۔ اکبر کے دربار میں بعض عالمگیر شہرت کے کاتب تھے جن کو زریں قلم معجز رقم وغیرہ کے خطابات دیے گئے تھے۔ جہانگیر نے خطاطی کی جس پیمانہ پر سرپرستی کی اس کا اندازہ معاصر تاریخوں اور خود اس کی تزک سے ہوتا ہے۔ شاہجہاں خوبصورتی اور حسن کا شیدائی تھا۔ اس کی اس فطری دلچسپی کا اظہار صرف تاج محل اور جامع مسجد ہی کی صورت میں نہیں ہوتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خطاطی اسی کے عہد میں درجۂ کمال کو پہونچی۔ خود شاہجہاں فن خطاطی کا ماہر تھا۔ عالمگیر نہایت باکمال کاتب تھا۔ اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن پاک کے نسخے اپنی پاکیزگی اور دلآویزی میں بے مثل ہیں۔ ان کے چند نمونے مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہیں جن کے دیکھنے سے عالمگیر کے خط کی پختگی، صفائی اور خوبصورتی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں بہادر شاہ ظفر، دارا شکوہ، الٰہی بخش کے بھی کچھ کتبے ہیں ان کے دیکھنے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شہزادوں کو یقیناً باقاعدہ خوش خطی کی مشق کرائی جاتی تھی۔ بہر حال شاہان مغلیہ کی سرپرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان میں کتابت کا فن بے حد ترقی کر گیا اور اس سے کتب خانوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ اس زمانہ کے ایک مشہور کاتب کا واقعہ تاریخی کتابوں میں ملتا ہے کہ جب کوئی سائل اس کاتب کے پاس جاتا اور سوال کرتا تو وہ کاتب اس شخص کو روپیہ یا پیسہ دینے کے بجائے کاغذ کے ایک پرزہ پر الف، ب لکھ کر دے دیا کرتا تھا۔ وہ سائل یہ حرف جس رئیس کے پاس لے جاتا وہ اس کو ضرور خرید لیتا۔

حاشیہ نگار: عہد مغلیہ میں کتابوں کو جب نستعلیق میں لکھنے کا رواج شروع ہوا تو ان کو نقش ونگار سے سجانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ جب شاہی توجہ اس طرف مبذول ہوئی تو یہ فن بھی ترقی کرنے لگا۔ کتابوں کے حاشیوں پر نقش ونگار بنائے جانے لگے۔ یہ رنگ سونے کے ورق مختلف جواہرات اور موتیوں سے بنائے جاتے تھے اور اس قدر پختہ ہوتے تھے کہ اگر ان پر پانی کی دھار بھی ڈالی جائے تو رنگ میں فرق نہ آتا تھا۔ بعض شاہی قرآن پاک کے نسخوں میں حاشیوں کی ترتیب اور رنگوں کی تقسیم حیرت انگیز ہے۔ موتی کو پیس کر اس کے پانی سے رکوع کے نشانات کو ظاہر کیا گیا ہے۔ پاروں کے ابتدائی حصوں کو زمرد وغیرہ کے رنگوں سے دلآویز بنایا گیا ہے۔ نواب حبیب الرحمان خاں شیروانی مرحوم نے اپنے کتب خانے کی فہرست میں ایسی کتابوں کو جو حاشیہ پر طلائی کام کے باعث امتیاز رکھتی ہیں "الذہبیات" کے عنوان سے ترتیب دیا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر سے حاشیہ مزین کرنے کا فن انحطاط پذیر ہونے لگا۔ اس کی

ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دربار کی سرپرستی جو حقیقتاً اس فن کی ترقی کا باعث ہوئی تھی اب ختم ہونے لگی تھی۔

مصور: کتابوں میں تصویر بنانے کا فن مغلیہ عہد میں انتہائی عروج پر پہونچ گیا تھا۔ مصوری کے نمونے عہد مغلیہ سے قبل بھی ملتے ہیں لیکن وہ تصویریں کتابوں پر کم اور دیواروں پر زیادہ بنائی جاتی تھیں۔ سلطان مسعود غزنوی کے محل میں ایسی تصویریں کثرت سے تھیں۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے تصویروں کو غیر شرعی سمجھ کر اپنے محل سے مٹوادیا تھا۔ غرض عہد مغلیہ سے پہلے مصوری کا فن پوری طرح ترقی نہ کر سکا تھا۔ شاہان مغلیہ نے مصوری کو بیحد ترقی دی۔ اس کی ترقی کی ابتدا بابر کے عہد سے ہوئی۔ اس نے اپنے تزک کو نہایت اعلا پیمانہ پر مصور کرایا۔ اکبر نے اپنے عہد میں سنسکرت کی بہت سی کتابوں کو مصور کرایا۔ سید علی تبریزی، وسونت، خواجہ عبدالصمد اور کیسو دربار اکبری کے مشہور مصور تھے۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اکبر کے دربار میں سو مصور ایسے تھے جو یکتائے فن تھے۔ بدایونی نے لکھا ہے کہ خواجہ عبدالصمد خشخاش کے ایک دانہ پر پوری قل ہو اللہ لکھ دیا کرتا تھا اور اس کا بیٹا شریف چاول کے ایک دانہ پر سپاہی کی تصویر معہ اس کے سامان حرب کے بنا دیتا تھا۔ جہانگیر خود بھی اعلا درجہ کا مصور تھا۔ ایک یورپین مورخ نے لکھا ہے کہ جہانگیر کے دربار میں ایسے مصور تھے جو یورپ کی بہترین تصویروں کی نقل نہایت کامیابی سے کر سکتے تھے۔ رو (ROE) جب ہندستان آیا تو اس نے جہانگیر کو ایک نہایت عمدہ تصویر پیش کی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کی متعدد کاپیاں رو کو دکھائی گئیں جو اس کی پیش کی ہوئی تصویر سے اس قدر ملتی جلتی تھیں کہ وہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا۔ جہانگیر کا ایک مشہور مصور منصور تھا جو جانوروں کی تصویر بنانے میں کمال رکھتا تھا۔ ابوالحسن انسانی تصویر غضب کی بناتا تھا۔ اس نے دربار جہانگیری کی ایک ایسی تصویر بنائی تھی کہ شہنشاہ نے اس کو جہانگیر نامہ کے سرورق پر لگانے کا حکم دیا تھا۔ تزک میں ایک مصور کا واقعہ لکھا ہے کہ اس نے ایک تصویر جہانگیر کی خدمت میں پیش کی۔ اس تصویر میں ایک عورت غسل سے فارغ ہو کر بیٹھی تھی اور ایک خادمہ اس کے پاؤں کے تلوؤں سے میل صاف کر رہی تھی۔ جہانگیر نے اس تصویر کو بہت پسند کیا اور پسندیدگی کی یہ وجہ بتائی کہ اس عورت کے چہرہ پر اس کیفیت کے پورے آثار ظاہر ہیں جو تلوؤں کو کھجاتے وقت محسوس ہوتی ہے۔ اس باریک تنقیدی نگاہ نے فن مصوری کو ترقی دی۔ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں "مثنوی حسینی" کا ایک مصور نسخہ ہے جس کی دیدہ زیب تصویریں یقیناً عہد مغلیہ ہی کے مصوروں کے کمال کی آئینہ دار ہیں۔

جلدساز: کا کام نئی کتابوں کی جلدیں باندھنا اور پرانی کتابوں کی مرمت کرنا ہوتا تھا۔ عام طور پر یہ جلدساز اپنے فن میں ماہر ہوتے تھے۔ مغلیہ عہد کی جو پرانی کتابیں ہم تک پہونچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جلدسازی کا فن بھی اس عہد میں کمال کو پہونچ گیا تھا اور آج کئی صدیاں گذر جانے کے بعد بھی وہ کتابیں اپنی آب و تاب اور دلآویزی میں بے نظیر ہیں۔ محمد امین خراسانی اکبری عہد کا مشہور جلدساز تھا۔ یہ اپنے فن میں بڑا کمال رکھتا تھا۔ جلدوں میں جو ابری کا کاغذ استعمال ہوتا ہے وہ اسی کی ایجاد ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں سید حامد علی صاحب نے جو کتابیں عنایت کی ہیں ان میں بعض جلدیں عہد مغلیہ کی جلدسازی کی بہترین شاہکار ہیں۔ نواب حبیب الرحمان خاں شیروانی مرحوم نے اپنے کتب خانے کی فہرست میں ان کتابوں کو جو جلدسازی کے اعتبار سے نادر ہیں ایک علاحدہ عنوان "المجلدات" کے ماتحت ترتیب دیا ہے۔

وراق: کتابوں کی ورق گردانی کرتا تھا اور یہ دیکھتا تھا کہ کتابوں میں کیڑا تو نہیں لگا اور سیلن کا اثر تو نہیں ہوگیا۔ عام طور پر کتابوں کے شروع میں لفظ "کبیکج" لکھ دیا جاتا تھا جو دیمک کے بادشاہ کا نام ہے اور یہ عقیدہ تھا کہ اس کے بعد کتابیں کیڑوں سے محفوظ ہو جائیں گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکثر کتابوں کے یہ الفاظ بھی کیڑوں نے کھالیے۔ بہرحال کتابوں کو موسم اور کیڑوں سے محفوظ رکھنے کی پوری

کوشش کی جاتی تھی۔ نیم کی پتیاں سکھا کر کتابوں کے اندر رکھنا وراق کا کام تھا۔ ہرن کی چربی سے ہلکے ورق بنا کر کتابوں کے درمیان رکھے جاتے تھے اس کے بنانے کے لیے مخصوص لوگ ہوتے تھے اور یہ بھی ایک علاحدہ فن تھا جو مغلوں کے ذوق کا آئینہ دار تھا۔

محافظ: شاہی کتب خانوں کی حفاظت کے لیے ایک محافظ ہوتا تھا جس کا یہ کام تھا کہ کتب خانہ کے رقبہ کی نگرانی کرے تاکہ وہاں کوئی غیر معمولی حادثہ پیش نہ آئے۔

کتب خانوں کی بربادی

عالمگیر کے مرتے ہی سلطنت مغلیہ کا انحطاط شروع ہوگیا۔ کمزور جانشینوں میں تیموری سلطنت کے وسیع نظام کو قائم رکھنے کی طاقت اور صلاحیت نہ تھی۔ گو ان کو علم و ادب سے ذاتی لگاؤ تھا اور کتب خانے بھی کسی نہ کسی صورت سے قائم رہے لیکن جب سلطنت میں ضعف آگیا اور قوم کی زندہ قوتیں مردہ ہوگئیں تو قدرتی طور پر وہ علمی سرگرمیاں باقی نہ رہیں جو اکبر و جہانگیر کے عہد کی خصوصیات تھیں۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کو روکنے کے لیے ایک ہمہ گیر قوت درکار تھی لیکن مالا ٹوٹ چکی تھی اور دانے بکھر گئے تھے۔

طوائف الملوکی اور سیاسی انتشار غالب آچکا تھا اور عیش پرستی کا یہ حال ہوگیا تھا کہ حملہ آوروں کے نقل و حرکت کی خبر پا کر بزم عیش و طرب منعقد ہو جاتی تھی۔ ایسے ماحول میں علم و ادب کی کوششیں کیونکر بار آور ہوتیں اور کتبخانوں کا نظام کیسے فروغ پاتا۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ کتب خانوں کا شیرازہ بھی منتشر ہوگیا اور رفتہ رفتہ یہ نیست و نابود ہو گئے۔

شاہان مغلیہ کے کتب خانوں کی بربادی کی داستان عبرت انگیز ہے۔ ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ نے دہلی میں لوٹ مار کی تو کوہ نور کے ساتھ ہندستان کی معنوی دولت یعنی شاہان مغلیہ کے کتب خانوں کے بہترین نوادر بھی اپنے ساتھ ایران لے گیا اور کچھ عرصہ بعد یہ کتابیں ایران کے بازاروں میں کوڑیوں کے مول بکیں۔ جو کتب خانے باقی رہ گئے وہ مرہٹوں اور جاٹوں کی پیہم شورش اور لوٹ مار کے باعث منتشر ہو گئے اور ان کا بڑا حصہ اودھ منتقل کر دیا گیا، لیکن انقلاب زمانہ نے ان کو وہاں بھی محفوظ نہ رہنے دیا اور ایک مشہور عالم نے لکھنؤ کے بازاروں میں کتابوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے دیکھے جن پر سے لوگ جوتوں سمیت گزر رہے تھے اور وہ کتابیں ردی کے بھاؤ بک رہی تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں دہلی کے کتب خانے جس طرح سے برباد ہوئے اور یہ علمی خزانے جس طرح لوٹے گئے اس کا حال شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خاں کی زبانی سنیئے:

"بارہ بجے کے بعد سے کتب خانے لٹنے شروع ہوئے لیٹرے عربی، فارسی اور اردو وغیرہ کی کتابیں گٹھر باندھ کر کتب فروشوں اور مولویوں اور طالب علموں کے پاس بیچنے کے لیے لے گئے۔ بعض طلبا کتابوں کے شوقین بھی اس لوٹ میں خود شریک ہو کر اچھی اچھی کتابیں چھانٹ کر لے گئے۔ لوگوں نے کتابوں کے شیرازے توڑ کر ان کے پھٹے آتار لیے کہ جلد سازوں کے ہاتھ وہ بیچیں گے۔ باقی کتابوں کے ورقوں کو پھاڑ کر پراگندہ کر کے کالج کے باغ اور احاطہ میں کئی اینچ موٹا فرش ردی کا بچھا دیا۔ غرض کالج میں سوائے کاغذی ردیوں کے ...... کچھ اور نہ تھا۔"

اس خونی ہنگامہ کے بعد اگر ایک طرف ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا تو دوسری طرف کتب خانوں کو تباہ و برباد کر کے ذہنی انحطاط اور پستی کی بنیاد ڈال دی گئی۔ ہمارے کتب خانے لٹے اور ہمارے اسلاف کے خون جگر سے یورپ کے کتب خانوں کو زینت دی گئی۔ اس منظر سے متاثر ہو کر علامہ اقبالؒ نے بے اختیار کہا تھا ؎

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

انجمن ترقی اردو بہار

انجمن ترقی اردو بہار کا قیام ۱۹۱۹ میں ہوا۔ اس کے پہلے صدر شاد عظیم آبادی تھے۔ اس وقت سے انجمن مسلسل بہار میں اردو زبان اور ادب کے تحفظ و ترقی کے لیے ہمہ جہتی کوشش کر رہی ہے۔ اس وقت اس کے ابتدائی ممبروں کی تعداد ڈھائی لاکھ سے زیادہ ہے۔ اس کی شاخیں ریاست کے اضلاع، قصبات اور دیہاتوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ سب ڈویزنل ہیڈ کوارٹر میں باضابطہ مرکزی دفتر کے زیر نگرانی علاقائی دفاتر کام کر رہے ہیں۔ ریاست کے تمام طبقوں، حلقوں اور علاقوں کے نمائندہ ترین افراد انجمن کے ساتھ وابستہ ہیں اور اپنی اپنی جگہ انجمن کے مختلف عہدوں پر فائز ہیں۔ انجمن کا ادبی شعبہ حلقۂ ادب، بہار ریاست کی سب سے فعال ادبی تنظیم ہے۔ انجمن کے تحت ریاست گیر پیمانے پر ایک نمائندہ اقلیتی تعلیمی بورڈ کا قیام بھی عمل میں آچکا ہے۔

۱۹۵۱ سے انجمن بہار میں اردو کو اس کا جائز قانونی مقام دلانے کی تحریک عوامی و جمہوری سطح پر چلاتی رہی ہے۔ ۱۹۶۱ سے انجمن نے بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کر رکھا تھا۔ اب انجمن ہی کے مطالبے کی تکمیل کرتے ہوئے حکومت بہار نے سرکاری زبان کے ترمیمی ایکٹ ۱۹۸۰ء کے ذریعہ اردو کو تمام ضروری کاموں کے لیے قانوناً پوری ریاست میں ہندی کے ساتھ دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دے دی ہے۔ اس قانون کے عمل درآمد کے پہلے مرحلے میں ۱۵ ضلعوں میں اردو کے سرکاری استعمال کے لیے ضلع کے صدر مقام سے بلاکوں تک باضابطہ احکام جاری کر دیے گئے ہیں۔

یہ انجمن ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ۱۹۸۱ کی مردم شماری میں اردو آبادی کی تعداد ۱۹۷۱ کی بہ نسبت تین گنا زیادہ — اضلاع میں دس فیصد سے زائد درج کی گئی۔ اس کے علاوہ ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی سطحوں پر اردو میں اور اردو کے ذریعۂ تعلیم کی تمام ضروری سہولتیں دے دی گئی ہیں۔ ساتھ ہی مدرسہ بورڈ کی کئی ڈگریوں کو اسکول اور کالج کی ڈگریوں کے برابر تسلیم کر لیا گیا ہے۔

حکومت بہار نے انجمن ترقی اردو بہار کو سالانہ ایک لاکھ کی گرانٹ اور ریاست کی تمام یونیورسٹیوں کی سینیٹ میں نمائندگی دے دی ہے۔ اردو اکاڈمی اور لسانی و مذہبی اقلیتی کمیشن میں بھی انجمن کی نمائندگی ہے۔

انیس اعظمی

اردو کتابوں کی اشاعت اور تقسیم کے مسائل



اردو ہندستان کے آئین میں تسلیم شدہ چودہ قومی زبانوں میں سے ایک ہے دوسری ریاستی زبانوں کے مقابلے اردو ہندی کے زیادہ قریب ہے جو ہمارے ملک کی سرکاری قومی زبان ہے اور اس قربت کی وجہ سے اردو سب سے زیادہ نقصان میں رہی ہے آزادی کے فوراً بعد ان تمام علاقوں کو جہاں کی زبان ہندی کے ساتھ ساتھ اردو بھی تھی ہندی کا علاقہ قرار دے دیا گیا یہ علاقے ہیں۔ دلی، اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، پنجاب، ہماچل پردیش، ہریانہ اور راجستھان، اس کے علاوہ چار اور ریاستیں جہاں اردو بولنے والوں کی خاصی تعداد موجود ہے وہ ہیں مغربی بنگال، آندھرا پردیش، کرناٹک اور مہاراشٹر، ان حالات نے اردو اور ہندی کا جھگڑا کھڑا کر دیا جبکہ یہ جھگڑا دوسری ریاستی زبانوں کے ساتھ قطعی نہیں ہے ان علاقوں میں دن بہ دن ہندی کو فروغ حاصل ہوتا رہا جبکہ اردو کو انجانے میں یا جان بوجھ کر نقصان پہنچایا جاتا رہا آزادی کے فوراً بعد اسکولوں میں جو مقام اردو کو حاصل تھا وہ ہندی کو مل گیا۔ اسکولوں میں اردو مدرس کی تعداد راتوں رات گھٹ گئی۔ اب بیشتر جگہوں پر ذریعۂ تعلیم اردو نہیں ہندی ہے۔ اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ اردو جاننے والوں کی تعداد کس قدر تیزی سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ ملک کی آزادی کے پندرہ سال بعد اسکولوں سے جو نئی پود نکلی وہ اردو سے نابلد تھی۔ بہت کم ایسے اسکول ہیں جہاں آزادی کے بعد اردو ذریعۂ تعلیم ہے اور ایسے اسکولوں میں صرف وہی والدین اپنے بچوں کو بھیجتے تھے جو اس بات پر سنجیدگی سے غور کرتے تھے کہ بغیر اس زبان کو پڑھے ان کے بچے اپنی تہذیب اور مذہب کو نہیں سمجھ سکیں گے۔

اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں کمی واقع ہونے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اردو کے تمام اشاعتی ادارے اس صورتِ حال سے بری طرح متاثر ہوئے اردو کتابوں کی صنعت کی ترقی کی راہ میں اس صورت حال سے جو رکاوٹیں پیدا ہوئیں ان کی مندرجہ ذیل وجوہات سامنے آتی ہیں۔

۱۔ ایسے بہت اسکولوں میں جہاں اردو پہلے ذریعۂ تعلیم تھی وہاں آزادی کے بعد ہندی ذریعۂ تعلیم ہوگئی۔

۲۔ نئی نسل اردو زبان و ادب سے رفتہ رفتہ ناواقف ہوتی گئی۔

۳۔ اردو جاننے والوں کی اقتصادی حالت چونکہ عام طور پر کمزور ہے اس لیے کتابوں کے سلسلہ میں ان کی قوت خریداری پر بھی برا اثر پڑا۔

۴۔ اردو طباعت کا معیار دوسری زبانوں کے مقابلے میں خراب ہے اردو کتابوں میں وہ حسن نہیں ہے۔ جو انگریزی یا اور دوسری کتابوں میں ہوتا ہے۔

۵۔ اردو کے رسائل اور اخبارات کا معیار بھی عام طور پر اتنا پست رہا ہے کہ وہ پڑھنے والوں کے لیے مشکل ہی سے باعث کشش ہوتے ہیں۔

۶۔ عام طور پر اردو کی کسی کتاب کی اشاعت ایک ہزار سے کم ہی ہوتی ہے زیادہ تر پہلے اڈیشن کی تعداد پانچ سو ہی ہوتی ہے۔

۷۔ کتاب کم تعداد میں چھپنے کی وجہ سے اس پر لاگت بھی زیادہ آتی ہے

۸۔ اردو میں اس طرح کے رسائل اور کتابیں شائع کرنے کا کوئی رواج نہیں ہے۔ —— جن سے نئی شائع ہونے والی کتابوں کے بارے میں کتب فروشوں، کتابوں کی تجارت سے متعلق دوسرے لوگوں اور عام پبلک کو کوئی معلومات حاصل ہو سکے

۹۔ اردو کے ناشرین اپنی کتابوں کے اشتہار کی پروا شاید ہی کرتے ہوں

۱۰۔ کتابوں پر جو تبصرے شائع بھی ہوتے ہیں وہ کتابوں کی فروخت کے نقطۂ نظر سے زیادہ کارآمد اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتے

۱۱۔ اردو کتابوں کے ناشرین اور کتب فروشوں کے درمیان یا تو رابطہ سرے ہی سے نہیں اور اگر ہے بھی تو برائے نام۔

۱۲۔ اردو کتب فروشوں تقسیم کاروں یا ناشروں کی کوئی پیشہ ورانہ تنظیم یا ایسوسی ایشن نہیں ہے جبکہ دوسری زبانوں میں ہے۔

۱۳۔ اردو کے ناشر اپنی کتابوں کی کوئی باقاعدہ فہرست کتب شائع کرنے پر کوئی توجہ نہیں دیتے اور اس طرح کی فہرستوں کا کوئی معیار بھی نہیں ہے جو فہرستیں شائع ہوتی بھی ہیں وہ زیادہ موثر نہیں ہوتیں۔ اس طرح کی تمام فہرستیں مصنفین کے نام کی بجائے کتابوں کے عنوان کے تحت شائع ہوتی ہیں۔ بہت کم ہی ایسی فہرستیں ہیں جن میں کتابوں کے موضوعات اور مصنفین کا کوئی اشاریہ شائع ہوا ہو۔

۱۴۔ اردو کتابوں کی صنعت میں آرڈر فارم، ایڈوانس کاپی بروشر جیکٹ جیسے ذرائع اشتہار سے لوگ ابھی ناواقف ہیں۔

۱۵۔ اردو کتابی صنعت کتابوں کی پیداوار ان کی فروخت تقسیم کاری تشہیر یا حسابات کے سلسلے میں جدید طریقۂ کار سے استفادے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتی، کتابوں کی فروخت کے متعلق بہت ہی معتبر ادارے ایسے ہیں جو اپنا تجارتی کھاتہ (ACCOUNT) باقاعدہ رکھتے ہوں۔

۱۶۔ نئی کتابوں کے متعلق شائع ہونے والے پیشگی پبلسٹی پمفلٹ جو بالکل ابتدائی نوعیت کی چیز ہے ابھی اردو کتابی صنعت کے افق پر نمودار نہیں ہوئے ہیں۔

۱۷۔ بہت سی لائبریریاں اردو کتابوں کی خرید کے لیے بہت ہی ناکافی فنڈ مخصوص کرتی ہیں۔

۱۸۔ کتابوں کی دکانیں یا ان کی مارکیٹ زیادہ تر شہر کے ایک مخصوص علاقے تک محدود رہتی ہیں۔

۱۹۔ اردو کتابوں کی دکانوں میں کتابوں کی نمائش (DISPLAY) کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ عام طور پر کتابیں بے ترتیبی سے ادھر ادھر کی شکل میں پڑی پائی جاتی ہیں۔

۲۰۔ ان تمام حالات نے مل کر ایک ایسی صورت حال پیدا کردی ہے کہ اردو کی کتابیں خریداروں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر پاتیں کیونکہ نسبتاً ایک طرف تو ان کی اشاعت کا معیار گرا ہوا ہے۔ اور دوسری طرف اسی اعتبار سے ان کی قیمتیں بھی زیادہ ہیں۔

یہ وہ حقائق ہیں جن کی وجہ سے کتابوں کی مارکیٹ میں اردو کتابی صنعت کا حصہ بہت کم ہے۔ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۸ء کے دوران ملک میں مجموعی طور پر جتنی کتابیں شائع ہوئی تھیں ان میں اردو کتابوں کی شرح صرف ۱۷ء۱ فیصد تھی۔

اردو کتابی صنعت کا سب سے بڑا مسئلہ کتابت ہے جو نہ صرف گراں ہے بلکہ دیر طلب بھی ہے اشاعت کے میدان میں ہر ممکن ترقی کے باوجود اردو کتابوں کی اشاعت کا لگ بھگ تمام تر دارومدار کتابت پر ہے اردو ٹائپ آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا مثال کے طور پر دہلی میں ایک ہی پریس ایسا ہے جس کے پاس اردو ٹائپ ہے۔ لیکن یہ ٹائپ بھی اتنا پرانا ہے کہ صاف ستھری اور تیز رفتار ٹائپ چھپائی کا متحمل نہیں ہوسکتا چنانچہ دہلی کے کسی بھی ناشر کے ذہن میں اس سے استفادے کا خیال پیدا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں خوش نویسی اردو دنیا میں اس قدر مقبول ہے کہ اس کی وجہ سے نستعلیق کے خوشنما حروف کے مقابلے میں ٹائپ کو آج تک مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی ہے۔ اردو کا عام قاری کتابت شدہ مواد کو ٹائپ کے مقابلہ میں زیادہ آسانی اور تیزی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ اردو ٹائپ کے اس قدر غیر مقبول ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس کی ترقی پر سنجیدگی کے ساتھ کوئی توجہ نہیں دی گئی، بہ الفاظ دیگر اردو کا اپنا کوئی ٹائپ نہیں ہے۔ ہم عربی کے ٹائپ ہی کو کچھ ترمیم کے ساتھ اردو کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اردو کی ۹۰ فیصد کتابیں لیتھو کے ذریعہ چھپتی ہیں لیتھو مشینوں کے نتائج تسلی بخش نہیں چونکہ یہ مشینیں بہت پرانی ہو چکی ہیں ۱۹۴۷ء کے بعد سے آج تک ملک میں کوئی لیتھو مشین درآمد نہیں کی گئی ہے چونکہ حکومت نے ان مشینوں کی درآمد پر پابندی لگا رکھی ہے اردو کی بقیہ دس فیصد کتابیں یا تو آفسیٹ کے ذریعہ چھپتی ہیں یا ڈائرکٹ ڈائپ طریقے سے لیکن ڈائرکٹ ڈائپ اور آفسیٹ کو بھی کتابت سے مفر نہیں ہے۔

کتابوں کی تقسیم:

اردو کتابی صنعت میں تقسیم کاری کا نظام قطعی جدید طرز کا نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے ناشر کتابوں کی تقسیم کے جدید تصورات اور تکنیک سے بالکل ناواقف ہیں۔ زیادہ تر ناشرین اپنا کاروبار سیل ڈپو کے ذریعہ ہی چلاتے ہیں یعنی یہ کہ ایک ناشر نہ صرف محض ناشر ہے بلکہ وہ ایک ساتھ تھوک فروش خردہ فروش اور اس کے علاوہ بھی سب کچھ ہے۔ ایک اشاعتی ادارہ

ایک ہی وقت میں کسی دوسرے اشاعتی ادارہ کا تقسیم کار بھی ہوتا ہے اردو کے ناشرین نہ کاروبار کے اصول سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ان مسلمہ قاعدوں اور شرائط و ضوابط کے پابند نظر آتے ہیں جو انگریزی کتابوں کی صنعت میں رائج ہیں مثال کے طور پر اگر کسی شہر میں کسی ناشر کا کوئی تھوک تقسیم کار ہے تو اس کے باوجود وہ اسی شہر سے براہِ راست خریداری اور نجی خریداروں سے بھی کاروبار کرتا رہتا ہے۔ اس صورت حال کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ شاید خود تھوک فروش تقسیم کار اپنے کاروباری حقوق سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ ناشر کی اس طرح کی کارروائی پر کوئی اعتراض بھی نہیں کرتا اس بات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فی الحال اردو کتابوں کی تقسیم کا انتظام کتنا بے قاعدہ بے ربط اور پسماندہ ہے کتابوں کی تقسیم — کی ہر سطح پر ناشر کی جانب سے براہِ راست کاروبار کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو کتابوں کی تجارت میں چھوٹے کتب فروشوں کو کچھ بھی نہیں ملتا۔

اردو ناشر براہ راست لائبریریوں کو بھی کتابیں فراہم کر دیتے ہیں تقسیم کاری کے نظام میں، اس بدنظمی کی انتہا یہ ہے کہ ناشرین انفرادی خریداروں اور لائبریریوں کو ایک ایک جلد کا آرڈر سپلائی کرنے میں نہیں ہچکچاتے۔

اردو کتابوں کی تقسیم کاری کے نظام میں کوئی تنظیم نہیں ہے اردو کتابوں کے نام نہاد نظام تقسیم DISTRIBUTION SYSTEM کی کوئی تجارتی بنیاد نہیں ہے۔ مثال کے طور پر تقسیم کے نظام میں — CREDIT CONTROL POLICY کے سلسلے میں HORIZONTAL اور VERTICAL اقدامات جیسی چیزوں سے اردو کتابی صنعت قطعاً ناواقف ہے۔ اردو میں صرف ایک ہی اشاعتی ادارہ ایسا ہے "شعور" جو اس (DISTRIBUTION SYSTEM) سے واقف نظر آتا ہے۔ کیونکہ یہ ادارہ اپنی تمام کتابیں صرف دو تقسیم کاروں — کے ذریعہ فروخت کرتا ہے۔

> اول شب وہ بزم کی رونق شمع بھی تھی پروانہ بھی
> رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی
>
> (آرزو لکھنوی)

نسیم اختر شاہ قیصر

دیوبند کی اشاعتی سرگرمیاں

۱۸۶۶ء میں دارالعلوم کے قائم ہونے کے بعد دیوبند کی زندگی میں جو علمی، دینی، سیاسی، انقلاب پیدا ہوا اس کو ہم مختصر طور پر تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں یہاں اس بات کا ذکر کردینا ضروری ہے کہ دارالعلوم میں پڑھایا جانے والا نصاب ان کتابوں پر مشتمل ہے جن کی زبان اوّل تا آخر عربی ہے مگر درس و تدریس، افہام و تفہیم اور حل مطالب کے لیے یہاں ہمیشہ اردو زبان استعمال کی گئی، اور حصولِ علم کی خاطر ہمیشہ اردو زبان ہی سے کام لیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان میں جو لاتعداد کتابیں دیوبند سے اب تک منظرِ عام پر آئی ہیں وہ اسی دارالعلوم کا طفیل ہیں۔

دورِ اوّل تصنیفات و تالیفات

قیامِ دارالعلوم سے لے کر آج تک اکابر دارالعلوم کی ہزاروں لاکھوں کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں، اور سو سال سے زائد عرصہ میں اتنا بڑا علمی، دینی، ادبی ذخیرہ پیش کیا گیا ہے کہ جس کا احاطہ ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ دارالعلوم کی جانب سے پیش کیا گیا یہ لٹریچر اور اکابر دارالعلوم کی تصانیف ان موضوعات کا احاطہ کیے ہوتے ہیں، جو وقت اور زمانے کے اعتبار سے پیدا ہوتے رہے یا جن کی ضرورت، حالات اور واقعات کے اعتبار سے محسوس کی جاتی رہی۔ جب بھی اسلام مخالف تحریکوں نے سر اٹھایا یا اسلامی تعلیمات پر اعتراض کرنے والوں کی کوئی جماعت، سامنے آئی اکابر دارالعلوم نے ان کا جواب دیا۔ سلسلہ ماضی میں بھی جاری تھا، آج بھی جاری ہے، اور یہ کام اسی تندہی، دلچسپی اور توانائی کے ساتھ انجام دیا جارہا ہے۔ کتابوں کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ اس کے تعارف، اس کے مصنف کے حالات، اس کے موضوع پر اس مختصر مضمون میں قلم نہیں اٹھایا جاسکتا۔ ہم اس سمندرِ علم میں سے ان چند گوہرِ نایاب کے نام اور مصنفین کی نشاندہی کر رہے ہیں جنہیں آج بھی علمی حلقوں میں اہمیت و عظمت حاصل ہے اور جن کی بنیاد پر آج بھی علمی دنیا ایک کام انجام دے رہی ہے:

'جہادِ اکبر' (حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ)، 'اسرارِ قرآنی' (مولانا قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند) — 'براہینِ قاطعہ' (مولانا رشید احمد گنگوہیؒ) — 'ترجمہ قرآن مجید' (مولانا محمود الحسن صاحبؒ) — 'الابواب والتراجم' (مولانا محمود الحسن صاحبؒ) — 'ترجمہ قرآن مجید' (مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ) — 'ترجمہ قرآن مجید کشمیری' (مولانا محمد یوسف شاہ کشمیریؒ) — 'حواشی قرآن مجید ترجمہ شیخ الہندؒ' (مولانا شبیر احمد عثمانیؒ) — 'تفسیر بیان القرآن' (۱۲ جلدیں) (مولانا اشرف علی تھانویؒ) — 'تفسیر ثنائی' (مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ) — 'دینی دعوت کے قرآنی اصول' (مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ) — 'فہم قرآن' (مولانا سعید احمد اکبرآبادی) — 'ترجمہ صحیح بخاری' (مولانا شبیر احمد عثمانیؒ) — 'الکوکب الدری' (مولانا رشید احمد گنگوہیؒ) — 'معارف الحدیث' (مولانا منظور نعمانی صاحب) 'تعلیم الاسلام' (مولانا مفتی کفایت اللہؒ) — 'نقشِ حیات' (دو جلد خود نوشت سوانح شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ) — 'اسلام کا نظامِ تعلیم و تربیت' (مولانا مناظر احسن گیلانیؒ) — 'اسلام اور مغربی تہذیب' (مولانا قاری محمد طیب صاحب) — 'نقشِ دوام' (مولانا سید انظر شاہ کشمیری) — 'حیاتِ انور' (مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر)، — 'یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ' (مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر) — 'سفرنامہ مصر و حجاز' (مولانا منت اللہ

عثمانی ... مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی)۔
... سے چند نمونے ہیں
جو اپنے موضوعات زبان و بیان ... وسیع اور ٹھوس مواد کی وجہ سے سالوں گذر جانے کے بعد ... ترو تازہ ہیں۔

دیوبند کے مجلات و جرائد

۱۳۲۱ھ ... دارالعلوم دیوبند میں آخری جلسہ دستار بندی ہوا، اس کے بعد کوئی جلسہ دستار بندی نہ ہوسکا۔ ۱۹۱۰ء میں پھر جلسہ دستار بندی عظیم الشان طریقہ پر منعقد ہوا۔ اس موقع پر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ علمائے دیوبند کے علوم و معارف اور مضامین کو مسلمانوں تک پہنچانے کے لیے ماہوار مجلہ کا اجرا عمل میں آئے چنانچہ اسی سال بانی دارالعلوم مولانا قاسم نانوتویؒ کی نسبت سے "القاسم" کا اجرا ہوا جس کے ادارہ تحریر سے مختلف حضرات وابستہ رہے:

ماہنامہ "القاسم" مدیران:— مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ۔ ادارۂ تحریر سے وابستہ اراکین مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا محمد طاہر مرحوم، مولانا عتیق احمد صدیقی مرحوم۔

۱۳۳۲ھ میں ماہنامہ "الرشید" کا اجرا عمل میں آیا جس کی مجلس ادارت سے وابستہ ہے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، اور مولانا عتیق احمد صدیقی مرحوم۔

۱۳۴۵ھ میں "الانصار" منظر عام پر آیا۔ جو مولانا طاہر قاسمی اور مولانا عتیق احمد صدیقی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔

۱۳۶۰ھ میں "دارالعلوم" کے نام سے پرچہ نکالا گیا جو آج تک پابندئ وقت کے ساتھ سے شائع ہو رہا ہے ———

——— اور اس عرصہ میں مولانا عبدالوحید صدیقی مرحوم، قاضی خلیق احمد صدیقی مرحوم، مولانا عبدالحفیظ بلیاوی مرحوم، اور مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر ایڈیٹر رہے، مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر ۱۹۵۱ء سے تاحال اس کے مدیر ہیں موصوف کی ادارت میں جو چند رسائل و اخبار ماضی میں نکلے ان کے نام یہ ہیں اخبار "استقلال" دیوبند، اخبار "انور" دیوبند، رسالہ "خالد" دیوبند، اخبار اجتماع، سہارنپور، وغیرہ۔

عربی زبان کی اہمیت ——— کی بنیاد پر اکابر دارالعلوم نے ایک ماہنامہ "دعوۃ الحق" کے نام سے مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کی ادارت میں شائع کیا، اور فی الحال پندرہ روزہ "الداعی" مولانا بدرالحسن صاحب دربھنگوی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اس اخبار کی اپنی ایک آواز ہے۔

ان کے علاوہ دیوبند سے جو علمی، دینی، سیاسی، ادبی پرچے منصۂ شہود پر آئے، ان میں حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کا مشہور و معروف جماعتی ترجمان "مہاجر" آج بھی لوگوں کے ذہن میں محفوظ ہے اور جس کی ادارت کے فرائض اپنے وقت کے جواں سال اور جواں قلم انشا پرداز مولانا حامد الانصاری غازی مولانا عبدالوحید صدیقی غازی پوری وغیرہ نے انجام دیے۔ ماضی کے دیگر پرچوں میں "نقش" مدیر مولانا سید انظر شاہ کشمیری رسالہ "قاسم العلوم" مولانا عتیق احمد صدیقی مرحوم، رسالہ "المحمود" مدیر مولانا محمد یحییٰ تھانوی مرحوم، رسالہ "تجلی" مدیر مولانا عامر عثمانی مرحوم، اخبار "میثاق" مدیر مولانا محمد سالم قاسمی، رسالہ "مشرب" مدیر مشہود اقبال عثمانی، رسالہ "ہادی" مدیر مولانا مسعود احمد قاسمی، اخبار "دیوبند کی آواز" مدیر جناب وصی الزماں صاحب، اخبار "دیوبند ایکسپریس"، مدیر جناب حامد تحسین صاحب وغیرہ وہ اخبار و رسائل ہیں جو اپنے وقت اور اپنے دور میں مستند اور معتبر ترین اخبار و رسائل مانے جاتے تھے۔

تیسرا دور- موجودہ اخبار و رسائل اور کتابی خدمات

ہندوستان کی تاریخ کے ہر ہر صفحہ پر دیوبند کی خدمات کی چھاپ اس قدر گہری ہے جس کو مٹایا نہیں جا سکتا، دیوبند آج بھی علمی، دینی، ادبی خدمات کا ایک عظیم ترین مرکز ہے، یہاں آج بھی رسالہ "دارالعلوم" پندرہ روزہ "اشاعت حق"، پندرہ روزہ "یثرب" پندرہ روزہ "دیوبند ٹائمز" ——— پندرہ روزہ "چراغ حرم" رسالہ "الایمان" پندرہ روزہ

"الداعی" پندرہ روزہ "قومی منشور" ہفتہ وار "اجتماع" "ماہنامہ "توحید" وہ پرچے ہیں، جن سے ادبی اور علمی پیاسوں کو زندگی مل رہی ہے۔ آج بھی علمی مجلسیں جمتی ہیں، علمی مباحثے ہوتے ہیں، ادبی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ آج دیوبند کے علمی بازار میں بے شمار ایسا اشاعتی ادارے ہیں، جو سالہا سال سے علمی دینی کتابیں لاکھوں، ہزاروں کی تعداد میں پیش کرچکے ہیں، اور کررہے ہیں۔ دیوبند کتابی دنیا کی ایک ایسی منڈی ہے جہاں ہر طرح کے علمی ذوق رکھنے والے آدمی کی تسکین کا سامان موجود ہے جو ادارے آج بھی سرگرم ہیں، اور ہندستان اور غیر ممالک سے باہر مشہور و مقبول ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں۔

کتب خانہ رحیمیہ:۔ دیوبند کا انتہائی قدیم مرکز ہے جس کی جانب سے وقیع اور معلوماتی کتابیں شائع ہوچکی ہیں خاص طور پر مدارس اسلامیہ میں پڑھائے جانے والے نصاب کی تمام کتابیں بخاری شریف، ترمذی شریف، مسلم شریف، مشکوٰۃ شریف وغیرہ عظیم اور ضخیم کتابیں شائع کرنے کا اعزاز اسی ادارے کو حاصل ہے۔ اس کی مطبوعات اپنی نفیس کتابت اور عمدہ طباعت کی بناپر اہل علم میں مقبول و متعارف ہیں یہ قدیم کتب خانہ آج بھی اسی رنگ اور اہتمام سے علمی خدمات انجام دینے میں مصروف ہے

کتب خانہ اعزازیہ:۔ اپنے وقت کے جید علماء کی سرپرستی میں قائم ہوا اور چند سالوں کے اندر ہی کتابی دنیا میں وہ مقام پیدا کرگیا، جس تک پہونچنے کے لیے ایک مدت درکار ہوتی ہے، نفحۃ العرب، لامیۃ المعجزات وغیرہ وہ اہم ترین کتابیں ہیں جن کے نامعلوم کتنے ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں یہ ادارہ اپنی کثیر مطبوعات رکھتا ہے، اور ملک کے گوشے گوشے میں اس کے جاننے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔

کتب خانہ امدادیہ:۔ مختلف موضوعات پر بہت سی بلند پایہ کتابیں شائع کرچکا ہے۔ تجارتی اعتبار سے کافی مقبولیت اور کامیابی حاصل ہے۔ آج بھی علم کی چوٹیوں کو سر کرنے میں مصروف ہے، احسن المسائل، کنز الدقائق، اصول الشاشی وغیرہ۔

مقبول عام کتابیں ہیں۔

مکتبہ تجلی:۔ مشہور انشاء پرداز مولانا عامر عثمانی مرحوم کا قائم کردہ یہ ادارہ گذشتہ بیس پچیس سال سے اہل علم کے ذوق کا سامان فراہم کررہا ہے متعدد تصانیف کے علاوہ "مسجد سے میخانے تک" وہ مقبول کتاب ہے جس کے بہت سے ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں، اور جس کی تازگی آج بھی اسی طرح برقرار ہے۔

ادارہ انوریہ:۔ ایک قدیم اور معتبر ترین ادارہ ہے جس نے بہت سی کتابیں پیش کی ہیں جن میں، حیات انور، یاد گار زمانہ ہیں یہ لوگ، اسلام کا منظر، اور مشہور زمانہ کتاب "طبقات ابن سعد" وغیرہ کو زبردست مقبولیت حاصل ہے مستقبل میں اس کی آنے والی مطبوعات خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

ملک پبلشرز:۔ دیوبند کے بڑے کتابی اداروں کا مشترکہ قائم کردہ وہ ادارہ ہے جس نے نہایت شاندار اور خوبصورت انداز میں کافی کتابیں علمی دنیا تک پہنچائی ہیں ان میں قابل ذکر تعبیر اردو یا، غنیۃ الطالبین اور "مسند امام اعظم" ہیں جن کی اہمیت کا اندازہ اور مانگ کا تصور اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کتابوں کے کافی ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

مکتبہ فیض القرآن:۔ بخاری شریف جیسی عظیم الشان کتاب کی ایک بہترین شرح "تفہیم البخاری" کے نام سے شائع کرچکا ہے۔ بخاری شریف اپنی علمی عظمت اور انفرادیت کی وجہ سے احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا زبردست اور مستند ذخیرہ ہے تو تفہیم البخاری اس کی کامیاب ترین شرح۔ بہت تھوڑی سی مدت میں اس ادارے نے بھی کافی کتابیں لوگوں تک پہنچائی ہیں۔

مکتبہ دینیہ:۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی یادگار میں قائم ہوا اور آگے چل کر علمی دنیا کی ایک معتبر ترین آواز بن گیا نقش حیات، تحریک ریشمی رومال، جیسی نہ بھلانے والی کتابیں پیش کرچکا ہے۔

عظیم بکڈپو: چند سال ہی ہوئے اس کی بنیاد پڑی مگر ان چند سالوں ہی میں کافی اہم اور مفید کتابیں پیش کرچکا ہے۔ "ہم مسلمان ہیں" (دو جلدوں میں) اور "عورت کیا کچھ کرسکتی ہے" وغیرہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ادارہ دعوت القرآن: تاریخ کے نایاب گوہروں اور نگاہوں سے اوجھل آبدار موتیوں کو سجا سنوار کر پیش کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔ "حیات الحیوان" اہل علم کیلیے وہ حسین اور دلچسپ ترین تحفہ ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے علاوہ مشہور کتاب "تاریخ طبری" بھی پیش کرنے کی سعادت اس ادارہ کو حاصل ہے۔ دیگر مطبوعات میں داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، اور صراطِ مستقیم وغیرہ ہیں۔

مکتبہ تھانوی: صرف کتابوں کی چھپائی ہی کو مقصد نہیں بنا رکھا ہے، بلکہ ان کے حسن کو دوبالا کرنے اور دیدہ زیب بنانے میں بھی کافی مہارت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ جواہر الفقہ اور تفسیر جلالین وغیرہ بیحد مقبول ہیں۔

کتب خانہ قاسمی: سیرت طیبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مکمل واقعات وحالات کا وہ مستند ترین تذکرہ ہے جس کو اس کتب خانے نے بڑے اہتمام کے ساتھ، اپنے قسط وار پروگرام میں پیش کیا ہے، اس کے علاوہ دیوان حضرت علیؓ، مترجم وغیرہ بلند پایہ کتابیں شائع کی ہیں۔

مکتبہ دانش: تصنیفات اور تالیفات کی دنیا میں گو نئی آواز ہے مگر وہ زبردست مطبوعات منظرِ عام پر آئی ہیں، جن کا تصور اتنی جلد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ "مدارج النبوۃ" سیرت کے موضوع پر وہ لاجواب کتاب ہے جس کو بے انتہا مقبولیت حاصل ہے، دیگر مطبوعات میں "اقبال کے ممدوح علماء، خلافت راشدہ"، جیسی قابل قدر کتابیں شامل ہیں اور یہ سلسلہ تیزی کے ساتھ جاری ہے۔

ادارہ درس قرآن: تاریخ، سیرت اور سفرناموں ——— پر مشتمل عمدہ اور لاجواب کتابیں جو ماضی میں بھی عظمت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں، اور جن کی اہمیت آج بھی مسلّم ہے انتہائی اعلیٰ معیار پر پیش کی ہیں۔ "تاریخ ابن خلدون"، "سفرنامہ ابن بطوطہ"، "کیمیائے سعادت" وغیرہ زیور طباعت سے آراستہ ہو کر سامنے آچکی ہیں۔

افغانی دارالکتب: ربانی بکڈپو دہلی کی شاخ ہے جو دہلی سے لیکر دیوبند تک منفرد روایت کا بانی ہے خوبصورت اور دلکش انداز میں کتابیں پیش کرنے میں سب سے آگے ہے "شریعت یا جہالت"، "حسن پرستوں کا انجام"، "ترمذی شریف" وغیرہ متعدد تصانیف میں سے چند ہیں۔

کتب خانہ فخریہ: ازاحۃ الشجن، التعلیق الصبیح وغیرہ کتابیں پیش کی ہیں، اور آئندہ پروگرام میں خاص مطبوعات شامل ہیں۔

کتب خانہ محمودیہ: چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں، شائع کی ہیں اور کافی شرحیں پیش کی جاچکی ہیں۔

ادارہ اسلامیات:

منفرد اور متبرک کتاب مشکوٰۃ شریف کی معتبر اور مانی ہوئی شرح "مظاہر حق"، قسط وار پروگرام کے تحت آرہی ہے اور بھی بہت سی مطبوعات ہیں۔

ادارہ علم وحکمت: ابھی تک صرف ایک نمایاں کتاب "نیر سیرت مصطفےٰ" پیش کرسکے ہیں۔ ابھی اس میدان میں قدم رکھا ہے مستقبل میں اچھی امیدیں وابستہ ہیں۔

دارالکتاب: "احیاء العلوم، زاد المعاد"، جیسی اعلا کتابیں سامنے آئی ہیں۔ ایک کامیاب کتابی ادارہ ہے آئندہ آنے والی کتابیں علمی دنیا کے لیے مفید ہونگی۔

مرکز ادب: "نقش سلیمانی، تاریخ اسلام"، جیسی ضخیم کتابیں آئی ہیں۔ ان کے دوسرے پروگرام بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

ادارہ تالیفات اولیاء: "التبلیغ، مجالس حکیم الاسلام، نظام الفتاوی"، جیسی مفید اور نافع کتابیں پیش کی ہیں۔

شاہ بکڈپو: "نقش دوام، گل افشانی گفتار، فروغ سحر"، جیسی دلچسپ اور معلوماتی کتابیں علمی حلقوں کو دی ہیں تفسیر وحدیث کے موضوع پر دیگر کتابیں بڑے ——— تزک واحتشام کے ساتھ منظر عام پر آرہی ہیں۔

جامعہ دینیات بھی کافی زمانے سے خدمات انجام دے رہا ہے فلسفۂ نماز، التشدد فی الاسلام، اور حدیث رسول کا قرآنی معیار، کے علاوہ کثیر مطبوعات ہیں۔
سالم کمپنی: "تفسیر معارف القرآن، تفسیر روح المعانی شرح ابن عقیل، نہایت عمدہ اور شاندار مطبوعات ہیں۔
ان کتابی اداروں کے علاوہ کتب خانہ ہاشمیہ، علمی مرکز، مکتبہ حجاز، راشد کمپنی، وغیرہ اور دیگر بہت سے کتب خانے ہیں جن کی جانب سے ہزاروں کتابیں پیش کی جا چکی ہیں اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دیوبند کی اشاعتی سرگرمیوں میں ان اداروں کا زبردست رول رہا ہے۔ اور جن کی علمی، دینی تحقیقی، مذہبی خدمات کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہے۔

●●●●●●●●●

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

نام شاعر	سال ولادت	مقام ولادت	سال وفات	مقام وفات	عمر
حالی	۱۸۳۷ء	پانی پت	۱۹۱۴ء	پانی پت	۷۷ سال
اکبر الٰہ آبادی	۱۸۴۶ء	بارہ ضلع الٰہ آباد	۱۹۲۱ء	الٰہ آباد	۷۵ سال
شاد عظیم آبادی	۱۸۴۶ء	پٹنہ	۱۹۲۷ء	پٹنہ	۸۱،
محسن نعمانی	۱۸۵۳ء	جگور (لکھنؤ)	۱۹۲۸ء	حیدرآباد	۷۵،
نظم طباطبائی	۱۸۵۳ء	لکھنؤ	۱۹۲۸ء	حیدرآباد	۷۵،
ریاض خیرآبادی	۱۸۵۴ء	خیرآباد (اودھ)	۱۹۳۴ء	گورکھپور	۸۸،
صفی لکھنوی	۱۸۶۲ء	لکھنؤ	۱۹۵۰ء	لکھنؤ	۸۸
آرزو لکھنوی	۱۸۷۲ء	〃	۱۹۵۰ء	لکھنؤ	۷۰،
سرور جہان آبادی	۱۸۷۲ء	جہان آباد ضلع پیلی بھیت	۱۹۱۰ء	جہان آباد	۳۸،
ڈاکٹر اقبال	۱۸۷۵ء	سیالکوٹ	۱۹۳۸ء	لاہور	۶۳،
حسرت موہانی	۱۸۷۸ء	اناؤ	۱۹۵۱ء	لکھنؤ	۷۳،
مولانا محمد علی جوہر	۱۸۷۸ء	رام پور	۱۹۳۱ء	لندن	۵۳،
فانی بدایونی	۱۸۷۹ء	بدایوں	۱۹۴۱ء	حیدرآباد	۶۲،
سیماب اکبرآبادی	۱۸۸۰ء	اکبرآباد	۱۹۵۱ء	کراچی	۷۱،
عزیز لکھنوی	۱۸۸۲ء	لکھنؤ	۱۹۳۵ء	لکھنؤ	۵۳،
چکبست	۱۸۸۲ء	فیض آباد	۱۹۲۶ء	رائے بریلی	۴۴

سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کی مطبوعات

طب یونانی میں گھریلو ادویہ اور عام معالجہ کی کتاب

بہت سی بیماریاں ایسی ہیں کہ اگر ان کا علاج نہ کیا جائے تو عارضی طور پر معمولی تکلیف پہنچا کر اپنی مدت پوری کر کے خود بخود دب جاتی ہیں یا پھر بالکل ختم ہو جاتی ہیں لیکن دوسری جانب خود علاجی ناکافی طبی سہولیات یا عطائی علاج نہ صرف مریض کے لیے نقصان کا باعث ہوتا ہے بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے بھی مضر ہو سکتا ہے اسلیے طبی و صحتی میدان میں بھی اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ حفظ ما تقدم اور علاج کے سلسلے میں مناسب معلومات کی اشاعت کی جائے۔ یونانی طریق علاج پر مشتمل اس کتابچے میں وہ نباتی، معدنی اور حیوانی ادویہ درج کی گئی ہیں جو بسہولت فراہم ہو جاتی ہیں اور علاج میں موثر ہیں ساتھ ہی یہ کم خرچ بھی ہیں اور ان کے استعمال سے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچتا۔

اس کتاب کے آخر میں حفظان صحت سے متعلق ہدایات اور غذاؤں کے بارے میں معلومات بھی شامل کر دی گئی ہیں۔

نوٹ: یہ کتاب انگریزی، اردو، ہندی، تامل، اور تلگو زبانوں میں دستیاب ہے قیمت اردو، ہندی، انگریزی -/۵ تامل -/۶ اور تلگو -/۷ روپے ——————— سائز ۱۶/۳۶×۲۳

کتاب الکلیات (اردو ترجمہ) بارہویں صدی عیسوی کے عظیم فلسفی اور معالج ابوالولید محمد ابن رشد کی فن طب پر یہ ایک اہم تصنیف ہے۔ اس کتاب میں طب کے تمام ہی ضروری مضامین ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب اس فن کے ہر ایک طالب علم کے لیے ایک شاہراہ کی حیثیت رکھتی ہے ——— قیمت -/۳۵ روپے ——— (سائز، ڈیمائی سائز)

رسالہ جودیہ (اردو) اس رسالے میں شیخ الرئیس ابوعلی ابن سیناء کے تجربات اور مختلف امراض سے متعلق ان کے مصدقہ اور آزمودہ نسخے درج ہیں۔ یہ رسالہ صرف طلباء طب کے لیے ہی مفید نہیں بلکہ فن طب سے متعلق ہر شخص کیلیے فائدہ مند ہے قیمت -/۱۰ (سائز ڈیمائی سائز)

آئینۂ سرگذشت (اردو) شیخ الرئیس ابوعلی ابن سینا جو گزشتہ ایک ہزار سال میں طب یونانی کی سب سے بڑی شخصیت رہی ہے کی حیات اور کارناموں سے متعلق یہ ایک اہم دستاویز ہے ——— قیمت -/۵ روپے ——— (ڈبل ڈیمائی سائز)

کتاب الابدال (اردو) یہ کتاب مصنف کی تصنیف مقالہ فی الابدال الادویہ المستعملۃ فی الطب والعلاج کا ترجمہ ہے جسکے ترجمے کا کام تحقیقاتی پروگرام کے تحت کونسل کے ایک لٹریری یونٹ نے انجام دیا ہے۔ اس سے قبل اس تصنیف کے چند قلمی نسخے ہی دستیاب تھے ان نسخوں کی مدد سے اس کتاب کو ترتیب دیا گیا ہے اور ساتھ ہی کتاب میں درج دواؤں اور انکے ابدال پر ضمنی نوٹ بھی تیار کیے گئے ہیں آخر میں مصنف کی حیات اور کارناموں پر ایک مختصر تعارفی مضمون بھی شامل ہے ——— قیمت -/۹ روپے ——— (ڈیمائی سائز)

کلینیکل اسٹڈی آف ضیق النفس (انگریزی) اس کتاب میں خالص یونانی دواؤں کے ذریعہ سے مرض ضیق النفس (دمہ) پر تحقیق کے نتائج اور مرض میں یونانی دواؤں کی اثر پذیری پر روشنی ڈالی گئی ہے ——— قیمت -/۳ روپے ——— ڈیمائی سائز

کلینیکل اسٹڈی آف وجع المفاصل (انگریزی) اس کتاب میں یونانی ادویہ برگ سنبھالو اور پوست سنبھالو کے ذریعے مرض وجع المفاصل (جوڑوں کے درد) پر تحقیق کے نتائج اور مرض کے متنوع پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے قیمت ۲/۶۰ ——— (ڈیمائی سائز)

پروسیڈنگس سیمینار آن برص (انگریزی) برص کے مرض پر ایک سیمینار میں طبی اسکالروں کی جانب سے پیش کردہ تحقیقی مقالات پر مشتمل یہ ایک تفصیلی روئیداد ہے۔ ——— قیمت -/۲۵ ——— (سائز ۸/۳۰×۲۰)

تفصیلات کے لیے لکھیں۔ سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن ۵ پنچشیل شاپنگ سینٹر نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷ (فون ۶۵۳۲۴۸ اور ۶۵۲۶۹۸)

QA PN-13

اکمل اجملی

میں کتاب ہوں

میں کتاب ہوں

میری کہانی تابناک بھی ہے اور دردناک بھی، میں نے اچھے دن بھی دیکھے اور برے دن سے بھی دوچار ہوئی۔ مجھے لائبریریوں اور کتب خانوں کی زینت بننے کا فخر بھی حاصل رہا۔ میں نے کتنوں کو سیراب کیا، میری افادیت ہر زبان پر ہے، میری افادیت کا سب ہی گن گاتے ہیں، میری تعریف و توصیف میں کیا کچھ نہیں کہا گیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھے کبھی برے دنوں سے بھی سابقہ پڑا، میری زندگی درد و غم کا بھی شکار ہوئی۔ آج میں اپنی زبوں حالی خود اپنی زبان سے ہی سنانے تمہارے کمرے میں در آئی ہوں۔ جب میں اہل سے نااہلوں میں منتقل ہوتی ہوں تو مجھ سے جو برتاؤ کیا جاتا ہے میں اسے برداشت نہیں کرپاتی اور خودکشی تک کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہوں۔ چند واقعات اپنی زندگی کے تمہیں سنانے آئی ہوں۔

ایک بار میں ایک بہت بڑے عالم کے گھر میں اس کے آباء واجداد کی میراث کی صورت رہ رہی تھی۔ وہ عالم اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا، میری خبرگیری کرتا میری خدمت انجام دیتا مجھ سے اکتساب فیض کرتا اور ایک عالم کو اس سے فیض پہونچاتا۔ لیکن اسی درمیان میری بدقسمتی نے مجھے آواز دی عالم بیمار پڑا، علاج ہوتا رہا مرض اپنا کام کرتا گیا اور آخر ایک دن اس نے رخت سفر باندھا اور مجھے کس مپرسی کے حال میں چھوڑ کر راہیٔ ملک عدم ہوا۔ نااہل اولاد نے اس کے مرنے کے تیسرے ہی دن مجھے الماریوں سے نکال کر کباڑیوں کے ہاتھ کوڑیوں کے دام بیچنا شروع کیا۔ دکانداروں نے میری جلدیں توڑیں مجھے اوراقِ پریشاں میں تبدیل کیا اور پھر میں مرچوں کی دھانس، دھنیے، ہلدی گرم مسالہ کی ناگوار بدبو سہتی مختلف گھرانوں کی سیر کرنے لگی، جہاں بچے مجھے کبھی ناؤ بنا کر پانی میں تیراتے کبھی جہاز اور چپل بنا کر ہواؤں میں اڑاتے، کبھی کانٹ چھانٹ کر میری درگت بنائی جاتی کہ الامان والحفیظ۔ لیکن اس وقت مجھے خوشی محسوس ہوتی جب۔۔۔ انہیں گھر والوں میں سے کوئی میرے اوراق پریشاں کو یکجا کرنے کی کوشش کر۔ مگر جب وہ بنیے کی دکان پر پہونچتا تو میں ایسے گھرانوں میں پہونچ چکی ہوتی جہاں مجھے نذر آتش کر دیا جاتا یا کسی کام میں لایا جا چکا ہوتا اور وہ میرا محسن میرا نثیہ پڑھتا آتا اور اتنے ہی اوراق پر اکتفا کرتا۔ مجھے اس عالم کے ۔۔ کا اتنا دکھ ہے جتنا اپنی بربادی کا۔

مجھے اپنا ایک قصہ اور بھی یاد آرہا ہے۔ میں ایک پروفیسر کے گھر میں تھی شلف میں لگی تھی الماریوں میں سجی تھی آرام سے زندگی گزار رہی تھی۔ پروفیسر میرا اتنا ہی خیال کرتا جتنا اپنے باپ یا اپنی اولاد کا کرتا۔ مجھے اس کی موجودگی میں کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی مگر واہ رے شومیٔ تقدیر وہ پروفیسر بھی مجھے چھوڑ کر چلتا بنا۔ اس کی نااہل اولاد نے چہلم تک تو مجھے گوارہ کیا لیکن اس کے بعد اس نے مجھے شلف سے نکالا الماریوں سے باہر کیا اور کھلی چھت اور کھلے آنگن میں پھینک دیا۔ سردی سے ٹھٹھرتی رہی، گرمی سے جھلستی رہی مگر چھ زندگی تھی، سو مظالم سہے پر جیتی رہی لیکن برسات کی مار نہ سہہ سکی طرہ یہ کہ پروفیسر کے مرنے کے بعد گھر میں مزدور ہر مزدور میرے سینے پر پیر رکھ کر گذرتا مجھے روندتا میں روتی کراہتی مگر میری آہ و زاری کا کسی پر اثر نہ ہوتا، میں تو الماری میں پھر سے جانے کے لیے ہی الماری سے نکالی گئی تھی لیکن میری آہ کا جواب ملا اب اس الماری میں ہملے کپڑے

رکھے جائیں گے سوائے صبر کے کیا چارہ تھا۔ گارے کی شکل میں پڑی اپنی مصیبت کے دن دیکھ رہی تھی اور اس پروفیسر کو نہ دعا دے سکتی تھی نہ بددعا۔

لگے ہاتھوں ایک واقعہ اپنی زندگی کا اور سنا دوں اور اس کے بعد مجھے خاموش ہی رہنا ہے اور خاموشی سے زندگی کے نشیب و فراز دیکھنے ہیں۔ اس وقت میں ایک عالم اور درویش خاندان میں رہ رہی ہوں۔ سیکڑوں سال پرانے مکان میں ٹوٹی پھوٹی پرانی الماریوں میں رکھی گئی ہوں یہ وہ گھرانہ ہے جس میں ہمیشہ فارغ البالی رہی۔ جب مجھے دھوپ کی ضرورت ہوتی نوکروں اور خادموں کی ایک فوج مجھے دھوپ کھلاتی، جب لباس بدلنے کی ضرورت ہوتی خادماؤں اور خادموں کی ایک قطار میرا لباس تبدیل کرتی مجھے بناتی سنوارتی، الماریوں میں سجاتی، دور دور سے تشنگان علم و ادب میری زیارت کو آتے، میں قاعدے سے ان کے سامنے پیش کی جاتی۔ مجھے یاد ہے ——— حبیب الرحمٰن شیروانی، نواب صدیق حسن خاں، ابوالکلام آزاد، شبلی نعمانی جیسے بڑے علما و فضلا اسی گھرانے میں میری زیارت کو آئے۔ کسی نے میرے صفحات پر قصائد تلاش کیے، کسی نے احادیث کا درس لیا کسی نے علم کلام کی تشنگی دور کی، کسی نے ادب کے فن پارے چنے، اور کسی نے اقوام کی تاریخ سے عبرت حاصل کی، مگر واہ رے میری بدقسمتی اس گھرانے کا عروج رو بہ زوال ہوتا گیا، عالم اور درویش مرتے گئے، موت نے اس گھرانے کو تاک لیا۔ بوڑھے مرے بچے مرے آخرش ایک بوڑھا خود سال عالم اور بڑا درویش رہ گیا جس کے چار بیٹے ہوتے مجھے تقویت ہوئی کوئی ایک تو میری خبرگیری کرے گا، مگر واہ رے میری قسمت چاروں نوجوان ایک ایک کر کے رخصت ہوتے بوڑھے باپ کی کمر توڑی دیکھتے دیکھتے وہ بوڑھا عالم بھی گم رہنے لگا، میری ہمت نہ پڑتی وہ عالم جس نے مجھے سینے سے لگا کر رکھا وہ درویش جس نے مجھے بیٹوں کی محبت دی اس سے اپنا حال زار بیان کروں پھر بھی وہ میری خبرگیری کرتا رہا، خود یہ صدمات سہہ گیا، لیکن مکان اپنے مالک کے غم میں لرزنے لگا چھت اتنا بڑا صدمہ برداشت نہ کر پائی اور بیٹھ گئی۔ میں اس میں دبی چیخیں کراہی بوڑھا عالم لکڑی ٹیکتا کمر سیدھی کرتا اٹھا مجھے اپنے گھر میں لے آیا مگر اس سے نظر بچا کر اسے لوٹنے والوں نے مجھے لوٹا میرے پڑوسیوں کو در در کی ٹھوکر کھلوائی۔ میں اسی کشمکش و پیچ میں تھی، کیا کروں وہ بوڑھا اپنے جوان بیٹے کی ایک نشانی پوتی چھوڑ کر رخصت ہوا۔ میں قدرت کے اس کرشمے کو دیکھتی رہی، مگر واہ رے میری قسمت اس بچی نے میری خبرگیری کی اپنے دادا کی یادگار کو سینے سے لگایا اس بوڑھے کے جانشین نے اس پوتی کو سن بلوغ پر پہونچنے پر اپنے عقد میں لیا میری قسمت بدلنے لگی اس بوڑھے عالم کے جانشین نے جو علم سے واقف تھا اور میری افادیت سمجھتا تھا، اس نے میری خبرگیری اپنے ذمہ لی ——— لیکن حالات نے اس کا ساتھ نہ دیا زمینداری کیا ٹوٹی گویا میری کمر ٹوٹی وہ تو درویش ہے کوئی غم نہیں لیکن میرے خرچوں میں میرے اخراجات میں کمی آئی، میری تعداد گھٹ چکی تھی میں ڈر رہی تھی مگر اس نے اس عالم میں بھی میری خبرگیری کی اور مجھے دربدری سے بچا لیا۔ میں آج بھی اسی گھر میں ہوں عافیت سے ہوں مگر تنگ دستی کا شکار ہوں، لیکن مجھے اس کی خوشی ہے کہ اس کی اولاد پڑھی لکھی ہے مجھ سے محبت کرتی ہے، میری قدر کرتی ہے، آج بھی وہ گھرانا ایسا ہی مشہور ہے آج بھی دور دور سے لوگ میری زیارت کو آتے ہیں مجھ سے اکتساب کرتے ہیں، مجھ پر تبصرہ کرتے ہیں، مجھ سے اقوام عالم کی تاریخ مرتب کرتے ہیں آج بھی میں اسی طرح باہر آتی ہوں میری دعا ہے کاش اس درویش کے دن پھریں میرے لیے نیا کمرہ بنے، نئی الماریاں آئیں میری تنگ دستی دور ہو۔

مجھے یقین ہے وہ دن دور نہیں جب مجھے نیا مکان نئی الماریاں ملیں گی میرے اچھے دن آئیں گے، میں آج بھی خوش ہوں کم از کم مجھے محبت تو مل رہی ہے، میری عزت و وقار پر تو کوئی حرف نہیں آ رہا ہے۔

میں تمہارے کمرے سے جا رہی ہوں اپنے کمرہ میں

(بقیہ صفحہ ... پر)

خواجہ ذکی احمد

دہلی کی اشاعتی سرگرمیاں

کسی زبان کو ترقی یافتہ اسی وقت کہا جاسکتا ہے جب اس زبان میں معیاری ادب نہ صرف بکثرت ہو بلکہ اس کے لکھنے پڑھنے بولنے اور سمجھنے والے بھی بکثرت ہوں۔ اردو بھی دنیا کی ان چند زبانوں میں سے ایک ہے جسے شاہکار ادب پیش کرنے کا فخر حاصل ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ کسی فردِ واحد کی کوشش کا نتیجہ ہے یا مختلف لوگوں یا اداروں کا نتیجہ۔ وقت کے ساتھ ساتھ کتابوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی اور اسی کے ساتھ ساتھ چھاپنے والوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ اور ہر ایک ادارے نے اس دور میں دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کی۔ اور اسی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

تقسیم ہند سے پہلے دہلی، لاہور، لکھنؤ، حیدرآباد کا نام سرِفہرست تھا جہاں مطبع مجتبائی، میسور پریس، مطبع نول کشور، رائے صاحب گلاب سنگھ، مکتبہ جامعہ، فیروز سنز، ادارہ ادبیات اردو اور انجمن ترقی اردو جیسے مایہ ناز ادارے اردو ادب کی خدمت کر رہے تھے۔ لیکن ملک کی آزادی کے بعد اس کاروبار کو وقتی دھکا لگا۔ کچھ ادارے آبادی کی تبدیلی کے ساتھ ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے اور کچھ پاکستان چلے گئے اور اس طرح اردو ادب کی اشاعت کا سنہری دور دو حصّوں میں منقسم ہو گیا۔

پاکستان سے آنے والے ناشرین نے دہلی کی سرزمین کو اپنے لیے زرخیز سمجھا اور انھوں نے یہیں ڈیرے ڈال دیے۔ وقت نے زخموں پر مرہم رکھا اور رفتہ رفتہ لوگ اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہونے شروع ہوئے۔ ان آنے والوں میں لاجپت رائے اینڈ سنز، نرائن دت سہگل، رائے صاحب منشی گلاب سنگھ، جے ایس سنت سنگھ اینڈ سنز، مستانہ جوگی، روزگار، پنجابی پستک بھنڈار، راج پال اینڈ سنز، آتمارام اینڈ سنز، بیسوی صدی پبلیکیشنز، اہلووالیہ بکڈپو، ——— ریاست بکڈپو، شانِ ہند بکڈپو، اور تاجور، عطر چند کپور قابلِ ذکر ہیں۔ ان ناشرین نے آنے کے بعد اپنے کاروبار کو بتدریج شروع کیا اور اپنے سابقہ نام اور تجربہ کی بناء پر جلد مشہور ہو گئے۔

جو مسلم ادارے دہلی کے علاقہ قرول باغ میں تقسیم سے پہلے اشاعتی سرگرمیوں میں حصّہ لے رہے تھے انھیں بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے وہ علاقہ خالی کرنا پڑا اور بمشکل تھوڑا بہت اثاثہ بچا سکے ندوۃ المصنفین اور مکتبہ برہان نے جامع مسجد علاقہ میں پناہ لی اور مکتبہ جامعہ جامعہ نگر منتقل ہو گیا۔ جسے مالی دشواریوں نے آگھیرا آخر اس کے حصّے پبلک میں فروخت کیے گئے اور اس طرح یہ ادارہ لمیٹڈ ہو گیا۔

تقسیم ہند سے برسوں پہلے خواجہ حسن نظامی نے اپنے ادبی ذوق اور اردو کے فروغ کے لیے نہ صرف یہ کہ رسالہ نکالا بلکہ مختلف موضوع پر بے شمار کتابیں لکھیں اور اپنے قائم کردہ ادارے سے شائع بھی کیں، خواجہ صاحب کا نعرہ تھا "ہر گھر اردو ہر گھر اللہ"۔ اور اسے عملی شکل میں جگت سنیما کے پاس ایک مکان تعمیر کر کے دکھایا جس کا نام اردو گھر رکھا جس کے لیے خصوصی ٹائل بنوائے جن پر لکھا تھا اردو لکھیے اردو پڑھیے اردو بولیے اور یہ اس مکان کی تمام دیواروں پر جڑے گئے اور اس کی وجہ سے جگت سنیما سے مٹیا محل کے نکڑ تک کے بازار کا نام اردو بازار مشہور ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد یہ سلسلہ بستی حضرت نظام الدین میں اپنے رہائشی مکان سے اپنی وفات تک جاری رکھا۔ ان کی وفات کے بعد صاحبزادگان نے اس کاروبار کو سنبھالا اور اب خواجہ اولاد کتاب گھر کے نام سے اس اشاعتی سلسلہ کو قائم کیے ہوئے ہیں۔

خواجہ صاحب کے بعض احباب نے خواجہ صاحب اس ذوق سے فیض حاصل کیا اور اپنے نہ صرف رسالے نکالے بلکہ بکڈپو بھی قائم کیے۔ جیسے عزیز حسن بقائی صاحب رسالہ "تعزیت" اور "پیشوا" نکالتے تھے اور پیشوا بکڈپو کے نام سے کتابیں چھاپتے تھے ان کی وفات کے بعد

یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ مولوی عبدالمجید صاحب کا رسالہ مولوی تھا اور مولوی بکڈپو کے نام سے کتابیں چھاپتے تھے ——— ان کی اولاد پاکستان منتقل ہوگئی تھی لہٰذا ان کی وفات کے بعد یہ ادارہ ختم ہوگیا۔ مفتی شوکت علی فہمی صاحب نے "دین دنیا" کے نام سے رسالہ نکالا اور دین دنیا پبلشنگ ہاؤس کے نام سے کتابیں چھاپنی شروع کیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ مستحسن فاروقی صاحب ہفت روزہ "پیام مشرق" اور ماہنامہ "آستانہ" نکالتے تھے ——— ہفت روزہ ان کی زندگی ہی میں بند ہوگیا تھا اور آستانہ ان کی وفات کے بعد بند ہوگیا۔ آستانہ بکڈپو اب ان کے صاحبزادے کی نگرانی میں کام کررہا ہے اور آستانہ بھی دوبارہ شائع ہونے لگا ہے۔ اردو بازار کا علاقہ بھی بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس نے بھی زمانے کے بہت نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کا گہوارہ رہا ہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے حامیوں کی ہنگامہ آرائی بھی دیکھی۔ یہاں تک کہ کتب فروش بھی دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے اور ان میں آپس میں چھیڑ چھاڑ بھی ہوتی رہتی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان کا حامی طبقہ اپنی دکانیں فروخت کرکے پاکستان چلا گیا۔ اور ان کی جگہ دوسرے اداروں نے سنبھال لی جیسے کتب خانہ نذیریہ، کتب خانہ حمیدیہ، تاج کمپنی، سنگم کتاب گھر، مدینہ بکڈپو، مکتبہ جماعت اسلامی، آزاد کتاب گھر۔ بقیہ دوسرے ادارے کتب خانہ انجمن ترقی اردو، کتاب خانہ رشیدیہ، کتب خانہ عزیزیہ، سنٹرل بکڈپو، رحیمیہ بکڈپو، مکتبہ جامعہ، دینی بکڈپو اور صلاح الدین حسام الدین تقسیم ہند سے پہلے بھی موجود تھے اور تقسیم کے بعد بھی اپنے کاروبار میں مشغول ہیں۔

حالی پبلشنگ ہاؤس تقسیم سے پہلے اوپر کمرے میں قائم تھا جہاں آج مسلم لیگ کا دفتر ہے۔ اپنے اس دور میں اس ادارے سے بہت سی معرکتہ الآرا کتابیں شائع ہوئیں، ساحر کی "تلخیاں" مولانا آزاد کی "غبار خاطر" کو خریدنے کے لیے تو خریداروں کی باقاعدہ دکان کھلنے سے پہلے سے لائن لگنی شروع ہوجاتی تھی اور تمام دن یہ سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد اس ادارے کے ایک شریک پاکستان چلے گئے اور دوسرے شریک بدرالحسن صاحب اسے نیچے بازار میں لے آئے۔ ان کی حیات تک یہ ادارہ قائم رہا۔

جب حالی پبلشنگ ہاؤس نیچے منتقل ہوگیا تو اس کمرے کو ان کے ایک اور دوست جناب محمد یوسف صاحب نے حاصل کرلیا اور اس میں مکتبہ شاہراہ قائم کیا۔ اور شاہراہ کے نام سے ایک پرچہ بھی نکالا جو اپنے زمانے میں ایک مقام رکھتا تھا۔

یوسف صاحب کے انتقال کے بعد رسالہ شاہراہ اور کتابوں کے کاروبار کو ان کے صاحب زادے نے چلانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی بعض مجبوریوں کی وجہ سے اسے چلا نہ سکے اور ادارہ بند ہوگیا۔

تاج کمپنی اور تاج آفس دو ادارے الگ الگ قائم ہوتے اور اس تیزی سے آگے بڑھے کہ حیرت ہوتی تھی اور یہ ان ہی کی جدت تھی کہ ہندستان کے ٹور پر ایجنٹ بھیجے جاتے تھے، جو ان کے تنخواہ دار ملازم تھے اور دہلی سے باہر کے دکانداروں کو بھی پہلی مرتبہ اس کا تجربہ ہوا کہ کتابیں بغیر کسی دشواری اور خط و کتابت کے گھر بیٹھے بھی اپنی مرضی کے مطابق منگائی جاسکتی ہیں لہٰذا پہلا ہی ٹور بہت بڑی کامیابی کا ضامن تھا۔ ان ایجنٹ حضرات کو بھی باہر کی مارکیٹ کا اندازہ ہوا لہٰذا رفتہ رفتہ وہ لوگ اپنے علاحدہ ادارے قائم کرتے گئے جیسے ادبی دنیا، نا پبلشنگ ہاؤس، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، چمن بکڈپو، اعجاز پبلشنگ ہاؤس تاج اکیڈمی وغیرہ۔

ایک زمانے میں ایشیا پبلشرز کی بھی بڑی شہرت تھی۔ یہ ادارہ زیادہ تر اردو کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر اور مہندر ناتھ کی تصنیفات شائع کرتا تھا لیکن اب یہ ادارہ تقریباً بند ہوگیا ہے۔

• —— پبلشرز کے زمرے میں مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی پیش پیش ہیں۔ اخلاق احمد صاحب مالک چمن بکڈپو کے انتقال کے بعد ادارہ تقریباً بند ہوگیا تھا لیکن ان کی بڑی لڑکی نے حوصلہ کیا اور اس ادارے کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔ اور اب ماشاء اللہ بہت خوش اسلوبی سے اسے انجام دے رہی ہیں۔

کتب خانہ حمیدیہ اردو بازار میں قائم ہوا۔ کتابیں بھی چھاپیں اور قرآن مجید بھی لیکن بعض مجبوریوں کے تحت انہوں نے دکان چھوڑ دی۔ اور گھر سے اس سلسلہ کو شروع کیا۔ جو اب بہت اچھی طرح چل رہا ہے۔

کتب خانہ نذیریہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے پوتے محمد مسلم --

صاحب نے اردو بازار میں قائم کیا تھا —— —— کچھ دنوں بعد وہ دکان بند ہو گئی جس کو بعد میں انہوں نے اپنی قیام گاہ کھاری باولی سے شروع کیا ہے جو اب تک جاری ہے

حافظ فیاض احمد صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں سے تھے تقسیم کے بعد وقت کے بدلتے ہوئے حالات اور زمانے کو دیکھتے ہوئے انھوں نے اپنے چند احباب کی شرکت اور مشورہ سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا جس کا نام سنگم کتاب گھر رکھا گیا۔ اور اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ اس میں معیاری کتابیں شائع کی جائیں چاہے وہ ادبی ہوں یا مذہبی اور خصوصیت سے بچوں کے لیے معیاری کتابیں چھاپی جائیں —— راقم الحروف کے سپرد تعلیم کی تکمیل کے بعد اس کی نگرانی سپرد کی گئی۔ اور یہ کام ان کی حیات تک (میرے دادا تھے) تو باقاعدہ چلتا رہا لیکن ان کی وفات کے بعد عدم دلچسپی کی وجہ سے اس کاروبار کو ختم کرنا پڑا اور اب کتابیں گھر منتقل کر دی گئیں جہاں سے اس ذخیرہ کی آہستہ آہستہ نکاسی ہو رہی ہے۔

لاجپت رائے اینڈ سنز کے مالک سری پرکاش ساہنی نے بہت کتابیں چھاپیں اور بڑے پیمانے پر کام کیا لیکن کاروبار میں تنہا ہونے کی وجہ سے زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کر سکتے تھے اور عمر کا تقاضہ بھی تھا ہر کام اطمینان سے کیا جائے لہذا انھوں نے مناسب سمجھا کہ اسے گھر واقع کالکا جی منتقل کر دیا جائے اور خط وکتابت کے ذریعہ ہی اس کام کو جاری رکھا جائے لہذا اردو بازار کی دکان ختم کر دی اور اب اپنے رہائشی مکان سے ہی یہ سلسلہ قائم ہے۔

ساہنی صاحب کے سب سے چھوٹے بھائی جو تقسیم ملک کے بعد اس اشاعتی سلسلہ سے الگ ہو گئے تھے اور دوسرے مختلف کاروبار میں مصروف تھے۔ انھیں یہ احساس ہوا کہ ایک ادارہ قائم کیا جائے جس سے عمدہ طباعت وگٹ اپ کی کتابیں ممتاز ادیبوں کی شائع کی جائیں لہذا انھوں نے انڈین اکیڈیمی کے نام سے گول مارکیٹ میں ایک ادارہ قائم کیا اور خواجہ غلام السیدین کی معرکتہ الارا کتاب "آندھی میں چراغ" شائع کی کئی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور دوسرے کاروبار بھی چلتے رہے لیکن بعد میں دوسری بڑھتی ہوئی مصروفیات کی بنا پر یہ ادارہ بند کر دیا۔

گوپال متل صاحب نے نیشنل اکاڈمی اور مکتبہ تحریک کے نام سے اپنا ادارہ قائم کیا اور کافی کتابیں شائع کیں بعد میں ان کے بڑے صاحبزادے پریم گوپال متل صاحب اس کی نگرانی کا کام کرتے رہے لیکن اب چند سال سے انہوں نے اپنا ادارہ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس کے نام سے قائم کر لیا ہے۔

ایک زمانے میں اردو میں پاکٹ بکس کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ سلسلہ شمع بک ڈپو نے شروع کیا تھا جنہوں نے اردو کی بہت سی کتابیں اور شعراء کے دیوان پاکٹ بک میں منتقل کر دیئے۔ اس کے بعد دوسرے اداروں نے بھی پاکٹ بکس کی اشاعت شروع کی جس میں پنجابی پستک بھنڈار جنہوں نے اسٹار پاکٹ بکس کے نام سے اور راج پال اینڈ سنز جنہوں نے ہند پاکٹ بکس کے نام سے یہ کام شروع کیا اور بہت سی اردو کتابیں پاکٹ بکس میں شائع کیں۔

ادارہ انجمن ترقی اردو ہند بھی کتابوں کی طباعت اور فروخت کا کام کرتا ہے۔ یہ اردو کا ایک قدیم ادارہ ہے جو حکومت کی امداد سے چلتا ہے۔ یہ ادارہ ایک عرصہ تک علی گڑھ سے نشر واشاعت کا کام کرتا رہا لیکن اردو گھر کے نام سے انجمن کا دفتر دہلی میں تعمیر ہو جانے کے بعد اب یہ ادارہ ایک عرصے سے دہلی منتقل ہو گیا ہے اور یہیں سے کتابوں کی طباعت اور فروخت کا کاروبار کر رہا ہے انجمن نے اس درمیان بہت سی معیاری علمی و ادبی کتابیں شائع کی ہیں۔

یہ تذکرہ نامکمل رہے گا اگر دو مقامی ہندی ادارے رتن اینڈ کمپنی اور گرگ اینڈ کمپنی کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہ دونوں ادارے شروع وقت سے ہندی کی کتابوں کے ساتھ ساتھ اردو اجزائی کتب سپارے و قرآن مجید چھاپ رہے ہیں اور آج تک یہ سلسلہ قائم ہے۔

اردو زبان کی اشاعت میں مذہب نے بھی بہت بڑا کردار ادا کیا ہے پہلے چند ہی ادارے تھے جو صرف مذہبی کتب ہی چھاپتے تھے لیکن تقسیم ہند کے بعد سب سے پہلے بڑا ادارہ آفتاب رسالت اور بعد میں اشاعت دینیات کا نام بہت زور سے چمکا —— —— اس کے کچھ عرصہ بعد تو ایسا معلوم ہوا کہ مذہبی کتب چھاپنے والوں کا جیسے طوفان آگیا ہو اور

شب و روز دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں ان میں نصیر بکڈپو، فرید بکڈپو، مسلم بکڈپو، نفیس بکڈپو، حفیظ بکڈپو، قومی کتاب گھر، تاج پبلیشرز، قومی بکڈپو، ورلڈ اسلامک پبلیکیشنز، صدیقی کتاب گھر، مرکزی ادارہ تبلیغ دینیات، تعلیمی کتب خانہ، کمال پبلیشرز کتابستان اور مجلس اشاعت قرآن قابل ذکر ہیں۔

جنگ آزادی میں عوام کے ساتھ ساتھ مسلم علماء نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے اور اس سلسلہ کو باقاعدہ ایک تنظیم کی شکل دے کر جمعیۃ علماء ہند نام رکھا۔ تقسیم ہند سے مسلمانوں کے پیدا شدہ مسائل کا حل تلاش کرنے میں بہت مدد دی اور خصوصاً دینی مدارس قائم کرنے اور ان کے لیے اردو میں درسی کتب فراہم کرنے میں اس ضرورت کو انہوں نے الجمعیۃ بکڈپو قائم کرکے پورا کیا۔ لیکن پچھلے کئی سال سے کسی نئی کتاب کا اضافہ نہیں ہوسکا ہے۔

فارسی کی قدیم مشہور کتابیں گلستان، بوستان، دیوان حافظ، مثنوی مولانا روم کی اہمیت اور ضرورت کو اردو میں تراجم پیش کرتے ہوئے قاضی سجاد صاحب کا ادارہ سب رنگ کتاب گھر پوری مستعدی سے کام کر رہا ہے۔

بعض ادارے قائم بھی ہوئے اور بند بھی ہوگئے جن کی وجہ یا تو ان کے بانیوں کی موت رہی یا ان لوگوں نے اپنی لائن بدل دی اور اگر اس کاروبار میں رہے بھی تو اردو کی کتابیں چھاپنے کا کام بند کردیا بلکہ ہندی میں کتابیں چھاپنی شروع کردیں۔ ایسے ادارے مکتبہ رنگین، مکتبہ حسن و شباب، مکتبہ جوار بھاٹا، ریاست بکڈپو، سیما پرکاشن اور میر اینڈ کمپنی ہیں۔

اردو میں بڑی کتابیں شائع ہوئیں لیکن رفتہ رفتہ یہ ناپید ہوتی گئیں اور تلاش بسیار کے بعد بھی انھیں حاصل کرنا ناممکن تھا اور اس کی ضرورت زیادہ تر ریسرچ کا کام کرنے والے اصحاب اور لائبریریوں کو ہوتی تھی لیکن یہ کتابیں ادب کے شوقین حضرات کے ذاتی کتب خانوں میں موجود تھیں جو تقسیم ہند کے بعد یا تو لٹ کر یا معاشی مجبوریوں کی بناء پر فروخت ہونے کے لیے بازار میں آئیں اور ان کی اہمیت کو جن لوگوں نے سمجھا انھوں نے اس ذخیرہ کو اپنے پاس اکٹھا کر لیا تاکہ ایسے ذخیرہ کو اس کے متلاشی شائقین کو ان کی ضرورت کے تحت مہیا کیا جاسکے اس کے لیے منشی نیاز الدین صاحب مالک کتب خانہ انجمن ترقی اردو کرم الٰہی صاحب مالک ہند بکڈپو اور رحمت قطبی صاحب کے نام قابل ذکر ہیں۔ اور اب بھی بیش بہا ذخیرہ ان حضرات کے پاس موجود ہے۔

اردو میں درسی کتب کے علاوہ ٹیکنیکل کتب کی بھی ضرورت تھی کہ ہر موضوع پر معیاری کتابیں دستیاب ہوجائیں تاکہ اردو داں طبقہ جو ٹیکنیکل کتابیں اپنی زبان میں پڑھنا چاہے وہ پڑھ سکے اس ضرورت کو سمجھتے ہوئے دیہاتی پستک بھنڈار اور رسالہ روزگار کتابیں اردو میں بھی فراہم کر رہے ہیں۔

اردو میں طبی کتابیں تقسیم ہند سے پہلے دستیاب ہوجاتی تھیں لیکن تقسیم کے بعد یہ سلسلہ مفقود ہوگیا تھا انفرادی طور پر کچھ کتابیں شائع بھی ہوئیں لیکن ادارہ کی شکل میں کتب خانہ المسیح نے جسے حکیم کبیر الدین صاحب نے قائم کیا تھا شائع ہوئیں ان کی حیات تک تو اس کا اہتمام رہا کہ ضرورت کے وقت کتابیں ملتی رہیں لیکن ان کے انتقال کے بعد یہ ادارہ صرف نام کا رہ گیا ہے جو کتابیں ختم ہیں انھیں ان کے صاحبزادے پھر دوبارہ چھاپنا نہیں چاہتے اور جو تھوڑی بہت رہ گئی ہیں وہ بھی آہستہ آہستہ ختم ہوتی جارہی ہیں۔ ہمدرد بکڈپو کے تحت بھی کچھ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ لیکن اس میں سے اکثر نایاب ہیں کتابوں کے اس دور میں غالب اکیڈمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، معیار پبلیکیشنز، شعور پبلیکیشنز اور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس بھی پیچھے نہیں ہیں۔ ان اداروں سے بھی بڑی معیاری کتابیں شائع ہوئیں ہیں اور یہ سلسلہ مستقل جاری ہے۔

آخر میں ان سرکاری اداروں کا تذکرہ بھی کرتا چلوں کہ جن کے ذکر کے بغیر اس سرزمین کی اشاعتی سرگرمیاں نامکمل رہیں گی۔ یعنی پبلیکیشنز ڈویژن، نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکیڈمی، ترقی اردو بورڈ اور این سی آر ٹی۔ یہ ادارے نہ صرف دوسری زبانوں کے شاہکاروں کو اردو قالب میں ڈھال کر پیش بلا تخصیص مضامین میں معیاری ادب پڑھنے والوں کے لیے النوع کے لیے بچوں کے لیے فراہم کر رہے ہیں اور مختلف مضامین میں درسی کتب کی ضرورت کو بھی پورا کر رہے ہیں ان اداروں سے ... کئی سو اردو کتابیں شائع ہو چکی ہیں

لہجہ بہ لہجہ

غزلیں

افسانے

نظمیں

مقالات

غزلیں

میر تقی میر
مرزا رفیع سودا
خواجہ میر درد
شیخ غلام ہمدانی مصحفی
سید انشاء اللہ خاں انشاء
خواجہ حیدر علی آتش
مرزا اسد اللہ خاں غالب
شیخ محمد ابراہیم ذوق
حکیم مومن خاں مومن
شاد عظیم آبادی
حسرت موہانی
اصغر گونڈوی
مرزا یگانہ چنگیزی
فانی بدایونی
جگر مرادآبادی
ڈاکٹر شیخ محمد اقبال
سیماب اکبرآبادی
فراق گورکھپوری
مجاز
مخدوم محی الدین
پرویز شاہدی

بسمل سعیدی
[illegible]
روش صدیقی
قتیل شفائی
سلام مچھلی شہری
معین احسن جذبی
جاں نثار اختر
شمیم کرہانی
شکیل بدایونی
مجروح سلطانپوری
ساغر نظامی
سکندر علی وجد
غلام ربانی تاباں
اعجاز صدیقی
کلیم عاجز
خلیل الرحمن اعظمی
شہاب جعفری
خورشید احمد جامی
شہریار
بانی
ندا فاضلی

فضا ابن فیضی
نازش پرتاب گڑھی
مظہر امام
وحید اختر
حسن نعیم
بشیر بدر
شمیم حنفی
کمال احمد صدیقی
اعزاز افضل
عنوان چشتی
مسعود اختر جمال
والی آسی
سلطان اختر
پرکاش فکری
افتخار امام صدیقی
محسن زیدی
حیات لکھنوی
سید شکیل دسنوی



میر تقی میر

کہتا ہے کون میر کہ بے اختیار رو
ایسا تو رو کہ رونے پہ تیری ہنسی نہ ہو

پایا گیا وہ گوہرِ نایاب سہل کیا
نکلا ہے اس کو ڈھونڈنے تو پہلے جان کھو

سنتے نہیں کسی کی جو نہ کہیے تو دم رکے
کچھ پوچھیے نہ قصہ ہمارا ہے گومگو

مشہور ہے بے دماغی یہ مطلق نہ بولنا
ہم دیں تمہیں دعائیں تم گالیاں تو دو

اے غافلانِ دہر یہ کچھ راہ کی ہے بات
چلنے کو قافلے ہیں یہاں تم رہے ہو سو

گردش میں جو کوئی ہو رکھے اس سے کیا امید
دن رات آپ ہی چرخ میں ہے آسمان تو



مرزا محمد رفیع سودا

صورت تو تجھ کو کہنا نہیں ایسا کوئی کب ہے
کس دھج سے یہ دیکھا ہے آفت ہے غضب ہے

کیا چیز ہے وہ دل جسے کہتے ہیں الٰہی
اک قطرۂ خوں سینے میں آفات طلب ہے

اک طرز ہو لٹ جانے کی دل کے تو کہوں تب
ہے جو حرکت، جان کی غارت کا سبب ہے

دشنام تو دینے کی قسم کھائی ہے لیکن
جب دیکھے ہے وہ مجھ کو تو اک جنبشِ لب ہے



خواجہ میر درد

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم بھی مہماں تھے واں اک تو ہی صاحبِ خانہ تھا

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراجِ خزاں
آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا

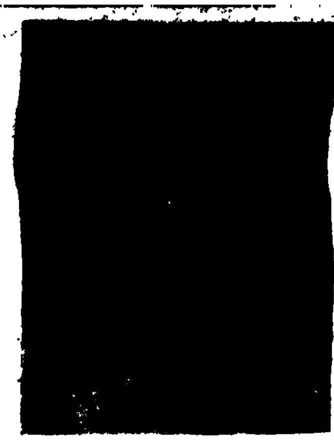
ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ
وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا

بھول جا خوش رہ عبث وے سابقے مت یاد کر
درد یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

کلیاتِ میر علمی مجلس دہلی ۱۹۶۸

انتخابِ سودا مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۷۲

خواجہ میر درد تصوف و شاعری، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۷۱



شیخ غلام ہمدانی مصحفی

بیٹھ کر وہ جہاں سے اٹھتا ہے
ایک فتنہ وہاں سے اٹھتا ہے

نالہ کرتی ہے جس گھڑی بلبل
شعلہ اک آشیاں سے اٹھتا ہے

منہ کو مت کھول ورنہ عالم کے
پردہ رازِ نہاں سے اٹھتا ہے

شورِ محشر کہیں ہیں جس کے تئیں
میرے شور و فغاں سے اٹھتا ہے

بیٹھتا ہے وہ جنگ جو جس جا
لڑکے آخر وہاں سے اٹھتا ہے

کلیاتِ مصحفی　　مجلس علی　　۱۹۶۸



انشاء اللہ خاں انشا

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے ابکہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

غزل نمبر　　فن و شخصیت بمبئی　　۱۹۶۸



خواجہ حیدر علی آتش

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

طبل و علم نہ پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح مری قبضِ روح کو!
دیکھوں تو موت ڈھونڈھ رہی ہے بہانہ کیا

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

کلامِ آتش　　ہندستانی اکیڈمی الہ آباد　　۱۹۷۲



غالب

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے"
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پر، لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

ہوا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

دیوانِ غالب صد سالہ یادگار غالب اکیڈمی دہلی ۱۹۶۹



شیخ ابراہیم ذوق

بیمارِ محبت نے لیا تیرے سنبھالا
لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر
اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا

ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام
اور پھر کہوں گر آج سے کل جائے تو اچھا

جب کل ہو تو پھر وہ ہی کہوں کل کی طرح سے
گر آج کا دن بھی یونہی ٹل جائے تو اچھا

القصہ نہیں چاہتا میں جائے وہ یاں سے
دل میری ہی باتوں میں بہل جائے تو اچھا

انتخاب ذوق وظفر انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۵



مومن

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

کیا گل کھلے گا دیکھیے ہے فصلِ گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

منہ دیکھنے سے پہلے بھی کس دن وہ صاف تھے
بے وجہ کیوں غبار رکھیں آرسی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں!
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

دیوانِ مومن مکتبہ پروین الہ آباد ۱۹۵۹



شاد عظیم آبادی

یہ رات بھیانک ہجر کی ہے کاٹیں گے بڑے آلام سے ہم
ٹلنے کی نہیں یہ کالی بلا سمجھے ہی ہوئے تھے شام سے ہم

تھا موت کا کھٹکا جاں فرسا صد شکر کہ نکلا وہ کانٹا
گر ہو نہ قیامت کا دھڑکا اب ہیں تو بڑے آرام سے ہم

وہ ہم نفسو دم لینے دو وہ بھولے نغمے یاد آلیں
آئے ہیں چمن میں اڑ کے ابھی چھوٹے ہیں ابھی دم دام سے ہم

وہ سمجھے کہ ہیں نے مارلیا ہم سمجھے ملیں گے آخر وہ
ملتے ہی نگہ کے دونوں خوش آغاز سے وہ انجام سے ہم

دنیا میں تخلص کوئی نہ تھا کیا نیل کا ٹیکا شاد ہی کا تھا
تم وجہ نہ پوچھو کچھ اس کی چڑ جاتے ہیں کیوں اس نام سے ہم

انتخاب جدید انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۷



حسرت موہانی

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے وہ شامل ارباب امتیاز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

کلیات حسرت موہانی شفیق بک ڈپو دہلی ۱۹۶۶



اصغر گونڈوی

یہ عشق نے دیکھا ہے یہ عقل سے پنہاں ہے
قطرہ میں سمندر ہے ذرہ میں بیاباں ہے

ہے عشق کی شورش سے رعنائی و زیبائی
جو خون اچھلتا ہے وہ رنگ گلستاں ہے

پھر گرم نوازش ہے ضو مہر درخشاں کی
پھر قطرۂ شبنم میں ہنگامۂ طوفاں ہے

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

آغوش میں ساحل کے کیا لطف سکوں اس کو
یہ جان ازل ہی سے پروردۂ طوفاں ہے

اک ایک نفس میں ہے صد مرگ بلا مضمر
جینا ہے بہت مشکل مرنا بہت آساں ہے

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا!
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

کلیات اصغر ہند بک ڈپو امرتسر ۱۹۶۰

مرزا یگانہ چنگیزی

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

پیام زیرِ لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا

ہنسی میں وعدۂ فردا کو ٹالنے والو
لو دیکھ لو وہی کل آج بن کے آنہ گیا

گناہ زندہ دلی کہئے یا دل آزاری
کسی پہ ہنس لیے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

گنجینہ ——— ادارہ اشاعت لاہور



فانی بدایونی

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا !
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں
رازِ کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لاکے مجھے !
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا

دل سے پہونچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں
سلسلہ شیشہ سے ملتا تو ہے پیمانے کا

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

باقیاتِ فانی نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۹



جگر مرادآبادی

جب تک کہ غمِ انساں سے جدا انسان کا دل معمور نہیں
جنت ہی سہی دنیا لیکن جنت سے جہنم دور نہیں

جز ذوقِ طلب جز شوقِ سفر کچھ اور مجھے منظور نہیں
اے عشق تیا اب کیا ہو گلہ کہتے ہیں کہ منزل دور نہیں

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

اس نفع و ضرر کی دنیا سے میں نے یہ لیا ہے درسِ جنوں
خود اپنا زیاں تسلیم مگر اوروں کا زیاں منظور نہیں

میں زخم بھی کھاتا جاتا ہوں قاتل سے بھی کہتا جاتا ہوں
توہین ہے دستِ بازو کی وہ وار کہ جو بھرپور نہیں

اربابِ ستم کی خدمت میں اتنی ہی گزارش ہے میری
دنیا سے قیامت دور سہی دنیا کی قیامت دور نہیں

۱۹۵۱ آتش تر جواب مکتبہ شاہراہ دہلی ۱۹۵۲



اقبال

تیری متاعِ حیات علم و ہنر سے سرور
میری متاعِ حیات ایک دلِ ناصبور

معجزۂ اہلِ فکر فلسفۂ پیچ پیچ
معجزۂ اہلِ ذکر موسیٰ و فرعون و طور

مصلحتاً کہہ دیا میں نے مسلماں تجھے
تیرے نفس میں نہیں گرمیِ یوم النشور

ایک زمانے سے ہے چاک گریباں مرا
تو ہے ابھی ہوش میں! میرے جنوں کا قصور

فیضِ نظر کے لیے ضبطِ سخن چاہیے
حرفِ پریشاں نہ کہہ اہلِ نظر کے حضور

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور فقر ہو جس کا غیور

ضرب کلیم کمال پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۵۶



سیماب اکبر آبادی

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

دنیا کرے تلاش نیا جامِ جم کوئی
اس کی جگہ نہیں مرے جامِ سفال میں

آزردہ اس قدر ہوں سرابِ خیال سے
جی چاہتا ہے تم بھی نہ آؤ خیال میں

دنیا ہے خواب حاصلِ دنیا خیال ہے
انسان خواب دیکھ رہا ہے خیال میں

اہلِ چمن ہمیں نہ اسیروں کا طعن دیں
وہ خوش ہیں اپنے حال میں ہم اپنے حال میں

سیماب اجتہاد ہے حسنِ طلب مرا
ترمیم چاہتا ہوں مذاقِ جمال میں

کلیم عجم مکتبہ قصر الادب آگرہ ۱۹۴۸



فراق گورکھپوری

رازِ عالم سے ہے شاید کہ مرا راز جدا
مجھ سے سننے میں ہے اس آنکھ کا انداز جدا

بدگماں عشق کو صد وہم و یقیں کے کھٹکے
شوخیِ چشمِ سخن ساز ہے غماز جدا

یوں ہی کیا کم ہے تری یاد کہ دل کو چھیڑیں
زلف پُرخم لبِ رنگیں نگہِ ناز جدا

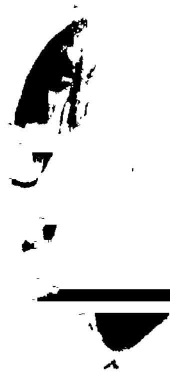
پے بہ پے اڑتے ہوئے ہوش کے انداز الگ
طرزِ برقِ نگہِ حسنِ جنوں ساز جدا

عقدۂ پیچ و خمِ زلف کا کھلنا معلوم
رازِ عالم سے نہ ہے یہ سلسلۂ راز جدا

کچھ اشارے ہیں ادھر شوخیِ پنہاں کے فراقؔ
ہے سکوتِ نگہِ نازِ سخن ساز جدا

گل نغمہ ادارہ انیس اردو الہ آباد ۱۹۵۹







مجاز

سازگار ہے ہمدم ان دِنوں جہاں اپنا
عشق شادماں اپنا شوق کامراں اپنا

آہِ بے اثر کس کی نالہ نارسا کس کا
کام بارہا آیا جذبۂ نہاں اپنا

کب کیا تھا اس دل پر حسن نے کرم اتنا
مہرباں اور اس درجہ کب تھا آسماں اپنا

الجھنوں سے گھبرائے میکدے میں در آئے
کس قدر تن آساں ہے ذوقِ رائیگاں اپنا

کچھ نہ پوچھ اے ہمدم ان دنوں مرا عالم
مطربِ حسیں اپنا ساقیِ جواں اپنا

تم مجاز دیوانے مصلحت سے بیگانے
ورنہ ہم بنا لیتے تم کو رازداں اپنا

آہنگ — آزاد کتاب گھر دہلی — ۱۹۵۲

مخدوم محی الدین

زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی زندگی رنگِ گل کا بیاں دوستو
گاہ روتی ہوئی گاہ ہنستی ہوئی میری آنکھیں ہیں افسانہ خواں دوستو

ہے اسی کے جمالِ نظر کا اثر زندگی زندگی ہے سفر ہے سفر
سایۂ شاخِ گل، شاخِ گل بن گیا بن گیا ابر، ابرِ رواں دوستو

اک مہکتی بہکتی ہوئی رات ہے لڑکھڑاتی نگاہوں کی سوغات ہے
[illegible]

کیسے طے ہوگی یہ منزلِ شامِ غم، کس طرح سے ہو دل کی کہانی رقم
اک ہتھیلی میں دل اک ہتھیلی میں جاں اب کہاں کا یہ سود و زیاں دوستو

دوستو ایک دو جام کی بات ہے دوستو ایک دو گام کی بات ہے
ہاں اسی کے در و بام کی بات ہے بڑھ نہ جائیں کہیں دوریاں دوستو

سن رہا ہوں حوادث کی آواز کو، پا رہا ہوں زمانے کے ہر راز کو
دوستو اٹھ رہا ہے دلوں سے دھواں آنکھ لینے لگی ہچکیاں دوستو

بساطِ رقص — استقبالیہ کمیٹی جشنِ مخدوم حیدرآباد — ۱۹۶۶

پرویز شاہدی

موقعِ یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا
شرط جینے کی لگا دی مجھے مرنے نہ دیا

غم سے کم میں غمِ دنیا کو بھلا سکتا تھا
زندگی [illegible] کرنے نہ دیا

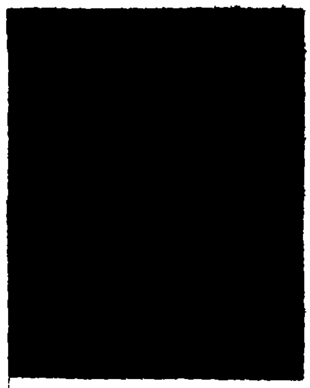
تیری غم خوار نگاہوں کے تصدق کہ مجھے
غمِ ہستی کی بلندی سے اترنے نہ دیا

وہ تری سرخیِ عارض کہ قریب آ نہ سکی
رنگ جس فکر کو بھی خونِ جگر نے نہ دیا

حسن ہمدرد ترا ہم سفر شوق رہا
مجھ کو تنہا کسی منزل سے گزرنے نہ دیا

کتنی خوش ذوق ہے تیری نگہِ بادہ فروش
خالی رہنے نہ دیا جام کو بھرنے نہ دیا

تثلیثِ حیات — ادارہ لوح و قلم کلکتہ — ۱۹۶۸



بسمل سعیدی

اپنے دامن سے مرے پونچھنے والے آنسو
دامنِ خاک سے اب آکے اٹھالے آنسو

باغ میں آج تری یاد میں رونے کے لیے
میں نے پھولوں کے تبسم سے نکالے آنسو

کتنی آنکھوں پہ ہیں احسان ترے دامن کے
میری آنکھوں کے بھی دامن میں چھپالے آنسو

پھر خدا جانے رہے ان میں روانی نہ رہے
چشمِ خوں بار ابھی اور بہالے آنسو

اب یہ کم بخت کریں کس کے حوالے بسمل
کردیے دل نے تو آنکھوں کے حوالے آنسو

لمحاتِ زندگی — پاکستان پبلیکیشنز کراچی — ۱۹۷۱



جمیل مظہری

دیئے بھی ہوں تو بچاری سورج کے ساتھ کیا لگی ہے تیرگی ہو
کہ ہو پتنگوں سے رقص کا ہیں چراغ کی دھیمی روشنی میں

معاف اے نازِ رہنمائی پہنچ کے منزل پہ بھی نہ پائی
وہ لذتِ خواب جو میسر ہوئی سرِ راہِ خستگی میں

ستم ہے اے روشنی ستم ہے کہ وہ بھی اب دھوپ کی زد میں
ذرا سا سایہ جو رہ گیا تھا گھنے درختوں کی تیرگی میں

اِدھر اندھیرے کی لغزشیں ہیں اُدھر اجالے کی زحمتیں ہیں
ترے مسافر لگائیں بستر کہاں یہ صحرائے زندگی میں

وہ روشنی کیا بنے گی رحمت جو دھوپ کو ساتھ لا رہی ہو
وہ سایہ کیا دیگا زندگی کو جنم لیا جس نے تیرگی میں

جمیل ہم اٹھ کے گر پڑے اور گزر گیا کارواں ہمارا
غبار کی بات تک نہ پوچھی مسافروں کی روا روی میں

نقشِ جمیل — مجلہ ادب پٹنہ — ۱۹۵۸

روش صدیقی

عشق کی شرحِ مختصر کے لیے
سِل گئے ہونٹ عمر بھر کے لیے

زندگی دردِ دل سے اکتا کر
دردِ سر بن گئی بشر کے لیے

دل ازل سے ہے شعلۂ پیراہن
شمع جلتی ہے رات بھر کے لیے

ہم بھی کوئے بتاں کو جاتے ہیں
اے صبا قصد ہے کدھر کے لیے

وہ تجلی ہے منتظر اب تک
کسی شائستہ نظر کے لیے

خونِ دل صرف کر رہا ہوں روش
خوب سے نقشِ خوب تر کے لیے

اعلاک منتخب شاعری — پبلک پبلیکیشنز — ۱۹۷۳

مدینہ بک ڈپو دہلی کی مطبوعات

قرآن مجید اشرف الشان مترجم کلاں
ترجمہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح
سائز ۲۲×۳۰ (رنگین ایموز) ہدیہ -/۳۶

قرآن مجید رحمانی عکسی مترجم رنگین
ترجمہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح
سائز ۸/۲۰×۳۰ (رنگین ایموز) ہدیہ -/۳۴

قرآن مجید بے نظیر عکسی مترجم سبز حنا
ترجمہ مولانا شاہ عبد القادر صاحب محدث رح
سائز ۸/۲۰×۳۰ ہدیہ -/۲۵

حمائل شریف مترجم اشرف الشان عکسی رنگین جدید ایڈیشن
ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح
سائز ۱۶/۲۰×۲۲ ہدیہ -/۱۰

قرآن مجید مدنی حافظی عکسی معرّیٰ
ہر صفحہ آیت پر ختم سائز ۸/۲۰×۳۰ ہدیہ -/۲۰

حمائل حقانی عکسی معرّیٰ ۸۵۲ صفحات
سائز ۱۶/۲۲×۳۰ ہدیہ -/۱۸

حافظی مدنی حمائل شریف عکسی جیبی ہدیہ -/۸
رحمانی عکسی سولہ سورہ کلاں رنگین مترجم ومحشی مکمل وظائف اوراد چشت
۱۶/۲۰×۳۰ ہدیہ -/۱۰

ایضاً جیبی خورد -/۵
رحمانی عکسی مترجم مناجات مقبول -/۱۰
رحمانی دلائل الخیرات عکسی رنگین مترجم ومحشی -/۱۰
مدنی اصلی بہشتی زیور مکمل مدلل عکسی از حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی -/۲۵
مدنی تبلیغی نصاب عکسی اردو از شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب -/۲۶
فضائل صدقات اول و دوم مکمل -/۲۰

مدنی تبلیغی نصاب عکسی دوم معہ فضائل صدقات وفضائل -/۳۴
مرنے کے بعد کیا ہوگا از مولینا عاشق الٰہی میرٹھی -/۱۰
مسلمان بیوی ۳/۵۰ مسلمان خاوند ۳/۵۰
میری نماز ۳/۵۰

ہندی مطبوعات

رحمانی قرآن مجید مترجم محشی ترجمہ حضرت مولانا فتح محمد صاحب جالندھری ہندی ترجمہ کوثر یزدانی ایم اے ایک طرف نہایت ہی جلی عربی متن دوسری طرف سلیس بامحاورہ ہندی ترجمہ اور اختصار تفسیر موضح القرآن حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب محدث دہلوی ہر آیت کے شروع میں شان نزول درج ہے
سائز ۲۲×۱۸ بہترین کاغذ اعلیٰ چھپائی ہدیہ مجلد رنگین -/۴۵

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری کی مشہور و معروف کتاب جو نہایت ہی سلیس ہندی میں ترجمہ کی گئی ہے اس میں چار کتابیں احوال برزخ، حالات جہنم، میدان حشر اور خدا کی جنت شامل ہیں
ہدیہ مجلد رنگین -/۱۵

پیغمبر اسلام یعنی سیرت رسول مصنفہ کوثر یزدانی ایم اے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اور جامع سوانح حیات نہایت ہی سلیس ہندی زبان میں چھپوائی ہے۔ مجلد رنگین -/۱۵

تبلیغی نصاب مکمل (ہندی) شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریاؒ جس میں مندرجہ ذیل سات کتب ہیں حکایت صحابہ رسائل نماز فضائل تبلیغ فضائل ذکر فضائل قرآن فضائل درود شریف
بہترین کاغذ چھپائی۔ ہدیہ مجلد رنگین -/۴۰

مدنی اصلی بہشتی زیور مکمل (ہندی) ۱۱ حصے از مولانا اشرف علی تھانویؒ جس میں گیارہ حصے ہیں نہایت سلیس ہندی میں ترجمہ
کاغذ بہترین اعلیٰ چھپائی ہدیہ مجلد رنگین -/۲۵
آرڈر کے ہمراہ پانچ روپے آنے ضروری ہیں۔

مدینہ بک ڈپو اردو بازار جامع مسجد دہلی

فون 265385

QA/PN-8



قتیل شفائی

○

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے
جو وابستہ ہوئے تم سے وہ افسانے کہاں جاتے

نکل کر دیر و کعبہ سے اگر ملتا نہ میخانہ
تو ٹھکرائے ہوئے انساں خدا جانے کہاں جاتے

تمہاری بے رخی نے لاج رکھ لی بادہ خانے کی
تم آنکھوں سے پلا دیتے تو پیمانے کہاں جاتے

چلو اچھا ہوا کام آ گئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

قتیل اپنا مقدر غم سے بیگانہ اگر ہوتا
تو پھر اپنے پرائے ہم سے پہچانے کہاں جاتے

مجموعہ ... نیا ادارہ دہلی ۱۹۵۷

سلام مچھلی شہری

○

نہ دردِ یادِ جاناں ہے نہ دنیا ہی کا غم ساقی
اب اس سے بڑھ کے کیا ہوگا ترا حسنِ کرم ساقی

کہاں ہم اور کہاں یہ جلوہ ہائے جامِ جم ساقی
یونہی بس رکھ لیا کرتے ہیں جینے کا بھرم ساقی

نہ جانے زندگی کی کتنی مبہم رہ گزاروں سے
لیے پھرتی ہے مجھ کو تیری زلفِ خم بہ خم ساقی

زمانہ اڑ رہا تھا آسماں تا آسماں لیکن
حضورِ جام و مینا ہو گئی رفتار کم ساقی

سویرا ہوتے ہوتے میکدے سے اٹھ ہی جاؤں گا
ابھی تھوڑا بہت باقی ہے ان آنکھوں میں دم ساقی

سلام اک "عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ" ہے
ابھی سے کس لیے ہے اس کے مرجانے کا غم ساقی

گل صد رنگ ایوان پبلشرز الہ آباد ۱۹۶۰



معین احسن جذبی

○

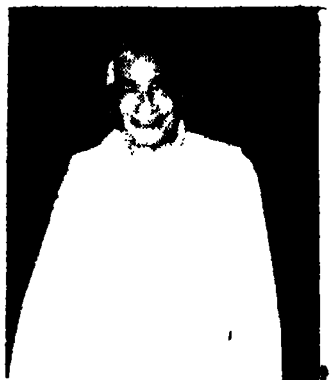
مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہشِ دنیا کون کرے

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب دنیا دنیا کون کرے

فروزاں آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۵۱



جاں نثار اختر

دور کوئی رات بھر گاتا رہا
تیرا ملنا مجھ کو یاد آتا رہا

اس طرح کچھ اس نے چھیڑا دل کا ساز
دیر تک ہر تار تھراتا رہا

حسن پر تاثیرِ غم ہوتی رہی
اک شگفتہ پھول کملاتا رہا

ہم بھی ضبطِ دردِ غم کرتے رہے
وہ بھی اپنے جی کو سمجھاتا رہا

ہم نہ آئے پھر چمن میں لوٹ کر
موسمِ گل بار بار آتا رہا

اب تو اختر لطفِ غم بھی مٹ گیا
اب تو وہ آرام بھی جاتا رہا

انتخاب کلام جاں نثار اختر انجمن ترقی اردو علی گڑھ



شمیم کرہانی

جو دیکھتے ہوئے نقشِ قدم گئے ہوں گے
پہنچ کے وہ کسی منزل پہ تھم گئے ہوں گے

پلٹ کے دشت سے آئیں گے پھر نہ دیوانے
پکار لو کہ ابھی کچھ قدم گئے ہوں گے

ترے جنوں نے پکارا تھا ہوش والوں کو
نہ جانے کون سے عالم میں ہم گئے ہوں گے

کہاں سے آئی دیارِ شفق میں رنگینی
ادھر سے تیرے شہیدانِ غم گئے ہوں گے

شمیم ہمتِ پائے طلب کی بات نہ پوچھ!
وہاں گیا ہوں جہاں لوگ گم گئے ہوں گے

عکسِ گل ۱۹۵۷ احباب پبلشرز لکھنؤ ۱۹۶۴



شکیل بدایونی

مری زندگی ہے ظالم ترے غم سے آشکارا
ترا غم ہے در حقیقت مجھے زندگی سے پیارا

وہ اگر برا نہ مانیں تو جہانِ رنگ و بو میں
میں سکونِ دل کی خاطر کوئی ڈھونڈ لوں سہارا

مجھے آگیا یقیں سا کہ یہی ہے میری منزل
سرِ راہ جب کسی نے مجھے دفعتاً پکارا

میں بتاؤں فرق ناصح جو ہے مجھ میں اور تجھ میں
مری زندگی تلاطم تری زندگی کنارا

مجھے فخر ہے اسی پر یہ کرم بھی ہے مجھی پر
تری کم نگاہیاں بھی مجھے کیوں نہ ہوں گوارا

کوئی اے شکیل دیکھے یہ جنوں نہیں تو کیا ہے
کہ اسی کے ہو گئے ہم جو نہ ہو سکا ہمارا

رعنائیاں ... نیا ادارہ دہلی ۱۹۵۰



محمود سلطان پوری

ہمیں شعورِ جنوں ہے کہ جس چمن میں رہے
نگاہ بن کے حسینوں کی انجمن میں رہے

تو اے بہارِ گریزاں کسی چمن میں رہے
مرے جنوں کی مہک تیرے پیرہن میں رہے

وہی ہے آبلہ پائی وہی چمن بندی
چنے دوانہ ترا شہر میں کہ بن میں رہے

نہ ہم قفس میں رکے مثلِ بوئے گل صیاد
نہ ہم مثالِ صبا حلقۂ رسن میں رہے

کھلے جو ہم تو کسی شوخ کی نظر میں کھلے
رہے گرہ تو کسی زلف کی شکن میں رہے

زباں ہماری نہ سمجھا یہاں کوئی مجروح
ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے

غزل — نظار پبلشرز بمبئی — ۱۹۵۹



ساغر نظامی

دل کی آنکھیں کھلتی ہیں جب چشمِ ظاہر سوتی ہے
بے ہوشی کے پردے میں سیرِ عالم ہوتی ہے

کافر گیسو والوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے
حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے

مجھ میں تجھ میں فرق نہیں مجھ میں تجھ میں فرق یہ ہے
تو دنیا پر ہنستا ہے دنیا مجھ پر روتی ہے

صبر و سکوں دو دریا ہیں بھرتے بھرتے بھرتے ہیں
تسکیں دل کی بارش ہے ہوتے ہوتے ہوتی ہے

جینے میں کیا راحت تھی مرنے میں تکلیف ہے کیا
جب دنیا کیوں ہنستی ہے اب دنیا کیوں روتی ہے

رات کے آنسو اے ساغر پھولوں میں بھی جاتے ہیں
صبح چمن اس پانی سے کلیوں کا منہ دھوتی ہے

رنگ محل — الہلال پبلشرز الہ آباد — ۱۹۶۰



سکندر علی وجد

موت رونے سے ٹل نہیں سکتی
یہ تمنا نکل نہیں سکتی

گلشنِ کائنات کی رونق
وقت کی دھوپ ڈھل نہیں سکتی

نوجوانی کے تیز دھارے پر
عقل کی ناؤ چل نہیں سکتی

اس نے پھر مسکرا کے دیکھ لیا
اب طبیعت سنبھل نہیں سکتی

وجد تم ہی ذرا بدل جاؤ
ساری دنیا بدل نہیں سکتی

بیاضِ مریم — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی — ۱۹۶۴



غلام ربانی تاباں

زندگی دل پہ عجب سحر سا کرتی جائے
اک جگہ ٹھہری لگے اور گزرتی جائے

آنسوؤں سے کوئی آواز کو نسبت نہ سہی
بھیگتی جائے تو کچھ اور نکھرتی جائے

دیکھتے دیکھتے دھندلا گئے منظر سارے
تیری زلفوں کی طرح شام بکھرتی جائے

بات کا راز کھلے بات کا انداز کھلے
تیرے ہونٹوں سے چلے دل میں اترتی جائے

رفتہ رفتہ کسی گمنام لہو کی تحریر
قاتلِ شہر کے دامن پہ ابھرتی جائے

میں نے کب دعویٔ الہام کیا ہے تاباںؔ
لکھ دیا کرتا ہوں جو دل پہ گزرتی جائے

نوائے آوارہ — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی — ۱۹۷۶



اعجاز صدیقی

یہ دنیا خالی تو نہیں انسانوں سے
ملتے رہیے اپنوں سے بیگانوں سے

دیجیے کوئی آپ ہی دانائی کا ثبوت
نادانی تو ممکن ہے نادانوں سے

پاؤں نہیں ہیں اب تک کانٹوں سے خارج
ہاتھ ابھی تک لپٹے ہیں دامانوں سے

اندر اندر کھل رہی ہے آتشِ گل!
شعلے اور بھی اٹھیں گے گلدانوں سے

قاتل ہیں ایک ایسی زباں کے صبح و قتل
جس نے رشتہ جوڑ دیا انسانوں سے

کچھ ہاتھوں میں پتھر ہیں بے تاب اعجازؔ
جھانک رہی ہیں کچھ آنکھیں ایوانوں سے

شاعر بمبئی —— سالنامہ —— ۱۹۶۵

کلیم عاجز

بلاتے کیوں ہو عاجزؔ کو بلانا کیا مزا دے ہے
غزل کمبخت کچھ ایسی پڑھے ہے دل ہلا دے ہے

محبت کیا بلا ہے چین لینا ہی بھلا دے ہے
ذرا بھی آنکھ جھپکے ہے تو بیتابی جگا دے ہے

غضب کی فتنہ سازی آئے ہے اس آفتِ جاں کو
شرارت خود کرے ہے اور ہمیں تہمت لگا دے ہے

مری بربادیوں کا ڈال کر الزام دنیا پر
وہ ظالم اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر مسکرا دے ہے

اب انسانوں کی بستی کا یہ عالم ہے کہ مت پوچھو
لگے ہے آگ اک گھر میں تو ہمسایہ ہوا دے ہے

کلیجہ تھام کے سنتے ہیں لیکن سن ہی لیتے ہیں
مرے یاروں کو میرے غم کی تلخی بھی مزا دے ہے

وہ جو شاعری کا سبب ہوا — ۱۹۷۶



خلیل الرحمن اعظمی

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے

میں اپنے گھر کو بلندی پہ چڑھ کے کیا دیکھوں
عروجِ فن مری دہلیز پر اتار مجھے

ابلتے دیکھی ہے سورج سے میں نے تاریکی
نہ راس آئے گی یہ صبحِ زر نگار مجھے

کہے گا دل تو میں پتھر کے پاؤں چوموں گا
زمانہ لاکھ کرے آکے سنگسار مجھے

وہ فاقہ مست ہوں جس راہ سے گزرتا ہوں
سلام کرتا ہے آشوبِ روزگار مجھے

نیا عہد نامہ — انجمن ترقی اردو علی گڑھ — ۱۹۶۵

شہاب جعفری

شاید کہیں ... ہے بہت دور سے بیتاب مجھے
لے کے چھپ جائیں نہ آرزو کے خواب مجھے

اب میں اک موجِ شبِ تار ہوں سنبھال سنبھال
راہ میں چھوڑ گیا ہے مرا مہتاب مجھے

اب تک اک شمعِ سیہ پوش ہوں صحرا صحرا
تجھ سے چھٹ کر نہ ملی رہ گزرِ خواب مجھے

دشت در دشت مرے سر سے گزرتا سورج
لے کے لوٹا ہے یہی نورِ فلک تاب مجھے

اب مجھے ڈھونڈ نہ آغوشِ گریزاں ہر سو
لے اڑی خاک بہا لے گیا سیلاب مجھے

میں بھی صحرا ہوں مجھے سنگ سمجھنے والو
اپنی آواز سے کرتے چلو سیراب مجھے

شام پوچھے تو نہ کہنا کہ میں دنیا میں نہیں
لے کے پھر آئے گا اس گھر میں مرا خواب مجھے

موج کا شہر — ملا فکر و شعور — ۱۹۶۷

خورشید احمد جامی

رات چپ چاپ ہے راتوں کے مسافر ہیں اداس
کوئی دلچسپ کہانی بھی نہیں وقت کے پاس

زندگی آج وہ تاریک مکاں ہے جس میں
منہ چھپائے ہوئے بیٹھا ہے سحر کا افلاس

دل کی مٹی میں ہے یہ کس کے لہو کی خوشبو
کون گزرا ہے یہ پہنے ہوئے زخموں کا لباس

اب بھی رکتا ہے کسی یاد کے دروازے پر
چند بچھڑے ہوئے خوابوں کا سلگتا احساس

کتنے چہروں پہ کڑی دھوپ ہے صحراؤں کی
کتنی آنکھوں میں نظر آتی ہے اک عمر کی پیاس

جس کو ماحول کی پلکوں سے اٹھالایا تھا
وہی اک شعلۂ لرزاں ہے مرے فن کی اساس

شہر امید بھی وہ دشتِ وفا ہے جامی
اب جہاں کوئی نہیں چارہ گر و درد شناس

برگ آوارہ — شائع کردہ شاہد پبلی کیشنز — ۱۹۶۸





شہریار

○

تجھ سے بچھڑے ہیں تو اب کس سے ملاتی ہے ہمیں
زندگی دیکھیے کیا رنگ دکھاتی ہے ہمیں

مرکزِ دیدہ و دل تیرا تصور تھا کبھی
آج اس بات پہ کتنی ہنسی آتی ہے ہمیں

پھر کہیں خواب و حقیقت کا تصادم ہوگا
پھر کوئی منزلِ بے نام بلاتی ہے ہمیں

دل میں وہ درد نہ آنکھوں میں وہ طغیانی ہے
جانے کس سمت یہ دنیا لیے جاتی ہے ہمیں

گردشِ وقت کا کتنا بڑا احساں ہے کہ آج
یہ زمیں چاند سے بہتر نظر آتی ہے ہمیں

اسمِ اعظم   انڈین بک ہاؤس علی گڑھ   ۱۹۶۵

بانیؔ

○

خاک و خوں کی وسعتوں سے باخبر کرتی ہوئی
اک نظر امکاں ہزار امکاں سفر کرتی ہوئی

اک عجب بے چین منظر آنکھ میں ڈھلتا ہوا
اک خلش سفاک سی سینے میں گھر کرتی ہوئی

اک کتابِ صد ہنر تشریحِ زائل کا شکار
ایک مہمل بات جادو کا اثر کرتی ہوئی

جسم اور اک نیم پوشیدہ ہوس آمادگی
آنکھ اور سیرِ لباسِ مختصر کرتی ہوئی

تشنگی کا زہر سینے کو سیہ کرتا ہوا
اک طلب اپنے نشے کو تیز تر کرتی ہوئی

وہ نگاہ اپنے لیے بے صد حسابِ آرزو
اور مجھے بیگانۂ نفع و ضرر کرتی ہوئی

حسابِ رنگ   نیشنل اکیڈمی نئی دہلی   ۱۹۷۶

ندا فاضلی

○

دل تھا حساس بہت زیر و زبر ...
جو بھی طوفاں اٹھا پہلے مرے گھر ...

کسی دیوار سے ٹکرایا نہ در سے گ...
وقت حیرت ہے خدا جانے کدھر ...

انقلابوں کا کوئی وقت نہ تاریخ ...
جب بھی پانی کسی سیلاب کا سر ...

اتنا چھوٹا تو کبھی شہر نہیں ...
تیرے رستے ہی سے گزرا میں جا...

زندگی جاگی ہوئی آنکھوں کا رتجگ...
جو بھی گزرا وہ سوالوں کے سا...

مورناچ · نیو ایرا پبلیکیشنز بمبئی



فضا ابن فیضی

دادِ فن بھی نہ ملی عرضِ ہنر سے بھی گیا
اپنی تہ میں جو نہ اترا وہ گہر سے بھی گیا

سورج ابھرا تو سیہ پڑ گئے چہرے کتنے
روشنی کا جو تصور تھا سحر سے بھی گیا

پُرسکوں اپنے کو رکھتا ہوں سمندر کی طرح
ورنہ طوفاں تو گزر کے مرے سر سے بھی گیا

تو بھی اب میرے لیے کچھ دنوں آوارہ بھٹک
جستجو میں تیری میں اپنی خبر سے بھی گیا

کتنا مہنگا ہے نہ پوچھو یہ قلم کا سودا
ہم کو تھی نفع کی امید سو گھر سے بھی گیا

تو لہو بن کے رگ و پے میں چھلک جسم میں دوڑ
ڈھل گیا اشک میں جو دیدۂ تر سے بھی گیا

وقت کی بات ہے سب کس کا گلہ کیجیے فضا
وہ طبیعت کا خلوص اہلِ نظر سے بھی گیا

سفینۂ زرگل — دانش کدہ پبلیکیشنز مئو ناتھ بھنجن - ۱۹۷۳

مظہر امام

اک گذارش ہے بس اتنا کیجیے
جب کبھی فرصت ہو آیا کیجیے

ہم بھی دیکھیں اپنی نظروں کا مآل
ہو سکے تو ہم سے پردا کیجیے

لوگ اس کا بھی غلط مطلب نہ لیں
اجنبیت سے نہ دیکھا کیجیے

خود کو اپنی آنکھ سے دیکھا تو ہے
اب مری آنکھوں سے دیکھا کیجیے

عشق کو کب یاد تھی رسمِ وفا
حسن کا کس منھ سے شکوا کیجیے

ظلمتِ غم جب کبھی امڈے امام
شمعِ فکر و فن جلایا کیجیے

زخمِ تمنا — انالیہ اردو پبلشرز کٹک ۱۹۶۲



نازش پرتاپ گڑھی

ہمارے ہم سفروں کو بھی ہم پہ شک گزرا
جمی ہے چہرے پہ گردِ سفر سلیقے سے

نہ حرف آیا چمن پر نہ خود ہوئی رسوا
پھری ہے نکہتِ گل در بدر سلیقے سے

نہ سر پہ گرد ہی آئے نہ پاؤں میں چھالے
کوئی چلے جو رہِ زیست پر سلیقے سے

ہجومِ گل کا یہ پہلو ہے کس قدر تاریک
نظر ٹکے نہ کسی پھول پر سلیقے سے

میں اپنے آپ کو پہچاننے سے منکر ہوں
یہ ایک طنز ہے اس دور پر سلیقے سے

لکیریں — بزمِ اردو پرتاپ گڈھ ۱۹۶۹



وحید اختر

جس کو مانا تھا خدا خاک کا پیکر نکلا
ہاتھ آیا جو یقیں وہم سراسر نکلا

اک سفرِ دشتِ خرابی سے سرابوں تک ہے
آنکھ کھولی تو جہاں خواب کا منظر نکلا !

کل جہاں ظلم نے کاٹی تھیں سروں کی فصلیں
نم ہوئی ہے تو اسی خاک سے لشکر نکلا !

تھی تہی دست ہر اک شاخِ خزاں تھی جب تک
فصلِ گل آئی تو ہر شاخ سے خنجر نکلا !

خشک آنکھوں سے اٹھی موج تو دنیا ڈوبی
ہم جسے سمجھے تھے صحرا وہ سمندر نکلا

دوریاں سنگ کو بھی شمع بنا دیتی ہیں
چھو کے دیکھا تو جو دل موم تھا پتھر نکلا

زیرِ پا اب نہ زمیں ہے نہ فلک ہے سر پر
سیلِ تخلیق بھی گرداب کا منظر نکلا

شب کا زینہ   مکتبۂ شعر و حکمت حیدرآباد ۱۹۷۳

حسن نعیم

ایک بھی حرف نہ تھا خوش خبری کا لکھا
نامۂ وقت ملا اور کسی کا لکھا

آ بسے کتنے نئے لوگ مکانِ جاں میں
بام و در پر ہے مگر نام اسی کا لکھا

موجۂ اشک سے بھیگی نہ کبھی نوکِ قلم
وہ انا تھی کہ کبھی درد نہ جی کا لکھا

کوئی جدت تو کوئی حسنِ تغزل سمجھا
مرثیہ جب بھی کوئی اپنی صدی کا لکھا

بات شیریں سی لگی فن کے طرفداروں کو
قصۂ ہر چند حسن کوہ کنی کا لکھا

اشعار   شاہکار پبلیکیشنز حیدرآباد ۱۹۷۱

بشیر بدر

اپنی کھوئی ہوئی جنتیں پا گئے زیست کے راستے بھولتے بھٹکتے
موت کی وادیوں میں کہیں کھو گئے تیری آواز کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے

مست و سرشار تھے کوئی ٹھوکر لگی آسماں سے زمیں پر لیں ہم آ گئے
شاخ سے پھول جیسے کوئی گر پڑے رقصِ آواز پر جھومتے جھومتے

کوئی پتھر نہیں ہوں کہ جس شکل میں مجھ کو چاہو بنایا بگاڑا کرو
بھول جانے کی کوشش تو کی تھی مگر یاد تم آ گئے بھولتے بھولتے

آنکھیں آنسو بھری پلکیں بوجھل گھنی جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہیے انہیں کچھ ہنسی آ گئی بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

اب وہ گیسو نہیں ہیں جو سایہ کریں اب وہ شانے نہیں جو سہارا بنیں
موت کے بازوؤ تم ہی آگے بڑھو تھک گئے ہم گھومتے گھومتے

دل میں جو تیر ہیں اپنے ہی تیر ہیں اپنی زنجیر سے پا بہ زنجیر ہیں
سنگریزوں کو ہم نے خدا کر دیا آخرش رات دن پوجتے پوجتے

اکائی   کا پی اینڈ یونیورسٹی بک اسٹال علی گڑھ   ۱۹۶۹



شمیم حنفی

○

یہ کہانی ایک حرفِ رائیگاں تک جائے گی
زندگی معلوم ہے سب کو کہاں تک جائے گی

میں بھی کھو جاؤں گا آخر آنسوؤں کے سیل میں
یہ اندھیری شام جب کوہِ گراں تک جائے گی

توڑ کر زنجیرِ جاں سب بے کراں ہو جائیں گے
ساعتِ افسردہ بھی کس کے مکاں تک جائے گی

اے خدا اُس مشعلِ گم گشتہ کو محفوظ رکھ
روشنی اس کی مرے نام و نشاں تک جائے گی

ریگِ صحرا کو حرارت دے ہوا کو اضطراب
ایک دن ہر موج تیرے آستاں تک جائے گی

اے فنا کی لہر وہ نیلا کنارہ دور ہے
میں بھی تیرے ساتھ جاؤں گا جہاں تک جائے گی

ہمعصر ادب نمبر ماہنامہ شاعر بمبئی ۱۹۰۰ء



کمال احمد صدیقی

○

مجھے ماحول کی شدت سے بچائے رکھنا
مجھ پہ زلفوں کے مہکتے ہوئے سائے رکھنا

جس گھڑی پہلی ملاقات ہوئی تھی تم سے
وہ گھڑی اپنے خیالوں میں بسائے رکھنا

روز اک جشن کرو اور مسرت بانٹو
جو سمجھنا مرے جینے کی اٹھائے رکھنا

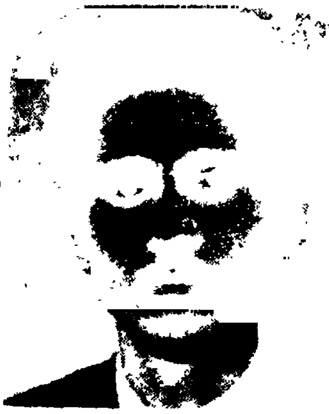
ایک دن آؤں گا، آؤں گا، ضرور آؤں گا
تم مری یاد کو سینے سے لگائے رکھنا

تم نہ دیکھو جو مرے خواب کوئی بات نہیں
اپنا ہر خواب مرے دل میں بچھائے رکھنا

وہ تمہیں دیکھنا چاہے تو نگاہیں اپنی
اے کمال اس کی نگاہوں سے ہٹائے رکھنا

ماہنامہ روبی

روبی پبلیکیشنز نئی دہلی اپریل ۱۹۷۹ء



اعزاز افضل

○

اجالے تیل چھڑکنے لگے اجالوں پر
عجیب وقت پڑا ہے چراغ والوں پر

تمہارے ذہن میں جو آج چھپ رہے ہوں گے
میں کل سے سوچ رہا ہوں انھیں سوالوں پر

نہ اٹھ سکا ترے طرزِ خرام سے پردہ
ہوائیں ڈال گئیں خاک پائمالوں پر

تمہارا عالمِ مستی ڈھکا چھپا ہی سہی
مری نگاہ سے لوٹے ہوئے پیالوں پر

محاکمہ نہ کریں آپ اپنی باتوں کا
یہ کام چھوڑ دیا جائے سننے والوں پر

یہ کیا ضرور کہ رخ سب کا ایک جانب ہو
فضا کی قید لگاؤ نہ اڑنے والوں پر

الحریٰ ۃ آندھی ۱۹۸۱ء

عنوان چشتی

عشق پھر عشق ہے آشفتہ سری مانگے ہے
ہوش کے دور میں بھی جامہ دری مانگے ہے

ہائے آغازِ محبت میں وہ خوابوں کے طلسم
زندگی پھر وہی آئینہ گری مانگے ہے

دل جلانے پہ بہت طنز نہ کر اے ناداں
شبِ گیسو بھی جمالِ سحری مانگے ہے

میں وہ آسودۂ جلوہ ہوں کہ تیری خاطر
ہر کوئی مجھ سے مری خوش نظری مانگے ہے

آپ چاہیں تو تصور بھی مجسم ہو جائے
ذوقِ آذر تو نئی جلوہ گری مانگے ہے

حسن ہی تو نہیں بے تابِ نمائش عنواںؔ
عشق بھی آج نئی جلوہ گری مانگے ہے

ذوقِ جمال — اردو سماج نئی دہلی — ۱۹۶۶

مسعود اختر جمال

شاعری میری غمِ عشق کی تفسیر بھی ہے
رامش و رنگ کے لمحات کی تصویر بھی ہے

مژدۂ امن بھی ہے میری نوائے ہستی!
وقت کے ہاتھ میں چلتی ہوئی شمشیر بھی ہے

ساز اٹھاتا ہوں مگر یاد رہے اہلِ نشاط
ساز کی لے میں نہاں سوز کی تاثیر بھی ہے

زندگی خواب سہی خوابِ پریشاں ہی سہی
دل یہ کہتا ہے یہی خواب کی تعبیر بھی ہے

ناشنیدہ سے جواب تک مرے نغمے ہیں جمالؔ
کچھ زمانے کی خطا کچھ مری تقصیر بھی ہے

گلِ صد رنگ — ایوان پبلشرز الہ آباد — ۱۹۶۰

والی آسی

جسم میں بن کے جو ہم صورتِ جاں رہتے ہیں
عمر بھر وہ بھی مگر ساتھ کہاں رہتے ہیں

سارا دن سب کو ہنساتے ہیں جو محفل محفل
شام ہوتے ہی وہ چہرے بھی دھواں رہتے ہیں

یوں درِ دل پہ تمناؤں کو آواز نہ دو
ایک مدت سے یہاں وہم و گماں رہتے ہیں

سہمے سہمے سے نظر آتے ہیں سب لوگ یونہی
جیسے بھیگے ہوئے بارش میں مکاں رہتے ہیں

جو کبھی ساتھ رہا کرتے تھے سائے کی طرح
اب خدا جانے وہی لوگ کہاں رہتے ہیں

لوگ پیاس اپنی بجھاتے ہیں چلے جاتے ہیں
اور دریا ہیں کہ دن رات رواں رہتے ہیں

غم کو سینے میں چھپائے ہوئے رکھتا یارو
غم بہت ساتھ نبھاتے ہیں جواں رہتے ہیں

باادب ہو کے سخن منہ سے نکالو والیؔ
لکھنؤ شہر میں کچھ اہلِ زباں رہتے ہیں

ضمیمہ قومی آواز لکھنؤ — ۱۹۸۲



سلطان اختر

پلٹ کے روئی ہوا جب شکستہ شاخوں سے
لہو ٹپکنے لگا زرد زرد پتوں سے

کسی نظر میں خوش اخلاقیاں بھی طنز نہ ہوں
اداس ہو کے ہی ملیے اداس لوگوں سے

خزاں کی دھوپ سے کمھلا گئیں ہری شاخیں
دبیز چھاؤں گریزاں ہوئی درختوں سے

سوائے خواب پریشاں کے اور کچھ نہ ملا
اداس لوٹے ہیں ہم نیند کے جزیروں سے

جہاں بھی تیرگی مصلحت بڑھی اختر
کرن سی پھوٹ پڑی ذہن کے دریچوں سے

۱۹۶۰ کی منتخب شاعری ۔ ادارۂ ترقی پبلشرز دہلی ۱۹۶۹



پرکاش فکری

بھلا کے اس کو بہت بے نیاز جی کو آئے گا
مگر وہ سانپ لہو میں جو سر اٹھائے گا

بڑے غرور سے سورج چمک رہا ہے ابھی
ڈھلے گا دن تو یہی خون میں نہائے گا

گریں گے پھول اندھیرے میں آنسوؤں کی طرح
روش روش پہ اداسی کا رنگ چھائے گا!

مرے فضول سے قصہ کو وقت کا راوی
ہزار ڈھنگ سے ہر دور کو سنائے گا

میں ہو تو آؤں گا اس راہ سے مگر فکری
مرا وہ نقش قدم بھید کب چھپائے گا

ارتکاز ـــــ مطبوعات نشتر ناگپور ـــ ۱۹۷۱



افتخار امام صدیقی

اس میں کوئی شکوہ نہ شکایت نہ گلہ ہے
یہ بھی کوئی خط ہے جو محبت سے بھرا ہے

دیتا ہے پتا دشتِ تمنا مرے دل کا
اجڑے ہوئے گھر میں کوئی مہمان رہا ہے

میں تجھ سے بچھڑ کر ہوں عذابوں کے نگر میں
ہر موڑ تری یاد کا اک کرب بلا ہے

ہر لمحہ مری روح پہ لگتے ہیں نئے زخم
کیا جانئے کیا وقت کے ماتھے پہ لکھا ہے

چہرے میں ہے آئینہ کہ آئینے میں چہرہ
معلوم نہیں کون کسے دیکھ رہا ہے

تغزل ۔ خیابانِ ادبی کنشنر بمبئی ۱۹۷۹



محسن زیدی

کب گرفتار کسی قیدِ مکانی میں رہے
ہم تو بہتے ہوئے پانی تھے روانی میں رہے

مُشت بھر خاک ہی رستے کی اٹھا کر دے دے
کچھ ترا ہاتھ بھی منزل کی نشانی میں رہے

کیا جادو تھا کہ ہم بن گئے پتھر جیسے
کون سا نشہ تھا ہم جس کی گرانی میں رہے

اپنے وقتوں میں بھی ہم اپنے لیے جی نہ سکے
زندگی ہم تو تری مرثیہ خوانی میں رہے

مرے اشعار کے پیکر میں سمو دے خود کو
فاصلہ کیوں کوئی الفاظ و معانی میں رہے

حق سے رنگین تھے دنیا کے فسانے محسن
کتنے بے رنگ وہ خود اپنی کہانی میں رہے

رنشۂ کلام — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی — ۱۹۷۸



حیات لکھنوی

حصارِ کرب سے باہر سکوں کہاں ہوگا
جہاں بھی جائیں گے ہم سر پہ آسماں ہوگا

معاملات کو بے اعتبار رہنے دو
مرے یقیں سے وہ اور بدگماں ہوگا

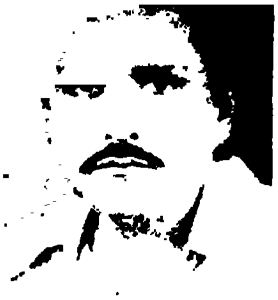
نظر نظر نے جسے دادِ سرخوشی دی ہے
وہ اپنی ذات سے اجڑا ہوا مکاں ہوگا

بڑے خلوص بڑی سادگی سے ملتا تھا
وہ ایک شخص خدا جانے اب کہاں ہوگا

نظر نواز فضا خوشگوار ہے موسم
کبھی یہ منظرِ بستی دھواں دھواں ہوگا

شبِ فراق کا حاصل حیات پاؤ گے
کبھی اجالا اندھیروں کے درمیاں ہوگا

حصارِ آب — پی کے پبلیکیشنز نئی دہلی — ۱۹۷۷



سید شکیل دسنوی

آؤ تم یوں بیٹھے ہو کیوں بچشمِ نم تنہا
کب کسی سے کٹتا ہے زندگی کا غم تنہا

اب تو جیسے دل اپنا اجڑا سا شوالہ ہے
رہ گئے ہیں یادوں کے اس میں کچھ صنم تنہا

ڈھونڈیئے تو یادیں بھی دور تک نہیں ملتیں
اس قدر کوئی ہوگا اس جہاں میں کم تنہا

کتنے ٹکڑے خوابوں کے آس پاس بکھرے ہیں
دیکھتے ہیں اک اک کو ہم بچشمِ نم تنہا

شہرِ دل کی گلیوں میں اب تو خاک اڑتی ہے
دستکیں ہر اک در پر دے رہا ہے غم تنہا

بچھڑیں سب امیدیں بھی جاں بلب ارادے بھی
غم کے تپتے صحرا میں چل رہے ہیں ہم تنہا

رنگ اے زندگی — موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی — ۱۹۹۱

نظمیں

جوش ملیح آبادی
ن۔ م۔ راشد
میراجی
فیض احمد فیض
سردار جعفری
اختر الایمان
ساحر لدھیانوی
وامق جونپوری
نریش کمار شاد
شاذ تمکنت

امجد نجمی
حرمت الاکرام
قاضی سلیم
زبیر رضوی
مخمور سعیدی
عمیق حنفی
بلراج کومل
راج نرائن راز
محمد علوی
کمار پاشی

رفعت سروش
کرامت علی کرامت
ساجدہ زیدی
صلاح الدین پرویز
اطہر عزیز



آوازِ شاعر

جوش ملیح آبادی

میں زمیں پر مصحفِ احساس کی تفسیر ہوں　　عشق کی تنویر، خوابِ حسن کی تعبیر ہوں
جو دو عالم کی حدیں جکڑے ہے وہ زنجیر ہوں　　میں ستاروں کی زباں ہوں، چاند کی تقریر ہوں
میری نظمیں روشنی ہیں قلبِ حق آگاہ کی
یہ سنہری کنجیاں ہیں قصرِ مہر و ماہ کی

شہد میری گفتگو ہے، سانس ہے میری گلاب　　نطق سے میرے نمایاں ہے تخیل کا شباب
پیکرِ خاکی ہوں، لیکن وہ طلسمِ آب و تاب　　جس کے ہر ذرہ میں گردش کر رہا ہے آفتاب
ڈالتا ہوں پرتوِ گلشن خس و خاشاک پر!
عرش کی مہریں لگاتا ہوں جبینِ خاک پر

وارثِ کونین ہوں، میرا کوئی ثانی نہیں!　　میرے قدموں پر جھکی رہتی ہے فطرت کی جبیں
مسکراتی ہے غرورِ عرش پر میری زمیں　　ظالم و سرکش عناصر ہیں مرے زیرِ نگیں!
رقص کرتا ہے نظامِ دہر میرے ساز پر
کاروانِ روح چلتا ہے مری آواز پر

ناز سے گلشن میں چلتی ہے ہوا میرے لیے　　جھوم کر آتی ہے ساون کی گھٹا میرے لیے
حسن کو بخشے گئے ناز و ادا میرے لیے　　ساز سے باہر نکلتی ہے صدا میرے لیے
صبح کے رنگین غنچوں میں ترنم مجھ سے ہے
چاندنی راتوں میں اندازِ تبسم مجھ سے ہے

صبح کو غنچوں میں در آتی ہے جب پہلی کرن　　مجھ سے شبنم کی زباں ہوتی ہے سرگرمِ سخن
چاندنی میں جب چھلک اٹھتا ہے برگِ یاسمن　　عشق ہوتا ہے مری محفل میں صدرِ انجمن
زمزمے سنتا ہوں شب کی محفلِ خاموش میں
حسن آ جاتا ہے تاروں سے مری آغوش میں

سرد ہو جائے گی جب یاں عقل کی قندیلِ دماغ　　تیرگی میں اور بھی چمکیں گے میرے دل کے داغ
عصرِ حاضر کا زمانہ جب لگائے گا سراغ　　دور سے جلتا نظر آئے گا شاعر کا چراغ
رات جب تاریک ہوگی برق چمکاؤں گا میں
اک ستارہ نور کا اس وقت بن جاؤں گا میں

پرچمِ تعمیر تو جب چرخ پر لہرائے گا!　　عصرِ پارینہ کے ایواں کا کلس تھرائے گا
انقلابِ دہر تاج و تخت کو ٹھکرائے گا　　ایک میرا نقش ہے دنیا میں جو رہ جائے گا
مشعلوں کو جب بجھا دے گی ہوا آفاق میں
یہ کنول روشن رہے گا آندھیوں کے طاق میں

فکر و نشاط　　کتب خانہ تاج آفس بمبئی　　۱۹۴۸

ن. م. راشد

"اے سمندر"

اے سمندر! پیکرِ شب، جسم، آوازیں
رگوں میں دوڑتا، پھرتا لہو
پتھروں پر سے گزرتے، رقص کی خاطر اُڑان دیتے گے
اور میں مرتے درختوں میں نہاں سنتا رہا ــــ
ان درختوں میں مرا اک ہاتھ عہدِ رفتہ کے سینے پہ ہے
ــــ جس پہ جل جلتے ہیں ہاتھ ــــ
دوسرا اک شہرِ آئندہ میں ہے جویائے راہ
شہر ــــ جس میں آرزو کی بے انڈیلی جائے گی
زندگی سے رنگ کھیلا جائے گا

اے سمندر!
چاند کی ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختے
شب کی طغیانی کی باہوں پر رواں
اے سمندر! آنے والے دن کو یہ تشویش ہے
رات کا کابوس جو دن کے نکلتے ہی ہوا ہو جائے گا
کون دے گا اس کے ژولیدہ سوالوں کا جواب؟
کس کرن کی نوک
کن بگولوں کا خواب؟

اے سمندر!
میں گنوں گا دانہ دانہ تیرے آنسو
جن میں اک زنگار بے ہستی کا شور۔

اے سمندر! رات اس ساحل پہ غراتے رہے
غم زدہ لمحات کے ترسے ہوئے کتوں کی نظریں
چاند پر پڑتی رہیں
ان کی عوعو چاند تک لپکی رہی



ــــــــــ

اے سمندر! میں گنوں گا دانہ دانہ تیرے آنسو
جن میں آنے والا جشنِ وصل ناآسودہ ہے
جن میں فردائے عروسی کے لیے کرنوں کا ہار
شہرِ آئندہ کی روحِ بے زماں چنتی رہی
میں ہی دوں گا اے سمندر! جشن میں دعوت تجھے
استراحت تیری لہروں کے سوا کس شے میں ہے؟
اے سمندر! ابر کے اوراقِ کہنہ
بازوئے دیرینۂ امید پر اڑتے ہوئے
دور سے لائے ہیں کیسی داستاں!
شہرِ آئندہ کے دست و پا کے رنگ
ــــ جیسے جاں دینے پہ سب آمادہ ہوں ــــ
دست و پا میں جاگ اٹھے
راگ کے مانند، میں بھی دست و پا میں جاگ اٹھا
اے سمندر!
کل کے جشنِ نو کی موج
شہرِ آئندہ کی بینائی کی حد تک آ گئی
اب گھروں سے ــــ
جن میں راندہ روز و شب کی چار دیواری نہیں
مرد و زن نکلیں گے ہاتھوں میں اٹھائے برگ و بار
جن کو چھو لینے سے لوٹ آئے گی رو گرداں بہار
اے سمندر!

ن م راشد فکر و فن مکتبۂ شعور و حکمت حیدرآباد ۱۹۸۱



میراجی

میں ڈرتا ہوں مسرت سے

میں ڈرتا ہوں مسرت سے
کہیں یہ میری ہستی کو
پریشاں، کائناتی نغمۂ مبہم میں الجھا دے
کہیں یہ میری ہستی کو بنا دے خواب کی صورت

مری ہستی ہے اک ذرہ
کہیں یہ میری ہستی کو چکھا دے مہرِ عالم تاب کا نشہ
ستاروں کا علمبردار کر دے گی مسرت میری ہستی کو
اگر پھر سے اسی پہلی بلندی سے ملا دے گی
تو میں ڈرتا ہوں ــــ ڈرتا ہوں
کہیں یہ میری ہستی کو بنا دے خواب کی صورت

میں ڈرتا ہوں مسرت سے
کہیں یہ میری ہستی کو
بھلا کر تلخیاں ساری
بنا دے دیوتاؤں سا
تو پھر میں خواب ہی بن کر گزاروں گا
زمانہ اپنی ہستی کا .....

میراجی شخصیت اور فن موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۸۱



فیض احمد فیض

نثار میں تری گلیوں پہ

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کہ دستِ بہانہ جو کے لیے!
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے!
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی!
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہو گی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق!
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی!
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی!
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

[illegible] جیل ——— [illegible] ——— [illegible]



سردار جعفری

گفتگو

(ہند پاک دوستی کے نام)

گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح تک شامِ ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے
وہ جو الفاظ کے ہاتھوں میں ہیں سنگِ دشنام
طنز چھلکائے تو چھلکایا کرے زہر کے جام
تیکھی نظریں ہوں ترش ابروئے خمدار رہیں
بن پڑے جیسے بھی دل سینوں میں بیدار رہیں
بے بسی حرف کو زنجیر بپا کر نہ سکے
کوئی قاتل ہو مگر قتلِ نوا کر نہ سکے
صبح تک ڈھل کے کوئی حرفِ وفا آئے گا
عشق آئے گا بصد لغزشِ پا آئے گا
نظریں جھک جائیں گی دل دھڑکیں گے لب کانپیں گے
خامشی بوسۂ لب بن کے مہک جائے گی
صرف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آئے گی
اور پھر حرف و نوا کی نہ ضرورت ہوگی
چشم و ابرو کے اشاروں میں محبت ہوگی
نفرت اٹھ جائے گی مہمان مروت ہوگی
ہاتھ میں ہاتھ لیے سارا جہاں ساتھ لیے
تحفۂ درد لیے پیار کی سوغات لیے
ریگزاروں سے عداوت کے گزر جائیں گے
خوں کے دریاؤں سے ہم پار اتر جائیں گے
گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح تک شامِ ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے

[illegible] ۱۹۷۸

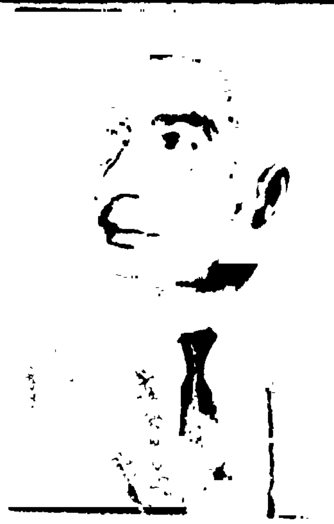
سلیم بک ڈپو کی عکسی مطبوعات

حمائل شریف عکسی معریٰ حوالہ ۱۳۲ ریگزین	۲۰/-
ریاض الصالحین عربی عکسی	۴۰/-
حمائل شریف عکسی مترجم ۴۸ پلاسٹک	۲۱/-
” ” ” ۴۸ پریس	۳۰/-
حافظی حمائل شریف عکسی معریٰ ۱۳۳ پلاسٹک	۲۲/-
” ” ” ۱۳۳ ریگزین	۲۰/-
” ” ” ۱۳۳ فوم پلاسٹک	۳۰/-
” ” ” ۱۳۳ پریس	۳۰/-
حافظی حمائل شریف عکسی معریٰ ۳۴ پلاسٹک کور	۱۱/-
” ” ” ۳۴ پریس	۲۰/-
” ” ” ۴۷ پلاسٹک	۸/۵۰
” ” ” ۴۷ پریس	۱۵/-
” ” ” ۱۹ ”	۲۳/-
حمائل شریف عکسی معریٰ ۹ پلاسٹک کور	۱۴/-
” ” ” ۳۹ پلاسٹک کور	۹/۵۰
” ” ” ۳۹ پریس	۲۲/-
” ” ” ۱۰۴ پلاسٹک کور	۱۱/-
” ” ” ۱۰۴ پریس	۲۰/-
” ” ” ۲۶ پلاسٹک کور	۱۰/-
” ” ” ۲۶ پریس	۲۰/-
” ” ” ۴۳ پلاسٹک کور	۶/۵۰
” ” ” ۴۳ پریس	۱۷/۵۰
” ” ” ۲۴ پلاسٹک کور	۷/۵۰
” ” ” ۲۴ پریس	۱۵/-
الحزب الاعظم عکسی مترجم ۱۰۵ پلاسٹک کور	۱۳/۵۰

الحزب الاعظم عکسی مترجم ۱۱۵	پلاسٹک کور	۷/-
قصیدہ بردہ مترجم مع شرح	پیپر بیک	۵/-
مرنے کے بعد کیا ہوگا عکسی	پلاسٹک کور	۱۱/-
میدان حشر عکسی	”	۵/۷۵
حالات جنت عکسی	خوشنما ٹائٹل	۳/۵۰
حالات جہنم عکسی	”	۲/۵۰
احوال برزخ عکسی	”	۲/۵۰
اُم الامراض عکسی	پیپر بیک	۴/-
پنج سورہ شریف عکسی مترجم ۱۰۰	پلاسٹک کور	۵/-
یازدہ سورہ شریف عکسی مترجم ۵۰	”	۳/۵۰
چھ باتیں انگریزی	پیپر بیک	۵/-
چھ باتیں عکسی کلاں	خوشنما ٹائٹل	۳/-
” ” خورد	پیپر بیک	۲/۵۰
” ” ”	پلاسٹک کور	۳/۲۵
مقبول اور مسنون دعائیں عکسی مترجم	پیپر بیک	۲/۵۰
” ” ”	پلاسٹک کور	۳/۲۵
چھ باتیں اور مقبول و مسنون دعائیں	”	۵/۷۵
” ” ”	پیپر بیک	۵/-
مسنون دعائیں عکسی مترجم	”	۳/-
” ” ”	پلاسٹک کور	۳/۷۵
یٰسین شریف عکسی مترجم کلاں		۱/-
” ” درمیانی		-/۶۰
” ” خورد		-/۵۰
یٰسین شریف عکسی معریٰ درمیانی		-/۵۰
دعائے حزب البحر عکسی مترجم		-/۷۵

دعائے گنج العرش عکسی مترجم		-/۶۰
” ” ”		-/۵۰
قاعدہ بغدادی مع پارہ عم عکسی مجلد		۲/۵۰
قاعدہ یسرنا القرآن عکسی کلاں	خوشنما ٹائٹل	۱/۲۵
قاعدہ نورانی عکسی	نیوز ٹائٹل	-/۴۰
قاعدہ بغدادی ”	”	-/۲۵
” ” ”		-/۵
پارہ عم عکسی معریٰ نمبر ۳۰	خوشنما ٹائٹل	-/۷۵
پارہ الم عکسی معریٰ نمبر ۱		-/۷۵
پارہ سیقول عکسی معریٰ نمبر ۲		-/۷۵
پارہ تلک الرسول ” نمبر ۳		-/۷۵
پارہ لن تنالوا ” نمبر ۴		-/۷۵
پارہ والمحصنٰت ” نمبر ۵		-/۷۵
پارہ لا یحب اللہ ” نمبر ۶		-/۷۵
مسنون دعائیں ہندی	پیپر بیک	۴/-
” ” ”	پلاسٹک	۴/۷۵
چھ باتیں ہندی	پیپر بیک	۳/-
” ” ”	پلاسٹک کور	۳/۷۵
ترکیب نماز ہندی	پیپر بیک	۱/۷۵
” ” ”	پلاسٹک کور	۲/۵۰
یٰسین شریف ہندی	خوشنما ٹائٹل	-/۶۰
اشرفی نماز کلاں		۱/۲۵
” ” خورد		-/۷۵

سلیم بک ڈپو حضرت نظام الدین نئی دہلی ۱۳



ساحر لدھیانوی

کبھی کبھی

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ زندگی تری زلفوں کی نرم چھاؤں میں
گزرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی
یہ تیرگی جو مری زیست کا مقدر ہے
تری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی ہے

عجب نہ تھا کہ میں بیگانۂ الم ہو کر!
ترے جمال کی رعنائیوں میں کھو رہتا
ترا گداز بدن تیری نیم باز آنکھیں
انہی حسین فسانوں میں محو ہو رہتا

پکارتیں مجھے جب تلخیاں زمانے کی
ترے لبوں سے حلاوت کے گھونٹ پی لیتا
حیات چیختی پھرتی برہنہ سر اور میں
گھنیری زلفوں کے سائے میں چھپ کے جی لیتا

مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم ہے
کہ تو نہیں ترا غم تیری جستجو بھی نہیں
گذر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی جیسے
اسے کسی کے سہارے کی آرزو بھی نہیں

زمانے بھر کے دکھوں کو لگا چکا ہوں گلے
گزر رہا ہوں کچھ انجانی رہگذاروں سے
مہیب سائے مری سمت بڑھتے آتے ہیں
حیات و موت کے پر ہول خارزاروں سے

نہ کوئی جادہ نہ منزل نہ روشنی کا سراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
انھیں خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر
میں جانتا ہوں مری ہم نفس مگر یونہی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے....



اختر الایمان

شکوہ

خدائے عالم بلند و برتر
سنا ہے اس تیرے خاکداں میں
محبتوں کے لطیف دامن
مسرتوں سے بھرے ہوئے ہیں
یہ وادیاں ہیں گلوں کا مسکن

سنا ہے اس تیرے خاکداں میں
زمیں کے سینے سے پھوٹتے ہیں
نئے شگوفے نئی بہاریں
فراز کوہ گراں سے گرتی
ہیں تند اور تیز آبشاریں

مگر مجھے کیا دیا یہ تو نے
شباب اک زہر میں بجھا کر
خراب آنکھیں لہو رلا کر
خدائے عالم بلند و برتر
نہ ایک مونس بھی ایسا بخشا
کہ جس کی آغوش میں تڑپ کر
سکون کے سانس لے سکوں میں!

تلخیاں — حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۴۴

یادیں — پنجاب پبلشنگ ... ۶۳



وامق جونپوری

سوکھے ہوئے بیلے

تم نے سوکھے ہوئے بیلے بھی کبھی سونگھے ہیں
ان کو مسلا نہ کرو
کتنی آزردہ مگر بھینی مہک دیتے ہیں
ان کو پھینکا نہ کرو
غم سے کمھلائے ہوئے چہروں کو سمجھا بھی کرو
صرف دیکھا نہ کرو
دل میں رستے ہوئے زخموں کا مداوا بھی کرو
صرف چھیڑا نہ کرو
تم نے سوکھے ہوئے بیلے بھی کبھی سونگھے ہیں

نصب تذکرہ نکہت پبلی کیشنز الہ آباد ۱۹۰۹



نریش کمار شاد

پبلشر

آپ کی بیشمار نظموں میں
ایک بھی نظم جاندار نہیں
آپ کی شاعری ہے فرسودہ
ایک بھی شعر پُر بہار نہیں !
آپ یہ جانتے نہیں شاید
اس زمانے میں نام بکتا ہے
جو بہت نامدار شاعر ہیں
صرف انھیں کا کلام بکتا ہے
آپ گمنام آدمی ہیں ابھی
اس لیے آپ کا یہ مجموعہ
از سر نو درست کروا کر
اپنے ہی نام سے میں چھپواؤں گا
رہ گیا اب معاوضے کا سوال
نقد لینا کوئی ضرور نہیں
شام کے وقت آپ آجائیں
میکدہ اس جگہ سے دور نہیں

سنگم نیو اردو ... دہلی ۱۹۶۴



شاذ تمکنت

مفاہمت

سنا ہے زیست سے تم نے نباہ کرلی ہے
مفاہمت کا یہ سودا کہیں گراں تو نہ تھا
سبک سری تو نہ ٹھہری بلا کشی کے عوض
کوئی فریفتہ کوئی کشاں کشاں تو نہ تھا
بتا سکو تو بتادو ہمیں بھی راز کی بات
یہ بات کیسے بنی کیسے کاروبار ہوا
یہ لین دین کا جھگڑا چکا تو کیسے چکا
پتہ چلے تو ہمیں کون کس پہ بار ہوا
چھڑے تو ہوں گے پرانے نئے گلے شکوے
نگاہ کس کی جھکی کون شرمسار ہوا
تمہاری کونسی شرطیں تھیں کیا تقاضے تھے
ادھر سے کونسا پیمان استوار ہوا
شمار حسرتِ ناکام بھی ہوا ہوگا
اگر ہوا تو ہمارا بھی کچھ شمار ہوا ؟

بیاضِ شام مکتبہ شعر و حکمت حیدرآباد ۱۹۰

امجد نجمی

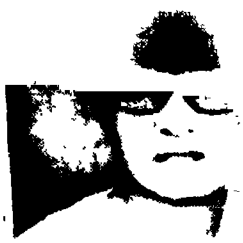
پیاسا

ابھی باقی ہے وہی رنجِ فراق
وہی وحشت وہی آشفتہ سری
وہی افکارِ پریشاں وہی یاس و حرماں
وہی دھوکا وہی خوابوں کا فریب
آہ محرومِ اثر
درد محرومِ علاج
ابھی باقی ہے شبِ تارِ حیات
ابھی باقی ہے وہی رنجِ فراق
باغ میں پھول کھلے تھے کتنے
موتیا، جوہی، چمیلی، بیلا
کیتکی، مالتی، چمپا، گیندا
مختلف رنگ کے پھول
جیسے جلوؤں کا نزول
قرمزی سرخ گلابی نیلے
سرمئی چمپئی اودے پیلے



میں بگا ہوں کا تھکا
ایک بھی چن نہ سکا
لوٹ آیا تہی دست و تہی داماں آخر
جیسے لوٹے کوئی محفل سے پشیماں ہو کر
باغ میں پھول کھلے تھے کتنے !!
جا کے دریا پہ بھی پیاسا آیا
سوزشِ تشنہ لبی
بڑھتی جاتی تھی مگر
ایک قطرہ نہ لبوں تک پہنچا
موجِ سیلاب بنی میرے لیے موجِ سراب
چشمۂ زہر میں تبدیل ہوا چشمۂ آب
چار سو کتنی گھٹائیں چھائیں
لیکن اک بوند نہ دھرتی پہ گری
تلخیٔ کام و دہن اور بڑھی اور بڑھی
ساحلِ خشک سے کچھ بھی نہ ملا
جا کے دریا پہ بھی پیاسا آیا

جوئے کہکشاں   اڑیسہ اسٹیٹ پبلشنگ   ۱۹۶۹



حرمت الاکرام

اداس رات

خاموشیوں کی گود میں دم توڑتی زمیں
غلطاں خود اپنے سوگ میں ذرّات کی جبیں

اک موجِ کربِ نخلوں کے سائے میں تہہ نشیں
تاروں کی چھاؤں ٹوٹتے خوابوں کا آئینہ

لہروں کے ساز میں کوئی نغمہ نہیں رہا
آتی نہیں دلوں میں دھڑکنے کی بھی صدا

کس درد لادوا کا نشانہ ہے کائنات
کتنا اداس چاند ہے کتنی اداس رات

تشبیہیں   پاک پبلشرز نئی دہلی   ۱۹۷۳



قاضی سلیم

یوں ہی سہی

چلو یوں ہی سہی
تم سب دریچے بند کردو
—— وہ ہوائیں روک دو
جو خلا سینے کا بھرنے کے لیے آتی ہیں
اور سانسیں تمہاری ساتھ لاتی ہیں
تو لو ایسے سے
میری رگوں میں خون کے بدلے
—— وہ پانی ہے
جو ارماں سادھ لینے والے پیڑوں کا مقدر ہے
مرے طوفان کی موجیں
کسی برفیلی چوٹی کی وہ تحریریں ہیں جن کو
—— اب فقط ایسے فرشتے پڑھ سکیں گے
جو کبھی بدبخت دھرتی پر اترتے ہی نہیں
چلو یوں ہی سہی
تم جو بھی چاہو
جس طرح چاہو وہی ہوگا
میں اک گرداب کی مانند واپس لوٹتا ہوں اس سمندر میں
کہ جس کی تہ میں جاکر
سب خزانے ڈوب جاتے ہیں۔

نجات سے پہلے   شب خون کتاب گھر الہ آباد   ۱۹۷۱

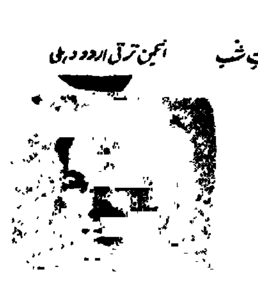


زبیر رضوی

دوسرا آدمی

بسنو پھر آج ہم سب سے کسی کو موت نے تاکا
اچانک مر گیا کوئی
چلو یارو ہمیں دیوار سے سر پھوڑ کے روئیں
نشہ اترے تو اس کی یاد میں اک مرثیہ لکھیں
پرانے تذکرے میں اس کے خدوخال کو ڈھونڈیں
کتابوں کے ورق الٹیں
رسالوں اور اخباروں کی پچھلی فائلیں کھولیں
دماغ و دل کے گوشے میں چھپی یادیں کریدیں
تلخیاں بھولیں
فراموشی کی ساری گرد جھاڑیں
رنجشیں بھولیں
ہر اک خوبی ہم اس کے نام سے منسوب کردیں
اور ایسے شخص کا پیکر تراشیں
کل جو اپنے درمیاں زندہ نہیں تھا۔

مسافتِ شب   انجمن ترقی اردو دہلی   ۱۹۷۸



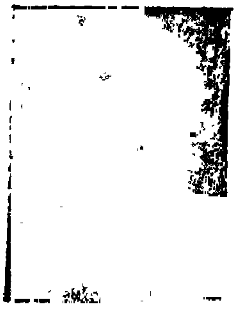
محمود سعیدی

دائروں کے قیدی

نئے نئے دائرے بناتے رہے ہیں ہم تم
کئی مدتوں سے
یہ دائروں کا طلسم تشکیل کائنات بشر کی پہچان بن چکا ہے
ہمارا ایمان بن چکا ہے
یہ دائرے زندگی کو تقسیم کرکے اب آدمی کو تقسیم کررہے ہیں
میں اپنا اک دائرہ بنائے ہوئے اسی میں کھڑا ہوں
تم اپنا اک دائرہ بنائے ہوئے اسی میں گھرے کھڑے ہو
اور ان جداگانہ دائروں میں بھی اندر کتنے ہی دائرے ہیں
انہی طلسماتی دائروں میں بٹی ہوئی ہے ہماری ہستی
نگاہ اس دائرے میں محبوس ہے دل اس دائرے کا قیدی
عجیب عالم کا دیپ در پیچ سلسلہ ہے
نہ مجھ میں ہمت رہی ہے اتنی نہ تم میں یہ حوصلہ رہا ہے
کہ اس مدور طلسم سے دو گھڑی کو باہر نکل کے دیکھیں
کھلی فضا میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کچھ دور چل کے دیکھیں
زمین کتنی وسیع کتنی بڑی ہے اب تک
تمہاری میری نظر کی حدبندیوں سے باہر
افق کی ملتی ہوئی لکیروں کے آگے آگے
یہ دن کتنا دل فروز وسعت
یہاں مجھے یا تمہیں بھلا اس کی کیا ضرورت
الگ الگ تنگ تنگ سارے دائرے بنائیں حصار کھینچیں
کبھی کبھی خود ہمارے اندر ایک آوارہ لہر اٹھتی ہے
—— اور ہم سے یہ پوچھتی ہے:
یہ دائروں کا طلسم کیا ہے!
نظر کا دھوکہ ہے واہمہ ہے
مگر نہ مجھ میں رہی ہے ہمت نہ تم میں یہ حوصلہ رہا ہے
کہ اس مدور طلسم سے دو گھڑی کو باہر نکل کے دیکھیں
کھلی فضا میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کچھ دور چل کے دیکھیں

سیہ پر سفید   نازش بک سنٹر دہلی   ۱۹۶۹

عمیق حنفی



"نئی حمد"

اے خدا اے خدا
میں نے وہ سر تسلیم کر دیا
جس میں کچھ بھی نہ تھا سرکشی کے سوا
لپلپاتی ہوئی دس زبانیں جو لیں انگلیاں کاٹ دیں
بطن گیتی سے بس جن کو سونے کے کچھ ریزے کی تھی آرزو
اپنے دو پیر بھی چھوڑ آیا ہوں دہلیز پر
جو یقین کی زمیں کے بجائے گماں کی ہوا پر ہمیشہ کھڑے ہونے
کی دھن لیے خشک و تر میں بھٹکتے رہے
نفسِ نا مطمئن تغلب بے چین اور ذہنِ مایوس کشور کو
تیری آیات کی تیرگی میں ڈبونے کا پکا ارادہ کیے
دو نئے زانوؤں کے لیے گھومتا ہوں
دس نئی انگلیاں ڈھونڈتا ہوں
اک نیا سر اگلنے کی کوشش میں ہوں
دیکھ
اپنے لہو میں خود اپنا ہی خانۂ سر دکو
آج پھر گوندھتا ہوں۔

تیسرا صدا — نصرت پبلشرز لکھنؤ — ۱۹۷۵

بلراج کومل

آخری شہر جل چکا ہے

ابھی میرے کان میں یہ آواز آرہی تھی
حسین تمنا کا آخری شہر جل چکا ہے

یہ وقت کو کیا ہوا
کہ سارے پلوں کو لمحوں میں پھاند کر
آج موت کے روپ میں مرے روبرو کھڑا ہے
ہوا کی رفتار تیز تر ہے
ہوا کی یلغار تیز تر ہے
کہ خواب کا کوہسار ذہنوں کی ظلمتوں سے پگھل چکا ہے
حسین تمنا کا آخری شہر جل چکا ہے
میں حوصلوں کے بنے ہوئے بال و پر لیے
صرف رسمِ پرواز کے لیے
آسماں کی جانب لپک رہا ہوں
زمیں کے سینے سے سرخ لاوا ابل چکا ہے
کہ آخری شہر جل چکا ہے
مگر میں بکھرے ہوئے عناصر کے ہاؤ ہو میں
کہیں تو زندہ ہوں اب بھی شاید
میں منہدم شہر کے زمانوں کے کریوم میں
گزرں کا اک روز سرد مٹی میں بیج بن کر
مگر ابھی خاک و خوں کا طوفان روشنی کو نگل چکا ہے
حسین تمنا کا آخری شہر جل چکا ہے

نثرا دوستگ — نصرت پبلشرز لکھنؤ — ۱۹۷۵



راج نرائن راز

"نیا باب"

زندگی اک کتاب ہے جس کے
لفظ — لمحے ہیں
میٹھے
کڑوے بھی
جملے — گھڑیاں ہیں
سہل
مشکل بھی
سطریں — دن ہیں
برے بھی
اچھے بھی
ماہ — اوراق
چشم گیں
دم ساز
سال — ابواب —
زخم
مرہم بھی
حد تو یہ ہے — کہ یہ ادھوری ہے
آخری اور اولیں صفحات
جانے کس تیرگی میں کھوئے ہیں
کیسے غائب ہوئے نہیں معلوم
ان کی بس داستاں ہی باقی ہے
— اور یہ وہ کتاب ہے جس کو
ہر کوئی درمیاں سے پڑھتا ہے
میں نے آج ایک باب پڑھ ڈالا

لذت آشنائی — سمت نامہ پبلیکیشن دہلی — ۱۹۷۷



محمد علوی

آخری دن کی تلاش

خدا نے قرآن میں کہا ہے
کہ لوگو میں نے
تمہاری خاطر
فلک بنایا
فلک کو تاروں سے
چاند، سورج سے جگمگایا
کہ لوگو میں نے
تمہاری خاطر
زمیں بنائی
زمیں کے سینے پہ
ندیوں کی لکیریں کھینچیں
سمندروں کو
زمیں کی آغوش میں بٹھایا
پہاڑ رکھے
درخت اگائے
درخت پر پھول پھل لگائے
کہ لوگو میں نے
تمہاری خاطر
یہ دن بنایا
کہ دن میں کچھ کام کر سکو تم

کہ لوگو میں نے
تمہاری خاطر
یہ شب بنائی
کہ شب میں آرام کر سکو تم
کہ لوگو میں نے
تمہاری خاطر
یہ سب بنایا
مگر نہ بھولو
کہ ایک دن میں
یہ ساری چیزیں سمیٹ لوں گا
خدا نے جو کچھ کہا ہے
سچ ہے
مگر نہ جانے
وہ دن کہاں ہے
وہ آخری دن
کہ جب خدا یہ تمام چیزیں سمیٹ لے گا
کہ اب یہ چیزیں
بہت پرانی
بہت ہی فرسودہ ہو چکی ہیں

محمد علوی، ایک مطالعہ۔ مسلور پبلی کیشن دہلی - ۱۹۸۰



کمار پاشی

دعا دیتے چلو

دعا دیتے چلو ان کو
جنہیں جینا نہیں آتا
جو شب بھر شہر کی سڑکوں پہ
آدم خور گھوڑوں کی طرح ہنہناتے ہیں
دعا دیتے چلو ان کو
ہمارے شہر میں چرچے ہیں جن کی بے لباسی کے
جو اپنے آپ سے مل کر بھی شاید خوش نہیں ہوتے
وہ جن کے قد بہت چھوٹے نظر آتے ہیں دنیا کو
جو اپنے پیٹ کے بل رینگ کر چلنے میں شاید فخر محسوس کرتے ہیں

دعا دیتے چلو ان کو
کہ جن کے غم بڑے خوشیاں بہت چھوٹی سی
کہ جو بکھرے ہوئے ہیں اپنے انسانوں کی صورت
جسم کی سنسان بستی میں
دعا دیتے چلو
ایسا بھی دن آئے
ازل سے منتشر بدبخت روحوں کو
کوئی آ کر سمیٹے
اور ان کو شکل دے کوئی
تو شاید آئینہ ہم کو ہمارا گمشدہ چہرہ بھی لوٹا دے
دعا دیتے چلیں —— آؤ!

اک موسم میرے دل کے اندر
اک موسم میرے باہر | مسلور پبلی کیشن دہلی ۱۹۰۹

دار الکتب الاسلامیہ دہلی

کتابوں کی دنیا میں ایک نیا اضافہ جو نہایت آب و تاب اور تیزی کے ساتھ کتابوں کی اشاعت کا پروگرام چلا رہا ہے اس ادارہ کا مقصد مسلکی چپقلش سے آزاد ہوکر خدمت دین کرنا اور مشہور و مقبول علماء دین کی بہترین نگارشات کو شائع کرنا ہے۔

اس ادارہ کا اشاعتی پروگرام قرآن کریم کی اشاعت کے ساتھ شروع کیا گیا ہے۔ لہٰذا قرآن شریف معریٰ حوالہ ۳۲ اور قرآن شریف معریٰ حوالہ ۵۳ شائع ہوکر مقبول خاص و عام ہوچکے ہیں۔

ادارہ کی تیسری پیش کش شیخ الحدیث مولانا عبدالسلام بستوی کی مشہور و مقبول دعاؤں کی کتاب "اسلامی وظائف" ہے۔ جو منظر عام پر آگئی ہے

ادارے کے زیر پروگرام دیگر قرآن مجید، سیپارے، قاعدے اور دیگر مفید کتب ہیں۔ ان میں سے چند کے نام نیچے درج کیے جاتے ہیں۔

مجموعہ رسائل حج — مصنفہ مولانا عبدالوہاب دہلوی رح
التہذیب من البدعہ — مصنفہ شیخ عبدالعزیز بن باز
کتاب الجمعہ — مصنفہ شیخ الحدیث مولانا عبدالسلام رح
اسلامی عقائد — "
تقویتہ الایمان — شاہ اسماعیل شہید دہلوی

QA,PN-91

دار الکتب اسلامیہ (اسلامک پبلشنگ ہاؤس) ۵۵۸۵ اردو بازار دہلی



رفعت سروش

ایک کیفیت

دبی دبی سی بے کلی
گھٹی گھٹی سی نغمگی
اک اضطرابِ مضمحل سا مضطرب سکون سا
خرد کی وادیٔ عمل میں سایۂ جنون سا
بجھی بجھی سی چاندنی
نہ تیرگی نہ روشنی
نہ زندگی سے ربطِ خاص ہے نہ بے تعلقی
ترے بغیر بھی مگر گزر رہی ہے زندگی

وادیٔ گل — پبلشر: بیگم سروش نئی دہلی — ۱۹۶۳



ساجدہ زیدی

درسِ غم

ڈھل گیا پھر صبح کے چہرے سے
خواب آلودہ لمحوں کا خمار
شام کا کاجل
گھنی تاریکیوں میں کھو گیا
ڈھل گیا پھر رات کا افسوں
ستاروں کی کمانیں ٹوٹ کر گم ہو گئیں
دھند کا دامن کشادہ ہو گیا
اور افق تا بہ افق
خاموشیوں کی کائنات
درسِ غم دینے لگی

آتشِ سیّال — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی — ۱۹۷۲



کرامت علی کرامت

ایک کیفیت

چاند کے زخم سے رستا ہے لہو
شمعِ انفاس لٹاتی ہے گہر بار آنسو
بام و در پر ہے مسلط غم و اندوہ کی تاریک ردا
کہکشاں سے ہے رواں زہر کی جوئے سیّال
شجرِ خشک کے سائے ہیں قیامت بکنار
پیاس اک ایسا سمندر ہے کہ گہرائی پہ اپنی حیراں
وقت کہتا ہے کہ رک جاؤں گا
نبض کہتی ہے کہ تھم جاؤں گی
رات کہتی ہے کہ کٹ جاؤں گی
درد کہتا ہے کہ بڑھ جاؤں گا

شعاعوں کی صلیب — شاخسار پبلیکیشنز — کٹک — ۱۹۷۲



صلاح الدین پرویز

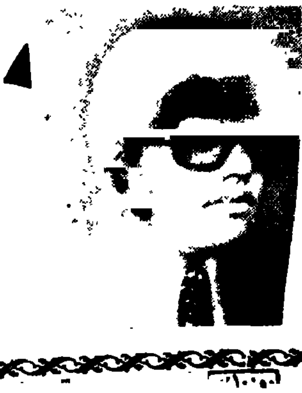
دھڑکتی صدا

سنہری دعاؤں کے خیمے میں لیٹی
برستی ہوئی بارشوں کے دنوں میں

دھڑکتی صدا
جھلملاتی شبوں میں گندھی
پارۂ ابر کے آبگینے سے کوندی

دھڑکتی صدا
اپنی آنکھوں کی شب سے نکل کر
مرے دل کے آنگن سے ہنستی چلی جا رہی ہے
اسے ریشمی طائروں نے پکارا
یہ لرزہ براندام ہو کر
ہوئی آب دیدہ
نہ جانے کہاں سے کئی سنگ ساراں
ہجوم ہلاہل کے بستر سے میں لپٹے
دھڑکتی صدا سے ہوئے سنگ ساماں
دھڑکتی صدا مسکرائی
دھڑکتی صدا مسکراتی ہوئی
دل کے آنگن میں پلٹی
بڑی دیر رحلِ سایہ پہ آنکھیں بچھائے
نہاتی رہی دھوپ میں
اور پھر اپنی آنکھوں کے دونوں پٹوں کو اٹھا
نہیں دور آنکھوں سے بیٹھی
کسی شب گزیدہ سی ماں کے بدن کو چرایا
کسی شب گزیدہ سی معصوم ننھی سی بچی نے
شب کو چڑایا
"دھڑکتی صدا"
دھڑکتی صدا پھر پلٹ کر نہ آئی

دھوپ سایہ سمندر صبا جی پبلی کیشنز دہلی ۱۹۷۰



اطہر عزیز

رقصِ سکوت

ہر طرف ایک پُراسرار سی تاریکی ہے
کوئی آہٹ نہیں آواز نہیں شور نہیں
وہ خموشی ہے کہ تاروں کا بھی دم گھٹتا ہے

چاند حیراں ہے کہ رک جائے نہ شب کی دھڑکن
رات روتی ہے کہ تھم جائے نہ خود چاندنی سالس
دہشتِ فکر سے کلیوں کی نگاہیں خاموش
شدتِ غم سے ہواؤں کی ہیں سانسیں لرزاں

گردشِ وقت نے لی ہے وہ بھیانک کروٹ
ساز کے بدلے اب ہاتھوں میں ہے سنگِ آتش
جن لبوں پر تھے ترنم کے ستارے رقصاں
جن نگاہوں میں تبسم کی تھی خوابیدہ بہار
مٹ گئے ایک ہی جھونکے سے وہ رخشندہ نقوش
گر پڑا ایک ہی آندھی میں وہ ایوانِ نگار

اب مسلط ہے ملبے پہ شراروں کا ہجوم
چنگِ احساس ہے گم اپنے ہی نالوں میں
اجنبیت کا وہ ماحول ہے طاری ہر سو
چشمِ اخلاص غزل خواں ہے بیابانوں میں

اب بھی ہے وقت سنبھل جاؤ پیکتے سالیو!
اب بھی چہرے سے ہٹا لو یہ دہکتی سی نقاب
ورنہ برساتے رہے تم جو یہ شعلوں کی پھوار
خود ترس جاؤ گے پھولوں کی ہنسی کو ایک روز!

۱۹۶۸ء کی منتخب نظمیں ممتاز پبلشرز دہلی ۱۹۶۹

مقالات

پروفیسر آل احمد سرور
پروفیسر احتشام حسین
ڈاکٹر اعجاز حسین
پروفیسر خواجہ احمد فاروقی
ڈاکٹر محمد حسن

ڈاکٹر قمر رئیس
پروفیسر گوپی چند نارنگ
شمس الرحمن فاروقی
پروفیسر جگن ناتھ آزاد
اندر جیت لال جی
ایم حبیب خاں
مولانا امداد صابری

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی
موہن چراغی
بیگم اختر
نور جہاں ثروت

جلال الدین اسلم
نیاز دہلوی
جمیل نقوی
سلیم الدین قریشی
مجاہد حسین زیدی



پروفیسر آل احمد سرور

موجودہ ادبی مسائل

(خطبۂ صدارت بزم ادب پٹنہ کالج)

خواتین وحضرات.

میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے بزم ادب کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے یاد کیا۔ ادب کے خدمت گذاروں کے لیے اس سے زیادہ خوش گوار چیز اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ علم و ادب کے ہر مرکز سے ربط پیدا کر سکیں ابھی میری جاننے، دیکھنے بھالنے، سیکھنے سمجھنے کی خواہش مردہ نہیں ہوئی ہے. مجھے مختلف ادبی گہواروں اور علمی اداروں کے رجحانات اور خصوصیات سے گہری دلچسپی ہے۔ ایک معلم اور ادب کے خادم کی حیثیت سے مجھے یہ فکر رہتی ہے کہ طلبا کی ذہنی کیفیات کا اندازہ کروں اور اساتذہ میں زندہ رہنے اور زندہ رکھنے کی صلاحیت کا جائزہ لوں. مجھے بڑی خوشی ہے کہ عرصے کے بعد مجھے پٹنہ کے ارباب نظر اور صاحبان فن سے ملنے کا موقع ملا ہے افسوس ہے کہ گذشتہ دو سال میں جب آپ نے یاد کیا تو میں حاضر نہ ہو سکا. بہرحال دعوت نامے کا شکریہ اور بہت دنوں میں آنے کی معذرت قبول فرمایئے.

اردو ادب نہ اب شعرا کی کمائی ہے اور نہ دہلی و لکھنؤ کی جائیداد۔ بیسویں صدی کے ادب میں وسعت اور گہرائی دونوں ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارا ادب ابھی تک اتنا نہیں بدلا جتنی ہماری زندگی بدلی ہے. ہمارا ادب ابھی تک ہماری ذہنی ترقی میں معاون ہونے کے بجائے اس کے راستے میں ایک رکاوٹ بنا ہوا ہے. ہم اپنے ادبی سرمائے کو اچھی طرح برتنے کے بجائے اسے پیٹھ پر لادے ہوئے ہیں. جس کے بوجھ سے ہماری رفتار پر اثر پڑ رہا ہے. اچھا ادب اچھی زندگی کی تخلیق اور تعمیر کرتا ہے. خیال کے لیے نئے سانچے اور علم و عمل کے لیے نئے راستے بناتا ہے، وہ اپنی تاریخ کو نظر انداز نہیں کرتا وہ آثار قدیمہ کی قدر کرتا ہے مگر اپنی زندگی کو آثار قدیمہ نہیں بناتا ہے اپنے ماضی سے شرمندہ نہیں ہوتا مگر ماضی پرستی کو گوارا نہیں کرتا. وہ روایت کی قدر کرسکتا ہے، روایت پرست نہیں بن سکتا.

آپ کہیں گے کہ میں ناحق شروع ہی سے نئے اور پرانے کا جھگڑا لے بیٹھا لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس میں جھگڑنے کی کوئی بات نہیں. ادب کا ایک قدیم تصور ہے اور ایک جدید جس طرح زندگی کا ایک قدیم اور جدید تصور ہے. قدیم تصور میں بعض بڑی خوبیاں ہیں. اس میں زبان کے اصولوں فن کی باریکیوں، الفاظ کی موسیقی کا احساس ہے. یہ صلاحیت رکھتا ہے، ٹھوس اور وزنی ہے، یہ بڑے ریاض کا پھل اور بڑی محنت کا ثمرہ ہے. یہ بڑا سخت گیر ہے، ذرا سا ادھر اُدھر ہونا گوارہ نہیں کرتا. اس میں ایک عظمت بھی ہے مگر یہ تصور یا تو ادب کو ایک فن سمجھتا ہے یا ایک مذہب یا ایک مخصوص خطے یا سوسائٹی کی جاگیر. میر سمجھتے تھے کہ سپاہی شعر نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ اس فن کے لیے جو ریاض اور دردمندی ضروری ہے وہ ان کے بس کی نہیں. انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے ؎

نکتہ پردازوں سے اجلافوں کو کیا
شعر سے بزازوں، نداّفوں کیا

میر بڑے شاعر تھے، ان پر جو ایمان نہ لائے وہ کافر لیکن ان کے اس نظریے سے کون اتفاق کر سکتا ہے؟ شیفتہ کے نظریے کے غالب، مومن جیسے تند جبیں بھی قائل تھے. انہوں نے حالی کے مذاق شعری کی تربیت کی. ان کا تذکرہ "گلشن بے خار" سدا بہار ہے مگر وہ شاعری کو فن شریف سمجھتے تھے. عوام سے گھبراتے تھے اور بازاری چیزوں کا نام آتے ہی ناک پر رومال رکھتے تھے. انہوں نے نظیر کو محض اس وجہ سے نظر انداز کر دیا کہ اس کے اشعار بازاری لوگوں کی زبان پر ہیں. نظیر کا کیا بگڑا؟ شیفتہ ایک خاص دور کے نقاد ہو کر رہ گئے. یہ وہ لوگ تھے جو شعر و ادب کو شرافت و نجابت کا

ایک جزو سمجھتے تھے اور اپنے حسب و نسب پر فخر کرتے تھے۔ ادب میں یہ برہمنیت اپنے زمانے میں مفید ہوئی۔ اس نے قاعدے بنائے اور انھیں برتا۔ اس نے نااہلوں کو پھٹکنے نہیں دیا۔ مگر آج جبکہ زندگی میں برہمنیت یا خواجگی کا زوال شروع ہو گیا ہے، ادب میں اسے باقی رکھنے کا جواز نہیں۔ آج کسی کو یہ کہنے کا حق حاصل نہیں کہ ادب وہی ہے جو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں یا لکھنؤ کے چوک یا درباروں کے روایتی ماحول یا صوفیوں کی خانقاہوں سے وابستہ ہیں۔ جب یہ تمدنی گہوارے آباد تھے تو ان کا ادب بھی زندہ تھا۔ اب یہ روایت ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب اقبال کے الفاظ میں "شعلۂ نم خوردہ سے شرر نہیں ٹوٹ سکتے"۔ اکبر نے ایک قطعہ میں اس بات کا ماتم کیا تھا ؎

ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاکھا سے ضم ہوں گے

اکبر بڑے نیک نیت تھے مگر نہ ان کی نظر میں وسعت تھی نہ دل میں، وہ زبان کو بھی ایک اٹل، جامد اور مستقل چیز سمجھتے تھے۔ وہ جس طرح زندگی کی اور تبدیلیوں کو شبہے کی نظر سے دیکھتے تھے اسی طرح زبان میں کچھ تغیر و تبدل بھی انھیں گوارا نہ تھا۔ وہ اسے مجموعی مشرقیت پر ایک حملہ جانتے تھے۔ عوام یا بازار سے اس قدر جھجک صحت کی علامت نہیں۔ نہ اپنے آپ کو اس قدر مکمل سمجھنا کہ کسی تبدیلی کی ضرورت ہی نہ ہو، ہوشمندی کی دلیل ہے۔ مغرب سے اس قدر بیزاری اکبر کے زمانے میں تو معاف کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس وقت عام لوگ اتنا آگے دیکھ ہی نہ سکتے تھے مگر آج یہ رجعت پسندی کی علامت ہے۔ ہماری بڑھی ہوئی مشرقیت کسی طرح بھی سراہنے کی چیز نہیں کیونکہ یہ ان چیزوں سے محروم ہو کر جو اسے غذا پہنچاتی تھیں اب محض ایک خیالی چیز ہو کر رہ گئی ہے جسے ہم نے اور بھی بھینچ بھینچ کر سینے سے لگا رکھا ہے۔ ہم اب دراصل مشرقیت کو نہیں اس کے ایک فرضی تصور کو گلے سے لگائے رہتے ہیں۔ مشرقیت سے تو ہم اب اس لیے دور ہو گئے ہیں کہ تاریخی قوتوں نے ہمیں دور کر دیا ہے۔ مگر ہمیں اس کا احساس نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے کلام میں مغرب کے خلاف اعلانِ جنگ دیکھ کر ہمیں ایک تسکین سی ہوتی ہے۔ ہمارے ذہن کا ایک حصہ دوسرے سے کہتا ہے "دیکھو ہم ایسے برے نہیں جیسا تم ہمیں کہتے ہو، اور تم اتنے اچھے نہیں جتنا کہ اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہو"۔ ہاں دیکھو اقبال بھی تو یہ کہتا ہے، کون اقبال؟ جس پر حالی کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں
مری نگاہ میں ہیں رند پارسا ایک ایک

حالانکہ اقبال ان معنوں میں مشرقی نہیں ہے جن معنوں میں ہم اسے مشرقی سمجھتے ہیں۔ وہ ذہنی اعتبار سے مغرب کا فرزند ہے۔ اس نے اپنے لکچروں، خطبوں اور خطوں میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ اس کی مشرقیت مغرب کے مطالعے سے ابھری ہے مگر وہ اسی مطالعہ کی وجہ سے کچھ بدل بھی گئی ہے اور اس پرانی جانی پہچانی مشرقیت سے بالکل مختلف ہے جو مثلاً اکبر کی ہے۔ چنانچہ اقبال مغرب کو برا کہتے ہوئے بھی مغرب کے علم و فن کا لوہا مانتے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اوپر اقبال کے ان اعتراضات کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ہم اپنی اس مفروضہ مشرقیت کے پھر سے قائل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ہماری ذہنی زندگی کی کشمکش بڑھ جاتی ہے جس کو ختم کرنے کے لیے بعض حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی ضرورت ہے۔

پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ تہذیب اور مغربیت ایک دوسرے کے مترادف نہیں ہیں۔ دوسرے مغربیت محض مغرب کی چیز نہیں ہے۔ اسے بھی اپنے زمانے میں خود عربوں نے تازہ خون دیا ہے۔ اس لیے وہ ارتقا کا ایک قدرتی سلسلہ ہے اور تیسرے مغرب کی ذہنی عظمت، قوتِ تسخیر، عملی صلاحیت، دنیا کو جنت بنا دینے کی قدرت، اس کی ہمت و جرأت، اس کا جوش اور ولولہ، اس کی عقلیت، اس کا سائنٹفک اور علمی نقطۂ نظر، اس کی حقیقت پسندی، اس کی واقعیت، اس کا سماجی قدروں کا احساس ایسی چیزیں نہیں کہ جن سے انکار کیا جا سکے۔ تاج محل کی حسن کاری، اجنتا کے اعجاز اور مغل تہذیب کی شان و شوکت کا حوالہ دے کر نہ ہم مغرب کی عظمت کو کم کر سکتے ہیں اور نہ اس سے ہمارے حال

ناپستی کم ہوتی ہے بلکہ غور کیجیے تو اور بڑھتی ہے۔
چنانچہ ادب کے کسی زندہ تصور میں آپ مغرب اور اس کی قدروں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مغربیت محض "لادینی اور خط لاطینی" ہی نہیں ہے مغرب کے سراہنے والے اور اس پر اعتراض کرنے والے دونوں اس کو بھول جاتے ہیں مغربیت اس کے باوجود ایک زندہ، بیدار اور عملی نقطۂ نظر ہے۔ ہم مادی کہہ کر اس کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتے۔ وہ لوگ جو ہندستان کی روحانی عظمت، اس کی قناعت، اس کے مزاج کی نرمی، اس کی ماورائیت کے گیت گاتے ہیں وہ اسے ماضی کی زنجیروں میں گرفتار رکھنا چاہتے ہیں۔ یہی لوگ ملک کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ بعض دوسرے اور تیسرے درجے کے مصنفین کے خیالات اور لاطینی، فرانسیسی یا جرمن ادیبوں کے انکار سے اس خیال کو مدد ملی ہے کہ ہندستان ابھی دنیا کی روحانی قوم کی قیادت کر سکتا ہے اور مغربی تہذیب کی ستائی ہوئی روحوں کو سکون ہندستان کی آغوش میں ملتا ہے۔ اس نقلی روحانیت کے نام پر ہم نے اپنی غلامی کی رات کو اور تاریک بنا لیا ہے۔
آپ کے پروفیسر کلیم الدین احمد کی کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" پر جو ہنگامہ برپا ہوا تھا معلوم نہیں اس سے آپ نے کیا اثر لیا؟ کہیں ان کی موجودہ خاموشی اس جرأت رندانہ پر پشیمانی نہ ہو۔ بہرحال اس کتاب میں ایک نہایت اہم ادبی اصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ باوجود ملکوں اور تہذیبوں کے فرق، جغرافیائی حالات کے اختلاف اور تاریخ و تمدن کے علاحدہ علاحدہ ہونے کے ادبیات میں بعض مشترک اور عالم گیر اصول بھی ہیں۔ حسن کا معیار مختلف سہی لیکن حسن کا احساس مختلف نہیں ہے۔ رومین رولان نے اپنی مشہور تصنیف "جین کرسٹاف" میں لکھا ہے کہ "دنیا کو سچ کی کم اور جھوٹ کی خوراک زیادہ ملتی ہے" ہم سب کے لیے سچ یکساں ہے مگر ہر قوم کے لیے آپس کا ایک مخصوص جھوٹ ہوتا ہے جسے وہ اپنی نصب العینیت (IDEALISM) سے تعبیر کرتا ہے۔ اس چکر سے بہت کم لوگ نکل پاتے ہیں۔ مغربی تنقید کے اصولوں سے اردو کے شعرا پہ حکم لگانا عام طور پر

ہماری شریعت میں کفر ہے۔ یہ ایسا ہی برا سمجھا جاتا ہے جیسے کسی مقدس زمین پر جوتا پہن کر چلنا یا کسی بزرگ کی شان میں گستاخی کرنا۔ ادب کو اب تک ہم مذہب ہی سمجھتے ہیں۔ اقبال نے حافظ کی شاعری کو گوسفندی قرار دیا تھا تو کتنی ہی مقدس جبینوں پر شکن آ گئی تھی۔ اسی طرح ہماری قدیم جانی پہچانی اپنی عظمت میں ایورسٹ کی چوٹی کی طرح محفوظ شاعری پر یہ حملہ ویسا ہی قابل اعتراض تھا جیسا بعض سرپھروں کا ایورسٹ کی پاک فضا کو اپنے قدموں سے پامال کرنے کی کوشش کرنا۔ روما کے ایک شہنشاہ کے متعلق روایت ہے کہ وہ چاہتا تھا کہ مرتے وقت بھی نہ جھکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ساری زندگی زمین پر رینگتے گذاریں اور زمین پر رینگنے کی سب سے بڑی علامت وہ ذہنی قلعہ بندی ہے جو کسی طرح دلوں کے بت خانے کو صدمہ پہنچانا گوارا نہیں کرتی۔ پودوں کی طرح قوموں میں بھی خود کفالتی اچھی چیز سہی مگر مناسب نہیں۔ اچھی نسلوں کی تربیت اور اچھے خیالات کی اشاعت کے لیے دوسری قوموں کے خیالات کی تخم ریزی بھی مفید ہے۔
ابھی تک ہماری زندگی میں گہرائی، جامعیت اور ذہنی بیداری بہت کم ہے۔ اس وجہ سے ہمارا ادب تہی مایہ ہے۔ شاعر صرف شاعر ہے۔ سائنس داں صرف سائنس داں۔ دونوں اس بڑی انسانیت سے آشنا ہیں جو زندگی کو ایک مقدس فریضہ بناتی ہے۔ آپ میں سے بہت سے اشخاص نے بیورلی نکلس (BEVERLY NICHOLS) کی بدنام کتاب (VERDICT OF INDIA) پڑھی ہوگی۔ کتاب یکطرفہ ہے اور مصنف فن کار سے زیادہ خطیب اور مبلغ ہے، مگر بعض باتیں اس نے بہت اچھی کہی ہیں۔ ہندستان میں آ کر اس نے ہندستان کے آرٹ کے نمونے دیکھنے چاہے مگر اسے مایوسی ہوئی۔ ہمارے یہاں آرٹ کے معنی مغل اسکول راجپوت اسکول وغیرہ کے ہیں۔ بمبئی، پونا اور شانتی نکیتن میں جو آرٹ کے اسکول ملتے ہیں ان میں بھی اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کے ہندستان کی روح بولتی ہے۔ جدید ہندستان کے دل کی دھڑکن اس میں کہاں، اس کی وجہ

یہ ہے کہ آرٹ کو زندگی میں وہ درجہ نہیں مل سکا جس کا وہ مستحق ہے۔ اگر شعر و شاعری، موسیقی، سائنس اور دوسرے علوم سے واقفیت بھی شخصیت کی تربیت کے لیے ضروری سمجھی جاتی تو اور چیزوں سے قطعِ نظر اس سے ہمارے ادب کو بڑا فائدہ پہنچتا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ اس لحاظ سے ہمارا پرانا طریقۂ تعلیم کچھ برا نہ تھا۔ درس نظامیہ پر ہم لاکھ اعتراضات کریں لیکن اس میں متداول علوم سے آشنا ہونا تو ضروری تھا۔ ہمارے نئے طرزِ تعلیم نے پرانے طرز کی اس معنویت اور گہرائی کو چھوڑا اور خود کوئی وسعت اور جاذبیت پیدا نہ کی۔ نتیجہ ظاہر ہے ؎

سینہ خالی آنکھیں ویراں دل کی حالت کیا کہیے

عرصہ ہوا میں نے ہکسلے کی مشہور کتاب ——— POINT COUNTER POINT پڑھی تھی۔ کتاب کے خاتمے پر بیتھوون کے نغمے کا جو اثر قاتل پر ہوا ہے اس کا راز اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ رومین رولاں نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف (JEAN CHRISTOPHE) میں ایک مغنی کی ذہنی نشو و نما کی داستان بیان کی ہے۔ کتاب اپنے خلوص، نظر اور فطرتِ انسانی کی نبض شناسی کی وجہ سے غیر فانی ہے مگر بعض اوقات اس بات پر افسوس ہوتا ہے کہ کس طرح فرانسیسی اور جرمن قوم کی رگ رگ میں نغمہ بھرا ہوا ہے اور ہم اس سے محروم ہیں۔ ہندوستان میں نغمہ اب ریڈیو دربار اور کوچہ و بام کے لیے وقف ہو کر رہ گیا ہے۔ اس میں ہمارے یہاں مغرب کی اصطلاحیں اشاریت، رمزیت کیوبزم وغیرہ استعمال ہوتی ہیں جو مصوروں سے لی گئی ہیں مگر ہم ان کی روح سے ناواقف ہیں۔ ہم لفظ کے حسن کو پہچانتے ہیں۔ موئے قلم کو حقیر سمجھتے ہیں۔ ادب اور سائنس ہمارے نزدیک ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ہمارے یہاں کوئی سیاسی شاعر نہیں، کوئی مفکر ادیب نہیں، کوئی ڈاکٹر نہیں جو سمرسٹ ماہم کی طرح ادبی کارنامے پیش کر سکے۔ ایسے فلسفی نہیں جو برٹرینڈ رسل اور ہالڈن کی طرح ادیب بھی ہوں۔ ایسے عالم اور مفکر نہیں جو جیمس اور آلیور لاج کی طرح شگفتہ اور شاداب طرزِ تحریر رکھتے ہوں اور اس پر فخر کرتے ہوں۔ اب تو سائنس سے ضبط و نظر، حقیقت پسندی، عقلیت، خارجیت اور کیا کیا کچھ لینا ہے۔ اسے روح کا ہی نہیں مادے کا بھی حسن پہچاننا ہے۔ اسے چاندنی رات کے شیریں دھندلکے کے ساتھ بجلی کی تیز اور بے رحم روشنی کا حسن بھی دیکھنا ہے۔ اسے فطرت کے حسن کے ساتھ ساتھ انسانی صنعت کے حسن کو بھی جذب کرنا ہے۔ اس جنگ نے جو قیامت کی طرح ہمارے سروں پر ٹوٹی ہمیں کتنے استعارے، کتنی تشبیہیں، کتنے نئے افسوں اور افسانے، کتنی امیدیں اور کیسی تلخیاں عطا کی ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو آنکھیں بند کر کے نئے عنوانات پر طبع آزمائی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ جب تک آپ اس قوت اور حقیقت سے واقف نہ ہو جائیں جو ان عنوانات کے پیچھے کام کر رہی ہے، عنوانات پر طبع آزمائی بے کار ہے۔ ہوائی جہاز یا جوہری بم پر نظم یا افسانہ لکھنا بڑی بات نہیں، بڑی بات اس کو سمجھنا ہے کہ ان چیزوں نے زندگی کے مفہوم کو کس قدر بدل دیا ہے۔

سائنس اور ادب کے سنجوگ سے سائنس کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ موجودہ صنعتی رجحانات کی وجہ سے یہ خطرہ ہو رہا ہے کہ سائنس داں کہیں سرمایہ داری کے ہاتھوں میں کھلونا نہ بن جائیں۔ بقول اکبر ان کا خونِ جگر کسی کا مالِ تجارت نہ ہو جائے۔ ادب انھیں زندگی کی ایسی قدریں دے سکتا ہے کہ وہ سائنس کو انسان کے لیے رحمت بنا سکیں مشینوں کی حکومت دل کے لیے باعثِ موت نہ ہو، صنعت انسانیت کو کچل کر نہ رکھ دے۔ ایک طرف صنعتی اور میکانکی تصورات کی آمیزش سے ہماری خیالی زندگی میں ٹھوس حقیقتوں کا حسن آئے گا، دوسرے ادب کی معیار پرستی اور انسان دوستی سے سائنس کی ہلاکت آفرینی کم ہوگی۔ ادب اسے روح بھی دے گا اور ہندوستان کو دونوں کی ضرورت ہے۔

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ جنگ کے بعد ہندوستان میں جو صنعتی انقلاب آنے والا ہے، اس کے تہذیبی نتائج کیا ہوں گے۔ ایک زمانے میں فنون کے طلبا اور سائنس کے

طلب میں دس اور ایک کی نسبت ہوتی تھی۔ ابھی حالات اس کے برعکس تو نہیں ہیں لیکن جلد ہی وہ صورت بھی آنے والی ہے۔ ہندستان میں تعلیم قومی ضروریات اور فطری صلاحیت کو دیکھ کر حاصل نہیں کی جاتی بازار کو دیکھ کر حاصل کی جاتی ہے۔ ہندستان کی یونیورسٹیاں ایک عرصے تک سائنس کو ذریعہ ہیچ سمجھتی رہیں۔ آج وہ اس تیزی سے اس گناہ کا کفارہ ادا کر رہی ہیں کہ اندیشہ ہے، کہیں فنون اور ادبیات کی مقبولیت پر اس کا بہت برا اثر نہ پڑے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ہماری کوئی سوچی ہوئی تعلیمی پالیسی نہیں ہے۔ یہ وقتی اور ہنگامی اثرات کا شکار ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ابھی سے علم وفن، سائنس اور ادب میں ربط پیدا کریں۔ ہوائی جہاز بنائیں اور فضا پر حکومت کریں مگر ہوا باز میں حسن کا احساس، سماجی شعور اور اچھی شخصیت بھی پیدا کرنے پر اصرار کریں۔ ان کی ذہنی اور اخلاقی تہذیب، ان کے تاریخی شعور، ان کے قومی جذبے کو استوار کریں۔ آپ دیکھیے گا انھیں راستوں سے ادب ان کے دل میں جاگزیں ہوگا اور زندہ رہے گا۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ جدید زندگی میں ادب کا وہی درجہ ہو جس کا وہ مستحق ہے تو آپ ادب کے ایک ترقی پسند نظریے سے انکار نہیں کر سکتے۔ ترقی پسندی آج کل کافی بدنام ہے اور اس بدنامی کا باعث اس کے نادان دوست اور دانا دشمن دونوں ہیں۔ ہندستان کی ہر تحریک کی طرح یہ بھی نعروں، ترانوں اور ہنگامہ پسندی کا شکار ہو گئی ہے۔ اس کے بہت سے علمبرداروں میں بڑی رعونت ہے۔ عصمت چغتائی نے "دوزخی" میں کہیں لکھا ہے کہ وہ شروع شروع میں ادب صرف اس چیز کو سمجھتی تھیں، جو گذشتہ آٹھ دس سال میں لکھی گئی ہو۔ بہت سے پرجوش مگر سطحی ترقی پسند ناقدوں کا یہی خیال تھا مگر یہ ترقی پسندی کا سطحی ناقص اور غلط تصور ہے۔ اردو میں ترقی پسند رجحانات ہمیشہ پائے گئے ہیں اور حالی اور آزاد کے وقت سے ان رجحانات کو ایک مستقل تحریک کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ دو جنگوں کے درمیان جو تلخی اور بیزاری ادب میں پیدا ہوئی اور جس نے بڑھ کر ترقی پسند تحریک کا نام اختیار کیا اس نے ادب اور زندگی کے خاموش سمندر میں خاصا تلاطم پیدا کیا ہے اور اس تلاطم سے بڑے بڑے فائدے بھی حاصل ہوئے ہیں۔ فائدے جو نقصان سے ہر طرح زیادہ ہیں۔ غلط اور نام نہاد مذہبیت کو کم کرنے میں جو ایک پیر تسمہ پا کی طرح مسلط تھی، معاشرتی الجھنوں اور گرہوں کو صاف کرنے میں طبقاتی بے انصافی اور سیاسی عناصر کے خلاف آواز اٹھانے میں، عقلیت کی روشنی کو عام کرنے میں، ایک بین اقوامی تصور اور پس منظر کے پیدا کرنے میں، اندھی روایت پرستی کو شکنے میں، سستی جذباتیت اور معجون شباب اور قسم کی روحانیت کا پردہ فاش کرنے میں، تجربوں کی راہ کھولنے اور حقائق سے آنکھیں چار کرنے والی جرأت پیدا کرنے میں ترقی پسند ادب کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اس میں ہر قسم کے لوگ شامل ہو گئے ہیں۔ جس طرح بہت سے ترقی پسند یا تو لذتیت کے پجاری ہیں یا نفسیاتی تجزیے کے نام سے زندگی کی الجھنوں میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں لاشعور کی مصوری یا جنسی جذبے کی عکاسی، زندگی میں اہمیت ضرور رکھتی ہیں مگر یہ ایک نشہ بھی ہیں اور قوموں کی صحت کے لیے ایسے نشے بہت اچھے نہیں ہوتے۔ ہکسلے نے لکھا ہے کہ ہندستان میں قوت مردی کی دواؤں کے اشتہار ایک خاص کمزوری کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس چیز نے انسانوں کو اچھا خاصا کوک شاستر بنا دیا ہے۔ گو یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ادب لطیف والوں کے مقابلے میں ترقی پسندوں کی عریانی مختلف ہے۔ ادب لطیف کے نام لیوا، عریانی کو حسین بنا کر پیش کرتے تھے۔ ترقی پسند عریانی کے باوجود دراصل لذتیت کے پجاری نہیں، ان کے منہ کا مزا کڑوا ہے۔ وہ اس عریانی کے دھبے دکھانا چاہتے ہیں۔ ادب لطیف کا آرٹ چٹخارے کا آرٹ ہے۔ ترقی پسندی کا طنز کا ایک نشتر ہے دوسرا ترشی، ایک مست کرتا ہے، دوسرا ہوش میں لاتا ہے

امراض و علاج کے سلسلہ میں تین اہم کتابیں

دیہاتی مُعالج

اس کتاب میں ۶۶ کے قریب ایسی جڑی بوٹیوں اور چیزوں کے بارے میں معلومات پیش کی گئی ہیں، جو گاؤں میں اور گھروں میں عام طور پر ملتی ہیں اور سو سے فی صد بیماریوں کا قدرتی علاج ہیں۔ اسی کے ساتھ کتاب میں تندرستی کی حفاظت کے اصولوں اور اتفاقی حادثات کا علاج بھی بتایا گیا ہے۔

قیمت : حصہ اوّل ۸/۵۰

حصہ دوم ۷/۵۰

(محصول ڈاک الگ)

ہمدرد مَطب

جناب حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی، واقف متولی ہمدرد دواخانہ (وقف)، دہلی کے افادات پر مشتمل اس کتاب میں ۱۱۹ امراض اور ان کے اسباب و اقسام اور ان کے سلسلہ میں احتیاطی تدابیر کے ساتھ ساتھ ان کے مختلف متبادل علاج ایسے ڈھنگ سے پیش کیے گئے ہیں جو آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ یہ کتاب یونانی طریقہ علاج کے سب سے زیادہ کامیاب اور معبول 'ہمدرد مطب' اور 'ہمدرد مجلس تشخیص و تجویز' کے سالہاسال کے تجربات کا خلاصہ ہے۔

۱۴۴ صفحات ـــــ قیمت آٹھ روپے صرف

محصول ڈاک بذمہ خریدار

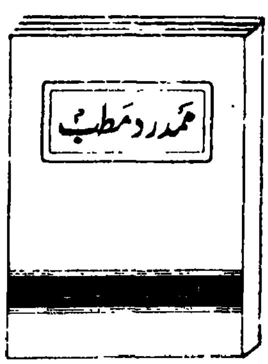
قرابادین مجیدی

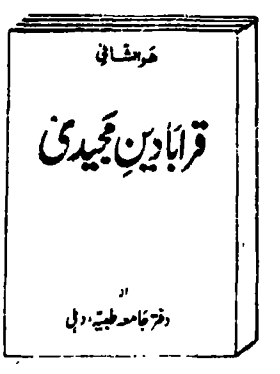
اس بے نظیر قرابادین میں یونانی مرکبات میں سے سات سو کے قریب مشہور و کثیر الاستعمال ان دواؤں کے اجزا، ترکیب تیاری اور استعمال کے طریقے بتائے گئے ہیں، جنہیں زمانۂ قدیم سے اطبائے کرام کامیابی سے استعمال کراتے آرہے ہیں۔ کتاب کے آخر میں بہت سی ایسی مفرد دواؤں کے بدل بھی تحریر کردیے گئے ہیں، جن کے ملنے میں اکثر دشواری پیش آتی ہے۔

صفحات ۳۷۶ ـــــ قیمت : اکیس روپے۔

یہ کتاب صرف اُردو میں ہے۔







ہمدرد دواخانہ (وقف) ہمدرد ہمدرد مارگ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

QA/PN-49

جواب کی طرف لے جاتا ہے دوسرا بیداری کی طرف۔
بھی تک بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہر نئی چیز
پسند تحریک کے ذیل میں آتی ہے۔ یہ صحیح نہیں ہو سکتے ہی
لکھنے والے ترقی پسندی کے مفہوم سے واقف نہیں۔ منٹو اور
عصمت، میرا جی اور راشد کی آزاد شاعری سب کی سب ترقی پسند
بہت سے افسانے ترقی پسند ہیں مگر بو، اور لحاف کسی
طرح اس ذیل میں نہیں آتے۔ یہاں فنکار اپنی منزل مقصود سے
ہٹ کر راستے کے پھولوں سے دل بہلانے لگا ہے چنانچہ اچھے
لکھنے والوں میں ترقی پسندی کے ہلکے یا گہرے رنگ ملتے ہیں بعض ان
کے برخلاف اب ترقی پسند ہو رہے ہیں۔ شاعری، حسن
شاعر کی طرح ترقی پسندی کا کوئی بندھا ٹکا فارمولا نہیں
ہے۔ یہ ایک رجحان، ایک تصویر حیات ایک منزل مقصود ہے۔
میرے خیال میں اقبال اور پریم چند کے یہاں ترقی پسندی
کا صحیح تصور ملتا ہے۔ افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر
سنگھ بیدی، اختر انصاری، سجاد ظہیر، حیات اللہ انصاری
علی عباس حسینی اس ذیل میں آتے ہیں۔ یہ فہرست مکمل
نہیں ہے، اس میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔
مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ جس طرح ایک زمانے
میں غزل مقبول تھی اسی طرح آج افسانے مقبول ہیں۔
افسانوں اور غزلوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں دونوں
کی چھوٹی سی دنیا میں آپ بہت کچھ بھر سکتے ہیں، دونوں کا
آرٹ تلوار کی دھار کا آرٹ ہے۔ دونوں دراصل چاول
پر قل ہو اللہ لکھنے اور نقش نگینے بنانے کے فن ہیں دونوں
میں عظمت ہے مگر دونوں میں خطرہ بھی ہے۔ غزل کی وجہ سے
ہمارے شاعر نہ مسلسل سوچ سکتے ہیں نہ مسلسل لکھ سکتے ہیں۔
اشاروں ہی اشاروں میں باتیں کرنے کی وجہ سے ان کی
گویائی سلب ہو گئی ہے۔ وہ چیزوں کے ربط سے واقف ہیں
نہ تعمیر کے حسن کو جانتے ہیں۔ ہمارے افسانہ نگار بھی غزل گو
شعرا کی طرح چند آڑے ترچھے نقوش کے عادی ہو گئے
ہیں۔ وہ بڑے حساس ہیں۔ زندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔
اور اس کی جھلک اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔ یہ
افسانے چمکتی ہوئی بجلیاں ہیں۔ آفتاب پارے ہیں۔ فتنہ
ہیں قیامت ہیں مگر یہ سارا ادب نہیں، ساری زندگی
نہیں۔ انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو کبھی کبھی دیکھنے کی
کوششیں ہیں۔ ہمارے بیشتر افسانہ نگار افسانے کی تکنیک
سے واقف نہیں۔ اس کے فارم کی آسانی کو دیکھ لیتے ہیں۔
افسانہ محض ایک مختصر قصہ، ایک بھولی یاد، ایک چھوٹی سی
کہانی، ایک منظر کی تصویر یا غزل کا ایک شعر نہیں یہ ایک
لمحے کو اس طرح روشن کر دیتا ہے کہ وہ پوری زندگی معلوم ہو۔
یہ ایک ایسا تاثر ہے جو کبھی دل سے محو نہ ہو۔ اس میں ایک
وحدت خیال ہوتی ہے جو کم نہیں افسانہ نگاروں کے بس کی بات
نہیں ہر قسم کے افسانوں کی یہ کثرت اردو ادب کے لیے ایک
خطرہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں بعض بڑے
اچھے افسانے لکھے گئے ہیں اور ان کی وجہ سے ہمارے ادب
میں اضافہ بھی ہوا ہے مگر عام طور پر اس کی وجہ سے چٹخارہ
چھپ چھپ کر ہمارے مزاج میں راہ پاتا جا رہا ہے۔ ادب
لطیف کا نشہ ہو یا نام نہاد ترقی پسند ادب کی عریانی
دونوں چٹخارے کے ادب کے ذیل میں آتے ہیں۔ حسن و عشق
کی چاشنی، زبان کی چاشنی، خطابت کی چاشنی اور انقلابی
چاشنی ان سب کے نمونے ہمارے افسانوں میں مل جائیں
گے۔ ہم چاشنی کی خاطر ہر چیز پڑھتے ہیں اور ہمارے ادیبوں
کا کام ذرا خوبی سے مختلف چاشنیوں کو ملا کر پیش کر دینا ہے۔
میں افسانوں کا مخالف نہیں ہوں نہ میں کلیم الدین صاحب
کی طرح غزل کا مخالف ہوں مگر افسانوں کی اس کثرت اور
مقبولیت کی وجہ سے ہمارے ادبی مزاج پر جو اثر پڑ رہا ہے
اسے دیکھتے ہوئے مجھے خطرے کی گھنٹی بجانے کی ضرورت
محسوس ہوئی۔ رہی غزل، تو میں غزل کے حسن کا قائل ہوں
یہ ہلکے پھلکے لطیف جذبات کے اظہار کا بہت اچھا ذریعہ ہے
کبھی کبھی ہم اس میں بڑی بلاغت سے اچھے اچھے خیال کو
ادا کر سکتے ہیں کبھی کبھی اس کے ذریعے سے ہم ساری زندگی پر
نظر ڈال کر پھر لوٹ سکتے ہیں، مگر غزل کے ستر پردوں میں
ساری عمر اظہار خیال کرنے کے بعد ہماری حالت اس قیدی

کی سی ہو گئی ہے ، جو تاریکی کے بعد روشنی کا مقابلہ نہیں کر سکتا اچھی غزل کہنا بڑا مشکل ہے اور اچھی غزل کہنے کی قدرت بڑی مشکل سے ہوتی ہے ۔ اس میں اتنی جانی پہچانی آوازیں ہیں کہ کسی نئی آواز کا پہچاننا مشکل ہے ۔ اس کا پیدا کرنا بھی آسان نہیں ۔ غزل کے اشارے کنائے اس کے نکتے اور رمز بڑے بلیغ ہیں لیکن تفصیل ، تعمیر ، مسلسل خیال ، وضاحت کا بھی ایک حسن ہے ۔ غزل کے جادو سے کون کافر انکار کر سکتا ہے لیکن وجد و رقص کے علاوہ خیال میں ایک مکمل تصویر بھی ضروری ہے ۔ فطرت کے مناظر ، انسانی زندگی کے ڈرامے ، رزم و بزم کے نقشے ، ذہنی و جذباتی کشمکش کے مرقعے اگر منظوم ڈراموں نظموں ، مثنویوں اور قطعوں کے ذریعے سے پیش کیے جائیں تو کیا ہرج ہے ۔ میں عظمت اللہ خاں کی طرح غزل کا گلا گھونٹنا نہیں چاہتا ۔ غزل کے ساتھ دوسری اصناف کی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلانا چاہتا ہوں ۔

نظم کی ضرورت اور اہمیت مسلم ، مگر اس وقت ہمیں سب سے زیادہ ضرورت سنجیدہ واضح اور مدلل نثر کی ہے ۔ شاعری کا مذاق ہماری طبیعت میں ایسا رچ گیا ہے کہ ہم اب بھی نثر میں شاعری کی خصوصیات ڈھونڈتے ہیں ، ہم انسانوں میں بھی ادبیت کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور ادبیت کے معنی ہماری لغت میں محض شعریت کے ہیں ۔ پہلے تو ہر دو چار سطر کے بعد ایک شعر منہ کا مزا بدلنے کے لیے ضروری ہوتا تھا اور نثر کے کڑوے گھونٹ اس چاشنی کی مدد سے گلے سے اتارے جاتے تھے ۔ اب اشعار نہیں تو اشعار کے کچھ الفاظ یا اجزا ہوتے ہیں جن سے مطالعہ کی گہرائی اور وسعت کا ثبوت دیا جاتا ہے ۔ شاعرانہ نثر کا زمانہ ختم ہوا تو خطیبانہ نثر وجود میں آئی ۔ اس کے سب سے بڑے امام مولانا ابوالکلام آزاد ہیں ۔ مولانا بہت بڑے انشا پرداز ہیں مگر ان کا رنگ خطیبانہ اور جذباتی ہے ۔ ان کے وسیع علم ، گہرے مشاہدے اور رنگین طبیعت کے اثر سے اس خطیبانہ اور جذباتی رنگ میں ایک عظمت پیدا ہو جاتی ہے ۔ شخصیت کی گرمی طرز بھی آتش نفس ہو جاتا ہے ۔ خلوص کی آنچ جامد الفاظ کو انگارہ بنا دیتی ہے ۔ مگر ملٹن کی طرح ان کا طرز بھی ادب کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے ۔ ملٹن کے اسلوب کو نبھانے کے لیے اس کی سی رفعت خیال ہونی چاہیے ۔ ابوالکلام اب بہت بدلے ہیں ۔ انہوں نے رام گڑھ کانگرس کے خطبۂ صدارت میں "تذکرے" کی زبان سے نہیں لکھی بلکہ ہندستانی لکھی ہے اور خطوط کے اس مجموعے میں جو "غبارِ خاطر" کے نام سے حال میں شائع ہوا ہے جا بجا سادہ اور آسان الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ مگر ان میں وہی پینکاریاں ہیں جو "الہلال" کے مضامین میں ہیں مگر ہماری صحافت نے ابوالکلام کی تقلید میں جو عالمانہ ، جذباتی ، مرعوبیت اور تقدس سے پر تکلف طرز عام کر دیا وہ اردو کے حق میں کچھ مفید ثابت نہیں ہوا ۔ غرض آزاد کی جادو نگاری ہو یا ابوالکلام کی آتش بیانی ، عبدالماجد کی رقت آلود جذباتیت ہو ، یا نیاز کی پر تکلف شاعرانہ اور رنگین میناکاری ، ان سب میں گرم مسالے کی فراوانی ہے ۔ حالی کو اب بھی لوگ سپاٹ کہتے ہیں ، اور سرسید کو خشک ۔ حافظ نے ایک خالِ محبوب پر سمرقند و بخارا بخش دینے کا عزم کیا تھا ، ہم اب بھی ایک اچھے فقرے کی خاطر بڑی بڑی کوتاہیوں کو معاف کر دیتے ہیں ۔ اچھے اسلوب میں تلوار کی جو تیزی بہتے ہوئے پانی کی جو روانی آئینے کی جو صفائی اور ادائے محبوب کی سی جو دلربائی ہوتی ہے اس سے کتنے واقف ہیں اور جن نئے لوگوں نے اظہار خیال کے لیے نئی زبان بنائی ہے وہ ترجمہ کرتے ہیں ۔ ہماری کتنی ہی کتابیں انگریزی ادب کا چربہ معلوم ہوتی ہیں ۔ ان کی زبان اکھڑی اکھڑی ، ان کے خیالات ژولیدہ ۔ ان کی عبارت پیچیدہ ہے ۔ وہ سوچتے انگریزی میں اور لکھتے اردو میں ہیں ۔ ایک طرف گرم مسالے کی بھرمار ہے دوسری طرف غذا کچی پکی اور کبھی بالکل پھیکی ہے ۔ توازن اور اعتدال کی دونوں طرف کمی ہے اور وضاحت اور سلاست کی بھی ۔

مانٹینے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اچھے اسلوب میں وکالت کی شان کم ہونی چاہیے ، سپاہی کا یا قطعی لہجہ زیادہ ۔ ہمارے یہاں قطعیت ہے مگر وہ قطعیت نہیں جو واضح خیال اور گہرے علم سے پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ قطعیت ہے جو یکطرفہ

ــــ رائے اور سطحی علم کی پہچان ہے۔ ہم میں وکیل اب بھی زیادہ ہیں مبصر اور پارکھ کم۔

یہ وکالت کہیں اتنی نمایاں نہیں جتنی تنقید میں۔ ہماری تنقید یں ابتک بیشتر پروپیگنڈا ہیں۔ ہم یا توکسی کی تعریف کرتے ہیں یا اس کے چھترے بکھیرتے ہیں یا پھر اپنی علمیت کا مظاہرہ ادبی اصطلاحوں ناموں اور نظریوں کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں۔ تنقید ایک کشکول نہیں ہے جس میں ادھر اُدھر سے ٹکڑے جمع کرکے پیش کردیے جائیں نہ یہ دوسروں کے اقوال کو ایک خاص انداز سے یکجا کرکے سستی مغربیت یا نام نہاد مشرقیت کا علم بلند کرنے کا دوسرا نام ہے۔ جب تنقید کو زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تھی تو لوگ تذکروں میں صاف صاف لوگوں کی تعریف یا مذمت کیا کرتے تھے۔ اب ایک پُر فریب طریقہ نکلا ہے کہ ایک شخص کی تعریف کرنے کے لیے ایک خاص اصول بناتے ہیں یا محض فن کی غلطیوں کو دیکھ کر کسی کے خلاف فتویٰ صادر کردیتے ہیں۔ سنجیدہ اصول اور غیر جانبدار تنقیدیں اب بھی بہت کم ہیں۔ نیاز نے ایک زمانے میں جوش پر اعتراضات شروع کیے تھے آج کل جگر کے اشعار پر عمل جراحی کررہے ہیں۔ تاثیر نے کرشن چندر کے ناول کو محض اس وجہ سے قابل اعتنا نہ سمجھا کہ اس میں کوئی خاص پلاٹ نہیں ہے۔ حالانکہ کتنے ہی بڑے اور اچھے ناول ایسے پیش کیے جاسکتے ہیں جن کا کوئی خاص پلاٹ نہیں۔ 'مداوا' میں ترقی پسند ادب کو سمجھے بغیر اس پر اعتراضات کیے گئے اور ہر نئے لکھنے والے کو ترقی پسند کہہ کر اس کو برا بھلا کہا گیا۔ 'نیا ادب' میں بعض اوقات سارے قدیم سرمائے پر آنکھ بند کرکے فتویٰ صادر کیا گیا۔ ان سب تنقیدوں میں ادب سے زیادہ وکالت اور جانبداری کار فرما تھی۔ تنقید بھی ایک فن ہے۔ اس کے بھی کچھ اصول ہیں۔ اس کے لیے اردو زبان سے ناواقف ہوتے ہوئے تنقید کے میدان میں اترنا ریت پر عمارت بنانا ہے۔ زبان سے واقفیت کے بعد زبان کی ادبی تاریخ پر عبور حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہ کام اتنا مشکل ہے کہ کم لوگ اس وادی سے کامیاب گزر سکتے ہیں۔ کوئی دکنی ادب کا نقاد ہے، کوئی غزل کا، کوئی بیسویں صدی کا، کوئی کسی دور کا کوئی کسی دور کا۔ پھر ادب کے ساتھ تاریخ نفسیات اور سائنس کے، صوبوں پر نظر درکار ہے اور دوسرے فنون لطیفہ سے مس شرط ہے۔ جس طرح میر کے خیالات کے مطابق انسان فلک کے برسوں پھرنے کے بعد وجود میں آتا ہے اسی طرح اچھا نقاد بھی بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے ہمارے نوجوان بلندی پر پہنچنے کے لیے ریاض نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بلندی کو اپنے معیار پر لے آتے ہیں وہ صحیح اور سادہ نثر لکھنا کافی نہیں سمجھتے وہ خلوص اور نظریے سے متاثر کرنے کے بجائے دکانداری اور دریچہ بندی سے مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ وہ تحسین و تنقید کے فرق کو نہیں پہچانتے، اور تنقید کی تخلیقی و تعمیری قوتوں سے ناواقف ہیں۔

خواتین وحضرات!

آپ کا شہر ایک یونیورسٹی کا مرکز ہونے کی وجہ سے علم کا مرکز ہے۔ یہ ایک شاندار ادبی تاریخ رکھتا ہے۔ آپ کے پرانے اہل علم کا تو ذکر ہی کیا، آج بھی ڈاکٹر عظیم الدین، پروفیسر کلیم الدین، قاضی عبدالودود، اختر اورینوی وغیرہ سے اردو ادب اچھی طرح واقف ہے۔ آپ کے رسالے 'معاصر' نے تنقید کا ایک بلند معیار قائم کیا ہے۔ آپ کے یہاں کے اشاعت خانوں نے ہمارے یہاں کے نوجوان شعرا سے بھی ملک کے اردو داں طبقہ کو روشناس کرایا۔ ظاہر ہے کہ اس شاندار ادبی روایت اور موجودہ ادبی جدوجہد کے پیش نظر احساس کمتری کا تو سوال ہی نہیں مگر صوبجاتی تعصب آپ میں پیدا ہوسکتا ہے۔ آپ کو بہار اسکول اور شاد اسکول پر ضرور فخر کرنا چاہیے مگر دوسرے دبستانوں کو سمجھنا اور ان کی قدر کرنا بھی ضروری ہے۔ مقامی رنگ اور مقامی خصوصیات اچھی چیزیں ہیں۔ مقامیت بری چیز ہے ازم بنالینا اچھا نہیں چشم تنگ کو کثرت نظارہ ملے تو وا ہوجاتی ہے۔

ادب میں جان ایک زندہ، ترقی پذیر اور لچک دار زبان سے آتی ہے۔ زبان کی بڑھوتری پر زیادہ پابندیاں

جائز نہ ہونے دیجیے۔ لوگ کہتے ہیں کہ فلم اور ریڈیو نے اردو ادب کو نقصان پہنچایا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی وجہ سے اردو اور زیادہ ہندستان گیر ہوگئی ہے۔ زبان کے بدلنے اور بعض نئے الفاظ کے شامل ہونے پر بہت زیادہ افسوس نہ کیجیے۔ ادب میں احتساب بہت سخت ہونا چاہیے۔ اردو دیو مالائی نہیں ہے۔ اس نے ہر زبان سے الفاظ لیے ہیں۔ اور اسے اب بھی لینا چاہیے۔ پہلے ہر ملک تجارتی پابندیوں کا قائل تھا۔ اب آزادانہ تجارت کا غلغلہ ہے۔ آپ کوئی ایسا قاعدہ نہ بنایئے کہ آپ کی زبان دوسری زبانوں سے نہ خود اثر لے سکے نہ ان پر اثر پڑ سکے۔ تجربے سے نہ ڈریے اور غلطی کرنے سے نہ گھبرایئے۔ موٹر کار اور ہوائی جہاز کے دور میں ریل گاڑی سے بھی کام لے سکتے ہیں، مگر اب بیل گاڑی چلانے والے ذہن کی ضرورت نہیں۔ زندگی اب گوتم کا مجسمہ نہیں رہی ہوائی جہاز ہوگئی ہے۔ جو لوگ اب بھی اس کے قائل نہ ہوں انھیں زمین سے غالب کا یہ شعر سنایئے ؎

با من میا ویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

(تنقید کیا ہے — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی — ۱۹۵۹)

بقیہ نئی شاعری کے نقاد

طرح ان کے شعور میں بھی ایک حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے اس لیے مختلف ملکوں کی شاعری میں بھی بہت بعد نہیں رہ گیا ہے۔ اس بنا پر یہ سوچنا کہ تنقید کے بعض عام اصول شاعری کے جانچنے اور پرکھنے کے بعض عام قاعدے جو جدید علوم کی مدد سے حاصل ہوتے ہیں اردو شاعری کے پرکھنے میں بھی مدد دے سکتے ہیں کوئی عجیب و غریب بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی شاعری کے نقادوں کا نئی زندگی اور نئے علوم سے واقف ہونا ہی صحیح نقطۂ نظر قائم کرنے میں معین ہو سکتی ہے نقاد تجزیے کے بغیر شاعری کی روح تک نہیں پہنچ سکتا اور تجزیہ کے لیے ان تمام علوم کی ضرورت ہے جو انسانی فطرت اور شعور کی فطری اور مادی تشکیل سے تعلق رکھتے ہیں۔

(تنقیدی جائزے — الناظر پبلشنگ ہاؤس الہ آباد — ۱۹۵۱)



پروفیسر احتشام حسین

نئی شاعری کے نقاد

شاعری کی تعریف اتنے گوناگوں انداز میں کی گئی ہے کہ واقعی کسی نتیجہ پر پہنچنا آسان نہیں رہا یہی وجہ ہے کہ ہر شخص شاعری کو اپنے مذاق اور ذوقِ سلیم کا پابند بنا دیتا ہے۔ جب دوسرے لوگ اس کے "ذوقِ سلیم" سے اختلاف کرتے ہیں تو وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اختلاف کرنے والا شاعری کے مفہوم سے ناواقف ہے۔

یہی نہیں شاعری کے بھیس میں اتنی چیزیں ہماری نگاہوں کے سامنے آتی ہیں کہ ان میں بہت تھوڑے سے اجزا مشترک پائے جاتے ہیں۔ لیکن ایک کا ذوقِ سلیم ایک طرح کی شاعری کو پسند کرتا ہے اور دوسرے کا دوسری طرح کی شاعری کو۔ شاعری کو ہر شخص کے ذوق کا پابند بنا دینا کوئی بہت معقول طریقہ معلوم نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی طریقے سے، کسی نہ کسی اصول کو سامنے رکھ کر ایک ایسا راستہ بنانا پڑے گا جس پر عمل کر کے جسے استعمال کر کے زیادہ سے زیادہ لوگ شاعری کے مفہوم کو سمجھ سکیں اور یہی نہیں بلکہ اصول اس طرح کا بنانا ہوگا جس میں شاعری کی مختلف تعبیروں کو جگہ مل سکے، اس کی مختلف قسموں کا احاطہ کیا جا سکے، اس میں ان تغیرات کو بھی سمویا جا سکے جو صرف ایجاد کے لیے نہیں بلکہ تاریخی تقاضوں اور وقت کی ضرورتوں کی وجہ سے شاعری میں ہوتے رہتے ہیں۔ ایسا راستہ شاعری کے حدود کو وسیع کرتا ہے اور شاعر کے دل سے نکلی ہوئی آواز کو بنی نوعِ انسان کی آوازوں سے ہم آہنگ بناتا ہے۔ گویا شاعر کے انفرادی تجربوں اور اس کے ذاتی محسوسات کو اس بزم میں باریابی حاصل ہوتی ہے جہاں بہت سے لوگ ایک ساتھ کہہ سکتے ہیں۔

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

جب تک کہ شعر و ادب کو اجتماعی اور سماجی ماحول کی روشنی میں نہ دیکھا جائے گا اس کی تعبیریں شاعری کو خواب پریشاں بناتی رہیں گی یا پھر شکل کے لحاظ سے شاعری کی خصوصیت کو متعین کرنا پڑے گا جسے فیصلہ کن خصوصیت قرار دینا درست نہ ہوگا۔

نئی شاعری کی پیدائش چونکہ ایسے دور میں ہوئی ہے جب انسانوں میں قوتِ نقد بڑھ چکی ہے، جب سائنس کے مختلف شعبوں کے علم نے انسانی فطرت، اس کی خواہشات، اس کے احساسات، اس کے ذوق و جمال، اس کے پسند و ناپسند گی کے اسباب سب کو بے نقاب کر دیا ہے جب شعور و لاشعور کے کشمکش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جب توہم پرستی کم ہو چکی ہے اور لوگوں نے اپنی عقلوں پر بھروسہ کرنا سیکھ لیا ہے، جب علم کی روشنی ہر شخص کے سینے کو منور کر سکتی ہے مختصر یہ کہ نئی شاعری کی پیدائش کا زمانہ وہ ہے جب شعر و ادب کے الہامی تصور کو ٹھیس لگ چکی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جا و بے جا طریقے پر لوگوں نے نئی شاعری کے مفہوم کو مسخ کر دیا اور نقادوں نے بغیر کسی اصول کو پیشِ نظر رکھے ہوئے جو کچھ جی میں آیا لکھ ڈالا۔ کسی نے نئی شاعری کی حمایت شروع کی تو وہ سب کچھ کر دیا جو اس کے کسی نقص اور کسی کمزوری کو ظاہر ہی نہیں کرتا اور اگر کسی نے اس کی مذمت کی۔ تو اس کے لیے وہ تمام الفاظ استعمال کیے جو اس کے زنگ آلود اسلحہ خانے میں اس دن کے لیے پڑے ہوئے تھے۔ ان دونوں قسم کے نقادوں نے تجزیہ اور منطق سے کام لے کر بحث کو سلجھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسے ایک جذباتی مسئلہ بنا کر اور الجھا دیا ہے۔

نئی شاعری یوں تو ہر وہ شاعری ہے جو دورِ جدید میں پیدا ہوئی۔ اس طرح وہ لوگ بھی تاریخی حیثیت سے نئے شاعر ہیں جو قدیم رنگ میں کہتے ہیں اور وہ بھی جو نئے رنگ میں شعر

کہتے ہیں صرف اس لیے کہ وہ بیسویں صدی میں شاعری کر رہے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نئی شاعری کہہ کر کوئی نقاد یہ مراد نہیں لیتا بلکہ وہ مواد اور صورت میں شاعرانہ اسلوب اور طرزِ فکر میں ایک طرح کے تغیر اور انقلاب کو "نئے" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اسے اور واضح کرنے کے لیے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اپنے وسیع ترین مفہوم میں نئی شاعری سے مراد وہ شاعری ہے جس میں حسب ذیل باتوں میں کسی ایک یا کئی ایک کا اظہار ہوتا ہو:۔

(۱) شعر اور نظم کی صورت میں کسی طرح کی تبدیلی۔ ہیئت میں ایسا تغیر جو شاعری کی عام ہدایتوں سے مختلف ہو۔

(۲) نئے سماجی اور سیاسی شعور کی بنا پر موضوع مواد اور طرزِ فکر میں تغیر۔

(۳) تخیل اور مبالغہ پرستی سے زیادہ واقعیت اور حقیقت پر زور دینا۔

(۴) شاعری میں ان مسائل کو جگہ دینا جن سے واقعی زندگی عبارت ہے۔

(۵) اس احساس کا اظہار کہ جمالیاتی عنصر مواد کی خوبی ہی کی وجہ سے پیدا ہو سکتا ہے مواد اور اسلوب میں ایک گہرا تعلق ہے جسے ایک ساتھ سوچنا ضروری ہے۔

(۶) رجعت پسندی، توہم پرستی، بے روح تصوف پرستی اور بے مقصد رومانیت سے بچنے کی کوشش۔

(۷) تمدن کے ان عناصر کی ترجمانی جو [illegible] انسانوں کی انفرادیت اور [illegible]

(۸) غلامی کے مقابلے میں آزادی، آمریت کے مقابلے میں [illegible] سرمایہ داری کے مقابلے میں ایک طرح کی مساوات [illegible] جس کی بنیاد جمع خوری پر نہ ہو اور جس میں محنت کا پھل [illegible] والے کو ملے، پر زور دینا۔

(۹) تمدن کی ان قدروں کی عزت اور حفاظت جو انسانیت کو آگے بڑھانے، ان آسائشوں کو حاصل کرنے، زندگی کو خوشگوار بنانے اور فطرت کے عناصر پر [illegible] دیا۔

(۱۰) وجود کو خیال پر مقدم قرار دے کر اقدار کا [illegible] مطلق قدروں کا قائل نہ ہونا بلکہ یہ جاننا کہ وقت کے تقاضوں سے طریقۂ پیداوار اور تقسیم میں تبدیلی پیدا ہونے سے شعر و ادب کی قدریں بھی بدلتی ہیں۔ اس وقت ذوق بھی بدلتا ہے۔

یہ چند باتیں نہ تو حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہیں اور نہ انھیں قطعی کہا جا سکتا ہے بلکہ بعض ضروری باتوں کو واضح کرنے کے لیے یہ جس طرح خیال میں آتی گئیں انھیں درج کر دیا گیا کہ انھیں غور و فکر کے بعد کم بھی کیا جا سکتا ہے اور بڑھایا بھی جا سکتا ہے۔ ان کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ نئی شاعری کا موضوع بہت وسیع ہے اور بہت پیچیدہ۔ اسے سمجھنے کے لیے تمدن اور نفسیات کے بہت سے مسائل کا علم ضروری ہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نہ تو نقادوں کو ان ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے اور نہ علم کی ضرورت کا۔ ایسی حالت میں نئی شاعری کی بہت سی تعبیروں کا پیش ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

اب اگر ہم ذرا دیر کے لیے اوپر لکھی ہوئی باتوں کے بعض ضروری اجزا پر غور کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ اس میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جنھیں قدیم شاعری سے دلچسپی لینے والے بھی بغیر اپنے مذاق کو بدلے ہوئے پسند کر سکتے ہیں اور بعض ایسی ہیں جن کی روایتیں موجود نہیں ہیں اور جنھیں ماننے کے لیے نئے تصورات کی تخلیق لازمی ہے۔ صرف نظم کی صورت اور ہئیت پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ مقررہ بحروں میں قافیہ اور ردیف کی شکلوں کو برقرار رکھتے ہوئے شاعری کرتے رہنا، مسمط اور ترجیع بند اور ترکیب بند کی مختلف شکلیں، قافیے کے استعمال میں جدتیں، گیتوں کا نیا انداز، مستزاد کی شکل میں نظمیں، بے قافیہ شاعری، آزاد شاعری اور وہ شاعری بھی جو شاعری کی ہر قید سے آزاد ہے ان سب کو نئی شاعری میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بند ولی کی تقسیم، لفظوں کے استعمال سے ترنم کی تخلیق، نئے استعارے، نئی تشبیہیں، نئی علامتوں اور نئے اشاروں کی مدد سے نئے اسلوب پیدا کرنے کی کوشش کو بھی شاعری کی لفظی تبدیلیوں میں اہم جگہ حاصل ہے۔ نقاد کے لیے ان تمام باتوں کا احساس ضروری ہے۔ وہ یہ نہیں کر سکتا کہ صرف اس بنا پر کسی چیز کو پسند کرے کہ اس کا جواز قدیم شاعری میں ملتا ہے یا اس بنا پر اسے رد کر دے کہ اس میں قدامت کی

ہوا کرتی ہے۔ یہ طریق کار اچھے نقاد کا نہیں ہو سکتا لیکن بہت سے لوگ صرف اسی طرح فیصلہ کرتے ہیں۔

نظم کی ہیئت' اور ظاہری شکل کے بعد موضوع' مواد' مضمون' اور فلسفۂ حیات پر خوب غور کر سکتے ہیں اور یہاں صرف طریق اظہار کا سوال نہیں رہ جاتا بلکہ نفس مضمون پر رائے زنی شروع ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے نئی شاعری عریاں نگاری اور فحش نگاری کے سوا اور کچھ نہیں۔ نئی شاعری صرف پروپگنڈا ہے۔ نئی شاعری کے ذریعہ بداخلاقی پھیلائی جاتی ہے۔ نئی شاعری کے ذریعہ شاعری کو خراب کیا جا رہا ہے۔ نئے شاعر پڑھتے لکھتے قیود سے گھبراتے ہیں اس لیے جو چاہتے ہیں کہتے ہیں' ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ نئی شاعری لامذہبیت پھیلانے کا ذریعہ ہے۔ نئی شاعری شاعری نہیں ہے۔ اور کوئی کہتا ہے پرانے شعرا کے دیوان میں آگ لگا دینی چاہیے۔ غزل نیم وحشی صنف سخن ہے۔ اس متمدن زمانے میں اس کی ضرورت نہیں۔ قدیم شاعری زندگی سے گریز ہے اور ایسی ہی بہت سی باتیں۔ لیکن نقاد کا فریضہ ان نعروں کو دہرانا' تنقیدی فقروں کا جا و بے جا استعمال نہیں ہے بلکہ اس کا فریضہ ان حالات کا تجزیہ ہے جس میں شاعری پیدا ہوئی ہے۔ ان خیالات کی تنقید ہے جو شاعر کے تجربے میں آ کر فنی شکل میں پیش ہوتے ہیں۔ ان تصورات کا احتساب ہے جنھیں وہ ایک ذمہ دار فنکار' ایک ذمہ دار انسان کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے۔ اسی حالت میں تنقید نگاری ان تمام علوم سے وابستہ ہو جاتی ہے جن سے انسانی تہذیب و تمدن کی تخلیق و تعمیر ہوتی ہے یا غیر شعوری طور پر جو خیالات کبھی افراد میں' کبھی جماعتوں میں پیدا ہو کر جذبات کی دنیا بناتے ہیں اور شعر و ادب میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔

اس طرح اتنی باتوں کا ایک ساتھ اندازہ لگاتے وقت نقاد کو بڑے علم کی ضرورت ہے اور قبل اس کے کہ وہ نئی شاعری کی تعریف کرے یا مذمت' اسے یہ جان لینا چاہیے کہ نئی شاعری کی ایک وسیع دنیا ہے اور اس کا اعتراض یا اس کی تعریف کس قسم کی شاعری' کس قسم کے شاعروں سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر نقاد اس کا خیال نہ رکھے گا تو وہ اس قسم کی سہل پسندی کا مجرم قرار پائے گا جو زیادہ دور تک نہیں دیکھتی اور پیچیدگیوں کا اندازہ نہیں لگاتی۔ مثال کے طور پر ایک آدھ بات سمجھنے کی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ نئی شاعری مبہم ہوتی ہے اور اس میں ناقابل فہم چیزوں کا ذکر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اعتراض صحیح ہو لیکن اسے ہمیشہ اور ہر حالت میں عمومیت کے ساتھ کہنا' نئی شاعری اور ترقی پسند شاعری سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا درست نہیں۔ ناقابل فہم اور مبہم ہونے کی وجہیں چند ہو سکتی ہیں۔

(۱) یا تو شاعر طریق اظہار پر قدرت نہیں رکھتا۔

(۲) یا ہم اس طریق اظہار سے واقف نہیں۔

(۳) یا وہ ایسی باتوں کا ذکر کرتا ہے جو انفرادی ہیں جن سے ہم واقف نہیں یا نہیں ہو سکتے۔

(۴) یا ہمارا علم اتنا کم ہے کہ ہم ان باتوں سے واقف نہ ہو سکے جن کا وہ ذکر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی اہم وجہ نہیں ہو سکتی۔ اب اگر شاعر طریق اظہار پر قدرت نہیں رکھتا تو اس کی غلطی ہے' نئی شاعری کی غلطی نہیں کیونکہ کئی نئے شاعر طریق اظہار پر قابو پا کر ہمیں آسودہ کرتے ہیں۔ اگر ہم اس طریق اظہار سے واقف نہیں تو ہمیں اعتراض کا حق نہیں۔ اگر واقف ہو کر اس میں خامیاں پائیں تو یہ اور بات ہے لیکن واقف ہوئے [illegible] نہیں۔ اگر وہ ان انفرادی باتوں کا [illegible] تا ہے جنھیں [illegible] لزام شاعر پر ہے۔ [illegible] سامنے پیش کرنا چاہتا ہے تو [illegible] مسائل حیات کو بھی سماجی مسائل [illegible] میں ڈھل جانا چاہیے ورنہ وہ گونگے کا خواب [illegible] لیکن اگر ہم اس لیے اس کی باتوں کو نہیں سمجھتے کہ ہمارا علم محدود ہے اور وہ نئے علوم کی مدد سے نئے خیالات پیش کرنا چاہتا ہے تو پھر شاعر کا قصور نہیں ہمارا قصور ہے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے' ہمارے علوم بدل گئے ہیں' طرز فکر بدل گیا ہے' ہم اپنے خیالوں کی کال کوٹھری سے نکل کر بین الاقوامی احساسات کی دنیا میں سانس لے رہے ہیں۔ ہماری تمنائیں وسیع ہیں اور ارادے

بلند ہیں۔ اس لیے نئی شاعری کا لہجہ اگر پرانے لہجے سے مختلف ہو جائے تو چونک کر منھ نہ پھیر لینا چاہیے بلکہ چونک کر اسے غور و فکر کا نقطۂ آغاز بنا لینا چاہیے۔ ان چند اشاروں کا جو بہت ہی بے ربط اور بے ترتیب ہیں مقصد صرف اتنا ہے کہ نئی شاعری میں اچھی اور بری دونوں قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ صرف بری چیزوں پر نظر رکھ کر سارے نئے ادب پر اعتراض کر دینا انصاف نہیں ہے کیونکہ اس طرح تو کسی قسم کی اور کسی دور کی شاعری میں خوبیاں نہ مل سکیں گی نئے نقادوں اور نئے شاعروں دونوں کے لیے اس جدید شعور کی ضرورت ہے جو علم اور خود اعتقادی کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

نئے شاعروں میں مختلف خیال اور مختلف رجحان کے لوگ ہیں۔ ان کے علم کی سطحیں بھی بہت مختلف ہیں۔ وہ مختلف سیاسی اور سماجی مقاصد کو سامنے رکھتے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جن کے پاس کوئی فلسفۂ حیات ہے۔ دنیا میں جو تغیرات ہو رہے ہیں ان کا علم ہے اور وہ بھی ہیں جن کی آنکھیں اپنے ہی اندر رکھلی ہوئی ہیں وہ باہر کی دنیا کو نہیں دیکھتے۔ ان میں سے وہ ہیں جو پرانی شراب کو نئی بوتلوں میں بھرنا چاہتے ہیں اور وہ بھی جو نئی شراب کو بھی پرانی بوتلوں میں بند کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں نئے شاعروں میں روایت پرست بھی ہیں اور قدامت شکن بھی، پھر آسانی کے ساتھ ایک ہی جملے میں پوری نئی شاعری پر کوئی رائے جو تجزیے پر مبنی نہ ہو کیونکر صحیح سمجھی جا سکتی ہے۔

اس لیے نئی شاعری کے نقادوں کو ایک دشوار گزار راہ پر چلنا ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے خلوص اور علم کی ضرورت ہے۔ صرف اپنی پسند اور خواہش کی بنا پر شاعری اور شاعر کے شعور کو نفرت کی نظر سے دیکھنا قوتِ نقد کی توہین ہے۔ ادھر ایک بات برابر دیکھنے میں آتی ہے جن پر نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ ہمارے بعض نقاد شعرا پر اس لیے ہنستے ہیں کہ وہ قدیم الفاظ، قدیم محاورات، قدیم علم و اخلاق، تصوف کے مصطلحات، پرانے رسم و رواج، طور طریقوں اور اندازِ بیان سے واقف نہیں ہیں اس لیے انھیں شاعری کے مقدس ایوان میں داخل ہونے کا حق نہیں ہے لیکن وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ آج زندگی کے مسائل دوسرے ہیں۔ سائنس اور فلسفے نے ذہن میں نئی تصویریں بنائی ہیں۔ زندگی نے محبت اور عشق کے طریقے بدل دیے ہیں۔ رسم و رواج میں تبدیلی ہو گئی ہے۔ تصوّف اور مذہب کی جگہ اشتراکیت اور مادیت کے مصطلحات نے لے لی ہے، رہنے سہنے کے طریقے دوسری طرح کا اخلاق پیدا کر رہے ہیں اس لیے نئے شعرا کو اس کا حق ہے کہ وہ اپنے نقادوں سے اس بات کا مطالبہ کریں کہ وہ بھی نئے علوم و فنون اور زندگی کی نئی آویزشوں کو جانے بغیر نئی شاعری کے متعلق کوئی رائے دینے کی کوشش نہ کریں۔ انصاف اور عقل کی نظر سے دیکھا جائے تو ان کا یہ مطالبہ حق بجانب ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں باتیں ادھوری ہیں۔ شاعری کو سمجھنے اور اس کے افادی یا حسن کا پہلو سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ دونوں کا علم ضروری ہے۔ کیونکہ آج کا انسانی شعور ماضی کے شعور سے تعلق رکھتا ہے اس لیے آج بھی کئی حیثیتوں سے ماضی کے علم کے بغیر حال کا مکمل علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن نئی شاعری کے قدیم تصورِ نقد رکھنے والے نقاد جن چیزوں کو خود جانتے ہیں صرف انھیں کو اہمیت دیتے ہیں اور کوئی بات ان کے علم کے باہر کہی جائے تو یا تو وہ اسے مبہم کہتے ہیں یا پھر اس کو شاعری کا موضوع جاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے لاعلمی یا کم علمی کے ساتھ تنقید نگاری نہیں چل سکتی۔

اردو شاعری میں نئے علوم اور نئے ادبی جائزے کا ذکر بعض لوگ پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ چیزیں بدیسی ہیں اور ان کا ذکر بے جوڑ سی بات ہے لیکن اس طرح سوچنے والوں کو اس بات کا علم بھی ہونا چاہیے کہ ساری دنیا میں شاعری کا رواج پایا جاتا ہے اور ہر جگہ کی شاعری میں بعض قدریں مشترک ہیں جن کا جائزہ لینے کے لیے بعض تنقید کے اصول ہر جگہ کے ادب میں پائے جاتے ہیں۔ پھر آج جس طرح ساری دنیا کے انسان بعض مسائلِ زندگی کے سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش میں علوم سے ایک ہی طرح مدد لیتے ہیں اسی

(بقیہ ص ۲۳۰ پر)



ڈاکٹر اعجاز حسین

ادبی ڈرامے

اگر ادب کی نشوونما کے لیے ماحول و مذاق کی ضرورت ہے تو اس کی کسی صنف کے لیے علاوہ ان باتوں کے شعور و ذہنی بینی کی بھی ضرورت ہے کیونکہ ادب ایک وسیع میدان کا ایسا مسافر ہے کہ جس طرف چاہے اپنا راستہ بنا لے مگر کسی مخصوص صنف کو ادب کی شاہراہ سے ہٹ کر ایک نئے راستے کی تلاش میں نکلنا پڑتا ہے۔ یہ راستہ نسبتاً تنگ بھی ہوتا ہے، اور دشوار گذار بھی۔ اس صنف کا تقاضا ہوتا ہے کہ یہ راہ نمایاں بھی ہو اور حسین بھی ہو۔ اس مطالعہ کو پورا کرنا جب ہی ممکن ہے کہ اس راہ پر چلنے والے کسی خاص شعور کے مالک ہوں۔ گرد و پیش ہی کے حالات پر ان کی نظر نہ ہو بلکہ ماضی کی تاریخ اور عروج و زوال کے مرقع بھی سامنے ہوں اور مزاج میں جدت پسندی بھی ہو۔ ادب کی روایت سے بھی واقفیت ہو اور کوئی مقصد بھی پیش نظر ہو۔ اس خیال کے لحاظ سے جب ہم اردو ڈرامے کی تاریخ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں بہت سی مجبوریاں ہولیں اس غریب کو نصیب نہ تھیں۔ اردو ادب کی جملہ اصناف سخن کو ابتدا میں فارسی کا سہارا ملا۔ غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی وغیرہ سب کو آگے بڑھاتے وقت ایرانی ادب کا مخزن و معیار موجود تھا تفصیلات و موضوعات کے علاوہ فنی و تخیل کو سہارا دینے کے لیے یہ ذخیرہ بہت کافی تھا۔ اس طرح کی روایات سے سہارا مل جاسکتی تھی مگر ڈرامے کے لیے کوئی سامان اس زبان میں نہ تھا، اس کی ادبیات کا دستور ہی میں اس صنف کو جگہ نہ ملی تھی۔ اسی کے علاوہ ہندستان کی دوسری زبانوں سے اس صنف میں فائدہ اٹھانے کا کوئی سوال نہ تھا اس لیے کہ ایک مدت سے سنسکرت زبان ہندستان میں نیم مردہ تھی۔ اس کے سمجھنے اور بولنے والے برائے نام تھے اس کے وہ ڈرامے جو عہد قدیم میں شہرت حاصل کر چکے تھے

اردو کی ابتدا ہونے سے بہت پہلے زیب طاق نسیاں ہو گئے تھے۔ دوسری زبانوں سے اردو قریب ہوئی ان میں بھی ڈرامے کا کوئی ایسا مواد نہ تھا جو اس کو اپنی طرف متوجہ کرتا۔ اس لیے اس صنف کو وجود میں لانے کے لیے ایک نئی تہذیب نئے تمدن کا انتظار کرنا پڑا۔ ہم اس سے بے خبر نہیں کہ انگریزوں کے محکم تسلط سے کچھ ہی پہلے واجد علی شاہ، امانت وغیرہ رہس کی صورت میں ڈرامہ اسٹیج پر پیش کر چکے تھے لیکن اول تو یہ کارنامے نقوش کی حیثیت سے زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے اور دوسرے آج جس صنف کو ہم ڈرامے سے تعبیر کرتے ہیں اس لحاظ سے یہ اردو ڈرامے کے باوا آدم نہیں کہے جاسکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو ڈرامے کی نشوونما اس وقت ہوئی جب مغربی تمدن و ادب سے ہم اور ہمارا ادب قریب ہوئے شروع میں ایسے ڈرامہ نگار سامنے آئے جو ڈرامے کی روح سے واقف نہ تھے۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی کہ جو لوگ ڈرامہ لکھانا اور اسٹیج پر دکھانا چاہتے تھے ان کا مقصد حصول زر کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ لوگ روپیہ کمانے کے لیے تفریح کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ مالکان کمپنی کو ادب سے واسطہ تھا نہ ادیب سے دلچسپی۔ ان کو غرض عوام کے ذوق تماشا کو آسودہ کرنا تھا۔ اس نقطہ نظر سے وہ ڈرامے لکھواتے اور اسٹیج سجاتے۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں جو کچھ لکھنے والوں کو حکم دیا جاتا اس کی تعمیل ضروری سمجھ کر قلم اٹھاتے بقول پروفیسر احتشام حسین جن تھیٹروں میں یہ ڈرامے دکھائے جاتے ان کی کوئی قومی یا تہذیبی اہمیت نہیں تھی بلکہ یہ صرف نئے تجارتی مرکزوں کی تفریح گاہ تھے۔ شاید اسی وجہ سے کسی بڑے ادیب نے اس صنف ادب سے کوئی دلچسپی نہ لی۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس طرح اردو میں جو ڈرامے

ادبی کتب

- اقبال کا فلسفۂ خودی۔ پروفیسر محمد عثمان ۔/۲۵
- اوصاف اقبال۔ بہار الہ آبادی ۔/۵۰
- ذکر اقبال۔ عبدالمجید سالک ۔/۲۰
- عرفانِ اقبال۔ لشیبہ مفتی ۔/۲۰
- مقاماتِ اقبال۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ۔/۲۰
- مریمن سے عبدالحق تک ۔/۲۵
- سرسید احمد خاں۔ ... ۔/۲۵
- اردو تنقید کا ارتقاء۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ۔/۳۰
- نادراتِ مرزا دبیر۔ سید صفدر حسین ۔/۱۰

- اردو تنقید نگاری۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ۔/۲۰
- مقالاتِ آزاد۔ مولانا آزاد ۔/۱۰
- انتخاب معانی۔ اسلم رفیق ایم اے ۔/۶
- ارشاداتِ تنقید۔ سید عبداللہ ۔/۲۵
- اقبال اپنے آئینے میں۔ رئیس احمد جعفری ۔/۲۵
- انسانیت موت کے دروازے پر۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۔/۷٫۵۰

ناول

- آنگن کا چاند۔ رضیہ جمیل ۔/۲۵
- دریا۔ شاہین حسی ۔/۲۵
- زندگی۔ پروین شریف ۔/۲۰

- خوشبو۔ مینا ناز ۔/۲۰
- دامانِ ساحل۔ عظمت اقبال شمع ۔/۲۵
- داستان در داستان۔ وحیدہ نسیم ۔/۲۰
- سونا سونا آنگن۔ سیدہ ساجدہ خاتون ۔/۲۰
- آہٹ ۔/۲۰
- جھوٹ جیا کیا کیا۔ ... ۔/۲۰
- ... سلطانہ ۔/۲۲٫۵۰
- بت رمنی۔ ... کیلانی ۔/۲۰
- ... زبیدہ سلطانہ ۔/۲۵

چمن بکڈپو۔ ۲۰۵۔ گلی گڑھیا۔ میٹا محل دہلی ۱۱۰۰۰۶

QAPN-20

ہماری چند معیاری مطبوعات

ناول

- درویش کی بیٹی۔ الیاس سیتاپوری ۔/۲۰
- لذت آشنائی ۔/۱۵
- ابن آدم ۔/۲۰
- خاقان اعظم ۔/۱۲
- سہاگ کی خنجر ۔/۲۰
- قراقرم کے باسی ۔/۲۰
- دیوتا کی بیٹی ۔/۲۰
- تمر ازیہ ۔/۲۰
- نقش فریادی ۔/۱۵
- قراقرم کی تباہی ۔/۲۰

- خون مشرق وسطیٰ۔ الیاس سیتاپوری ۔/۲۰
- کچرا گھر۔ محی الدین نواب ۔/۱۲
- بارود کے پھول ۔/۲۰
- طلسم ہوشربا۔ ابن صفی ۔/۲۰
- تفتیش صفی ۔/۲۰
- اردو کی آخری کتاب۔ ابن انشاء ۔/۱۰
- خمار گندم ۔/۱۲٫۵۰
- آبرو۔ حمیدہ جبیں ۔/۲۰

فنی کتابیں

- فن جوڈو ۔/۲۰
- آسان کراٹے ۔/۱۰

- ہپناٹزم کیا ہے ۔/۲۰
- ہپناٹزم کے عملی طریقے ۔/۲۰
- ٹیلی پیتھی گائیڈ ۔/۱۵
- آئینہ بینی و عمل حاضرات ۔/۱۰
- دنیا کے چھپے ہوئے اسرار علوم ۔/۱۰
- نام اور اس کے اثرات ۔/۱۰
- وچ کرافٹ (کالے جادو) بہترین عملیات ۔/۱۰

ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہونے والا جریدہ

نیرنگِ اردو ڈائجسٹ

پاکستانی ڈائجسٹوں کا بہترین انتخاب مع کہانیاں

قیمت ۔/۱۰

کتاب والا۔ ۲۷۹۴ پہاڑی بھوجلہ دہلی ۱۱۰۰۰۶

QAPN-27

وہ مغرب کے ڈراموں کی نقالی تھی۔ اگر یہ نقالی ...رح اور صحت مند طریقہ پر آتی تو شاید یہ اشک شوئی ہو جاتی مگر غضب تو یہ ہوا کہ ڈرامہ نویسوں نے شکسپیئر کے ڈرامے لے کر ...ستان کی پست ذہنیت کو خوش کرنے کے لیے ایسی تبدیلیاں ... کی وجہ سے یہ ڈرامے نہ گھر کے ہوئے نہ گھاٹ کے، نہ ان ... ... فنکری خصوصیات پیدا ہو سکیں نہ ہندستان ...یت اور اعلا اخلاقی قدروں کی روایتیں روشن ہوئیں۔ آغا حشر نے ضرور اور لکھنے والوں سے بہتر ڈرامے لکھے۔ ...یہاں رانسیت اور ڈرامہ نگاروں کے فکری عنصر اور مواد ...یلی ڈرامائی لحاظ سے صحت مند اور ترقی یافتہ ہے۔ ان کے ...یں بڑی متانت ہے۔ نثر و نظم میں بڑی جان ہے غالباً ...سے پہلے کسی ڈرامہ نویس نے ڈراموں میں اتنی نثر نہیں لکھی ...تھی۔ نظم ہی کا غلبہ ڈراموں میں رہتا تھا۔ آغا حشر نے نثر کو بھی وسیع جگہ دی، وقت کے تقاضوں کو بھی قصوں میں کھپانے کی فکر کی، سماجی مسائل اور زندگی کی کشمکش کو بھی پیش کرتے رہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ اُن کے یہاں بھی کوئی ذہنی تحریک نہیں، ان کا ... بھی مطمح نظر ڈرامہ دیکھنے والوں کی تفریح سے آگے نہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کہ ڈرامے میں شعوری طور پر صحت مند تبدیلی آ رہی تھی، گو اس تبدیلی کی رفتار بہت سست تھی مگر اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈرامہ لکھنے والے ذہنی و معاشی تقاضوں کو محسوس کرنے لگے ہیں۔

ڈرامہ نگاری کا یہ رجحان پہلی جنگ عظیم تک غالب رہا۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ اب تک سطحی مذاق و عوامی تفریح ڈرامہ نگاروں کے لیے اہم چیز تھی جس کے بہاؤ میں وہ اپنے کارنامے پیش کرتے رہے۔ ۱۹۱۸ء کے بعد سے ہندستان کی سیاسی تحریک نے پورے سماج کا نقشہ بدلنا شروع کیا۔ زندگی نئی کروٹیں لے کر قوم و ملک کو توانائی بخشنے لگی، حب الوطنی، ایثار، ملک کی آزادی کے لیے مسلسل جدوجہد اور اس قسم کے دوسرے جذبات سارے ہندستان پر چھا گئے۔ ذہنی فضا میں ہمیشہ سے زیادہ اجتماعی و سماجی شعور کی لہریں دوڑنے لگیں۔ اہل قلم کو بھی جنبش ہوئی کہ ادبی دنیا میں اس ہمہ گیر تحریک آزادی کے مرقعے مختلف اصناف سخن میں پیش کیے جائیں۔ افسانے، نظمیں، غزلیں، مضامین وغیرہ میں اس وقت کی عملی کاوشیں تیزی سے جگہ پانے لگیں چنانچہ صنف ڈرامہ کو بھی لوگوں نے عصری تقاضوں سے سنوارنے کی کوشش کی۔ اچھے ادب، اچھے افسانہ گو اس طرف متوجہ ہوئے۔ ان لوگوں کی توجہ سے ڈرامے کی بھی سطح کچھ بلند ہوئی لیکن پھر بھی بقول پروفیسر احتشام حسین کوئی حالی کوئی آزاد کوئی نذیر احمد کوئی شبلی کوئی سرشار کوئی اقبال کوئی جوش ڈراما کی دنیا میں نہ پیدا ہو سکا۔

اس کمی کی وجہ پر ہم غور کرتے ہیں، تو محسوس ہوتا ہے کہ نہ لکھنے والوں کی کمی تھی نہ مواد کی۔ اچھے اچھے ادیب مثلاً پریم چند، عبد الماجد، چکبست پنڈت وغیرہ نے ناٹک لکھنے پر توجہ کی لیکن ڈرامے کی سطح اتنی نہ بلند ہو سکی جتنا مختصر افسانوں اور نظموں کی ہو سکی، مغربی تمدن میں ڈرامے کی روح کو بھی اہل قلم پا چکے تھے۔ اجتماعی و قومی زندگی اور سیاسی تگ و دو میں ایسے واقعات کافی سے زیادہ سامنے آ گئے تھے جو اچھے ڈرامے کو وجود میں لانے کے لیے کافی تھے، مگر ان باتوں کے باوجود اردو میں کوئی ڈرامہ ایسا نہ لکھا جا سکا جو عالمی شہرت کا مالک ہوتا۔ امتیاز علی تاج نے البتہ انارکلی لکھ کر ڈرامائی کاوشوں کی لاج رکھ لی، لیکن اس ڈرامے کو بھی شکسپیئر کے ڈراموں کے مقابلے میں پیش کرنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔

اس خرابی کا ایک خاص سبب اسٹیج کی کمی معلوم ہوتا ہے، ڈرامہ اور اسٹیج کا جو گہرا ربط ہے اس کو سوچ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈرامہ خوبصورت طائر ہے اور اسٹیج اس کا پر پرواز جس کے بغیر طائر بلندی نہیں حاصل کر سکتا۔ اس کی خوبصورتی فطری قوت اور حسن جاذب نظر نہیں ہو سکتا۔ ڈرامے کی مقبولیت و نمائش اسٹیج کے بغیر ناممکن ہے۔ ہندستان میں آج تک اسی کی کمی رہی ہے۔ جس وقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت تھوڑے بہت اسٹیج جو بھی تھے، وہ

تجارتی ذہنیت کے لوگوں کے تھے۔ وہ ادبی اور فنی کارناموں کو ان اسٹیجوں پر عموماً اس لیے جگہ نہیں دیتے تھے کہ عوامی ذوق تماشا آسودہ نہ ہوگا۔ مالکوں کو نفع نہ ہوگا یا کم ہوگا۔ اس کمی کی وجہ سے ڈرامے کا ذوق لے کر اہل قلم رسائل اور علمی درسگاہوں کے مختصر اسٹیج کا سہارا لینے لگے۔ دونوں مقامات پورے ڈرامہ کے پیش کرنے کے متحمل نہ ہوسکے۔ نتیجہ یہ ہوا یک ایکٹ کے ڈرامے تعداد میں زیادہ آنے لگے۔ تین یا چار ایکٹ کے بڑے اور مکمل ڈرامے بہت کم لکھے جاسکے۔ اس لیے کہ نہ رسائل میں اتنی جگہ ہوتی تھی کہ اتنا بڑا کارنامہ بیک وقت پیش کیا جاسکے نہ علمی ادارے اتنا وقت اتنا بڑا اسٹیج اور اتنے کردار فراہم کرسکتے تھے کہ پورا ڈراما دکھایا جاسکے۔

اس سلسلہ میں ہم ان دو محاذوں پر بھی غور کرلیں جو ڈرامے کی ترقی میں معاون ہوسکتے تھے تو برا نہ ہوگا۔ فلم اور ریڈیو ڈرامے کے لیے مفید ہوسکتے تھے مگر چند نقائص کی وجہ سے زیادہ کارآمد نہ ہوئے۔ فلم کے لیے کہانی اور ڈرامہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغیر ان کی امداد کے فلم پردۂ سیمیں پر نہ صرف مجروح بلکہ بیکار نظر آئے گی۔ اس لیے فلم نے ڈرامے کو اپنانے کی کوشش کی مگر خود ڈرامہ اس سے پوری طرح فیضیاب نہ ہوسکا کیونکہ ڈرامے کے وجود و اختتام کی منزلیں آتے آتے سینما کے لحاظ سے اس میں اتنی تبدیلیاں آجاتی ہیں کہ ڈرامے کا وحدت تاثر باقی نہیں رہتا بلکہ اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ کاش ڈرامہ سینما کے لیے نہ ترتیب دیا گیا ہوتا۔ اس لیے کہ تاریخی یا روایتی واقعات کو اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے کہ نہ صرف واقعات و عام تصورات کچھ کے کچھ ہوجاتے ہیں بلکہ اس ڈرامائی پیشکش میں وہ اثر و بلندی مفقود ہوجاتی ہے جو ڈرامہ نگار پیش کرنا چاہتا تھا۔

ریڈیو کا میدان ڈرامے کے لیے اتنا تنگ اور مختصر ہے کہ یہاں مجموعی حیثیت سے صنف ڈرامہ کا پنپنا مشکل کیا قریب قریب محال ہے۔ اس کا اسٹیج اصل معنی میں وہ اسٹیج نہیں جو ڈرامے کے لیے ہونا چاہیے۔ پھر یہاں نہ تو مختلف و متعدد کردار سامنے آتے ہیں نہ ان کے ساز و سامان، حرکات و سکنات کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ کرداروں کو جو پس پردہ پر ہوتے ہیں صرف اپنی آواز کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جسمانی گردش سے جو تماشائی پر اثر پڑ سکتا ہے وہ غائب ہوتا ہے۔ سننے والوں کو صرف کان سے لطف اندوز ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے وہ اثر جو ڈرامے کا بیک وقت بصارت و سماعت سے پہنچ سکتا ہے تماشائی اس سے محروم ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ڈرامے کا پورا اثر سننے والوں پر نہیں ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں یہ سمجھیے کہ عمل سے زیادہ "گفتار" کا پہلو ڈرامے پر غالب رہتا ہے۔ تماشا دیکھنے والوں کا اشتیاق دید آسودہ ہونے کے بجائے زیادہ تشنہ ہوجاتا ہے۔ وہ ڈرامہ دیکھتے وقت اپنے پورے ذوق تماشہ کو آسودہ کرنا چاہتا ہے۔

یہاں تک جس کمی کا ذکر کیا گیا صرف وہی اردو کی ڈراما نگاری کو بلندی تک پہونچانے میں سدِ راہ نہیں ہیں بلکہ ایک خاص وجہ ڈرامہ نگاروں کا فن سے پوری طرح واقف نہ ہونا، زندگی کے اعلا مقاصد کو مدنظر رکھنا بھی — اس صنف کے بلند معیار تک نہ پہنچنے کی ہے۔ دراصل فن اور ڈرامہ اور تماشائیوں کی نفسیات سے ناواقف ہونا، ڈرامہ نگار کو کامیابی کی منزل تک پہنچنے میں خاص رکاوٹ ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو یہ معلوم ہوجائے گا کہ ڈرامے کی کامیابی کا راز کوئی ایک سبب نہیں کبھی مقصد کی بلندی کبھی صرف پلاٹ کی وجہ سے ڈرامہ تماشائیوں کو گرویدہ کرلیتا ہے کبھی مکالمے کی دلآویزی سے سامعین کو متوجہ کرتا ہے، کبھی دو مختلف خیالات کے تصادم سے اپنے کو پُر اثر بنالیتا ہے اور کبھی ان کے علاوہ منظر کی دلکشی، موسیقی کی سحر انگیزی اور کبھی اداکار کی شخصیت کی جاذبیت پورے ڈرامے کو کامیاب بنا دیتی ہے مگر بہترین ڈرامہ وہی سمجھا جاتا ہے جس میں فن اور ساز و سامان کے ساتھ ساتھ اور سب باتیں بھی کامیابی کے ساتھ پیش ہوئی ہوں کیونکہ تماشہ دیکھنے والوں میں مختلف مذاق و معیار کے لوگ ہوتے ہیں کسی کو موسیقی و رقص سے زیادہ رغبت ہوتی ہے کوئی اداکاری سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے بعض افراد

منظر کی دلکشی میں اپنے ذوق کی آسودگی تلاش کرتے ہیں کچھ لوگ ہدایت کار کی ہدایت پر نظر رکھ کر اپنی دلچسپی حاصل کرتے ہیں۔ اگر یہ سب باتیں مجموعی تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو ڈرامہ بھی کامیاب سمجھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اردو میں گنتی کے چند ڈرامے نظر آتے ہیں ورنہ عام طور پر یہ کمی نقاد کو ہمیشہ کھٹکتی رہتی ہے۔

باوجود ان دقتوں کے ڈرامائی ذوق بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی نمائش کے لیے متعدد کلب اور انجمنیں قائم ہو گئیں۔ پڑھے لکھے لوگ اس میں اپنے طور پر حصہ لیتے رہے مگر قریب قریب ہر جگہ ایکانکی ڈرامے دکھائے جاتے جو کسی کتاب یا رسالے سے لیے جاتے اور اپنی ضرورت کے لحاظ سے ترمیم کرکے اسٹیج پر پیش کیے جاتے۔ یہ طریق کار ذوق تماشہ اور ڈرامے کی ترقی کے لیے مفید ہو سکتے ہیں مگر خود لکھنے والوں کا شعور ترقی نہیں پاتا۔ اس لیے کہ ان کو یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ اسٹیج پر ان کا لکھا ہوا ڈرامہ کتنا پسند کیا گیا کتنا ناپسند۔ اگر اس کی کوئی صورت ہو جاتی تو ممکن ہے وہ اپنی اصلاح کرتے اور فن ڈرامہ کو ترقی ہوتی۔ ڈرامے کی بڑھتی ہوئی طاقت سے متاثر ہو کر حکومت نے بھی اس کی سرپرستی کے لیے ہاتھ بڑھایا اور سال میں ایک بار مختلف یونیورسٹی کے طلبا ایک جگہ اس لیے جمع کیے جانے لگے کہ ان کے فن و ڈرامہ کا مقابلہ ہو جایا کرے مگر یہ سرپرستی بھی برائے نام ہے اور اتنی محدود ہے کہ صنف ڈرامہ کو کوئی قابل ذکر فائدہ نہیں پہنچا۔ نہ یہ ہوا کہ خاص خاص شہروں میں اچھے اسٹیج بنوا دیئے جائیں تاکہ ڈرامہ سے دلچسپی لینے والے اس کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکیں۔

ادبی دنیا میں جو اس صنف سے دلچسپی لی جا رہی ہے وہ بھی اس کا ثبوت ہے کہ یہ صنف مقبولیت کے مدارج برابر طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ متعدد مضامین، کتابیں ڈرامے اردو ادب میں اس ذوق کی ہر دل عزیزی کا بین ثبوت ہیں۔ یہ فضا ہر لحاظ سے امید افزا ہے۔ ڈرامہ نگاری کی خصوصیات کے لحاظ سے آج کے ڈراموں میں زیادہ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ڈرامہ نگاروں کا کارواں فن کے زینے پر تنقیدی سہارا لے کر آگے بڑھ رہا ہے۔ اگر یہ دلچسپی اور بڑھی اور اہل قلم کے شعور میں اور بلندی آئی تو عجب کیا ہے کہ عنقریب کوئی کارنامہ ایسا بھی سامنے آجائے جو فکر و فن کے بلند ترین مقام کے نزدیک پہنچ جائے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا میں سے کچھ ہونہار اور مستقبل کے ادیب بھی پیدا ہو جائیں جو اپنے شعور و ذوق کے امتزاج سے ایسے ڈرامے لکھیں جو مواد و فن کے لحاظ سے اس صنف کو بھی اس درجہ پر پہنچا دیں جس کی عرصہ سے اردو ادب کو تمنا ہے۔

ادبی ڈرامے ۔ کاروان پبلشرز الٰہ آباد ۔ ۱۹۶۵ء

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی



اردو کے نصابی مسائل

میں اس خطبے کے ذریعے آپ کی خدمت میں کوئی (PACKAGE PLAN) —— یا کوئی جامع یا مانع نصاب پیش کرنا نہیں چاہتا صرف چند اشارے کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے سامنے چند اشارے ہی کافی ہیں۔ اس میں تاریخی تمہید کے بعد اس کی کوشش کی گئی ہے کہ آپ کی توجہ بعض بنیادی امور کی طرف مبذول کرائی جائے جو یونیورسٹی کی سطح پر اردو کے نصاب کی ضرورتوں اور اصلاحوں پر غور کرنے اور تعلیمی معیاروں کو بلند کرنے میں مددگار ہو سکیں۔

سب سے پہلے ان تاریخی حالات کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے جن میں اردو کے استادوں نے پیروں کے ذریعے نہیں بلکہ سینے کے بل چل کر یہ بائیس برس طے کیے ہیں اور کسی نہ کسی طرح جسم و جان کے رشتے کو باقی رکھا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہندستان کو آزادی تو مل گئی جو اس کی تاریخ کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے، لیکن ساقی نے اس جام میں زہر کی ایک بوند بھی ملا دی اور سامراجی مصلحتوں نے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ گوشت کا ناخن سے جدا ہونا تھا۔ موجِ خوں سر سے گذر گئی اور تبادلۂ آبادی کی وجہ سے لاکھوں کروڑوں آدمی گھر سے بے گھر ہو گئے۔ دست و بازو کو نظر نہ لگے لیکن تقسیم کی یہ لکیر اس خوبی سے کھینچی گئی ہے کہ اردو کا سارا علاقہ، اس کا مولد و مصدر، دنیا میں اس کے بولنے والوں کی سب سے بڑی تعداد ہمارے پاس ہے، لیکن سرکاری طور پر وہ دو گز زمین بھی نہیں جس کی بہادر شاہ ظفر نے آرزو کی تھی۔ غالب کو "ہونے نے" ڈبویا تھا اور اردو کو تقسیم نے۔

ہندستان کی تقسیم دراصل ہر لسانی واحدہ کے لیے علاحدگی پسندی کی ایک دعوت تھی کہ وہ اپنی خودی کو پہچانے اور ذیلی گروہ بندیوں کو مقامی عصبیت کے ذریعے مضبوط کرے۔ اس لیے یہ لسانی واحدے آگے چل کر طبقاتی واحدے بن گئے جو آج زیادہ سے زیادہ سیاسی اور سماجی حقوق کے لیے کوشاں ہیں۔

ہماری دستور ساز اسمبلی کو ان علاحدگی پسند رجحانات کا ڈر لگا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے بڑی بحث و تمحیص کے بعد ہندستان کی یک جہتی کی خاطر ہندی کو ایک ووٹ کی اکثریت سے سرکاری زبان قرار دیا جس کے بولنے والوں کی تعداد اگرچہ صرف ۲۸ فیصد تھی لیکن جس کا آسان روپ پورے ملک میں پھیل سکتا تھا۔ اس کے ساتھ مجلس آئین ساز نے ایک چھوڑ کئی دفعات میں ہندستان کی دوسری زبانوں کی ترقی اور ان کے رسوم خط کی پوری پوری ضمانت کی۔ آئین نے ایسی ہندی پر زور دیا تھا جس میں سبھی زبانوں کا حسن اور توانائی شامل ہو۔ لیکن عملاً وہ سنسکرت آمیز ہندی پھیلائی گئی جو پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں اور ہندستان کے دیہی عوام دونوں کے لیے اجنبی تھی اور جو مقبول و مشہور مورخ آرنلڈ ٹوئن بی انیسویں صدی میں برطانوی پروٹسٹنٹ مشنریوں نے اس لیے گھڑی تھی کہ وہ عوام کو مغلوں سے منحرف کر کے اور ان کے جذبات سے کھیل کر ان کو عیسائیت کی طرف راغب کر سکیں۔

زبان کے مورخین جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں سب سے اہم وہ لسانی میدان رہا ہے جو برج بھاشا، کھڑی، اودھی، میتھلی سب کو ساتھ لے کر اور ان کی خودمختاری کو تسلیم کر کے آگے بڑھتا ہے۔ گاندھی جی اس کے حامی تھے۔ لیکن قومی امتیاز اور تہذیبی کفالت کے جذبے نے نہ صرف زبان کی پرکار کو پیچھے کی طرف لوٹا دیا بلکہ ملک کی سالمیت کو بھی خطرے میں ڈال دیا۔

اردو وجود در اصل ایک لسانی آمیزہ اور ملک کے سیکولر کردار کی زندہ علامت ہے، چکّی کے ان دو پاٹوں میں دب گئی اور اس کو دہلی، یوپی، بہار، پنجاب، راجستھان اور آندھرا ہر ہر جگہ سے دیس نکالا گیا۔ وہ اجنبی سمجھی جانے لگی اور اس کا کوئی علاقہ باقی نہیں رہا۔ معاشی بدحالی نے اردو داں طبقے کی بالکل ہی کمر توڑ دی اور قومی معیشت میں اردو پڑھنے والوں کو ایک مذموم اندیشہ سمجھا جانے لگا۔ ٹھیک اس وقت جبکہ لسانی تہذیبی حلقوں میں ترقی کے نئے نئے آثار پیدا ہو رہے تھے، اردو کے بولنے والے اس کے استاد اور ادیب، پریشان حال اور دل گرفتہ تھے۔ وہ اس تہذیبی ترقی کے کارواں میں شریک نہیں تھے۔ اردو والوں کو جو دولت ارثاً ملی تھی وہ مشترکہ تہذیب کی دولت تھی۔ اب وجدانی تہذیب کا چلتا ہو رہا تھا اور اس میں وہ نقش و نگار جن کو ہندستانی، ایرانی اختلاط اور اتحاد پسندی کے رجحان نے پروان چڑھایا تھا ماند پڑتے جا رہے تھے۔ ہمارے طالب علم حزن و یاس کے مارے ہوئے، استادِ حق بخشوائے ہوئے کتابیں ذوق کے بجائے قینچی اور لئی کی مدد سے تیار کی ہوئی — نتیجہ یہ کہ ۱۹۴۷ کے فوراً بعد زبان و ادب کی تعلیم زندہ روایت اور تہذیبی قدر کے طور پر نہیں بلکہ ایک مردہ و بے جان رسم کے طور پر ہونے لگی۔

اس صورتِ حال کا سب سے بڑا اثر لڑکوں کی تعداد پر ہوا، وہ روز بروز گرنے لگی۔ ۴۸ء میں دہلی یونیورسٹی میں اردو کا صرف ایک لڑکا تھا۔ وہ بھی فاتر العقل۔ یہی شوریدگی اسے اردو کی جماعت میں کھینچ لائی تھی۔ ورنہ عقلمندوں کے نزدیک اردو پڑھنا دیوانگی سے کم نہیں تھا۔ زیادہ تر طالبِ علم ایسے علاقوں سے آئے تھے جہاں اردو کے اثرات کم ہو رہے تھے۔ خود ان کے ذہن میں بھی ایک کشمکش تھی۔ گھر کی زبان اردو اور باہر کی سنسکرت آمیز ہندی۔ جس طرح پودے کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے اور وہ مرجھانے لگے، یہی حال ان طالب علموں کا تھا۔ نہ ان کا شین قاف درست تھا۔ نہ انشا، نہ املا۔ نہ ان کو اردو آتی تھی۔ نہ ہندی، نہ انگریزی، رجعت پسند طاقتوں نے سب سے پہلا وار ابتدائی اور ثانوی تعلیم پر کیا تھا۔ یہ اسکول یونیورسٹی کو غذا بہم پہنچاتے تھے۔ ان کے غیر متحرک اور مردہ ہو جانے سے یونیورسٹی کے شعبوں کو ناقابلِ بیان دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ آج بھی اگر ہمیں اپنے نصاب کو درست کرنا ہے تو سب سے پہلے اسکول کے نصاب کو درست کرنا چاہیے۔ لارڈ رابنس نے آکسفورڈ یونیورسٹی رپورٹ میں اس بات پر زور دیا ہے۔ کیمبرج میں بھی ۱۹ویں صدی تک صرف ایٹن (ETON) سے طلبا آتے تھے جن کی تعلیم و تربیت پر غیر معمولی محنت کی جاتی تھی۔ جاپان کی ایک پرانی مثل ہے! "اگر قوم پیدا کرنا ہے تو ہمیں بچے بونا چاہئیں"۔ اس کی صداقت میں آج بھی شبہ نہیں۔ شاید سرسید اور ان کے رفیقوں نے بھی اس کے پیشِ نظر یونیورسٹی اسکول کو خاص اہمیت دی تھی۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آزادی کے بعد اردو کی جو ترقی ہوئی ہے وہ پرائمری اسکول کی سطح پر نہیں ہوئی، یونیورسٹی کی سطح پر ہوئی ہے۔ اس کی مثال اس مثلث کی سی ہے جس کو الٹا کر دیا جائے یا بانس کے اس پیڑ کی سی ہے جس کے تنے پر گانٹھیں ہی گانٹھیں ہوں اور اوپر جا کر کہیں چند پتے نظر آجائیں۔

تعلیم کا تعلق اقدار سے ہے اور وہ نصاب بیکار نہیں ہے جس میں ان اقدار کی جھلک نہ ہو۔ یونیورسٹی کا مقصد تلاشِ حق ہے لیکن وہ "انا الحق" نہیں کہتی بلکہ بحث کے ذریعے تخلیقی فکر کے لیے راہیں کھولتی ہے اور سماج کو بہتر بنیادوں پر استوار کرتی ہے۔ گوئٹے نے مرتے وقت کہا تھا "روشنی مزید روشنی" — چاہے اس میں میری موت ہی کیوں نہ واقع ہو۔ یہی "روشنی مزید روشنی" یونیورسٹی کا فریضۂ زندگی ہونا چاہیے۔ گلیلیو کی دریافت پر بڑی گرفت ہوئی اور مذہبی مخالفت نے اس کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے خیالات کی ترویج سے باز آجائے۔ لیکن اس محضر پر دستخط کرتے وقت بھی اس نے یہی کہا "یہ زمین تو گھوم رہی ہے"۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ اردو کے استادِ ناسازگار حالات میں بھی اقدار کی تخلیق اور اشاعت سے کبھی دست بردار نہیں ہوئے۔

تقسیم کے بعد جو سیلاب بلا آیا اس میں تہذیبی قدریں خس و خاشاک کی طرح بہہ رہی تھیں اور اچھے اچھوں کے قدم

ڈگمگائے تھے۔ لیکن اردو کے استادوں کی شفاعت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اردو کا حق نمک ادا کر دیا۔ انھوں نے اردو کے نامذہبی کردار پر آنچ نہیں آنے دی۔ تیز و تند ہواؤں میں چراغ روشن کیے ذہن میں ٹھنڈک اور نظر میں وسعت پیدا کی اور ایک دور سے نظر آنے والی روشنی کی طرف قدم بڑھایا۔ جس وقت انسانی اقدار جل رہی تھیں، انھوں نے تہذیب کی قدروں کی پرورش کی جس وقت چھوٹی وفاداریوں کے آگے بڑی وفاداریاں بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں، انھوں نے اپنے ملک کو ایک کل کی حیثیت سے دیکھا اور اس کی سالمیت کو کلیجے سے لگائے رکھا۔ ہندستان کی کسی زبان میں تہذیبی یک جہتی اور ملکی سالمیت پر اتنا زور نہیں ہے جتنا اردو میں۔ یہاں ملتیں اہم نہیں، ان کے ملنے سے جو ایمان بنتا ہے وہ اہم ہے۔ اسی لیے اردو اتحاد اور شیرازہ بندی کی زندہ علامت ہے اور اس کے نقصان میں دراصل پورے ملک کا نقصان پوشیدہ ہے ع:

گلستاں می رود اگر مریم ما

اردو کے استادوں کا ان اقدارِ عالیہ پر اتنا گہرا یقین تھا کہ اس کا اثر اس کے مخالفوں پر بھی ہوا۔ اور وہ ہزار خرابی سے سہی لیکن اردو کی تہذیبی اور ادبی اہمیت کو پہچاننے لگے۔ ۱۹۵۹ء میں ایک بڑے ذمہ دار شخص مجھ سے کہنے لگے۔:

"Farooqui Sahib! Now I feel Urdu should not be allowed to die."

اس کے پیچھے کتنا غرور تھا، عرض نہیں کر سکتا۔ آج تک وہ چینِ قبا اور طرفِ کلاہ یاد ہے لیکن اس میں مجرم ضمیر کی آواز بھی پوشیدہ تھی۔

جم گیا خوں کفِ قاتل پہ ترا میر زبس
اُن نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

مشکلات ذوق فزا بھی ہوتی ہیں اور عزم اور حوصلے کی زادِ راہ بھی۔ آج اردو کے اخبارات، اردو کے اسکولوں اور اداروں کی تعداد اتنی ہے جو اس کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ آزادی نے ہمارے سامنے اتنے وسیع اور مثبت امکانات پیدا کر دیے ہیں کہ ان کی سرحدیں ابھی متعین نہیں ہو سکیں۔ آج اردو کی تعلیم اٹھارہ یونیورسٹیوں میں، سری نگر سے ونکٹیشور تک اور کلکتے سے احمد آباد تک ہو رہی ہے اور اسی لیے آج اس کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اپنے نصابی رجحانات کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ ہمارا نصاب تعلیمی اقدار کا محرم ہے یا نہیں۔ ہر کام اتنا بڑا اور اہم ہے کہ بغیر ایک نصابی ریسرچ سینٹر کے جیسا کہ امریکہ میں ہے، دشوار ہوگا۔

کوئی تعلیم ہنگامی مصلحتوں کی دراندازی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ یہی حال نصاب کا ہے۔ اس میں گھٹیا قسم کے فائدوں کے لیے جگہ نہیں ہے۔ آج اردو کے سلسلے میں ہر بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ اس کے پڑھنے سے بے روزگاری کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بڑی دردناک بات ہے کہ ہم ہر چیز کو بنیے کی ترازو میں تولنے لگتے ہیں اور جدھر پلہ جھکتا ہے خود بھی ادھر جھک جاتے ہیں۔ یہ نقد سودے کا اصول اگر زندگی پر حاوی ہو گیا تو ہم سارے تہذیبی کام بند کر دیں گے، اور خود فریبی کے نئے نئے ڈھنگ نکالیں گے۔ یہ رونا اردو ہی کا نہیں بلکہ قومی زندگی کا رونا ہے۔ اس کے پیچھے جو ذہنیت کار فرما ہے وہ حد درجہ پست، انتشار انگیز اور نقصان دہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے زندگی کے وہ اعلا مقاصد نہیں ہیں جو اسے بامعنی اور بامقصد بنا دیتے ہیں۔ ہم زبان و ادب کی تنویری قوت سے بے خبر ہیں اور کل زندگی میں اس کا جو مقام ہے اس کے شناسا نہیں ہیں۔ میں بڑے ادب سے پوچھتا ہوں کہ ایک انجنیئری کے پڑھنے سے بے روزگاری کا مسئلہ طے ہو جاتا ہے؟ کیا نارے کر اور کھورانا کے سامنے یہ دقتیں نہیں تھیں؟ بے روزگاری کا مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا ہم نے سمجھ لیا ہے۔ یہ کسی مضمون پڑھنے یا نہ پڑھنے سے طے نہیں ہو سکتا۔ یہ اس سے کہیں زیادہ بڑا معاملہ ہے۔ یہ سارے ملک کی معاشی تنظیم کا مسئلہ ہے، پیداوار اور دولت کی مناسب تنظیم اور تقسیم کا مسئلہ ہے۔

اس وقت انسانی علوم اور ادبیات کے استادوں کے سامنے جو دشواریاں ہیں وہ اردو ہی تک محدود نہیں۔

تمام عالم میں یہی صورت ہے کہ سائنس میں بہترین طلبا داخلہ لیتے ہیں۔ اس کے بعد سماجی علوم میں، پھر ادب میں پہنچتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس کا بھی عرفان بڑھتا جا رہا ہے کہ اس برق و بخارات کی دنیا کے مرحلے بغیر ادب شناسی کے طے نہیں ہو سکتے سائنس میں ہزار خوبیاں سہی لیکن وہ اقدار کی محرم نہیں ہے اگر ہمیں اچھا آدمی بننا ہے، زندگی کا گہرا عرفان اور اس کے پیچ وخم کی بصیرت حاصل کرنا ہے تو ادب کی مدد لینا ہوگی۔ شیکسپیر نے کنگ لیئر میں لکھا ہے کہ "جو محسوس نہیں کر سکتا وہ دیکھ بھی نہیں سکتا"۔ ادب ہمارے جذبات کی تہذیب کرتا اور تخلیقی فکر کو ابھارتا ہے۔ اس لیے نصاب تیار کرتے وقت یہ ضرور غور کرنا چاہیے کہ وہ اس معیار و میزان پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔

اردو میں چند مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر نصاب سازی کی طرف بالکل توجہ نہیں کی گئی۔ نصاب کی ریسرچ سے قطع نظر، یہ بھی نہیں سوچا گیا کہ کون سے اسباق کس عمر کے طالب علموں کے لیے مناسب ہوں گے۔ میں نے سودا کا قصیدہ "اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستان سے عمل" ہائی اسکول میں پڑھا ہے۔ پھر اسے بی۔ اے میں پڑھایا ہے۔ اب وہ ترقی کر کے ایم۔ اے میں داخلِ نصاب ہے۔ یہ لطیفہ نہ صرف ہمارے علمی معیار کے زوال کا اشاریہ ہے بلکہ اس سے وہ بے رحمانہ بے توجہی بھی ظاہر ہوتی ہے جو ہم نصاب کے ساتھ اکثر برتتے ہیں۔ میں نے الٰہ آباد کے ایک پروفیسر کے یہاں یہ کارخانہ دیکھا ہے۔ آٹھ دس طالب علم پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ہر ایک کے سامنے قینچی اور لئی رکھی تھی۔ وہ تاریخ سے متعلق اجمیر بورڈ کا سٹ تیار کر رہے تھے۔ پھر ذرا سی الٹ پھیر سے یو پی کا سٹ تیار ہو گیا۔ اگر ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ بی۔ اے کی سطح پر طالب علم زبان و بیان میں مہارت حاصل کریں اور ان کو ادب کی زندہ روایات سے سچ مچ دلچسپی پیدا ہو جائے تو ہمیں خشک اور بے روح نصاب کے بجائے ایسا نصاب تیار کرنا ہوگا جو فکر انگیز اور روح افزا ہو اور طالب علموں میں دید و دریافت اور ذوق و جستجو پیدا کر دے۔ جو نصاب طالب علموں کی تخلیقی اور جمالیاتی آسودگی کا سامان بہم نہیں پہنچاتا یا جو طالب علموں میں نئے جہانِ معنی تلاش کرنے کی تشویق اور تحریص نہیں پیدا کرتا یا ان کو ایک میکانیکی عمل کا حصہ بنا دیتا ہے یا جو خود ان کو اس تلاش کے عمل کا شریکِ غالب نہیں بناتا، وہ ناقص ہے اور اس سے اردو کے رہے سہے معیار بھی فنا ہو جائیں گے۔

ہندستان قدیم روایات کا ملک ہے۔ یہاں تبدیلیاں کم آتی ہیں اور جو کبھی کبھار آتی ہیں وہ دبے پاؤں۔ اورنگ زیب (متوفی ۱۷۰۷ء) کے زمانے میں مدرسہ فرنگی محل کے ایک عالم ملا نظام ... (متوفی ۱۷۴۸ء) نے اسلامی مدارس کا ایک نصاب مرتب کیا تھا۔ وہ درس نظامیہ کے نام سے مشہور ہے۔ وہ آج تک اسی طرح رائج ہے۔ اردو کے نصاب کی بھی کم و بیش یہی صورت ہے کہ جو حد بندیاں ایک دفعہ قائم ہو گئی تھیں ان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ حالانکہ زمین اور آسمان سب ہی بدل چکے ہیں۔ ہمارا حال الف لیلہ کے اس قصے کا سا ہے جو ایک لکیر پر چل رہے ہیں اور یہ ڈر ہے کہ اگر ادھر ادھر دیکھا تو پتھر کے ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر اظہر علی مرحوم ہمارے شعبۂ اردو، فارسی و عربی کے صدر تھے۔ ان کو مولانا امام بخش صہبائی کی کتاب بلاغت بہت پسند تھی۔ وہ درس میں شامل تھی۔ میں نے بارہا عرض کیا کہ یہ کتاب لڑکوں کی سمجھ میں نہیں آتی بڑی گنجلک عبارت ہے، دوسرے اب جنس نایاب ہے، کہیں ملتی نہیں۔ بدل دیجیے۔ وہ کسی طرح اسے نکالنے یا بدلنے پر راضی نہیں ہوئے۔ حد یہ ہے کہ پاکستان سے مجھے لکھ لکھ کر بھیجتے رہے کہ اس کے نسخے لائبریری میں ہیں، لڑکے کتب خانے سے استفادہ کر لیں گے لیکن اس کتاب کو نکالنا نہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو کی درسی کتابیں نایاب تھیں ہمارے ایک بزرگ نے یہ مشورہ دیا کہ ایک نصاب کسی طرح مرتب کر لو اور اسے تمام یونیورسٹیوں میں جہاں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے رائج کر دو۔ میں نے بہت ہائے دہائی مچائی۔ لیکن ایک پیش نہ گئی۔ انھوں نے اونچی سطح پر کوشش بھی کر لی تھی۔ لیکن خدا بھلا کرے کہ یو۔ جی۔ سی کا کہ اس بے رحم یکسانیت سے نجات دلائی۔

یہی حال نئے تجربات کا ہے۔ جب دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے آنرز میں ایک

قائم کی، اور رپورتاژ، ریڈیو فیچر اور عملی تنقید کو ایک پرچے میں مناسب جگہ دی، یا ایم اے میں سماجی اور تہذیبی پس منظر (SOCIAL & CULTURAL BACKGROUND) کا پرچہ شروع کیا یا مخطوطات شناسی یا ایم لٹ کی ابتدا کی یا ایک ایسے کورس کا آغاز کیا جو عہد حاضر کے ادب سے قدیم ادب کی طرف لے جاتا تھا یا ایم اے اردو کی اختیاری زبانوں میں فرنچ اور بنگالی کو شامل کیا اور اس طریقے سے تقابلی مطالعے کی طرح ڈالی تو بڑی مخالفتیں ہوئیں۔ لیکن میرا منہ نہیں کہ خدا کی ان نعمتوں کا پوری طرح شکرادا کر سکوں کہ اب یہ نئے رجحانات جڑ پکڑ چکے ہیں اور ان سے ہمیں اور طالب علموں کو فائدہ پہنچا ہے۔

اردو کے استادوں سے زیادہ اس حقیقت کا شناسا اور کون ہوگا کہ نصاب ایک قفس نہیں ہے جس میں استاد اور شاگرد دونوں کو اسیر کر دیا گیا ہے اور نہ اس کی حیثیت مولانا روم کی اس بکری کی سی ہے جو رسی کے حدود سے باہر نہیں جا سکتی۔ ہر نصاب کو فلسفہ کی اصطلاح میں ماورائی ہونا چاہیے اور اچھا استاد وہی ہے جو ان پابندیوں میں سے گذر کر آزادی حاصل کرے اور اپنے طالب علموں کے ذہن کے دریچوں کو اس طرح کھول دے کہ تازہ ہوا کے جھونکے اندر آ سکیں۔

ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارا نصاب دنیا جہان سے الگ تھلگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد نہ معلوم ہو اور نہ ہماری ادبی تاریخ مردہ مصنفوں کی داستان بن کر رہ جائے کہ اس پر مصر کے ممی خانے کا شبہہ ہونے لگے۔ اس کا رشتہ زندہ تہذیب سے، زندہ روایتوں سے اور روزمرہ کی زبان سے کیا ہے اور کس طرح اس کی صحت مند اقدار تنقید اور تجزیہ کے ذریعے ہماری رگ و پے کا حصہ بن سکتی ہیں، ہمیں ان تمام امور کو سامنے رکھنا ہوگا اس لیے کہ ہندوستان ایک بڑے تہذیبی دھارے کا حصہ ہے۔ اس کا حال امریکہ کا سا نہیں ہے جو دنیا میں حال اور مستقبل کے زاویۂ قائمہ سے پہچانا جاتا ہے۔ ہندوستان کی پیچیدہ انفرادیت ہے جو ہزاروں سال میں جا کر بنی ہے۔ یہاں بہت سی سلطنتیں بنیں اور بگڑیں۔ بہت سے سیاسی انقلاب رونما ہوئے۔ لیکن ان دونوں نے تہذیب و تمدن کی مٹی کو اور زیادہ زرخیز بنا دیا اور اس ملک کے دامن کو گلہائے رنگا رنگ سے معمور کر دیا۔ اتحاد و امتزاج کا یہ سرچشمہ جو موہنجوداڑو سے بھی پہلے پھوٹا تھا، عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کے میدانوں سے گزرتا ہوا برابر رواں دواں ہے۔ اس تہذیبی دھارے میں اردو زبان کی اتحاد پسندی، سادگی اور شیرینی اور اردو کے ادیبوں کے امتیازی اور تخلیقی کارنامے بھی شامل ہیں۔

ہمیں اپنے ملک کے تہذیبی مزاج کو سمجھنا اور اسے دوسروں کو سمجھانا ہے۔ مانا کہ سب انسان اولاد آدم اور اعضائے یک دگر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بقول جارج آرول افراد اقوام کے، ذہنی طریق فکر اور انداز اسلوب مختلف ہیں۔ بالکل یہی حال زبان و ادب کا بھی ہے۔ ایک یورپین پروفیسر مجھ سے کہنے لگے کہ آپ کے یہاں THANKS کے لیے بھی کوئی لفظ ہے، نیپالی زبان میں تو یقیناً نہیں۔ میں نے کہا اردو میں شکریہ کا لفظ رائج ہے۔ کہنے لگے اتنی میں عربی جانتا ہوں۔ آپ نے عربی کے لفظ کو بگاڑا ہے۔ میں نے عرض کیا آپ کی بیٹی مارگریٹ اگر ٹھنڈا پانی پلاتی ہے تو آپ THANKS کہیں گے میں کہوں گا جیتی رہو بیٹی۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔ اللہ تمہارے کلیجے کو ٹھنڈا رکھے۔ یا مارگریٹ اس الماری میں سے وہ بڑی کتاب نکال دے تو آپ لے دے کے وہی THANKS کہیں گے میں کہوں گا شاباش، کیسی سمجھدار اور پیاری بچی ہے۔ ہم مخاطب کی عمر اور اس کے مرتبے کو دیکھ کر خوشنودی یا تشکر کا اظہار کرتے ہیں اور کبھی تو شکریہ کا لفظ مطلق درمیان میں نہیں لاتے کیونکہ یہ رسمی لفظ ہے لیکن دوسرے فقروں سے اس بات کو ادا کر دیتے ہیں۔ میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا تھا۔ چھٹیوں میں مکان آیا۔ وہاں پیر میں ایک پھوڑا نکل آیا۔ بڑی سخت تکلیف تھی۔ پھوپھا صاحب کو اطلاع ہوئی۔ ان کی ۸۰ برس کی عمر گھٹنے پکڑ پکڑ کر مکان کے بالائی حصے پر پہنچے۔ میرے زخم کو دھویا اور مرہم لگا کر پٹی باندھ دی۔ میں نے عرض کیا، بڑی زحمت فرمائی آپ نے۔ شکریہ، یہ کہنا تھا کہ وہ برہم ہو گئے۔ کہنے لگے "میں دیکھتا ہوں کہ تم کالج میں جا کر بالکل بگڑ گئے۔ یہ شکریہ وکریہ کیا چیز ہوتی ہے۔ میاں، تم حسن کی اولاد ہو۔ میرے جی جگر ہو۔

کیا اب ہم اس لائق بھی نہیں رہے ؟"

یہی حال ادبی تاریخ کا ہے - ایک زمانے میں ہمارے نقادوں کو یہ بڑی بے کلی رہی کہ ہمارے یہاں ورڈزورتھ کیوں نہیں پیدا ہوا : اس کا جواب بجز اس کے اور کیا دوں کہ انگلستان میں غالب کیوں نہیں پیدا ہوا' دونوں ہم عصر ہیں لیکن دونوں کے تہذیبی عوامل مختلف ہیں۔ اس لیے ان کے تخلیقی کمالات بھی منفرد ہیں' امیر خسرو کا ایک مصرع ہے

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف

اقبال کا مصرع ہے:

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام

کیا کسی NORDIC شاعر کے یہاں یہ نقش و نگار مل سکتے ہیں ؟ ان کی شاعری کا حسن الگ ہے اور اس کو الگ ہونا بھی چاہیے۔ اسی طرح میر کا شعر ہے:

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یاں کبھی سرو و گل کے سایے تھے

یہ شعر صرف ہندستان کا شاعر کہہ سکتا ہے جس نے نادر شاہ اور ابدالی کی تباہ کاریوں کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہو۔ اسی طرح ہر قوم کا ذہن بھی الگ ہوتا ہے۔ ہمارا ذہن ریزہ کار ہے اور ایسا ہی ذہن' امتزاجی بصیرت کے ساتھ مل کر غزل میں کمالات دکھلا سکتا ہے۔

اس نصاب کے سلسلے میں ایک گزارش اور ہے۔ ہمارے اردو کے شعبے اردو ادب کے شعبے ہیں۔ یہ زبان و ادب کے شعبے نہیں ہیں۔ اس وجہ سے زبان اور اس کے اصولوں سے بڑی بیگانگی برتی جا رہی ہے - اگر ہر یونیورسٹی میں زبان کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہے تو کم سے کم ایک مرکزی ادارہ ایسا ہو جو اردو زبان کے قواعد' املا اس کی DIALECTOLOGY ' اس کے تلفظ' اس کے رسم خط اور اس کی اٹلس وغیرہ کو مرتب کرے' اور ان امور میں پورے ملک کی رہنمائی کرے - آج تک ہم یہ نہیں طے کر سکے کہ دہی اور برف مونث ہیں یا مذکر۔ فرانس کی اکیڈمی نے ۸۰ برس کے بعد یہ فیصلہ دیا ہے کہ آٹوموبیل مذکر ہے۔ لیکن ان کے یہاں کم سے کم اس قسم کا ایک مرکزی اور تحقیقی ادارہ تو ہے جو ان تمام امور کا جائزہ لے سکتا ہے اور جس کی رائے کو وقیع سمجھا جاتا ہے' اردو میں اس ادارے کے نہ ہونے سے جو مزاج کی کیفیت یا بے مایگی کا عالم ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں بالکل گلی ور کے قصے کا سا حال ہے - وہ چلتے چلتے ایک اکیڈمی میں پہنچا جہاں اہل علم الفاظ کے ختم کرنے کے درپے تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ الفاظ تو اشیا' ان کی کیفیت اور عمل کو ظاہر کرتے ہیں - اس لیے کیوں نہ الفاظ کے بجائے ان اشیا ہی کو استعمال کیا جائے۔ اس ادارے کے دو بڑے عالم ان چیزوں کے بوجھ کے نیچے دبے جا رہے تھے اور پسینے میں شرابور تھے۔ انھوں نے اپنے گٹھر زمین پر رکھے تب کہیں جا کر اس نئی زبان میں گفتگو کی۔

ایک امریکی دوست مجھ سے کہتے تھے کہ آپ تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن آپ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایک متوازی اردو پیدا ہو رہی ہے جس میں جملے کے جملے اور فقرے کے فقرے انگریزی کے ہیں - الفاظ کا تو شمار ہی نہیں۔

اردو کے سامنے جو خطرات ہیں وہ اندرونی زیادہ بیرونی کم۔ بے یقینی اور احساس کمتری کے ساتھ ہم زبان اور محاورے سے بھی بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں اور ایسی اردو استعمال کرتے ہیں جو کتابی زیادہ ہے یہی حال فارسی کے درس کا ہے جو آج پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ یہ کلاسیکی زبانیں مردہ نہیں ہیں۔ ہمارا نصاب مردہ ہے - ضرورت ہے کہ اردو کے روزمرہ اور محاورے کو' اس کی زبان و قواعد کو نصاب میں اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ معاشرے کا ورثہ اور فیض جاری معلوم ہو' معاشرے سے الگ کوئی چیز نہ ہو' رابنسن کروسو کے افسانے کی دلکشی اس میں مضمر ہے کہ وہ انسان کو سماج سے الگ کر کے دیکھنے کی ناکام کوشش ہے۔ زبان لفظوں کا ایک متحرک ملبوس ہے - لیکن بولنے والے کی حیثیت اس عقاب کی سی نہیں ہے جس نے انسانوں سے الگ آشیانہ بنا لیا ہو۔ اس بادشاہ کی سی نہیں ہے جو ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر فوج کا سلام لے رہا ہو - بولنے والا خود اس ملبوس کا حصہ ہے اور اس کے ذہن کے سارے نقش و نگار اسی معاشرے نے تعمیر

گئے ہیں۔ اس لیے وہ زبان زندہ رہے گی جس میں ہمارا سماجی ورثہ، نئے الفاظ کا خون اور تازہ خیالات کی توانائی شامل ہوگی۔

یہ سارے کام اردو کے استادوں کو کرنا چاہئیں۔ ان کے ملتوی کرنے یا ماتم کرنے سے وہ حل نہیں ہو جائیں گے۔ ہمیں اپنے پورے نصاب پر درجہ بدرجہ نظرِ ثانی کرنا ہے۔ اسے اعلا تعلیمی مقاصد سے ہم آہنگ بنانا ہے اور اس کے معیاروں کو اونچا کرنا ہے۔ ہمیں شمس الامرا، کبیر ثانی، قدیم دلی کالج، سرسید اور عثمانیہ یونیورسٹی کی صحت مند روایات کو از سرِ نو زندہ کرنا ہے۔ لیکن ان سب کاموں کو اس یقین کے ساتھ شروع کرنا ہے کہ اردو لازوال ہے۔ اس آسمان پر جلی اور سنہرے حروف میں لکھا ہوا ہے کہ اردو صرف ایک یونیورسٹی میں نہیں بلکہ کئی یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم ہوگی۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے رزولیشن جون ۱۹۶۷ء، وزارتِ تعلیم کے بیانات اور کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ سے جو فالِ نیک نکلتی ہے وہ تو یہی ہے۔

ہمیں ابھی سے اردو یونیورسٹی کی تیاری کرنی ہے اور ایک بڑے نقشے کو سامنے رکھ کر اپنے نصاب کی توسیع و اصلاح ان تعلیمی مقاصد کی روشنی میں کرنا ہے جو اس سے پہلے عرض کیے جا چکے ہیں۔ ان مقاصد کے پورا ہونے میں مجھے ذرا بھی شبہہ نہیں، اس لیے کہ اس ملک کی تقدیر، یک جہتی کی روایت اور تعلیم کے سارے اچھے اصول وابستہ ہیں۔

(چراغ رہگذر — مکتبۂ ان پبلشنگ ادبستان دہلی — ۱۹۷۴)

بقیہ اردو رسم خط مدلیہ بھی

پیدا ہوتا ہے۔ ایک زبان کی محبت دوسری زبان کی محبت سے روکتی نہیں۔ اردو کو حق ملے گا تو ہندی کا احترام بڑھے گا۔ سیکولرزم اور مشترک تہذیب کا احترام بڑھے گا۔ اور ہندستانی جمہوریت پر زیادہ سے زیادہ اعتماد بحال ہوگا۔ اردو تو سب کی خدمت کر ہی رہی ہے اور کرتی بھی رہے گی۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم اردو کے خزانوں سے کتنا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور اپنی اس تہذیبی میراث اور لسانی دولت کی قدر کرتے ہیں یا نہیں ✻

(روزنامہ قومی آواز نئی دہلی)

ڈاکٹر محمد حسن

غالب۔ اپنے اشعار کے آئینے میں

غالب کی سیرت اور شخصیت کے بارے میں معلومات کے بہت سے وسیلے ہیں۔ ان کے خطوط، ان کے دیباچے، دستنبو، مگر سب سے زیادہ معتبر اور مستند وسیلہ ان کے اشعار ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ادیب کی سب سے مستند آپ بیتی اس کی تخلیقات ہیں باقی سب وسائل محض حاشیے ہیں۔ فنکار کی سیرت اور شخصیت کے اعلا ترین جوہر اس کے فن میں کھلتے ہیں۔ کوئی فن کار اپنے فن سے بڑا نہیں ہوتا۔ اس کے تخیل کی اعلا ترین سطحیں، خیال کی پرواز کی آخری سرحد، جذبے کی گہرائی اور توانائی کا لطیف ترین اظہار۔ غرض اس کے دلوں کی تپش، شبوں کا گداز سب کچھ نکھر کر فن میں جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

دیوانِ غالب کو سامنے رکھیے اور ان زمزموں پر غور کیجیے جو ان اشعار سے ابھرتے ہیں۔ ان سے کس قسم کی تصویر ابھرتی ہے۔ یہ تصویر کچھ تو اشعار میں موجود ہے کچھ ہمارے آپ کے اندر چھپی ہوئی ہے اور ہماری شخصیتوں کے نہاخانوں سے نکل کر غالب کے شعروں میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ اس لیے غالب نے کہا تھا "شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے" اس طرح غالب کا کلام آئینہ خانہ بھی ہے اور نگار خانہ بھی۔ اس میں غالب کا عکس بھی نظر آتا ہے اور ان اشعار سے لطف لینے والے کا بھی اور ان دونوں سے مل کر وہ تصور ابھرتا ہے جسے غالب کہتے ہیں۔

سب سے پہلی تصویر ایسی کھلی ڈلی شخصیت کی ہے جو ہماری آپ کی دنیا کا باسی ہے۔ نہ پیغمبر نہ فلسفی نہ سیاسی رہنما نہ جوگی سنیاسی۔ نثر میں غالب نے جو دعوے کیے ہوں اردو دیوان میں وہ کبھی کوئی نقلی چہرہ نہیں پہنتا۔ تعلی ہے بھی تو اس قدر جتنی اس خاکدان پر رہنے والوں کی سرشت ہے۔ پڑھنے والوں پر اس تعلی کا بوجھ نہیں پڑتا اور تقدّس نہ درمیان حائل ہوتا ہے۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ غالب کو دنیا بازیچۂ اطفال یا بچوں کا کھیل نظر آئی۔ ایک ترنگ میں دنیا اور دین دونوں کو ساغرِ غفلت کی تلچھٹ کہہ ڈالا ہے۔ مگر ہم میں سے کس بے مایہ سے بے مایہ شخص پر ایسے لمحے نہیں گذرے جب وجود ہستی اور دنیا محض ایک تماشا نظر نہ آئے۔ پھر جو بات غالب کو عزیز بلکہ ہمارا "ہم مشرب و ہم راز" بناتی ہے وہ یہ کہ ہماری آپ کی طرح نہ اس کا سینہ آرزو سے خالی ہے نہ وہ شکستِ آرزو سے ناآشنا اور نہ آرزو مندی سے تائب ہے۔ دیوانِ غالب کے متعدد شعر اس کے گواہ ہیں کہ دنیا کو بازیچۂ اطفال بنانے اور دین و دنیا کو درد یک ساغرِ غفلت جاننے والے غالب کو اپنی تنہائی اور بے بضاعتی کا بارہا اس انداز سے بھی احساس ہوا ہے کہ

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

ظاہر ہے کہ اس سرو قامت اور بلند آہنگ شخصیت کو جذبے، فکر اور عمل کی دنیا میں بار بار منھ کی کھانی پڑتی ہے۔ زندگی کی اچھی قدروں سے پیار کیا ہے انھیں چاہا ہے اور ناکام رہا ہے۔ سیر و سیاحت کا ارمان ایسا کہ دوزخ کو بھی جنت میں ملا لینے کو تیار ہیں کہ سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی وضعداری اور استقامت پر اتنا اصرار کہ وفاداری بشرطِ استواری کو اصل ایماں قرار دے اور انسان دوست ایسا کہ دیر و حرم دونوں کو آئینۂ تکرارِ تمنا یا وا ماندگیٔ شوق کی پناہ گاہیں قرار دے مگر اپنی کلاہ کج رکھنے والے شاعر کو خود شعر کی دنیا میں بھی جگہ جگہ جھکنا پڑا ہے۔ کبھی مایوسی اور

محرومی کے سامنے کبھی کسی اہلِ ثروت کے آگے۔ مگر غالب کی عظمت اس کی خودداراور سمجھوتا دشمن شخصیت میں مضمر نہیں ہے۔ جو بات غالب کو دلنوازی بخشتی ہے وہ یہ کہ ان سمجھوتوں اور شکستوں کے باوجود اس کی شخصیت ٹوٹی نہیں اس کی آرزومندی اور نشاطِ زیست نے کہیں اور کبھی ہار نہیں مانی۔

غالب کے اشعار یہ نہیں بتاتے کہ وہ شاعر ہے جس کی زندگی کا بیشتر حصہ باسٹھ روپے آٹھ آنے ماہانہ آمدنی پر بسر ہوا۔ بہت حصہ قرض سے دبے ہوئے گذرا، پنشن کی بازیافت کی کوششوں میں صرف ہوا جس کا پاگل بھائی ۱۸۵۷ء میں انگریز سپاہیوں کی گولیوں سے مارا گیا جس کے سات بچوں میں سے ایک بھی زندہ نہیں رہا جس نے قمار بازی میں چند ماہ فرنگی جیل کی اذیت بھی اٹھائی اور لال قلعہ میں بہادر شاہ ظفر کے استاد ہوئے اور ۱۸۵۷ء میں سکہ شعر نذر کرنے کی تہمت پر بہت کچھ تنگی ترشی بھی جھیلی لیکن اس زندگی کے آڑے ترچھے عکس شاعری میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ ایسا شخص جو حساس باغیرت اور خوددار ہو اس کرب و بلا سے گزرے اور اپنا ذوق و جمال، اپنی حس مزاح اور اپنی آرزومندی برقرار رکھے یہ معمولی کارنامہ نہیں۔ اس پل صراط سے آج کی نسل کا نوجوان گزرتا ہے تو غالب میں اسے اپنا عکس نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اعلاترین موسیقار غالب کی غزلیں گاتے ہیں۔ اعلا ترین مصوران اشعار میں چھپی ہوئی تصویریں بناتے ہیں اور ہمارے دور کے شاعر اور ادیب اور افسانہ نگار غالب سے عنوان اور طرزِ بیان مستعار لیتے ہیں۔

یہ روحانی یگانگت دراصل عالی ظرفی سے آئی ہے لیکن غالب کے کلام میں عالی ظرفی نقاب یا نقلی چہرہ نہیں۔ ان کی شخصیت کا سچا کھرا اور بے ساختہ جز ہے نہ وہ اپنی شکستیں چھپاتے ہیں نہ کمزوریاں۔ وہ سب سے ہنستے بولتے فقرے، لطیفے اور ٹھٹھول سے بھری باتیں کرتے جاتے ہیں۔ وہ بازار سے گزرتے ہیں اور بے آرزو نہیں گزرتے۔ وہ ایک مفلس مگر جی دار خریدار کی طرح زندگی کے بازار سے گزرے ہیں اور اس زندگی کا دکھ درد اس کا کرب، کشاکش، غرض محرومیوں کا سارا زہر پینے پر بھی آمادہ ہیں۔

یہ عرفان کہ زندگی نہ محض اندھیروں سے عبارت ہے نہ محض اجالوں سے، کہنے کو آسان بات ہے مگر ایک عمر کے بعد یہ عرفان حاصل ہوتا ہے۔ غالب دنیا کے ان چند عظیم فنکاروں میں ہیں جنھوں نے زندگی کو مکمل اور غیر منقسم روپ میں پورے کرب و نشاط کے ساتھ دیکھا اور برتا ہے۔ انھیں احساس ہے کہ آرزو کا انجام اکثر و بیشتر شکست آرزو ہوتا ہے۔ جب شکست آرزو کے اس آئینہ خانے سے گزرتے ہیں تو ان کی تڑپ اور ان کا کرب دیکھا نہیں جاتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی لگتا ہے جیسے اب وہ اس ویران اور اندھیری دنیا کے ہو کر رہ جائیں گے۔ مگر پھر ان کے اندر چھپا ہوا درد آشنا اور آرزومند انسان جاگتا ہے پھر چاند کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور شکستِ آرزو کے تجربے سے دوچار ہونے کے بعد آرزوؤں کا انجام جاننے کے باوجود پھر آرزومندی کا یہی کھیل کھیلتا ہے۔ نشاط و کرب کی اس دھوپ چھاؤں میں مزا لیتا ہے اور اس کو زندگی سمجھتا ہے۔

ان تینوں منزلوں کی نشاندہی ان کے اشعار میں جا بجا ہوتی ہے۔ لیکن ان کے مزاج کی غمازی کے لیے شاید یہی بات کافی ہے کہ "پھر اور یہی" کے الفاظ جتنی بار اور جس انداز سے غالب کی غزل میں استعمال ہوئے ہیں اردو شاعری میں کسی اور کے کلام میں استعمال نہیں ہوئے۔ گویا ایک مدت ہوئی آرزومندی کے کھیل کے تائب ہو گئے تھے۔ غم روزگار نے زیر کر رکھا تھا مگر، پھر آرزومندی اور حسرت تعمیر کا یوسف چاہ کنعاں سے آفتاب بن کر ابھرا اور اس احساس کے ساتھ ابھرا کہ شاید اسے پھر شکستِ آرزو کے خوں میں نہا کر ڈوب جانا ہے۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا
پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

اور اس عرفانِ حیات کے سب سے واضح نمونے ان اشعار میں نمایاں ہیں ؎

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
دل میں رکھتے تھے جو اک حسرتِ تعمیر سو ہے

نہ اتنا بُرِّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بے تابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

غرض وہ دلنواز شخصیت جو ان شعروں میں سمائی ہے بار بار یہ اطمینان دلاتی ہے کہ وہ زمانے سے ساز و ستیز میں کئی بار ہاری مگر ٹوٹی نہیں اور اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ لطیف مزاح ہے جو ان اشعار میں موجِ تہ نشیں بن کر سمایا ہے۔ جس مزاح کی اعلاترین منزل وہ ہے کہ انسان خود اپنے اوپر ہنس سکتا ہو۔ یہ ہنسنا محض پھبتی کے انداز کا نہیں زہر خند کا سا ہے کیوں کہ اس میں تمسخر نہیں درد کی لہر اور کرب کی آمیزش شامل ہوتی ہے۔ یہ تمسخر قہقہہ یا کرب و عرفانِ کرب سے معمور مزاحِ غالب کے اشعار سے سنگیت کی طرح ابھرتا ہے ؎

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا
ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

مختصر یہ کہ غالب کی دلنواز شخصیت کچھ اسی طرح کی خصوصیات سے ابھرتی ہے۔ ان اشعار میں اس ٹوٹتے بکھرتے دور کی آوازِ شکست ہی سنائی نہیں دیتی بلکہ ایک ایسے دل کی دھڑکن بھی سموئی ہوئی ہے جسے زندگی سے اتھاہ پیار ہے اور جو زہر اور امرت دونوں کو اپنا کر بھی مایوسی اور محرومی پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ ستاروں پر کمندیں ڈالنے کا آرزومند ہے اور اس آرزومندی کو اصلِ حیات جانتا ہے۔

(عرضِ ہنر۔ نصرت پبلشرز لکھنؤ۔ ۱۹۷۰ء)



رخصت اے بزمِ جہاں سوئے چمن جاتا ہوں میں — اقبال

مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی خاص خاص مطبوعات

حیاتِ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی (نواب صدر یار جنگ)
مولانا حبیب الرحمان خاں صاحب شروانی ماضی قریب کے ایک نمائندہ فرد اور ملت کا قیمتی سرمایہ تھے۔ وہ بیک وقت ایک جید عالم دین حضرت مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادی کے مسترشد سلطنت آصفیہ حیدر آباد کے صدر الصدور، ایک خاندانی رئیس، مشرقی تمدن کا ایک نادر نمونہ اور اردو کے صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کی سوانح [illegible] اصل ہندوستانی مسلمانوں کی پچاس سالہ علمی دینی معاشرتی تاریخ اور اہم ملی اداروں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ندوۃ العلماء مسلم یونیورسٹی کی روداد بھی ہے۔ اس کتاب میں پہلی بار اپنے انداز میں تاریخ اقاعدہ مولانا کے نادر کتب خانہ ان کے جملہ اہم احباب و معاصرین کا تذکرہ، ان کی نظم و نثر اور تصانیف پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ سوانح ملی تاریخ کی ایک اہم کڑی اور ایک اہم ضرورت ہے۔ قیمت ۔/۱۵

تذکرہ حضرت مولانا فضل الرحمان گنج مراد آبادیؒ (مولانا سید ابو الحسن علی ندوی)
یہ کتاب چودہویں صدی ہجری کے مشہور و مقبول بزرگ اور عالم [illegible] حضرت مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادیؒ (۱۲۰۸ - ۱۳۱۳ھ) کے سوانح حیات حالات و کمالات اور ارشادات و ملفوظات پر مشتمل ہے۔ کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ حضرت مولانا کی صحبت میں بیٹھا ہوا ہے اور درد و محبت کی وہ آنچ اس کو بھی محسوس ہو رہی ہے جو مولانا کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ وہ حضرات جو درد و محبت کے جویا اور اہل یقین کے طالب ہیں ان کے لیے یہ کتاب بیش قیمت تحفہ ہے۔ قیمت ۔/۹

سیرت حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ (بانی ندوۃ العلماء) مولانا سید محمد الحسنی
مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانی و ناظم ندوۃ العلماء کی سیرت ندوۃ العلماء پر ایک قرض تھا۔ ان کی شخصیت اور ان کی خدمات اس کی مستحق تھیں کہ ان کو نہ صرف ندوۃ العلماء کی تاریخ میں بلکہ ہندوستان کی اصلاحی اور دعوتی تاریخ میں بھی نمایاں جگہ دی جائے اور اس کا شایان شان تعارف کرایا جائے۔ پیش نظر کتاب میں مولاناؒ کی شخصیت کے پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شروع میں مولانا سید ابو الحسن ندوی [illegible] کا مقدمہ ہے۔ قیمت ۔/۱۵

قادیانیت (مولانا سید ابو الحسن علی ندوی) جس کا احسن کرہی قادیانی گھبرانے لگتے ہیں۔ یہ کتاب ملک کے اندر اور افریقہ کے بعض حصوں میں اس فتنے کیلئے ایک سنگ گراں بلکہ پیام اجل ثابت ہوئی ہے۔ تاریخی ثقاہت، استدلال کی قوت، اسلوب کی متانت اور قلم کی شگفتگی کتاب کے سارے مباحث میں یکساں طور پر ملتی ہے اور پوری کتاب میں مناظرانہ طرز کلام کے بجائے خالص علمی اور تحقیقی طرز اختیار کیا گیا ہے تاکہ اس میں کوئی رکاوٹ نہ ہو سکے۔ قیمت ۔/۶

رودادِ چمن ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ جشن تعلیمی کی مفصل روداد۔
مرتبہ: مولانا محمد الحسنی ندوی ۔ ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی (منعقدہ نومبر ۱۹۷۵ء) کی تفصیلی رپورٹ جس کا آپ کو شدت سے انتظار تھا منظر عام پر آگئی ہے۔ اس کی حیثیت ایک دستاویز۔ ایک کہانی۔ ایک پیغام کی ہے۔ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے ایماء پر یہ روداد مرتب کی گئی ہے جس میں اجلاس کے مناظر کی اس طرح تصویر کشی کی گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا خود اجلاس میں شریک ہے۔ پوری کتاب دار العلوم کی خوبصورت عمارتوں کی تصاویر نیز دوران اجلاس نماز جمعہ کے دلفریب منظر سے بھی مزین ہے۔ خوبصورت رنگین ڈسٹ کور، دیدہ زیب گٹ اپ مجلد۔ قیمت ۔/۱۵

تعمیر حیات کی اشاعت خاص (مولانا عبد السلام قدوائی ندوی)
مولانا سید محمد الحسنی، مولانا اسحاق سنبھلی ندوی کے حالات واقعات، علمی و ادبی خدمات، خصوصیات و کمالات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔ ہند و بیرون ہند کی ممتاز علمی شخصیتوں کے تعزیتی خطوط علمی و ادبی [illegible] تنظیموں کی تعزیتی قرار دادیں، اخبارات اور رسائل کے [illegible] مولانا کے خاندان [illegible] اس پیشکش کے متعلق حضرت مولانا ابو الحسن علی نے فرمایا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ان نوجوانوں کے سامنے جانے والوں کی خدمات اور ان کے کارنامے سامنے آئیں اور ان کے اندر خود اعتمادی کوششوں کے جذبے ابھریں اور سابقین کے نقش قدم پر چلنے کا حوصلہ اور شوق پیدا ہو۔ صفحات ۴۹۴ دیدہ زیب طباعت عمدہ گٹ اپ قیمت ۔ ۲۵ روپے

مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء ۔ پوسٹ بکس ۹۳ لکھنؤ

QA.PN-64

ڈاکٹر قمر رئیس



عصرِ حاضر میں اردو طنز و مزاح

ایمرجنسی کا بھلا ہو کہ اس دور میں جہاں اور بہت سی اشیاء خالص ملنے لگی ہیں، وہاں ایک مزاح بھی ہے، ورنہ اس سے پہلے تو لوگ خالص مزاح کی صورت کو ترس گئے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ قول بڑی حد تک درست ہے کہ "جب معاشرہ بھوکا ہو تو اس میں طنز و مزاح کو فروغ ملتا ہے اور تخریب دہشت پسندیت اور برہمی کے عناصر اُبھرتے ہیں۔ دوسری طرف فارغ البالی کے دور میں ماحول سے یگانگت اور اُنس بڑھ جاتا ہے اور اس لیے خالص مزاح کو فروغ نصیب ہوتا ہے۔" (اردو ادب میں طنز و مزاح۔ صفحہ ۳۴۲) شاید ابھی خالص مزاح کے عروج کا دور تو نہیں آیا لیکن ماحول سے یگانگت کا آغاز ضرور ہو گیا ہے۔ اچھی فصلوں نے بھوک کم کر دی ہے، اگرچہ اس نسبت سے چبھن، گھٹن اور بے چینی و بے رخی کم نہیں ہوئی جو طنزیہ اظہار کو جنم دیتی ہے۔ پھر بھوک ہی نہیں، شکم سیری سے بھی ایسا خمار پیدا ہوتا ہے جب آدمی انصاف، آسودگی اور حُسن سے معمور ایک بہتر زندگی اور بہتر سماج کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ اور ان خوابوں اور حقیقتوں کا تصادم بھی اکثر تلخی اور بیزاری کی صورت میں تیر و نشتر بن جاتا ہے۔

آزادی کے قبل اردو میں لطف و انبساط دینے والی ظرافت کا سرمایہ کم نہیں تھا۔ عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، پطرس اور شفیق الرحمٰن ذہنی گدگدی چھیڑنے اور زہر خند کے بجائے ہنسانے میں کمال رکھتے تھے۔ وہ اپنے لطف انگیز مشاہدات اور ان کی تخلیقی تجزیوں سے ہنساتے رہتے تھے لیکن آزادی کے بعد یہ صورت حال بدل گئی۔ جیسے والہانہ جوش کے ساتھ ہنستے ہنستے کوئی دلدوز منظر دیکھ کر اچانک آدمی سنجیدہ یا رنجیدہ ہو جائے۔

دراصل تقسیم اور آزادی کے نتیجہ میں ملک میں کچھ ایسے اندوہناک حادثات پیدا ہوئے کہ ہنسی کا کال سا پڑ گیا۔ ظرافت نگار ہی نہیں، اچھے بھلے افسانہ نگار اور شاعر بھی طنز میں طبع آزمائی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ طنز کبھی تیکھی اور زہریلی اور کبھی مزاح کی ملی جلی چاشنی لیے ہوتے دیے پانوں جدید تخلیقی ادب کی شریانوں میں داخل ہونے لگا۔ ملک گیر فسادات، اغوا اور عصمت ریزی کے بہیمانہ جرائم اور پھر ہجرت کے اذیت ناک واقعات کے زخم اتنے کاری تھے کہ مدتوں تک بھر جانے کے بعد بھی مندمل نہ ہوتے۔ منٹو، کرشن چندر، رامانند ساگر، خواجہ احمد عباس، کنھیا لال کپور، فکر تونسوی یہاں تک کہ مجتبیٰ حسین کی نسل کے ادیب بھی چیخ پڑے کہ یہ مہاتما بدھ اور مہاتما گاندھی کے اہنسا، دھرم اور شانتی کا ملک تھا۔ وہ تہذیبوں کا ملک ۔۔ پھر یہی دور عام انسان کے لیے جمہوریت کی برکتوں اور آزادی کے حسین خوابوں کی شکست و ریخت کا دور بھی تھا۔ اس نئے طلسم ہوش ربا کے منظر بھی گھر، بازار، دفتروں، معبدوں، سیاسی اکھاڑوں، تعلیم گاہوں اور ودھان سبھاؤں میں ارزانی سے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف آزادی اور سماجی انصاف کی سہانی آرزوئیں اور حسین خواب تھے۔ دوسری طرف جبر و استحصال اور زہرناک بدعنوانیوں اور ناہمواریوں کی برہنہ حقیقتیں ۔۔ ان کے باہمی ٹکراؤ نے ادیبوں کو حسن ہیجان آفریں شدت سے متاثر کیا۔ اس کے اظہار نے اکثر طنز کی صورت اختیار کر لی۔ بقول مجتبیٰ حسین "آج کے انسان کی ہنسی کا المیہ یہ ہے کہ اس کی ہنسی کبھی آنسو بن کر

نوٹ:۔ یہ مضمون حال ہی میں پٹنہ میں جشنِ ظرافت کے سیمینار میں پڑھا گیا تھا۔ اب جزوی تبدیلیوں کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں صرف ہندستانی مزاح نگاروں کی تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بعض پاکستانی ادیبوں کا ذکر ضمناً آ گیا ہے۔

آنکھ سے ٹپک پڑتی ہے۔ اور کبھی آہ بن کر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے" میں بھی غور و تامل اور سماجی احساس کے ساتھ ساتھ طنز کا عنصر بڑھ
اس دور میں پچھلی پود کے سنجیدہ ادیبوں اور شاعروں مثلاً منٹو گیا اور اسی نسبت سے سنگ و خشت، شیشہ و تیشہ والی شگفتگی
عصمت چغتائی، عیاش، شاہد عاشق، اختر الایمان اور کیفی کی تحریروں میں اور شوخ طراری کم ہوتی گئی۔ لیکن اس کی جگہ انسانی نفسیات

بھی نشتر زنی کا عنصر بڑھتا گیا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ نئی پود کے ادیبوں کا جذباتی اور ذہنی ردِ عمل تند و تلخ نظر آتا ہے۔ ان میں سے بعض کی تحریروں میں طنز آمیز تیز ابی اظہار نے ایک مستقل عنصر کا درجہ حاصل کر لیا ہے افسانہ نگاروں میں جوگندر پال، اقبال متین، واجدہ تبسم، اقبال مجید، کلام حیدری اور شاعروں میں عمیق حنفی، وحید اختر، باقر مہدی، عزیز قیسی، بلراج کومل، شہاب جعفری، مظفر حنفی اور عتیق اللہ کی تخلیقات سے بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس وقت ان کی تحریریں مطالعہ کا موضوع نہیں ہیں۔ میں یہاں صرف ان ادیبوں کا ذکر کروں گا جن کے یہاں طنز و مزاح ایک غالب رحجان کی حیثیت رکھتا ہے اور جنہوں نے اسے فن کے طور پر برتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے پچھلی پود کے ادیبوں میں کرشن چندر اور کنہیا لال کپور کی تحریریں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ کرشن چندر نے اردو طنز و مزاح کے سرمایہ میں جو وقیع اضافہ کیا ہے اس میں ان کے مشاہدہ اور تخیل کی شادابی کے ساتھ ساتھ ان کی بے لاگ عقلیت پسندی اور بے داغ گہری انسان دوستی کا بھی ہاتھ ہے "وہ ہوائی قلعے" کے انشائیے ہوں یا فسادات کے افسانے۔ داور پل کے بچے ہوں، یا گدھے کی سرگذشت، اور اس قبیل کے دوسرے فنطاسیے۔ کرشن چندر ایک خالص ذہنی بلندی اور بے تعلقی سے زندگی کا نظارہ کرتے ہیں اور ان کی عقابی نظر ہمیشہ اس کی نتیجہ خیز ناہمواریوں کمزوریوں اور بے اعتدالیوں پر پڑتی ہے۔ وہ ان کے مضحک یا خندہ آور پہلوؤں کے ساتھ ان سماجی اور سیاسی عوامل کی طرف بھی معنی خیز اشارے کرتے ہیں جن میں وہ صورت حال یا کردار سانس لیتے ہیں۔ پھر خوبی یہ ہے کہ ان سب کا ماحول، محرکات اور سیرتیں جدا نظر آتی ہیں ان کی اکثر تصویریں یکسانیت اور تکرار کے نقص سے پاک ہیں۔ ان کے ظریفانہ منظروں میں ایک ایسا چٹیلا پن ہوتا ہے جو ہر قاری کو سوچنے پر اکساتا ہے۔ بے شک ان کے موضوعات گرد و پیش کے سیاسی اور سماجی حقایق سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کو انہوں نے فکری اور تخیلی سطح پر ایک آفاقی رنگ دینے کی کوشش ضرور کی ہے، آزادی کے بعد کنہیا لال کپور کے انشائیوں

ژرف بینی نے ان کے مضامین میں مضحکات کے نئے عناصر داخل کر دیے جس سے ان کی انفرادیت کے نقوش تیکھے ہوتے اور وہ اپنے معاصرین میں الگ پہچانے جانے لگے۔ ہر طرح کی آرائش سے پاک، سادہ، شگفتہ اور چٹیلے طرزِ تحریر نے بھی ان کی انفرادیت کو نکھارا۔ اگر اب سے دس بارہ سال پہلے کے ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کے پیچ و خم اور پیش و کم کی حقیقی جھلکیاں دیکھتا ہوں تو کرشن چندر کے طنزیوں کے متوازی کنہیا لال کپور کے مضامین ضرور رکھتا ہوں گے۔ خاص طور پر زندہ باد غارستان، نٹ راج، اور پریس کانفرنس، جیسے مضامین۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ طنز و مزاح کو کپور نے فن کی طرح برتا اور پیش کیا۔ اور جب تیر و نشتر چلاتے ہوتے انہیں اپنے ہاتھوں میں کچھ رعشہ سا محسوس ہوا تو خاموشی سے انہیں الگ رکھ کر بیٹھ گئے۔ رشید احمد صدیقی اور پطرس مرحوم پہلے ہی یہ بساط اٹھا کر رکھ چکے تھے۔ طنز و مزاح میں ان دونوں کی پیغمبرانہ شان اس سے ہے کہ دونوں کے طنزیہ آمیز مزاحیہ مضامین صرف ایک ایک کتاب پر مشتمل ہیں۔ دونوں کی فکر و نظر کے دائرے اور طنز و تضحیک کے پیرائے ایک دوسرے سے الگ اور ایک حد تک محدود ہیں لیکن اردو طنز و مزاح میں دونوں کے اثرات لامحدود۔ دونوں ہی اردو نثر کے مزاحیہ ادب میں سب سے معتبر اور مستحکم روایت کا درجہ رکھتے ہیں ان سب کا اسلوب و انداز عصرِ حاضر کے ممتاز طنز نگاروں کی تحریروں میں اس طرح گھل مل گیا ہے کہ اس کی شناخت ایک زندہ روایت کی شناخت بن گئی ہے۔ رشید صاحب نے خاکوں کے علاوہ اردو شعر و ادب اور علی گڈھ کے رشتے سے جو مضامین گذشتہ برسوں میں لکھے ہیں ان میں بھی کہیں کہیں ان کے رچے ہوئے ذوقِ ظرافت کی چنگاریاں چمک اٹھتی ہیں جو دراصل ان کی خود آگاہ شخصیت اور منفرد اسلوبِ نگارش کا تابناک حصہ ہیں۔

جن ادیبوں نے رشید صاحب اور پطرس کے طنز آمیز ظریفانہ اسلوب کی کمیوں یا کمزوریوں سے دامن بچا کر ان کے فنی محاسن کو تخلیقی حسن کے ساتھ عصری بصیرت اور عصری مذاق و فکر سے

ہے۔ ان میں مشتاق احمد یوسفی کا نام سرِ فہرست ہے یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ گذشتہ دو دہوں میں اردو نثر میں طنز و مزاح کا جو نشاۃ ثانیہ ہوا ہے مشتاق احمد یوسفی کے مضامین اُس کا نقطۂ عروج ہیں۔ ان کے علاوہ پاکستانی ادیبوں میں نظیر صدیقی، ابن انشا اور ابراہیم جلیس نے بھی طنز و مزاح کو تخلیقی ہنر سے آشنا کرنے کی کوشش کی ہے۔

شکر کی بات ہے کہ آج اردو میں ظریفانہ ڈرامائی واقعات عملی مذاق یا ٹھٹھول اور تمسخر کے حربوں سے مزاح پیدا کرنے کا رجحان تیزی سے رو بہ زوال ہے۔ اودھ پنچ کے بعد اس کی پرورش عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی اور شفیق الرحمن نے کی تھی۔ اس رجحان کے انحطاط کا ایک بڑا سبب پھبتیوں اور لفظی کرتبوں کا سہارا لیا تھا اس میں ایک طرف سماجی اور اخلاقی قدروں کی آویزش اور دوسری طرف حقیقی انسانی تجربات کے لطیف اور تہہ دار مضحک پہلوؤں کو سمجھنے کی گنجائش کم تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ اردو ادب کے نئے قارئین کی صفیں بھی اب اپنی واقعیت پسندی اور ذہنی پختگی کی بنا پر ایسے ظریفانہ ادب کی متلاشی ہیں جو بیک وقت تفنن اور تفکر، مسرت اور بصیرت کا حامل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عصرِ حاضر کی ظرافت گردوپیش کی حقیقی زندگی اور اس کے زندہ تہذیبی مظاہر سے اپنا مواد اور موضوع اخذ کرتی ہے۔ فنی نقطۂ نگاہ سے مزاح نگار ڈرامہ نگار کی طرح بلکہ اس سے بھی سوا ایک خاص افتاد کے مواد کے انتخاب پر مجبور ہوتا ہے۔ وہ پابند ہوتا ہے کہ زندگی اور فطرت فرد اور سماج کے صرف ایسے رخ اور ایسی تصویریں دکھائے جو نہ صرف ہنسائیں بلکہ قارئین کی ارتقا پذیر جمالیاتی حس کی تسکین کا ذریعہ بھی بن سکیں۔ وہ جانتا ہے کہ اسی کمال و ہنر کے بغیر اس کا مزاحیہ فن تخلیق کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ شعور و احساس عصرِ حاضر کے مزاح نگاروں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اس احساس اور احتیاط کی بنا پر ان میں سے اکثر اپنے مشاہدے، تجربے اور محسوسات کی دنیا ہی سے اپنے مواد اور موضوع کا انتخاب کرتے ہیں اس سے انفرادی سطح پر جہاں ان کے موضوعات میں تنوع پیدا ہوا ہے، وہاں عصری قومی زندگی کے بے شمار مسائل اور مظاہر کے بارے میں ان کے مشترک بیدار اور پائدار احساس کے نشانات بھی ملتے ہیں۔

اس عہد کے ممتاز اور محبوب مزاح نگاروں میں فکر تونسوی، فرقت کاکوروی، مجتبےٰ حسین، احمد جمال پاشا، وجاہت علی سندیلوی یوسف ناظم، اور شاعروں میں راجہ مہدی علی خاں اور رداہی کے نام نمایاں رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی بھارت چند کھنہ، خواجہ عبد الغفور، نریندر لوتھر اور مسیح انجم نے بھی اس دور میں اردو طنز و مزاح کے معیار و کردار میں خوشگوار اضافہ کرنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے تخیلی واقعات اور افسانویت کے بجائے پیکر تراشی ماحول آفرینی اور مرقع نگاری کے ذریعہ مزاح پیدا کرنے کا انداز ان کی تحریروں میں مشترک نظر آتا ہے دوسری طرف وہ عام فہم زبان کے استعمال میں بھی ایمائی اظہار پر زور دیتے ہیں اور طرزِ بیان میں بذلہ سنجی اور رعایتِ لفظی کے نئے پینترے تلاش کرتے ہیں۔

موضوعات کے لحاظ سے ان کی مزاحیہ تحریروں کو پانچ طرح کے عنوانات کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔

(۱) اردو زبان و ادب کی کس مپرسی کا درد مشترک
(۲) سیاسی نظام اور دفتر شاہی کی بدعنوانیاں
(۳) اقتصادی ناہمواریاں
(۴) تعلیمی نظام اور نوجوانوں کی بے اعتدالیاں
(۵) سماجی اور تہذیبی بوالعجبیاں

ان میں آخر الذکر کا دامن موضوعات کی رنگارنگی اور نفسیاتی تحلیل کی وجہ سے سب سے زیادہ وسیع ہے۔ اکثر انشائیے مزاحیے اسی ذیل میں آتے ہیں۔

ملک میں اردو زبان کے جائز جمہوری حقوق کی پامالی کے خلاف شاید سب سے پہلے اور سب سے شدید ردعمل کا اظہار کنہیا لال کپور نے "برج بانو" میں کیا تھا۔ اس کی تلخی اور تندی میں غضب کی جولانی تھی۔ اس کے بعد فکر تونسوی، فرقت کاکوروی، وجاہت علی سندیلوی واہی اور دوسرے طنز نگاروں نے تیکھے تیکھے انداز سے اردو پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز بلند کی۔ لیکن اس سلسلے کے اہم مضامین وہ ہیں جو غالب صدی کے موقع پر یا اس کے بعد لکھے گئے۔ ایک طرف ملک میں اردو زبان کے چلن اور اس کی تعلیم کی جڑیں کاٹنا اور دوسری طرف اس کے ایک شاعر کا سارے ملک بلکہ ساری دنیا میں شاندار جشن منانا۔ یہ ایسا تضاد تھا جس نے اردو کے ادیبوں کو بے رحمانہ طنز کی ترغیب دی اس سلسلے کے امام، مرحوم فرقت کاکوری تھے۔ انہوں نے مختلف ادیبوں اور رہنماؤں کے نام مرزا غالب کی

طرف سے جو خطوط لکھے ہیں، غالب خستہ کے بغیر ان میں تلخی اور زہر ناکی مزاح پر غالب آگئی ہے۔ اس دور میں غالب اور ان کی شاعری اردو کے مزاح نگاروں کا ایک مستقل اور مشترک موضوع بن گیا۔ وجاہت علی سندیلوی اور گیان چند جین نے اگر کلام غالب کی مزاحیہ شرحیں لکھیں تو واجدہ، مہدی علی خاں، شوکت تھانوی اور قاضی غلام محمد نے پیروڈیاں۔ الغرض بیشتر مزاح نگاروں کے اعصاب یا اوسان پر غالب سوار ہو گئے۔

تیزی سے بدلتے ہوئے ملک کے سیاسی سماجی نظام میں ایک طرف طبقاتی مفادات اور نظریات کے ٹکراؤ اور دوسری طرف تغیر پذیر انسانی رشتوں، رویوں اور قدروں نے ایسی صورت اختیار کی کہ اس پُر آشوب گرداب میں مزاح نگاروں کو خود انسان اور انسانیت کا وجود ڈولتا اور ڈوبتا نظر آنے لگا۔ اس صورت حال کے مضحک عناصر کو انہوں نے بڑے ضبط اور ٹھہراؤ سے اپنے مزاح پاروں کا موضوع بنایا۔ فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، وجاہت علی سندیلوی اور شاعروں میں واجد، راجہ مہدی علی خاں، قاضی غلام محمد کی تخلیقات سے لطیف سیاسی طنز کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ فکر تونسوی کے طنزیہ نشتروں میں مدتوں صحافتی رنگ نمایاں رہا۔ لیکن "بدنام کتاب" کے نام سے حال ہی میں ان کے طنزیہ مضامین کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اس میں رمزیہ اظہار نے ایک سنبھلی ہوئی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ مثلاً "میں نے الکشن لڑا" کا یہ اقتباس دیکھیے:

"میرا خیال تھا کہ الکشن لڑنا شرفا کا کام نہیں لیکن اب خیال آیا کہ صرف شرفا ہی کو الکشن لڑنا چاہیے، ورنہ ڈیموکریسی غنڈہ گردی کا شکار ہو جائے گی۔ اس لیے جونہی میں نے حامی بھری مجمع میں ایک عجیب احمقانہ طمانیت بھر گئی اور ایک مشٹنڈے سے نوجوان نے جو رام لیلا میں راون کا پارٹ ادا کرتا تھا مجھے پکڑ کر کندھے پر بٹھا لیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں رامائن کی سیتا ہوں اور ڈیموکریسی کا راون مجھے اغوا کرنے کے لیے جا رہا ہے (بدنام کتاب صفحہ ۱۴۴)

یہاں شرفا، رام لیلا، راون، رامائن اور سیتا سب کا استعمال رمزی انداز سے ہوا ہے۔ یہ الفاظ قاری کے ذہن میں بہت سے پنہاں اور تہہ دار تصورات کی گرہیں کھول دیتے ہیں۔ اسی طرح بلکہ کہیں کہیں اس سے بھی زیادہ ایمائی اور تمثیلی پیرایۂ بیان مجتبیٰ حسین کے مزاحیوں مثلاً انتخابی نعرے، سندباد جہازی کا سفر نامہ یا پھر احمد جمال پاشا اور یوسف ناظم کے طنز آمیز انشائیوں اور خاکوں میں نظر آتا ہے۔ یہاں احمد جمال پاشا کے مزاحیے کا ایک اقتباس دیکھیے:

ہیرو راشن کی دکان سے شکر لینے روانہ ہو رہا ہے

"والد صاحب نے راشن کارڈ اور دام دیتے ہوئے کہا، بیٹا شکر لانے کی کوشش کرو۔ کپڑے بدل کر میں شکر لانے کے لیے چلا تو والد نے پکارا

"ٹھہرو امام ضامن تو بندھوا لو"

بھابی بولیں۔ ہاں اور نہیں تو کیا۔ دن کا کھانا کھا لو اور رات کا بھی ساتھ لیتے جاؤ"

دادی جان نے پکار کر والدہ سے کہا۔

"ارے بہو اس غریب کا دودھ تو بخش دو"

بھائی صاحب بولے۔

دیکھو ساتھ میں بستر لیتے جاؤ۔ اور کچھ دام بھی لیتے جاؤ۔ نہ جانے کیا ضرورت پڑ جائے"

بڑی بہن نے بلائیں لیں، اور اپنا فرسٹ ایڈ کا بکس دیتے ہوئے کہا احتیاطاً اسے بھی لیتے جاؤ"

دولہا بھائی آنکھوں میں آنسو لاتے بولے۔

شکر لینے جا رہے ہو تو ہم لوگوں کا کہا سنا بھی معاف کرتے جاؤ"

بیگم نے آبدیدہ ہو کر دوپٹے سے آنسو پونچھے "مجھے کس پر چھوڑے جا رہے ہو"

یہاں ہیرو ہاتھ میں کپڑا لے کر راشن کی شکر لینے اس طرح رخصت ہو رہا ہے جیسے حضرت عباس مشکیزہ لیے فرات سے پانی لینے جا رہے ہوں۔ ماحول کشی اور مبالغہ نے مزاح پیدا کیا ہے لیکن طنز کا ہدف کچھ اور ہے۔

آج کی تہذیبی زندگی کی بساط اپنے مشغلوں اور سرگرمیوں کے اعتبار سے بہت وسیع اور پہلودار، پیچیدہ اور پراسرار ہو گئی ہے۔ اس نسبت سے اس کی معقولیت اور نامعقولیت، سوجھ بوجھ اور بوکھلاہٹ، متانت اور ظرافت کے تضادات کا میدان (RANGE) بھی بہت بڑھ گیا ہے اس کا موازنہ اگر ملا رموزی، شوکت تھانوی، اور عظیم بیگ چغتائی کے عہد سے کیجیے تو یہ فرق نمایاں ہو جائے گا۔ یہ بھی محسوس ہوگا کہ اب

سے چوتھائی صدی پہلے مضحک تضادات کی نوعیت ذہنی اور داخلی کم خارجی اور عملی زیادہ تھی جب کہ آج یہ صورت حال برعکس ہو گئی ہے پہلے مزاح شوخی، طراری اور زبان کے شاطرانہ استعمال کا تابع تھا آج شگفتگی شائستگی اور دردمندی کا مطیع ہے۔ اس کے علاوہ نفسیاتی تحلیل نے بھی اس میں رنگ بھرا ہے۔ صرف دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

"داڑھ کے درد کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ درد بالاقساط ہوتا ہے۔ یعنی درد کی ایک لہر جاتی ہے اور دوسری آتی ہے جب درد کی پہلی لہر جا چکی تو ہم پر یہ عظیم انکشاف ہوا کہ درد کی ہر لہر کے ساتھ ہم میں" جدید شاعر" بننے کی زبردست صلاحیتیں پیدا ہو رہی ہیں۔

اچانک ہم پر یہ راز کھلا کہ جدید شاعری اصل میں داڑھ کے درد کی شاعری ہے جس میں آدمی کا سارا کرب سمٹ آتا ہے اور وہ سورج کو چبا کر کھا جانے کی منزل میں پہونچ جاتا ہے"

"چند قدم ہی چل پاتے تھے کہ داڑھ مذکور میں اچانک بجلی سی کوند گئی۔ برق کی ایک رو تھی جو داڑھ سے نکل کر سارے بدن میں لہرا گئی۔ ایک تجلی تھی جو آنکھوں کو چکا چوند کر گئی۔ یوں لگا جیسے ہماری داڑھ میں اچانک ایا ہزار کے کلبلیں بھرنا شروع کر دیا ہے جیسے کسی نے ہماری داڑھ میں توپ داغ دی ہو۔ جیسے ہماری داڑھ میں اچانک فوجی انقلاب آیا ہو" (مجتبیٰ حسین، بہرحال صفحہ ۱۴۴)

آدمی مکان اس لیے بنواتا ہے کہ زندگی، خاص طور پر بڑھاپا آرام سے گذرے۔ لیکن فکر تونسوی کی طرح اس سلسلے میں نریندر لوتھر کا تجربہ بھی دوسرا ہے۔ مکان کی تعمیر کے بعد صاحب مکان گھر میں داخل ہوتے ہیں۔

"اب آپ ساز و سامان لے کر نئے گھر میں منتقل ہو گئے، لیکن جو شخص اس گھر میں منتقل ہوا ہے، وہ آپ نہیں ہیں کوئی دوسرا آدمی ہے۔ بال پک گئے ہیں، چہرہ اتر گیا ہے عینک لگ گئی ہے، مسکراہٹ غائب ہو گئی ہے، سر میں اکثر درد رہتا ہے، طبیعت میں وہ روانی نہیں، نظریوں میں سنکی پن آ گیا ہے۔ ایک سال کے اندر آپ کی عمر میں دس سال کا فرق پڑ گیا ہے" (نریندر لوتھر۔ مزاح پرے صفحہ ۴۵)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ واقعات یا زبان کے شاطرانہ استعمال سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ یوسف ناظم موقع محل کی مناسبت سے اور اکثر حدِ اعتدال میں ان دونوں سے کام لیتے ہیں۔ وہ روزمرہ زندگی کے کسی چھوٹے سے واقعے یا عام مشاہدے کو تلازمات تعبیروں اور ظریفانہ دلیلوں کے ذریعہ معنی خیز بنا دیتے ہیں۔ طولِ کلام اور ابتذال سے بچ کر لفظوں کی رعایت اور الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرنے کا جیسا ہنر وہ جانتے ہیں وہ اس دور کے کم مزاح نگاروں کے حصے میں آیا ہے "آداب عرض" "دیوار ہے" نام رکھنا اور دوسرے بے شمار مزاحیوں اور خاکوں میں انہوں نے اسی وصف اور تکنیک سے کام لیا ہے۔ وجاہت علی سندیلوی اور بھارت چند کھنہ اپنے اکثر مزاحیوں میں افسانوی اور ڈرامائی طریق کار سے کام لیتے ہیں۔ وہ ہنساتے بھی ہیں چونکاتے بھی ہیں۔ لیکن طنز سے نہیں چوکتے۔ وجاہت علی سندیلوی کے مزاحیہ افسانوں میں افسانہ کی خوبیاں کم سہی، لیکن مزاح اور طنزیہ پیرایہ بیان کی نشتر زنی کم نہیں۔ 'تربوزہ۔ الکشن کا خبط۔ شرافت اور برکت ایک چھینک کی' اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ وہ مخلص بھوپالی اور عبدالمجیب سہالوی کی طرح متوسط طبقہ کی گھریلو زندگی اور رسم و رواج کے فرسودہ اور اچھوتے ہوئے گوشوں سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور زبان کی چاشنی اور چٹخارے سے بھی موج تبسم پیدا کرتے ہیں لیکن مجیب سہالوی جہاں مزاح اور مذاق عام کی ایک خاص سطح سے بلند نہیں ہوتے وہاں یوسف ناظم اور وجاہت علی سندیلوی ہر سطح اور ہر رنگ کی سماجی ناہمواریوں سے لطف و انبساط فراہم کرتے ہیں۔ احمد جمال پاشا کے ہوش و گوش کا دائرہ بھی وسیع ہے۔ ان کے واقعاتی مزاح میں چبھتے ہوئے مکالمے اور فقرے مزہ دے جاتے ہیں۔ مرزا ظاہر دار بیگ اور رستم جیسے مانوس کرداروں کو عصر حاضر کے ہوش ربا حالات میں لا کر انہوں نے طنز و مزاح میں اظہار اور تکنیک کے کچھ کامیاب تجربے کیے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی انفرادیت ان کی ذکاوت زور بیان اور حسن انتخاب۔ تینوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ ہنساتے نہیں۔ پطرس کی طرح ہنسنے کا موڈ اور فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن موجودہ سماج میں انسان کی محرومیاں اور تلخیاں انہیں ہمیشہ آتش زیر پا رکھتی ہیں۔ جو کبھی سندباد جہازی اور کبھی ریلوے وزیر کے سفر اور کبھی انتخابی نعروں کی صورت سامنے آتی ہیں۔

اس دور طنز و مزاح میں خواجہ عبدالغفور کا یہ کارنامہ بھی یادگار رہے گا کہ انہوں نے لطیفہ گوئی کو فن کا درجہ دے دیا۔ خالص مزاح میں انہیں شفیق الرحمن کا جانشین کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ظرافت کی جلوہ صورتوں کا مطالعہ دقت نظر سے کیا ہے، لیکن طبعی مناسبت کی بنا پر ان کا خاص میدان لطیفہ نگاری ہی ٹھہرا۔ نریش کمار شاد مرحوم اور احمد جمال پاشا نے تو صرف اردو شعرا کے یا پھر نصرالدین آفندی کے لطیفے جمع کیے تھے، غفور صاحب کا حافظہ ساری دنیا کے رنگا رنگ لطائف کا نگار خانہ ہے، جنہیں وہ اپنے مزاحیوں میں بہ پابندی سے جڑ دیتے ہیں۔ سردار جعفری نے اسے تہذیب و شرافت کی دلیل کہا ہے کہ وہ دوسروں کو ہنساتے ہیں لیکن ان پر ہنستے نہیں۔ اگر ہمارے طنز نگار تہذیب و شرافت کی اس کسوٹی پر احتجاج کریں تو کم از کم غفور صاحب کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

بقول پروفیسر کلیم الدین بیسوی صدی میں اردو میں طنز و مزاح کا بڑا سرمایہ نظم کے بجائے نثر میں ہی ملتا ہے۔ عصر حاضر میں بھی اگرچہ ظریف شاعر بہت ہیں، لیکن فنی اعتبار سے موثر اور معقول ظریفانہ شاعری کے نمونے خال خال ہی ملتے ہیں۔ یوں ایک بزرگ کا قول ہے کہ آج کے عہد میں اردو میں جو شاعری معرض وجود میں آرہی ہے اس کا بڑا حصہ اگر طنزیہ نہیں تو مزاحیہ شاعری میں ضرور شمار ہوگا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے طنز نگار مثلاً فرقت کاکوری اور یوسف ناظم اسے شاعری ہی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ اس لیے خوف ہے کہ وہ شاعری نہ رہ کر صرف مزاحیہ رہ جائے گی۔ یوں بھی ہماری طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں شاعری کم اور طنز و مزاح زیادہ ہوتا ہے۔ اگرچہ سرحد پار کے بعض شاعروں مثلاً سید محمد جعفری، ضمیر جعفری اور مجید لاہوری نے دونوں میں توازن قائم کرکے اکبر کی روایت کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ آزادی کے بعد ہماری طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں جن ناموں کو اعتبار حاصل ہوا ان میں شاد عارفی کے علاوہ راجہ مہدی علی خاں، فرقت کاکوری اور رضا نقوی واہی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ شاد عارفی مزاجاً ظریف نگار نہیں طنز نگار ہیں۔ ان کی تیکھی غزلوں میں سماج اور سیاست کے مریضانہ حقایق پر بڑی نازک اور لطیف چوٹیں ملتی ہیں۔ گرد و پیش کی عفونت، عیاری اور کھوکھلے پن سے ان کی برہمی اور بیزاری کا اظہار کبھی عوامی محاورہ اور پھکڑپن میں ہوتا ہے، اور کبھی ان کی [illegible]

ہے، یہ چند اشعار دیکھیے۔

ٹھٹھک گیا وہ ٹھہر گیا میں یہ واہمہ بھی عجب بلا ہے
میں اسکو رہزن سمجھ رہا ہوں وہ مجھ کو رہزن سمجھ رہا ہے

عقل بھی سود پر چل رہی ہے
ہیں کوئی چیز اہل ہوس بھی

ہر غلط بات پر بھی ہاتھ اٹھاؤ
یہ نمائندگی نہیں شرماؤ

خشک لب کھیتوں کو پانی چاہیے
کیا کریں گے ابر گوہر بار سے

ان کے عزیز شاگرد مظفر حنفی نے بھی "پانی کی زبان" میں طنز کے اس پیرایہ کو اپنایا ہے۔ ان کے لہجہ میں وہ طرح داری اور تنوع تو نہیں لیکن عصر حاضر میں انسانی جذبات اور اقدار کی بے قدری کا تیکھا اور گہرا احساس ضرور ہے۔ دوسرے شعرا میں مشاہدہ اور موضوعات کا جو تنوع رضا نقوی واہی کے کلام میں ملتا ہے وہ اور کہیں نظر نہیں آتا۔ ان کی نظمیں پست و بلند ضرور ہیں، لیکن بنایت اور بسیار نہیں۔ نوکر شاہی اور لیڈری۔ فیشن اور کرپشن۔ ترقی پسندی اور جدیدیت اور مرغ بازی سے ملا محقق اور مشاعروں تک، الغرض ان کے تجربے اور مشاہدہ کی زد میں جو بھی آجاتا ہے عافیت سے محروم ہوجاتا ہے ان کی وہ نظمیں اور مزاحیہ خطوط نسبتاً زیادہ موثر اور کامیاب ہیں، جن کا مواد انہوں نے اپنے عہد کی شعر و شاعری اور بکھری ہوئی تہذیبی زندگی سے اخذ کیا ہے۔ شعرستان سلسلہ کی نظموں میں انہوں نے اردو شعرا کو جو "ہوم لینڈ" دیا ہے اس میں جدید اردو شاعری کے رنگ و آہنگ، نقالی نقادی گروہ بندی اور فیشن پرستی پر کاری چوٹیں لگائی ہیں۔ انتہا پسندی، شدت، بناوٹ اور یکسانیت سے ان کا احساس برہم اور تخیل برانگیختہ ہوجاتا ہے۔ ان کا یہ گویا شاعر آج کل ہر شاعر میں نظر آجاتا ہے۔ صرف چند اشعار دیکھیے۔

ان سے ملیے آپ ہیں وہ شاعر رنگیں نوا
جن سے بزم شعر کی مرطوب رہتی ہے ہوا
بھیرویں کی دھن میں جس دم دادرا گاتے ہیں آپ
بن کے ساون کی گھٹا محفل پہ چھا جاتے ہیں آپ

انجمن پر ٹوٹ پڑتا ہے سرک کا اژدھام
مصرعِ اوّل کو دو دو بار دہرانے کے بعد
انگلیوں سے تال سُر کا بھاؤ بتلانے کے بعد
لوچ پیدا کر کے قدموں میں تھرک جاتے ہیں آپ
کچھ پھڑک جاتی ہے محفل کچھ پھڑک جاتے ہیں آپ

واہی کے کلام میں موضوعات کے تنوع کے باوجود اسلوبِ اظہار کی یک رنگی کبھی کبھی اکتا دیتی ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن۔

"ان کی شاعری میں لہجے کی یکسانیت پڑھنے والوں کو جلدی تھکا دیتی ہے اور مزاح کی شگفتگی کو بھی مجروح کرتی ہے۔ یہ نقص ان کے دوسرے معاصرین کے کلام میں نظر نہیں آتا۔ دلاور فگار کی نظمیں جتنی موثر اور خندہ آور خود ان کی زبانی نظر آتی ہیں، اتنی کاغذ پر نہیں۔ وہ لفظوں اور نکتوں کے الٹ پھیر سے ظریفانہ صورت پیدا کر لیتے ہیں، لیکن ان کی اکثر نظموں میں فکر و خیال کی وسعت، تازگی اور احساس کی گرمی کم نظر آتی ہے۔ شاعرِ اعظم، عشق کا پرچہ، انٹرویو کے سوالات جیسی نظمیں بھی صرف مشاعروں کو گرماتی ہیں۔ اس کے برعکس راجہ مہدی علی خاں کی نظمیں "ظرافت"، بے ساختگی اور لطف بیان کے ساتھ ساتھ وسیع تر تہذیبی اور نفسیاتی شعور کا پتہ دیتی ہیں۔ ایک بیاہ پر اور دو شرابی" کے علاوہ ان کی متعدد پیروڈیاں اردو کی کامیاب مزاحیہ نظموں میں شمار ہوں گی۔

گذشتہ دو دہوں میں اردو طنز و مزاح میں بہ لحاظ کیفیت اور کمیت فروغ کے جو آثار نظر آتے ہیں اس میں زندہ دلانِ حیدرآباد کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ مزاح نگاروں کی بڑی تعداد اسی ادارہ سے وابستہ رہی ہے۔ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کے کئی اہم مجموعے بھی اسی ادارے نے شائع کیے ہیں، اور گذشتہ سات آٹھ سال سے اس کا ترجمان "شگوفہ"، بھی مصطفےٰ کمال کی زیرِ ادارت پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ جو اردو میں واحد ظریف رسالہ ہے۔ اس سے قبل لکھنؤ سے احمد جمال پاشا نے "اودھ پنچ" جاری کیا تھا۔ جو حقیقت میں اس تاریخ ساز ظریف رسالہ کا تیسرا دور تھا۔ یہ رسالہ زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکا۔ حال ہی میں مزاح نگاروں کی ایک نئی پیڑھی بھی سامنے آئی ہے جن کی تحریریں اردو طنز و مزاح کے روشن مستقبل کی بشارت دے رہی ہیں۔ ان نوجوان ادیبوں میں طالب خوندمیری، مسیح انجم، پرویز اللہ مہدی، سرور جمال اور شفیقہ فرحت کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

مجھے احساس ہو رہا ہے کہ عصرِ حاضر میں اردو طنز و مزاح کے اس مختصر جائزے میں بہت سی کہنے کی باتیں، کہنے سے رہ گئی ہیں جو حقیقت میں زیادہ تفصیلی تجزیہ اور بحث کا تقاضہ کرتی ہیں۔ مثلاً بار بار مجھے احساس ہوا ہے کہ اردو طنز و مزاح میں شہر کے متوسط طبقہ کی زندگی، اس کے مسائل اور ذہنیت کا بے جا تسلط رہا ہے۔ طنز و مزاح کی زبان اگرچہ بوجھل فارسی تراکیب سے آزاد ہو کر سلیس سادہ اور رواں ہو گئی ہے۔ لیکن نثری مزاح، اردو شاعری سے بیش از بیش استفادہ کے رجحان کے زیرِ اثر شعری تلازمات اور شاعرانہ طرزِ بیان سے ابھی تک آزاد نہیں ہو سکا ہے، اس کی دل کشی اور سحرکاری اپنی جگہ لیکن شاید اس نزاکت اور شیشہ گری کا فیضان ہے کہ موجودہ قومی زندگی کی بے شمار مضحک نیرنگیاں اور بے رنگیاں اردو ظرافت میں ایسے بھرپور محاکاتی حسن کے ساتھ نہیں آ سکیں، جس طرح وہ بعض دوسری زبانوں کے مزاحیہ ادب میں منعکس ہو رہی ہیں۔ صدیوں سے ٹھہری ہوئی ہندستانی کی دیہی زندگی میں جو تغیرات ہو رہے ہیں، نئی صنعتی اور سائنسی ترقیوں کی برکتیں مثلاً بجلی، ریڈیو، خودکار آلات ٹیلی ویژن جیسے جیسے گاؤں میں پہنچ رہے ہیں، ان کی جامد و ساکت زندگی کی سطح پر بھی نئی لہریں اُٹھ رہی ہیں۔ یہ لہریں بھی شوخیِ فکر اور مضحک رویوں سے خالی نہیں جس معاشرہ میں تبدیلی اور ترقی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے وہاں بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کا حجم بھی بڑھ جاتا ہے۔ آخر ہماری ظرافت ان کی شفا بخش تازگی اور توانائی سے کیوں محروم رہے! پھر ان محنت کش انسانوں کی زندگی، زبان، میلوں، تہواروں اور ان کے عوامی قصوں میں بھی جاندار ظرافت کے لامحدود امکانات موجود ہیں اگر ہم اس سے فیض نہ اٹھا سکے اسے اپنے ادب کا ایک حصہ نہ بنا سکے تو اس میں ان کا نہیں ہمارا ہی زیاں ہے۔ دکنی یعنی قدیم اردو میں جو جدید مزاحیہ شاعری ہو رہی ہے یا ہوئی ہے اس میں اس کمی یا کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ان شعرا

سے اگر ایک طرف انہوں نے یہاں کی دکنی زبان لہجہ اور محاورہ سے فائدہ اٹھایا ہے، تو دوسری طرف عوامی تہذیب، ماحول اساطیری علامتوں اور ان کے مذاق و فکر کی تازہ جولانیوں سے بھی رنگ اڑایا ہے۔ سرور ڈنڈا (مرحوم) حمایت اللہ اور سلیمان خطیب کی طنزیہ مزاحیہ شاعری میں جو فرحت بخش تازگی ہے، اس سے اردو ظرافت کا دامن بڑی حد تک خالی نظر آتا ہے۔ حالانکہ جعفر زٹلی اور نظیر اکبرآبادی سے اکبر اودھ پنچ اور پریم چند تک بروایت کسی نہ کسی صورت میں زندہ رہی ہے۔

ایک مشکل یہ ہے کہ اردو کے بیشتر ادیب طنز و مزاح کے لیے انشائیہ یا خاکے کا انتخاب کرتے آئے ہیں۔ بلاشبہ (سرشار اور کرشن چندر کی تصانیف سے قطع نظر) اردو ادب میں اعلا درجہ کی ظرافت انشائیوں اور خاکوں کی صورت ہی میں ملتی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان کی اپنی حدود اور پابندیاں ہیں۔ یہاں ہر بات ذاتی مشاہدات اور شخصی تاثرات کے رشتے سے بندھی ہوتی ہے۔ زندگی کے متناقض حقایق کا اظہار اکثر شرح و بسط کے بجائے اشاروں، کنایوں میں کیا جاتا ہے جہاں الفاظ کی شعبدہ بازی زیادہ اہمیت اختیار کرلیتی ہے۔ ذاتی عنصر کی بنا پر اس خلاقانہ معروضیت اور تخیل آزادروی کی گنجائش بھی یہاں کم ہوتی ہے، جن کی تحریر اور تاثیر سے تجربات تخلیقی فن پارہ کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ جہاں ایسے جاندار کردار اور ایسی متحرک تصویریں جنم لیتی ہیں جو ذہن و تخیل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ اردو کے ادیب کسی بڑے تمثیلی کینوس پر ڈراما یا قصے کی صورت میں سماجی نظام کی مضحک ناہمواریوں کے شعبدے دکھانے سے گریز کرتے ہیں۔ حالانکہ یہاں مبالغہ کے ذریعے جو ظرافت کا بڑا کارگر حربہ ہے، پرچھائیں کو آسیب اور آسیب کو پرچھائیں بنانے کی بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اسی وادی میں سماجی فکر تخیلی قوت اور تخلیقی ہنر کی آزمائش بھی ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک سبب ہے کہ اردو طنز و مزاح کا بڑا سرمایہ تخلیقی ادب کی اعلا سطح تک پہونچنے سے قاصر رہتا ہے۔

تنقیدی تناظر — ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ — ۱۹۷۸

پروفیسر گوپی چند نارنگ



اُردو رسم خط بدیسی نہیں

یہ کلیدی خطبہ چنڈی گڑھ میں ہوئی عالمی اردو کانفرنس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے پیش کیا۔ اس خط میں اردو کی ابتدا سے لے کر اس کے اہم آواز حروف کا احاطہ کرتے ہوئے اس کے رسم خط کی انفرادیت و اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اُردو کی زلف گرہ گیر کے ہم سب اسیر ہیں۔ اردو کے حسن وخوبی کا تذکرہ کون نہیں کرتا۔ اس کے لطف وتاثیر، شیرینی اور دل نشینی کی کشش کون محسوس نہیں کرتا، کون نہیں جانتا کہ اردو ہندستان کی بلکہ اس برصغیر کی یا جنوبی ایشیا کی ایسی زبان ہے جس میں اخذ وقبول کا حیرت انگیز ملکہ ہے، اور جس کا دامن طرح طرح کے پھول سے بھرا ہے۔ اور جس کی جادو اثری میں شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق عربی تینوں کا ہاتھ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اردو نے ہند آریائی کا دودھ پیا ہے اور اس دھرتی پر پلی بڑھی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جب نئی تاریخی حقیقتیں ابھرتی ہیں تو نئے سماجی تقاضے پیدا ہوتے ہیں۔ اور نئی سچائیاں وجود میں آتی ہیں۔ اردو ایسی ہی ایک سچائی ہے۔ لسانی، سماجی اور تہذیبی سچائی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے سابقے اور اختلاط و ارتباط سے وجود میں آئی۔ اس وقت اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ کوئی بھی سچائی جب جنم لیتی ہے۔ اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ سچائیوں کو نام تو اس وقت ملتا ہے۔ جب وہ خانہ زاد ہو جاتی ہیں۔ پراکرتوں کی دھرتی سے جب نیا اکھوا پھوٹا اور اس میں عربی، فارسی ترکی اثرات کا پیوند لگا۔ تو اس کا کوئی بھی نام نہیں تھا۔ ہند یعنی ہندستان کی ہر چیز ہندی تھی۔ فارسی یائے نسبتی کے ساتھ اس طرح ہر زبان ہندی تھی۔ امیر خسرو نے اسے ہندوی بھی کہا اور دہلوی بھی۔ اس زمانے میں جب راگ رنگ کی محفلوں میں اس کے نغمے سماں باندھنے لگے تو اسے ریختہ بھی کہا گیا۔ دکن اور گجرات پہنچی تو دکنی اور گجراتی کہلائی۔ پھر کسی نے اردو کہا، کسی نے ہندی کسی نے کھڑی۔ بنیاد وہی ایک راہیں الگ الگ ہو گئیں نام سے کیا ہوتا ہے۔ لیکن یہاں نام ہی سے فاصلے بڑھے اور دوریاں ہوتی گئیں۔ اس امر کے تسلیم کرنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو۔ کہ اردو زبان ہماری پچھلی کئی صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے۔ ایسی کمائی جس سے کوئی انصاف پسند نظر نہیں چرا سکتا۔ اردو کو محض ادب کہنا، اسے محض ایک زبان کہنا اسے آٹھویں شیڈول کی درجہ بندی تک محدود رکھنا اردو کے ساتھ بے انصافی ہی نہیں، پوری ہندستانی تہذیب۔ ایک ہزار برس کی تاریخ باہمی میل ملاپ اور نئے ہندستان اور اس کی تعمیر کے خوابوں اور امنگوں اور امیدوں اور ولولوں کی توہین بھی ہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اردو جینے کا سلیقہ، سوچنے کا ایک طریقہ بھی ہے اردو محض زبان نہیں ایک طرز زندگی ایک اسلوب زیست بھی ہے اور مشترکہ تہذیب کا وہ ہاتھ بھی جس نے ہمیں گھڑا بنایا اور سنورا ہے اور وہ شکل دی ہے جسے ہم آج اپنی پہچان کی ایک منزل سمجھتے ہیں۔ درباروں سے اردو کا رشتہ بڑا معنی خیز ہے۔ اردو نے درباروں سے نہیں بلکہ خود درباروں نے اردو سے رشتہ پیدا کیا اردو اصلاً بازاروں، گلیوں، کوچوں، میلوں ٹھیلوں، جوگیوں، سنتوں فقیروں اور صوفیوں کی زبان ہے۔ ان ہی فقیروں سنتوں، اور صوفیوں نے اسے قریہ قریہ اور شہر شہر پھیلایا اور سورج کی کرنوں کی طرح یہ جہاں جہاں پہنچی، آنکھوں میں بستی اور دلوں کو شاداب

کرتی گئی۔ اس کی پشت پر ہمیشہ انسان دوستی، وسیع النظری اور محبت ویگانگت کا وہ تصور رہا جس سے قومیں عروج پاتی ہیں۔ اور تاریخ میں ان کے کارناموں کے نقش جگمگاتے رہتے ہیں۔ یہی وہ زبان ہے جس کی ملتی جلتی شکلوں میں بھگتوں، سنتوں اور صوفیوں نے توحید کے ترانے گائے۔ خواجہ معین الدین اجمیری چشتی ہوں یا حضرت بابا فرید الدین گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیاء ہوں یا خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، راما نند ہوں یا تکارام، کبیر ہوں یا نانک، سیکڑوں صوفیوں سنتوں اور اولیاء اللہ نے اس زبان کے سر پر شفقت اور دعا کا ہاتھ رکھا، اور مذہبوں کی ظاہرداری سے ہٹ کر باطنیت کے جوہر کو دیکھا۔ اور روحانیت اور سچی انسانیت کے پیغام سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دلوں کو آباد کیا۔ حضرت نظام الدین اولیاء سے منسوب وہ روایت کس نے نہیں سنی کہ ایک دن جمنا کے کنارے وہ چھت پر موجود تھے نیچے کچھ ہندو اپنے طریقے سے پوجا پاٹھ کر رہے تھے۔ معاً یہ مصرع زبان سے نکلا ؎

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

انسانیت اور رواداری کا یہ وہ درس ہے جس سے اردو کا مے خانہ ہمیشہ آباد رہا ہے صدیوں کے اس تاریخی عمل میں جب کوئی محمد قلی قطب شاہ کہتا ہے۔

میں نہ جانوں کعبہ و بت خانہ و مے خانہ کوں
دیکھیا ہوں ہر کہاں دستا ہے تجھ مکھ کا صفا

یا جب کوئی میر کہتا ہے۔

دیر و حرم کو دیکھا اللہ رے فضولی
یہ کیا ضرور تھا جب دل سا مکان بنایا

گوش کو ہوش کے ٹک کھول کے سن شورِ جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک

یا جس زبان میں غالب نے اعلان کیا ہو!

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

چنانچہ اس زبان کی انسان دوستی کے پیچھے صدیوں کا جو فشار ہے اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس غلط فہمی کو اب دور ہونا چاہیے کہ اردو عربی فارسی کا نقلِ ثانی ہے یا اس کی اپنی کوئی آزادانہ حیثیت نہیں، اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اردو ہند آریائی زبان ہے۔ اور ہندی سے اس کا اٹوٹ رشتہ ہے، یہ اگر صحیح ہے تو اردو کسی بھی دوسری زبان کا نقشِ ثانی کیسے ہو سکتی ہے اردو لفظیات کا بمشکل ایک تہائی حصہ فارسی، عربی، ترکی سے مستعار ہے، لیکن ان لفظوں کو بھی اردو نے کس طرح اپنی خراد پر اتارا اور کس طرح انہیں اپنایا اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ تہنید اور تارید کا یہ عمل صرف آوازوں کے ساتھ ہی نہیں ہوا ہے لفظوں اور ترکیبوں کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ طوالت کے خوف سے صرف ایک مثال دی جائے گی۔ اردو میں ذ، ز، ض، ظ، چار الگ حروف ہیں۔ لیکن آواز ایک رہ گئی ہے۔ عربی میں ان چار حروفوں کی چار مختلف آوازیں ہیں۔ اردو میں یہ سب آوازیں ایک ہو گئیں ایسا کئی دوسرے حروف کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ جن کی نوعیت یکسر بدل گئی ہے۔ یہ سب اردو والوں کے ہندوستانی عمل کا کرشمہ ہے۔ ایسا گرامر میں بھی ہوا ہے۔ مثلاً ہم امیر، وزیر، فقیر کی جمع امیروں، وزیروں، فقیروں یعنی ہندی طریقے سے بناتے ہیں۔ اور ان کی مستعار جمع امرا، وزرا، فقرا، بھی استعمال میں لاتے ہیں لیکن ہر عربی فارسی لفظ پر اس قاعدے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ مثلاً صندوق عربی لفظ ہے لیکن اس کی عربی جمع صنادیق ہم استعمال نہیں کرتے اور ہمیشہ ہندی صندوقوں ہی لکھتے ہیں۔ اسی طرح شمس عربی میں مؤنث ہے اسے اردو میں ہندی سورج کی وضع پر مذکر بولا جاتا ہے۔ ہند یانے کے عمل کا اثر گرامر کے علاوہ معنی کی تبدیلیوں پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً امیر کے اصل معنی حاکم یا سردار کے تھے۔ اور غریب کے اجنبی کے، ہم ان لفظوں کو روپیہ پیسے والے اور بغیر پیسے والے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں خفا کے معنی گلا گھونٹنا ہیں، ہم ناراض ہونا کے لیے بولتے ہیں۔ تیغ ہمارے یہاں تلوار ہے، اور ایران میں استرے کے معنی میں رہ گیا ہے سید سلیمان ندوی نے ایک پرلطف مثال "ظریف و متین" کی پیش کی ہے۔ ظریف ہم اس شخص کو کہتے ہیں جس کی طبیعت میں مذاق ہو، متین ہم سنجیدہ آدمی کو کہتے ہیں۔ لیکن ایک ترکی اخبار میں سید سلیمان ندوی نے ایک جوتا بیچنے والے کا اشتہار دیکھا۔ جو کہتا تھا

کہ اس کے جوتے "ظریف و متین" ہیں۔ تو کیا اس کا مطلب تھا کہ جوتے مذاق بھی کریں گے اور متانت سے بھی پیش آئیں گے۔ نہیں وہ تو اعلان کر رہا تھا کہ اس کے جوتے "ظریف" یہ معنی خوبصورت بھی ہیں۔ اور "متین" یعنی مضبوط بھی آپ نے دیکھا اردو میں ان لفظوں کے معنی کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے۔ کہ اردو نے دیسی اور بدیسی عناصر میں جیسا اعتدال پیدا کیا ہے اس کی نظیر دوسری زبانوں میں آسانی سے نہیں ملتی صرف روزمرہ ہی کو لیجیے۔ آتش آگ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن "چولہے میں آتش جلا دو" اردو میں کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اردو روزمرہ کی رو سے یہ غلط محض ہے۔ اردو میں ہمیشہ "چولھے میں آگ جلا دو" کہا جائے گا۔ اگر دیسی یعنی ہندی لفظ کا محل ہے تو ہندی لفظ ہی استعمال ہوگا۔ عربی فارسی لفظ اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ یہ اردو کی خوش امتزاجی کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ مثلاً

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

میں لفظ آگ استعمال ہوا ہے۔ اور

دہکا ہوا تھا آتشِ گل سے چمن تمام

میں لفظ آتش ایک کی جگہ پر دوسرے کا استعمال، قطع نظر بحر کی ضرورتوں کے، ممکن ہی نہیں۔ اردو اس معاملے میں مستعار اور ہندی لفظوں سے برابر کا سلوک کرتی ہے۔ اور جہاں جس کا محل ہوتا ہے اسے استعمال کرتی ہے۔ اردو کی یہ خوش مذاقی لسانی انصاف و اعتدال پر مبنی ہے اور معمولی بات نہیں۔

اب مختصراً ایک نظر اردو رسم خط پر بھی ڈالی جائے۔ کیونکہ بہت سی غلط فہمیاں رسم خط کی وجہ سے پھیلائی جاتی ہیں۔ اردو رسم خط میں چھتیس حروف ہیں، چودہ ہکار اور معکوس آوازیں ہیں۔ ان کی وجہ سے اردو رسم خط میں جو کایا پلٹ ہوئی ہے۔ وہ معمولی نہیں یعنی اردو رسم خط میں ایک تہائی سے بھی زیادہ حروف کا اضافہ اردو کی ہندی آریائی ضرورتوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ اردو بولتے لکھتے ہوئے ان آوازوں سے ہم بچ نہیں سکتے لب و لہجہ، لفظوں کے بل اور سر لہروں کا اضافہ ان سے الگ ہے۔ غرض اس رسم کی جو ہم نے صدیوں سے پہلے اردو کے لیے لے لیا تھا اردوانے کے عمل کے دوران اتنی کایا پلٹ ہو چکی ہے کہ نہ صرف اس کی اصل آوازوں میں سے بہت سوں کو ہم نے بدل دیا ہے بلکہ اس میں ایسی ایسی آوازوں اور علامتوں کا اضافہ بھی ہو چکا ہے جو نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں یہ حقیقت ہے کہ اردو کا ایک صفحہ تو کیا ایک پیراگراف بھی تو ان آوازوں کے بغیر لکھا نہیں جا سکتا۔ مثال کے طور پر کسی اردو اخبار یا اردو کتاب کا ایک صفحہ بھی اگر کسی ایرانی یا عرب کے سامنے رکھا جائے تو وہ اسے صحیح نہیں پڑھ سکے گا۔ اس سے انکار نہیں کہ اس رسم خط کو ہم نے عربی فارسی سے لیا ہے۔ اور مشرق وسطیٰ سے ہمارے ثقافتی رشتوں میں اس رسم خط سے مدد ملتی ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ یہ رسم خط اردوائے جانے کے دوران تنسیخ و توسیع کے زبردست نامیاتی عمل سے گزر چکا ہے اور خاصی حد تک بدل چکا ہے۔ چنانچہ اب اس کو بدیسی کہنا اور اس کی بنا پر اردو اور ہندی کی خلیج کو وسیع کرنا کہاں کی انصاف پسندی اور دانش مندی ہے۔ یہ رسم خط اب اردو کا رسم خط ہے اور جس طرح دوسری ہندوستانی زبانوں کے اپنے اپنے رسم خط ہیں، اور وہ ہمارے رسم خط ہیں اردو رسم خط بھی ہمارا اپنا رسم خط ہے۔

ایک ایسی زبان جو ہندوستانی زبان ہے، جو ہندوستان میں پلی بڑھی، اور جس کا ہماری قومی زبان ہندی سے سگی بہن کا رشتہ ہے ظاہر ہے کہ اس کے حقوق ایک سچی جمہوریت میں زیادہ دنوں تک نظرانداز نہیں کیے جا سکتے ہندوستان اپنی اس بیش بہا لسانی اور تہذیبی دولت سے ہرگز منہ نہیں موڑ سکتا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوسری علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ کیسے دیا جائے۔ یہ بات معلوم ہے کہ اردو والے ہندوستان کے کسی صوبے میں لسانی اکثریت میں نہیں جموں و کشمیر میں اگرچہ اردو پہلی سرکاری زبان ہے لیکن ایسا ثقافتی وجوہ سے ہے ورنہ وہاں کی فطری زبانیں کشمیری، ڈوگری، لداخی، شنا، دلدری وغیرہ ہیں۔ باقی ریاستیں جہاں اردو کا چلن ہے دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جہاں اردو کا چلن ہندی کے ساتھ ہے۔ اور جہاں اردو کی مخالفت کا جذبہ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے دوسری طرح کی ریاستیں وہ ہیں۔ جو غیر ہندی ریاستیں ہیں۔ اور جہاں اردو کا چلن دوسری علاقائی زبانوں کے ساتھ ہے۔ پہلی طرح کی ریاستوں میں اتر پردیش بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور ہریانہ کو شامل سمجھنا چاہیے۔

دوسری طرح کی ریاستوں میں بنگال، آندھرا پردیش، گجرات کرناٹک، مہاراشٹر، ہماچل وغیرہ شامل ہیں۔ ہندی ریاستوں میں بہار نے اپنے آفیشل لنگویج ایکٹ میں ترمیم کرکے بعض اضلاع میں خاص خاص کاموں کے لیے اردو کو دوسری زبان کا درجہ دیا ہے۔ اتر پردیش میں بھی حال ہی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں کابینہ کے فیصلے کا اعلان کیا ہے۔ اور امید ہے کہ جلد سرکاری بل میں ترمیم کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔ غیر ہندی ریاستوں میں اردو کے مسائل نسبتاً کم ہیں۔

آندھرا پردیش اور ہماچل کے بارے میں معلوم ہے کہ دوسری زبان کی حیثیت سے اردو کے لیے قانونی تحفظ موجود ہے۔ حال ہی میں حکومت بنگال نے بھی اسی نوعیت کی مراعات کا اعلان کیا ہے لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسکولوں میں اردو کی تعلیم کیسے ہو! ہماری دقتیں صرف ایک زبان پڑھا دینے سے دور نہیں ہو جائیں گی۔ ہماری مشکل تو یہ ہے کہ اسکولوں میں بچوں کو اردو پڑھانے کا موقع بھی ملے اور ہمارے طلبا ہندستانی شہری کی طرح دوسری زبانوں کے طلبا کے دوش بدوش کھڑے بھی ہو سکیں ہندستان ایک کثیر لسانی MULTILINGUAL ملک ہے اردو کے مسئلے کو بھی اس لسانی رنگارنگی کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ سہ لسانی فارمولے کا نفاذ کثیر لسانی سماج کے انھیں تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ مختلف ریاستوں میں اس عمل درآمد کی جو صورتیں سامنے آئی ہیں۔ وہ اقلیتی زبانوں کے لیے شدید طور پر نقصان دہ ہے۔ مثال کے طور پر ہندی ریاستوں میں انگریزی اور ہندی کے علاوہ اس فارمولے میں دوسری یا تیسری زبان کے طور پر سنسکرت کو شامل کر لیا گیا۔ اور اردو کو دیس نکالا مل گیا۔ ہم سنسکرت کا احترام کرتے ہیں۔ اور یقیناً چاہتے ہیں کہ سنسکرت کے لیے بھی تعلیمی سہولتیں ہونی چاہییں لیکن ایسا جدید مادری زبانوں یا اقلیتی زبانوں کی قیمت پر نہیں ہونا چاہیے۔ سنسکرت کو سہ لسانی فارمولہ سے ہٹ کر ایک اختیاری کلاسیکی زبان کے طور پر پڑھانا کہیں زیادہ مفید ہوگا۔ عربی، فارسی، اور بعض یوروپی کلاسیکی زبانوں کی تعلیم کو بھی اسی سطح پر رکھا جا سکتا ہے۔ این سی ای آر ٹی کے ایک سروے کے مطابق ہندستان کے اسکولوں میں اسوقت ۶۷ زبانوں کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ ہندی علاقوں میں —— اگر اردو تعلیم کا انتظام ہو جائے تو سہ لسانی فارمولے کی ایک شکل یہ ہو سکتی ہے کہ پہلی زبان اردو، دوسری زبان ہندی اور تیسری زبان انگریزی ہوگی۔ اس کے برعکس وہ بچے جن کی مادری زبان ہندی ہے۔ پہلی زبان کے طور پر ہندی دوسری زبان کے طور پر اردو یا کوئی بھی دوسری ہندستانی علاقائی زبان اور تیسری زبان کے طور پر انگریزی پڑھ سکیں گے۔ اردو والوں یا لسانی اقلیتوں کا مسئلہ غیر ہندی علاقوں میں اور بھی پیچیدہ ہے۔ مثال کے طور پر جو طلبا بنگال یا آندھرا پردیش یا کرناٹک یا گجرات یا مہاراشٹر میں زیر تعلیم ہیں کیا ہم چاہیں گے کہ وہ فوری لسانی ماحول کی زبان یعنی بنگال میں بنگالی آندھرا میں تیلگو، کرناٹک میں کنڑ، گجرات میں گجراتی، یا مہاراشٹر میں مراٹھی، کی تعلیم سے محروم رہیں؟ لامحالہ اس صورت میں پہلی زبان یعنی مادری زبان اردو ہوگی۔ دوسری زبان بنگالی، تیلگو، کنڑ، گجراتی، یا مراٹھی ہوگی کیونکہ ہو سکتا ہے آگے چل کر طالب علم اس ریاست میں ملازم ہو، جہاں اس کے لیے سرکاری علاقائی زبان کا جاننا ضروری ہوگا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ تیسری زبان کے طور پر لسانی اقلیتوں کے طلبا قومی زبان ہندی پڑھیں یا بین اقوامی زبان انگریزی کو۔ کیا واقعی ان دونوں میں سے ایک کو دوسری پر ترجیح دینا مناسب ہوگا۔ چنانچہ اکثر ماہرین کا خیال ہے کہ سہ لسانی فارمولے کی شکل غیر ہندی علاقوں میں چار لسانی فارمولے کی سی ہو جاتی ہے۔ بہرحال اس سلسلے کی مزید باریکیوں میں جانے کا یہ موقع نہیں اس بار اردو کانفرس کا مطالبہ یہ ہونا چاہیے کہ سہ لسانی فارمولے پر اردو تعلیم کے نقطۂ نظر سے از سر نو غور کیا جائے اور تمام ریاستوں کو مناسب ہدایات جاری کی جائیں۔ نیز جہاں جہاں آفیشل لنگویج ایکٹ میں اردو کے لیے گنجائش نہیں ہے وہاں ایکٹ میں مناسب ترمیم کے ذریعے اردو کے قانونی تحفظ کی ضمانت دی جائے۔ قانونی تحفظ سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اردو کو ایک سماجی اور قومی حیثیت ملے گی یعنی اردو والے اپنے ملک میں رہتے ہوئے یا اپنے گھر میں رہتے ہوئے خود کو بے گھر نہیں سمجھیں گے تہذیبی شناخت کی سب سے بڑی نشانی زبان ہے۔ زبان کو حق نہ ملے تو پوری نسلیں بے چہرہ برباد اور بے نشان ہو جاتی ہیں۔ اپنے چہرے کی شناخت ہو جائے تو پھر دوسرے چہروں کی شناخت کا عمل آسان ہو جاتا ہے۔ عزت سے عزت اور اعتماد سے اعتماد

(بقیہ ص ۲۳۷ پر)

شمس الرحمٰن فاروقی

جدید ادبی تنقید

تنقید کیا ہے؟ اس سوال کا جواب شاید بہت تشفی بخش نہ ہو. لیکن تنقید کیا نہیں ہے؟ کا جواب یقیناً تشفی بخش اور بڑی حد تک قطعی ہو سکتا ہے۔ تنقید عمومی اور سرسری اظہار رائے نہیں ہے۔ غیر قطعی اور گول مال بات کہنا نقاد کے منصب کے منافی ہے۔ تنقید کا مقصد معلومات میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ علم میں اضافہ کرنا ہے۔ یہاں یہ سوال اُٹھ سکتا ہے کہ علم سے کیا مراد ہے؟ اگر علم سے مراد وہ فلسفیانہ اصطلاح ہے جس کی رُو سے علم وہی ہے جسے کسی نہ کسی طرح ثابت کیا جا سکتا ہو تو تنقید اس قسم کا علم نہیں عطا کرتی۔ وہ علم بھی جسے فلسفے میں علم اولین (APRIORI KNOWLEDGE) کہا جاتا ہے، تجزیاتی فلسفے کے نزدیک مشکوک ہے کیوں کہ اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے ریاضیاتی حقائق جو مفروضہ ہیں یعنی جنھیں (AXIOM) کہا جاتا ہے، اسی قسم کا علم ہیں جن کا کوئی ثبوت نہیں۔ لیکن علم سے مراد یہ بھی ہے کہ کسی شے کے بارے میں آگاہی حاصل ہو۔ آگاہی حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے اس چیز کو بیان کرنا ضروری ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کسی چیز کا صحیح بیان اس کی صحیح آگاہی فراہم کرتا ہے۔ یہ مسئلہ بھی اُٹھ سکتا ہے کہ کیا کوئی بیان ایسا بھی ممکن ہے جس میں تعیّن قدر یعنی موضوعی معیار کا کوئی شائبہ نہ ہو؟ ظاہر ہے کہ خالص بیانیہ بیان ممکن نہیں ہے اور ہر بیان میں تھوڑی بہت تعیّنِ قدر شامل ہوتی ہے۔ لیکن تنقیدی بیان کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں تعیّنِ قدر موضوعی نہیں ہوتی بلکہ حتی الامکان معروضی ہوتی ہے۔ ادبی تنقید خارجی دنیا کے بارے میں خالص علم نہیں عطا کرتی (کیوں کہ یہ شاید کسی بھی علم یا فن کے لیے ممکن نہیں ہے) لیکن یہ دو کام کرتی ہے۔ اول تو یہ خارجی دنیا کے اہم ترین مظہر یعنی ادب کو بیان کرنے کے لیے ایسے الفاظ تلاش کرتی ہے جن کا استعمال درستی اور صحت بیان کے لیے ناگزیر ہو. اس لیے کہ جو الفاظ ناگزیر ہوں گے اُن میں حقیقت کا شائبہ یقیناً ہوگا، کیوں کہ ہر وہ لفظ جسے نظر انداز کیا جا سکے یا جس کی ضرورت ایسی نہ ہو کہ اس کو پسِ پشت ڈالنا ممکن ہو. یقیناً اس شے سے نزدیک ترین تعلق نہ رکھتا ہوگا جسے بیان کیا جا رہا ہے۔ دوسرا کام تنقید یہ کرتی ہے کہ صحیح ترین بیان کی تلاش کے ذریعے ایسے اصول دریافت یا مرتب کرتی ہے جس کی روشنی میں صحیح ترین بیان تک پہونچنے میں مدد ملتی ہے۔ پہلا کام عملی تنقید اور دوسرا نظریاتی تنقید کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ لیکن اکثر یہ دونوں کام ساتھ ساتھ ہوتے رہتے ہیں۔

مندرجہ بالا خیالات کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہماری بیشتر ادبی تنقید افسوس ناک حد تک ژولیدہ فکری اور چھچھلے پن کا شکار نظر آتی ہے۔ وٹ گنشٹائن نے ایک بار برٹرنڈ رسل کے بارے میں کہا تھا کہ رسل نے فلسفہ اس لیے ترک کر دیا کہ اس کے پاس مسائل کا فقدان ہو گیا تھا. یہ اس نے اس معنی میں کہا کہ جتنے بھی مسائل خارجی دنیا کے علم کے بارے میں ممکن تھے، رسل نے ان سب کو جانچ پرکھ ڈالا تھا اور اب ایسے مسائل باقی ہی نہ تھے جن پر وہ اپنا زور صرف کرتا۔ آج کی اردو تنقید پر بھی یہ قول صادق آتا ہے لیکن الٹے معنوں میں۔ یعنی یہاں مسائل کا فقدان اس لیے نہیں ہے کہ سارے سوالات پر بحث ہو چکی، بلکہ اس لیے ہے کہ سوالات اٹھائے ہی نہیں گئے۔ گوپال متل صاحب نے ایک انٹرویو میں کہا کہ اردو میں کوئی نقاد ہی نہیں ہے۔ عظیم نقاد کی بحث کیا معنی رکھتی ہے؟ اس پر ایک صاحب نے مجھے خط لکھ کر پوچھا کہ بطور نقاد میں نے اس فیصلے کا

بہار اردو اکیڈمی کی مالی امداد سے شائع ہونے والی کتابیں

(ناول اور ڈرامے)

کتاب	مصنف	قیمت
ملالہ	جناب شین مظفر پوری	۴/-
تصور اور تصویر	〃 اعجاز شاہین	۵/-
کاجل اور آنسو	〃 معین شاہد	۵/-
شکست آرزو	〃 〃	۱۰/-
اعتراف	〃 شبیر احمد	۱۰/-
نیا کا ورق	〃 ظفر اوگانوی	۱۰/-
روشنائی کی کشتیاں	〃 احمد یوسف	۱۲/-
شاخ لہو	〃 شفیع مشہدی	۱۳/-
لہو کے مول	مسز شکیلہ اختر	۷/۵۰
مدد دراہوں کے مسافر	جناب رضوان احمد	۱۰/-
آدمی	〃 الیاس احمد گدی	۱۲/-
پرندہ پکڑنے والی گاڑی	〃 غیاث احمد گدی	۱۲/-
اپنی آہٹیں	〃 عظیم اقبال	۱۰/-
دائرے سے باہر	〃 شفیع جاوید	۱۵/-
کرچیاں	〃 شمیم صادقہ	۵/-
امید کی ڈوبتی لہریں	جناب حشمت ظہیر	۱۰/-
آگ کے ہمسایے	〃 احمد یوسف	۱۵/-
ساگر اور لہریں	〃 ڈاکٹر ظہیر احسن	۹/۵۰
اسلحہ اور انسان	آرمس اینڈ دی مین کا ترجمہ) الیاس یوسف	۱۲/-
شاہی کنیز	〃 رحمان حمیدی	۱۰/-
بارہ رنگوں والا کمرہ	〃 عبدالصمد	۱۵/-
میں نہیں کہہ سکتا	〃 م۔ق۔ خاں	۱۵/-
آدھی مسکراہٹ	〃 شین مظفر پوری	۱۸/-
اپنی آگ	〃 شاکر کریمی	۱۸/-
ایک ورق	〃 شمیم سیفی	۲۰/-
یونی نغ	〃 تاج انور	۱۰/-
پس پردۂ شب	〃 حسین الحق	۱۲/-
میں کیا کروں	〃 شہاب دائروی	۲۶/-

کتاب	مصنف	قیمت
نظمی گونی (یونانی شاعر سوفوکلیس کے ڈرامہ کا اردو منظوم ترجمہ)	محمد سمیع الحق	۱۰/-
مقالات سلطان احمد (تحقیقی، تنقیدی، لسانیات)	ڈاکٹر عبدالخالق	۱۰/-
بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۲۵/-
ادبی قدروں کی تشکیل جدید	پروفیسر عبدالمغنی	۲۶/-
بہار میں اردو سوانح نگاری کا آغاز	ڈاکٹر عبدالواسع	۲۶/-
آثار اثر	ڈاکٹر اختر قادری	۲۵/-
اردو ڈرامہ	ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی	۷/-
افکار و اقدار	جناب طیب عثمانی	۱۲/-
مثنوی کا فن اور اردو مثنویاں	نجم الہدیٰ	۱۰/-
غور و فکر	〃 طلحہ رضوی برق	۱۵/-
معنی کی تلاش	〃 ڈاکٹر وہاب اشرفی	۲۰/-
ذکر شاد	〃 پروفیسر عبدالمنان بیدل	۶/-
اردو ڈرامہ اور بہار کا اسٹیج	〃 پروفیسر سید حسن	۲۰/-
تذکرۂ شعرائے منیر شریف	〃 شاہ مراد اللہ منیری	
نقد آزاد	〃 احمد حسین آزاد	۱۶/۵۰
راجندر سنگھ بیدی شخصیت اور فن	ڈاکٹر نثار مصطفےٰ	۲۵/-
اردو و قومی ایکتا (لسانیات)	جناب قیوم خضر	۱۰/-
زبان کے روپ (〃)	〃 ڈاکٹر حسن امام	۲۲/-
آثار و افکار	〃 ڈاکٹر عبدالخالق	۲۵/-
سحر العروض	〃 منظور تسکین	۶/۵۰
دیوان مہدی بخش تسلیم	〃 ڈاکٹر حمیرا خالوق	۳۰/-
الشرف (تحقیق)	〃 ڈاکٹر محمد طیب ابدالی	۲۰/-
بہار میں اردو نثر کا ارتقاء (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء)	ڈاکٹر مظفر اقبال	۵۰/-
تاریخ اطبائے بہار (تحقیق)	حکیم محمد اسرار الحق	۱۲/-
شہباز۔ بہار میں نظم جدید کا بانی (تحقیق و تنقید)	ایس ایم فضل اللہ	۱۶/-
ایران عہد قدیم کی سیاسی ثقافتی و لسانی تاریخ	تصنیف ڈاکٹر محمد عالم	۳۲/-
صد رنگ آنچل (متفرقات، مضامین)	مناظر عاشق ہرگانوی	۲۰/-
یادیار مہربان (سوانحی خاکے)	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	۲۰/-

بہار اردو اکیڈمی کی اپنی مطبوعات

کتاب	قیمت
کلیات شاد حصہ اول و دوم مرتبہ کلیم الدین احمد	۱۰۰/-
۲۔ دیوان جوشش 〃	۲۵/-
مقالات قاضی عبدالودود	۳۰/-
رقص شرر (اسلم عظیم آبادی کا منتخب کلام) 〃	۱۰/-
دیوان سجاد اکبر آبادی مرتبہ شمیم احمد	۱۰/-
کلیات منتظر (سلمان شمس ندوی)	۷/۵۰
اختر اور نیوی کے افسانے، عبدالمغنی	۱۵/-
بہار کے نظم نگار شعراء، قمر اعظم ہاشمی	۲۰/-
ودیاپتی۔ حیات اور شاعری، شمیم احمد صدیقی	۱۰/-
سوانح عمری مولانا آزاد، مشتاق احمد	۱۰/-
سیل آتش (عزیز عظیم آبادی کی رباعیات کا مجموعہ)	۱۲/-
ذکر حیات اور شاعری خواجہ بدیع الزماں	۱۰/-
نامۂ شوق (نہال کے خطوط بیوی کے نام) سید صباح الدین	۱۵/-
آموزش اردو مصنفہ رضیہ تبسم	۱۲/-
سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری اور ان کے بہترین افسانے، وہاب اشرفی	۱۲/-
زبان و ادب (شاد عظیم آبادی نمبر)	۲/-
زبان و ادب (پرویز شاہدی نمبر)	۲/۵۰
زبان و ادب (اطفال نمبر)	۳/-
زبان و ادب (انعام نمبر)	۲/-
زبان و ادب (خاص نمبر)	۵/-

ایجنٹوں کے لیے مذکورہ بالا مطبوعات پر ۲۵ فیصد کمیشن محصول ڈاک بذمہ خریدار۔ زبان و ادب کے غیر مقامی ایجنٹوں کو رسالہ منگانے پر ۲۵ فیصد کمیشن اور محصول ڈاک بذمہ اکادمی، انفرادی طور پر جو حضرات اکادمی کی مطبوعات کا مکمل سیٹ خریدیں گے ان کے لیے بھی ۲۵ فیصد کمیشن۔ رسالے کی دس کاپیوں سے کم کی وی۔ پی نہیں بھیجی جائیگی۔ مزید معلومات کیلئے سکریٹری بہار اردو اکیڈمی ۸ بی سری کرشنا پوری پٹنہ ۱۳ سے رابطہ قائم کریں

QAPN-88

بہار اردو اکیڈمی کی مالی امداد سے شائع ہونے والی کتابیں

(شاعری)

مثنویات شوق	جناب عطاء اللہ پالوی	۱۰/-	سفر جلتے دنوں کا	جناب علیم اللہ حالی	۸/-
پرواز تخیل	" شعور سہاگل پوری	۱۰/-	گمنام کوچے کی صدا	" شعیب راہی	۱۰/-
نقش و نغمہ	" قسیم الحق گیاوی	۱۰/-	ذوق سفر	" نادم بلخی	۱۰/-
بے چہرہ لمحے	" علقمہ شبلی	۱۰/-	فردوس خیال	" جوہر نظامی	۲۰/-
ساز و آواز	" غضنفر نواب ونش	۷/-	سنبل و شبنم	" مختار احمد عامی	-
مجموعہ کلام حمید عظیم آبادی	" محمود خاں صبا	۱۵/-	دل و نظر	" ناظم سیوانی سہسرامی	۱۵/-
پرواز غبار	" غبار بھٹی	۱۰/-	تہی دست	" بدنام نظر	۱۰/-
[illegible]	" نصرت قادری	[illegible]	زرد موسم کی ہوا	" [illegible] بدر	۱۵/-
دیوان احقر	" مسز طیبہ خاتون	۲۵/-	بزم و رزم فطرت	" ڈاکٹر سید عبدالمجید	۱۲/-
قول و تبسم	" حفیظ بنارسی	۱۰/-	گلدستہ (بچوں کی نظمیں)	" ناوک حمزہ پوری	۷/-
نگارش	" جگیشور پرشاد خلش	۷/-	کلام انجم مان پوری	" معین شاہد	۱۵/-
شگفتہ کانٹے	" سید صدر الدین فضا	۱۰/-	حرف تمنا	" معین کوثر	۱۰/-
دیوان حضور	" پروفیسر مختار الدین آرزو	۱۲/-	زیر بار	" شاہد کلیم	۱۰/-
رشتہ گونگے سفر کا	" منظہر امام	۱۰/-	آئینہ ایام	" عبدالقیوم ذکی اورنگ آبادی	۷/-
لمحوں کی آواز	" ادریس احمد دوراں	۱۵/-	عکس تمنا	" نند کشور پرشاد نند	۱۰/-
جلوۂ نور	" نور نوحی آروی	۴/-	خاک آشیاں	" محترمہ رضیہ رضا	۱۰/-
الفاظ کا سفر	" ظہیر غازی پوری	۱۰/-	شعلۂ تشنگی	" شہزاد معصومی	۱۵/-
ماسوا	" ظہیر صدیقی	۱۰/-	گلزار فلسفی	اصغر امام فلسفی	۱۰/-
نعرۂ آتش	" بیباک بھوجپوری	۱۰/-	حکایت ہستی	" سید شاہ محمد حسن بسمل عظیم آبادی	۱۰/-
کاروان خیال	" عطا کاکوی	۱۵/-	زمزمے	" حبیب آروی	۱۰/-
کلام ثاقب	" ثاقب عظیم آبادی	۱۵/-	کہکشاں (ڈاکٹر محمد ہاشم کی غزلوں کا انتخاب)	جناب ڈاکٹر یحییٰ ابدالی	۲۵/-
چشم غم	" قمر زاہدی	۱۰/-	جوہر ظرافت	" جوہر سیوانی	۱۵/-
نشاط غم (کلام راز عظیم آبادی)	" اعجاز علی ارشد	۱۵/-	نالہ و نغمہ	" محسن دربھنگوی	۱۵/-
خار و خس	" رضا مظہری	۶/-	نقش دوام	" نیر رضوی	۳/-
دیوان حامد عظیم آبادی	" ڈاکٹر یوسف خورشیدی	۲۰/-	نقوش طبع	" متین عمادی	۱۰/-
متاع داہی	" سید رضا نقوی واہی	۲۰/-			
تازگی برگ نوا	" ڈاکٹر لطف الرحمٰن	۲۰/-			

بہار اردو اکیڈمی

۸۔ بی سرکلر روڈ پٹنہ

QA|PN-38

برا ماننا کہ نہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ اردو میں نقاد یا تنقید ہے کہ نہیں، افسوس کا مقام یہ ہے کہ دو اروی میں کہی ہوئی ایک بات کو فوراً ذاتی رنگ میں رنگنے کی کوشش (اگرچہ خلوص نیت سے) کی گئی۔ سب سے پہلے تو ان مسائل کی فہرست بنائیے جن پر اظہارِ خیال تنقید کے لیے ضروری ہے، پھر سوچیے کہ ان مسائل پر کتنا اظہارِ خیال ہوا تو معلوم ہوگا کہ ہمارے اکثر نقاد بنیادی باتوں پر گفتگو کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ اگر ترقی پسند نقاد ہے تو وہ گھوم پھر کر انسان کے چاند پر پہونچنے، سماجی اور معاشی ترقی، جدوجہد اور انقلاب کا تذکرہ کرے گا اور اگر ترقی پسند نقاد نہیں ہے تو صنعتی زندگی کی حشر سامانی، موت کا خوف، تنہائی وغیرہ اس کے ہر پیراگراف میں کسی نہ کسی بہانے سے جلوہ افروز ہوں گے۔

ایسا نہیں ہے کہ ان چیزوں سے نقاد کو سروکار نہ ہونا چاہیے ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن اول تو یہ تمام باتیں پیش پا افتادہ ہیں ان کی حیثیت معلومات کی ہے، علم کی نہیں۔ دوم یہ کہ ان باتوں سے جو نتیجہ نکالا جائے اگر وہ ادبی ہو تو ہم یہ سب اخباری حالات برداشت بھی کرلیں، لیکن اکثر یہ ہوتا ہے کہ نتیجہ برآمد ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو اتنا لجلجا اور غیر ضروری کہ اس سے ادبی تنقید میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ مثلاً انقلاب کی دھمک نیاز حیدر میں بھی ہے اور سردار جعفری میں بھی۔ فرد کی تنہائی کا احساس اختر بستوی میں بھی ہے اور بلراج کومل میں بھی۔ تو کیا یہ چاروں ایک ہی درجے کے شاعر ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ سماجی اور سیاسی حالات کا تذکرہ ہمارے نقادوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ ذکر میر کا ہو یا نظیر کا، یا سودا کا، بار بار وہی سماجی اور سیاسی حالات نکام کے نسخے کی طرح لکھے ملیں گے، لیکن سوال کو حل کرنے کی کسی میں تاب نہیں کہ اگر ایک ہی زمانے اور ایک ہی سماجی پس منظر نے میر، نظیر اور سودا تینوں کو جنم دیا تو یا تو وہ حالات غلط ہیں یا یہ تینوں شاعر ایک ہی طرح کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ تو پھر سماجی حالات کی اہمیت یا معنویت کیا رہ گئی؟ یا تو ہمارے نقاد اپنے روایتی غبی پن کو ترک کرکے یہ ثابت کریں کہ سماجی حالات میر اور نظیر دونوں کے لیے مشترک نہیں تھے یا اگر تھے تو ان کی انفرادیتیں سماجی اور سیاسی پس منظر کے ماورا تھیں۔ پہلا نظریہ تاریخی اعتبار سے غلط ٹھہرے گا اور دوسرا نظریہ ہمارے پروفیسر نقادوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہوگا کیونکہ وہ انفرادیتوں کے قائل ہی نہیں ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انفرادیت کے معنی ہیں عدم تقلید۔ اور عدم تقلید انتشار کو راہ دیتی ہے۔ اس لیے تقلید کی ڈھابلی ہی میں بند ہو کر انفرادی بانگ دی جاسکتی ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ جدید روسی شاعرانہ منظر ایسے شاعروں سے بھرا ہوا ہے جو اپنی انفرادیت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ "پچاس سویت شاعر" کے عنوان سے جو مجموعہ ابھی روس سے شائع ہوا ہے اس کے دیباچے میں بھی اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ ان شعرا میں پیچیدگی، تہہ داری اور تنوع کی جو کیفیت ہے وہ اس وجہ سے بھی ہے کہ ان کا قاری اب پہلے سے زیادہ سمجھ دار، باذوق اور بلند معیار ہوگیا ہے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ یہ شاعر انسانی تجربے کی مختلف جہتوں کے بے دریغ اظہار کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مجموعے میں ایک نوجوان شاعر ایوجنی ونوکوروف (EVGENY VINOKUROV) کی ایک دلچسپ نظم ہے کہ لوگ مجھے طرح طرح کے مفت مشورے دیا کرتے ہیں، میں ان کی باتیں مسکرا کر سنتا ہوں لیکن کرتا اپنی سی ہوں۔ آزادیٔ فکر کا یہ تصور شاعری اور تنقید دونوں کے لیے بہت ضروری ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ نقاد کو جہاں یہ آزادی ہے کہ وہ کسی مخصوص نقطۂ نظر کی روشنی میں فن پارے کو پرکھے، وہاں اس سے ہمارا یہ مطالبہ بھی ہے کہ اس کا نقطۂ نظر کسی ادبی معیار کے زیر اثر تعمیر کیا گیا ہو اور اس میں کوئی ایسے منطقی تضادات نہ ہوں جو اُن معیاروں یا اس نقطۂ نظر کی وقعت کو مجروح کریں جس کی رو سے نقاد اپنے فیصلے کر رہا ہے۔ یہ نقطہ قابل لحاظ ہے کہ کوئی بھی تنقیدی نقطۂ نظر سو فیصدی صحیح نہیں ہوسکتا۔ سائنسی علم کے بارے میں تو پھر بھی اتنا کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ حقائق و شہادت کی روشنی میں یہی نظریہ درست ہے۔ لیکن ادبی نقطۂ نظر کے بارے میں اتنا بھی کہنا ممکن نہیں ہوتا کیوں کہ ادب بذاتِ خود اس قدر داخلی اور انسان کے ناقابل تجزیہ تصورات سے اس قدر

پیوست ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔ لہٰذا وہ نقاد جو اپنے نظریے کے علاوہ تمام نظریات کو رد کرتے ہیں صرف اسی حد تک قابلِ اعتبار و اعتنا ہیں جس حد تک ان کے تردیدی خیالات منطقی اور عقلی ثبوت کے پابند ہیں۔ منطقی اور عقلی ثبوت سے اور انظریات بھی درست ہو سکتے ہیں لیکن نقاد ان کی صحت پر اصرار نہیں کر سکتا۔

جدید تنقید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے پچھلی تنقید کی مزعوماتی اور ادعائی فضا کی جگہ آزاد خیالی کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی کمزوری یہ ہے کہ اس نے اکثر صحیح ترین بیان کو تلاش کرنے کے بجائے کام چلاؤ بیان پر اکتفا کیا ہے یعنی فن پارے کو بیان کرنے کے لیے بہترین طریقہ نہیں اختیار کیا ہے لیکن پھر بھی نئے نقادوں کی کوششیں پچھلی نسل کے نقادوں سے بہتر ہیں جو یا تو فراقؔ صاحب کی طرح انشائیہ لکھنا پسند کرتے تھے یا ممتاز حسین کی طرح غیر تجزیاتی بیانات سے کام لیتے تھے۔

دراصل نئی اور پرانی تنقید کا اختلاف دو مختلف نظریات کا اختلاف ہے اور یہ نظریات محض سیاسی یا ادبی نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق فلسفۂ علم سے ہے۔ وہ فلسفی جنھیں حقیقت پسند (REALIST) کہا جاتا ہے، اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ اشیاء کسی نہ کسی مفہوم میں موجود ہیں اور ان کا مطالعہ اشیاء کی حیثیت سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برخلاف عینیت پرست فلسفی جو ہیگل اور کانٹ کے پیرو ہیں، اشیاء کا صرف عینی وجود مانتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ کسی شے کا مطالعہ صرف اسی طرح ممکن ہے کہ عینی حقیقت کا مطالعہ کیا جائے۔ مارکسی یا روایتی تنقید دراصل اسی عینیت پرست فلسفے کی پیداوار ہے جو تجزیے کے بجائے عمومی اور تحلیل (SYNTHESIS) پر اصرار کرتا ہے اور جدید تنقید حقیقت پرست ہے جو فن پاروں کو بقیہ چیزوں سے الگ کر کے اس کا تنہا تجزیہ و مطالعہ کرنا پسند کرتی ہے۔

تجزیاتی فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ فن پارے کے بارے میں موضوعی اور موضوعاتی دونوں طرح کی باتیں خارج از بحث کر دی گئیں۔ موضوعی باتوں سے میری مراد وہ باتیں ہیں جو مجھے ذاتی یا جذباتی طور پر پسند آتی ہیں، چاہے منطق یا استدلال ان کے وجود سے انکار کرے۔ مثلاً میں نے یہ فرض کر لیا کہ ادیب کی سماجی ذمّے داری ہے، لہٰذا میں ادب میں اس سماجی ذمّے داری کا انعکاس تلاش کروں گا۔ اگر وہ نہیں ملتا تو میں اس ادب کو لاطائل قرار دوں گا چاہے اس ادب میں ادبی حُسن ہو یا نہ ہو، میں یہ کہہ دوں گا کہ سماجی ذمّے داری کا انعکاس نہیں ہے تو ادبی حُسن بھی نہیں ہے۔ خیر یہاں تک تو غنیمت تھا لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر فن پارے میں سماجی ذمّے داری کا اثر ملتا ہے تو میں اسے اچھا ادب کہوں گا اس میں کسی اور طرح کا حسن ہو یا نہ ہو۔ میں تمام ادب کی تنقید کرتے وقت یہ پہلو بچا تا رہوں گا کہ کہیں یہ ثابت نہ ہو جائے کہ سماجی ذمّے داری کا ثبوت نہ ہونے کے باوجود فلاں ادب اچھا ہے چنانچہ سردار جعفری اور دوسرے ترقی پسند نقاد ایک عرصے تک اس گتھی کو حل کرنے میں سرگرداں رہے کہ بودلیئر یا غالبؔ یا رومیؔ کی معنویت اُن کے لیے کیا اور کیوں ہے؟ غالبؔ، میرؔ اور کبیرؔ کی حد تک تو وہ کھینچ کھانچ کر کچھ نہ کچھ سماجی فلسفہ برآمد کر لاتے لیکن بودلیئر کافکا وغیرہ کے لیے ان لوگوں نے مریضانہ، غیر صحت مندانہ داخلیت پرست وغیرہ اصطلاحیں تراش کر دل کو مطمئن کر لیا کہ اگر یہ لوگ مجھے اچھے بھی لگتے ہیں تو یہ محض انسانی کمزوری ہے ورنہ یہ سب مریض اور غیر صحت مند ہیں۔ سردار جعفری یا احتشام حسین یا سجاد ظہیر باعلم اور باذوق لوگ ہیں۔ اس لیے ان لوگوں نے ان مسائل کو حتی الامکان اس طرح برتا کہ خدا اور وصالِ صنم دونوں سے بہرہ مند ہوتے رہے۔ لیکن غبی اور کم علم نقادوں کی وہ فوج جو ان کی کلمہ گو ہے، اس کے ہاتھ خد وخال کے علاوہ کچھ نہیں لگا۔

بہر حال بات ہو رہی تھی موضوعی نقطۂ نظر کی۔ ایمان دار دانشور کا پہلا امتحان وہاں ہوتا ہے جب وہ کسی ایسے نتیجے کو رد کرنے پر مجبور ہوتا ہے جو منطقی طور پر غلط لیکن جذباتی طور پر اس کے لیے دلکش ہو۔ اگر اس نے جذباتی دلکشی رکھنے والے نتیجے کو منطق کے علی الرغم قبول کر لیا تو گویا وہیں خود کشی کر لی۔ جدید تنقید چونکہ موضوعی اور ذاتی طور پر دلکشی رکھنے والے نتائج سے سرکار ہی نہیں رکھتی بلکہ تجزیے کی روشنی میں فن پارے کو پرکھتی ہے اس لیے اسے یہ مشکل درپیش ہی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر فیض کا

مطالعہ کرنے والے جدید نقاد کو اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی کہ وہ ان کے سیاسی اعتقادات کو کس خانے میں رکھے۔ ممکن ہے موضوعی طور پر وہ ان اعتقادات سے متفق نہ ہو یا متفق ہو لیکن اس حد تک اور اس طرح نہ ہو جس طرح فیض صاحب چاہتے ہیں، لیکن تجزیاتی تنقید کا پیروکار ہونے کی وجہ سے اس کو اپنے ذاتی مفادات اور فیض کے معتقدات میں کوئی کشاکش نہیں نظر آتی۔ فیض اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش۔ جہاں ان کا شعر اپنے فنی تجربے کی روشنی میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس کی اچھائی اور اپنے دلائل کا بیان کر دیں گے اور باقی مسائل جو ذاتی نوعیت کے ہیں ان کو اپنے تجزیے پر حتی الامکان اثر انداز نہ ہونے دیں گے۔ ورنہ جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ فیض صاحب نے اردو کے خلاف مورچہ سنبھالا ہے اور پنجابی زبان و ادب کے حامی اس طرح بن گئے ہیں کہ کہتے ہیں میں نے اردو میں شاعری کر کے زندگی ضائع کی تو میرے دل میں ان کے خلاف سخت غم و غصہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے جس شعر میں مجھے اچھائی نظر آتی ہے میں اس کو اب بھی اچھا کہتا اور لکھتا ہوں۔ اس نظریے کو محض لبرل کہہ کر پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا (حالانکہ لبرل ہونا بہت عمدہ چیز ہے) کیوں کہ اس کا تعلق ایک پورے نظریۂ حیات و ادب سے ہے۔ پچھلی نسل کے تمام نقاد بلکہ پچھلے تمام نقاد جن میں حالی کا نام بھی شامل ہے، کسی نہ کسی حد تک موضوعی اور موضوعاتی دھوکے میں گرفتار تھے اور خوب صورت یا قابل قبول موضوع کو خوب صورت اور قابل قبول شعر و ادب کی شرط ٹھہراتے تھے۔ اس دھوکے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اچھے اور برے ادب میں امتیاز کا معیار ادب کی اچھائی برائی نہیں، بلکہ موضوع کی اچھائی برائی ہو گیا۔ یہ دھوکا اس شدت سے پھیلا کہ سمجھ دار لوگوں نے بھی اسے اپنی تنقید کی اساس بنا لیا۔ چنانچہ اسلوب احمد انصاری جیسے شخص نے لکھا کہ ان کے نزدیک اقبال کی عظمت کا تعین ان کے عشقِ رسول کو دھیان میں لائے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ایک اور صاحب نے ایلیٹ کا ایک قول کہیں سے ڈھونڈ کر بڑے فخر و مباہات سے پیش کیا کہ ممکن ہے کہ ادب اور غیر ادب میں فرق کرنے کے لیے ادبی معیاروں کا حوالہ دینا پڑے لیکن کوئی ادب بڑا ہے کہ نہیں اس کا تعین غیر ادبی معیاروں کے ہی ذریعے ہو سکتا ہے۔ اول تو یہ کیا ضرور ہے کہ ایلیٹ جس کی ہزاروں باتیں ان صاحب کو غلط معلوم ہوتی ہیں، یہ ایک بات صحیح کہے، اور دوسرے یہ کہ اگر یہ صاحب ایلیٹ کے پورے نظام فکر سے واقف ہوتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ اسی مضمون کے آخر میں (جہاں اس نے یہ بات کہی ہے) ایلیٹ نے تلقین کی ہے کہ لوگوں کو عیسائی ادب پڑھنا چاہیے کیوں کہ وہی عظیم ترین ادب ہے۔ ہمارے نقاد نے ایلیٹ کا قول اسی معصومیت سے نقل کیا ہے جو بعض پرانے نقادوں میں نظر آتی ہے کہ وہ مغربی مصنفین کے اقوال ادھر سے اُدھر چھین جھپٹ کر لکھ لاتے ہیں لیکن انھیں نہ ان کے مضمرات کا پتا ہوتا ہے اور نہ وہ اس بات سے سروکار رکھتے ہیں کہ جس مصنف کا ایک تنہا جملہ وہ نقل کر رہے ہیں اس کا پورا نظام فکر کیا تھا اور اس نظامِ فکر میں اس جملے کی حیثیت کیا ہے؟ ہمارے نقاد نے ایلیٹ کے حوالے سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ غیر ادبی معیاروں کی رو سے ہی ادب کی عظمت کا پتا چلتا ہے، لیکن یہ بھول گئے کہ ان ہی میں سے بعض معیاروں کی روشنی میں ایلیٹ نے عیسائی ادب کو عظیم ترین درجہ دیا ہے۔ کسی دوسرے غیر ادبی معیار کی رو سے جن سنگھی یا مہا سبھائی کسی اور ادب کو عظمت کے تخت پر بٹھا دے گا۔ جماعت اسلامی والا کسی اور ادب کے گن گائے گا، وقس علیٰ ہذا۔ پھر ان غیر ادبی معیاروں کی اہمیت یا حیثیت کیا ہوئی؟

اس مسئلے پر دراصل یوں غور کرنا چاہیے اگر کوئی فن پارہ سراسر کسی مخصوص فلسفے یا نظریے کا اظہار کرتا ہے تو پھر بقول آڈن ہمیں اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس فلسفے یا نظریے کی بہترین نمائندگی اس کے مفکروں نے پیش کر ہی دی ہے۔ اب اس پر شعر لکھنا تضییع اوقات کہلائے گا۔ میرا خیال ہے کہ جو لوگ شعر کے ذریعے فلسفہ یا نظریہ سیکھنا چاہتے ہیں وہ دراصل ذہنی طور پر کم کوش اور بے ہمت ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ فلسفے کی ادق کتابیں کون پڑھے، لاؤ سستی ہلکی شاعری سے وہی باتیں تھوڑی بہت سیکھ لیں تاکہ بات چیت میں ہم جاہل نہ ٹھہریں۔

جدید نقاد سیاست یا فلسفے کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد



جواہر لال نہرو کا ادبی مرتبہ

جواہر لال نہرو کی زندگی کے مختلف النوع پہلوؤں کا احاطہ کرنا کسی ایک مقالے میں ممکن نہیں۔ ان کے انتقال پر دنیا بھر کے مفکرین، سیاست دانوں اور رہنماؤں نے انھیں دلی خراجِ تحسین ادا کیے ہیں کسی نے ان کی موت کو ہندستان کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا ہے تو کسی نے اس موت کو دنیا بھر کا نقصان کہا ہے کسی نے کہا ہے کہ دنیا کے پسماندہ ملکوں کا ہمدرد جاتا رہا تو کسی نے کہا ہے کہ ہندستان کی اقلیتیں بے سہارا ہو گئی ہیں۔ اکثر ملکوں کے سربراہوں نے اسے اپنے عزیز ترین دوست کی موت کہا ہے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ ہمارے ملک ایک مخلص دوست سے محروم ہو گئے ہیں۔ کسی نے انھیں امن کا دیوتا کہا ہے اور کسی نے ترقی پسند طاقتوں کے رہنما کا نام دیا ہے۔ غرض ہر ایک نے ان کی مختلف النوع زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کو سامنے رکھ کر خراجِ عقیدت ادا کیا ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے سے یہ عقیدت بھرے جذبات جب ہر صبح اخبارات کے صفحات پر بکھرے ہوئے مجھے نظر آتے ہیں تو حافظ کا یہ مصرع بے اختیار زبان پر آجاتا ہے ؎

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

جواہر لال نہرو نے جس استقامت کے ساتھ برطانوی استعمار سے ٹکر لی اور جس بہادری کے ساتھ اپنا لڑکپن اور اپنی جوانی جنگِ آزادی کی نذر کی وہ صرف تاریخِ عالم یا تاریخِ ہندستان ہی کا نہیں بلکہ ہمارے ادبِ عالیہ کا بھی جزو بن چکی ہیں[1]

جنگ آزادی کے اس سپاہی کو عزم، استقلال اور شجاعت ایسی خوبیوں سے مالا مال کرنے کے ساتھ ہی ساتھ قاسم ازل نے انھیں ایک ایسا دردمند اور درد شناس دل بھی عطا کیا تھا جو شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کے حصے میں آتا ہے اصل میں جواہر لال نہرو کی زندگی اقبال کی اس رباعی کی تفسیر تھی ؎

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے ∗ تنے محکم تر از سنگیں حصارے

درونِ او دلِ دردآشنائے ∗ چو جوئے در کنارِ کوہسارے

یہ الگ بات ہے کہ سیاسی ہنگامہ آرائیوں اور نظامِ مملکت کی ذمہ داریوں کے باعث وہ ادبی زندگی کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے لیکن اس کے باوجود ان کے اندر جو ایک ادیب پنہاں تھا

---

[1] اقبال نے جب ۱۹۳۱ء میں غنی کاشمیری کی زبان سے یہ شعر کہلوایا تھا ؎ آں برہمن زادگانِ زندہ دل ∗ لالۂ احمر ز روئے شاں خجل (جاوید نامہ) تو ان کا اشارہ واضح طور پر موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو کی طرف تھا۔ اسی طرح مختلف ہندستانی زبانوں کے ادب میں جواہر لال نہرو ایک زمانے سے اپنی مستقل جگہ بنا چکے ہیں۔ ٹیگور نے نہرو کے متعلق ۱۹۳۶ء میں لکھا تھا:

"جواہر لال نہرو ہر اعتبار سے نئے ہندستان میں سب سے اونچے اعزاز کا مستحق ہے۔ جواہر لال ایک باوقار کردار کا دوسرا نام ہے، اس کا صبر و تحمل اور اس کی حوصلہ مندی اپنی مثال آپ ہیں لیکن جو خاصیت اسے اپنے رفیقوں اور ساتھیوں سے خاص طور پر ممتاز اور ممیز کرتی ہے وہ ہے اس کی اخلاقی قدروں کے ساتھ غیر متزلزل وابستگی اور اس کی طہارتِ فکر۔ سیاسیات کے اتار چڑھاؤ میں جہاں قدم قدم پر طرح طرح کے فریب، خود فریبی سمیت موجود ہیں اس نے حق و صداقت کا پرچم ہمیشہ بلند رکھا ہے۔ انتہائی خطرات کے پیشِ نظر بھی اس نے سچائی کا دامن اپنے ہاتھوں سے نہیں چھوڑا۔ مصلحت اندیشی سے نہرو ہمیشہ لاتعلق رہا ہے بعض اوقات پالیسی کے نام پر گھٹیا طور طریقے اپنی مقصد براری کے لیے اپنا لیے جاتے ہیں۔ جواہر لال کا رشتہ اس سے ہمیشہ منقطع رہا ہے جنگ آزادی میں جواہر لال کا سب سے بڑا کارنامہ اس کا اونچا معیارِ صداقت ہے۔"

اردو ادب میں جواہر لال نہرو کے ذکر کو اگر جمع کیا جائے تو نہ جانے کتنی ضخیم کتابیں تیار ہو جائیں۔

اس کا پر تو جواہر لال کی شخصیت اور تحریروں پر پوری طرح نمایاں رہا۔

ان کی ادبی زندگی کی عکاسی صرف ان کی تحریروں اور تقریروں ہی میں موجود نہیں بلکہ ملک اور بیرون ملک کے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ان کے مراسم بھی ان کی زندگی کے اس پہلو پر خاصی روشنی ڈالتے ہیں لیکن اپنے اس مقالے میں میں صرف ان کی تحریروں کا ذکر کروں گا اور اس امر کو نہیں چھیڑوں گا کہ سفر انگلستان کے دوران میں وہ برناڈ شاہ سے ملنے کے لیے گئے یا ہندستان میں انہوں نے شعرا اور ادیبوں کے لیے کیا کیا یا جوش ملیح آبادی اور رام دھاری سنگھ دنکر کے ساتھ ان کے مراسم کیسے تھے۔ یا جامعہ اور دارالمصنفین اعظم گڑھ انہیں کس قدر عزیز تھے وغیرہ۔

شعر و ادب کے ساتھ ان کے دلی لگاؤ کی ایک مثال تو ان کے انتقال سے چند روز بعد ہی منظر عام پر آئی جب ۵ جون کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ان کی رحلت کے وقت ان کی میز پر جو پیڈ رکھا تھا اس پر ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ کے یہ مصرعے موجود تھے

The woods are lovely dark and deep
But I have promises to keep
And miles to go before I sleep
And miles to go before I sleep

اس سے صرف ایک روز قبل ان کا لکھا ہوا انگریزی نثر کا وہ شاہکار ہمارے سامنے آیا جو اُن کی وصیت کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تین صفحوں کی مختصر سی تحریر جو ۲۱ جون ۱۹۵۴ء کو لکھی گئی تھی اور ۳ جون ۱۹۶۴ء کو منظر عام پر آئی۔ زبان و بیان کے اعتبار سے نثر کا ایک شہپارہ تسلیم کی جاچکی ہے اس تحریر میں سیاست داں جواہر لال نہرو کے اندر سویا ہوا فن کار صرف جاگ ہی نہیں اٹھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چند صفحات لکھتے وقت اس کی تمام تخلیقی قوتیں پوری شدت کے ساتھ مصروف عمل ہو گئی ہیں۔

اس وصیت میں جو ایک عہد نامہ بھی ہے جواہر لال نے امیجری کے محاسن سے بھرپور زبان میں اہل وطن کی توجہ اس فرض کی طرف دلائی ہے کہ انہیں روشنی میں بھی اور تاریکی میں بھی مل کر اپنا قدم آگے بڑھانا ہے گنگا میں انہیں ہندستان کی ایک تصویر نظر آتی ہے مکمل اور جامع تصویر۔ ان کے الفاظ میں "گنگا ہندستان کا ایک ایسا دریا ہے جس کے ساتھ ہندستان میں رہنے والوں کو ایک دلی لگاؤ ہے۔ نسلاً بعد نسلٍ گنگا کے ساتھ روایتیں وابستہ ہوتی چلی آئی ہیں۔ ان روایتوں میں ہندستان کے عزائم سامنے آنے والے خطرات، فتح مندی اور فتح مندی کے گیت اور شکستیں آرامیدہ ہیں"

گنگا ہندستان کا ایک مقدس دریا ہے۔ رگ وید میں اس کا ذکر آیا ہے۔ پرانوں میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ بلکہ پرانوں میں تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کا سرچشمہ آسمانوں میں ہے علامہ اقبال کی مثنوی "اسرار خودی" میں ہمالہ جب گنگا سے ان الفاظ میں خطاب کرتا ہے :۔

اے ز لطفِ چرخِ گرداں زادۂ

تو علامہ کے پیش نظر اس وقت اہل ہندستان کا یہی عقیدہ ہے کہ رودِ گنگا کا سرچشمہ آسمان پر ہے۔ اسی طرح محرومؔ کی نظم "گنگا" کے پہلے بند میں اسی تصور کی طرف اشارہ ہے ؎

جوش زن رحمتِ یزداں ہوئی دریا ہو کر
بہہ چلی عالمِ اجسام میں گنگا ہو کر!
آئی ہے راہروِ عالمِ بالا ہو کر!
رہ گئے کچھ ترے قطرات ثریا ہو کر
عرش اور فرش ہوئے تجھ سے منور گنگا
مظہر نورِ ازل ہے تو سراسر گنگا

جواہر لال کا یہ ایک بہت بڑا کمال ہے کہ انہوں نے گنگا کی عظمت کا تصور مذہبی تصورات سے ہٹ کر پیش کیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ گنگا کو ہندستان کے ماضی اور حال کے درمیان ایک قوی رشتہ سمجھتے ہیں ان کے الفاظ میں گنگا "ہندستان کے ماضی کی ایک یادگار اور ایک علامت ہے جو بہتی بہاتی حال میں داخل ہو رہی ہے اور حال کی منزلوں سے گزر کر مستقبل کی جانب گامزن ہے۔"

تسلسل کا یہی احساس ہندستان کی داستان ہے اور اسی احساس کا اظہار ہندستان کے ان رہنماؤں کی شخصیتوں میں ملتا ہے جنھوں نے ہندستان کی وحدت کو اپنا مرکزِ فکر و نظر بنایا ہے انہیں رہنماؤں میں جدید ترین اندازِ فکر رکھنے والے اور ترقی پسند رہنما جواہر لال نہرو بھی شامل ہیں۔ جواہر لال نہرو اس قومی ترقی کی اہمیت

سے پوری طرح واقف تھے جس کا تعلق جدید طور طریقوں سے ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ہندستان کے تمدنی، ثقافتی اور تاریخی ورثے سے بھی مکمل طور پر آگاہ تھے یاان کی ہندستانیت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی اور شدید تر ہوتی گئی۔ اپنی ہندستانیت کے بارے میں ان کا احساس کتنا تیز تھا اس کے بارے میں بھی وہ باخبر تھے اور یہ باخبری ان کی آخری تصنیف "ہندستان کی دریافت" میں جو انہوں نے اپنی جیل یاترا کے دوران میں لکھی قدم قدم پر نظر آرہی ہے۔

جواہر لال نہرو نے ہندستان کو گنگا ایسے ایک عظیم دریا کے روپ میں دیکھا ہے۔ اس تصویر میں اہل ہند کے لیے ایک بڑا پیغام موجود ہے اس لیے کہ ان تمام ہندو روایات اور دیومالائی تصورات کے باوجود جو گنگا کے ساتھ وابستہ ہیں گنگا ان تمام لوگوں کی دولت ہے جو اپنے آپ کو ہندستانی سمجھتے ہیں۔ ہندوؤں کا یہ دیومالائی تصور کہ گنگا شوجی کی جٹاؤں سے نکلی ہے گہرے معنی سے خالی نہیں ہے۔ دنیا کے ہر ملک کا ادب اس قسم کی شاعرانہ علامتوں سے لبریز ہے۔ ہندستانی ادب بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ کئی ندیوں کی صورت میں گنگا کا شوجی کی جٹاؤں سے نکلنا استعارہ ہے ہندستان کے اس تمدن سے جو مختلف النوع خیالات اور عقائد سے مل کر بنا ہے۔ علامہ اقبالؒ جب اپنے سفرِ روحانی کی ابتدا چاند کے سفر سے کرتے ہیں اور چاند میں شوجی مہاراج سے ملاقات کرتے ہیں تو اس بات سے خالی الذہن نہیں ہیں کہ شوجی کی ذات کے ساتھ جو تصورات وابستہ ہیں وہ قدیم ہندستانی تمدن کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں[1]۔

جواہر لال نے اپنے اس شہ پارے میں ہندستان کو گنگا سے جو تشبیہ دی ہے وہ ایک ایسی نادر اور اچھوتی تشبیہ ہے کہ کسی بھی ادب کے لیے باعث فخر ہو سکتی ہے۔

جس طرح گنگا میں جواہر لال کو ہندستانی عظمت کی تصویر جھلکتی نظر آتی ہے اسی طرح علامہ اقبال نے مسجد قرطبہ میں عظمت اسلام کی تصویر دیکھی ہے۔

کعبۂ اربابِ فن سطوتِ دینِ مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہ سوار
حاملِ "خلقِ عظیم" صاحبِ صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں
جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

اس مقام پر اس فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے جو جواہر لال نہرو اور اقبال کے نظریۂ حیات میں تھا۔ اقبال مذہب اور مذہبی زندگی کو جو اہمیت دیتے تھے نہرو اس سے بیگانہ تھے۔ اقبال کا دور پیچھے کی طرف "اے گردشِ ایام تو" کے قائل تھے۔ نہرو ہندستان میں ایٹمی دور لانے کے لیے بے تاب تھے۔ اسی وصیت میں کہتے ہیں۔

"......اس معاملے میں میرے کوئی مذہبی جذبات نہیں۔ گنگا

[1] عارف ہندی که بیکے از غارہائے قمر خلوت گرفته و اہلِ ہند او را "جہاں دوست" می گویند

زیرِ نخلے عارفِ ہندی نژاد — دیدۂ از سرمہ اش روشن سواد
موئے بر سر بستہ و عریاں بدن — گرد او مارے سفیدے حلقہ زن
آدمے از آب و گل بالا ترے — عالم از دیر خیالش پیکرے
وقت او را گردشِ ایام نے — کار او با چرخ نیلی فام نے

(جاوید نامہ)

اور جمنا سے میرا دلی تعلق اس وقت سے چلا آرہا ہے جب میں ابھی بچہ ہی تھا عمر کے ساتھ ساتھ یہ تعلق خاطر بھی بڑھتا گیا میں نے موسموں کے ساتھ ساتھ ان دریاؤں کے بدلتے ہوئے مزاج بھی دیکھے ہیں. اور اس تاریخ ودیدانا روایت، گیتوں اور کہانیوں پر بھی غور کیا ہے جو ایک زمانے سے ان کے ساتھ وابستہ ہوتی چلی آرہی ہیں اور ان کی موجوں کا جزو بن گئی ہیں ..... گنگا ہندستان کے صدیوں پرانے تہذیب و تمدن کا ایک نشان ہے ہمیشہ بہتے چلے جانے اور ہمیشہ ایک تغیر نے آشنا رہنے کے باوجود گنگا وہی قدیم گنگا ہے. اسے دیکھ کر مجھے ہمالہ کی وہ برف پوش چوٹیاں اور گہری وادیاں یاد آجاتی ہیں جن سے مجھے والہانہ عشق ہے اور ان سرسبز و شاداب میدانوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جہاں میں نے اپنی زندگی کا آغاز کیا. وہی گنگا جو صبح کی روشنی میں متبسم اور رقصاں نظر آتی ہے. شام کے سایوں میں ایک اداس اور پراسرار بن جاتی ہے. سردیوں میں یہی گنگا ایک چھوٹی نہر کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور جب برسات آتی ہے تو اس پر ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کا گمان ہوتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ اس میں وہ تمام تخریبی قوتیں بھی جمع ہو جاتی ہیں جو سمندر کا خاصہ ہیں.

مناظر قدرت سے یہ لگاؤ یہ گہرا تعلق کسی سیاست داں کا نہیں فنکار ہی کا ہو سکتا ہے اور فنکار جواہر لال نے اس لگاؤ کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے میں جو انوکھا انداز بیان استعمال کیا ہے اس نے خلوص احساس کے ساتھ مل کر اس تصویر کو ایک جاودانی زندگی بخش دی ہے. یہ تصویر اس لیے بھی ہمیشہ زندہ رہے گی کہ اس کے ساتھ اس تصویر گر کی یاد وابستہ ہے جس نے آزادی کے بعد ہندستان کے سفینے کی ناخدائی کی. اس ناخدا کی اپنی زندگی بھی گنگا کی طرح تھی، صاف ستھری، کہیں پرسکون کہیں طوفانی. مستقبل کے سمندر کی طرف رواں دواں.

سیاسی موضوعات پر لکھنے والے اہل قلم میں بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جن کے انداز فکر میں ایک استقامت اور ہمواری ہو. جواہر لال نہرو کا نام ایسے مصنفین میں سر فہرست ہے. ان کا قلم کبھی مصلحت اندیشی کا شکار نہیں ہوا. بعض اہم نظریات پر ان کی پختہ یقینی ایمان کی صورت اختیار کرچکی تھی مثلاً برطانوی سامراج کے بارے میں انھوں نے روز اول سے جو نظریہ قائم کر لیا اسی پر آخر تک قائم رہے اس کے علاوہ قوم پرستی، فرقہ پرستی، سیکولرزم، قومی زبان کا مسئلہ، ہندستانی زبانوں میں اردو کی اہمیت، ہندستان میں انگریزی کی اہمیت، ہندستانی زبان کی ساخت وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن کے بارے میں ان کے خیالات کبھی افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوئے. ان موضوعات پر انھوں نے جن خیالات کا اظہار اپنی سوانح حیات میں کیا ہے اس سے دوسری تصانیف میں سرمو انحراف نہیں کیا ورنہ سیاست دانوں کے رستے میں ایسے مشکل مقام اکثر آجاتے ہیں جہاں انھیں مصلحت کے پیش نظر اپنے کسی سالہا سال پرانے نظریے کو یک قلم ترک کردینا پڑتا ہے لیکن جواہر لال نہرو کا دامن تحریر اس گرد سے پاک ہی رہا ہے. غالباً اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ ان کی زندگی کی سطح مصلحت اندیشی کی سطح سے کہیں اونچی تھی. زندگی کی یہی تابناکی ہے جس نے ان کی تحریروں کو تابناک بنادیا ہے سہ

خون دل و جگر سے ہے اہل نوا کی پرورش
ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو

زندگی کی طرح ادب میں بھی جواہر لال نہرو کا نظریہ انتہائی ترقی پسندانہ رہا. دنیا کے ملکوں کو انھوں نے بکھرے دانوں کے روپ میں دیکھا اور ان بکھرے دانوں کو ایک ہی تسبیح میں پرونے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہے. ہندستان کو انھوں نے کبھی باقی دنیا سے کٹا ہوا ایک الگ تھلگ قطعۂ زمین نہیں سمجھا. بلکہ اسے ہمیشہ اس جسم کا ایک حصہ تصور کیا ہے جسے وہ "ایک دنیا" کہا کرتے تھے.

ان کا آزادی کا تصور محض سیاسی آزادی کی حدود سے کہیں آگے تھا. اقتصادی آزادی کے بغیر انھوں نے سیاسی آزادی کو ہمیشہ نامکمل سمجھا اور اسی آزادی کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہے. اور پھر آزادی کے ساتھ افراد پر جو فرائض عاید ہوتے ہیں ان کی وہ ہمیشہ یاد دہانی کراتے رہے.

شاہنشاہی جسے وہ سرمایہ داری کی اولاد کہا کرتے تھے، ان کی نظر میں ہر قسم کی ترقی کے رستے میں رکاوٹ ہے ان کی رائے میں سرمایہ داری کی بدولت کسی زمانے میں بے شک بعض بڑے

بڑے کام بھی رونما ہوئے ہوں گے لیکن آج کے دور میں اس کی کوئی اہمیت، کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔

ان کے نزدیک فاشزم سرمایہ دارانہ سماج کی خطرناک صورت تھی، تشدد کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ اس سے زندگی کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ تشدد سے حاصل کی ہوئی آزادی غلامی سے بہتر ہے لیکن اس کے باوجود ہمیں عدم تشدد کو تشدد پر ترجیح دینا چاہیے۔

مذہبی تنظیم کو انھوں نے سیاست کے رستے میں ہمیشہ ایک رکاوٹ جانا۔ ویسے بھی مذہب کے بارے میں اُن کی رائے یہ تھی، یہ چونکہ مذہب کی بدولت ہم اس دنیا کو اس دنیا کی بہ نسبت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اس لیے نتیجۃً ہم بے انصافی اور غریبی کا فوراً ہی ایک جواز ڈھونڈ لیتے ہیں۔ مذہب کو اکثر افراد اور قوموں کے استحصال کے لیے ایک آلہ بھی بنا لیا جاتا ہے۔

اب یہ چند نظریات جن پر ان کی ساری جہد حیات کی بنیاد قائم تھی ان کی تحریروں میں اول سے آخر تک موتیوں کی طرح دمکتے نظر آتے ہیں۔ ہم ان نظریات سے اتفاق کریں یا نہ کریں یہ بالکل ہی ایک دوسرا سوال ہے لیکن یہ حقیقت کہ اپنے ان نظریات پر نہرو اپنی ہر تصنیف میں ایک چٹان کی طرح سے قائم رہے ادب میں استقامت کی ایک ایسی مثال ہے جو بہت کم ادیبوں اور شاعروں میں نظر آتی ہے اور خواہ ادیب سیاست داں بھی ہوں ان کی تحریروں میں اس استقامت کا موجود ہونا معجزے سے کم نہیں۔

یہاں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ جواہر لال کی یہ تصانیف ایک ادیب محض کی تصانیف نہیں ہیں بلکہ لکھنے والے کی اصل زندگی ایک سپاہی کی زندگی ہے۔ جواہر لال نہرو کو اس حقیقت کا صرف علم ہی نہیں تھا بلکہ شدید طور پر احساس تھا اس لیے وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں "میں ایک ادیب نہیں ہوں" زیادہ سے زیادہ وہ اپنے آپ کو کسی حد تک صحافی ماننے کو تیار تھے لیکن ان کے انکسار کا یہ اظہار حد سے بڑھا ہوا ہے۔ انھیں محض صحافی سمجھنا حقیقت سے روگردانی ہے وہ اپنے آپ کو ادیب کہیں یا نہ کہیں لیکن دراصل وہ کتاب خواں بھی تھے اور صاحب کتاب بھی۔

دنیا کے دانشوروں میں ان کا مقام بہت اونچا تھا۔ ہندستان سے باہر بھی ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں ہے جنھیں جواہر لال نہرو کی تحریروں کے اکثر حصے زبانی یاد ہیں۔ ابھی ہندستان آزاد نہیں ہوا تھا کہ ایک یوروپی ملک میں وہ مہمانِ محترم کی حیثیت سے گئے وہاں ان کے اعزاز میں ایک جلسہ ہوا اور میزبان وزیر اعظم نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جواہر لال نہرو اپنی سوانح حیات کے کسی باب میں سے کوئی فقرہ پڑھیں باقی حصہ میں زبانی سنا دوں گا۔

سیاست کی ہنگامہ آفرینیوں سے ہٹنے کا انھیں جب بھی موقع ملتا تھا خواہ یہ موقع ایک لمحے کے لیے ہو یا ایک دن کے لیے وہ کتابوں کی دنیا میں کھو جاتے تھے کتابیں ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بن جاتی تھیں جن لوگوں کو ان کے قریب رہنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ وہ بتلاتے ہیں کہ آپ جب بھی سفر پر روانہ ہوتے تھے کتابوں کا ایک بکس ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا تھا۔ جاننے والوں نے تو یہاں تک بتایا کہ اگر دن میں انھیں پڑھنے کا موقع نہیں مل سکا تو انھوں نے رات کا زیادہ تر حصہ کتاب خوانی کی نذر کر دیا۔

جواہر لال نہرو نے اپنی زندگی کا جو حصہ قید فرنگ میں بسر کیا اس کا سب سے بڑا کارنامہ آپ کی تصانیف ہیں اس زمانے میں آپ نے ایک ایک لمحہ پڑھنے اور لکھنے میں نذر کر دیا۔ اسی قید فرنگ ہی نے ان سے "سوانح حیات" بھی لکھوائی اور اندرا کے نام کوئی دو سو خطوط بھی۔

جیل یاترا سے باہر آنے کے بعد بھی یہ سلسلہ ہمیشہ بدستور جاری رہا۔ مقالے، کتابچے، مضامین اور خطبات بہ تسلسل ان کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر آتے رہے۔ ممکن ہے ان مقالوں اور مضامین میں ادب کی وہ شان نظر نہ آتی ہو جو ان کی مستقل تصانیف میں جھلکتی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی ادبی حیثیت بہت بلند ہے۔

اور جواہر لال نہرو کے ہر حرف کو ادب کے اس معیار پر پرکھنا جو محض ادیبوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے صحیح اندازِ نقد و نظر بھی نہیں ہے ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے ادب برائے ادب کے خیال سے نہیں لکھا۔ وہ تو افکار کا ایک طوفان تھے۔ ایک لاوا اور ان کی زندگی کے سامنے ایک مقصد تھا۔

اور وہی مقصد ان کی تحریروں کے سامنے تھا ع

سوئے قطار می کشم ناقۂ بے مہار را

ان کی تحریریں خواہ کتابیں ہیں خواہ مقالات و خطبات فولادی

قطعہ میں جنھیں وقت کی دست برد سے کوئی اندیشہ نہیں گھنے اشجار ہیں جن کے سائے میں راہ چلتے مسافر آرام کر سکتے ہیں۔ اور تازہ دم ہو کر نئے سفر پر روانہ ہو سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر "سوانح حیات" اور "تاریخ عالم کی جھلکیاں" ہی کو لے لیجیے۔ ان دونوں کتابوں کا کینوس بہت وسیع ہے۔ "سوانح حیات" جیسا کہ نام سے گمان ہوتا ہے محض واقعات ہی کا بیان نہیں ہے بلکہ یہ ایک دھڑکتے ہوئے دل کی داستان ہے۔ اول سے آخر تک یہ داستان آپ کو رلاتی بھی ہے۔ آپ کے آنسو بھی پونچھتی ہے اور آپ کے دل میں ایسا ولولہ بھی پیدا کرتی ہے کہ آپ سامراج سے ٹکر لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سے "تاریخ عالم کی جھلکیاں" ویسی ہی تاریخ کی کتاب نہیں ہے جو ہم اسکولوں کالجوں میں پڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ مصنف نے اس کتاب میں ماضی اور مستقبل میں ایک گہرا تعلق قائم کیا ہے۔ دیروز کے کھنڈروں میں مصنف نے فردا کی تعمیریں دیکھی ہیں۔ تاریخ کی یہ کتاب ماضی کے مرثیوں سے خالی ہے۔ یہ کتاب اس معمار کے ذہن کی تخلیق ہے جو حسرت رم پر شوق تعمیر اپنے دل میں لیے آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ تاریخ کی یہ کتاب جو

؎ زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ قدیم و جدید

کی تفسیر ہے ایک ایسے مصنف کی تصنیف ہے جو صرف تاریخ داں ہی نہیں تاریخ ساز بھی ہے۔

اور پھر جواہر لال کی ہر تحریر کی طرح اس کتاب کا بھی ایک مقصد ہے اور وہ ہے امن عالم کا حصول۔ آزادی کا مفہوم نہرو کے نزدیک صرف یہی نہیں ہے کہ غیر ملکی جذبے سے نجات حاصل کر لی جائے بلکہ آزادی کے بعد وہ تمام برکتیں بھی آزادی حاصل کرنے والے ملک کو حاصل ہونا چاہئیں جن پر افراد کی پُرمسرت زندگی کا دار و مدار ہے اور ان خیالات کی نشر و اشاعت کے لیے انہوں نے نہ کبھی مذہبی اعتقادات کا سہارا لیا نہ اسے وجدان کی تخلیق کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی بلکہ اسے ایک ملمع سے معرا سیدھی سادی نثر میں پیش کیا اور چونکہ اس نثر میں فنکار کا خلوص شامل ہے۔ اس لیے وہ بے ساختہ دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ انہوں نے مشرق و مغرب کو حالات و واقعات کے آئینے میں دیکھا اور مشرق کے مسائل اہل مغرب کے سامنے جس زبان میں پیش کیے وہ حقائق پر مبنی بھی ہے اور موثر و دل کش بھی۔

اور کسی بھی اہل قلم کا اندازِ بیان اگر موثر و دل کش ہے تو وہ بطور ایک مصنف کے کامیاب ہے۔ جواہر لال نہرو کی نثر بالخصوص "سوانح حیات" میں شاعری کی حدوں کو چھو جاتی ہے اور اس درد و گداز سے مملو ہے جو شاعری ہی کا حصہ ہے۔ "سوانح حیات" میں جواہر لال نہرو کا اپنا مذاق ادب پورے عروج پر نظر آتا ہے۔

"سوانح حیات"، "تاریخ عالم کی جھلکیاں" (مع باپ کے خطوط بیٹی کے نام) اور متعدد مقالات کے علاوہ نہرو کی اور کتابیں بھی ہیں مثلاً "ہندوستان میں استعمارہ مہینے"، "نئے مضامین اور تحریریں"، "ہم کہاں ہیں"، "اور چین، ہسپانیہ اور جنگ"۔ آخر الذکر کتاب ہم نے آج سے بائیس سال قبل پڑھی تھی اور جو صداقت و خلوص اس کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے اس کا اثر میرے دل و دماغ پر آج بھی موجود ہے۔ اس کتاب کے اکثر حصے باوقار شاعرانہ اندازِ بیان کے حامل ہیں اور انگریزی ادب میں گہری نظر رکھنے والے انھیں زبان و بیان کے شاہکار تسلیم کرتے ہیں۔ جواہر لال نہرو کی یہ کتاب ہو یا کوئی اور تصنیف آپ کی طبیعت اس وقت پوری جولانی پر ہوتی ہے جب آپ وقت کی رفتار اور روحِ آدم کا، وقت کی رفتار کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ یہی کیفیت بلکہ ایک ایسی جولانی طبع جو ظلم اور بے انصافی پر حملہ کرنے کے لیے بے تاب ہو اس وقت نظر آتی ہے جب آپ کا قلم دنیا کے پسماندہ ملکوں یا مفلوک الحال انسانوں کا ذکر کرتا ہے۔ مہاتما گاندھی کسانوں، مزدوروں اور مفلوک الحال انسانوں کو پستی سے اٹھانے کے لیے میدانِ عمل میں آتے ہیں تو آپ کا قلم یوں گوہر افشانی کرتا ہے:

"آخر کار اسے امید کی ایک جھلک نظر آئی۔ ایک ہلکی سی آواز اس کے کانوں میں پڑی کہ اب تیرے دن پھرنے والے ہیں اور جس ہمت شکن بوجھ کو تو نے اٹھا رکھا ہے وہ کسی حد تک ہلکا ہونے والا ہے۔ ایک چھوٹے سے نت کے آدمی نے آ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا اور اس کی نظر افسردہ دل کی گہرائیوں تک پہنچی۔ اس نظر نے اس کے تمام مسائل اور مصائب کو دیکھ لیا۔ دیکھنے والے کی ایک آنکھ میں جادو تھا جس میں ہمدردی کا گداز تھا اور آواز میں محبت اور جذبِ وفا کا ایک جہاں بند تھا اور جب کسانوں اور مزدوروں نے

اوران تمام لوگوں نے جو پسماندہ تھے اور ظلم کے بوجھ تلے پس رہے تھے اسے دیکھا اور اس کی آواز سنی تو ان کے مردہ دلوں میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ ناامیدی کی جگہ امید نے لے لی۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کی جے کا نعرہ لگایا۔ اور حوادثِ غم و آفات سے نکلنے کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔ لیکن جو نظام انھیں ایک مدت سے کچل رہا تھا اس نے ان کی راہ میں رکاوٹ ڈالی۔ یہ نظام بھی میدان میں آیا۔ اور اس نے انھیں اور زیادہ کچلنے کے لیے نئے ہتھیار، نئے قوانین اور نئے آرڈیننس بنائے۔ انھیں بے دست و پا کرنے کے لیے اس نے نئی زنجیریں ڈھالیں۔ اس کے بعد ــــ ؟ یہ بتانا میرا منصب نہیں ہے یہ آنے والے کل کا ایک حصہ ہے اور جب آنے والا کل آج میں تبدیل ہوگا تو ہم سب جان جائیں گے ــــ لیکن اس میں کسے شک ہے؟"

ترجمے میں اصل زبان کی خوبی کو منتقل کرنا انتہائی مشکل کام ہے اور مجھے احساس ہے کہ میں اس نازک فرض سے بخوبی عہدہ برا نہیں ہو سکا۔ لیکن بتانا میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ دردمندانہ لب و لہجہ نہرو کے اندازِ بیان کا صرف ایک پہلو ہے۔ قادرالکلام مصنف کی طرح ان کا اندازِ بیان موضوع کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ انقلابِ فرانس کے موضوع پر نہرو کا قلم ایک نفسِ آتشیں کا روپ اختیار کر لیتا ہے اور میو نیچ پیکٹ کے بیان میں ایک ایسے مفکر کا جس کے دل میں ساری دنیا کا درد سمٹ کر آگیا ہو۔

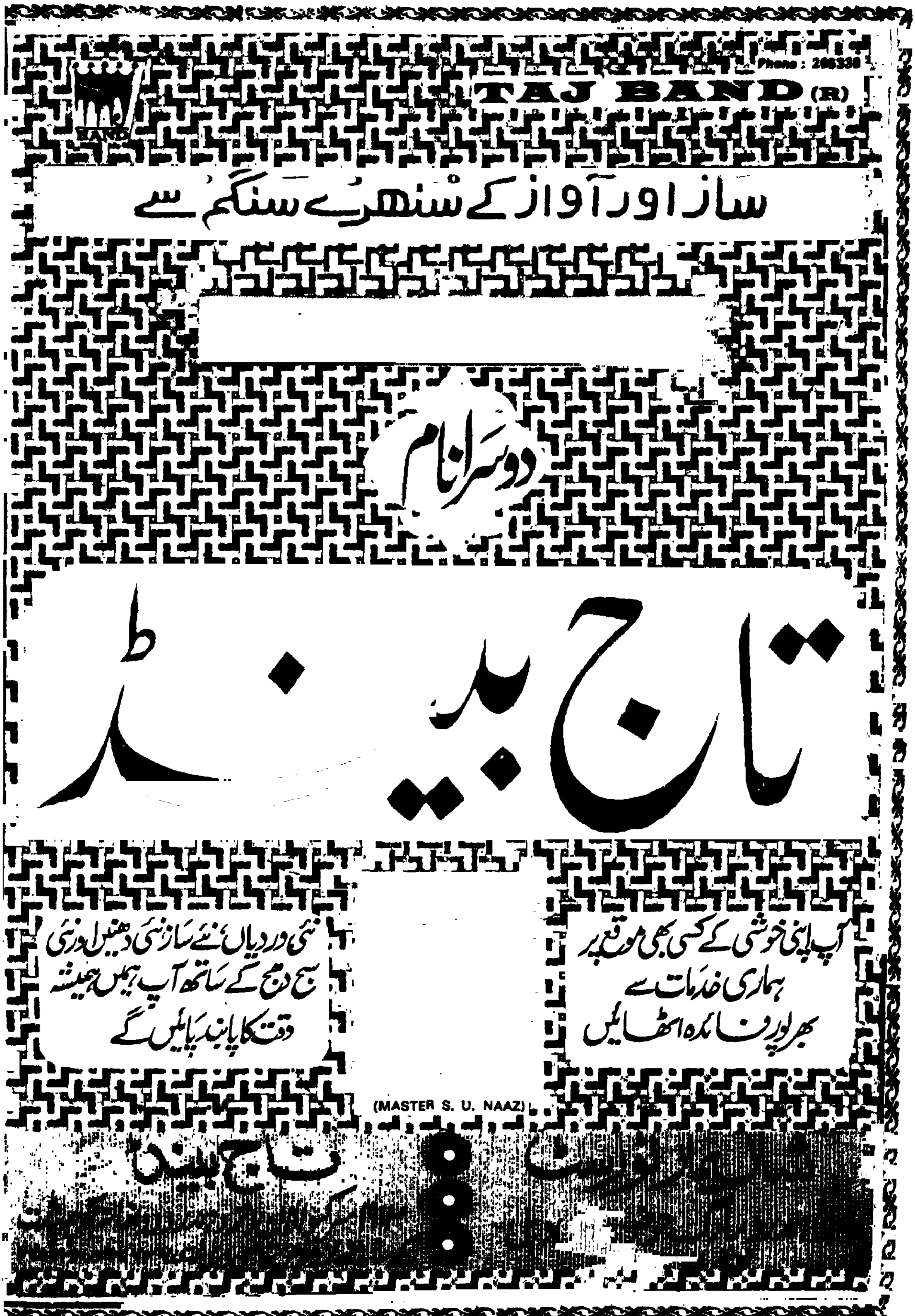
صحافت اور ادب کے بارے میں ہم اکثر ایک غلط فہمی کا شکار رہے ہیں۔ صحافت کو ہم نے ادب کے مقابلے میں ہمیشہ فروتر سمجھا ہے حالانکہ ان دونوں میں مقابلے کی کوئی بات ہی نہیں۔ صحافت صحافت ہے ادب ادب۔ تیسرے درجے کا ادب صحافت نہیں کہلاتا۔ اور اعلا درجے کی صحافت ادبِ عالیہ نہیں بن سکتی ادیب کا مقام ہمیشہ ادیب ہی کا مقام رہتا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی شاعری اور عبدالمجید سالک کے افکار و حوادث صحافت کے نمونے نہیں ہیں بلکہ ادب پارے ہیں۔ یہ دونوں حضرات مسلمہ طور پر شاعر ہیں اور ادیب ہیں۔ صحافت کو انھوں نے ادب کی دولت سے مالامال کیا ہے۔ ان کی نظم و نثر کو پرکھنے کے لیے صحیح کسوٹی ادب کی ہے صحافت کی نہیں۔ اسی طرح مسائلِ عالم پر جواہرلال نہرو کی اکثر تحریروں کے بارے میں بھی ایک رائے یہ ہے کہ یہ صحافت ہے ادب نہیں، اصل میں یہ ہمارا سطحی اندازِ نظر ہے جو ایسی تحریروں کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا۔ یہ تحریریں ہر اعتبار سے ادب پارے ہیں اور یہی ادب ہے جو زندگی کی رہنمائی بھی کرتا ہے اور زندگی کی نشوونما بھی۔

اس مقالے کو ترجموں سے بوجھل بنانا میرا مقصود نہیں۔ یہاں صرف ان کی "سوانح حیات" سے ایک پیراگراف پیش کرتا ہوں۔

"کھلی فضا میں لیٹے ہوئے میں نے آسمان پر ایک نظر ڈالی، بادلوں کو دیکھا اور شاید پہلی بار میں لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے رنگوں کے حسن سے متاثر ہوا۔

بادل یوں اپنا رنگ بدل رہے تھے جیسے ہر لمحہ ایک نیا ہی عالم پیشِ نظر ہو۔ اس طرح سے لیٹے رہنا اور وقت کی عشرت سے لذت یاب ہونا بھی کتنی بڑی دولت ہے ــــ! دراصل وقت ہمارے لیے حاملِ عشرت نہیں تھا۔ یہ ایک بوجھ تھا لیکن برسات کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے بادلوں کو دیکھنے میں جو وقت میں نے گزارا، ایک سراپا عالمِ مسرت تھا مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میں نے کوئی نئی دریافت کرلی ہو۔ میں نے یوں محسوس کیا گویا مجھے زنداں سے رہائی مل گئی ہو۔ معلوم نہیں ایک برسات کیسے مجھ پر اتنا گہرا اثر چھوڑ گئی۔ برساتیں اس سے پہلے بھی آئیں اور بعد میں بھی لیکن ان میں وہ بات نہیں تھی۔

پہاڑوں پر اور سطحِ بحر پر میں نے کئی بار طلوع اور غروب کے جاں پرور نظارے دیکھے تھے۔ میری آنکھیں ایسے مناظر سے پوری طرح سیراب ہو چکی تھیں۔ میں نے ان مناظر کو ایک بار کلی طور پر اپنانے کے بعد دنیا کے کاموں میں الجھ گیا تھا۔ جیل میں نہ طلوع تھا نہ غروب۔ افق کی حد ہماری نظروں سے پوشیدہ تھی اور طلوع کے کافی دیر بعد آتشیں کرنیں برساتا ہوا سورج جیل کی دیوار کے اوپر سے نمودار ہوتا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتے رنگ تو کیا کسی بھی رنگ کا کوئی سوال نہیں تھا۔ ہماری نظریں تھیں اور جیل کی چار دیواری اور چار دیواری میں گھری ہوئی بارکیں۔ اس چار دیواری اور بادلوں کی عمر کسی سائے کسی رنگ کے انتظار میں ختم ہو رہی تھی ــــ اور جب برسات کے بادل آہستہ آہستہ میرے اوپر سے گزرے تو مجھ پر ایک حیرت ناک کیفِ مسرت طاری ہوگیا



Phone : 266330
TAJ BAND (R)
ساز اور آواز کے سنہرے سنگم سے
دوسرا نام
تاج بینڈ
آپ اپنی خوشی کے کسی بھی موقع پر
ہماری خدمات سے
بھرپور فائدہ اٹھائیں
نئی وردیاں، نئے ساز، نئی دھنیں اور نئی
سج دھج کے ساتھ آپ ہمیں ہمیشہ
وقت کا پابند پائیں گے
(MASTER S. U. NAAZ)
تاج بینڈ

مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میں ایک عجیب عالمِ سرمستی میں ہوں۔

بادلوں میں کہیں کہیں ایک شگاف سا پیدا ہو جاتا تھا تو میری نگاہ بادلوں میں سے نکلتی ہوئی نیلے آسمان تک پہنچ جاتی تھی جس کی گہرائی کا اندازہ تو کیا ہو سکتا تھا ہاں وہ نیلا آسمان مجھے ابدیت کا ایک جزو نظر آنے لگا تھا"

میں نہیں کہہ سکتا کہ اصل تحریر کی سادگی، سلاست، شگفتگی اور لطافت کو میں کہاں تک اردو میں منتقل کر سکا ہوں لیکن اس انداز کی لطیف تحریریں نہرو کی تصانیف میں قدم قدم پر نظر آتی ہیں اور یہ سلاست اور سادگی تشبیہ اور استعارے کے حسن سے خالی نہیں۔ ایک مثال دیکھیے

مثلاً بعد نسل انگریزوں نے ہندستان کو کنٹری ہاؤس کے مکان (COUNTRY HOUSE) کی طرح استعمال کیا۔ جدید مکان کی طرح یہ مالک مکان کے بہترین حصے تو اپنے مصرف میں لے آئے اور ہندستانیوں کو رہنے کے لیے نوکروں کا کمرہ ملا، کچن ملا، پینٹری ملی ہر کنٹری ہاؤس میں ایک طبقہ ایسے ہی لوگوں کا مستقل طور پر رہتا ہے مثلاً خانساماں، رکھوالا، باورچی، ملازم، ملازمہ، سائیس وغیرہ اور ان سب کے درمیان بھی ایک فرقِ مراتب کا اصول کارفرما تھا۔ مکان کی ان سطحوں میں سماجی ناہمواریوں اور سیاست کی ایک ناقابلِ عبور دیوار حائل تھی لیکن زیادہ حیرت ناک بات یہ نہیں تھی کہ انگریزی حکومت نے ہم پر یہ دھاندلی ٹھونس رکھی تھی۔ زیادہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ہم نے یا ملک کی اکثریت نے اسے ایک ناگزیر ضابطۂ حیات سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ ہمارا مزاج کنٹری ہاؤس کے ملازم کا مزاج بن گیا کبھی کبھی ہماری عزت افزائی بھی کر دی جاتی تھی۔ اور وہ یوں کہ ڈرائنگ روم میں ایک پیالہ چائے کا دے دیا جاتا تھا۔ ہماری انتہائے آرزو یہی تھی کہ ہم فرداً فرداً ترقی کر کے مکان کے اوپر والے طبقے تک پہنچ جائیں۔ کسی بھی فوجی اور سیاسی فتح سے زیادہ انگریز کی یہ نفسیاتی فتح تھی جو اس نے ہندستان پر پائی تھی ـــــ

یہاں مجھے اقبال کا ایک شعر بے اختیار یاد آ رہا ہے ؎

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

ان دونوں عظیم مفکروں کے اندازِ فکر میں کتنی مماثلت ہے ـــ!
کتنی حیرت انگیز مماثلت ـــــ!

نہرو کی نثر طنز و مزاح اور ظرافت کے عناصر سے بھی خالی نہیں وزیروں اور جرنیلوں کی طرف سے انھیں دعوتیں ملیں تو ان شان و شوکت کو وہ فقروں میں اڑاتے ہیں ـــــ

"میرا خیال ہے اس فضائی بمباری کے دور میں اس سے زیادہ مہمان دوستی اور عزت افزائی ممکن نہیں ہے"

برطانوی حکومت نے کسی دوسری حکومت کو احتجاجی نوٹ بھیجا تو آپ نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا۔

"برطانوی حکومت نے احتجاج اور شکایات کا ایک صالح نوٹ بھیجا۔ اب غیر ملکی معاملات میں اس حکومت کا یہی سب سے بڑا کام رہ گیا ہے"

آپ کا مقالہ "زنداں کے غرفے سے" اس مزاج کی ایک عمدہ مثال ہے

جواہر لال نہرو کی کوئی بھی تصنیف آپ دیکھیں کسی بھی تحریر پر نگاہ ڈالیں، ایک بات روزِ روشن کی طرح واضح نظر آئے گی کہ ان کی نگارشات صرف "نتیجۂ فکر" ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے جوشِ کردار کی ایک ایسی قوت بھی موجود ہے جسے علامہ اقبال نے لفظ "عشق" سے تعبیر کیا ہے۔ نہرو کی نثر صرف ایک "کلکِ گوہر بار" کا کارنامہ نہیں بلکہ دراصل ایک ایسی شخصیت کا پرتو ہے جو حرکت، جہد اور عمل سے عبارت ہے۔ جواہر لال نہرو محض الفاظ سے کھیلنے والے مصنف نہیں ہیں بلکہ ان کی نظر تخلیقِ ادب کی اس حقیقت پر تھی جو اقبال نے "ارتباطِ حرف و معنی اختلاطِ جان و تن" کہہ کر بیان کی ہے۔

نہرو کے اندازِ بیان کا نیاپن ادب کی ایک بہت بڑی دولت ہے۔ دنیا بھر کے مفکروں کے خیالات سے مستفید ہونے کے باوجود آپ کی تحریروں میں نقالی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ آپ کے خیالات ہر مقام پر نئے تقاضوں کا ساتھ دیتے نظر آتے ہیں۔ گاندھی کا فلسفۂ حیات ہو یا مارکس کا، ایچ جی ویلز کا ہو یا لینن کا، نٹشے کا ہو یا تلسی داس کا، نہرو کے یہاں آ کے وہ نہرو کی اپنی حیات کا جزو بن گیا ہے ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ ان کے خونِ جگر کا جزوِ لاینفک بن گیا ہے اور وہی خونِ جگر ایک زندہ اور جی دار اندازِ فکر بن کر صفحۂ قرطاس پر نمودار ہوا ہے

محبِ وطن جواہر لال نہرو کو ہندستان کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ لیکن یورپ، امریکا اور روس کے اہلِ فکر و نظر جس نہرو سے بدرجۂ اتم متاثر ہوئے ہیں اور جس نہرو نے ان کے دل و دماغ پر ایک جاودانی نقش چھوڑا ہے وہ اہلِ قلم نہرو ہے، وہ اہلِ قلم جس نے دنیا کو "دریافتِ ہند"

شوانح حیات اور تاریخ عالم کی جھلکیاں لیے زندہ جاوید کارنامے عطا کیے ہیں اور جن کارناموں نے بنی آدم اعضائے یک دیگر ند کا ازلی اور ابدی نظریہ نئی دنیا کو پیش کیا ہے۔

روس کے ایک مصنف بوروک جواہر لال نہرو کے انتقال کے بعد ان کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"جواہر لال نہرو نے اپنی ایک کتاب کا نام "دریافت ہند" رکھا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ان کی خود نوشت سوانح عمری کی اشاعت سے لاکھوں سوویت قارئین نے ایک نیا نہرو دریافت کیا۔ وہ نہرو جو ادیب اور سائنس داں تھا۔ اس سے پہلے تک ہمارے لیے نہرو ایک ممتاز سیاست داں اور نو آبادیاتی نظام کے خلاف لڑنے والے ایک پرجوش مجاہد تھے۔ ان شاندار تصانیف سے روشناس ہو کر ہی سوویت عوام کو ہندستان کے اس عظیم سپوت کے علم و دانش کی گہرائیوں کا پتہ چلا۔ انہوں نے صرف سیاست کے میدان ہی میں نہیں بلکہ تاریخ اور ہندستانی اور عالمی کلچر کے میدان میں بھی ان کے علم کی وسعتوں کا عرفان حاصل کیا۔

"سوویت یونین میں ان کتابوں کی اشاعت سے پہلے مشرق شناسوں، معیشت کے ماہروں، ادیبوں اور علم الہند کے ماہروں نے مفصل تحقیقات کیں۔ ماسکو کے غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر نے ان کتابوں کی اشاعت کا بڑا اہتمام کیا۔ بہترین ترجموں نے سوویت قارئین کے سامنے نہرو کی خوبصورت زبان اور ان کے دلکش اسلوب کی پیشکش پر خاص توجہ دی اور ان بے شمار انسانوں کی محنت بارآور ہوئی۔ اگرچہ کتابیں بڑے پیمانے پر شائع کی گئیں اور سوویت یونین کی تمام جمہوریتوں میں بھیجی گئیں پھر بھی اشاعت گھروں میں خطوط کا سیلاب امنڈتا رہا جن میں "دریافت ہند" اور "سوانح حیات" کی کم از کم ایک ہی جلد مہیا کر دینے کی درخواست کی جاتی رہی۔

"سوویت قارئین کی نگاہوں میں ان کتابوں کے صفحات نے ایک بار پھر اس حیرت انگیز انسان مجاہد اور دانشور کا سراپا ابھارا۔ سوویت قارئین نے جو مصنف کا بے حد احترام کرتے تھے پوری طرح یہ محسوس کیا کہ جواہر لال نہرو کو اپنی کتاب "دریافت ہند" کا اختتام بہادر سوویت ادیب نکولائی اوستروسکی کے ان الفاظ پر کرنے کا پورا حق پہنچتا ہے۔

" زندگی انسان کی عزیز ترین متاع ہے اور یہ زندگی انسان کو صرف ایک بار ملتی ہے یہ زندگی اسے اس طرح گزارنا چاہیے کہ اسے اُسے کبھی شرمندگی نہ ہو کہ برسوں وہ بغیر کسی مقصد کے زندہ رہا ہے کبھی اسے ایک ذلیل اور بے کار ماضی پر شرمساری کا احساس نہ ہو۔ وہ اس طرح زندہ رہے کہ جب موت کی آہٹیں محسوس ہوں تو یہ وہ کہہ سکے کہ میری ساری صلاحیتیں دنیا کے حسین ترین مقصد یعنی بنی نوع انسان کی نجات کے لیے جدوجہد کی نذر کر رہی ہیں۔"

نشانِ منزل   موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی   ۱۹۸۲



از: اندرجیت لال

اردو شعروادب میں سائنس

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

قدرت کے کارخانے میں آسمانی عجائبات سے عجیب تر اور کوئی چیز نہیں۔ اور فلکیاتی نظاروں سے شاندار کوئی دوسرا نظارہ نہیں۔ یہی سبب ہے کہ انسان آسمان کی طرف سب سے پہلے متوجہ ہوا۔ اور آسمان کے اندر جو کچھ موجود ہے اسے جاننے پہچاننے کی سعی کرتا رہا۔ آسمان کے اسرار کو انسان بہت زیادہ سمجھ نہ سکا۔ کیونکہ سو ڈیڑھ سو برس پہلے یہ بہت ہی مشکل بات تھی اس کے باوجود شاعر کا مذکورہ بالا شعر اردو ادب میں اس زمانہ کی یاد دلاتا ہے۔

غالب کے زمانہ میں سائنس کسی معیاری منزل پر نہ تھی۔ مغل سلطنت کا شیرازہ بکھرتا جا رہا تھا۔ انگریزوں کے پاؤں ہندستان میں مضبوط ہو رہے تھے۔ سیاسی افراتفری اور سن ۱۸۵۷ کے غدر نے سارے ملک کو ہلا دیا تھا۔ ہندستانی سائنس کی روشنی سے ان دنوں کوسوں دور تھے۔ محکوم بے چارے تحقیق و انکشافات اور تجربات کا کام کیا جانتے تھے۔ ایسے حالات کے باوجود غالب کے اشعار میں کہیں کہیں سائنسی معاملات کی طرف تجسس کا اظہار ہوتا ہے۔ ع

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ظاہر ہے غالب سائنس کے اس نظریہ سے پوری طرح واقف نہ تھے کہ ابر و ہوا کی ماہیت کیا ہے۔ کیونکہ اگر واقف ہوتے تو اس بات کو کسی اور پیرائے میں بیان کرتے۔

سیاروں کے مطالعہ و مشاہدہ کا ذوق ان دنوں اتنا عام نہ تھا۔ جتنا ان دنوں بین اقوامی سطح پر ہے پھر بھی مشتری، زہرہ، چاند یا چھوٹے چھوٹے ٹمٹماتے تارے ان دنوں لکھے پڑھے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتے تھے۔ "کیا" اور "کیوں" کے کئی سوالات لوگوں کے دلوں میں اٹھتے تھے۔ مرزا غالب نے غلط نہیں کہا ہے۔ ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

غالب سائنس داں نہیں تھے لیکن ان کا یہ مشاہدہ تھا کہ پانی گرم ہو جانے کے بعد بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے یہ ایک سائنسی حقیقت تھی جسے غالب نے اس شعر میں خوبصورتی سے سمو دیا۔ ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج ... باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

رنج سے گویہ میدل بہ دم سرد ہوا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

غالب انگریزی زبان سے واقف نہ تھے اس لیے سائنس کے علم سے بھی نابلد رہے۔ مگر تھے بلا کے ذہین اور ان کی قوتِ مشاہدہ بہت تیز تھی۔ ذہن متجسس تھا اس لیے علم فلکیات سے واقف نہ ہونے کے باوجود یہ شعر کہہ گئے۔ ؎

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

بنات النعش گردوں دراصل سات ستاروں کے جھرمٹ کا نام ہے جسے "گوبٹیز" بھی کہا جاتا ہے اس جھرمٹ کی خوبی یہ ہے کہ اس کے دو ستارے ہمیشہ قطب ستارے کی طرف اشارہ کرتے ہیں غالب نے مشاہدہ کیا کہ یہ سات ستارے آسمان پر سب سے زیادہ عجیب انداز میں حرکت کرتے ہیں۔ اس لیے ان سات ستاروں نے ان کے ذہن کو متاثر کیا اور یہی تاثر شعر میں نمودار ہوا۔

علامہ اقبال مشرقی و مغربی ادب کے سنجیدہ اور ذہین عالم تھے ان کے فکر و نظر میں بڑی وسعت تھی جس سے انسان کائنات اور اسرارِ کائنات کے رازہائے سربستہ منکشف ہوتے تھے۔ جہاں ان کا اندازِ فکر ایک طرف خالص مذہبی تھا تو دوسری طرف سائنسی و تکنیکی۔ جس نے ان کے کلام میں معنویت اور افادیت پیدا کر دی۔ اقبال کہا کرتے تھے، "میں نے دل کو عقل کے نور سے روشن کیا اور عقل کو دل کے معیار پر پرکھا۔" اقبال کا زاویۂ نگاہ سائنسی رہا۔ وہ اس بات کے حامی تھے کہ دلفریبوں و انکشافات سے بھری ہوئی کائنات میں انسان کو قدرت کے بھید تک پہنچنا چاہیے۔ نئی روشنی تحقیق و تجسس اور انہماک کا جذبہ اقبال کے ان اشعار میں بخوبی ملتا ہے۔ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اکبر الٰہ آبادی نئی روشنی کے قدر دان تھے اور اسے ہندستان کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ سمونے کے خواہاں تھے۔ ان کے ——— اشعار ان کے ترقی پسند ہونے کے مظہر ہیں۔ ؎

کہتے ہیں راہ ترقی میں ہمارے نوجوان
خضر کی حاجت نہیں ہم کو جہاں تک ریل ہے

اکبر ایک دور اندیش اور روشن خیال اور نئے شعور کے شاعر تھے۔ اور اس بات کا انہیں اطمینان تھا کہ سائنس کی روشنی ہندستان کو دن بہ دن منور کرتی جائے گی پرانے تصورات کی جگہ جدید سائنسی علم مقبول ہوگا کیونکہ سائنسی علم ہی سے انفرادی و اجتماعی تعمیر و ترقی ہو سکتی ہے۔ اسی لیے انہوں نے فرمایا ؎

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

سائنس کی برکات نے دنیا کی تہذیب و تمدن کے فروغ میں بڑی مدد پہنچائی ہے۔ زندگی کی اندھیری راتوں کو روشن تر بنانے کے لیے جھاڑ فانوس سے زیادہ رنگا رنگ برقی قمقموں نے سامان روشنی فراہم کیا ہے، گوناگوں نئے طور طریقوں اور وسیلوں نے انسان کو بڑی سہولتیں و آرام بخشے ہیں۔ سائنس کی برکت ایٹمی توانائی ہی کو لیجئے۔ یہ توانائی کتنی زبردست ثابت ہوئی ہے اس کا ذکر پروفیسر جاوید وششٹ نے اس شعر میں ملاحظہ ہو ؎

سمجھا ہے تو ذرے کو فقط ذرۂ ناچیز
چھوٹی سی یہ دنیا ہے جو سورج سے بڑی ہے

ایٹم ایک حقیر ذرہ ہے لیکن جب اس کا جگر چیرا جاتا ہے تو اس میں سے ایک آفتاب نکلتا ہے ایک قدیم سائنس داں البوالہشم نے ایک جگہ لکھا ہے۔ "تم اگر ایک ذرہ کا جگر چیر کر دیکھو تو تمہیں اس میں آفتاب نظر آئے گا" جدید شاعر نعیم اس نظریہ کو یوں شعر میں باندھتا ہے ؎

امیرِ چرخ کا احساں نہیں ہے مجھ پہ نعیم
مجھے ہے ناز کہ ذرہ سے آفتاب بنا

آج کا نوجوان شاعر ہمارے معاشرے پر سائنس کے اثر کو اپنی شاعری میں مضمون کے طور پر باندھتا ہے اور خوبصورت الفاظ میں بڑی بے باکی سے یوں کہتا ہے ؎

یہ کارخانوں کے دل کی دھڑکن — یہ گنگناتی ہوئی مشینیں
میرے تصرف میں سیلِ دریا ! — ہیں بجلیاں میری دسترس میں
ہوا کی زلفیں ہیں میرے ہاتھوں میں میرا بازیچہ ہے عرشِ اعظم
فضا میں پرواز کر رہے ہیں مرے تدبر کے نقشِ محکم
ستاروں کی حسین دنیا سے چن کے لایا حسین موتی
حقیر ایٹم کا راز پا کر — جبینِ تعمیر کو جلا دی

بسمل سعیدی اس دور کے ایک حساس شاعر ہیں ان کی کچھ غزلیں ایسی بھی ہیں جو اندھیرے میں قندیل کا کام انجام دیتی ہیں۔ غزلیں کیا ہیں آج کے سائنسی دور میں نئی روشنی و ترقی کا پیغام جان پڑتی ہیں۔

نیا سماں ہے نیا اک جہاں ہے اور ہم ہیں
نئی زمین نیا آسماں ہے اور ہم ہیں
نئے مقام نئے مرحلے نئی راہیں
نئے ارادے نیا کارواں ہے اور ہم ہیں
ہمارے نقشِ قدم ہیں یہ مہر و ماہ و نجوم
ہماری راہ سرِ کہکشاں ہے اور ہم ہیں
گئی وہ قصۂ کہنہ کی ساری بات گئی
نیا زمانہ نئی داستاں ہے اور ہم ہیں

آج کا انسان چاند پر کمند ڈالنے پر کمربستہ ہے۔ مہم باز پے در پے چاند کی کنواری دھرتی کا دورہ کر کے قدرے کامیاب لوٹ آئے ہیں

تسخیرِ قمر کا خواب آج حقیقت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ فضائی سفر اب قصہ کہانی نہیں رہا۔ اس لیے کہ ہر مہم اپنے ساتھ کچھ معلومات لاتی ہے کچھ خوشی بھی۔ شاعر (پروفیسر اے۔ سی۔ بہار) اس خوشی کا اظہار ان لفظوں میں یوں کرتے ہیں۔

؎ اک خاک کے پتلے نے غضب ڈھایا ہے — آکاش سے دھرتی پہ خبر لا دیا ہے!

پیہم یہ جذبۂ پرواز جنوں ! انسان کے حصے میں فقط آیا ہے
اب چاند پہ انسان نے پھینکی ہے کمند دیکھے تو کوئی اس کا ذرا عزم بلند
پھیلا فرش زمیں پر جس آدم کو پھر عرش نشیں ہے وہ خدا کا فرزند
باقی مہ و خورشید کی دوری نہ رہی پھر رفعت افلاک ضروری نہ رہی
بے تاب تھا کونین پہ چھا جانے کو انسان کی یہ خواہش بھی ادھوری نہ رہی

اُردو کے کئی شاعروں نے انسان کی عظمت پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اتنی فہم و فراست انسان ہی کو قدرت نے عطا کی ہے جس کی بدولت وہ ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔ تخلیق و تحقیق کی منازل طے کرتا ہوا ترقی کا زینہ چڑھ سکتا ہے۔ اس کیفیت کو ذہن میں رکھ کر علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

ایک جدید شاعر تسخیرِ قمر کے مضمون سے جِلا لے کر انسان کے جذبۂ تحقیق اور اس کی صحیح خواہش کی یوں ترجمانی کرتا ہے ؎

تمام تاروں کو چھوتا ہوا گزر جاؤں کمان بن کے مجھے تیر سا رواں کر دے

تنقید و تاریخ میں اُردو کے جن نقادوں نے سائنس کو سوچا سمجھا ہے اسے اپنایا ہے ان کی تحریریں منطق کا رنگ پیدا ہو گیا ہے ان کا استدلال قوی ہو گیا ہے بلکہ یوں کہیے ان کا زاویۂ نظر ہی سائنٹیفک بن گیا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور سائنس کے متعلق یوں فرماتے ہیں ”سائنس نے مجھے ایک خاص عینک سے دیکھنے کی بجائے اس کے اپنے رنگ میں دیکھنا سکھایا۔ سائنس نے اس سوال کو پس پشت ڈال دیا کہ میں کیا جانتا ہوں یا کیا پسند کرتا ہوں بلکہ یہ سکھایا ہے کہ یہ کیا ہے اور کیسا ہے سائنس نے مجھے خوبیوں اور خامیوں کو پرکھنا سکھایا ہے۔ سائنس نے بنیادی اور جزوی باتوں میں فرق کرنا سکھایا“

یورپ و امریکہ میں سائنس کو عام موضوعات کی سطح پر لکھنے کا رواج بڑے زوروں پر ہے۔ مگر ہندوستان میں اور خصوصاً اردو میں اس تناسب سے معلوماتی سائنس پر نہیں لکھا جا رہا جس تناسب سے شعر و ادب

اور دوسری اصناف پر لکھا جاتا ہے سائنسی موضوعات کی اہمیت پر راقم الحروف کی کتاب ”آج کی سائنس“ سے اقتباس ملاحظہ ہو ”بچپن میں ہم سائنس کے کرشموں کا ذکر پڑھتے تھے ان کرشموں میں ریل گاڑی، ہوائی جہاز، وائرلیس وغیرہ شامل تھے ان دنوں لوگ سائنس کو کرشموں یا عجوبوں کا دوسرا نام سمجھتے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا سائنس کے کرشمے زیادہ سے زیادہ سامنے آنے لگے یہاں تک کہ سائنس آج انسانی زندگی کا ایک حصہ بن چکی ہے آج سائنس کی ایجادوں کی طرف نظر ضرور اٹھتی ہے لیکن کرشموں کے دن بدلنے پر کوئی حیران نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ آج سائنس انسانی زندگی سے الگ نہیں رہی کھیتی باڑی ہو یا دستکاری ڈاکٹری ہو یا انجینئرنگ ہر پیشہ اور زندگی کے ہر کاروبار میں سائنس کی اہمیت سے ہم واقف ہیں۔“

اردو ادب میں جدید سائنس پر کہیں کہیں قلیل القدر تذکرے ملتے ہیں جو معلوماتی بھی ہیں اور دلکش بھی آئین اسٹائن کے نظریہ اضافت پر پروفیسر محمد رضی الدین صدیقی لکھتے ہیں آئین اسٹائن نے نظریہ اضافت کی بنا پر یہ ثابت کیا کہ توانائی بھی ایک جمود رکھتی ہے جس کو عرف عام میں وزن کہا جاتا ہے۔ مادہ اور توانائی دو مختلف اشیاء نہیں بلکہ ایک ہی شے کے دو مختلف روپ ہیں۔ روشنی کی شعاع صرف اس وقت سیدھے خط میں پائی جاتی ہے جبکہ فضا میں کوئی مادہ نہ ہو۔ لیکن اگر یہی شعاع کسی مادی جسم کے قریب سے گزرے تو اپنے سیدھے راستے سے مڑ جائے گی :

”اس سائنس داں نے ایک فارمولا بھی پیش کیا جو بتاتا ہے کہ کس مادی شے سے کس قدر توانائی اور کس توانائی سے کس قدر مادہ حاصل ہوتا ہے۔ مادہ اور توانائی میں کوئی اساسی اختلاف نہیں ہے بلکہ ایک ہی شے کبھی ذرہ کے خواص کا اظہار کرتی ہے اور کبھی موج کے خواص کا۔ آئین اسٹائن کے خیال میں کائنات متناہی ہے اور اس کے کسی دو نقطوں کا درمیانی فاصلہ معین ہے لیکن چونکہ کائنات کرہ یا گول کی شکل کی ہے اس لیے اس پر کہیں کوئی حد یا کنارہ نہیں ہے اور جب تک چاہیں اس کے گرد سفر کر سکتے ہیں۔ اس لیے کائنات کو متناہی مگر غیر محدود کہتے ہیں۔ یہ نتیجہ فضا کے مڑی ہوئی ہونے کا ایک معمولی نتیجہ ہے“ (مذہب اور سائنس)

جب آئین اسٹائن کہتا ہے کہ کائنات میں ہر چیز اضافی ہے یعنی آپ کسی شے کو دیکھ کر یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ جو کچھ آپ کو نظر آ رہی ہے مثلاً ہمیں روزانہ سورج آسمان پر چڑھتا اور اترتا نظر آتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ سورج زمین کے گرد گھوم رہا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے ہمیں سورج کی یہ حرکت اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ ہماری زمین اپنے محور پر گھوم رہی ہے۔ آئین اسٹائن کے اس خیال کو حسن نعیم نے اس شعر میں

ملاحظہ ہو۔

میں بیولوں کی طرح پھولا پھلا ہوں دشت میں
ابر آئے یا نہ آئے میں سدا شاداب ہوں

مری نظر پہ جو قطرہ دکھائی دیتا ہے
تری پلک پہ ستارہ دکھائی دیتا ہے

اردو میں متفرق مضامین بھی ان برسوں میں شائع ہوئے جن میں قدرت، کائنات اور سائنس کا ذکر ملتا ہے۔ سائنس کے حق اور مخالفت میں مواد بھی اور کہیں کہیں ایسا مواد خوبصورت نثر میں۔ وحید الدین خاں لکھتے ہیں "سائنس کی ترقی اور علم کے پھیلاؤ نے اب انسان کو وہ کچھ دکھا دیا ہے جس کو پہلے اس نے دیکھا نہیں تھا واقعات کی جن کڑیوں کو نہ جاننے کی وجہ سے ہم سمجھ نہیں سکتے تھے کہ یہ واقعہ کیوں ہوا وہ اب واقعات کی تمام کڑیوں کے سامنے آجانے کی وجہ سے ایک جانی بوجھی چیز بن گیا ہے۔ مثلاً پہلے آدمی یہ نہیں جانتا تھا کہ سورج کیسے نکلتا ہے اور ڈوبتا ہے اس لیے اس نے سمجھ لیا کہ کوئی خدا ہے جو سورج کو نکالتا اور غروب کرتا ہے۔ اس طرح ایک ما فوق الفطرت طاقت کا خیال پیدا ہوا۔ اور جس چیز کو آدمی نہیں جانتا تھا اس کے متعلق یہ کہہ دیا کہ یہ اس طاقت کا کرشمہ ہے مگر اب جبکہ ہم جانتے ہیں کہ سورج کا نکلنا اور ڈوبنا اس کے گرد زمین کے گھومنے کی وجہ سے ہوتا ہے تو سورج کو نکالنے اور غروب کرنے کے لیے خدا کو ماننے کی کیا ضرورت ہے اس طرح وہ تمام چیزیں جن کے متعلق پہلے سمجھا جاتا تھا کہ ان کے پیچھے کوئی ان دیکھی طاقت کام کر رہی ہے وہ سب جدید مطالعہ کے بعد ہماری جانی پہچانی فطری طاقتوں کے عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ نظر آیا۔ گویا واقعہ کے فطری اسباب معلوم ہونے کے بعد وہ ضرورت آپ سے آپ ختم ہوگئی جس کے لیے پہلے لوگوں نے ایک خدا یا ما فوق الفطرت طاقت کا وجود فرض کر لیا تھا۔"

سائنسی تحقیقات اور انکشافات کے انہماک میں روحانیت ایک حد تک قربان ہوگئی اور ہندستان چونکہ فلسفہ و دھرم کا گہوارہ رہا ہے اس لیے کئی شعرا اور ادبا کو اس سے قلبی بے اطمینانی ہوگئی۔ طنز و مزاح اور اعتراضات کے ٹکڑے بہت ملتے ہیں۔ جن میں انفرادیت اور حسن ہے اور سائنسی نظریات پر ایک ہلکا پھلکا مزاح۔

نئی تہذیب کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈاروان کو حضرت آدم سے کیا مطلب

کچھ خدا سے ہے شکایت کچھ فرشتوں سے گلہ
اس سے کیا شکوہ کروں میں جو کبھی بندر بھی تھا

پیام فخر ہے ذرات کی توانائی
مگر یہ فخر ہے بنیادِ انتشارِ حیات

ہوائے تند کا جھونکا ہے وقت کا رجحان
اور اس کی زد میں ہے گیسوئے تیدارِ حیات

انسان نے مشینوں ایجادوں اور نئے نئے سائنسی نظریات کی بدولت ترقی کی شاہراہ پر قدم بڑھایا ہے اور اب اس سے پیچھے جانا نہیں چاہتا۔ اور پیچھے جانا کوئی عقل کی بات بھی نہیں۔ آج کا انسان سائنس کی برکات سے منحرف نہیں ہو سکتا اسے وقت کے دھارے کے ساتھ چلنا ہے اور یہ دھارا سائنس کا دھارا ہے بلاشبہ سائنس روشن مستقبل اور تعمیر و ترقی کی ضامن ہے۔

ہمیں بھی ذہن و فکر اپنے بدلنے ہیں جس کل
نئے خیال کا ہندستاں ہے اور ہم ہیں۔

سائنس اور ہندستان ——— سلوجہ پرکاشن دہلی ——— ۱۹۷۷ء

ایم حبیب خان



اردو تحریک اور انجمن ترقی اردو ہند

سرسید کی تحریک پر علی گڈھ میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم ہوئی، جنوری ۱۹۰۳ء میں اس کانفرنس کو تین شعبوں میں تقسیم کیا گیا، جن میں سے ایک شعبے کا نام انجمن ترقی اردو ہند رکھا گیا، اس شعبے کے مقاصد میں اردو زبان کی ترقی اور اس کے علمی سرمائے میں اضافہ تھا۔ ابتدا ہی سے انجمن ایک سیکولر ادارہ رہی ہے، مسلم اور غیر مسلم دونوں فرقوں کے لوگوں نے انجمن کی ترقی اور فروغ میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

انجمن کے قیام کے وقت مندرجہ ذیل عہدے دار منتخب ہوئے:

صدر	پروفیسر ٹامس آرنلڈ
نائب صدر	مولوی نذیر احمد
"	مولوی ذکاء اللہ
"	مولانا خواجہ الطاف حسین حالی
اعزازی سکریٹری	مولانا شبلی نعمانی
اسسٹنٹ سکریٹری	مولوی حامد علی صدیقی سہارنپوری

مولانا شبلی نعمانی نے بڑی سرگرمی اور جوش کے ساتھ انجمن کے کام کیے اور عوام میں بھی اس کا جوش ابھارا انھوں نے اپنے زمانے میں انجمن سے بڑی اہم کتابیں شائع کیں، ان کتابوں میں دوسری زبانوں کے علاوہ انگریزی سے اردو میں ترجمے بھی شامل تھے، مولانا نے سکریٹری شپ کے زمانے میں ایک اور اہم کام کا آغاز کیا یعنی کسی بہترین کتاب کی اشاعت پر انعام دینا، اس زمانے میں انجمن کی کارگزاری اور رپورٹیں سرسید کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوتی تھیں، ان کارگزاریوں کی اشاعت سے لوگوں میں اردو زبان کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا، اور اردو زبان ترقی کی سرحد میں داخل ہو چکی تھی، مگر محض تنگ نظر حضرات اردو کی ترقی کو اتنا جلد آگے بڑھتا ہوا دیکھ کر کاوٹیں پیدا کرنے کی تدبیر سوچنے لگے۔ چنانچہ ایک خبر انجمن ترقی اردو کے بارے میں "ہندستانی" اخبار میں کسی شریف النسان نے یہ شائع کرادی کہ "اس (انجمن ترقی اردو ہند) نے ہندو جماعت کو علاحدہ رکھا"۔ حالانکہ ایسا بالکل نہیں تھا، اردو تو اس ملک کی زبان ہے جس میں ہندو مسلم، سکھ، عیسائی سب رہتے ہیں، اور اس زبان کو بولتے ہیں، اس خبر کو پڑھ کر مولانا شبلی بڑے خفا ہوئے، اور انھوں نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں یہ خبر شائع کرائی۔

> "یہ واقع کے خلاف ہے، انجمن کے قواعد میں اس خیال کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا اور عملی تردید اس خیال کی یہ ہے کہ انجمن نے سب سے پہلا انعام جو اردو تصنیف پر دیا اور ایک ایسی کتاب پر دیا جو ہندو قوم کے ساتھ مخصوص تھی یعنی "پیغمبران ہند" جس میں سری کرشن جی اور گوتم بدھ کا تذکرہ اور ہندو

لہ دسمبر ۱۹۰۲ء میں کنگ ایڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی کے موقع پر دہلی میں شاہی دربار منعقد ہوا، نواب محسن الملک جن میں پارس پتھر کی خاصیت تھی۔ انھوں نے اس موقع پر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقد کرائی جس کی صدارت ہز ہائی نس سر آغا خان نے کی تھی۔ اسی کانفرنس میں انجمن ترقی اردو کا شعبہ بھی قائم ہوا اور باقاعدہ طور پر جنوری ۱۹۰۳ء میں انجمن کا قیام عمل میں آیا اور اس کے عہدے داروں کا اعلان کیا گیا۔

مذہب کے اصول و عقائد ہیں'' ؎۱

یہ تھا انجمن کا سیکولر کردار جس سے انجمن کے کاموں کو آگے بڑھانے میں بڑی مدد ملی اور ہر قوم و مذہب کے لوگوں نے انجمن کی ترقی اور فروغ کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔

جب ۱۹۰۵ء میں علامہ شبلی نعمانی نے لکھنؤ میں ندوۃ العلما قائم کیا تو انجمن ترقی اردو (ہند) کی سکریٹری شپ سے استعفا دے دیا، مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی انجمن کے نئے سکریٹری منتخب ہوئے۔ شروانی صاحب چار سال تک انجمن کے سکریٹری رہے، انھوں نے انجمن کے کاموں میں غیر معمولی دل چسپی لی اور پوری کوشش کی کہ انجمن کے کچھ مالی وسائل پیدا ہو سکیں، لیکن ایسا نہیں ہوا، اور ۱۹۰۹ء میں انجمن کی مالی دشواریوں سے تنگ آکر حبیب الرحمٰن خان شروانی (نواب صدر یار جنگ) نے استعفا دے دیا۔ ان کے بعد مولوی عزیز مرزا انجمن کے سکریٹری منتخب ہوئے، مگر افسوس بہت جلد ان کا انتقال ہو گیا، مولوی عزیز مرزا کے بعد ان کے صاحب زادے مولوی سجاد مرزا نے انجمن کے کاموں کو دیکھا، لیکن انھیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی، حسن اتفاق سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی نظر انتخاب مولوی عبدالحق پر پڑی، چنانچہ انجمن کے چوتھے سکریٹری مولوی عبدالحق ۱۹۱۲ء میں مقرر ہوئے، یہ انجمن کی خوش نصیبی تھی کہ مولوی عبدالحق جیسے عالم فاضل و ادیب اور ایک سرگرم باصلاحیت انسان انجمن کو ملا، اب تک انجمن کو قائم ہوئے دس سال ہو چلے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ نامور ادیبوں کی سرپرستی کے باوجود کوئی نمایاں کام نہیں ہوا تھا، بقول مولوی عبدالحق

؎۱ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۔ ۲۶، اکتوبر ۱۹۰۳ء ۔ یہ ۳۰، مارچ ۱۸۶۶ء کو پہلی بار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ سے جاری ہوا۔ اس کی اشاعت سے بیرونی ملکوں میں رہنے والے باشندوں کے حالات اور ان کے رہن سہن کے طریقے اردو داں طبقے تک پہنچے۔ اس کے بعد اس اخبار میں بہت سی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ ۱۸۹۶ء سے گزٹ میں تہذیب الاخلاق بھی شامل کر دیا گیا۔ یہ ۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۷ء تک سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ سے شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد سرسید کی تجویز پر جولائی ۱۸۸۷ء سے گزٹ کو مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے تحت کر دیا گیا۔ جو مارچ ۱۸۹۸ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔

جب انھیں انجمن کا چارج دیا گیا، تو انجمن کا کل اثاثہ ایک پرانا صندوق جو بوسیدگی کی وجہ سے رسّی سے بندھا ہوا تھا، کچھ رجسٹر اور کچھ غیر مرتب شدہ مسودات، ایک قلم اور ایک ٹوٹی ہوئی پرانی دوات تھی، یہ تھا انجمن کا کل اثاثہ جو مولوی صاحب کو اپنے پیش رو کی طرف سے ملا، مولوی صاحب میں غیر معمولی خود اعتمادی علم سے لگن اور اردو سے والہانہ محبت تھی، اسی لیے اس اثاثہ نے انھیں بد دل نہیں کیا۔

اب تک انجمن کا دفتر علی گڑھ میں تھا، مولوی صاحب اسے اورنگ آباد لے گئے، وہاں نظام حکومت نے ایک خوب صورت عمارت؎۱ جو نہایت پرفضا مقام پر بنی ہوئی تھی انجمن کے دفتر کے لیے دیدی، مولوی صاحب نے حیدرآباد میں اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کرنا شروع کیا، نظام حیدرآباد اور بیگم بھوپال سے انجمن کے لیے سالانہ گرانٹ مقرر کرائی، اس کے علاوہ چندہ جمع کرنے کی اسکیم بنائی، مولوی صاحب نے چندہ جمع کرنے کے جو گُر سرسید سے سیکھے تھے ان پر عمل کر کے ایک کثیر رقم انجمن کے لیے جمع کی اور اس رقم کو علمی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت پر صرف کیا، انجمن کا بنیادی مقصد علمی اور تحقیقی کتابیں شائع کرنا تھا، اب اس مقصد کی طرف پوری توجہ دی گئی، مولوی صاحب نے اپنے گرد ادیبوں اور محققوں کا ایک ایسا حلقہ بنا لیا جن کی لکھی ہوئی کتابیں جو انجمن سے شائع ہوئی تھیں، آج بھی اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ سمجھی جاتی ہیں۔

پروفیسر ٹامس آرنلڈ کے بعد انجمن کے دوسرے صدر نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی بنائے گئے، انجمن کو ان کی وجہ سے بہت فائدہ پہنچا، ان ہی کی تحریک پر نظام حیدرآباد نے بارہ سو روپے کی سالانہ گرانٹ انجمن کے لیے منظور کی اور اس کی سرپرستی قبول فرمائی، مولوی صاحب کے سر اکبر حیدری سے خاص تعلقات تھے، اور حیدری

؎۱ یہ خوبصورت عمارت رابعہ دورانی کا مقبرہ ہے جو نہایت پرفضا مقام پر تھی یہیں مولوی صاحب نے انجمن کا دفتر قائم کیا اور اس کا نام اردو باغ رکھا۔ مولوی صاحب ان دنوں حیدرآباد میں ملازم تھے وہاں سے جب اس پرفضا مقام پر آئے تو اردو باغ کے ایک بنگلے میں ان کا قیام رہتا۔

صاحب بھی مولوی صاحب کی بے حد عزت اور احترام کرتے تھے اس لیے سر اکبر حیدری کی کوشش سے انجمن کی سالانہ گرانٹ بڑھا کر پانچ ہزار کر دی گئی۔ مولوی صاحب نے ایک طرف سرمائے کی فراہمی کی طرف توجہ کی تو دوسری طرف ان کی توجہ سرمایہ داروں کی تلاش اور کتابوں کی اشاعت پر مبذول رہی۔

مولوی صاحب نے جنوری ۱۹۲۱ء میں ایک علمی اور تحقیقی مجلہ "اردو" کے نام سے جاری کیا، جو آج تک شائع ہو رہا ہے اگرچہ آزادی کے بعد اس کا نام بدل کر "اردو ادب" کر دیا گیا مولوی صاحب دور اندیش آدمی تھے، اور دشواریوں میں ان کی صلاحیتیں اُجاگر ہوتی تھیں۔ اگرچہ انجمن کی مالی حالت اچھی نہیں تھی لیکن انھوں نے کوشش کر کے انجمن کا پریس لگا لیا۔

دکن میں ہونے کی وجہ سے مولوی صاحب نے دکنی ادب پر خاص طور پر توجہ دی، انھوں نے نہ صرف شمالی ہند بلکہ دکن کے بھی اہم مخطوطات مرتب کر کے شائع کرائے اور بہت سے اساتذہ مثلاً ولی، اثر، تاباں اور یقین کے دواوین مرتب کر کے انجمن سے شائع کرائے۔ قدیم اردو کے یہ گنج ہائے گراں مایہ جو صدیوں سے گرد آلود پڑے تھے، ان کو باہر نکال کر لانے کا سہرا مولوی عبدالحق صاحب ہی کے سر رہا ۱۹۲۸ء میں مولوی صاحب نے رسالہ "سائنس" جاری کیا، افسوس کہ یہ رسالہ آزادی کے بعد جاری نہ رہ سکا، آصف جاہی حکومت کی مالی مدد سے مولوی صاحب نے انگریزی اردو ڈکشنری کا ایک پروجیکٹ بنایا، کئی سال کی لگاتار محنت سے یہ لغت تیار ہوئی، اور آج بھی پوری دنیا میں انگریزی اردو کی اس سے زیادہ مستند لغت کوئی اور نہیں ہے، انجمن کے تیسرے صدر سر راس مسعود ۱۹۳۷ء میں انتقال فرما گئے، یہ اردو کے سچے پرستار اور عاشق تھے، ان کے انتقال سے انجمن اپنے ایک محسن اور مربی سے محروم ہو گئی۔ ان کے انتقال کے بعد سر اکبر حیدری کی تجویز پر انجمن کی مجلس نظما نے سر تیج بہادر سپرو کو انجمن کا صدر بنایا۔ یہ انجمن کے چوتھے صدر تھے، نومبر ۱۹۳۸ء میں، انجمن ترقی اردو ہند کے مرکزی دفاتر دہلی منتقل کر دیے گئے۔ جب ۱۹۱۳ء میں انجمن علی گڈھ سے اورنگ آباد گئی تھی، تو اس کا کل اثاثہ ایک پرانا صندوق تھا، جب یہ دلی لائی گئی تو اس کی شائع شدہ کتابیں اور دوسرے سامان مال گاڑی کے کئی ڈبوں میں لاد کر دلی لایا گیا، دلی میں دریا گنج میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی کرائے پر لی گئی۔ کچھ ہی دن بعد یعنی ۱۹۳۹ء میں "ہماری زبان" کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار جاری کیا گیا یہ اخبار اب ہفت روزہ ہے اور آج تک شائع ہو رہا ہے مولوی صاحب کا دلی آنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس زمانے میں اردو اور ہندی کا تنازعہ بہت بڑھ گیا تھا، اور اردو کو سیاست کا شکار بنا کر ہر ممکن نقصان پہنچانے کی کوشش کی جا رہی تھی اب انجمن کے مقاصد دو ہو گئے۔ ایک تو علم و فن کی خدمت اور دوسرے اردو زبان کا تحفظ، مولوی صاحب دونوں محاذوں پر بڑی کامیابی اور مستعدی کے ساتھ جنگ کرتے رہے۔

تقسیم ہند کے وقت مرکزی انجمن کے دفاتر کو مفسدوں نے آگ لگا دی، اور انجمن کا بیشتر اثاثہ جس میں بیش بہا کتابیں بھی تھیں جلا کر راکھ کر دیا۔ اس کے بعد مولوی عبدالحق پاکستان چلے گئے اور وہاں کراچی میں نئے سرے سے انجمن ترقی اردو کی بنیاد رکھی۔ یہ انجمن آج تک اردو ادب اور علم و فن کی انتہائی کامیابی کے ساتھ خدمت کر رہی ہے۔ اور بہت سی علمی، ادبی اور تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں تقسیم کے بعد ہندستان میں تقریباً دو سال تک انجمن کا وجود برقرار نہیں رہا

له مولوی صاحب نے انجمن کا جب ذاتی پریس قائم کر لیا تو ایک علمی، ادبی اور تحقیقی رسالے کے اجراء کی طرف توجہ کی۔ اس قسم کے رسالے کے اجراء کی ضرورت علمی و ادبی حلقے میں عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی۔ مولوی صاحب نے جنوری ۱۹۲۱ء میں اس کا اجرا کر کے اس خلا کو پر کیا۔ حالاں کہ اس سے پہلے مخزن، لاہور، اردوئے معلیٰ، علی گڑھ، معارف، علی گڑھ، دکن ریویو، حیدرآباد دکن ادیب، الہ آباد، نقاد، آگرہ، دل گداز، لکھنؤ، الناظر، لکھنؤ، زمانہ، کانپور اور صلائے عام دہلی نمونے کے لیے موجود تھے۔ ان سب رسالوں کو سر عبدالقادر، مولانا حسرت موہانی، وحیدالدین سلیم، میر ناصر علی، عبدالحلیم شرر، دلگیر اکبرآبادی اور پنڈت دیا نراین نگم جیسوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ بابائے اردو نے "اردو" کو جاری کر کے انجمن کی صحیح ترجمانی کی اور حالات کے تقاضے اور علمی و ادبی حلقے کی مانگ کو پورا کیا۔ اس رسالے نے تحقیق کی وہ بنیاد ڈالی جو اردو میں تقریباً ناپید تھی۔ پریم چند نے اس رسالے کے بارے میں کہا تھا کہ "یہ سب رسالوں کا قافلہ سالار ہے۔"

۲ راگست ۱۹۴۹ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے انجمن میں دلچسپی لی اور مولانا کے اثر و رسوخ سے مفسدوں کے پاس سے انجمن کا کچھ اثاثہ دوبارہ حاصل کیا گیا، اور اردو کے مشہور انشا پرداز قاضی محمد عبدالغفار کو انجمن کا جنرل سکریٹری بنایا گیا، اکتوبر ۱۹۴۹ء کے آخر میں قاضی عبدالغفار انجمن کا صدر دفتر علی گڈھ لے گئے۔ علی گڈھ میں سلطان جہاں منزل کا نصف حصہ کرایہ پر لیا گیا، اور اس میں دفتر کا تمام سامان اور کتب خانہ منتقل ہوا، قاضی صاحب تقریباً ۷ سال تک انجمن کے سکریٹری رہے، انھوں نے مولوی عبدالحق کے نقش قدم پر چل کر بعض اہم کتابیں شائع کیں۔ اب انجمن کا رول اور بھی زیادہ پیچیدہ ہو گیا، کیونکہ اردو کے ساتھ زبردست بے انصافیاں شروع ہو گئیں، خاص طور پر اتر پردیش میں اردو کو زبردست تعصب کا شکار بنا دیا گیا قاضی صاحب اور انجمن کے دوسرے اراکین نے اس مورچے کو سنبھالا۔ ۱۷ جنوری ۱۹۵۶ء کو قاضی صاحب کا انتقال ہو گیا، اور اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر آل احمد سرور کو انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

قاضی صاحب کے زمانے میں تقسیم ہند کے بعد انجمن کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین بنائے گئے تھے، قاضی صاحب کے انتقال کے چند ماہ بعد ذاکر صاحب علی گڈھ سے بہار کے گورنر ہو کر چلے گئے، ان کی جگہ کرنل بشیر حسین زیدی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے وائس چانسلر بنائے گئے، اور انجمن کی مجلس نظما نے ۱۹۵۷ء میں ان کو انجمن کا صدر منتخب کیا۔

سرور صاحب کے زمانے میں علمی، ادبی اور تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں، ان کے علاوہ انہوں نے اردو تحریک کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا، سرور صاحب نے اپنے زمانے میں تین کل ہند اردو کانفرنسیں کرائیں، ان میں پہلی علی گڈھ میں، دوسری کانپور میں اور تیسری بے پور میں۔ انھوں نے ٹھوس علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت کے علاوہ "اردو ادب" کے کئی نمبر نکالے، ان میں حسرت نمبر، غالب نمبر، ذاکر نمبر، نہرو نمبر اور ابوالکلام آزاد نمبر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ سرور صاحب کے زمانے میں کرنل زیدی کے بعد پنڈت ہردے ناتھ کنزرو انجمن کے صدر منتخب ہوئے، اور ان کے بعد پنڈت آنند نرائن ملا ۱۹۷۲ء میں انجمن کے صدر منتخب ہوئے جو آج تک انجمن کے صدر ہیں، ملا صاحب نے جے پور کی اردو کانفرنس میں اردو کے بارے میں کہا تھا کہ "میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن اپنی زبان نہیں چھوڑ سکتا، کیونکہ زبان میری ذات کا آئینہ ہے میری میراث ہے، میری تاریخ ہے، اور میری زندگی ہے" ملا صاحب کے اردو کے بارے میں یہ جملے آج تک اردو والوں کے سینے میں محفوظ ہیں۔ اردو کے کاز کو آگے بڑھانے میں ملا صاحب کا خاص حصہ ہے۔ موصوف نے اردو کی ترقی اور بقا کے لیے جو کوششیں کی ہیں اور کر رہے ہیں وہ کبھی نہیں بھلائی جا سکتیں۔ اردو کو ان کی ذات سے بہت فائدہ پہنچا ہے۔ سرور صاحب[1] کے زمانے میں انجمن کے دفاتر کے لیے نومبر ۱۹۶۵ء میں دلی میں ایک قطعہ زمین خریدا گیا، اس کی تعمیر سرور صاحب ہی کے زمانے میں شروع ہوئی، اس عمارت کا نام اردو گھر رکھا گیا اس کا نام بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس وقت رکھا تھا جب انجمن اورنگ آباد میں تھی، اور عمارت کے لیے انھوں نے چندے کی اپیل کی تھی، یکم اپریل ۱۹۷۱ء کو سرور صاحب نے انجمن سے استعفا دے دیا، اور ان کی جگہ ڈاکٹر خلیق انجم

[1] سرور صاحب کا عہد نہایت شاندار رہا ہے انھوں نے جنوری ۱۹۵۶ء سے اپریل ۱۹۷۴ء تک انجمن کی جو اعزازی خدمات انجام دیں وہ ہمیشہ یاد رہیں گی۔ ان سترہ سالوں میں انھوں نے کئی طرف توجہ کی۔ اردو کی بے کسی اور مظلومی کی داستان جو کسی سے پوشیدہ نہیں اس کو زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کی طرف نہ صرف عوام کی توجہ 'ہماری زبان' کے ذریعہ مبذول کراتے رہے بلکہ حکومت کی پالیسی کے خلاف اپنے اداریوں کے ذریعہ اردو کے لیے سازگار ماحول پیدا کرتے رہے اور حکومت کو اس کے فروغ اور اتر پردیش میں دوسری سرکاری زبان بنائے جانے پر زور دیتے رہے۔ ان کے عہد میں یوں تو بہت سی اہم کتابیں شائع ہوئیں لیکن دیوان غالب (مرتبہ مولانا عرشی)، غالب ایک مطالعہ (ڈاکٹر خورشید الاسلام)، مضامین رشید احمد صدیقی گل کرسٹ اور اس کا عہد (عتیق صدیقی مرحوم)، اردو مثنوی شمالی ہند میں (ڈاکٹر گیان چند)، خواجہ میر درد تصوف اور شاعری (ڈاکٹر وحید اختر)، یادگار حالی (صالحہ عابد حسین)، مسائل تصوف (میکش اکبرآبادی)، زنداں نامہ (فیض احمد فیض)، اور نوائے ظفر (خلیل الرحمٰن اعظمی) ایسی مفید اور قابل قدر کتابیں ہیں جن کی افادیت اور اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

انجمن کے جنرل سکریٹری بنائے گئے، ۱۶ مئی ۱۹۷۸ء کو انجمن کے صدر دفاتر علی گڈھ سے دلی منتقل اس نامکمل عمارت اردو گھر میں ہوئے جہاں اب انجمن کے دفاتر ہیں اس وقت تقریباً چار منزلیں تعمیر ہو چکی تھیں، مگر سب نامکمل حالت میں تھیں۔ خلیق انجم صاحب نے ان نامکمل منزلوں کو پورا کرایا، اور اس عمارت کی تعمیر کے بعد اس کی آمدنی میں اضافے کی تدبیریں نکالیں اس عمارت کے مکمل ہونے میں جتنی محنت اور بھاگ دوڑ خلیق انجم صاحب نے کی وہ قابل تعریف ہے۔ اس عمارت کی تعمیر میں محترم بشیر حسین زیدی کا بھی خاص حصہ ہے، موصوف کی وجہ سے بہت سی مشکلات کو حل کرانے میں بڑی مدد ملی، سرور صاحب کے زمانے میں، پروفیسر مسعود حسین دو بار انجمن کے جنرل سکریٹری (قائم مقام) رہے، ان کے زمانے میں ہماری زبان کے اداریے بڑے معرکے کے شائع ہوئے ہر اداریہ اردو زبان کے مسائل کے حل کا بہترین ذریعہ ہوتا، انھوں نے ہماری زبان کا ایک اردو نمبر نکالا، یہ نمبر آفسٹ پر چھپا تھا، قاضی عبدالغفار کے زمانے میں پروفیسر عبدالعلیم تین ماہ تک قائم مقام جنرل سکریٹری رہے مرحوم کی ذات سے انجمن کو بہت فائدہ پہنچا۔

ڈاکٹر خلیق انجم کے زمانے میں بھی بہت سی مفید کتابیں شائع ہوئیں۔ ان میں اقبال ـ کچھ مضامین ــــ اردو میں تمثیل نگاری، سرسید کی صحافت، خسرو کا ذہنی سفر اور غزل کا تنقیدی مطالعہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ہماری زبان کے مطبوعات نمبر، علیم نمبر، خواجہ حسن نظامی نمبر، گجرال کمیٹی نمبر، بیگ نمبر اور تبصرہ نمبر شائع کیے، اردو ادب کے بھی کئی نمبر نکالے، ان میں اقبال نمبر اور حسرت نمبر بے حد مقبول رہے۔ خلیق انجم صاحب کے زمانے میں کئی کل ہند اردو کانفرنسیں ہندوستان کے مختلف شہروں میں منعقد ہوئیں اور خاصی کامیاب رہیں۔

اس وقت انجمن کی تقریباً چھ سو شاخیں ہیں، ہندستان کا کوئی ایسا اہم شہر نہیں، جہاں پر انجمن کی شاخ نہ ہو، انجمن آج تک ۸۰۰ سے زاید کتابیں شائع کر چکی ہے آج بھی ہر سال تقریباً ۸ کتابیں شائع ہوتی ہیں، انجمن کی ایک بیش قیمت لائبریری بھی ہے جہاں فارسی، اردو اور عربی کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں موجود ہیں۔ قلمی ذخیرے کی سب سے بڑی خوبی دکنی ادب ہے۔ اس کے علاوہ بعض قلمی کتابیں ایسی ہیں جن کے واحد نسخے انجمن کے کتب خانے میں، موجود ہیں، اس کے موجودہ صدر پنڈت آنند نرائن ملا ہیں، اور نائب صدر پروفیسر آل احمد سرور اور جناب عابد علی خاں ہیں۔ بیگم عابدہ احمد، قرۃ العین حیدر جناب مالک رام، پروفیسر مختار الدین احمد، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی پروفیسر گیان چند، جناب علی جواد زیدی، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، اور ڈاکٹر قمر رئیس وغیرہ انجمن کی مجلس عاملہ و عام کے مخصوص ممبر ہیں۔ جناب مالک رام اور پروفیسر نارنگ کے مفید مشوروں سے انجمن کو بہت فائدہ پہنچا اور اب بھی ان کی کوشش انجمن کے کاموں کو آگے بڑھانے میں جاری ہیں۔

اب خود اپنے مالی وسایل پیدا کرنے کیلئے انجمن نے ایک بک ڈپو قائم کیا ہے جس میں تقریباً ہندستان کے تمام پبلشروں کی کتابیں فروخت کی جاتی ہیں۔

اردو خالص ہندوستانی زبان ہے اور اس زبان کو دوسری زبان پر جو فوقیت حاصل ہے، اس کی جھلکیاں ملک کے ہر دور میں ملتی ہیں، لیکن اردو کی ترقی کے لیے جو رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں اس کے حل کے لیے ہم سب مل کر کوشش کریں تاکہ اردو سارے ہندستان کی مکمل کاروباری اور دوسری سرکاری زبان بن سکے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے زندگی بھر اردو کی خدمت اور انجمن کا کام ایمان سمجھ کر کیا دوسرے لوگ بھی اگر ان سے سبق لیں تو کوئی وجہ نہیں۔ جو ان کے مشن میں کامیابی نہ ہو۔

انجمن ترقی اردو ایک ادارہ ہے ایک تحریک ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس کی خاطر گوتم بدھ کی طرح گھر بار چھوڑ کر اپنا سب کچھ تیاگ دیا اور اپنی تمام زندگی اردو تحریک کے لیے وقف کردی۔ ان ہی کی سچی لگن اور خلوص کی وجہ سے انجمن ترقی اردو آج ایک ادارہ اور ایک تحریک ہے۔ (مقتدرہ ہماری زبان ۱۵ مئی ۱۹۷۸ء)

مولانا امداد صابری

منشی نول کشور

منشی نول کشور کے دادا رائے بالکند سرکاری خزانچی تھے اور والد بابو جمنا پرشا دبھار گو علی گڑھ کے قریب موضع ساسنی کے ایک بڑے رئیس تھے۔ ان کے پانچ بیٹے تھے جن میں منشی نولکشور دوسرے تھے۔ وہ ۳ دسمبر ۱۸۳۶ء میں متھرا کے نزدیک ریڑھا گاؤں میں پیدا ہوئے۔ چھ سال کی عمر میں انھوں نے اپنے وطن ساسنی میں آکر پڑھنا شروع کیا۔ ان میں ابتدا ہی سے غیر معمولی ذہانت کے آثار پائے جاتے تھے۔ چنانچہ دس سال کی عمر میں وہ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر آگرہ چلے گئے جہاں انھوں نے کالج میں داخلہ لیا۔ پندرہ سال کی عمر میں انھیں مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے میں آگرہ سے "آگرہ سفیر" نامی ایک اخبار نکلتا تھا جو شمالی ہندستان میں بہت مشہور تھا۔ نول کشور نے اس میں لکھنا شروع کیا اور سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیا۔ ان کے مضامین پبلک میں کافی مقبول ہوئے۔ انھیں دنوں لاہور میں کوہ نور نامی ایک پریس تھا جس کے مالک منشی ہرسکھ رائے اپنی دیانت داری اور نیک نیتی کے لیے بہت مشہور تھے۔ ان کو اپنے مطبع کے کاموں کے لیے ایک شخص کی ضرورت ہوئی۔ انھوں نے اس بارے میں اپنے برادر مکرم رائے مکھن لال مرحوم سب جج کو جو اس وقت آگرہ کے منصف تھے تحریر کی اور رائے صاحب نے منشی صاحب کو لاہور بھیج دیا۔ چنانچہ سترہ ہی سال کی عمر میں نول کشور لاہور جا کر منشی ہرسکھ رائے کے شریک کار ہو گئے۔ منشی ہرسکھ رائے کو ان پر اس قدر اعتماد ہو گیا کہ اپنا سارا کاروبار انھیں کے بھروسے پر چھوڑ کر خود سکھ چین کی نیند سونے لگے۔ اسی اثنا میں ان پر فوجداری کی کوئی دفعہ لگا کر مقدمہ چلایا گیا اور ان کو سزائے حبس دوام ہو گئی۔ اس واقعہ نے نول کشور کو پریشان کر دیا لیکن انھوں نے منشی ہرسکھ رائے کی رہائی کی کوشش میں دن رات ایک کر دیے۔ آخر منشی جی رہا ہو گئے اور نول کشور کی دیانت اور وفاداری عوام میں ضرب المثل بن گئی۔

چار سال تک نول کشور مطبع کوہ نور میں کام کرتے رہے۔ لیکن اکیس سال کی عمر میں ان کے خیالات میں انقلاب شروع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں ہر طرف جہالت، بھوک، افلاس اور بے روزگاری کا دور دورہ تھا۔ پرانی اخلاقی اور سماجی قدریں دم توڑ رہی تھیں اور عوام جو نئی قدروں کو قبول کرنے سے منحرف تھے عجب کشش و پنج کے عالم میں تھے وطن کی یہ تباہی نول کشور کو ایک لمحے کے لیے چین نہ لینے دیتی تھی۔ آخر ایک طویل فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بے سود زندگی بسر کرنے سے مر جانا بہتر ہے۔ وہ انسان ہی کیا ہے جو اپنی قوم اور ملک کی بہتری کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ چنانچہ وہ نوکری سے دستبردار ہو گئے اور عوام کی خدمت کے لیے ایک ذاتی مطبع کھولنے کی فکر کرنے لگے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی چنگاری سرد پڑنے کے بعد نول کشور لکھنؤ آ گئے۔ مہذب انسانوں کی یہ بستی انھیں بھا گئی۔ ہر علم اور فن کے لوگ یہاں ملتے تھے اور اس جوار میں تعلیم اور ادب کی قدر تھی۔ چنانچہ نول کشور نے اپنے کام کے لیے اس جگہ کو منتخب کیا۔ مقامی حکام سے مل جل کر انھوں نے کوٹھی غالب جنگ میں مطبع منشی نول کشور کے نام سے ایک پریس قائم کر دیا اور اودھ اخبار کا اجرا کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کے اخبار نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔ ملک بھر میں سچی، صحیح اور تازہ خبریں دینے کے لیے اودھ اخبار مشہور تھا۔ اس کے نامہ نگار تمام صوبوں اور ریاستوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ مشہور تھا کہ ہندستان کی مختلف راجدھانیوں میں یا تو حکومت کے نمایندے رہتے ہیں یا منشی نول کشور کے۔ اس اخبار نے

منشی نول کشور کے نام کو چمکا دیا۔ حکومت میں بھی ان کی قدر ہونے لگی۔ طباعت کا سرکاری کام تقریباً سارا مطبع نول کشور کے سپرد ہوگیا۔ محکمۂ تعلیم کے لیے نصاب کی کتابیں بھی یہاں چھپنے لگیں اور چند ہی دنوں میں یہ ملک کا سب سے بڑا پریس بن گیا۔

اب منشی نول کشور کی توجہ اس بیش بہا خزانہ کی طرف مبذول ہوئی جو قلمی نسخوں کی شکل میں تباہی اور گمنامی کے غار میں پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے بڑی بڑی رقمیں خرچ کرکے اردو، فارسی اور سنسکرت کی اعلا کتابیں بہم پہنچائیں اور مختلف زبانوں کے ادیب ملازم رکھ کر نئے سرے سے ان کی تالیف و ترجمے کا کام شروع کرایا۔ رفتہ رفتہ وہ کتابیں جو کسی قیمت پر دستیاب نہ ہوتی تھیں صرف چند روپیوں کے عوض ہر خاص و عام کو میسر ہونے لگیں اور اردو فارسی کا بہت سارا ادب طباعت کے زیور سے آراستہ ہوکر محفوظ ہوگیا۔

قرآن اور رامائن کے متعدد ایڈیشن بارہا طبع ہوتے اور یہ کتابیں یہاں تک ارزاں کردی گئیں کہ غریب سے غریب گھر میں ان متبرک صحائف کی کئی کئی جلدیں نظر آنے لگیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مذہبی کتب کی اشاعت کو یہاں تک ترقی ہوئی کہ تمام ایشیائی ممالک حتیٰ کہ یورپ میں بھی مطبع نول کشور کی کتابیں ملتی ہیں۔ منشی صاحب نے اپنی زندگی میں چار ہزار سے زیادہ مختلف کتابیں شائع کیں۔ اور اہل ملک کے خیالات میں رفعت اور بلندی پیدا کرنے کے لیے منشی صاحب نے ٹاڈ راجستھان، مہدنا مہابھارت ہند، تاریخ مصر اور اس قسم کی صدہا دیگر تاریخوں کے ترجمے اور علمی مذاق کی کتابیں شائع کیں۔ تاریخ روس مصنفہ سرڈالڈ میکنزی والس کو صرف اردو ہی زبان میں شائع نہیں کیا بلکہ فارسی، ہندی، بنگلا اور گورمکھی زبانوں میں بھی چھپوا کر اہل ملک کو معتدبہ فائدہ پہنچایا۔ ترجمے بھی شائع کیے اور ان ترجموں کے ذریعہ اردو زبان میں ایک علمی روح پھونک دی۔ ان تراجم میں ایک قابل قدر ترجمہ "علاج برعمل" ہے جو فن جراحی میں ایک لاثانی کتاب ہے۔ فن طب میں بوعلی سینا کا قانون عربی سے اردو میں ترجمہ ہوا جس کی کئی جلدیں ہیں۔ 'فسانۂ آزاد' جو فسانہ نگاری کے فن کا ایک بے مثل نمونہ ہے منشی صاحب کی قدر دانی اور سرپرستی میں طبع ہوا تھا۔

۱۸۸۴ء میں نول کشور پریس میں ایک امریکن آئے تھے۔ انھوں نے مطبع کے متعلق جو خیالات امریکہ کے ایک نامی اخبار میں ظاہر کیے تھے وہ ذیل میں قلم بند کیے جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ منشی صاحب اپنے ملک کی دونوں عظیم قوموں کی خدمت میں اس سرگرمی اور بے تعصبی سے مصروف تھے کہ لوگ انھیں یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ ہندو تھے یا مسلمان۔

"ہندستان کے باشندے جلد جلد مغربی طریقے اختیار کرتے جاتے ہیں اور قدیم مذاہب کے بیدار کرنے والوں میں ایک منشی نول کشور کا چھاپہ خانہ ہے۔ اس مطبع سے تمام جزیرہ نمائے ہندستان کو کتابیں جاتی ہیں۔ منشی نول کشور عالی دماغ اور بلند حوصلہ شخص اور پبلشرز کی حیثیت سے بالکل بے تعصب ہیں اور گو اُن کے مطبع میں اسلامی مذہبی کتابیں بہت کثرت سے طبع ہوئی ہیں لیکن وہ برہمنوں اور بدھ مت والوں کی کتابیں بھی ایسی مستعدی سے شائع کرتے جس مستعدی سے اسلامی کتب اور رسالے کم قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔ مطبع نول کشور حضرت گنج کے متعلق بے شمار عمارتیں ہیں جو ایک وسیع رقبہ کو گھیرے ہوئے ہیں اور صدہا آدمی ہر طرف اپنے اپنے کاموں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ مطبع میں نہ صرف ہندستان بلکہ ٹرکی، افغانستان، عرب اور یورپ سے فرمایشیں آتی ہیں۔ اس مطبع کا رقبہ اس قدر بڑا ہے کہ یورپ میں اس کی قیمت پانچ لاکھ ڈالر سے کم نہ ہوگی۔ منشی نول کشور ایک ایسے ہشیار شخص ہیں کہ ولایت سے ٹائپ تک نہیں منگواتے بلکہ حروف ڈھالنے کا ایک ایسا کرتب سیکھ لیا ہے کہ خود تیار کرا لیتے ہیں۔ اس بڑے کارخانے کا بہت بڑا کام پتھروں سے ہوتا ہے۔ پریسوں کے چلنے کے متعدد کمرے ہیں۔ میں نے ایک میں اکسٹھ پریس شمار کیے جو ہاتھوں سے چلائے جاتے تھے اور ہر شخص کو اپنے اپنے کام میں مصروف پایا۔ پتھروں کی تعداد بے شمار تھی جن کے چالان جرمن وغیرہ سے برابر چلے آتے ہیں۔ البائن واقع پریس کے کارخانہ کی طرح کارخانہ نول کشور میں تالیف و تصنیف کا بہت بڑا کام کارخانہ کے اندر رہتا ہے۔ اس کارخانہ کا گودام عجائبات میں سے ہے۔ اس مطبع میں

بارہ سو آدمیوں سے کم نہیں ہیں۔"

اس کے بعد منشی صاحب نے اور بھی اصلاحیں کیں۔ پہلے بہت سا کام دستی پریسوں سے ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے مگر ان کے علاوہ بیس بڑی مشینیں ہیں جو انجن سے چلتی تھیں۔ یہ خوش کارخانوں کے مالکوں میں منشی صاحب ان طیب نفس بزرگوں میں سے تھے جو اپنے ملازموں کی خدمات کی داد دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ تقریباً پانچسو روپے ماہوار بطور پنشن کے قدیم ملازموں اور ان کی بیوں کو دیا جاتا تھا۔

منشی صاحب آنریری مجسٹریٹ میونسپل کمیٹی جیل کے آنریری انسپکٹر اور الہ باد یونیورسٹی کے فیلو تھے۔ ۱۸۸۸ء میں منشی صاحب کو گورنمنٹ عالیہ نے ان کی پبلک خدمات کے صلہ میں سی آئی ای کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ انھیں اودھ کے درباریوں میں نامزد کیا۔ صوبجات متحدہ کا سرکاری پریس جو الٰہ باد میں تھا اس کا انتظام بھی حکومت نے منشی صاحب کے سپرد کیا۔

اب منشی نول کشور خدمت خلق کی طرف متوجہ ہوئے انھوں نے غربا کے علاج کی خاطر حکیم، ڈاکٹر اور وید ملازم رکھے جو غریبوں کو دوا مفت تقسیم کرتے تھے اور سارا خرچ مطبع نول کشور کے ذمہ تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے غریب طلبا کی تعلیم کے لیے متعدد وظائف مقرر کیے۔

اسی دوران میں منشی صاحب کسی کام سے کلکتے گئے۔ کلکتہ کے دوسرے حکام کے ساتھ ساتھ انھوں نے جہاز کے حکام سے بھی ملاقات کی۔ اتفاق سے ولایت سے ایک جہاز کاغذ سے لدا ہوا آیا تھا جس کا نیلام ہونے والا تھا۔ مقامی تاجروں کا خیال تھا کہ اس کے اندر کاغذ اچھا نہیں ہے اس لیے انھوں نے اس کی خرید کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور نیلام میں بہت معمولی دام لگائے۔ منشی صاحب نے سب سے اونچی بولی بول دی اور جہاز کا نیلام ان کے نام پر ختم ہو گیا۔ بولی ختم ہونے کے بعد لوگوں نے منشی صاحب کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ ان سب کا خیال تھا کہ منشی صاحب کو یہ سودا مہنگا رہے گا۔ دوسرے روپے کا بھی سوال پردیس میں اتنے روپے کا انتظام کہاں سے ہوگا غرض جو تھا منشی صاحب پر نادانی کی تہمت لگاتا تھا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری اور کلکتہ میں ان کے جتنے ایجنٹ تھے ان سے روپیہ فراہم کرکے چوتھائی رقم جہاز کے حکام کو دے کر انھوں نے کاغذ اتروانا شروع کیا اور بقیہ رقم کی فکر کرنے لگے۔ قسمت دیکھیے کہ جہاز میں کاغذ عمدہ قسم کا نکلا۔ اب کیا تھا وہی تاجر جو منشی صاحب کے اس سودے پر ہنستے تھے دوگنے اور چوگنے داموں پر کاغذ خریدنے لگے۔ غرض یہ ہے کہ منشی صاحب نے ساری رقم ادا کر دی اور لاکھوں روپے نقد کے علاوہ ہزاروں روپے کا کاغذ اپنے کارخانے کے واسطے لے کر لوٹے۔

اب مطبع نول کشور کا کاروبار بہت وسیع ہو چکا تھا چنانچہ غالب جنگ کی کوٹھی تنگ نظر آنے لگی اس لیے انھوں نے حضرت گنج میں ایک زبردست عمارت مطبع کے واسطے تعمیر کروائی اور آس پاس کی بہت سی کوٹھیاں خرید کر نہایت اعلا پیمانہ پر کام شروع کیا۔ انھوں نے یہیں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کانپور، دہلی، لاہور، آگرہ، الٰہ باد، اجمیر اور لندن میں مطبع کی شاخیں قائم کیں۔

لیکن ان سب کاموں سے منشی صاحب کی غرض دولت کی فراہمی نہیں تھی۔ خدمت خلق اللہ کے نزدیک انسان کا سب سے پہلا فرض تھا۔ چنانچہ انھوں نے ہندستان کے مختلف تعلیمی، مذہبی اور سماجی اداروں کو بڑے بیش بہا عطیے دیے۔ اس کام میں انھوں نے مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہیں رکھی۔ ہندستان کے کالج، عیسائیوں کے ادارے اور مسلم یونیورسٹی سب ہی ان سے فیضیاب ہوئے۔ نقد روپوں کے علاوہ انھوں نے لاکھوں روپے کی کتابیں ہندستان کے بیشمار کالجوں اور اسکولوں کو دیں جن کی طویل فہرست یہاں درج کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہسپتال، یتیم خانہ، سیوا سدن، مندر اور دھرم شالے بھی ان کے فیض سے محروم نہ رہے۔ غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کی خفیہ طور پر بہت مدد کرتے تھے جس کا علم ان کے خاص دوستوں کے علاوہ کسی کو نہ ہوتا تھا۔ غرض انھوں نے اپنی محنت، دیانتداری اور نیک نیتی سے وہ مرتبہ حاصل کر لیا جو ملک کے راجاؤں اور مہاراجاؤں کو حاصل تھا۔ ذیل کے واقعہ سے اندازہ ہوگا کہ ملک اور بیرون ملک

میں منشی نول کشور کو کیا منزلت حاصل تھی۔

ایک مرتبہ گورنر پنجاب نے راولپنڈی کے مقام پر ایک زبردست دربار منعقد کیا جس میں ہندستان کے نامی گرامی راجاؤں، مہاراجاؤں اور رؤسا کے علاوہ افغانستان کے حکمراں امیر عبدالرحمٰن خاں کو بھی خاص طور پر شرکت کے لیے مدعو کیا گیا۔ دربار میں نول کشور بھی شریک تھے اور انھیں مہاراجاؤں کے برابر کرسی دی گئی تھی۔ یہ بات راجگانِ ہند کو بہت گراں گزری کہ ایک تاجر پیشہ انسان حکمرانوں کے برابر اعزاز پائے۔ چنانچہ انھوں نے اس بات کی شکایت گورنر سے کی گورنر نے انھیں سمجھا بجھا دیا کہ علم وادب کی سلطنت میں منشی نول کشور کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو آپ لوگوں کو اپنی اپنی ریاستوں میں۔ اتفاق سے امیر کابل اس گڑبڑ کو تاڑ گئے ___ اور انھوں نے اپنے وزیر کے ذریعہ گورنر سے دریافت کرایا کہ کیا معاملہ ہے گورنر نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ امیر کابل منشی نول کشور کا نام سنکر چونک پڑے اور بولے 'کون نول کشور؟ وہی جنھوں نے بہت اچھی اچھی کتابیں چھاپ کر دنیا بھر میں پھیلادی ہیں؟' جواب اثبات میں پاکر انھوں نے منشی صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ گورنر نے آپ کو امیر کے سامنے پیش کیا۔ امیر آپ سے بڑی آؤ بھگت کے ساتھ ملے اور فرمانے لگے "بخارا اور کابل میں ہم آپ کی کتابیں دیکھ کر سوچا کرتے تھے کہ نول کشور ضرور کوئی باہمت آدمی ہوگا"۔ اس کے بعد انھوں نے منشی صاحب سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ کابل میں بھی اس قسم کا ایک مطبع قائم کریں۔ آپ اس کام میں ہماری مدد کیجیے۔

منشی صاحب کا یہ اعزاز دیکھ کر ہندستان کے راجہ دنگ رہ گئے اور گورنر سے بڑی ندامت اور خفت کا اظہار کیا کہ ہم نے ایسے لائق آدمی کی قدر نہ کی جس کی شہرت ہندستان کے باہر بھی پھیلی ہوئی ہے۔

منشی نول کشور کا ایک زبردست کارنامہ پیپر مل کا قیام ہے۔ انھوں نے سو سو روپے کے حصے فروخت کرکے ایک کمپنی قائم کی اور انگلستان سے مشینیں منگوا کر لکھنؤ میں دریائے گومتی کے کنارے کاٹھ کے پل کے پاس پیپر مل کی بنیاد ڈال دی۔ اتفاق کی بات کہ کمپنی بہت مقروض ہوگئی اور حصہ داروں نے بدگمان ہوکر اپنے حصے اونے پونے بیچنے شروع کر دیے۔ منشی صاحب نے یہ حال دیکھ کر اپنے پاس سے سارا قرض ادا کیا اور کمپنی کو ٹوٹنے سے بچایا۔ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہندستان میں ولایت کے انداز پر عمدہ قسم کا کاغذ تیار ہونے لگا۔

ادبی، سیاسی اور تجارتی مشغولیتوں کے علاوہ منشی نول کشور نے، اناؤ اور بارہ بنکی کے اضلاع میں ایک بڑی جائداد خریدی تھی اور اس کا انتظام خود ہی بڑی خوش اسلوبی سے کیا کرتے تھے۔ ان کی اعلا انتظامی قابلیت کو دیکھ کر مہاراجہ جے پور نے انھیں اپنی ریاست کی نیابت پیش کی تھی۔ لیکن منشی صاحب کا دل بہت پہلے نوکری کی طرف سے ہٹ چکا تھا اس لیے انھوں نے یہ اعزاز قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

۵۹ کی عمر میں ۱۹ فروری ۱۸۹۵ کی شب کو منشی نول کشور نے انتقال فرمایا۔ اخباروں کے ذریعہ سارے ملک میں یہ خبر مشہور ہوگئی اور ہر جگہ ان کی وفات پر سوگ منایا گیا۔ نعش ایک اسپیشل ٹرین کے ذریعہ کانپور لے جا کر نذر گنگا کی گئی۔ آپ کے بیٹے پراگ نرائن بھارگو نے آخری رسوم پر ہزاروں روپے خرچ کیے۔

، تاریخ صحافت اردو - شمع بک ڈپو دہلی - ۱۹۶۵ء

مذہب



ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

انسانیت کا منشورِ آزادی

ہجرتِ نبوی کا دسواں سال تھا، عیسوی ۶۳۲ء فروری کا مہینہ آیا تو سرورِ کائنات فخرِ موجودات رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار حج کا ارادہ فرمایا اور اپنے اصحاب کو بھی تیاری کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ حج ۹ ہجری میں فرض ہوا تھا اور عام روایت یہی ہے کہ حضور نے ایک ہی حج کیا۔ حج کا اعلان ہوتے ہی لوگوں کے انبوہ چاروں طرف سے مدینے میں جمع ہونے لگے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ آپ ۲۴ ذی قعدہ یعنی ۲۲ فروری ۶۳۲ عیسوی کو جمعرات کے دن مدینۂ طیبہ سے باہر نکلے ذوالحلیفہ میں تشریف لائے وہاں غسل کرکے خوشبو لگائی اور مسجد میں دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر ایک تہبند اور ایک چادر پہن کر احرام باندھا اور بآوازِ بلند تلبیہ پڑھا:

لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لبیک لبیک لاشریک لک لبیک
اِنّ الحمد والنعمۃ لک والملک لاشریک لک۔

۸ ذی الحجہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر بیٹھے۔ منیٰ میں ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازیں پڑھیں۔ فجر کی نماز کے بعد اتنی دیر قیام فرمایا کہ آفتاب قدرے بلند ہوگیا۔

۹ ذی الحجہ کو وہاں سے روانہ ہوکر مقامِ نمرہ میں نزول کیا۔ جب نمرہ میں دھوپ ڈھلنے لگی تو آپ نے اپنی اونٹنی طلب فرمائی جس کا قصواء نام تھا۔ اس پر کجاوہ کسا گیا۔ آپ سوار ہوکر بطنِ وادی یعنی میدانِ عرفات میں تشریف لائے یہاں آپ نے وہ تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جسے بجا طور پر انسانیت کا منشورِ آزادی یا (CHARTER OF HUMAN RIGHTS) کہا جا سکتا ہے۔

اس وقت حدِ نظر تک انسانوں کا ہجوم تھا۔ سارا میدان کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور تمام اصحابِ رسول بآوازِ بلند تکبیر و تہلیل و تسبیح و تقدیس میں مصروف تھے۔ مورخین نے اس مجمع کا اندازہ ایک لاکھ چالیس ہزار اور بعض نے ایک لاکھ چوبیس ہزار لکھا ہے۔ اتنا یقینی ہے کہ ایک لاکھ سے زیادہ تھا۔

اس خوش نصیب مجمع کی آنکھیں شہنشاہِ دو عالم کے روئے انور سے کسبِ نور کر رہی تھیں۔ جب آپ اپنی اونٹنی قصواء پر بیٹھے تقریر کر رہے تھے سارے میدان میں ایسا ادب آمیز اور رعب انگیز سکوت طاری تھا کہ ہر شخص کے کانوں تک وہ مقدس آواز پہنچ رہی تھی جس کے لیے قرآن میں کہا گیا ہے: وماینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ۔

یوں تو حضور کا ہر فعل، ہر قول، ہر ارشاد حدیث ہے اور اس میں زندگی کے ہزاروں مسائل اور احکام کے بارے میں ہدایات موجود ہیں لیکن آج ایک ایسا اجتماع تھا جو نہ پہلے کبھی چشمِ فلک نے دیکھا تھا اور نہ یہ دنیا ان قدسی صفات انسانوں کے درمیان ایک شہنشاہِ عالم و عالمیاں اور مخدومِ کرّوبیاں کو اس طرح خطاب فرماتے ہوئے پھر کبھی سن سکے گی۔ سورج کروڑوں بار طلوع ہوگا، زمین کھربوں چکر لگائے گی۔ ستارے اربوں سال گردش کھائیں گے مگر وہ قدسیوں کا مجمع، وہ مبارک لمحات اور کلماتِ جاں بخش کہاں سے لائیں گے!

آج آپؐ نے ان باتوں کی طرف اشارے کیے جن کا تعلق پوری نوعِ انسان سے، سارے عالمِ انسانیت سے اور ہر زماں و مکاں کے معاشرے سے تھا۔ خواہ وہ گورے ہوں یا کالے، مالدار ہوں یا مفلس، شریف ہوں یا رذیل، عالم ہوں یا عامی، غلام ہوں یا آزاد — آج آپؐ نے وہ منشور پڑھ کر سنایا جس نے انسانی معاشرت کے سارے مصنوعی بدصنوں کو توڑ دیا — انسان کی فطری اور بنیادی آزادی کو بحال کر دیا، انسان کے جن حقوق پر زبردستوں نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا اور اللہ کے بندوں کو جو خالقِ کائنات کی طرف سے مساوی صلاحیتیں اور مساوی امکانات لے کر پیدا ہوئے تھے، کہیں غلام بنایا تھا، کہیں انھیں ظلم و استبداد اور جبر و استحصال کے شکنجوں میں جکڑ دیا تھا، کہیں سماجی طبقہ بندی کرکے انھیں نچلی سطح میں ڈال دیا تھا،

کہیں وہ پیٹ بھر کر کھانے سے محروم تھے کہیں ان کے جسم پر پورا لباس نہیں تھا، کہیں عورتوں کو مردوں سے کمتر درجے کی مخلوق سمجھ لیا گیا تھا کہیں حاکموں کو یہ گھمنڈ تھا کہ ان کے محکوم بھی چوپایوں کی طرح ہانکے جا سکتے ہیں یا متاعِ بازار کی طرح لٹکے جا سکتے ہیں۔ کسی کو اپنے حسب نسب پر گھمنڈ، کسی کو رنگ اور نسل پر غرّہ۔ کوئی اپنے تئیں خدا کی برگزیدہ مخلوق سمجھ رہا ہے ــــ یہ سب وہ طریقے تھے جن سے ایک انسان دوسرے کمزور انسان کا استحصال کر رہا تھا۔ اس کے حقوق کو پامال کر رہا تھا اور اللہ نے دنیا میں جن نعمتوں کو سب کے لیے عام کر دیا ہے ان سے انسانوں کے درماندہ طبقوں کو محروم کر کے انھیں پسماندہ، مسکین، محکوم اور مفلوک الحال بنا رہا تھا۔

سرورِ عالم کا یہ آخری خطبہ رہتی دنیا تک کے لیے عظمتِ انسانیت کا اعلان کرتا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ سب انسانوں کے حقوق برابر ہیں اور کسی کو استحصال کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ آج اقوامِ متحدہ کی فلک بوس عمارتوں میں بیٹھ کر اقوامِ عالم کے نمائندے جو (CHARTER OF HUMAN RIGHTS) بنا رہے ہیں مگر ان کے نفاذ میں کامیابی نصیب نہیں ہوتی، صحرائے حجاز کے ایک نبی اُمّی نے ریگستانِ عرب کے ایک میدان میں، اونٹنی کی پیٹھ پر بیٹھ کر جو بلند آواز کی تھی جس کی لہریں آج بھی اکناف و اقصائے عالم میں گونج رہی ہیں، دیکھیے اس میں کون سا پہلو ایسا ہے جو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یا کونسی دفعہ ایسی ہے جو انسان کے بنیادی حقوق اور اس کی فطری عظمت کا استقرار نہیں کرتی اس سے زیادہ واضح، پُرسوز، اثر انگیز، دل نشیں، سحر کار اور جاں بخش اعلان کیا آج تک دنیا کے کسی مصلح، کسی ریفارمر، کسی لیڈر، کسی رہنما کی آواز میں انسانیت کے کانوں نے سنا ہے؟ پہلے اس خطبے کے کچھ حصّے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی الفاظ میں سن لیجیے:

یاایہا الناس۔ انی لا أرانی وایاکم یجتمع فی ھذا المجلس أبدا۔ ان دماءکم واموالکم وأعراضکم حرام علیکم کحرمۃ یومکم ھذا فی بلدکم ھذا فی شھرکم ھذا وستلقون ربکم فیسٔلکم عن أعمالکم... لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی الّا بالتقویٰ کلکم من آدم وآدم من تراب انّ اکرمکم عند اللہ اتقکم...

آپؐ نے فرمایا:

لوگو! مجھے امید نہیں ہے کہ ہم تم پھر کبھی اس جگہ ملیں گے۔

دیکھو، تمھارا خون، تمھارا مال، تمھاری آبرو ایک دوسرے پر ایسے ہی حرام ہیں جیسے آج کے دن اس شہر میں، اس مقدس مہینے میں۔

دیکھو تم اپنے رب سے ملوگے تو وہ تم سے تمھارے اعمال کی باز پُرس کرے گا۔

کسی عرب کو کسی عجمی پر یا کسی عجمی کو عرب پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر پرہیزگاری کے اعتبار سے۔ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔ یقیناً اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ بزرگ وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔

خبردار! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا، کبھی آپس میں ایک دوسرے کی گردن کاٹنے لگو۔ دیکھو، جاہلیت کی ہر بُری رسم کو میں اپنے پیروں تلے روندتا ہوں۔ دورِ جاہلی کے تمام خون کا بدلہ اپنے قدموں تلے رکھتا ہوں۔ سب سے پہلے میں خود ربیعہ بن الحارث کے بیٹے کا قصاص چھوڑتا ہوں۔

جاہلی دور کے سود بھی ختم۔ سب سے پہلے میں اپنے خاندان سے عباس بن عبدالمطلب کا سود چھوڑتا ہوں۔

لوگو! اپنی بیویوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہنا تم نے اللہ کی ذمہ داری پر انھیں اپنایا ہے اور اللہ کے کلمے سے ان کے جسم کو اپنے واسطے حلال کیا ہے۔ عورتوں پر تمھارا حق یہ ہے کہ وہ تمھارے گھر میں کسی غیر کو نہ آنے دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو۔ اگر وہ ایسا کریں تو انھیں ایسا نہ مارو کہ چوٹ ظاہر ہو جائے۔

اور ان کا حق تم پر یہ ہے کہ انھیں اچھی طرح کھلاؤ اور پہناؤ۔

اور دیکھو تمھارے غلام ــــ ہاں تمھارے غلام ــــ جو خود کھاتے ہو وہی انھیں کھلانا جو خود پہنتے ہو وہی انھیں پہنانا۔

دیکھو، میں نے تمھارے درمیان وہ چیز چھوڑی ہے کہ اسے اگر مضبوطی سے پکڑو گے تو تم کبھی راستہ نہیں بھٹکو گے۔ وہ اللہ کی کتاب ہے!

لوگو! یقیناً نہ میرے بعد کوئی نبی آنے والا ہے نہ تمھارے بعد کوئی امت۔ دیکھو اپنے رب کی عبادت کرنا، پانچوں وقت نماز پڑھنا، ایک مہینے روزے رکھنا اور اپنے مال کی زکوٰۃ خوش دلی سے

ادا کرنا اور اپنے حاکم کی اطاعت کرنا تاکہ تم جنت میں داخل ہو سکو۔

دیکھو! کل قیامت کے دن تم سے میرے بارے میں بھی پوچھا جائے گا۔ بتاؤ کیا جواب دوگے۔؟

سب نے کہا۔ ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے اللہ کے احکام کو پہنچا دیے اور حق رسالت ادا کر دیا اور ہماری خیر خواہی کی باتیں ہمیں بتا دیں۔

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگشتِ شہادت آسمان کی طرف بلند کی پھر مجمع کی طرف اور تین بار فرمایا: اے اللہ گواہ رہیو! اے اللہ گواہ رہیو! اے اللہ گواہ رہیو!

دیکھو! جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ میرا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیں جو اس وقت حاضر نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ ان سننے والوں سے زیادہ باشعور ہوں۔

یہ تھا وہ "انسانیت کا منشورِ آزادی"۔ اس میں جو مسائل آ گئے ہیں اب ان پر مختصراً غور کر لیجیے۔ (PEACEFUL COEXISTENCE) کا ہے "جیو اور جینے دو"۔ یہی وہ اصول ہے جس کے لیے آج تیسری دنیا خاص طور پر جد و جہد کر رہی ہے۔

(اردو سروس سے مناسک حج سلسلہ میں نشر)

بقیہ جدید ادبی تنقید

آل احمد سرور نے جو ہماری تنقید میں لبرل اور آزاد ذہن کے بہترین نمائندہ ہیں، اپنی تنقیدوں میں اس کی اچھی مثال پیش کی ہے۔ جدید نقاد کو صرف اس بات سے انکار ہے کہ محض موضوع کی خوب صورتی یا درستگی سے ادب بھی خوب صورت یا درست ہو جائیگا جدید نقاد کا کہنا ہے کہ موضوع ہیئت سے الگ نہیں ہے۔ معنی لفظ سے الگ نہیں ہیں۔ لفظ کو چھوڑ دینا اور مجرد نفسِ موضوع سے بحث کرنا اس مفروضے میں یقین رکھنا ہے کہ جوہر عرض سے الگ بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور مرا ہوا بدن اس لیے مردہ ہے کہ روح اس میں سے نکل گئی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ مادہ اتنا مرئی ہے جتنا فرض کیا جاتا ہے اور نہ روح (یا جو بھی نام دے لیں) اتنی غیر مرئی ہے جتنی لوگ سمجھتے ہیں۔ جو جوہر ہے وہی عرض ہے۔ اسی طرح جو لفظ ہے وہی شعر ہے۔

جعفر امداد ادبی نمبر — ماہنامہ شاعر بمبئی — ۱۹۷۷

موہن چراغی



مشترکہ قوم کے مشترکہ مسئلے

فرقہ واریت کی عینک

ایک ہی ملک اور ایک ہی قوم کے لوگ جب آنکھوں پر فرقہ واریت کی عینک چڑھا کر مسائل پر نظر ڈالتے ہیں تو تعصب اور نفرت کی حس بیدار ہوتی ہے اور ٹکراؤ کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں آزادی حاصل کیے ہوئے ۴۴ برس گذر چکے ہیں اور اس طویل مدت میں اور سخت ترین آزمائشی مرحلوں سے گذرنے کے بعد یہ شعور پوری طرح پیدا نہیں ہوسکا ہے کہ اگر مذہبی اور لسانی فرقوں کو علاحدہ علاحدہ کرکے ہر فرقہ انفرادی انداز سے مسائل پر غور کرنا شروع کردے تو نہ ملک رہے گا اور نہ ہندستانی قوم۔ چھوٹے اور الگ الگ گروہوں میں تقسیم ہوکر کوئی بھی قوم نہ آج تک زندہ رہی ہے اور نہ زندہ رہے گی۔ ۱۹۴۷ء کا تجربہ ہمارے سامنے ہے، دو قومی نظریے کو اگرچہ کانگریس نے تسلیم نہیں کیا تھا لیکن تقسیم کی تحریک اسی بنیاد پر چلائی گئی تھی اور اس سے مخلوط تہذیب اور مشترکہ ورثے پر ایسی گہری چوٹ پڑی کہ درد کی شدت آج بھی محسوس ہوتی ہے اس لیے اگر آج قومی مسائل پر مجموعی انداز سے سوچنے کا رجحان مستحکم نہ ہوا اور ایک قوم کے اندر کئی کئی قوموں کی باتیں پائے جانے کی باتوں سے اندرونی اتحاد میں کمزوری آئی تو حالات ایسا رُخ اختیار کرلیں گے کہ ہندستانی قوم تباہ ہوجائے گی۔

مذہب فلسفۂ حیات ہے ضابطۂ اخلاق ہے، زندگی میں ربط و نظم قائم رکھنے اور مادی اور روحانی زندگی کے درمیان توازن برقرار رکھنے کا نام ہے اور سلیقہ ہے مذہب کا کوئی جغرافیہ نہیں، کوئی پوسٹل ایڈریس نہیں کوئی مخصوص حدود اربعہ نہیں۔ اگر عرب میں مسلمانوں کی اکثریت ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام صرف عربوں کی جاگیر ہے۔ اسی طرح اگر ہندستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہندو دھرم پر صرف یہاں کے ہندوؤں کا راج ہے۔

اسلام اور ہندو دھرم نے انسانی زندگی کو خوشحال اور بہتر بنانے کے لیے اعلا قدروں کی پرورش کی ہے اور ان کو توانائی بخشی ہے۔ نفرت اور تعصب تو ساری دنیا کی دین ہے۔ محبت، آشتی اور امن اسلام اور ہندو مت دونوں کا نچوڑ ہے اسی لیے اگر ہندو یا مسلمان مذہب کے نام پر نفرت یا تعصب پھیلاتے تو وہ مذہب کی توہین کرتا ہے، مذہبی عقیدہ انفرادی سوچ اور انداز فکر ہے، نہ کسی کو کسی مذہبی عقیدے پر ایمان لانے کے لیے مجبور کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی پر اپنا مذہبی عقیدہ ترک کے لیے دباؤ ڈالا جاسکتا ہے۔ عقیدہ خرید و فروخت کی جنس نہیں کہ اس کا تھوک یا پرچون کاروبار کیا جائے البتہ کمزور اعتقاد والے کبھی بھی پھسل سکتے ہیں، کسی بھی جگہ اور کبھی بھی بک سکتے ہیں۔ سیاسی عقیدوں پر اختلاف کیا جاسکتا ہے اور جیسا کہ آج کل رواج ہے، ان کا بیوپار بھی کیا جاسکتا ہے، لیکن مذہبی عقیدے بک نہیں سکتے لالچ انہیں داغدار نہیں بنا سکتا۔

الجھاؤ کی جڑ

اس پس منظر میں مذہب اور سیاست یا مذہب اور معیشت کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش الجھاؤ پیدا کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی، سیاست اور معیشت ایک سائنسی علم ہے جس کا مذہبی عقیدے سے کوئی تعلق نہیں، البتہ انسان دوستی ،

راست گوئی اور دیانت داری کا فلسفۂ حیات مذہب سے سیکھ کر سیاست میں استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن المیہ تو یہ ہے کہ ہندوؤں کی جماعت ہو، یا مسلمانوں کی، یا کسی اور فرقے کی، وہ معاشی، سماجی اور سیاسی سوالات کو فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے جس سے نہ صرف یہ کہ مسائل کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے، بلکہ مسائل پر علاحدگی پسند رجحانات حاوی ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے، اور مسلمان سب سے بڑا اقلیتی فرقہ ہیں، دونوں فرقوں کی تہذیب میں بہت سی باتیں مشترک ہیں، دونوں کی ذہنی پرورش ہندستانی ماحول میں ہوئی ہے۔ پھر دونوں فرقوں کے درمیان شکوک و شبہات کیوں پیدا ہو جاتے ہیں؟ ہندو کیوں یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد مسلمان کی جگہ پاکستان میں ہے اور مسلمان میں یہ احساس کیوں پیدا ہوتا ہے کہ اپنے ہی گھر میں وہ اجنبی ہے؟ حقیقت میں اس منفی انداز فکر کی بنیادی وجہ سماجی اور معاشی پس ماندگی اور فکر و ذہن کی ناپختگی ہے ..... جس سے مسلم اور ہندو لیڈر ناجائز فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔

مذہب اور سیاست

مسلمان ایک اقلیتی فرقہ ہیں اور ان کے معاشی اور سیاسی مسائل الجھے ہوئے ہیں، اس الجھاؤ کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض مسلمان لیڈر محض اپنے ذاتی مفادات اور سیاسی اغراض کے لیے عام مسلمانوں میں علاحدگی کی سوچ پیدا کر کے ان میں کمتری اور عدم تحفظ کا احساس ابھارتے ہیں، کسی بھی نام نہاد مسلمان سیاسی لیڈر نے آج تک اس بات کی نشان دہی نہیں کی کہ بنیادی مسئلہ کیا ہے۔ کچھ لیڈر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی یا مسلم پرسنل لا کی باتیں اس طرح کرتے ہیں کہ انہیں دو مسئلوں سے مسلمانوں کے تمام مسئلے حل ہوں گے۔

کشمیر کے شیخ عبداللہ کی شخصیت میں صلاحیت تھی کہ وہ ہندستانی مسلمانوں کی آواز بنتے۔ لیکن انہوں نے سیاست میں مذہب کو داخل کر کے مسلمانوں کے مسائل کو مسجدوں اور خانقاہوں کے اندر بند کر دیا۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مسلمان ذہنی طور پر پسماندہ رہے تاکہ اس میں مسلم "لیڈرشپ" کے خلاف احتجاج یا آواز بلند کرنے کی جرأت پیدا نہ ہونے پائے۔ یہی حال کئی دوسرے لیڈروں کا بھی ہے، مسلمانوں کی ایک بڑی بد قسمتی بھی یہ ہے کہ ان کی جماعتوں کے ذہنوں پر تقسیم ملک، اور پاکستان بننے کا بھوت اب بھی سوار ہے، ملک کی تقسیم کیوں ہوئی، کس فلسفے کے تحت ہوئی؟ یہ تو ماضی کی بات ہے۔ اس کے لیے نہ آج کا ہندو ذمہ دار ہے اور نہ مسلمان اب جب پاکستان بن چکا ہے، تو تقسیم ملک کے اسباب پر بحث کرنا نئی تلخیوں کو ابھارنے کے برابر ہے، لیکن جب مسلمانوں کے مسائل پر بحث کی جائے تو یہ حقیقت سامنے رکھی جانی چاہیے کہ پاکستان ایک علاحدہ ملک ہے، اور ہندستان کا مسلمان ہندوستان کا شہری ہے۔

مسلمان کیوں پس ماندہ ہے؟ کیا اس کی وجہ ہندستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے، یا پارلیمنٹ، ریاستی اسمبلیوں اور انتظامیہ میں غیر مسلموں کی اکثریت اس کی ذمہ دار ہے؟ اگر اقلیت میں ہونا ہی پسماندگی کا سبب ہے، تو پاکستان خالصتاً ایک مسلم ملک ہے، وہاں کے مسلمانوں کے معاشی اور سماجی مسائل حل ہو جانے چاہییں تھے، اور وہاں حکمران طبقوں کے خلاف بے چینی نہیں ہونی چاہیے تھی، اگر مسلم ریاست ہونا ہی مسلمانوں کی خوش حالی کی ضمانت ہے تو پاکستان میں مسٹر بھٹو پھانسی پر نہ چڑھائے جاتے، اور وہاں ذہن و فکر پر فوجی پہرے نہ بٹھائے جاتے۔ اس طرح اگر ہندوؤں کا اکثریت میں ہونا ہی ان کے مسائل کے حل کی ضمانت ہے تو آج ہریجنوں کا قتل عام نہیں ہوتا، ہریجنوں کو پست ذات قرار نہ دیا گیا ہوتا، اور لاکھوں پڑھے لکھے ہندو نوجوان بے روزگار نہ ہوتے

بنیادی مسئلہ

بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہندستان کی ۶۰ فی صد آبادی کنگالی کی سطح سے نیچے کی زندگی گزار رہی ہے اور اس ساتھ

فی صد آبادی میں ہندو مسلمان، سکھ اور ہری جن سبھی فرقے شامل ہیں، البتہ آبادی کے تناسب سے کسی فرقے کی تعداد زیادہ ہو سکتی ہے، اگر یہ ساٹھ فی صد آبادی کنگالی کی سطح سے اوپر اٹھتی ہے اور ان کی معاشی اور سماجی ترقی ممکن بن جاتی ہے تو سکھ، مسلمان اور ہندو کی کش مکش ہی ختم ہو جائے گی، بنیادی سوال یہ ہے کہ آزادی کے ۴۳ برس بعد ۶۰ فی صد آبادی کنگالی کی سطح سے کیوں نیچے ہے، جب کہ غذائی اشیاء کے معاملے میں ہم خود کفالت کی منزل کو چھو رہے ہیں، صنعتی میدان میں کافی پیش رفت ہوئی ہے اور تعلیم کا پھیلاؤ ہوا ہے، اس سوال پر بہت کم لوگ دھیان دیتے ہیں، زیادہ تر لوگ سطحی انداز سے سوچتے ہیں

زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اصل جھگڑا مذہب کا نہیں ہے، ایک مذہب کے ماننے والے دوسرے مذہب کے ماننے والوں کا استحصال نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک طبقے کے لوگ دوسرے طبقوں کا استحصال کرتے ہیں۔ مسئلہ دولت کی غیر متوازن تقسیم کا ہے، مسلمانوں کی اکثریت گھریلو دستکاری کی صنعت سے وابستہ ہے، مرادآباد میں برتن بنانے کا کاروبار ہو، مرزاپور میں قالین بافی کا کام ہو، مدراس میں چمڑے کی تجارت ہو یا کشمیر میں قالین بافی اور دست کاری ہو، ان سے تو مسلمان وابستہ ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ قالین بنانے والے مزدور، برتنوں پر نقش ونگاری کرنے والے کاریگر یا چمڑے کو قابل فروخت بنانے والے مزدور نہ صرف غریب ہیں بلکہ مسلمان بھی ہیں، اور ان کی محنت کا استحصال چند سرمایہ دار کر رہے ہیں۔ اسی طرح ہندوؤں میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کا استحصال کیا جاتا ہے، اور ایسے لوگ بھی ہیں، جو استحصال کرتے ہیں۔ استحصال کے مقصد اور عمل میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی ہندو اجارہ دار مندر تعمیر کرا دیتا ہے، مذہبی رسومات کے لیے دان دے دیتا ہے، اسی طرح مسلمان اجارہ دار مسجد بھی بناتا ہے لنگر بھی کھولتا ہے، اور دونوں خوش ہوتے ہیں، کہ مذہب کی خدمت کی گئی۔ اگر عام مسلمان یہ سوچے کہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے وہ پس ماندہ ہے، یا اس کے ساتھ امتیاز ہو رہا ہے یا عام ہندو یہ سوچے کہ اگر سب مسلمان پاکستان بھاگ گئے ہوتے تو ہندوستان میں رام راج قائم ہو جاتا اور دودھ، شہد کی ندیاں بہنے لگتیں تو مسائل کی نوعیت بدل کر ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوگی۔

فرقہ پرستی، معاشی نابرابری کے ماحول میں پنپتی ہے اور یہ نابرابری سرمایہ دارانہ نظام میں بڑھتی ہے اس لیے سرمایہ دار طبقہ فرقہ پرست جماعتوں کی سرپرستی کرتا ہے اور سوشلزم کی مخالفت کرتا ہے۔ اگر ترقی و خوش حالی کی تحریک نچلی سطح سے شروع ہو تو امتیازی سلوک اور نابرابری میں شدت نہیں پیدا ہونے پائے گی، اگر مجموعی طور پر ۶۰ فی صد آبادی میں یہ شعور پیدا ہو جائے کہ ملک مشترک ہے اس کے مسائل مشترک ہیں، اور منافرت کو ہوا دینے والوں میں سب فرقوں کے استحصال پسند لوگ شامل ہیں، تو حالات کی نوعیت بدل جائے گی، لیکن جس انداز سے مختلف سیاسی جماعتیں کام کر رہی ہیں اور جس طرح روز بروز استحصالی طبقوں کو تقویت پہونچا رہی ہیں، اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ عوام تقسیم ہوتے رہیں گے، اور مذہب کے نام پر کٹتے رہیں گے۔

فرقہ پرست جماعتیں

اس سے انکار نہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایسی جماعتیں موجود ہیں جو فرقہ پرستی کو ہوا دے رہی ہیں۔ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ ہو یا بھارتیہ جنتا پارٹی دونوں جماعتوں کا کردار مسلم دشمنی ہے اور جب بھی مسلمان اپنی معاشی، سماجی پس ماندگی کا ماتم کرتا ہے تو اس کو پاکستانی قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ پاکستانی وہی ہو سکتا ہے، جو پاکستان کا شہری ہو، کوئی شخص بہ یک وقت ہندوستانی پاکستانی کیسے ہو سکتا ہے، ؟ آر ایس ایس نے ہندو فرقہ پرستی کو ایک فلسفے کی شکل دے دی اور یہ فلسفہ جن سنگھ نے بھی اپنا لیا، اب بھارتیہ جنتا پارٹی والے اگرچہ اپنے آپ کو غیر فرقہ پرست کہتے رہیں، اور مسلمانوں کو یہ باور کرانے کے لیے پاکستان سے متعلق پہلے سے مختلف باتیں کرتے ہیں لیکن آر ایس ایس سے ساتھ انھوں نے اپنا ناتا نہیں توڑا ہے۔ وہ باتیں چاہے جیسی کریں، لیکن بنیادی طور پر آر ایس ایس کے فرقہ پرستی والے فلسفے کے پابند اور اس پر کاربند ہیں۔ دوسری طرف جماعت اسلامی والے ایک عرصے تک جمہوری نظام کو

غیر اسلامی قرار دیتے اور الکشن کا بائیکاٹ کرتے رہے۔ اور جس فرد یا پارٹی کو جمہوریت پر اعتقاد نہ ہو۔ وہ سیکولر نہیں ہو سکتی۔ بنیادی طور پر جماعت اسلامی کا کردار راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے کردار سے مختلف نہیں ہے۔ دونوں کو جمہوریت پر اعتقاد نہیں ہے دونوں تنگ نظری پر یقین ہے۔ اور دونوں کو استحصالی طبقوں سے مالی اور اخلاقی مدد ملتی ہے اور دونوں نہ صرف ہندوؤں۔ اور مسلمانوں کے مفادات کو زک دیتی رہی ہیں۔ بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دیوار بھی کھڑی کرتی رہی ہیں

تاریخ کی غلط تاویلیں

ہندو اور مسلمان فرقوں کے درمیان مسائل کبھی کبھی تاریخ کی غلط تاویل سے بھی الجھ جاتے ہیں۔ مغل بادشاہوں کے ہندوؤں پر "ظلم" کی داستانوں کو لے کر فرقہ پرست ہندو نت نئے فتنے برپا کرنے کی مسلسل کوششیں کرتے رہتے ہیں یہ مانا کہ مغل بادشاہوں کا مذہب اسلام تھا۔ لیکن یہ حقیقت کیوں فراموش کر دی جاتی ہے کہ ان کا طبقاتی کردار اور تعلق باقی ہندو مہاراجوں سے مختلف نہیں تھا۔ بادشاہ مسلمان ہو یا راجہ ہندو ہو، دونوں کا کردار استحصالی ہے اور دونوں نے عوام کا خون نچوڑ کر محلات بنائے ہیں۔ وہ عوام کو رعایا سمجھتے تھے اور حکمرانی کو اپنا موروثی حق۔ ایسے نظام میں لوگوں کو چاہیے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، دبائے رکھنے کے لیے ہر باغی کا سر قلم ہوتا رہا ہے۔ ہر انقلابی کے ہاتھ کٹتے رہے ہیں۔ اس لیے آج مسلمان کو یہ طعنہ دینا کہ اورنگ زیب نے ہندوؤں پر ظلم کیا ایک بے تکی منطق ہے اور تاریخ کے سائنسی تجربے کے منافی ہے، شہنشاہ مسلمان تھا یا راجہ ہندو تھا، ہر ایک نے اپنی رعایا کی بے کسی اور مجبوری کا فائدہ اٹھایا۔ کبھی کبھی زبان کے بارے میں بھی غلط باتیں کہی جاتی ہیں۔ اردو نہ ہندو کی اور نہ ہی مسلمان کی زبان ہے، یہ تو ہندستان کی زبان ہے، اس کو مسلمانوں کی زبان قرار دینا اردو زبان کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ اردو زبان کے فروغ اور اردو ترقی کے لیے زیادہ کچھ نہیں کیا گیا ہے۔ درحقیقت ابھی بھی حکمراں طبقوں، اپوزیشن پارٹیوں اور انتظامیہ میں غلامانہ ذہنیت باقی ہے وہ اب بھی انگریزی زبان کو مقدم سمجھتے ہیں اور انگریزی بولنے اور پڑھنے کو اعلا کلچر کی علامت قرار دیتے ہیں غالباً اسی لیے ہندی کو بھی پورا فروغ نہیں ملا ہے، اس میں اردو کا کوئی قصور نہیں ہے، اور بعض ہندی دوست اردو کے خلاف تعصب والا رویہ اختیار کر کے اردو سے زیادہ ہندی کو نقصان پہونچا رہے ہیں۔ ان کے اس رویے کی وجہ سے جنوبی ہند میں ہندی کو وہ مقبولیت نہیں مل پا رہی ہے جو ملنی چاہیے۔

مذہب کی طرح زبان بھی انتشار پھیلانے کے لیے نہیں بلکہ اتحاد اور یگانگت کو فروغ دینے کے لیے ہوتی ہے اور اگر انتشار پسند بالوں اور حرکتوں کا تجزیہ کیا جائے تو کسی نہ کسی منزل پر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ ان کے پیچھے استحصال پسند عناصر کا ہاتھ ہوتا ہے، یہ عناصر مشترکہ مسائل کے حل کے لیے عوام کو مشترکہ جد وجہد سے باز رکھنا چاہتے ہیں، جب تک عوام ان عناصر کی چالوں کو سمجھ کر خود ان کا توڑ نہیں کریں گے تب تک مذہب، زبان اور علاقے کے نام پر انہیں آپس میں لڑانے کی کوششیں ہوتی رہیں گی اور وہ استحصالی قوتوں کے خلاف اپنا تحفظ نہیں کر سکیں گے۔

(روزنامہ قومی آواز نئی دہلی ۱۹۸۹ء)

موسیقی

بیگم اختر

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے



ہم نے فن موسیقی گیارہ برس کے سن میں، جب ہم کلکتے میں تھے اس وقت خاں صاحب عطا محمد خاں پٹیالہ والے سے سیکھنے کی کوشش شروع کی وہ مہربان ہو گئے اور نہایت محبت کے ساتھ ہمیں موسیقی کی تعلیم دینا شروع کی خاں صاحب عطا محمد خاں ایک اعلا پائے کے فنکار، بڑے گنی اور سمجھ دار انسان تھے۔ ان سے ہم نے خیال، ٹھمری، دادرا اور غزل یعنی سبھی کچھ سیکھا۔ خانصاحب عطا محمد صاحب نے ابتدا راگ محل سے کی صبح کو راگ محل اور رات کو جب تعلیم دیتے اس وقت راگ یمن سکھاتے تھے۔ شروع میں انھوں نے ہمیں تقریباً ڈیڑھ برس تک بھیروگویا۔ شروع میں ریاض کرتے ہوئے ہمیں بڑی الجھن ہوتی تھی۔ جاڑے کے زمانے میں رات کے تین بجے اٹھا دیتے تھے۔ تان پورہ لاکر سامنے رکھ دیتے جب کہ نیند کی وجہ سے ہماری آنکھیں بند ہی ہوتی تھیں آخر میں تو حالت یہ ہو گئی تھی کہ ہم سو رہے ہیں۔ انھوں نے آواز دی۔ نام لے کر پکارا۔ ہم نے آنکھیں بند کیے تکیے سے سر اٹھایا اور آ.... آ.... کرتے اٹھ بیٹھے بچپن بھی اور شوق بھی، دونوں کیفیات ساتھ ساتھ موجود تھیں اس کے علاوہ استاد کی تنبیہ بھی اس کی ایک وجہ تھی۔ ہمیں یاد ہے ریاض کے معاملے میں ہم نے ان کی خفگی بھی سہی ہے ہر استاد کی طرح ہمارے استاد بھی ریاض کے معاملے میں لاپرواہی پر ناراض ہو جاتے تھے۔ اس وقت ہمیں ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ راگ گن کلی ہمیں بہت پسند تھا اور ہم بے حد شوق سے سیکھتے تھے لیکن ایک بار خانصاحب نے دوسرا راگ شروع کرایا جس کا نام اس وقت ہمیں یاد نہیں یہ راگ ہمیں پسند نہیں تھا ہم نے کہہ دیا تھا خانصاحب یہ ہم سے نہیں ہو گا لیکن خانصاحب نہیں مانے۔ ان کا حکم تھا اضافہ پورن کی گئی۔ حال یہ تھا کہ وہ راگ کسی طرح یاد ہی نہیں ہوتا تھا حالانکہ خانصاحب کی فنکاری کا یہ عالم تھا کہ پوری پوری استھائی پندرہ منٹ میں ٹھیک کرا دیتے تھے۔ بالآخر ہم نے انکار کر دیا اس پر وہ ناراض ہو گئے کہنے لگے اب میں بتاؤں گا ہی نہیں جو تیرا جی چاہے کر۔

اب ہم کیا کرتے۔ ہم تانپورہ لیے بیٹھے ہیں، آواز لگاتے ہیں، تانیں دیتے ہیں، ٹھیک کر رہے ہیں یا غلط کچھ پتہ ہی نہیں چلتا، کوئی غلطی بتانے والا نہیں۔ استاد نے بتانا ہی بند کر دیا تھا۔ خیر صاحب بڑی خوشامد کی تو کہا جب تک تو استھائی یاد نہیں کرے گی اس وقت تک گانا نہیں بتاؤں گا۔ مجبوراً وہ استھائی یاد کی معافی مانگی، پھر وہ خوش ہوئے۔

ہمارے دوسرے استاد خانصاحب عبدالوحید خاں تھے جن کا تعلق کیرانہ گھرانے سے تھا۔ ان سے ہم نے تین برس تک کلاسیکی موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ ان کی شفقت ان کی محبت سے ہمیں بہت فیض پہنچا عبدالوحید خانصاحب کے سُر کا لگاؤ بہت اچھا تھا عبدالوحید خاں صاحب خیال گائیکی میں مہارت رکھتے تھے لیکن ٹھمری میں گاتے نہیں تھے۔ بتاتے ضرور تھے۔ ان سے ہم نے خیال سیکھا کیونکہ ہماری نظر میں ٹھمری گانے کے لیے خیال گانا ضروری ہے۔ ٹھمری گانا شروع کرنے کے پس پشت کوئی خاص وجہ نہیں تھی، بس ہمارا رجحان شروع سے ہی ٹھمری کی طرف رہا۔ ٹھمری کی گائیکی میں دو طرح کے انگ ہیں ایک پورب انگ کہلاتا ہے دوسرا پنجاب انگ۔ اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں ہی انگ اپنی اپنی جگہ بہت اچھے ہیں۔ گانے والا جس انگ کو گائے اور جس انگ کو پسند کرے وہی ٹھیک ہے۔ جس طرح خیال میں تانیں ہوتی ہیں الاپ ہوتا ہے اسی طرح ٹھمری میں چھوٹی چھوٹی مُرکیاں ہوتی ہیں، سُروں کا لگاؤ ہوتا ہے، بول کا بنانا ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فن موسیقی خدا داد عطیہ ہوتا ہے لیکن خدا دیتا ہے اور استاد سکھاتا ہے اور اس میں طریقۂ تعلیم بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ فن موسیقی میں آواز کا سُریلا پن بے حد ضروری ہے۔ میں نے بہت سے بزرگ فن کاروں کو سنا ہے۔ گو ان میں کچھ اس وقت دنیا میں نہیں لیکن اچھے بزرگوں کا نام صدا روشن رہتا ہے، دنیا انھیں ہمیشہ یاد کرتی ہے۔ بزرگ فنکاروں میں جن کے فن کی میں بے حد مداح اور

قائل رہی ہوں، میرے استادوں خانصاحب عطا محمد خاں اور خانصاحب عبدالوحید خاں کے علاوہ غلام علی خاں اور پنجاب کے ایک بزرگ استاد موسیقی خاں صاحب امراؤ خاں کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کو ہم نے اس وقت سنا جب وہ بوڑھے ہو چکے تھے لیکن ہم نے وہ انترے اور استھائی کبھی نہیں سنے۔

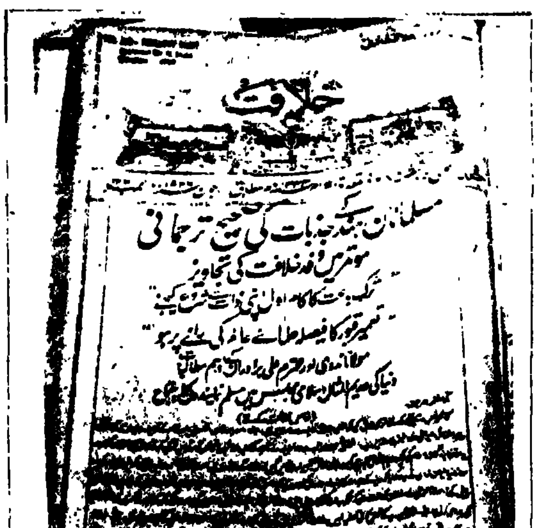
اب ہم غزل کی بات کریں گے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غزل نہ تو بھاؤ کے لیے بنی ہے اور نہ ناچ کے لیے۔ غزل تو جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہے غزل تو بس غزل ہے۔ غزل کو اگر راگ میں گایا جائے گا تو اس کا بھرم، اس کی بڑائی، اس کی سچائی انسان کے دل پر اثر انداز ہوں گے۔ غزل کو غزل کی طرح اگر راگ میں گایا جائے گا تو اس کا وقار بنا رہے گا۔

ایک زمانہ تھا کہ جب اچھے گانے والے غزل گائیکی کو اپنے لیے ہتک سمجھتے تھے لیکن بعد میں استادوں نے بھی غزل کو گایا جیسے ہم نے وزیر حسن خاں کو غزل گاتے ہوئے سنا، فیاض خاں صاحب کو سنا اور نجی محفلوں میں مشتاق حسین خاں صاحب کو بھی غزل گاتے ہوئے سنا۔ خود ہماری غزل گائیکی پر برکت علی خاں کا کافی اثر ہے، اس کے علاوہ عطا محمد خاں صاحب کا بھی اثر ہے۔ غزل کی مقبولیت ہم نے غیر ممالک میں بھی دیکھی۔ ایران کے علاوہ ہماری گائی ہوئی فارسی غزلیں تاشقند میں بھی پسند کی گئیں اور بخارا میں بھی۔

بات جب محفلوں کی چل نکلی ہے تو ہمیں بہت سی موسیقی کی محفلیں یاد آگئیں۔

ہم نے سب سے پہلے موسیقی کی جس محفل میں اپنا فن پیش کیا وہ اپنی طرز کا ایک انوکھا واقعہ تھا۔ پہلی دفعہ جب ہم اسٹیج پر آئے تو بہار میں زلزلہ آیا تھا۔ یہ ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء کی بات ہے۔ یہ زلزلہ بڑا بھیانک تھا۔ سارے ملک میں تہلکہ مچ گیا تھا، بہت تباہی پھیلی تھی۔

بہار ریلیف فنڈ کے لیے کلکتے میں ایک پروگرام منعقد کیا گیا۔ اس پروگرام میں شرکت کے لیے کلکتے کے تمام بڑے بڑے فنکاروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ لیکن غالباً چیریٹی پروگرام ہونے اور معاوضہ نہ ملنے کے سبب کوئی آرٹسٹ نہیں آیا۔ آئی گئی ساری مصیبت ہمارے سر آپڑی۔ تمام ٹکٹ فروخت ہو چکے تھے، سامعین آچکے تھے لیکن فنکار لاپتہ تھے۔ آخر میں منتظمین نے فیصلہ کیا کہ تنہا ہم اسٹیج پر جائیں۔ ہم اس سے قبل کبھی اسٹیج پر نہیں گئے تھے یہ سن کر تو ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ہم بتا نہیں سکتے اس وقت ہماری کیا کیفیت تھی ہم رونے لگے لیکن ہمیں اسٹیج پر جانا ہی پڑا۔ منتظمین نے ہم سے کہا کہ ہم اسٹیج پر جائیں اور سامعین سے کہیں کہ مدعو فنکاروں کے نہ آسکنے کے سبب ہم انھیں دو غزلیں سنائیں گے۔ لیکن اسٹیج پر جا کر یہ اعلان کرنا ہی کارے دارد والا معاملہ تھا۔ خیر صاحب ہم اسٹیج پر پہنچے۔ چونکہ ٹکٹ تمام فروخت ہو چکے تھے اس لیے بے پناہ بھیڑ وہاں جمع تھی اور ہماری یہ حالت کہ ہم تھر تھر کانپ رہے تھے۔ یا اللہ کیسے گا ئیں گے ہم! وہاں ہمارے استاد خاں صاحب عطا محمد خاں موجود تھے، انھوں نے کہا تم گھبراؤ مت، اللہ کا نام لے کر شروع ہو جاؤ ایک ٹھمری گا دو اور ایک غزل سنا دو۔ ایک دادرا گاؤ اور بس ختم۔ ہم نے کہا خاں صاحب آپ کہہ تو رہے ہیں لیکن ہم سے گایا نہیں جائے گا۔ کہنے لگے تم بسم اللہ کرو۔ خیر صاحب پردہ اٹھا۔ غزل شروع کی۔ استاد نے کہا تھا پہلے ٹھمری گانا، بعد میں غزل، ہم مارے گھبراہٹ کے پہلے غزل شروع کر بیٹھے۔ غزل بہت اچھی تھی اور لوگ سمجھدار تھے انھوں نے داد دینا شروع کی۔ ہماری گھبراہٹ کم ہونے لگی، دل کو ذرا اطمینان ہوا۔ ایک غزل گائی اس کے بعد تالیاں بجیں، دوسری غزل گائی، پھر فرمائش ہوئی ٹھمری گائیے اس طرح اسٹیج پر پہلی مرتبہ آنے کے باوجود ہم مسلسل ڈھائی گھنٹے تک تنہا گاتے رہے اور خدا نے ہمیں کامیاب کیا۔ اس طرح یہ ایک عجیب ابتداء تھی۔ بیگم اختر ۔ پندرہ روزہ آزادی نمبر ۱۹۸۰ء


خلافت
مسلمانانِ ہند کے جذبات کی صحیح ترجمانی
موتمر میں وفد خلافت کی تجاویز

روزنامہ خلافت ۱۰ جون ۱۹۲۶ء کے اخبار کا عکس

نور جہاں ثروت

صحت



تندرستی ہزار نعمت ہے

دنیا نعمتوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہر نعمت کا ایک الگ رنگ، جدا مزہ، نعمتوں کی بہتات یا کثرت ہی انسان کی آسائش کا معیار مقرر کرتی ہے۔ جتنے خوشحال لوگ ہیں: خواہ کتنی ہی محنت و جد و جہد کے بعد اس مقام تک پہونچے ہوں عام الفاظ میں یہی کہا جاتا ہے خدا نے انہیں کیسی کیسی نعمتوں سے نوازا ہے، نادیدہ کرم فرما بھی ہوتے ہیں نا۔

جہاں تک تندرستی کا تعلق ہے یہ دنیا کی تمام نعمتوں سے افضل ہے اور "گھر کی بکری کون ڈالے گھاس" کے مصداق اس کی قطعی قدر نہیں کی جاتی۔ یہ وہ دولت ہے جو بغیر محنت کے حاصل ہوتی ہے اس لیے بے دریغ اسے خرچ کیا جاتا ہے۔ اور احساس اس وقت ہوتا ہے جب یہ دولت ساتھ چھوڑنے لگتی ہے۔ یا اتنی کم رہ جاتی ہے کہ صورت پر بیماری برسنے لگتی ہے۔ لیجیے صاحب حکیم ڈاکٹروں کا دروازہ آپ پر سدا کے لیے کھل گیا تندرستی میں صحت کے نام پر چار ٹکے ترچ نہ ہوتے تھے بیماری میں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا۔ دوا تو خیر پیسہ خرچ ہوا تھا کھالی گئی مگر ساتھ میں پرہیز کی فہرست نے تو جان ہی نکال لی۔ یہ نہ کھاؤ، وہ نہ کھاؤ، زبان کو چٹخارہ لگا تھا۔ کھٹی میٹھی اچھی بری سب پیٹ کے ایندھن کے برابر تھی اب حساب کتاب کون رکھے کہ کیا کھایا جائے کیا نہ کھایا جائے۔ سیدھا سا اصول ہے دوا کھاؤ مگر پرہیز کرے بلا۔ بھئی قدرت کی نعمتوں سے منہ بھی تو نہیں موڑا جا سکتا۔ آپ نے ایک فیصلہ کر لیا اور اپنی جگہ خوش ہو گئے نتیجے میں آپ کی بیماری کی رسی دراز ہو گئی۔ اب تک چل پھر لیتے تھے اب پلنگ سنبھال لیا۔ چند دن گھر والوں نے مریض سمجھ کر جی جان سے خدمت کی، شب بیداری کی، دعائیں مانگیں، اتنے دن میں اگر آپ تندرست ہو گئے تو خوشیاں منائی گئیں۔ عزیز رشتہ داروں کے ہاں سے تیل ماش اور مبارک سلامت کے پیغامات آئے وہ بھی خوش آپ بھی خوش!! مگر اس کا کیا کیا جائے کہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ ایک دن کا بیمار، دو دن کا بیمار، تیسرے دن اللہ کی مار بن جاتا ہے۔ تیماردار دست کش ہو جاتے ہیں اور آپ دواؤں کی شیشیاں گنتے رہتے ہیں۔ اس خالی وقت میں درد تنہائی اور احساس بیماری سے بچنے کے لیے آپ تندرستی کے دور میں چلے جاتے ہیں اور وہ زمانہ یاد کرنے لگتے ہیں۔ جب آپ کی صحت قابل رشک تھی۔ یہ لوگ جو آپ کے قریب سے ہو کر نہیں گزرتے کس طرح آپ کے کندھوں پر سوار ہوتے تھے۔ آپ سخت سے سخت کام کرنے کے بعد بھی تھکنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ماضی کی یاد، بیتے دنوں کے تلازمے آپ کی ہمت اور بھی پست کر دیتے ہیں آپ کی کسمپرسی بڑھ جاتی ہے اور آپ خود کو لاچار و مجبور سمجھتے ہیں۔

بہرحال جہاں تک تندرستی کا تعلق ہے اسے دنیا کی کسی بھی خوشی کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ زندگی کا تمام تر لطف تندرستی میں ہے۔ آپ کی صحت ٹھیک آپ کا دل خوش، دل خوش تو دنیا حسین! لوگ دولت و شہرت پر جتنی توجہ صرف کرتے ہیں اگر اس سے ایک چوتھائی بھی صحت پر صرف کریں تو بادشاہ ہوں۔

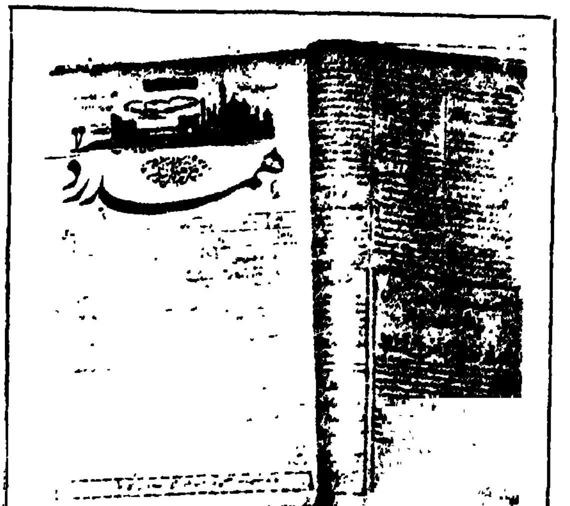
لیکن ظاہری نمود نظروں کو خیرہ کر دیتی ہے اور سامان عیش کے حصول کے لیے خوراک کی مد گھٹائی جاتی ہے

آج کا دور مقابلہ کا دور ہے۔ کسی دوست کے ہاں کوئی چیز آئی اور خوشی خوشی اس نے آپ کو دکھائی بظاہر اس چیز کی تعریف کے ساتھ دوست کے ذوق کی بھی تعریف کرتے ہیں اسے مبارک باد بھی دیتے ہیں لیکن دل میں فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ہر حالت میں یہی چیز آپ کو لینی ہے۔ اگر آپ کی آمدنی وافر ہے یعنی آپ بڑے بینک بیلنس کے مالک ہیں تو چیک کاٹنے میں آپ کو قطعی کسی بجٹ پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اگر آپ کے ذرائع محدود ہیں تو آپ بجٹ پر ضرور غور کریں گے اور سب سے زیادہ کٹوتی کا شکار کچن کا بجٹ ہوگا نتیجہ معلوم۔ چلیے صاحب اگر صرف سربراہ خاندان یعنی ہیڈ آف دی فیملی کی ہی پسند ناپسند یا گھر کے کسی ایک فرد تک یہ معاملہ رہتا ہے تو جیسے تیسے اس سے نبٹا جا سکتا ہے مگر اس کا کیا کیجیے کہ گھر کے ہر فرد کے دوست اور ملنے والے الگ الگ ہیں اور کسی نہ کسی جاننے والے کے ہاں کوئی نہ کوئی روز ہی نئی چیز آتی ہے۔ کس کس کا خیال کیجیے کس کس کو دیکھیے۔!!! حکمت کا اصول ہے کہ جو کچھ آپ کھاتے ہیں وہ آپ کا چہرہ بتا دیتا ہے۔ جہاں تندرستی سب سے بڑی نعمت ہے وہیں غذا، اس نعمت کو برقرار رکھنے میں سب سے زیادہ معاون مددگار ثابت ہوتی ہے۔ غذا نہ صرف یہ کہ اچھی اور وٹامنائزڈ ہو بلکہ صاف ستھری بھی ہو، اگر اچھی غذا برے طریقے سے پکائی جائے یا پکانے اور کھانے کے درمیان صفائی کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو بھی تندرستی کا اللہ حافظ ہوتا ہے۔ یہ صفائی محض غذا کے دائرے تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ تن صاف رکھو، من صاف رکھو کے ذیل میں صفائی یا ہائیجین کو رکھنا چاہیے۔ آپ صاف ستھرے ہوں آپ کا گھر قرینے سے سجا ہو یہ سجاوٹ خوبصورت اور قیمتی چیزوں کے اجتماع کا نام نہیں بلکہ سادگی پُرکاری سے عبارت ہے۔ تندرستی محض تن درستی ہی نہیں ہے۔ اس کا تعلق دل و دماغ سے بھی ہوتا ہے۔ انگریزی کی بہت مشہور کہاوت ہے ”صحت مند جسم ہی صحت مند دماغ کا مالک ہوتا ہے“ اچھے دماغ کی برکتیں لاتعداد ہیں۔ جی ہاں اچھا دماغ اچھا پلانر ہوتا ہے۔ زندگی کا ہر شعبہ پلاننگ چاہتا ہے حصول تعلیم سے لے کر کیریئر میکنگ اور کیریئر میکنگ سے لے کر فیملی ویلفیر تک سب اس کے ذیل میں آتے ہیں۔ بات فیملی ویلفیر کی نکلی ہے تو اس پر غور کر لیا جائے کہ کنبہ کی بہبود سے کیا مراد لی جاتی ہے۔ جہاں تک کنبہ کا مسئلہ ہے یہ ایک باغیچہ ہے، خوشنما، خوشبودار پھولوں کا، اور جو لوگ شے لطیف کے مالک ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ خوشبو یا مہک تھوڑی ہی اچھی ہوتی ہے۔ تیز خوشبو سر درد کا باعث ہوتی ہے اور دوسرے پر بھی کچھ اچھا تاثر نہیں چھوڑتی۔ چنانچہ وہ خاندان جو محض چند افراد پر مشتمل ہوتے ہیں زیادہ مطمئن اور خوش ہوتے ہیں۔ اس عورت کی صحت بھلا کیسے درست رہ سکتی ہے جس کے ذمہ محض مشینی طور پر افزائش نسل کر دی گئی ہو۔ وہ بچے ذہنی و جسمانی طور پر کیسے صحت مند ہو سکتے ہیں جنہیں ان کی ضرورت کے مطابق توجہ تک نہ ملی ہو۔ وہ بچپن سے تنہائی کا شکار رہے ہوں۔ اس مرد کی صحت کیسے بحال رہ سکتی ہے جسے اپنے خاندان کو دو وقت کی روٹی مہیا کرنے کے لیے بیس گھنٹے کام کرنا پڑے۔ ایسا کنبہ جس میں کوئی ایک فرد بھی بیمار ہوتا ہے، ذہنی طور پر بے حد پریشان ہوتا ہے کہاں کہ گھر کا گھر بیمار ہو۔ یہ بیماری مختلف قسم کی ہو سکتی ہے۔ ذہنی مریض جسمانی مریض سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے، اس کی دوا کسی لیباریٹری میں تیار نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ نہ صرف اپنے گھر یا اپنی ذات کے لیے عذاب ہوتے ہیں بلکہ پورے سماج کو متاثر کرتے ہیں۔ غیر صحت مند انسان جہاں جاتا ہے وہیں پریشانی کھڑی کر دیتا ہے۔ کہیں اپنے غصے سے کہ اعصابی کمزوری ہے کہیں اپنی فکروں سے دوسروں کو بور کرتا ہے۔ نہ تو کام ہی ڈھنگ سے کر سکتا ہے اور نہ اس کی بات میں شگفتگی ہوتی ہے۔

اس کے برخلاف وہ شخص جو اپنے ماحول اور اپنے آپ سے مطمئن ہے اصل میں صحت مند ہے۔ اس کی شخصیت میں ایک عجیب سی کشش ہوتی ہے اس کی باتیں دل چسپ اور اس کی ہنسی زندگی سے بھرپور ہوتی ہے۔ وہ ایک متوازن زندگی بسر کرتا ہے۔ اپنی ذمہ داریوں سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برا ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے لیے مثال کا کام کرتا ہے۔ اس لیے زندہ سب ہیں مگر جینے کا ڈھب کسی کسی کو ہی آتا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تندرستی ہی اصل خوشحالی اور کامرانی ہے۔ صحت کی دولت سے مالا مال شخص اس امیر سے بدرجہا بہتر ہے جس کی دولت محض دواؤں میں خرچ ہو، یا جو ذہنی طور پر اتنا مفلوج ہو کہ اپنے بچوں اپنے خاندان اور اپنے متعلقین کے لیے بہتر طور پر زندگی گزارنے کا طریقہ نہ سوچ سکے۔ کسی کا قول ہے ,,حاصل وہ کرو جس سے سب آ جائیں۔،، لہذا صحت کا خیال رکھو، زندگی کی باقی چیزیں اس کے بعد خود ہی مل جائیں گی اور اگر کچھ نہ بھی ملیں تو بھی تندرستی کے سہارے گذر ہو جائے گی۔

(اردو سروس سے نشر)



مولانا محمد علی کا روزنامہ "ہمدرد" جو کہ کلکتہ اور بعد میں دہلی سے جاری تھا

جلال الدین اسلم

فن خطاطی ایک قدیم فن ہے

جس کی پذیرائی سرکاری سطح پر کی جانی چاہیے

فن خطاطی زمانۂ قدیم سے مختلف النوع انداز میں جاری وساری ہے اور اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آج یہ فن بعض ممالک میں مصورانہ خطاطی تک پہنچ گیا ہے۔

یہ فن اہل زبان اور اہل فن کے ذوق جمال کی ترجمانی اور تقاضۂ حیات کی تبلیغ کرتا ہے اور فن کار کے ہاتھوں ارتقاء پذیر اور فن کار کی تہذیب وشائستگی کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے نیز اپنے مواد کی ابدی سچائی اور تخلیقی توانائی سے فنکار پر ہر لحظہ امکانات کے نئے افق روشن کرتا ہے اور اس کے علم وفن میں تبدیج وسعت کی گنجائش بھی فراہم کرتا رہتا ہے۔ یہ خصوصیت اس فن کے علاوہ دیگر فنون میں نہیں پائی جاتی۔

بعض ادوار میں ہمارے ملک میں بھی یہ فن عروج پر رہا اور اہل فن نے مختلف طرز تحریر میں اپنے شاہکاروں کو دنیائے فنون کے سامنے بڑے معنی خیز اور دیدہ زیب انداز میں پیش کیا ہے اور ان ادوار میں ان لوگوں کو ان کی صلاحیت کے مطابق گاہے بگاہے ایوان بالا یا شاہی خزانوں سے پوری پوری حوصلہ افزائی بھی کی جاتی تھی اور اسی دور کی ملک کی ایک اہم اور عظیم شخصیت جناب منشی محمد الدین صاحب بھی ہیں، جو نہ صرف خطاطی کے حلقے میں بلکہ علمی وادبی حلقوں میں بھی معروف شخصیت کے حامل تھے انہوں نے ہی برصغیر ہند پاکستان میں خانہ کعبہ کے پردے کی تزئین کاری اور خطاطی کی پہلی سعادت بھی حاصل کی تھی۔ اور انہی موصوف کے صاحبزادے منشی محمد یوسف صاحب اور صاحبزادی فاطمہ الکبریٰ نے نہ صرف اپنی ہی اعلا پوزیشن حاصل کی بلکہ ملک وقوم کے وقار کو بھی بلند وبالا کر دیا تھا۔

آج ملک کے ہر گوشے میں جا بجا اکیڈمیاں اس فن کی ترقی و ترویج کے لیے کام انجام دے رہی ہیں لیکن اسے اطمینان بخش یا خاطر خواہ کامیابی اسی وقت کہی جا سکتی ہے جب حکومت، ان اکیڈمیوں کے فارغین اہل زبان اور اہل فن کے لیے سرکاری سطح پر مراعات یا دیگر سہولیات کے انتظامات کرے۔ سرکاری نیم سرکاری دفاتر میں اہل زبان وفن کی ملازمت نیز سرکاری اسکولوں میں اردو تعلیم کے ساتھ اس کے فن کی مشاقی کا بھی مناسب اور موثر انتظام ہونا چاہیے اکثر بہتر سہولت اور دیگر مراعات حاصل نہ ہونے کی صورت میں ذی علم اور صاحب فن بیش قدمی نے بجائے گوشہ گمنامی کی نذر ہو گئے اور کچھ نے تو بحالت مجبوری اس فن کو ہی ترک کر کے تلاش معاش کے حصول میں دوسرے شعبہ ہائے حیات وفنون میں داخل ہو گئے اور نتیجتاً ان کی تخلیقات اور قابل قدر شاہکار جو بیش بہا سرمایہ ہمارے ملک اور ہماری قوم کی وراثت ہوتا ہم آج اس تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے یکسر محروم ہو کر رہ گئے اور اب بھی اس پر توجہ نہ دی گئی تو آئندہ ہم سب کے لیے یہ ایک زبردست سانحہ ہوگا۔

فن خطاطی کا ارتقاء اور فروغ فنکار کی حوصلہ افزائی اور مناسب سرپرستی کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں ہے ہمارے ملک میں آرٹ کے مختلف شعبے اور فنون کی مختلف شاخوں میں آرٹ کے خوگر فنکاروں کی علمی وقلمی رہنمائی اور مالی اعانت وسرپرستی نہ صرف نجی طور پر بلکہ سرکاری سطح پر بھی کی جاتی ہے جو یقیناً ایک مستحق اقدام ہے۔ مگر انتہائی افسوسناک بات ہے کہ اب تک کسی خطاط یا فنکار کو کسی سرکاری ادارے یا سرکاری سطح پر وہ پذیرائی نہیں کی گئی جس کے وہ مستحق تھے یا ہیں۔

موجودہ دور میں اس کے متعلمین فن عموماً کاتب یا خوش نویس ہی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ہم نے بارہا اپنے مضامین میں کاتب، خوش نویس خطاط یا فن کار ہونے کی واضح تشریحات کی ہیں اور اکثر اس بات پر بھی زور دیا کہ اہل فن جو اساتذہ کے منصب پر فائز ہیں متعلمین فن کو چند طرز تحریر میں محدود نہ کریں بلکہ فنون کے ہر ہر دریچے سے ہمکنار کریں اور ان خطوط کو ہی زیادہ اہمیت و فضیلت دیں جو حال اور مستقبل میں ملک و قوم، زبان و فن اور خود اہل فن کے لیے علمی و فنی، اقتصادی و معاشی طور پر ممد ثابت ہو سکیں۔

آج کے ترقی یافتہ و تکنیکی دور میں ہر طرح کی سہولیات حاصل ہیں جو کہ بہت ہی معمولی جد و جہد سے اہل فن اپنے فن میں چار چاند لگا سکتے ہیں اور اپنے اقتصادی اور معاشی نیز ملک کی ثقافتی حالات کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ مثلاً کیمرہ مینی، پیسٹنگ، کمرشیل آرٹ وغیرہ جو کہ تقریباً اسی لائن سے ملتی جلتی لائنیں ہیں۔ استفادہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان لائنوں سے قریب تر ہونے کے لیے کمرشیل آرٹ ایک بہتر ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ یعنی اس کی ابتدائی مشاقی جیسے (نیس) اور لیٹرنگ (ہندی انگریزی) ایک خوش نویس کے لیے نہ صرف سہل اور آسان ہی ہوگی بلکہ اختراعی صلاحیت کے لیے ممد و معاون بھی بن سکتی ہے اور دیگر فنون کے حصول کے لیے رہنما بھی۔ آج کے حالات میں خوش نویس کے لیے جس طرح عربی خطوط کی مشاقی ضروری ہوتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اہمیت کے ساتھ ہندی اور انگریزی کی لیٹرنگ کی مشاقی لازمی قرار دینی چاہیے، تاکہ ذہین اور ذی علم طلباء کے لیے ترقی کی راہیں ہموار ہو سکیں۔

کسی بھی نئے تعمیری کام کے لیے وقتی طور پر کچھ دشواری ضرور ہوتی ہے۔ لیکن تھوڑی سی جد و جہد اور قربانیوں کے بعد ہمارے لیے آسان راہیں کھل سکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں محض اکیڈمیوں کے ذمہ دار اور متمول لوگوں کے دیگر سہارے کافی نہ ہوں گے بلکہ اہل فن حضرات کو بھی قربانیاں دینی پڑیں گی۔ جو دو ایک گھنٹے ہی سہی ملی و قومی خدمات کے لیے وقف کر سکیں۔

منشی محمد الدین صاحب کے صاحبزادے جناب منشی محمد یوسف صاحب اپنے دور میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ آپ نے فن خوشنویسی اور آرٹ کے لطیف امتزاج سے فن خطاطی کو ایک نئی راہ دی اور نئی دلی کی سکریٹریٹ انڈیا گیٹ و دیگر عمارات پر اردو کے ساتھ ساتھ بارہ تیرہ دیگر زبانوں میں خطاطی کے علاوہ تزئین کاری بھی کی ہے۔ بھائی یوسف کی طرح ان کی بہن فاطمہ الکبریٰ کو بھی قدرت نے اس فن شریف کی تمام خوبیوں سے مالا مال کر رکھا تھا۔ اگرچہ خوشنویسی کے فن میں خواتین کے باب میں اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء کا نام ہی لیا جاتا ہے مگر فاطمۃ الکبریٰ کو اس سلسلہ کی پہلی اور آخری کڑی کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھیں جو کلام پاک لکھنے کی سعادت حاصل تھی وہ کسی اور خاتون کے حصہ میں نہ آسکی۔

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ (۱۹۰۷ء) سورت (۱۹۱۸ء) کے انجمن حمایت الاسلام کے اجلاس میں مختلف اداروں نے متعدد نقری و طلائی تمغوں سے ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔

سنہ ۱۹۲۷ء میں نظام دکن نے تاعمر وظیفہ مقرر کیا۔ اسی طرح ہرہائی نس بیگم بھوپال نے ازراہ قدردانی اپنی جڑاؤ پہنچیاں ان کو مرحمت فرمائیں اور ساتھ ہی وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ اسی طرح ملک کے دیگر والیان ریاست نے بھی ازراہ عزت افزائی و قدردانی کی انعامات سے نوازا۔

فاطمۃ الکبریٰ کی طرح خواتین کی فہرست میں دوسرا نام خوش نویسان دلی کے مشہور خطاط جناب منشی ممتاز علی کی صاحبزادی رقیہ بیگم کا بھی ہے جو بہت ہی عمدہ خوش نویس تھیں اور عربی خطاطی میں ان کا بھی جواب نہ تھا۔ ان کے فن کے تمام ہمعصر اہل فن اور اہل زبان معترف تھے۔

اب آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیسویں صدی عیسوی میں ہمارا فن اور ہمارے فنکار کس حد تک کامیاب ہیں؟ آج ملک کی دیگر زبانوں کے پریس کو جو مقام حاصل ہے وہ اردو پریس کو قطعی حاصل نہیں جس کی اصل وجہ اہل فن کے حالات کی ابتری اور اردو پریس و ناشروں کی کی بے اعتنائی بھی ہے۔

جہاں تک ہمارا اندازہ ہے کہ اس کے اصل ذمہ دار وہ اخبارات و رسائل یا وہ ناشرین کتب ہیں جنہوں نے بعض اپنے کاروبار کی وجہ سے اس فن کی ترقی و توسیع کی طرف سے بالکل ہی اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اخبارات و رسائل کے مالکان اور ناشران کتب اس کی طرف توجہ فرمائیں اور زبان و فن کی بقا اور اس کی ارتقا کے لیے اہل فن اور اچھے خوش نویسوں کے ساتھ وہ تعاون کریں جس کی آج سخت ضرورت ہے۔

فیاض احمد فیاض دہلوی



ابتدائی تعلیم کا نظریہ

حصولِ آزادی کے بعد سے اب تک جو کوششیں ملک میں ابتدائی تعلیم کی اصلاح و فروغ کے لیے کی گئیں وہ کچھ زیادہ مفید اور تسلی بخش ثابت نہیں ہوئیں۔ اس کے اسباب و وجوہ خواہ کچھ بھی رہے ہوں اس سے ہمیں بحث نہیں۔ باقی اس حقیقت سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی کے تصور کے مطابق ہماری ابتدائی تعلیم کا ڈھانچہ آج تک مرتب نہ ہو سکا۔ وہ ابتدائی تعلیم کا ایک بہت وسیع ہمہ گیر اور ایسا صاف ستھرا ڈھانچہ چاہتے تھے جس میں بچہ ڈھیر سی کتابوں کو رٹنے والے طالب علم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک آزاد جمہوری، سیکولر ملک کے مستقبل کے ذمہ دار وسیع النظر شہری کی حیثیت سے تعلیم حاصل کر سکے۔

دراصل مدرسہ ایک ایسی بنیادی درسگاہ ہے جس کا مقصد بچے کو صرف پڑھنا لکھنا سکھا دینا ہی نہیں بلکہ اس کی شخصیت کے تمام گوشوں اور پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی جسمانی، ذہنی سماجی اور اخلاقی تربیت کا کام بھی بحسن و خوبی انجام دینا ہے۔ اور اسے اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنی عمر کو نہ صرف بحیثیت ایک فرد کے بہتر اور خوب تر بنا سکے بلکہ خود کو ایک جمہوری سیکولر سماج میں کامیاب رہنے کے لیے مکمل طور سے تیار بھی کر سکے۔ اور اس میں وہ صفات و اوصاف بھی پیدا ہوں جو ایک اچھے طالب علم، ایک اچھے انسان، ایک اچھے شہری اور ایک اچھے رضا کار محب ملک و قوم کے لیے ضروری ہیں۔

حصولِ آزادی کے بعد ہمارے ملک میں ابتدائی تعلیم کے نصاب میں کچھ ضروری اور کچھ غیر ضروری ترمیمیں اور اضافے تو ہوتے رہے اور ان ترمیموں اور اضافوں کے پیچھے مختلف ذہن اور نظریات کارفرما رہے۔ یہاں سب سے زیادہ اہم اور قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ ان ترمیموں اور اضافوں میں بچے کی صحیح اور صاف ذہنی نشوونما اور اخلاقی بنیادوں کو قریب قریب نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ نصاب میں اس قدر پھیلاؤ اور زیادتی ہوئی کہ آج عام طور پر دیکھنے میں آ رہا ہے کہ جتنا وزن ابتدائی تعلیم کے ایک بچے (طالب علم) کا نہیں ہوتا اس سے کہیں زیادہ وزنی اس کا بستہ ہوتا ہے جسے وہ بمشکل اپنے کاندھے یا پٹی دار بستہ کے ساتھ سر میں یا پیٹھ پر ایک بوجھ ڈھونے والے مزدور کی طرح لاد کر گھر سے اسکول لے جاتا ہے اور لاتا ہے۔ اس طرح ایک ابتدائی طالب علم کی ذہنی و دماغی تازگی و توانائی میں سخت خلل اور کمزوری واقع ہوتی ہے۔ پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ حصولِ آزادی کے بعد حالات کے ساتھ ساتھ ہمارے ساتھ بیشتر اساتذہ نے بھی اپنے فرائض کو بالائے طاق رکھ کر اپنے پیشہ کا بنیادی مقصد صرف زر کشی بنا لیا۔ درجہ میں یا ٹیچرز روم میں بیٹھ کر خوش گپیوں میں اسکول کے اوقات کی خانہ پری ان کا شعار بن کر رہ گیا کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کریں اور اسکول کے اوقات میں فرض شناسی سے کام لے کر لگن اور ذمہ داری کے ساتھ بچوں کو ابتدائی تعلیم دیں تو پھر انھیں ٹیوشن پڑھانے کے ذرائع آمدنی کیسے دستیاب ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بچے درجہ میں شور کریں، کھیلیں یا لڑیں بھڑیں ٹیچر کو کوئی پرواہ نہیں ہوتی ظاہر ہے کہ اس غیر ذمہ دارانہ اور فرض ناشناس طرزِ عمل سے ایک درسگاہ کے بنیادی نظام اور مبتدی طالب علم کی ابتدائی بنیادی تعلیم کا حقیقی مقصد ہی یکسر فوت ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ ہر بچے کے اندر فطری طور پر وہ تمام امکانات موجود ہوتے ہیں جو بچہ کو جسمانی، ذہنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی دلچسپیوں، نفسیاتی کیفیتوں اور اس کی شخصیت کے سماجی

واخلاقی پہلوؤں اور قدروں کو اپنے اندر سمو سکیں۔ اس لیے ہمارے خیال میں سب سے ضروری اور اہم بات یہ بھی ہے کہ ہمارے مدرسین و اساتذہ کا بنیادی مقصد آزاد اور سیکولر ہندستان کے لیے ایسے شہری تیار کرنا ہونا چاہیے جو تہذیبی، ثقافتی، علمی و ادبی ہر لحاظ سے صحیح معنوں میں ہندستانی کہلانے جانے کے مستحق ہو سکیں۔ خواہ وہ کسی مذہب و فرقہ اور ذات و نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔

یہ بھی بہت ضروری ہے کہ ہمارا ابتدائی تعلیمی نصاب مختصر اور ایسا ہو جس سے طلبا کو ذہنی طور پر الجھن اور اکتاہٹ نہ ہو اور وہ اسے اپنے لیے ایک بوجھ محسوس نہ کریں۔ نصاب ایسا ہونا چاہیے جس سے طلبا کے ذہنوں میں ابتدا سے ہی اپنے گرد و پیش کی زندگی کو کسی نہ کسی حد تک سمجھنے کی صلاحیت و شوق اور جذبہ پیدا ہو اور متعلقہ مسائل کا کچھ نہ کچھ علم ہوتا رہے۔ نیز ان کے اندر سماجی و انفرادی دونوں نکتۂ نگاہ سے ایک خاص دلچسپی اور شوق پیدا ہو اور وہ ہماری ثقافتی درآثت کی اہمیت کو سمجھنے لگیں اور ان کے اندر شعور بتدریج پیدا ہوتا رہے۔ طلبا میں پڑھنے لکھنے کی معقول صلاحیت اور اس کے ذریعہ مزید اکتساب علم کا جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اساتذہ کو نہایت دلچسپی، محبت، لگن اور فرض شناسی سے اپنی خدمات انجام دینی چاہئیں ان کا نظریہ صرف ملازمت اور پیسہ کمانا ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس جذبہ کے ساتھ اپنے فرض کی بھرپور ادائیگی کرنا چاہیے کہ وہ ملک و قوم کے مستقبل کے معمار تیار کر رہے ہیں۔ انسپکٹران آف اسکولز کو خاص طور پر ایسی ہدایات ہونی چاہئیں کہ وہ اپنے اپنے حلقہ اور علاقہ کے اسکولوں میں آئے دن بغیر کسی اطلاع کے نہایت رازداری سے خفیہ معائنے کرتے رہیں تاکہ اساتذہ میں فرض شناسی کا جذبہ مستحکم ہو اور طلبا کے صحیح معیارِ تعلیم اور ٹیچر کی کارگزاریوں سے بھی محکمۂ تعلیم کے اعلا سربراہ واقف رہیں۔

غرض کہ ہماری رائے میں ان تمام نیک مقاصد کی تکمیل کے لیے ایسی چھوٹی چھوٹی لیکن مفید ترین ضروری تبدیلیاں جلد از جلد ضرور بروئے کار لائی جانی چاہئیں تاکہ لازمی اور ابتدائی تعلیم کے پروگرام کو حقیقی معنوں میں ملک و قوم کے مستقبل کے لیے مفید و کامیاب بنایا جا سکے۔ اگر ماہرینِ تعلیم اور متعلقہ اعلا اربابِ اقتدار نے ان چھوٹی چھوٹی اصلاحی و تعمیری امور پر مبنی باتوں پر دھیان دیا اور اس سلسلے میں ٹھوس اقدامات کیے تو یقیناً یہ ایک بہت بڑا اور نیک کام ہوگا۔

(ہفت روزہ ... دہلی ... ۱۹۰۲)

●●●●●●●●●●●●●●●●●●

جمیل نقوی

اردو کا تاریخی ارتقاء

سیسہ کے حروف سے الیکٹرونک خطاطی تک

خط نستعلیق جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے ہماری قومی زبان اردو کا پیدائشی رسم الخط ہے اور گزشتہ سات سو سال سے ایک مسلمہ رسم الخط کی حیثیت سے رائج ہے اردو اور نستعلیق کا چولی دامن کا ساتھ ہے اردو زبان کی طرح نستعلیق بھی ہمارا ایک ثقافتی ورثہ ہے خط نستعلیق ایک مکمل کتابی خط اور ایک قسم کی دیدہ زیب مختصر نویسی ہے اور ساتھ ہی ان تمام رسم الخطوط کا نچوڑ بھی ہے جو گزشتہ چودہ صدیوں کے دوران بالخصوص مشرق وسطیٰ میں اختراع کئے گئے۔

اس رسم الخط کی تاریخ چھٹی صدی عیسوی کے وسط سے شروع ہوتی ہے جب بصرہ اور کوفہ میں حیری رسم الخط ایجاد ہوا اور بعد میں کوفی کے نام سے مشہور ہوا۔ قبل اسلام عرب میں لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ قرآن کریم کی کتابت کا آغاز بھی خط کوفی ہی میں ہوا اور دوسری تحریروں کیلئے بھی یہی خط استعمال ہوتا رہا حتیٰ کہ ۱۳۱۰۵/۵ھ میں خلیفہ مقتدر باللہ کے وزیر ابن مقلہ نے خط کوفی کی ہیئت و ترکیب میں اصلاح کر کے بالخصوص قرآن مجید کی کتابت کیلئے ایک نیا رسم الخط ایجاد کیا جو خط نسخ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ نو ایجاد خط آسان ہونے کی وجہ سے بہت جلد مقبول ہو گیا اور قرآن مجید کی کتابت کے ساتھ ساتھ بعد میں دوسری تحریروں کیلئے بھی عربی رسم الخط کے طور پر دنیا بھر میں رائج ہو گیا۔

اسی ابن مقلہ نے دوسرے رائج الوقت رسم الخطوط کو سامنے رکھ کر پانچ خط اور ایجاد کئے یعنی (۱) خط محقق (۲) خط ریحان (۳) خط ثلث ریحانی (۴) خط رقاع اور (۵) خط توقیع یہ تمام رسم الخطوط مختلف قسم کی تحریروں کیلئے مستعمل ہونے لگے۔ ۳۲۲ھ/۹۴۴ء میں ابن مقلہ کے خط رقاع اور خط توقیع کی آمیزش سے عمادالدین دیلمی کے کاتب حسن فارسی نے ایک نیا خط ایجاد کیا جس کا نام تعلیق رکھا۔ تعلیق کے معنی لٹکے ہونے کے ہیں جو عام طور سے مراسلات کیلئے استعمال ہوتا تھا اور اسی لئے اسے خط ترسیل بھی کہا جانے لگا۔

آٹھویں صدی ہجری تک ایران، عراق، وسطی ایشیا اور برصغیر میں جن بادشاہوں کے عہد میں اردو زبان میں کتابوں کی تصنیف کا آغاز ہوا جو کتابیں اس وقت کے رائج رسم الخط تعلیق ہی میں لکھی گئیں۔

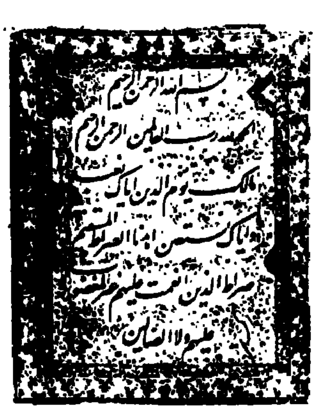
لیکن اسی زمانے میں مرزا امیر تیمور، میر علی تبریزی نے فارسی زبان کی ضروریات کے پیش نظر خط نسخ اور تعلیق کو ملا کر ایک الگ خط ایجاد کیا اور اس کا نام نستعلیق رکھا اس کے قواعد و ضوابط بھی مرتب کئے اس کے شاگردوں نے اسے ایک جاذب نظر کتابی خط بنا دیا۔

شہنشاہ شہاب الدین کے دور حکومت میں ایران اور مشرقی ممالک میں امام فن نستعلیق میر عماد الحسینی قزوینی کا طوطی بول رہا تھا بعض غلط فہمیوں کی بناء پر عباس صفوی کے اشارہ پر میر عماد کو اصفہان میں قتل کر دیا گیا ان کے بھانجے اور شاگرد آقا عبدالرشید دیلمی تخلیقی میر عماد کے واقعہ قتل سے خوفزدہ ہو کر ایران سے فرار ہو کر لاہور پہنچے



پھر آگرہ پہنچ کر شاہجہاں کے دربار سے منسلک ہو گئے اور شہنشاہ کے حکم سے خط نستعلیق کی تعلیم کا آغاز کیا بہت کم عرصہ میں آقا کے شاگردوں کا حلقہ وسیع ہو گیا اور یہ برصغیر میں پھیل گئے۔

سترھویں صدی عیسوی کے دور آخر تک برصغیر پاک و ہند میں خط نستعلیق کو قبول عام حاصل ہو گیا اور نستعلیق نویسی کو مغلیہ تہذیب کا جزو لازم تصور کیا جانے لگا۔ نستعلیق نویسی کے اس ہمہ گیر شوق نے بہت کم عرصہ میں علوم و فنون کی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم کر دیا اور اٹھارھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے اردو زبان کی لاتعداد کتابیں تصنیف و تالیف ہو کر سارے برصغیر میں پھیل گئیں ابتدائی تصنیف شدہ کتابوں کا موضوع ادب اور تصوف تھا۔ لیکن مابعد زمانہ میں مذہب تاریخ منطق فلسفہ طب نجوم اور دوسرے علوم و فنون پر اردو تصانیف کا سلسلہ چل نکلا۔ شاہجہاں کے زمانے سے آخری تاجدار مغلیہ ابوظفر بہادر شاہ تک خط نستعلیق کے لاتعداد اساتذۂ فن پیدا ہوئے جن میں بادشاہوں اور امراء سے لیکر برصغیر



کے عام شہری تک شامل ہیں۔ بہرحال گزشتہ سات صدیوں کے دوران ہماری قومی زبان اردو کی شستگی اور شائستگی کے ساتھ ساتھ اس کے رسم الخط میں بھی آہستہ آہستہ جاذبیت پیدا ہوتی چلی گئی۔ بدلتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر فارسی نستعلیق میں کچھ تبدیلیاں بھی رونما ہوتی رہیں اور سترھویں صدی کے آخر میں اردو نستعلیق اور فارسی نستعلیق میں ایک نمایاں فرق پیدا ہو گیا۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز میں ہی خط نستعلیق کو ایک مکمل اردو رسم الخط کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کی کششوں میں ربط، توازن اور دائروں میں جان، سبک پن اور تناسب پیدا ہوتے چلے گئے جو کسی بھی رسم الخط کی خوبصورتی اور حسن کیلئے لازمی ہیں۔

خط نستعلیق رفتہ رفتہ خطاطی کی حدود سے نکل کر نقاشی کی قلمرو میں داخل ہو گیا۔ حرفوں کی نوک پلک میں نزاکت پیدا ہوتی چلی گئی۔ ایک ایک حرف نقاشی کی خوبصورتی مصوری کی نزاکت اور ایسا بانکپن اور توازن پیدا ہو گیا کہ ہر لفظ بجائے خود ایک تصویر ہو گیا۔ اپنے حسن، دیدہ زیبی اور دلکشی کی بنا پر خط نستعلیق کو حسن الخطوط اور عروس الخطوط کہا جانے لگا۔ تقریباً پچھلی چار صدیوں سے بڑے بڑے اساتذۂ فن خطاطی اس عروس الخطوط کے حسن و جمال کو برقرار رکھنے کیلئے مدت العمر ریاض کرتے رہے۔ اس زمانے میں جب مایہ ناز خطاطوں کا سلسلہ سمٹ کر چند نقوش کی شکل میں باقی رہ گیا تھا انیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں لیتھوگرافی کی ایجاد اور مقبولیت کے بعد خطاطی نے فن لطیف کی صف سے نکل کر تجارتی فن کی حیثیت اختیار کر لی۔ خوشنویسی و خطاطی کی جگہ لی۔ معاشی ضروریات نے ماہر فن خطاطوں کو کاپی نویس بننے پر مجبور کر دیا۔ جہاں حالات کے دباؤ کے زیر اثر ایک نشست میں کم سے کم وقت میں طویل عبارتیں لکھنی پڑیں۔ اس زود نویسی نے خطاطوں

کاپی نویسوں کو معاشی خوشحالی سے تو ہمکنار کر دیا لیکن نستعلیق فن کی بحیثیت فن زوال پذیر ہو گئی اور ماہر فن خطاط ناپید ہونا شروع ہو گئے۔

لیکن لیتھوگرافی کے فروغ سے قبل شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں اس برصغیر کے مختلف صوبوں پر انگریزوں اور دوسری یورپی قوموں کے تسلط کے فوراً بعد برصغیر کی مختلف زبانوں کا ٹائپ بنانے کی کوشش کا آغاز ہو چکا تھا۔

سب سے پہلے انگریزوں نے ۱۷۷۸ء میں اردو زبان کا ابتدائی ٹائپ بنانے کی کوشش کی۔ کوشش یہی تھی کہ اردو دان طبقے کے مزاج کے مطابق اردو کا ٹائپ خط نستعلیق ہی میں ہو۔ ۱۸۰۰ء میں جب کلکتہ فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو اس کیلئے نصاب کی کتابیں چھاپنے کیلئے ایک مطبع بھی قائم کیا گیا اور کوشش کر کے بہتر سے بہتر اردو ٹائپ بنانے کی کوشش کی گئی۔ فورٹ ولیم کالج کے مطبع کیلئے جو ٹائپ بنایا گیا وہ نستعلیق سے قریب تر تھا۔ اس مطبع میں مختلف موضوعات کی تقریباً بیس اردو کتابیں طبع ہوئیں۔

انیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے اختتام پر جب فورٹ ولیم کالج چند وجوہات کی بنا پر بند ہوا تو یہ سلسلہ طباعت بھی بند ہو گیا اور اردو ٹائپ میں کتابیں چھاپنے کی یہ پہلی اور بڑی حد تک کامیاب کوشش ختم ہو گئی۔

تقریباً ۱۸۳۰ء میں والی اودھ نواب وصی الدین حیدر نے ایک انگریز کی نگرانی میں بمقام فیض آباد ٹائپ کا ایک مطبع قائم کیا جہاں سے ایک فارسی لغت ہفت قلزم کئی جلدوں میں ٹائپ میں چھپی لیکن یہ ضخیم ٹائپ نستعلیق سے بہت دور اور نسخ سے بہت قریب تھا لیکن یہ کتاب نستعلیق رسم الخط میں نہ ہونے کی وجہ سے عوام میں قبولیت حاصل نہ کر سکی۔ ایک دو کتابیں اور چھپیں اور آخر یہ مطبع بند کر دیا گیا۔ اردو فارسی کتابوں کیلئے ٹائپ کو مقبول بنانے کی یہ دوسری کوشش بھی ادھوری رہ گئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ٹائپ کے چھاپے کو مقبول بنانے کی تیسری کوشش سرسید احمد خان نے کی اور غازی پور میں ایک ٹائپ کا مطبع اپنی تصانیف چھاپنے کیلئے قائم کیا۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے بطور خاص ایک ٹائپ بنوایا لیکن یہ ٹائپ بھی نسخ کی ہی ایک شکل تھا۔ تقریباً ۲۰ سال تک سرسید کی تصانیف رسالے اور اخبار اس ٹائپ میں طبع ہوتے رہے لیکن لیتھو کی موجودگی اور نستعلیق میں یکسانی کی وجہ سے ٹائپ میں مطبوعہ کتابوں کو مقبولیت حاصل نہ ہو سکی اور تیسری کوشش بھی اردو کیلئے ٹائپ کو مقبول بنانے کے سلسلہ میں ناکام ہو گئی۔

اس کے بعد برصغیر کی مشہور ریاست حیدرآباد دکن کی حکومت کی سرپرستی میں اردو نستعلیق ٹائپ بنانے کی ایک بار پھر کوشش کی گئی۔ غالباً ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے نستعلیق ٹائپ بنوایا اور نمونے کے طور پر ایک مختصر کتاب "داستان لاکھینکی" اس نو ایجاد ٹائپ میں چھاپی۔ لیکن مولوی صاحب کا یہ نستعلیق ٹائپ بھی فورٹ ولیم کالج کے اردو ٹائپ کی طرح خط نستعلیق کے روائتی معیار سے بہت دور نظر آیا لہٰذا مولوی صاحب نے بھی یہ بھاری پتھر چوم کر زمین پر رکھ دیا۔

قیام پاکستان کے بعد ۴۷۔۱۹۴۸ء میں اردو خواں طبقہ میں ٹائپ کی چھپائی کو مقبول بنانے کیلئے "ڈان اردو" کا اجرا ہوا جو تقریباً نسخ ٹائپ میں چھپتا تھا۔ چند سال بعد نامقبول ہونے کی وجہ سے بند کر دیا گیا۔

بعض اخباروں نے بھی چند سال قبل اردو داں طبقہ کو روزمرہ ٹائپ میں چھپی ہوئی تحریر کا عادی بنانے اور اردو کیلئے نسخ ٹائپ کو رائج کرنے کی کوشش کے طور پر چند کالم ٹائپ میں چھاپ کر کافی عرصہ تک شائع کئے لیکن خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلنے کی وجہ سے آخر یہ سلسلہ ترک کر دیا۔ اردو چھپائی کے سلسلہ میں ٹائپ کو رواج دینے کی جس قدر کوششیں کی گئیں انہیں عوام کی سرپرستی حاصل نہ ہو سکی اور اردو خواندہ طبقہ کو ہمیشہ یہ اصرار رہا کہ اردو کو صرف خط نستعلیق ہی میں لکھا جائے خواہ وہ کاپی نویسی کے ذریعے ہو یا ٹائپ میں ہو۔ اس لئے کہ عوام کا جمالیاتی ذوق اردو کے رسم الخط کا عادی ہے اور صدیوں سے ذہنوں میں اس قدر رچا بسا ہے کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے رسم الخط کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ علاوہ ازیں ان کا کہنا ہے کہ ہر زبان کے ساتھ اس کے



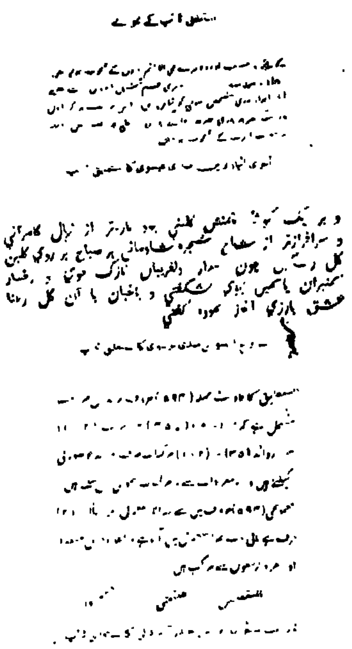
رسم الخط کو بھی ایک فطری لگاؤ ہوتا ہے وہ منقطع ہو جائے تو زبان اپنی فطری حالت پر مشکل ہی سے قائم رہ سکتی ہے۔

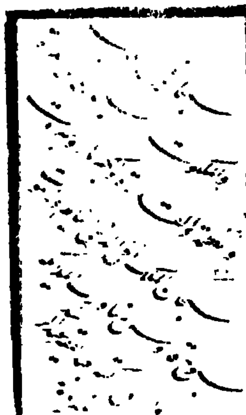
بہرحال مشین کے ذریعہ اردو نستعلیق خطاطی کا مسئلہ تقریباً ایک صدی سے ماہرین طباعت کیلئے دردِ سر بنا رہا ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ دوسری بیشتر زبانوں کے مقابلہ میں اُردو میں ایک ایک حرف کے کئی جوڑ ہوتے ہیں جن کی شکلیں ایک دوسرے سے نہیں ملتیں۔ اس کے علاوہ ان کی نشستیں بھی بہت زیادہ ہوتی ہیں یعنی یہ کہ مختلف الفاظ میں ایک ہی حرف کا جوڑ اور اس کی نشست یکساں نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ سے اردو زبان کے حروفِ تہجی اور ان کی تمام شکلوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ چھپائی کی وہ تمام مشینیں جو انگریزی اور ملتی جلتی دوسری زبانوں کیلئے بنائی گئی ہیں نستعلیق نویسی کیلئے بالکل موزوں نہیں۔ اس کے علاوہ سیسے کے حروف ڈھالنے میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ ان کے درمیان ایک طے شدہ مساوی فاصلہ ہونا ضروری ہے اور الفاظ کے جوڑ ایک دوسرے میں پیوست نہیں کئے جا سکتے ہیں جو قاری کی آنکھوں کو ناگوار محسوس ہوتے ہیں۔ اس فنی خرابی کی وجہ سے ہاتھ سے لکھی ہوئی اردو تحریر کو ہمیشہ ترجیح دی جاتی رہی ہے۔

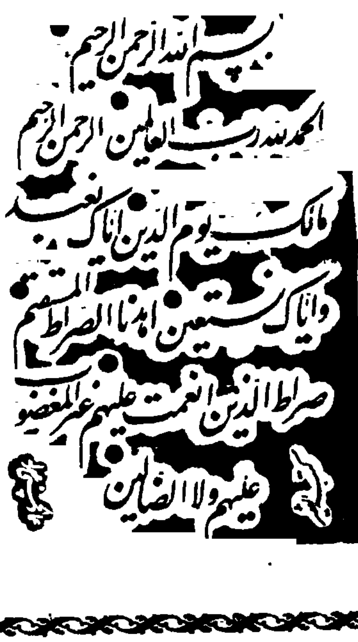
کم و بیش گزشتہ پچاس سال میں چھپائی کے آفسٹ طریقہ کے فروغ کی وجہ سے اردو نستعلیق ٹائپ ڈھالنے کی کوششوں کی رفتار بے حد دھیمی ہو گئی اور ہاتھ کی کتابت کو فوٹو آفسٹ میں چھپائی میں استعمال کیا جانے لگا لیکن خود کتابت کی رفتار اتنی سست ہے کہ آفسٹ پرنٹنگ کی افادیت گھٹ جاتی ہے۔

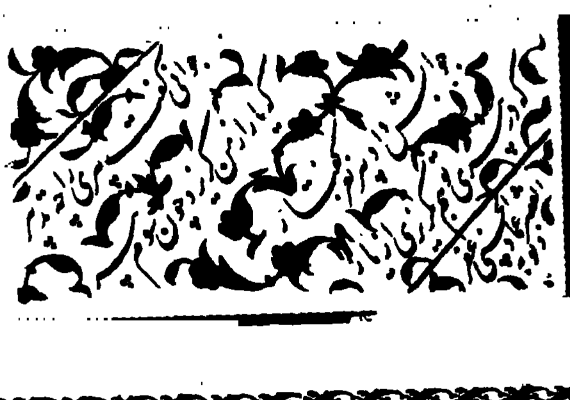
آفسٹ طریقہ طباعت میں جب مزید ترقی ہوئی تو فوٹو کے ذریعہ ٹائپ جوڑنے کا طریقہ رائج ہوا چنانچہ جوڑ ملانے کی مشکل تو حل ہو گئی لیکن نشستوں کی مشکلات بدستور باقی رہیں اور سانچوں کی کثیر تعداد کا کوئی حل نہ مل سکا۔

مگر اب امیکرو کمپیوٹر طریق کار کے طباعت کے میدان میں داخل ہونے کی وجہ سے حالات بہتر ہو گئے تو جناب احمد مرزا جمیل اور مطلوب الحسن سید نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کیلئے غور کرنا شروع کیا ابھی وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچے تھے کہ لیزر شعاعوں کا استعمال عام ہو گیا جس کی مدد سے حروف و الفاظ کے عکس اتارنے کے بجائے پوری عبارت کی نہایت سرعت کے ساتھ تصویر اتاری جا سکتی ہے اور سطریں بھی مرتب کی جا سکتی ہیں۔ ان دونوں حضرات نے محسوس کیا کہ اس طریق کار کو کام میں لا کر اردو زبان کی عبارتوں کی نستعلیق رسم الخط میں خطاطی کی جا سکتی ہے اور ان دونوں نوجوانوں نے نوری نستعلیق کے نام سے اردو زبان کے روایتی خط نستعلیق میں امیکرو کمپیوٹر خطاطی کی ایجاد مکمل کر لی اور اردو زبان کے اس خواب کو جیتی جاگتی حقیقت بنا دیا۔ یہ ایک عہد آفرین ایجاد ہے کہ احمد مرزا جمیل اور مطلوب الحسن سید کے احسان عظیم کو اردو زبان کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔









برطانیہ میں اردو مخطوطات

(سلیم الدین قریشی)

برصغیر ہند و پاک پر برطانوی تسلط کے اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی نتائج جس قدر بھی مفید یا مضر ثابت ہوئے ہوں ہمیں اس سے بحث نہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دور میں مادی مال و دولت کے علاوہ جو دوسری بڑی دولت برطانیہ میں منتقل کی گئی وہ برصغیر کے علمی خزائن تھے۔ آج اگر ہمیں سلاطین دہلی کے علمی خزانے شاہان اودھ کے نادر کتب خانے ٹیپو سلطان کے بیش بہا ذخیرہ کتب اور ہندوستان کے متعدد علم دوست رؤسا، امرا اور اصحاب علم کے ذاتی کتب خانوں سے وابستہ کسی کتاب کو دیکھنا مقصود ہو تو یورپ اور خاص کر برطانیہ کے کتب خانوں کا رخ کرنا پڑتا ہے۔

یہ وہی کتابیں ہیں جنہیں یہاں دیکھ کر علامہ اقبال نے فرمایا تھا:۔

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

یہ مخطوطات کب اور کیسے یہاں پہنچے؟ یہ ایک لمبی داستان ہے۔ مختصراً صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ سلسلہ اٹھارہویں صدی سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا لیکن اس وقت تک یہ عیسائی تبلیغی جماعتوں کے کچھ افراد، فوج کے کچھ اعلیٰ افسران اور چند دوسرے اشخاص جنہیں مشرقی زبانوں سے دلچسپی تھی محدود تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو سب سے پہلے جو بڑا علمی خزانہ ہندوستان میں ملا وہ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کا شاہی کتب خانہ تھا۔ اس کتب خانے کے تقریباً دو ہزار مخطوطات اور دستاویزات کا ایک بہت بڑا مجموعہ برطانوی فوج کے ہاتھ لگا۔ ان میں سے تقریباً دو ہزار مخطوطات اور کچھ اہم دستاویزات کی ایک فہرست ۱۸۰۵ء میں چارلس سٹورٹ نے مرتب کر کے کیمبرج سے شائع کی۔

ان مخطوطات اور دستاویزات کا ایک بڑا حصہ جس میں ٹیپو سلطان کے خود اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخے شامل ہیں اب انڈیا آفس لائبریری اینڈ ریکارڈز میں موجود ہے۔ سلاطین دہلی کے کتب خانوں کا انتشار بھی اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا۔ انڈیا آفس ریکارڈز میں LEIGH AND SOTHEBY کا ایک اشتہار موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ عالم کے کتب خانے کا ایک بہت بڑا حصہ ۱۸۱۱ء میں کلکتہ میں نیلام کیا گیا: اشتہار کی عبارت حسب ذیل ہے:۔

"A catalogue of the Library of the late William Platel Esq of Peterborough: also his entire and interesting collection of manuscripts, in the Persia, Arabic, Hindustani, Hindwi, Bengali, Tamul, Malabaric, Telingi, and Armenian languages, for the most part perfect and in finee condition, having formed part of the Library of the late Mogul [illegible] Shah Aulum which will be sold by auction, by Leigh and Sotheby.... on Thursday, December 13, 1950 and eight following days, at 12 O'clock (Sunday excepted".

اس فہرست کا صرف سرورق دستیاب ہے لیکن نیلامی کے متواتر ۹ دن جاری رہنے سے نیلام کئے گئے مخطوطات کی تعداد کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ۱۸۱۲ء میں ۲ جولائی سے ۷ جولائی تک اسی ادارہ نے Dr. B. Lomuel and Guise کے ذخیرہ کتب کو نیلام کیا۔ اس میں بھی شاہان مغلیہ اور ہندوستان کے دوسرے کتب خانوں سے حاصل کئے ہوئے مخطوطات شامل تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی شمع بجھنے کے بعد شاہان مغلیہ کے کتب خانے کا ذکر [illegible] نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے سلطنت برطانیہ کے ہاتھ آ گئے۔

"Foure and twenty thousand manuscripts, so richly bound that they were valued at six millions four hundred sixty three thousand, seven hundred thirty one Rupias, that is three millions, two hundred thirty one thousand, eight hundred sixty five crowns and a half."

ان مخطوطات کا کچھ حصہ جنگ کے دوران تباہ و برباد ہو گیا۔ مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے اپنی کتاب تاریخ عروج عہد سلطنت انگلیشیہ (صفحہ ۶۹۶) میں اس بربادی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"بارہ بجے کالج (دہلی کالج) کے

کتب خانہ لٹنے شروع ہوتے۔ بیشمار عربی، فارسی، اردو وغیرہ کی کتابوں کے گٹھر باندھ کر کتب فروشوں، کو نجڑوں اور طالب علموں کے پاس بیچنے کے لئے لے گئے۔ بعض طلباء بھی کتابوں کے شوقین خود شریک ہو کر اچھی اچھی کتابیں لے گئے۔ لوگوں نے کتابوں کے اچھے اچھے پٹھے اتار لیے کہ جلد سازوں کے ہاتھ بکیں گے باقی کو پھاڑ کر پھینک دیا اور احاطہ میں کئی انچ موٹا فرش ردی کا بچھا دیا۔ غرض کالج میں سوائے ردی کے ——— ڈھیر کے کچھ نہ تھا۔"

جو کتابیں برطانوی فوج کے ہاتھ لگیں ان میں سے بعض تو نیلامی کے ذریعے فروخت کر دی گئیں اور ان کا کچھ حصہ انڈیا آفس لائبریری میں منتقل کر دیا گیا جہاں وہ دہلی کلکشن کے نام سے موسوم ہے۔

ان مخطوطات کی نیلامی کا سلسلہ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۷ء تک جاری رہا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی پر قابض ہونے کے بعد پرائز ایجنٹ یعنی مال غنیمت کے PRIZE AGENT محکمے کو احکام جاری کئے کہ وہ تمام مخطوطات جو دہلی اور دوسری جگہوں سے حاصل کیے گئے ہیں ان کو نیلامی کے ذریعے فروخت کر دیا جائے ———

انڈیا آفس ریکارڈز میں گورنر جنرل کے سیکریٹری G.F. EDMONSTONE کا ۲۸ اگست ۱۸۵۸ء کا لکھا ہوا ایک خط جو انہوں نے کیپٹن W.N. LEES کو لکھا تھا محفوظ ہے جس میں انہیں ہدایت کی گئی ہے کہ وہ پرائز ایجنٹس کی یکم ستمبر ۱۸۵۸ء کو منعقد ہونے والی نیلامی کو پہلی اکتوبر تک ملتوی کرا دیں تاکہ نیلام کیے جانے والے مخطوطات میں سے تقریباً ۲۰۰۰ مخطوطات جو نایاب اور زیادہ قیمتی ہیں حکومت برطانیہ کے لئے چن لئے جائیں۔ خط کے کچھ حصے کی عبارت حسب ذیل ہے۔

From: G.F. Edmonstore, Esquire...
to Captain W.N.Lees, Secretary to the Board of Examinees, no 309, dated : Allahabad, the 28th August 1858.

"In reply to enqutres made by the desire of the Right Hon'able the Governor General, Mr. Sundurs, the Commissioner of Delhi, reports that among the oriental books which have been advertised by the Prize Agents for sale on the 1st eproximo, about two thousand are reputed to be rare and valuable manuscripts.

The Governor General being anxious to purchase for the Government of India such of the Manuscripts in question as may prove to be of real value, has caused a request to be conveyed to the Prize agent for the postponement of the sale until the 1st of October, in order that the collection may be examined, and a selection made of those which it may be desireable to secure--"

بعد میں حکومت ہند نے نیلام کئے جانے والے یہ تمام مخطوطات پرائز ایجنٹس سے ——— ۵۰۰۰ ۱۴۴۶۳ R میں خرید لیے تھے۔ ان میں سے تقریباً ایک سو مخطوطات بارش کی وجہ سے تباہ ہو گئے اور تقریباً ڈھائی سو کو کافی نقصان پہنچا۔ باقی ماندہ مخطوطات کو ۱۳ بکسوں میں بند کر کے کلکتہ روانہ کر دیا گیا جن میں سے نایاب اور قیمتی نسخے چن کر حکومت برطانیہ کے لئے رکھ لیے گئے اور باقی کو نیلامی کے ذریعے فروخت کر دیا گیا۔

فروری اور مارچ ۱۸۶۷ء کے گزٹ آف انڈیا میں ان مخطوطات کے نیلامی کے اشتہارات ملتے ہیں۔

مثلاً ۴ فروری ۱۸۶۷ء کے گزٹ آف انڈیا میں مندرجہ ذیل اشتہار شامل ہے۔

"Notice is hereby given that the valuable manuscripts purchased by Government of India after the fall of Delhi, consisting of rare works in Arabic, Persian and Urdu on various subjects will under instructions from Government be sold unreservedly to the highest bidders by Mackenzie Lyall and Company at the Madrisa College, Calcutta, on Monday 25 February 1867."

اس نیلامی میں ہر ایک مخطوطہ کی جو قیمت لگی اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ ۴ مارچ ۱۸۶۷ء کو نیلامی میں ۱۱۲۰ مخطوطات ۱۰۷۶-۱۴-۴ روپیہ میں فروخت کئے گئے یعنی ایک مخطوطہ کی قیمت ایک روپیہ سے بھی کم تھی۔

یہ سرگزشت ان مخطوطات کی ہے جو حکومت برطانیہ کو ہندوستان کے صرف دو شہروں سرنگاپٹم اور دہلی کے کتب خانوں سے ملے۔ بنگال، اودھ، گجرات، پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے اضلاع میں موجود کتب خانوں کی داستان اس سے کچھ مختلف نہیں۔

ان کتب خانوں کی جو کتابیں نیلام کی گئیں ان کا کچھ حصہ مختلف ذرائع سے برٹش میوزیم لائبریری جو آج کل برٹش لائبریری کہلاتی ہے آکسفورڈ کیمبرج اور اسی ملک کے دوسرے کتب خانوں میں جا پہنچا۔

اس سلسلہ میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور ان صاحب علم انگریز افسران کا ذکر بھی لازمی ہے جنہوں نے اردو ادب کی خدمت کی۔ ولیم ارون (W. IRWIN) رچرڈ جانسن RICHARD JOHNSON اور جے بی بلنٹائن J. B BALLANTYNE اور کچھ دوسرے افراد نے متعدد مخطوطات کو ہندوستان سے اکٹھا کیا اور کچھ نادر مخطوطات کی نقلیں کرا کر انہیں انگلستان بھیجا ———

برطانیہ میں عربی، فارسی اور اردو کی سب سے زیادہ قلمی کتابیں انڈیا آفس لائبریری میں موجود

ہیں۔ یہ مغربی دنیا میں مشرقی علوم اور مشرقی کتابوں کا سب سے قدیم اور سب سے بڑا کتب خانہ ہے۔ اسی عمارت میں ایک دوسرا ادارہ انڈیا آفس ریکارڈز ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد میں انڈیا آفس کی ان تمام دستاویزات پر مشتمل ہے جو ان دونوں اداروں نے ہندوستان پر حکومت کے دوران اکٹھی کی تھیں۔

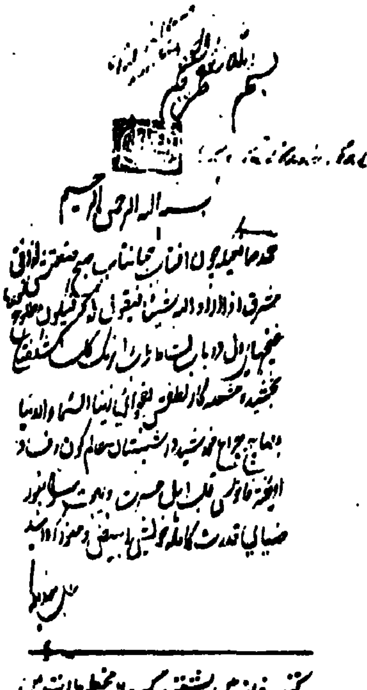
انڈیا آفس لائبریری میں تقریباً تین لاکھ کتابیں ہیں جن میں سے تقریباً ۲ لاکھ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اور باقی ایک لاکھ یورپین زبانوں میں ہیں۔ اس کے علاوہ رسائل و جرائد کی ایک بہت بڑی تعداد، پرنٹس اور ڈرائنگ اور فوٹو گرافس کا ایک بہت بڑا مجموعہ بھی اس کتب خانے میں موجود ہے۔ کتب خانہ میں بیس ہزار سے زائد مخطوطات بھی ہیں جن میں سے تقریباً ۱۲ ہزار اسلامی زبانوں میں ہیں۔ ان میں سے تقریباً ۶۰۰۰ فارسی کے تقریباً ۴۰۰۰ عربی کے، دو ہزار اردو، پنجابی، پشتو، سندھی ترکی اور دوسری زبانوں میں ہیں۔

فارسی کے ۳۰۷۹ مخطوطات کی فہرست ETHE نے ۱۹۰۳ء میں آکسفورڈ سے شائع کی تھی۔ اس کے علاوہ ROSS AND BROWN نے اپنی فہرست میں فارسی کے ۲۴۹ اور عربی کے ۴۸ مخطوطات شامل کئے تھے۔ فارسی اور عربی کے وہ مخطوطات جو کتب خانہ نے ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۸ء کے دوران حاصل کئے تھے ان کی تفاصیل ARBARY نے مندرجہ ذیل دو فہرستوں میں درج کی تھیں۔

Arberry, A.J
Handlist of Islamic manuscripts
acquired by the India Office
Library, 1936-38. In Journal of
the Royal Asiatic Society 1939,
111-July, pp 353-96.

Arberry, A.J.
Notes on Islamic manuscripts
recently acquired by the India
Office Library, In Islamic
Culture, XIII, October 1939,
pp540-58.

عربی مخطوطات کی فہرست
LOTH, ARBERRY STOREY AND LEVI
نے مکمل کی تھی۔ اس میں ۴۲۳۱ مخطوطات درج ہیں۔ فہرست میں شامل شدہ مخطوطات میں سب سے پرانا نسخہ غالباً ابن السکیت کی کتاب الفاظ ہے جسے ۳۹۱ھ یعنی ۱۰۰۹ء میں نقل کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ قرآن شریف کے کچھ نسخے خاص کر کوفی نسخے شاید اس سے بھی پرانے ہوں۔ ان میں سے ایک نسخہ پر کتبہ حسن ابن علی اور دوسرے پر کتبہ علی ابن طالب درج ہے۔



کتب خانہ میں پشتو کے ۶۰ مخطوطات ہیں ان کی فہرست بلوم ہارٹ اور میکنزی نے ۱۹۶۵ء میں لندن سے شائع کی تھی۔ اس فہرست میں ۱۰۷ مخطوطات درج ہیں جن میں انڈیا آفس کے ۶۰ مخطوطات کے علاوہ برٹش لائبریری ــ برٹش میوزیم لائبریری کے ۲۹، جان رائلنڈ لائبریری مانچسٹر کے ۱۶، اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز لندن کے ۱۰، کیمبرج یونیورسٹی لائبریری کے ۸ اور ڈرنٹی کالج ڈبلن کے دو اور بوڈلین لائبریری آکسفورڈ کے پانچ مخطوطات شامل ہیں۔

پنجابی اور سندھی مخطوطات کی فہرست حال ہی میں DR. C. SHACKLE نے مرتب کر کے شائع کی ہے۔ اس میں ۸۷ مخطوطات درج ہیں۔ (۷۱ پنجابی کے اور ۱۶ سندھی کے) پنجابی مخطوطات میں ۴۴ فارسی رسم الخط میں ہیں اور ۳۰ گورمکھی اور ناگری رسم الخط میں۔ ان میں سے ۴۷ مخطوطات سکھ مذہب سے متعلق ہیں (فارسی رسم الخط ۷، گورمکھی ۳۰) اور ۴۴ مخطوطات مسلمان مصنفین کے ہیں جن میں مولوی عبداللہ (عابدی) محمد یار، مولوی عبدالکریم، مولوی غلام مصطفیٰ، فرد فقیر، حافظ معزالدین اور جان محمد شامل ہیں۔ سندھی مخطوطات میں شاہ عبداللطیف بھٹائی، مخدوم محمد ہاشم، سید ہارون اور رشد الخالق کی تصنیفات شامل ہیں۔

برطانیہ میں اردو مخطوطات کی تعداد تقریباً ۷۵۰ ہے ان میں سے ۵۵۲ مخطوطات انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں جن میں سے ۲۶۹ مخطوطات بلوم ہارٹ کی فہرست میں اور تین ROSS AND BROWN کی فہرست میں شامل ہیں۔ باقی ماندہ ۲۸۰ مخطوطات کی فہرست بھی مکمل ہو چکی ہے جو دو یا تین ماہ تک شائع ہو جائے گی۔ ROSS AND BROWN کی فہرست میں درج شدہ

اردو کے قلمی مخطوطات بھی اس نئی فہرست میں شامل ہیں۔ اس طرح نصیرالدین ہاشمی نے اپنی کتاب "یورپ میں دکنی مخطوطات" میں انڈیا آفس لائبریری میں بلوم ہارٹ کی فہرست کے علاوہ جن مخطوطات کا ذکر کیا ہے وہ بھی اس نئی فہرست میں شامل کر لئے گئے ہیں۔

ہاشمی صاحب کی کتاب "یورپ میں دکنی" سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی برطانیہ کے مختلف کتب خانوں میں موجود ۱۹۴ دکنی مخطوطات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

1. Blumhardt, J.F. and Mackenzie, D.N. Catalogue of Pashto Manuscripts in libraries of the British Isles. London, 1965.
2. Shackle, C. Catalogue of the Panjabi and Sindhi manuscripts in the India office Library, London, India Office Library, 1977.
3. Blumhardt, J.F. Catalogue of the Hindustani manuscripts in the India office ملاحظہ ہو۔
4. Blumhardt, J.F. Catalogue of the Hindustani manuscripts in the India Office Library, London O.U.P. 1926.

بلوم ہارٹ کی فہرست میں شامل کئے گئے مخطوطات میں سے ۱۰۱ کا تعلق شاہان مغلیہ کے کتب خانوں سے ہے۔ ۹۰ کا ٹیپو سلطان کے کتب خانوں سے، ۵ کا بڑودا سے اور ۵ کا تعلق فورٹ ولیم کالج کے کتب خانوں سے ہے۔ اس فہرست میں مندرجہ ذیل کتابیں درج ہیں۔ اس فہرست میں جن مخطوطات کی تاریخ کتابت معلوم ہے وہ درج کر دی گئی ہے۔ بقیہ تمام مخطوطات ۱۹ویں صدی کے لکھے ہوتے ہیں۔

۱۔ مذہبیات

۱۔ خوب ترنگ از خوب محمد ۱۵۷۸ء – ۲۔ ایضاً ۱۶۶۶ء

۳۔ شریعت نامہ (احکام الصلوٰۃ) از شاہ ملک
۴۔ ترنجن ۱۴۲۳ء
۵۔ موضح القرآن از شاہ عبدالقادر دہلوی
۶۔ ترجمہ قرآن شریف از شاہ رفیع الدین دہلوی حاشیہ پر شاہ عبدالقادر کی موضح القرآن صرف ۲ سورہ۔
۷۔ ایضاً صرف آخری دو سیپارے۔
۸۔ ترجمہ قرآن شریف از شاہ رفیع الدین۔ صرف تیسواں سیپارہ۔
۹۔ ترجمہ قرآن شریف از شاہ عبدالقادر صرف تیسواں سیپارہ۔
۱۰۔ موضح القرآن از شاہ عبدالقادر دہلوی تیسواں سیپارہ اور سورہ فتح۔
۱۱۔ ترجمہ قرآن شریف از شاہ عبدالقادر دوسرا اور تیسرا سورہ۔
۱۲۔ تفسیر سیپارہ عم (منظوم) از غلام مرتضیٰ ۱۸۰۵ء۔
۱۳۔ تفسیر سورۂ یوسف ۱۸۴۸ء
۱۴۔ تفسیر سورہ فاتحہ۔
۱۵۔ تفسیر سورۂ رحمٰن۔
۱۶۔ احکام النساء از قاضی غلام احمد ۱۸ویں صدی۔
۱۷۔ ایضاً ۱۹ویں صدی۔
۱۸۔ تنبیہ المضلین۔
۱۹۔ تنبیہ الغافلین از شاہ رفیع الدین دہلوی اردو ترجمہ از بینی نرائن کھتری ۱۸۳۹ء
۲۰۔ برق لامع (منظوم) از مرزا محمد جعفر فصیح۔
۲۱۔ آئین العبادات از سید صالح محمد۔
۲۲۔ نصیحت المسلمین از مولوی خرم علی ۱۸۲۳ء
۲۳۔ تشکل بہار از مولوی سید فضل علی ۱۸۵۱ء

۲۴۔ مائۃ المسائل از مولانا محمد اسحاق فاروقی، اردو ترجمہ از احمد اللہ صدیقی ۱۸۵۶-۵۷ء
۲۵۔ شمائل نامہ از حکیم محمد مظفر حسین خاں ۱۸۳۱ء
۲۶۔ حدائق آثنا عشری از سید مہر علی اردو ترجمہ از سید حبیب الدین حیدر۔
۲۷۔ اوقات نماز پنجگانہ از محبوب علی خان حنفی ۱۸۴۰ء۔
۲۸۔ ضیاء الایمان از کفایت علی بریلوی۔
۲۹۔ عہد نامہ کسی عربی رسالے کا ترجمہ۔
۳۰۔ بحث بطلان تناسخ۔
۳۱۔ رسالہ در عقائد اہل سنت (کتاب الاخلاق)
۳۲۔ قصیدہ بردہ از شیخ شرف الدین بوصیری منظوم اردو ترجمہ از سید محمد۔
۳۳۔ انتخاب نمازوں کا (عیسائیت) از REV. HENRY MARTYN ۱۸۱۴ء
۳۴۔ ترجمہ انجیل متی از میر حسن علی و جان شیکسپیر J. SHAKESPEARE ۱۸۱۴ء

۲۔ تواریخ

۳۵۔ خاور نامہ از ابن حسام منظوم اردو ترجمہ از کمال خان رستمی۔ ۱۸ویں صدی۔
۳۶۔ علی نامہ از نصرتی۔ ۱۸ویں صدی
۳۷۔ جنگ نامہ بہاؤ راؤ (منظوم) از میر۔
۳۸۔ جنگ نامہ بہاؤ مرہٹہ و شاہ درانی (منظوم)
۳۹۔ آرائش محفل از سوجان رائے۔ اردو ترجمہ (جغرافیہ) از میر شیر علی افسوس۔
۴۰۔ جنگ خراسان یا جنگ نامہ کابل (منظوم) از کریم الدین یا کریم بخش۔
۴۱۔ تاریخ شیر شاہی از عباس خاں شیروانی اردو ترجمہ از مظہر علی خان ولا۔

۸۲ اردو بک سیلرز اور پبلشرز نمبر ۱۹

۴۲۔ حیدر نامہ
۴۳۔ سید التواریخ از سید روشن علی خان
۴۴۔ بیان حسب و نسب سادات بارہ از محمد شفیع علی خان ۱۸۹۴ء۔
۴۵۔ تاریخ فرمانروایان بہاول پور۔
۴۶۔ تاریخ اقوام ہند ۱۸۹۰ء
۴۷۔ تواریخ جمالی از عبدالقادر وکیل
۴۸۔ حالات پنجاب از سید محمد علی زکی ۱۸۹۶ء
۴۹۔ حالات نادر شاہ و محمد شاہ ، بیر تلوک داس کی ہندی نظم کا نثر اردو میں ترجمہ ہے)
۵۰۔ تاریخ نواب نجیب الدولہ از درگا پرشاد ۱۸۹۵ء۔
۵۱۔ حالات نواب رشید خان ۱۸۹۳ء

۳۔ سوانح حیات

۵۲۔ منتخب نیک نام ، شیخ فریدالدین عطار ، تذکرۃ اولیا کا منظوم اردو ترجمہ از عزیز۔
۵۳۔ ضیاء الابصار ۔ عربی سے نثر اردو میں ترجمہ از میر علی اکبر رضوی۔
۵۴۔ دوازدہ مجلس از عطا ؟

۴۔ تذکرات

۵۵۔ مخزن نکات از محمد قیام الدین قائم۔
۵۶۔ تذکرہ علی حسینی گردیزی ۹۷ ۔ ۱۷۹۶ء
۵۷۔ ایضاً ۱۸۰۲ء
۵۸۔ ایضاً ۶ ۔ ۱۸۰۵ء
۵۹۔ مجموعہ نغز از سید ابوالقاسم میر قدرت اللہ خان دہلوی قاسم۔
۶۰۔ گلشن ہند از نواب علی ابراہیم خان ۔ اردو ترجمہ از مرزا علی لطف۔
۶۱۔ گلستان سخن از سید غلام قطب الدین باطن۔
۶۲۔ تذکرہ سرور از میر محمد خان سرور
۶۳۔ چمن الشعرا از منشی توپ چند ذکا۔
۶۴۔ تذکرہ شعرائے اردو نامعلوم۔
۶۵۔ تذکرہ شعرائے اردو نامعلوم۔
۶۶۔ بیاض منشی شمس الدین۔

۵۔ جغرافیہ

۶۷۔ تاریخ نصیدوین از قاضی محمد شریف ۱۹۰۴ء
۶۸۔ آئینہ تبدیل کنندہ از سید منظور احمد ۱۸۹۶ء
۶۹۔ تاریخ بشیرہ۔
۷۰۔ وقائع بنارس و جونپور از سید مہدی حسن اردو ترجمہ از سید مبارک علی وکیل۔

۶۔ قصص و حکایات

۷۱۔ قصہ ابوشحمہ (منظوم) از امین ۱۸ ویں صدی
۷۲۔ قصہ طالب و موہنی (منظوم) از سید محمد والہ ۱۸۵۷ء۔
۷۳۔ قصہ بی بی مریم ، قصہ ملکہ مصر از عاجز ، قصہ ہدایت نامہ از محمد علی ۔ معجزہ سردر عالم از ولی ویلوری ۔ قصہ کرامات پیر دستگیر از افضل قصہ جو و ساس ۔ مثنوی عشق صادق از شفیق قصہ نافرمان عورت از مخدوم ۔ معجزہ بی بی فاطمہ ۱۸ ویں صدی۔
۷۴۔ قصہ ابراہیم ادہم بلخی از محی الدین۔
۷۵۔ حکایت سوداگر و حکایت مرثیہ کرباونسامت کرد از مرزا محمد اسمٰعیل۔
۷۶۔ نقل برہمن در باب کید زن (از بہار دانش) نقل زن برہمن ۔ حکایت پادشاہ ۔ حکایت زن را کشتن کر شکل شیر پیدا بود از مرزا محمد اسمٰعیل۔
۷۷۔ قصہ چنا ۱۸ ویں صدی۔
۷۸۔ ایضاً ۱۷۳۹
۷۹۔ قصہ بہلول صادق از لطفی ۱۸ ویں صدی
۸۰۔ قصہ منصور از احمد علی شیبور اچپوری رسا ۱۸۶۶ء
۸۱۔ ہشت گشت دشت گلگشت از سید حسین تحسین اردو ترجمہ از غلام احمد مومن ۱۸۲۱ء۔
۸۲۔ قصہ رنگین گفتار از خواجہ عظمت اللہ نیاز۔
۸۳۔ قصہ گل و صنوبر۔
۸۴۔ قصہ نادر زمانی ۔ قصہ ہارون الرشید یا قصہ بندگان زمانی۔
۸۵۔ مجموعہ حکایات
۸۶۔ انوار سہیلی ۱۸ ویں صدی
۸۷۔ ایضاً ۱۹ ویں صدی
۸۸۔ انوار سہیلی حرف باب چہارم
۸۹۔ ایضاً ۔ مقدمہ اور پہلے دو باب ۱۸ ویں صدی
۹۰۔ ایضاً ۔ حرف باب اول
۹۱۔ ناقص ۔ ایضاً۔
۹۲۔ قصہ مہر و رنگ از عاشق۔
۹۳۔ گریہ نامہ از سید غلام علی دہلوی ۔ معجزہ حضرت محمد در باب سلطان یمن ۔ نظم از فقیر ۔ اساس الواہین ۔ مثنوی رنگین ۔ مثنوی دریائے عشق از میر تقی میر ۔ تیرہ ماسہ از قطبی ۱۸۳۷ء ۔ ایک کہانی از افضل ۔ مثنوی رنگین (بیخود رنگین)
۹۴۔ قصہ شام و قمر از میر محبت اللہ شاہ۔
۹۵۔ مجموعہ ہدایت۔
۹۶۔ گلستان سعدی اردو ترجمہ

۹۷۔ ایضاً نظم و نثر
۹۸۔ باغ و بہار از میر امن دہلوی۔

۵۔ منظومات

۹۹۔ قصہ سیف الملوک و بدیع الجمال از غواصی ۱۷۳۱ء۔
۱۰۰۔ قصہ چندر بدن و مہیار از عزیز ۱۷۳۶ء
۱۰۱۔ راگ مالا از سید عبدالولی عزلت ۱۷۵۹ء
۱۰۲۔ دیوان عزلت ۱۸ ویں صدی۔
۱۰۳۔ پھول بن از ابن نشاطی۔ ۱۷ ویں صدی۔
۱۰۴۔ گلشن عشق از نصرتی ۱۷۸۵ء
۱۰۵۔ ایضاً ۱۷۹۹ء
۱۰۶۔ ایضاً ۱۹ ویں صدی۔
۱۰۷۔ ایضاً ۱۹ ویں صدی
۱۰۸۔ جنگ نامہ محمد حنیف از میرک ۱۸ ویں صدی۔
۱۰۹۔ ظفر نامہ از بلیت ۱۷۴۳ء
۱۱۰۔ قصہ لعل و گوہر از عاجز ۱۷۱۷ء
۱۱۱۔ ایضاً ۱۸ ویں صدی۔
۱۱۲۔ روضۃ الشہدا از ولی ۱۸۰۱ء۔
۱۱۳۔ دیوان ولی ۱۷۳۳ء
۱۱۴۔ ایضاً ۱۷۴۳ء
۱۱۵۔ ایضاً ۱۷۴۴ء
۱۱۶۔ ایضاً ۱۸ ویں صدی۔
۱۱۷۔ ایضاً۔
۱۱۸۔ ایضاً۔
۱۱۹۔ ایضاً صرف غزلیات ۱۸ ویں صدی۔
۱۲۰۔ ایضاً ۱۸۶۴ء
۱۲۱۔ منطق الطیر از شیخ فریدالدین عطار اردو ترجمہ از وجیہ الدین وجدی ۱۷۹۱ء
۱۲۲۔ پھول بن از ابن نشاطی۔ مثنوی قطب مشتری ازوجہی۔ روضۃ الشہدا از ولی۔ ۱۷۴۵ء۔
۱۲۳۔ دیوان آصف۔
۱۲۴۔ دیوان سجاد۔ ۱۸ ویں صدی
۱۲۵۔ دیوان یقین۔ ۱۷۸۰ء
۱۲۶۔ قصہ کامروپ و کلا کام از تحسین الدین۔
۱۲۷۔ ایضاً ۱۷۷۹ء
۱۲۸۔ آخر گشت از شاہ رمضان علی۔
۱۲۹۔ نو طرز مرصع از محمد حسین عطا خاں تحسین ۱۸۲۶ء۔
۱۳۰۔ ایضاً۔
۱۳۱۔ ایضاً۔
۱۳۲۔ ایضاً مع اضافہ از محمد ہادی غافل ۱۸۴۳ء
۱۳۳۔ کلیات ذکی ۱۸ ویں صدی۔
۱۳۴۔ ایضاً
۱۳۵۔ ایضاً
۱۳۶۔ ایضاً ۱۸۴۳ء
۱۳۷۔ دیوان ابجدی ۱۷۷۸ء
۱۳۸۔ دیوان درد۔ ۱۸۱۵ء
۱۳۹۔ ایضاً ۱۹ ویں صدی
۱۴۰۔ مثنوی خواب و خیال از خواجہ میر اثر ۱۸۳۲ء۔
۱۴۱۔ مثنوی سحرالبیان از میر حسن ۱۸۲۱ء
۱۴۲۔ ایضاً ۱۸۳۷ء
۱۴۳۔ دیوان قائم ۱۸ ویں صدی
۱۴۴۔ دیوان سوز ۱۸۰۱ء
۱۴۵۔ فتح نامہ ٹیپو سلطان یا اضراب سلطانی۔
۱۴۶۔ کلیات سودا۔
۱۴۷۔ ایضاً ۱۷۹۹ء
۱۴۸۔ ایضاً ۱۸۰۴ء
۱۴۹۔ ایضاً ۱۹ ویں صدی
۱۵۰۔ ایضاً ۱۸۱۷ء
۱۵۱۔ ایضاً ۱۹ ویں صدی
۱۵۲۔ ایضاً ۱۸۴۴ء
۱۵۳۔ ایضاً ۱۹ ویں صدی
۱۵۴۔ ایضاً۔
۱۵۵۔ ایضاً۔
۱۵۶۔ دیوان بیدار ۱۸۰۰ء
۱۵۷۔ ایضاً ۱۹ ویں صدی
۱۵۸۔ دہ مجلس از سیف الملوک بیدار۔ اردو ترجمہ از عبداللہ مکین۔ ۱۸ ویں صدی۔
۱۵۹۔ دیوان افسوس مع دیباچہ و مثنوی بہار سخن
۱۶۰۔ دیوان زادہ حاتم ۱۸ ویں صدی۔
۱۶۱۔ دیوان محبت ۱۸۰۲ء
۱۶۲۔ ایضاً ۱۹ ویں صدی
۱۶۳۔ دیوان جرأت۔
۱۶۴۔ دیوان میر ۱۸۲۷ء
۱۶۵۔ وفات نامہ پیغمبر از میر ۱۸ ویں صدی۔
۱۶۶۔ حال شمع و پروانہ ۱۸۲۸ء
۱۶۷۔ مجموعہ کلام شاہزادہ جہاں بخت جہاندار شاہ
۱۶۸۔ نصیحت المومنین از مولوی فرخ علی گھوسوی
۱۶۹۔ بکٹ کہانی از افضل ۱۸ ویں صدی۔
۱۷۰۔ ایضاً ۱۹ ویں صدی۔
۱۷۱۔ شاہنامہ منظوم ترجمہ اردو از مل چند منشی
۱۷۲۔ دیوان ترقی۔
۱۷۳۔ دیوان احسان ۱۸۴۱ء
۱۷۴۔ دیوان عشق ۱۸۲۱ء۔
۱۷۵۔ دیوان عیش۔
۱۷۶۔ کلیات انشاء
۱۷۷۔ کلیات ممنون
۱۷۸۔ آدمی کی زندگی کا انتظام اردو ترجمہ از

CAPT. W. R. ROBSON

۱۷۹۔ دیوان ریختہ از رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۱۸۰۔ دیوان بیختہ از رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۱۸۱۔ ایضاً بخط مصنف ۱۸۳۹ء

۱۸۲۔ دیوان آمیختہ از رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۱۸۳۔ دیوان انگیختہ از رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۱۸۴۔ مجموعہ رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۱۸۵۔ مجالس رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۱۸۶۔ ایضاً ۱۸۹۰ء

۱۸۷۔ امتحان رنگین بخط مصنف ۳۱-۱۸۳۰ء

۱۸۸۔ اخبار رنگین بخط مصنف ۱۸۱۴ء

۱۸۹۔ شش جہت رنگین بخط مصنف ۱۸۳۴ء

۱۹۰۔ ایجاد رنگین ۱۸۱۴ء

۱۹۱۔ عجائب و غرائب رنگین ۱۸۱۴ء

۱۹۲۔ داستان رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۱۹۳۔ چہار چمن رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۱۹۴۔ پنجہ رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۱۹۵۔ نظم رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۱۹۶۔ داستان رنگین ۱۸۳۲ء

۱۹۷۔ خمسہ رنگین بخط مصنف ۳۲-۱۸۳۱ء

۱۹۸۔ جنگ نامہ رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۱۹۹۔ جوابیات رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۲۰۰۔ نصاب رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۲۰۱۔ حکایات رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۲۰۲۔ بیست سپارہ رنگین بخط مصنف ۳۳-۱۸۳۲ء۔

۲۰۳۔ تقسیمات رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۲۰۴۔ گلدستہ رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۲۰۵۔ رنگین نامہ بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۲۰۶۔ ساقی نامہ رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۲۰۷۔ تجربہ رنگین ۱۸۳۲ء

۲۰۸۔ کلام رنگین بخط مصنف ۱۸۳۲ء

۲۰۹۔ فرس نامہ رنگین یا اسپ نامہ رنگین ۱۸۲۹ء

۲۱۰۔ قوت الایمان۔ ترجمہ قصیدہ غوثیہ۔ ترجمہ

۲۱۱۔ انتخابات شعریات رنگین بخط مصنف ۱۸۳۴ء

۲۱۲۔ دیوان آتش۔

۲۱۳۔ دیوان مومن ۱۸۳۹ء

۲۱۴۔ مثنوی مومن۔

۲۱۵۔ دیوان حاتم

۲۱۶۔ دیوان شور

۲۱۷۔ دیوان فقیر

۲۱۸۔ دیوان (ماہ لقا) چندا

۲۱۹۔ دیوان سراج۔

۲۲۰۔ انتخاب غزلیات، مخمسات و مسدسات شاہ ولایت۔

۲۲۱۔ مکاشفات الاسرار از سید علی دہلوی تمکین عرف حضرت جی۔

۲۲۲۔ یادداشت از فتح اللہ ۱۸۳۵ء — قاسم الیہ حنہ از زین العابدین۔ رسالۂ توحید۔ مناجات از شمس الدین گجراتی۔ نصیحت نامہ از شمس الدین گجراتی۔ ذوق اور غالب کے سہرے جو شاہزادہ جواں بخت کی عقد خوانی پر لکھے گئے تھے۔ دریائے عشق از میر۔ قصہ ابیونی از مرزا کچھو بیگ اکبر۔ عرضداشت جعفر زٹلی بدرگاہ حضرت آشناس کمجو رخان ولد نادیل خان۔

۲۲۳۔ قصہ حسین۔ مثنوی عقد فاطمہ از مخدوم حسینی ۱۷۸۵ء۔ معجزات رسالت از مخدوم حسینی۔ قصہ حضرت عمر از کمینہ۔ قصہ حسینی از حاص۔ مثنوی مصیبت اہل بیت از احمد۔

۲۲۴۔ مجموعہ اشعار

۲۲۵۔ مثنوی سحر البیان از میر حسن۔ دریائے عشق از میر۔ مثنوی میر اثر ۱۸۲۳ء

۲۲۶۔ دریائے عشق از میر۔ مثنوی مصحفی در جواب میر تقی۔ شعلۂ عشق از میر۔ اعجاز عشق از میر۔

۲۲۷۔ نامہ جرات از شیخ قلندر بخش جرات — بحر خار شش از جرات۔ مجموعہ اشعار جرات و علی جان۔ شہنشاہ جہانگیر اور نور جہاں بیگم کے درمیان گفتگو۔ علی جان کی سات غزلوں کا مجموعہ۔ مراثی اصغر۔ مجموعہ مراثی۔

۸۔ اخلاقیات

۲۲۸۔ سلک جواہر از فخر الدین حسین ۱۸۵۰ء

۲۲۹۔ تجربہ خاص از بشن دیال فرخ آبادی۔

۹۔ طب

۲۳۰۔ فارماکوپیا ادویات انگریزی۔ نقل ثانی از کپتان جان ولیم ٹیلر (TAYLOR) ۱۸۳۲ء

۲۳۱۔ خواص الادویہ

۲۳۲۔ لغات طبیہ۔ مخزن الادویہ از محمد حسین اور بہاؤ پرکاش از بہاؤ مسرا میں ادویہ کے ہندی ناموں کے عربی اور فارسی مترادفات کی فہرست۔

۱۰۔ موسیقی

۲۳۳۔ مفرح القلوب از حسن علی عزت ۱۲۳۲ء

۲۳۴۔ مفرح القلوب کے ۹ مکرر نسخہ نمبر ۲ پر ٹیپو سلطان کی تحریر اور دو جگہ پر ان کے دستخط ثبت ہیں۔

۱۱۔ زراعت

۲۴۲۔ توضیح ... عشت از مرزا کلب حسین خان ...

۱۲۔ آئینِ حرب

۲۴۳۔ قواعد انتظام افواج شاہ شجاع ترجمہ از لیفٹیننٹ بینٹ LIEUT BENNET

۱۳۔ فرہنگ الفاظ

۲۴۴۔ آموختن ۱۷۹۰ء
۲۴۵۔ فارسی۔ اردو فرہنگ
۲۴۶۔ فارسی۔اردو۔ فرہنگ
۲۴۷۔ آمد نامہ۔
۲۴۸ اردو۔ پشتو فرہنگ
۲۴۹۔ تحفۂ پنجاب۔ پنجابی۔اردو۔ فارسی — فرہنگ، از ایودھیا پرشاد۔
۲۵۰۔ مصطلحات تمنگی از علی اکبر الہ آبادی ۱۲۳۵ھ
۲۵۱۔ اردو فرہنگ
۲۵۲۔ خالق باری یا مطبوع الصبیان از امیر خسرو۔ ۱۸ویں صدی۔
۲۵۳۔ ایضاً ۱۷۲۲ء
۲۵۴ ایضاً ۱۸ویں صدی۔
۲۵۵۔ ایضاً ۱۸ویں صدی
۲۵۶ حمد باری
۲۵۷۔ رازق باری از والہ ۹۵-۱۷۹۴ء

۱۴۔ لغات

۲۵۸۔ مدار الافاضل از شیخ الہداد فیض سرہندی۔ اردو ترجمہ۔ مترجم نامعلوم

۴-۱۷۷۳ء

۲۵۹۔ اردو لغت از آگسٹس والٹر LIEUT AUGUST WALTER

۱۵۔ حرف و نحو

۲۶۰۔ ہندوستانی گرامر از بنجمن شولز — BENJAMIN SCHULTZ

۲۶۱۔ قاعدہ زبان پنجابی از منشی کاشی رام کھتری ۱۸۱۱ء

۱۶۔ متفرقات

۲۶۲۔ سرکاری حکامات مراسلات: ورشاہ عالم کے فرامین، مجموعہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی شاہان مغلیہ اور ہندو راجاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔
اسے سراج الدین خاصوری نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیکریٹری مسٹر پولش کے لئے ۱۷۸۴ء کے قریب جمع کیا۔

۲۶۳۔ گوشوارہ جات واعداد و شمار زمینداران صوبہ جات متحدہ ۱۸۴۴ء

۲۶۴۔ درخواست از جانب رئیسان و زمینداران پنجاب بنام ڈیوک آف ارگائل سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا۔ ۶ر فروری ۱۸۶۹ء

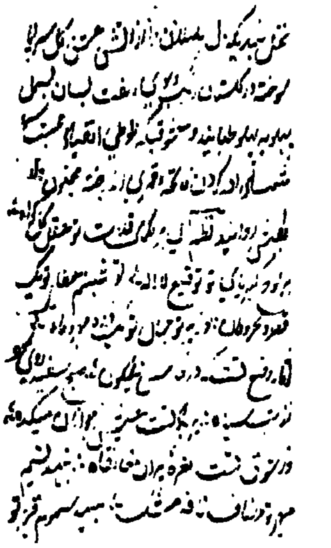
۲۶۵۔ عجیب اللطائف۔

۲۶۶۔ حکایات، منظوم مکالمات اور غزلوں وغیرہ کا مجموعہ۔

۲۶۷۔ ہندوستانی گرامر از بنجمن شولز (ناقص)، ضرب الامثال۔ سودا اور تاباں کی ریختہ نظمیں۔

۲۶۸۔ متفرق مذہبی رسائل اور استفتا کا مجموعہ جس میں ہجرت کا رسالہ، نکاح ثانی کا رسالہ شامل ہیں۔ ۱۸۶۹ء

۲۶۹۔ متفرق خطوط، درخواستیں اور اشتہارات کا مجموعہ۔



بلوم ہارٹ کی فہرست میں شامل شدہ مخطوطات کے علاوہ انڈیا آفس لائبریری میں اردو کے ۴۸ اور مخطوطات ہیں جن کی فہرست عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

اس فہرست اسلامیات کے تحت جو کتابیں دی گئی ہیں ان میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔
مولوی مخصوص اللہ ولد مولانا رفیع الدین کا رسالہ رد اسماعیلیہ۔ مولوی کریم اللہ کا حفظ الایمان ہدایۃ الضالین فی دفع انکار المنکرین۔ در جواز شعر خوانی در خطبہ اور ان کے دو اور رسالے جن میں سے پہلا سوئم کے دن درود اور فاتحہ پڑھنے سے متعلق اور دوسرا وہابی عقائد کی تردید میں ہے۔
مولوی خرم علی کی نصیحت المسلمین۔ رحمان علی عیش کی گلزار نعت۔ محمد منیر خان کا رسالہ در شرح دو بیت۔ شاہ رفیع الدین کی تنبیہ الغافلین کا

اردو ترجمہ۔ السراجیہ کا اردو ترجمہ جو سید مراد علی نے ۱۲۴۴ھ ۱۸۲۸ء میں نقل کیا تھا۔ خلاصۃ الکیدانی یعنی الفاضل الکیدانی کا اردو ترجمہ۔ مولوی محمد اسحٰق کی فضائل ذوالحجہ اور خطبات العیدین کا اردو ترجمہ۔ صدی مسلک کے دو نسخے۔

تاریخ کے تحت جو کتابیں ہیں ان میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

سیر التواریخ از سید روشن علی خاں۔ اس میں خاندان سادات بارہہ کی تاریخ دی گئی ہے۔ اس کا ایک نسخہ بلوم ہارٹ کی فہرست میں بھی شامل ہے۔ محمد حسن رضا خان کا "اخبار حسن" جس میں ۱۸۸۷ء تک رو ہیلہ سرداروں کی تاریخ دی گئی ہے۔ اس میں فرخ آباد کے بنگش نوابوں کے حالات شوکت جنگ یعنی ۱۸۲۳ء تک درج ہیں۔

حالات نادر شاہ چندیری کے کسی نامعلوم شاعر کی نظم ہے جس میں نادر شاہ کے ہندوستان پر حملے کا ذکر ہے۔ خدنگ غدر از معین الدین حسن خان ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی چشم دید تاریخ ہے۔ خواجہ احمد فاروقی نے ۱۹۷۲ء میں اس کی نقل دہلی یونیورسٹی سے شائع کی تھی۔

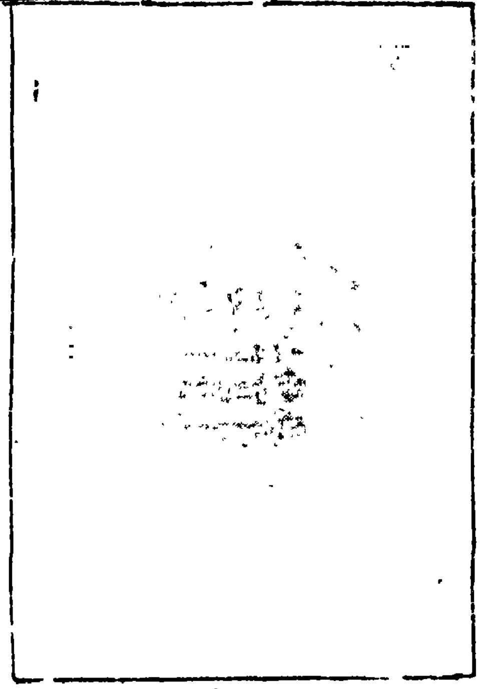
ہندوستان کے راجاؤں کا بیان۔ یہ کسی نامعلوم مصنف کی تصنیف ہے جس میں اکبر شاہ ثانی ۳۷-۱۸۰۶ء تک کے حالات قلم بند ہیں۔ احمد آباد کی آبادی کا بیان جس میں احمد آباد کی تاریخ اور شہر کی مختلف عمارات کا ذکر ہے۔ کتاب التواریخ جس میں ۱۸۴۶ء تک کے ہندوستان کے حالات درج ہیں۔ تاریخ بنگل کنندہ احوال قصبہ ہبتری از عبدالعزیز گلدستہ کشمیر از ہرگوپال کول جس میں جموں و کشمیر کے جغرافیائی حالات

اور تاریخ درج ہے۔ اس کے علاوہ اس میں مشہور عمارات، پیداوار، تجارت، علوم و فنون اور دیگر معلومات اور نقشہ جات شامل ہیں۔ تواریخ بجیل کھنڈ از رحمت علی خاں جس میں روہیلہ کے فرمانروا اور بجیل کھنڈ کے تاریخی حالات ۱۸۰۰ء تک درج ہیں۔ اس کے علاوہ ایک نامعلوم الاسم نظم ہے جس میں بیانہ اجمیر اور گجرات میں ۱۷۹۹ء میں سیلاب کی تباہ کاریوں کا ذکر ہے۔

نظم کے تحت جو کتابیں ہیں ان میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔ دیوان چندو لعل شاداں جسے مصنف نے ۱۸۲۸ء میں تھامس وا لبن کو بذات خود پیش کیا تھا۔ راجہ صاحب دربار آصفیہ میں وزارت کے منصب پر فائز تھے۔ کلیات اقبال بیگم ترک (اقبال بیگم ناری کے مشہور شاعر شیخ غلام قادر گرامی کی زوجہ تھیں) یہ نسخہ ان کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

قصہ سیاہ پوش از شاہ رحمان جو قصہ سوداگر بچہ کے نام سے بھی موسوم ہے نواب محبت خان کی اسرار محبت، عارف الدین عاجز کا قصہ لعل و گوہر، قصہ سازل دگوری از شیخ دین، مثنوی مہتاب و چندر بدن از سیف اللہ، میر حسن کی مثنوی سحرالبیان کا ایک نسخہ اور منشی رحمان علی طیش کی گلزار ندرت کا ۱۸۵۷ء کا ایک نسخہ۔

لغات کے تحت جو کتابیں ہیں ان میں سے



مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں

آرزو کی نوادر الالفاظ کے دو نسخے جن میں سے ایک ۱۸۳۸ء کا اور دوسرا غالباً اس کے بعد کا تحریر شدہ ہے۔ خالق باری اور بیں صدی کے دو نسخے، عبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغات کا ۱۷۴۸ء کا نسخہ جس میں شائع شدہ کتابوں کے علاوہ ایک اور باب "الفاظ و اصطلاحات و محاورہ روزمرہ بیگمات و خواتین ہندوستان و گفتار محل مبارک" شامل ہے۔ صفوۃ المصادر کے تین نسخے فیض کا جینز اور مصادر نیوٹن کا ایک نسخہ۔ طب کے تحت جو کتابیں ہیں ان میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

نصاب الطب جو دکن کے جمال نامی شاعر کی نظم ہے جس میں مختلف امراض کی … یت اور ان کے علاج کے لئے دواؤں کے نام تجویز کئے گئے ہیں۔ رسالہ معالجہ تپ بطور راہ فرنگ

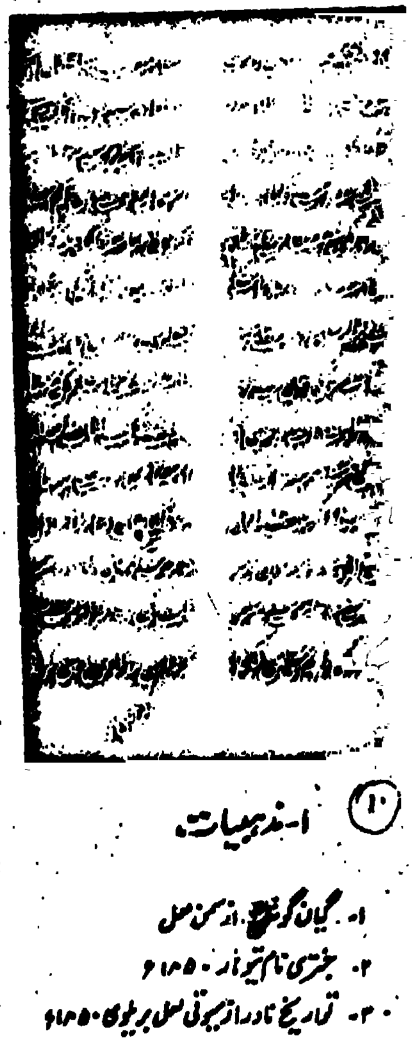
جو کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے اور فرہنگ طب شہابی جس میں طبی، عربی، فارسی، سنسکرت، ترکی اور دوسری زبانوں کی طبی اصطلاحات کے اردو متبادل پیش کئے گئے ہیں۔ بعنوان لغت جو نصاب الطب کے مصنف جمال کی تخلیق ہے اور جس میں ہندوستان میں پیدا ہونے والے پھلوں اور سبزیوں کے خواص نظم کے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔

متفرقات کے مختلف کتابیں ہیں ان میں غلام امام شہید کی تعریف روزہ منورہ اور کرنل کھنسری کا زرگری نامہ شامل ہیں۔

نثر میں قصہ حاتم طائی، بیتال پچیسی جسے مظہر علی خان ولا نے گلکرسٹ کی کتاب سے ترجمہ کیا تھا۔ محمد قادری کی طوطا کہانی، کاظم علی جوان کی شکنتلا اور گلستان سعدی کا اردو ترجمہ قابل ذکر ہیں۔

موسیقی کے مصنف منشی محمد کرم امام خان اونامی کی معدن الموسیقی کا ایک نسخہ ہے۔ یہ غالباً اس کتاب کا واحد نسخہ ہے۔ اس کی نقل ۱۸۲۵ء میں لکھنؤ کے ہندوستانی پریس سے شائع کی گئی تھی۔ بزم سدا رنگ لاہور نے غالباً ۱۹۶۰ء میں اسے دوبارہ شائع کیا تھا۔

برٹش لائبریری (برٹش میوزیم لائبریری) میں اردو کے ۱۱۵ مخطوطات کی فہرست بلوم ہارٹ نے ۱۸۹۹ء میں تیار کر کے شائع کی تھی۔ اس فہرست میں مندرجہ ذیل کتابیں درج ہیں۔ اس فہرست میں جن مخطوطات کی تاریخ کتابت معلوم ہے وہ درج کر دی گئی ہے۔ بقیہ تمام مخطوطات ۱۹ویں صدی کے لکھے ہوئے ہیں۔



(۱۰)

۱- مذہبیات

۱- گیان گودڑی از حسن علی
۲- جنتری تمام تیوہار ۱۸۵۰ء
۳- تواریخ نادر از بہونی لعل بریلوی ۱۸۵۰ء

۲- تواریخ

۴- کتب تواریخ A.F. TYTLER کی ELEMENTS OF GENERAL HISTORY کا اردو ترجمہ از لیوس ڈکوسٹا (LEWIS DACOSTA) و حکیم عبدالمجید۔
۵- جامع التواریخ از قاضی نیر محمد۔
۶- قصہ احوال روہیلہ از رستم علی صوبیدار

۱۷۹۰ء

۷- اخبار حسن (تاریخ روہیلہ) از محمد حسن رضا خان۔
۸- سلطان ٹیپو کی تاریخ از منشی عبدالحلیم منقبہ۔
۹- حال جنگ کابل از سید فدا حسین عرف نبی بخش بخاری ۱۸۵۱ء

۳- سوانح حیات

۱۰- مجموعہ عاشقین از سید عبدالعلی ادہم

۴- تذکرات

۱۱- تذکرہ گل حسینی گردیزی ۱۸۵۱-۵۲ء
۱۲- گلزار ابراہیم - ۱۸ویں صدی
۱۳- ایضاً ۱۹ویں صدی
۱۴- تذکرہ ہندی از غلام ہمدانی مصحفی
۱۵- دیوان جہان از بینی نرائن جہان
۱۶- گلشن بے خار از شیفتہ ۱۸۳۷ء
۱۷- نسب نامہ سادات بارہہ

۵- سیاحت

۱۸- سیاحت نامہ (انگلینڈ) از کریم خان ۱۸۴۱ء

۶- جغرافیہ

۱۹- دستور العمل پیمائش اراضی از نصراللہ خان
۲۰- منتخب آرائش محفل از شیر علی افسوس ۱۸۵۰ء
۲۱- تواریخ بریلی از گلزاری لعل ۱۸۴۷ء
۲۲- صورت حال بریلی از گلزاری لعل ۱۸۵۲ء
۲۳- کیفیت آبادی بہدول پور قصبہ پایان والرنیا

۷۔ طب

۲۴۔ معالجات شافیہ از سید تفضل حسین خان۔
۲۵۔ خلاصہ معالجات شافیہ۔
۲۶۔ کمپینٹ انیپ از گلز ری لعل ۱۸۵۰ء (زمینوں کی پیمائش کے متعلق)
۲۷۔ جامع الفاظ عیسوی از حاجی زین العطار ۱۸۰۷ء
۲۸۔ تحفۃ الملوک

۸۔ تنظیم افواج

۲۹۔ ترجمہ کتاب قواعد ترکسوار دون (افواج انگریزی) کا ۱۸۱۷ء

۹۔ خانہ داری

۳۰۔ خوان الوان از سید حمید الدین بہاری
۳۱۔ پہیلی نامہ ۱۸۵۰ء

۱۰۔ لغات

۳۲۔ خالق باری۔ ۱۷ ویں صدی آمد نامہ ۱۷ ویں صدی۔
۳۳۔ غرائب اللغات از سراج الدین خان آرزو ۱۸۴۴ء۔
۳۴۔ A VOCABULARY OF WORDS IN ENGLISH AND MOORISH
۳۵۔ انگریزی اردو لغت
۳۶۔ گلشن البیان فی مصطلحات ہندوستان از محمد اسماعیل طپش۔
۳۷۔ عجائب اللغات از اللہ یار ولد حافظ رحمت خان ۱۸۱۹ء
۳۸۔ نخبۃ اللغات از محمد علی صدر امین ۱۸۰۵ء؟

۱۱۔ صرف و نحو وغیرہ

۳۹۔ RUDIMENTS OF THE HINDOSTAN LANGUAGE
۴۰۔ ایضاً
۴۱۔ ... الامثال از فیض علی خان نواب جھجر۔

۱۲۔ منظومات

۴۲۔ قصہ شاہ بہرام و بانو حسن از دولت ۱۸ ویں صدی
۴۳۔ ایضاً گجراتی رسم الخط
۴۴ گلشن عشق از نصرتی۔ ۱۸ ویں صدی
۴۵۔ علی نامہ از نصرتی ۱۸ ویں صدی
۴۶۔ قصہ سیف الملوک (مصور) از غواصی ۱۷۴۹ء۔
۴۷ قصہ رضوان شاہ و روح افزا از فیض ۱۷۹۲ء۔
۴۸۔ قصہ بی بی مریم ۱۸۷۰ء
۴۹۔ جنگ نامہ حیدر از سید اشرف ۱۸ ویں صدی
۵۰۔ قصہ بہرام و گل اندام از طبی و ہشت بہشت از محمد شاہ ۱۸ ویں صدی۔
۵۱۔ دیوان ولی ۱۸۲۷ء
۵۲۔ کلیات قلی قطب شاہ میر جعفر زٹلی
۵۳۔ دیوان کیرد۔ دیوان مبتلا
۵۴۔ قصہ سوداگر کی بیوی کا از عبداللہ قیاس طوطی نامہ از غواصی۔
۵۵۔ قصہ لعل و گوہر از عاجز۔ شوہر نامہ از صابر مثنوی غواصی۔ غزل داؤد ۱۸ ویں صدی
۵۶۔ قصہ لعل و ہیرا، قصہ راجہ چترکمٹ ورانی چندرکرن۔ قصہ مرطا و مینا۔ قصہ مجمرہ از روشن علی ۱۷۷۴ء
۵۷۔ کلیات سودا۔
۵۸۔ ایضاً
۵۹۔ ایضاً ۱۸۰۵ء
۶۰۔ انتخاب کلیات سودا ۱۷۹۷ء
۶۱۔ ایضاً
۶۲۔ دیوان سودا۔ دیوان تاباں ۱۸۲۱ء
۶۳۔ دیوان میر تقی میر اول ۱۸۶۳ء
۶۴۔ دیوان میر (دوم تا ششم) ۱۸۱۲ء
۶۵۔ دیوان میر سوز۔ ۱۸ ویں صدی
۶۶۔ کلیات جرأت ۱۸۰۰ء
۶۷۔ دیوان جرأت
۶۸ دیوان صاحب قران
۶۹۔ کلیات میر حسن۔ مثنوی سحر البیان
۷۰۔ سحر البیان از میر حسن۔ ۱۷ ویں صدی
۷۱۔ ایضاً ۱۸ ویں صدی
۷۲۔ دیوان افسوس
۷۳۔ مرثیہ مسکین
۷۴۔ انتخاب کلام رنگین ۱۸۰۳ء
۷۵۔ اشعار محمد کاظم الدین ۱۸۰۷ء
۷۶۔ برق لامع از غالب۔
۷۷۔ دیوان بارش
۷۸۔ قصہ لیلیٰ مجنوں از نجیب علی خان ۱۸۳۱ء
۷۹۔ قصہ راجہ کنور سین ورانی چنراولی۔
۸۰۔ مثنوی نامعلوم۔
۸۱۔ بیاض اشعار انشا۔ جرأت سودا ۱۸۳۶ء
۸۲۔ گلدستہ حیدری از سید حیدر بخش حیدری

۸۳۔ مثنوی حمیل از میکن سنگھ ۱۸۳۷ء

حکایات

۸۴۔ طوطی نامہ ۔ از نیاز صمدی۔
۸۵۔ ترجمہ گلستان سعدی
۸۶۔ انوار سہیلی از مرزا مہدی
۸۷۔ نو طرز مرصع از میر محمد حسین عطا خان تحسین
۸۸۔ ایضاً ۱۸۲۲ء
۸۹۔ قصہ امیر حمزہ (جلد اول) از خلیل علی خان اشک۔
۹۰۔ شکنتلا ناٹک از کاظم علی جوان۔
۹۱۔ قصہ مادھونل اور کام کندلا از مظہر علی خان ولا۔
۹۲۔ توتا کہانی از سید حیدر بخش حیدری۔
۹۳۔ اخلاق ہندی از میر بہادر علی حسینی۔
۹۴۔ نثر بے نظیر از میر بہادر علی حسینی۔
۹۵۔ چار گلشن از بینی نرائن جہاں۔
۹۶۔ قصہ نل دمن از الٰہی بخش شوق۔
۹۷۔ ہفت گلشن از مظہر علی خان ولا۔
۹۸۔ قصہ چہار درویش ۱۸۰۳ء۔
۹۹۔ نگارستان عشق از غلام اعظم افضل ۱۸۴۶ء
۱۰۰۔ نگارستان عجائب از سعید الدین علی محمد
۱۰۱۔ قصہ ہیر رانجھا ۱۸۵۰ء
۱۰۲۔ قصہ ضمیر و آرام جان۔
۱۰۳۔ قصہ منیر الملک و مین البصر۔

تصاویر

۱۰۴۔ تصاویر بزرگان پنجاب

متفرقات

۱۰۵ مغزل صبیان۔ خالق باری از امیر خسرو ؟ ۴۵-۱۷۴۰ء۔
۱۰۶۔ انوار سہیلی۔ ترجمہ اقبال نامہ جہانگیری از مرزا سعت علی و تا۔ گلستان سعدی۔ انشا ابوالفضل دلی کے دو قصیدے۔
۱۰۷۔ احوال ابتدائے ترقی راجہ ہائے بھرت پور۔ احوال رستم خان وکھنی۔ احوال بہادر خان ودلیل خان۔ کیفیت قوم ترکان۔ بیان قوم بنجارہائے بہ ترتیب۔ اسمائے رونگ غلہ۔ احوال سری بدری ناتھ جیو۔ احوال سری کیدار ناتھ جیو۔ احوال آبادی ملک و زراعت کوہستان۔ احوال قوم بھادو۔ احوال قوم بنجارہائے بید۔ بیان قوم گذریہ ہائے بید۔ بیان اقوام گذریہ ہائے بیان ترکیب لگانے چونے اور اینٹ کا۔ احوال متعام جھانسی۔ رودیداد ریاست اناوہ۔ فہرست کاغذات مہاجنی۔ بیان قوم بنجارہائے موکیری۔ شجرۂ نسب بنجارہائے لاز کیفیت افسانہ وطن۔
۱۰۸۔ ترجمہ شاہ نامہ از مرل چند منشی۔ تاریخ یوسفی (سفر نامہ انگلستان) از یوسف خان صوبیدار ۱۸۴۵ء۔ تاریخ منلیہ از منشی حسینی و منشی نور محمد رسالہ حال آگرہ از سعید الدین ۱۸۴۵ء۔
۱۰۹۔ ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی اور انگریزی لغت۔ اردو برل چال۔ پنجابی، فارسی و ہندی لغت۔
۱۱۰۔ دستور العمل ترتیب کاغذات محکمہ بندوبست۔ بیان سلطنت ممالک خورد نکا، راحت افزا۔
۱۱۱۔ کتاب مساحت از ولایت حسین خان فائدہ تیسیر تو کو نیچۃ از کالی داتے۔ ہدایت نامہ کام از کالی داتے، کھیت کرم ۱۸۵۰ء۔
۱۱۲۔ کتاب مجموعہ حقائق الہند۔ کیفیت شیخ سدو۔ حال پیدائش اور کرامات گرو گا خابر پیر۔ حال راجہ ہری چند۔ قصہ راجہ سالباہن۔ قصہ اجہادو و دل۔ حقیقت بدھ گوجر ان۔ احوال قوم راجپوت بڑگوجر۔ احوال قوم بنجارہ وغیرہ۔ احوال قوم اہیر۔ شجرہ حسب و نسب قوم راجپوتان۔ بیان قوم بیراگیان وغیرہ۔ بیان قوم گسائیں ملا۔ حال ذات مجذیلیا۔ بیان حالات قوم ترکان۔ حال قوم بنجارہ۔ احوال راجہ کرہ کمایوں۔ کیفیت تردد فصل ربیع۔ کیفیت تردد نیشکر۔ کیفیت تردد شالی۔ کیفیت تردد ترن وغیرہ۔ نام ہر یک فصل کا جو ضلع اعظم گڈھ اور جونپور میں کھیتے ہیں۔ احوال پیدائش و تخم ریزی اجناس ضلع اعظم گڈھ۔ احوال پیدائش نمک ہر قسم اضلاع ہندوستان۔ کیفیت رتھ کی کیفیت چھکڑہ کی۔ کیفیت شرح گاڑی۔ کیفیت بہلی۔ کیفیت ڈھولو۔ نام آلات تیہ و جوا۔ کیفیت تورش۔ کیفیت اسم نویسی کا، مع شرح
۱۱۳۔ ہنتری نام نبرا۔ منتخب از کتاب باچنپو بوتلمون۔
۱۱۴۔ تاریخ ممتاز از واجد علی شاہ ۱۸۵۹ء
۱۱۵۔ شکرہ فرنگ از سید جلال الدین حیدر خان ۱۸۹۰ء۔

بلوم ہارٹ کی فہرست کے علاوہ کتب خانہ میں مندرجہ ذیل اور مخطوطات ہیں جن کی فہرست ابھی شائع نہیں ہوئی

۱۔ قصہ ملی تیراں جہانگیر (منظوم) ۱۷۹۰ء
۲۔ بیاض اشعار ۱۸۰۹ء

۳۔ مجموعہ نعت از محمد باقر آگاہ دکنی۔
۴۔ محبوب القلوب (منظوم) از محمد باقر آگاہ ۔
۱۸۵۷ء۔
۵۔ تحفۃ الاحباب (منظوم) از محمد باقر آگاہ ۱۸۴۴ء
۶۔ ریاض الجنان از محمد باقر آگاہ ۱۸۵۷ء۔
۷۔ راحت جان از محمد باقر آگاہ ۱۸۶۱ء حسن
دریں من جیرون (نقص) از زردینی ۱۸۵۷ء
۸۔ گنج قدرت (نظم) از عزیز الدین فقی ۱۸۳۰ء
۹۔ مخلص الجواہر
۱۰۔ چار گلشن (منظوم) از بیر نرشاد ۱۷۷۲ء
۱۱۔ سحر البیان (مصور) از غلام حسن۔
۱۲۔ قصہ شیخ الشمس حصہ دوم (مصور) ۱۸۲۱ء
۱۳۔ روضۃ الصالحین از غلام حسن ۱۸۰۰ء
۱۴۔ ایڈورڈ ہفتم کی تخت نشینی پر ایک نظم از کنور درگا پرشاد۔
۱۵۔ جنگ نامہ
۱۶۔ مثنوی حسن علی
۱۷۔ تفسیر ہندی از عبد الصمد بن نواب شکوہ الملک ناصر الدولہ عبد الوہاب نصرت جنگ۔
۱۸۔ دیوان واجد علی شاہ
۱۹۔ عہد نامہ جدید NEW TESTAMENT
۱۸۳۸ء
۲۰۔ فیاض القوانین مع مقدمہ از عبد السلام خان بھوپالی ۱۹۵
۲۱۔ طوطی نامہ از غواصی (مصور) ۱۷۳۷ء
۲۲۔ گلشن عشق از نصرتی۔
۲۳۔ غالب کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے چار خطوط ۱۸۶۶ء
۲۴۔ طوطا کہانی از حیدر بخش حیدری ۱۸۳۲ء
۲۵۔ سحر البیان (مصور) ۱۸۰۰ء
۲۶۔ خطوط از سردار پرتاپ سنگھ۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے کتب خانے میں اردو کے ۱۴ مخطوطات ہیں جن کی فہرست JOURNAL نے SIRRINGTON OF THE ROYAL ASIATIC SOCIETY کے ۱۹۰۰ء کے شمارے میں شائع کی تھی۔ اس میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل تھیں :-

۱۔ "سماد پوتھی" از بھوانی داس
۲۔ "شگرف نامہ ولایت" از اعتصام الدین۔ یہ ۱۱۸۱ء کی لکھی ہوئی ہے اور اس میں مصنف نے اپنے یورپ کے سفر کا ذکر کیا ہے۔
۳۔ "رسالہ کائنات" از تحسین علی خان اشک
۴۔ "روضۃ الشہدا" از ولی۔ یہ نسخہ ۱۱۸۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔
۵۔ "جنگ نامہ ٹیپو سلطان" یہ ۱۲۲۰ھ ۱۸۰۵ء کا لکھا ہوا ہے۔
۶۔ کلیات سودا ۔
۸۔ گلشن عشق از نصرتی کا ۱۱۶۴ھ ۱۷۵۰ء کا نسخہ۔
۱۰۔ "گلشن ہند" از مرزا لطف علی تک۔ یہ نسخہ ۱۲۵۵ھ ۱۸۳۹ء کا لکھا ہوا ہے۔
۱۳،۱۲۔ قصہ چہار درویش کے دو نسخے جن میں سے ایک ۱۸۰۲ء کا اور دوسرا ۱۹ویں صدی کا لکھا ہوا ہے۔
۱۴۔ "گلزار چین" کا ایک نسخہ
اس کے علاوہ مثنوی پھول بن از ابن نشاطی ۱۱۶۴ھ ۱۷۵۰ء کا ایک نسخہ بھی اس کتب خانہ میں موجود ہے۔

سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز لندن میں اردو کے مندرجہ ذیل مخطوطات ہیں۔

۱۔ "رسالہ دلکش" از علی اکبر رضوی ۱۹ویں صدی یہ پرندوں کی تربیت اور دیکھ بھال کے متعلق ہے۔
۲۔ ایضاً۔ نامکمل۔ ۱۹ویں صدی
۳۔ "منتخب اسرار الافغانی" از امان اللہ دیوانہ ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ء حیات شاہ نام سلیمانی۔
۴۔ "باغ و بہار" از میر امن۔ ۱۹ویں صدی

Harlav, A.R.
The Indian Khayyam, being a free rendering of the Indian poet Mirza Ghalib's odes, Rubaiyat and verses in English-- 1940.

۶۔ انجیل مقدس از ہنری مارٹن
۷۔ الا نبیہ از بن عجب ۲۰ لی صرف و نحو۔ ۱۹ویں صدی۔
۸۔ داستان امیر حمزہ۔ نامکمل۔
۹۔ انشائے ہری کرن از ہری کرن ولد منتظر داس خانی۔ ۱۸ویں صدی۔
۱۰۔ ہندی کہانیوں کا مجموعہ۔ مرہٹی سے اردو ترجمہ از جے ہورنر (J. HORNER) بمبئی ۱۹۰۸ء
۱۱۔ مذہب عشق از عزت اللہ بنگالی۔ اردو ترجمہ از نہال چند لاہوری۔ ۱۹ویں صدی۔
۱۲۔ لباس تقویٰ۔ آخر میں سید احمد شہید کی زندگی کے حالات درج ہیں۔ ۱۹ویں صدی۔
۱۳۔ سحر البیان از میر حسن مصور۔ ۱۸ویں صدی
۱۴۔ حکایت مرزا اور کلو۔ ۱۹ویں صدی۔
۱۵۔ کبوتر نامہ از محمد حسین رامپوری ۱۸۸۲ء
۱۶۔ سیر الہند و گلگشت دکن از منشی محمد قادر خان ۱۹ویں صدی۔
۱۷۔ منتخب دیوان سودا۔ کلکتہ ۱۸۰۲ء
۱۸۔ تاریخ قطب شاہی یا تاریخ قادری از منشی

محمد نادر خان۔ ۱۹ ویں صدی۔

۱۹۔ اردو صرف ونحو۔ ۱۹ ویں صدی۔

بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں اردو کے ۴۳ مخطوطات ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل ۲۳ مخطوطات ایتھے (۸) نے اپنی فہرست میں شامل کئے تھے۔ باقی کی فہرست ابھی مکمل نہیں ہوئی۔

۱۔ "دیوان قدرت" (شیخ قدرت اللہ دہلوی، ۱۲۳۰ھ ۲۴۔۱۸۲۳ء)

۲۔ دیوان میر درد ۱۲۳۰ھ ۲۴-۱۸۲۳ء

۳۔ دیوان محبت (نواب محبت اللہ خان ع خیر جنگ)

۴۔ دیوان ولی۔

۵۔ ایضاً۔

۶۔ کلیات سودا۔

۷۔ دیوان سودا۔

۸۔ دیوان فغاں (اشرف علی خان دہلوی)

۹۔ دیوان تاباں (عبدالحی دہلوی) ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۴ء۔

۱۰۔ دیوان رونق (میر غلام حیدر خان) ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۴ء۔

۱۱۔ بیاض اشعار

۱۲۔ تاریخ مختصر عہد قدیم۔

۱۳۔ قصص الانبیاء۔ ترجمہ از عبدالصمد عبدالوہاب خان بن نصرت جنگ۔

۱۴۔ انوار سہیلی۔ مترجم نامعلوم

۱۵۔ ایضاً۔ حرف تمہید کا کچھ حصہ۔

۱۶۔ انتخاب از انوار سہیلی مع اشعار سودا۔

۱۷۔ "نوطرز مرصع" ترجمہ از میر محمد حسین عطا خان تحسین۔

۱۸۔ ایضاً۔

۱۹۔ "قصہ چہار درویش" ترجمہ از یوسف ۱۷۷۶ء

۲۰۔ "باغ و بہار" از میر امن دہلوی۔

۲۱۔ "جذب عشق" از میر تقی شاہ یا میر حسین حقیقت

۲۲۔ "مذہب عشق" از نہال چند لاہوری

۲۳۔ "تاریخ سلاطین غوری" نامکمل

۲۴۔ "گلشن عشق" از نصرتی۔ نامکمل۔

۲۵۔ "مثنوی بدر منیر" از میر غلام حسن دہلوی۔

۲۶۔ "مثنوی گلزار عشق" از مولوی محمد باقر

۲۷۔ "قصہ حسن" از مولوی فیض الکریم۔

۲۸۔ ساقی نامہ

۲۹۔ نکات العارفین از صادق

۳۰۔ اردو فارسی لغت منظوم

۳۱۔ خالق باری

۳۲۔ صرف اردو

۳۳۔ اردو انگریزی لغت

۳۴۔ اردو صرف ونحو (انگریزی میں) از سے سی ۱۷۷۰ء

۳۵۔ اردو فارسی الفاظ۔

۳۶۔ مصدر نامہ

۳۷۔ عہد نامہ (انجیل مقدس) نامکمل

۳۸۔ تعلیم خدا سے خالق کی

۳۹۔ رسالہ موسیقی از جانا بیگم ۱۰۷۷ھ ۱۶۶۷ء

۴۰۔ نسب نامہ زمینداران ضلع رنگ پور ۱۷۸۶ء

۴۱۔ رقم کی ادائیگی کے متعلق دو رسیدیں۔

۴۲۔ ایک خط۔ مکتوب و مکتوب الیہ نامعلوم

۴۳۔ کہانیوں کا مجموعہ گجراتی رسم الخط میں۔

کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانوں میں ۷۲ مخطوطات ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل ۶۵ مخطوطات ایڈورڈ براؤن نے اپنی فہرست (۹) میں درج کئے تھے باقی چھ کی فہرست کتب خانہ میں موجود ہے۔

۱۔ اسرار محبت از محبت خان

۲۔ باغ و بہار از میر امن دہلوی۔

۳۔ مثنوی برزن لا مع

۴۔ پدماوت۔ منظوم ترجمہ از غلام علی مشہدی و ضیاء الدین۔

۵۔ ایضاً

۶۔ پربودھ ناٹک مع ہدایت المخلق

۷۔ پندنامہ از حاجی ولی۔ منظوم

۸۔ پوتھی بہارتی، پوتھی چترادلی، سب سیا از فاضل علی۔

۹۔ تذکرہ مختصر در حال ریختہ گویان ہند از محمد صدر الدین۔ نامکمل۔

۱۰۔ تواریخ نسب نامہ قدیم ۲۸-۱۸۲۷ء

۱۱۔ داستان بے نظیر یا داستان بینظیر شاہزادہ وملک آفتاب و بدر منیر از میر حسن۔

۱۲۔ ایضاً مصور۔

۱۳۔ دیوان آتش

۱۴۔ دیوان آبرو

۱۵۔ دیوان حسرت

۱۶۔ دیوان درد

۱۷۔ دیوان رضا

۱۸۔ دیوان سودا۔

۱۹۔ دیوان گویا (فقیر محمد خان)

۲۰۔ دیوان مصحفی

۲۱۔ دیوان میر تقی میر

۲۲۔ دیوان ناسخ

۲۳۔ دیوان نصائح از امام بخش نصائح (؟)

۲۴۔ دیوان نصیر

۲۵۔ دیوان ولی۔ تین نسخے

۲۶۔ دو اوین منتخبہ ہندیہ (یقین۔ سودا نعیم)
۲۷۔ داماتن۔ نثر
۲۸۔ داماتن منظوم
۲۹۔ رتنک پریاں۔ مصور
۳۰۔ سحرالبیان از میر حسن
۳۱۔ مسند رسنگار ۱۷۲۰ء
۳۲۔ مہس دس از بکھشو ناٹک
۳۳۔ طوطی کہانی ۱۲۴۵ھ ۱۸۲۹ء
۳۴۔ جغرافیات خورشید۔ ۱۲۵۱ھ ۱۸۳۵ء
۳۵۔ فسانہ عجائب
۳۶۔ قصیدہ جات صدر دیوان عدالت ممالک
مغربی ۱۸۴۰ء
۳۷۔ دیوان ولی
۳۸۔ قصہ اور شاہ اور حسن رخ بانو
۳۹۔ قصہ بدر منیر از مرزا حسن
۴۰۔ قصہ چہار درویش۔ دو نسخے
۴۱۔ ایضاً ترجمہ از میر محمد عطا حسین ۱۸۰۴ء
۴۲۔ قصہ سوداگر منظوم
۴۳۔ قصہ عاشق شدن شخصے بہ پسر زرگر منظوم
۴۴۔ قصہ گل بکاؤلی یا صنم نامہ گرداب یا اڑدتے
خیالی۔
۴۵۔ کلیات نثار (میر عبدالقاسم) ۱۲۱۵ھ
۱۸۰۰ء
۴۶۔ تذکرہ گلزار ابراہیم از علی ابراہیم خان
۴۷۔ لیلیٰ و مجنوں (منظوم) از محمد تقی علی خان
ہوس ۱۲۴۸ھ ۱۸۳۲ء
۴۸۔ ایضاً
۴۹۔ لیلیٰ و مجنوں (منظوم) از میر تجلی ۱۲۲۸ھ
۱۸۱۳ء
۵۰۔ لیلیٰ و مجنوں (منظوم) از عزیز ۱۲۴۰ھ
۱۸۲۴ء
۵۱۔ قصہ سوداگر منظوم از ضمیر ۱۲۴۳ھ
۱۸۲۷ء
۵۲۔ مثنوی مرزا لطیف ۱۲۵۱ھ ۱۸۳۵ء
۵۳۔ مثنوی مصحفی ۱۲۲۳ھ ۱۸۰۷ء
۵۴۔ مثنوی ملکہ سیم تن
۵۵۔ مثنوی میر حسن ۱۸۱۴ء
۵۶۔ ایضاً
۵۷۔ نو طرز مرصع
۵۸۔ داسوخت سودا ۱۲۵۱ھ ۱۸۳۵ء
۵۹۔ تذکرۂ شعرا۔ نامعلوم
۶۰۔ ایضاً
۶۱۔ بیاض اشعار۔ چار نسخے
۶۲۔ مثنوی شیخ جمال الدین ۱۸۱۵ء
۶۳۔ بیاض مراثی
۶۴۔ مجموعہ فارسی و اردو الفاظ
۶۵۔ مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال۔ دو نسخے
ان کے علاوہ آربری (۱۰) کی فہرست میں
ایک اور مخطوطہ درج ہے جس میں مندرجہ ذیل
کتب شامل ہیں۔
۱۔ رازق باری از اسماعیل
۲۔ کتاب حساب
۳۔ تاریخ مرہٹہ
JOHN RYLANDS LIBRARY
مانچسٹر میں اردو کے ۲۴ مخطوطات موجود ہیں
جن میں صرف ۲۰ کی فہرست دستیاب ہو سکی ہے۔
۱۔ ترجمہ بھگوت پران ۱۷۰۰ء
۲۔ کلیات سودا ۱۸۰۰ء
۳۔ مکتوبات جعفر زٹلی ۱۷۶۰ء
۴۔ اصول نغمات۔ فن موسیقی
۵۔ کلیات جرأت ۱۲۴۲ھ ۱۸۲۶ء
۶۔ دیوان ناسخ
۷۔ مثنوی بحرالحقیقت از مولوی محمد حسن ۱۲۵۶ھ
۱۸۴۰ء
۸۔ تواریخ آگرہ مصور ۱۸۳۵ء
۹۔ مکتوبات جعفر زٹلی ۱۷۷۰ء
۱۰۔ قصہ کامروپ (منظوم) از تحسین
۱۱۔ قصہ چندر بدن از عیشی
۱۲۔ مسند رسنگار (منظوم) از شاہ علی گجراتی
۱۷۱۹ء
۱۳۔ عمارات دہلی ۱۸۵۴ء
۱۴۔ حالات کمال تبریزی شاہ اور سلطان محمد تغلق
۱۵۔ فرس نامہ از سعادت یار خان رنگین ۱۷۹۵ء
۱۶۔ صنم کدۂ چین از سید حسین شاہ حقیقت
۱۸۹۱ء
۱۷۔ راگ مالا مصور
۱۸۔ بارہ ماسہ از کاظم علی جوان ۱۸۰۲ء
۱۹۔ کلیات سودا۔ ۱۹ ویں صدی
۲۰۔ دیوان ولی ۱۲۲۳ھ ۱۸۰۸ء
انڈیا آفس کالج میں اردو کے مندرجہ ذیل مخطوطات
موجود ہیں ان کی فہرست مارگولیتھ (۱۱) نے
۱۹۰۴ء میں شائع کی تھی۔
۱۔ انوار سہیلی۔
۲۔ قصہ چہار درویش از میر محمد حسین عطا خان
۳۔ کلیات سودا۔
۴۔ قصہ مدھونل از شیخ حلیم اکبرآبادی ۱۱۲۰ھ
۱۷۰۵ء
۵۔ گن ساگر (نظم) ۱۱۲۰ھ
اڈنبرہ کے یونیورسٹی کالج کے مخطوطات کی فہرست
[illegible]

جس میں اردو کے مندرجہ ذیل مخطوطات شامل ہیں۔

۱۔ دیوان سودا
۲۔ کلیات سودا
۳۔ قصہ بی بی مریم
۴۔ دو مجلس
۵۔ بحر العلم (منظوم) از تعظیم الدین
۶۔ قصہ لعل و گوہر از عارف الدین عاجز۔ ۱۱۸۷ھ ۱۷۷۳ء
۷۔ لیلیٰ و مجنوں۔ از عاجز (ملک مصر زالا)
۸۔ جنگ ذخوم (منظوم) اردو ترجمہ
۹۔ قصہ ملک مصر از عاجز
۱۰۔ وفات نامہ محمد مصطفےٰ از میر
۱۱۔ حکایات عرب از بیر (منظوم)
۱۲۔ شکستلا از کاظم علی جوان
۱۳۔ اخلاق ہندی از میر بہادر علی
۱۴۔ جنبات پر ایک کتاب نام نامعلوم ۱۸۳۰ء
۱۵۔ محاورات اردو از M. BINNING

اڈنبرہ یونیورسٹی کے کتب خانہ (۱۳) میں اردو کے مندرجہ ذیل مخطوطات موجود ہیں۔

۱۔ مثنوی چندر بدن و مہیار از مقیمی ۱۱۴۳ھ ۱۷۳۰ء
۲۔ دیوان ولی ۱۱۴۳ھ ۱۷۳۰ء
۳۔ بیاض مراثی: ولی۔ رضی۔ روحی۔ امامی شاہی کاظم۔ مرزا وغیرہ
۴۔ حکایات لطیف
۵۔ فالنامہ شیخ یحییٰ آنکہ ہندی ۱۰۶۶ھ ۱۶۵۵ء
۶۔ سرگزشت راجہ جیت اعظم گڑھ ۱۲۸۹ھ ۱۰۶۲ء
۷۔ مراۃ الشعرا ۱۱۹۳ھ ۱۷۷۹ء دو جلدیں

۸۔ حکایات متفرقہ مع حالات کلکتہ و مُنگیر و غزلیات سودا۔

NATIONAL LIBRARY OF WALES میں قادری کے طوطی نامہ کا ایک نامکمل نسخہ موجود ہے۔

NATIONAL LIBRARY OF SCOTLAND میں عشق نامہ نونہال و گل بدن (مصور) کا ایک نسخہ موجود ہے۔

HERT FORD COLLEGE کے کتب خانے میں اردو کے دو مخطوطات اور UNIVERSITY OF LEEDS کے DEPARTMENT OF SEMITIC LANGUAGE AND LITERATURE کے کتب خانے میں بھی اردو کے چند مخطوطات موجود ہیں جن کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔ ان کے علاوہ اس ملک کے کئی ایک دوسرے کتب خانوں میں اردو کے کئی ایک نسخے موجود ہوں گے جن کو ابھی تک کسی نے دریافت نہیں کیا۔

REFERENCES

1. Stewart, Charles. Descriptive Catalogs of the Oriental Library of the Lte Tipoo Sulten of Mysore Cambridge, University Press, 1809.
2. Mandelslo's travels (English Version Published as an appendix to the Voyages and travels of the Ambassadors, London, 1662 pp 48.
3. India Public consultations: IOR: p/18/57, 10th September 1858 No. 42
4. Ethe, Hermann. Catalogue of Per persian manuscripts in the Library of the India Office, London, India Office Library 1903 2 Vols.
5. Ross, E. Denison, and Browne. E.G. Catalogue of two collections of Persian and Arabic manuscripts... India office Library, London, Eyre & Spottiswoode 1902.
5. A catalogue of Arabic manuscripts in the India Office Vol.1, Otto Loth. London 1877. Vol.II part 1, Quranic Literature by C.A. Storey. London 1930 Vol II

— 3 —

part III: Sufism and Mystics by, A.J. Arberry, London, 1936. Vol.II, Part III: Fiqh I, R.Levy. London, 1936 Vol.II part IV: Kalam, by R. Levy. London 1940.

7. Blumelerdt, J.F. Catalogue of the Hindi Panjabi and Hindustani manuscripts in the library of the British Museum. London, 1899.
8. Ethe, Hermann Catalogue of the Persian Turkish, Hindustani and Pushto manuscripts in the Bodleian Library Pt.II, Oxford, Clarendon Press, 1930.
9. Browne, Edward G. A supplementary handlist of the Muhammadan manuscripts preserved in the Library of the University and Colleges of Cambridge, Cambridge C.U.P., 1922.
10. Arberry, A.J. A second supplementary hand list of the Muhammadan manuscripts in the University and Colleges of Cambridge, Cambridge., 1952.
11. Margoliouth, D.S. Catalogue of the Oriental manuscripts in the Library of Eton College Oxford 1904.
12. Serjeant, R.B. A handlist of the Arabic, Persian and Hindustani manuscripts of New College, Edinburgh. London 1942
13. Ashraful Huk, Hermann Ethe, & E. Robertson, Descriptive catalogue of the Arabic and Persian manuscripts in Edinburgh University Library Edinburgh, 1925.
14. Ethe, H. Catalogue of Oriental manuscripts Persian abd Hindustani (in the National Library of Wales) Aberystwyth, 1916.

(روزنامہ قومی آواز دہلی ۱۹۸۲ء)

ملک کی تمام اہم زبانوں سے اردو کے کئی روزنامے شائع ہوتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان اخبارات میں اردو کی نئی مطبوعات پر تبصرہ نہیں ہوتا اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مصنفین اور ناشرین اخبارات کو اپنی مطبوعات بھجوانا ضروری نہیں سمجھتے اگر کتابوں پر تبصرہ کا دائرہ وسیع ہو تو یقیناً کتابوں کی نکاسی اور فروخت میں مدد ملے گی۔ (عابد علی خاں) ایڈیٹر روزنامہ سیاست حیدرآباد

ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی

جرمنی میں اردو مخطوطات

جرمنی کے متعدد سرکاری اور نیم سرکاری کتب خانوں میوزیموں اور بعض حضرات کے ذاتی کتب خانوں میں پچاس ہزار سے زیادہ اورینٹل مخطوطات محفوظ ہیں۔ اٹھارویں صدی کے آغاز تک ان قلمی نسخوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی لیکن گزشتہ دو صدیوں کے دوران اورینٹل مخطوطات کی خریداری پر خصوصی توجہ کی گئی اور نتیجے کے طور پر مخطوطات کا بڑا ذخیرہ مشرقی ممالک سے منتقل ہوکر جرمنی پہنچ گیا۔ یوں تو یہ مخطوطات جرمنی کی اکثر قدیم درس گاہوں کے کتب خانوں میں بکھرے مل جاتے ہیں مگر برلن کے قدیم کتب خانے Preussische Staatsbibliothek یا پروشین اسٹیٹ لائبریری اور میونخ کی Bayerische Staatsbibliothek یا بویرین اسٹیٹ لائبریری میں ان کا بڑا حصہ محفوظ ہے۔ ان میں سے بیشتر مخطوطات کا موضوع مشرقی زبانیں، ادبیات، مذہبی علوم، علم تاریخ اور فنون لطیفہ ہے۔ ان مخطوطات کی معنوی اہمیت میں کلام نہیں مگر ان کی صوری خصوصیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ ان میں سے بعض مخطوطات کی جلدیں اور پٹھے فن جلد سازی کا اعلا نمونہ ہیں۔ ان جلدوں کی حسین ساخت، دیدہ زیب گلکاری اور رنگین نقش ونگار دیکھ کر چشم ما روشن، دل ما شاد کہنے کو جی چاہتا ہے اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ ان مخطوطات میں استعمال شدہ طرح طرح کا کاغذ، قسم قسم کی خطاطی کے نمونے، منقش وطلا آغاز واختتام اور حد درجہ جاذب نظر تصویریں مصوری کے اعلا شاہکار، دیکھ کر مانی و بہزاد کی یاد تازہ ہونے لگتی ہے۔

اچھا آئیے اب مشرقی مخطوطات کی دنیا ے رنگ وبو سے نکل کر ان کی حقیقی دنیا میں داخل ہوں اور یہ دیکھیں کہ اخوفاتی جمہوریہ جرمنی میں ان قلمی نسخوں کا مصرف کیا ہے! دولت کا اگر صحیح استعمال نہ کیا جائے تو بجائے خود یہ گھٹنے لگتی ہے۔ اسی طرح مخطوطات کو اگر محض ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو ان میں دیمک لگنے لگتی ہے، جس طرح دولت کی جانچ پڑتال کے لیے سرکاری پیمانے مقرر ہیں اسی طرح مخطوطات کو علمی دنیا سے متعارف کرانے کے لیے ان کی وضاحتی فہرستیں مرتب کرنا ضروری ہے۔ برصغیر ہند و پاکستان میں وضاحتی فہرستیں مرتب کرنے کا کام ابھی ابتدائی منزل میں ہے۔ مگر جرمنی میں یہ کام انیسویں صدی کے اوائل ہی شروع کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۲۰ء اور ۱۹۱۰ء کی درمیانی مدت میں برلن، گوٹے نگن، گوتھا، لائپزگ، ہالے، میونخ، اور ٹیوبن گن سے متعدد وضاحتی فہرستیں شائع کی گئیں۔ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیان پہلی جنگ عظیم اور دوسرے ناگزیر حالات کی وجہ سے یہ کام آگے نہ بڑھ سکا۔ مگر ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۴ء کی درمیانی مدت میں سنسکرت، عربی، فارسی اور ترکی مخطوطات کی متعدد فہرستیں مرتب کرکے شائع کی گئیں۔ دوسری جنگ عظیم نے اس اہم کام کو ایک بار پھر روک دیا اور ۱۹۵۸ء تک اس میدان میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہ کیا جا سکا۔ بالآخر ۱۹۵۸ء میں Deutsche Morgenländische Gesellschaft یعنی علوم شرقیہ کی انجمن المانی اور Deutsche Forschungsgemeinschaft یعنی جرمن ریسرچ کاؤنسل کے ایما پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں از سر نو مرتب کرائی جائیں جن کا ذکر سابقہ فہرستوں میں نہیں کیا جا سکا ہے۔ اس طرح کے غیر مبینہ مخطوطات کی تعداد چھ دہ ہزار تک پہنچ جاتی ہے جن کا تعلق مشرقی ممالک کی اکیس مختلف زبانوں سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے مذکورہ زبانوں کے ماہرین مخطوطات کے ساتھ ساتھ ایک ایسے ادارے کی تشکیل بھی ضروری تھی جس کے زیر اہتمام توضیحی فہرستیں تیار کرنے کا کام باقاعدگی سے کرایا جا سکتا۔ چنانچہ ۱۹۵۸ء میں DFG اور جرمن ریسرچ کاؤنسل کے زیر اہتمام جرمنی میں ایک نئے ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا نام Verzeichnis der orientalischen Handschriften in Deutschland یعنی جرمنی میں مشرقی مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں مرتب کرنے کا ادارہ۔ طویل مدت تک اس ادارے کی نظامت اعلا کے فرائض Dr. W. Voigt انجام دیتے رہے جنھوں نے مختلف زبانوں کے مخطوطات کی متعدد وضاحتی فہرستیں شائع کرائیں۔ ان ہی شائع شدہ وضاحتی فہرستوں میں پچیسویں فہرست اردو مخطوطات سے متعلق تھی جو ۱۹۷۲ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہے۔ اس فہرست میں اردو کے ۵۹ مفرد اور ۵ مرکب مخطوطات کی وضاحت کی گئی ہے جن کی کل تعداد ۱۰۸ تک پہنچ جاتی ہے۔ اردو زبان کے یہ مخطوطات اپنی جنم بھومی کو چھوڑ کر یہاں کب پہنچے، کیسے پہنچے، ان کی علمی نوعیت کیا ہے، قدامت کے اعتبار سے مخطوطات کتنے پرانے ہیں اور علمی وتحقیقی نقطہ نظر سے ان کی کیا اہمیت ہے یہ اور اسی قسم کے دوسرے سوالات ہیں جن کے جواب ایک ہی نشست میں دینا کچھ آسان کام نہیں۔ بہرحال سب سے پہلے یہ سنیے کہ یہ مخطوطات ملے کیسے؟

اردو زبان کے یہ مختلف النوع مخطوطات قریب قریب دو سو سال سے جرمن کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس طویل مدت میں دنیا نے نہ جانے کتنی انقلابی کروٹیں بدلیں مگر یہ مخطوطات گوشۂ گمنامی سے نکل کر منظر عام پر نہ آسکے۔ برصغیر ہند و پاکستان کے ان علمی شہ پاروں نے اپنی جلاوطنی کے زمانے میں جرمن ریاستوں کے عروج وزوال کے ساتھ ساتھ دو عالمی جنگوں کی ہولناک تباہیاں دیکھیں، محفوظ جگہ کی تلاش میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں نقل مکانی کی مصیبتیں بھی سہیں، برلن کے شاہی کتب خانے سے خانہ بدر ہوکر کسی کلیسا کی زینت بنا بھی ان کے مقدر میں تھا مگر کسی اللہ کے بندے کو یہ توفیق نہ ہوسکی کہ ان مخطوطات کا چرچا علمی حلقوں میں کرسکتا اور یہ ممکن بھی کیسے تھا جب کہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے جرمنی میں نہ تو اردو زبان کے نام سے کوئی واقف تھا اور نہ اردو زبان کی تعلیم وتدریس اور تحقیق وتفتیش کے کاموں پر اتنی توجہ صرف کی جاتی تھی جتنی اب کی جا رہی ہے۔ جرمن مستشرقین کی دلچسپی کا اصل مرکز سنسکرت یا عربی و فارسی زبانیں اور ان سے متعلق علوم تھے۔ بالفاظ دیگر اردو کو جرمن درس گاہوں میں اصلی مضمون کی حیثیت سے نہ کوئی اہمیت حاصل تھی اور نہ اس سے کوئی دلچسپی لیتا تھا۔ بنت ۱۹۶۱ء سے یہ امتیاز ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے ساؤتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ کو حاصل ہے کہ یہاں ساؤتھ ایشیائی ممالک کی جدید زبانوں کی تدریس کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام بھی موجود ہے ۱۹۶۲ء میں اس انسٹی ٹیوٹ میں کام شروع کرنے کے بعد مجھے اس بات کی فکر پیدا ہوئی کہ جرمن کتب خانوں میں محفوظ شدہ اردو اور فارسی مخطوطات کا مطالعہ کیا جائے۔ سب سے پہلے میں نے ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانے کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ یہاں سے مجھے غیر متوقع طور پر پانچ اردو مخطوطے مل گئے۔ اس کے بعد مجھے ماربرگ جانے کا اتفاق ہوا جہاں کی اسٹیٹ لائبریری میں فارسی و عربی کا بڑا اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ اس مطالعہ کے دوران مجھے یہاں سے مزید پانچ مخطوطے مل گئے۔ ان دس اردو مخطوطات کی دریافت کے ایک سال بعد میں نے ٹیوبن گن کا سفر اختیار کیا جہاں کی یونیورسٹی لائبریری میں جنگ کے دوران برلن کے شاہی کتب خانے کے بیشتر مخطوطات منتقل کر دیے گئے تھے۔ تین ہفتے کی تلاش شاقہ کے بعد خوش قسمتی سے یہاں سے بھی اردو کے اٹھائیس قلمی نسخے دست یاب ہوگئے جو عربی اور فارسی کے ہزاروں مخطوطات کے ساتھ کچھ اس طرح مدفون تھے کہ ان کو ڈھونڈ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ بات یہ تھی کہ بعض اردو مخطوطات پر فارسی مخطوطات کا گمان کرکے انھیں فارسی مخطوطات کے ساتھ مجلد کر دیا گیا تھا اس لیے تمام فارسی مخطوطات کا جائزہ لینا ناگزیر تھا۔ اردو مخطوطات کی غیر متوقع دریافت سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے اپنی تلاش وجستجو کی مہم کو جاری رکھنا چاہیے چنانچہ سٹوٹ گارٹ، میونخ، کولون اور برلن کے کتب خانوں سے مجھے مزید اردو مخطوطات کی نشاندہی ہوئی اور ان کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ ۳۱ جولائی سے ۲۹ جولائی ۱۹۶۵ء کے دوران جرمنی کے ایک قدیم شہر ورتس برگ (Würzburg) میں جب جرمن مستشرقین کا سترھواں اجلاس منعقد ہوا تو مجھے اردو کے ۴۸ دریافت شدہ مخطوطات کے بارے میں ایک تعارفی روداد پیش کرنے کا موقع ملا۔ اس روداد کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا اور قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند کے مصداق اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کرنے کا کام میرے سپرد کر دیا گیا۔

معزز خواتین وحضرات! بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے موضوع سے کچھ ہٹ گیا مگر میری یہ گریز دانستہ تھی تاکہ ایک طرف میں اپنے موضوع کی خشکی کو کچھ کم کرسکوں تو دوسری طرف مخطوطات کی گوناگوں دنیا سے متعارف کرانے کے لیے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرسکوں۔ اچھا تو آئیے سب سے پہلے اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ اردو کے ان مخطوطات کی نوعیت کیا ہے؟ اگر ہم ان مخطوطات کو موضوع کے اعتبار سے تقسیم کرنا چاہیں تو یہ تقسیم کچھ اس طرح ہوگی: مذہبی مخطوطات، ۸، سوانح ۶، ۹ ... ۳، اردو شعرا کے تذکرے، ۵، جغرافیائی تاریخ: ۱، لسانیات اور قواعد سے متعلق مخطوطات، ۴، قصے کہانیاں، ۶، ہندی مخطوطات، ۸، شعرائے متقدمین کے کلیات ودواوین اور شاعری پر مشتمل مخطوطات ۲۳، متفرق مخطوطات: ۸۔ اگر ہم ان مخطوطات کو صنف نظم اور صنف نثر کے خانوں میں تقسیم کرنا چاہیں تو حسن اتفاق سے دونوں اصناف کے مخطوطات کی تعداد قریب قریب برابر نکلے گی۔ لسانی نقطۂ نظر سے ان میں سے بیشتر مخطوطات کی زبان بلا شبہ اردوئے معلیٰ ہے مگر بعض مخطوطات سے دکنی، برج اور اودھی بولیوں کی نشاندہی بھی ہوتی ہے کہ جن کے بغیر اردو زبان کی تشکیل وارتقا میں وہ لوچ، لچک اور رس پیدا نہ ہوسکتا جو اس کا مخصوص مزاج بن گیا ہے۔ فن کتابت وخطاطی کے نقطۂ نظر سے ان میں سے اکثر وبیشتر مخطوطات نستعلیق میں قلم بند کیے گئے ہیں مگر کہیں کہیں نسخی طرز تحریر بھی مل جاتا ہے۔ ان میں سے بعض مخطوطات بہ پختہ، پاکیزہ اور جاذب نظر نستعلیق نظر آئے گا تو بعض بہت ہی شکستہ اور عام خط۔ صرف دو مخطوطے ایسے ہیں جن میں اردو اور دیوناگری رسم الخط کا استعمال کیا گیا ہے۔ بعض مخطوطات کی جلدیں معمولی گتے کی بنی ہوتی ہیں تو بعض کی چرمی جلدوں پر طلائی نقش ونگار اور گلکاری کے نمونے بھی نظر آجاتے ہیں۔ ان مخطوطات میں دیسی اور ولایتی دونوں قسم کے کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔ قدامت کے اعتبار سے پیش نظر مجموعے میں سب سے قدیم مخطوطہ پدماوت کے مشہور ومعروف مصنف ملک محمد جائسی کی تصنیف کنہاوت یا کھناوت ہے جس کا واحد نسخہ یہاں موجود ہے ورنہ جہاں تک میرے علم میں ہے یورپ اور ہند و پاکستان کے تمام کتب خانے اس نسخے کی نشاندہی کرنے سے قاصر ہیں۔ اس نسخے کی تالیف تو شیر شاہی عہد کے لگ بھگ ہوئی ہوگی مگر اس کے ترقیمے سے پتا چلتا ہے کہ اس کی کتابت شاہجہانی عہد میں ۱۰۶۱ھ مطابق ۱۶۵۱ء میں بہ تمام تمت کی گئی۔ اس کے مقابلے میں اردو مخطوطات کے پیش نظر مجموعے میں سب سے کم عمر مخطوطے کا نام حکمنامۂ نوح ہے جو غالباً ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے عہد میں مرتب کیا گیا تھا۔

اردو مخطوطات کے بارے میں ان چند تمہیدی کلمات کے بعد ایک اہم پہلو کو اجاگر کرنا باقی رہ گیا ہے جس کے بغیر یہ تمہید تشنہ رہ جائے گی۔ اردو زبان کے یہ مخطوطات سات سمندر پار ہندوستان سے جرمنی کب اور کیسے پہنچے! اس سلسلہ میں مشہور جرمن مستشرق Dr. Aloys Sprenger کا نام سر فہرست ہے جن کی ذات اردو کے علمی حلقوں میں کسی تفصیلی تعارف کی محتاج نہیں۔ متعدد یورپی زبانوں کے علاوہ وہ سنسکرت، عربی، فارسی، عبرانی اور دیگر مشرقی علوم کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ اردو

(با ان حاصل کے لیے ...) ... سرپرست تھے۔ الغرض شپرنگر کی علمی خدمات پر روشنی ڈالنے کا یہ موقع نہیں ہے پھر بھی اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ زبان اردو کی ترقی و ترویج کی طرف اہل زبان اور مقامی علما کی کوششوں ہی کو دخل نہیں ہے بلکہ اس کے بنانے اور سنوارنے اور اسے علمی زبان کے درجے تک پہنچانے میں یورپی مستشرقین کا رسان دے تاسی، ڈاکٹر جان گلکرسٹ اور جرمن عالم آلوس اشپرنگر کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ ان مستشرقین نے اپنی اردو دلداری کی بدولت تاریخ زبان اردو میں مستقل جگہ حاصل کر لی ہے۔ اشپرنگر نے ۱۸۴۳ء سے ۱۸۵۴ء تک تمام ہندوستان کے دوران نہ صرف برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے طبی مشیر کی حیثیت سے کام کیا بلکہ مدرسۂ عالیہ اور دلی کالج میں مدرسی، دفتر کا ... فرائض انجام دیے۔ قران السعدین جیسے اخبار کا اجرا کرکے مشرق اور مغرب کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی۔ یورپی زبانوں سے آسان اور بامحاورہ اردو میں ترجمہ کرنے کی بنیاد ڈالی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لکھنؤ میں ۲ ماہ کے قیام میں دس ہزار عربی، فارسی، اردو، ہندی مخطوطات کا مطالعہ کرکے ایک ضخیم وضاحتی فہرست تیار کی جس کا پہلا حصہ انگریزی زبان میں

A catalogue of the Arabic, Persian and Hindustany manuscripts of the libraries of the King of Oudh.

کے نام سے ۱۸۵۴ء میں کلکتہ سے شائع کرکے اردو کی علمی دنیا میں بڑا نام حاصل کر لیا۔ اودھ کیٹلاگ میں یقیناً کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں جن کی طرف اردو کے بعض محققوں نے توجہ دلائی ہے پھر بھی یہ کیا کچھ کم کارنامہ ہے کہ ایک یورپی مستشرق نے ۲۲ ماہ کی قلیل مدت میں دس ہزار مخطوطات کا مطالعہ کرکے ایک ایسی علمی یادداشت مرتب کر دی جو شاہان اودھ کے کتب خانوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ ڈاکٹر اشپرنگر کو خود بھی مخطوطات جمع کرنے کا شوق تھا چنانچہ ۱۸۵۶ء میں جب وہ ہندوستان سے اپنے وطن جرمنی واپس لوٹے تو ان کے نجی کتب خانے میں عربی، فارسی اور اردو کے ۱۹۷۲ مخطوطات اور مطبوعات جمع ہو چکی تھیں جن کی ایک فہرست بنا کر انھوں نے جنوری ۱۸۵۷ء میں گیسن (Giessen) سے شائع کی۔ اس فہرست کا نام

A catalogue of the Bibliotheca Orientalis Sprengeriana

ہے جو اودھ کیٹلاگ کی طرح مشکل سے دستیاب ہوتی ہے۔ اس فہرست کا جائزہ لینے سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹۷۲ مخطوطات کے عنوانات میں سے ۱۳۵ ایسے ہیں جن کا تعلق اردو زبان وادب سے ہے پھر ان ۱۳۵ عنوانات میں سے بھی ۵۰ مخطوطات اور ۸۵ مطبوعات یا لیتھوگراف تھے۔ ڈاکٹر اشپرنگر اپنے اس ذخیرہ کو دیانا یا میونخ کے سرکاری کتب خانوں کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتے تھے مگر چوں کہ اس زمانے میں موصوف کا قیام ہائیڈل برگ کے نزدیک ایک چھوٹے سے خوب صورت شہر وائن ہائم (Weinheim) میں تھا۔ اس لیے برلن کے شاہی کتب خانے کے کارکنان نے اس علمی لین دین کے معاملے میں بڑی مستعدی کا اظہار کیا اور ڈاکٹر اشپرنگر کے نجی کتب خانے سے بیشتر مخطوطات کو خرید لیا یہی وجہ ہے کہ اشپرنگر کے ہندوستان سے لائے ہوئے اردو کے ۳۵ مخطوطات آج ہمیں برلن کے شاہی کتب خانے میں ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک مخطوطے کے سرورق پر ڈاکٹر اشپرنگر نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے کہ اس مخطوطے کو انھوں نے جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں سے مبلغ تین روپے میں خریدا۔ لیکن اس وقت نہ خریدنے والے کو اس کا علم تھا نہ بیچنے والے کو اس کا گمان کہ تین روپے کے عوض کس متاع بے بہا کا سودا ہو گیا! اشپرنگر کے علاوہ دیگر ذرائع سے بھی یہ مخطوطات برلن پہنچے۔ ہوتا یہ تھا کہ جب عیسائی مبلغین اور برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کے انگریز افسران سپاہی ہندوستان سے اپنی خدمات انجام دے کر اپنے وطن مالوف کو لوٹتے تھے تو مال غنیمت کے طور پر اردو مخطوطات بھی اپنے ساتھ لے آتے تھے۔ یہ انگریز افسر کسی مصلحت کی بنا پر ان قلمی کتابوں کو انگلستان لے جانے کے بجائے برلن کے مشہور و معروف شاہی کتب خانے کو منھ مانگے داموں میں فروخت کر دیا کرتے تھے اس طرح سے ایک پنتھ دو کاج کے مصداق ایک طرف انگریز افسروں کی جیبیں گرم ہو جاتی تھیں تو دوسری طرف ان کے برآمد کردہ مال غنیمت سے برلن کی Koenigliche Bibliothek یعنی شاہی کتب خانے کے علمی خزانوں میں بیش بہا اضافہ ہو جاتا تھا۔

ان ضروری گذارشات کے بعد خواتین و حضرات! میں اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتا ہوں اور آپ کی خدمت میں مشتے از خروارے چند اہم مخطوطات کا اجمالی خاکہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ میں اپنے بیان کو قرآن کریم کے ایک دیدہ زیب نسخے سے شروع کرتا ہوں جو ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانے میں نشان Cod. Trubner 15 کے تحت محفوظ ہے۔ اس نسخے کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قرآن مجید کے عربی متن کے ساتھ اس کا فارسی اور اردو ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے اور ایک خانہ اس غرض سے خالی چھوڑ دیا گیا ہے کہ انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ تحریر کیا جا سکے جو کسی وجہ سے تحریر نہ کیا جا سکا۔ قرآن مجید کا یہ نسخہ اصل میں ضلع فرخ آباد کے صدر امین سید ولی اللہ نے ۱۸۲۵ء میں ایک انگریز افسر مسٹر ولیم رائٹ (William Wright) کے ذاتی استعمال کے لیے مرتب کیا تھا جو ضلع فرخ آباد میں عرصۂ دراز تک سرکاری خدمات انجام دینے کے بعد واپس انگلستان چلا گیا تھا۔ اس نسخے میں ۳۲ × ۲۳ سینٹی میٹر کے ۵۱۲ اوراق جلی نسخ و نستعلیق میں سرخ و سیاہ روشنائی سے تحریر کیے گئے ہیں۔ قرآن مجید کے اس نسخے کی چرمی جلد بہت خوبصورت اور پائدار بنی ہوئی ہے۔ اس نسخے میں مندرجہ ایک عبارت سے پتا چلتا ہے کہ اس کام کو دو جلدوں میں مکمل ہونا چاہیے تھا مگر زیر بحث مخطوطہ اس کام کی پہلی جلد ہے جس میں قرآن کریم کا صرف نصف متن شامل ہے۔ دوسری جلد کہاں ہے اس کے بارے میں کوئی بات یقین سے کہنا مشکل ہے۔

دوسرے دو اہم مخطوطات جن کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ ہیں Old Testament اور New Testament کے ہندستانی ترجمے جو برلن کی Staatsbibliothek میں نشانات Ms. or. 161 اور Ms. or. 160 کے تحت محفوظ ہیں۔ موخرالذکر مخطوطے میں Grammatica Indostanica کے نام سے لاطینی زبان میں ہندستانی زبان کی ایک قواعد بھی موجود ہے۔ عزیز سامعین! اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ ہندستانی زبان کی پہلی قواعد مرتب کرنے کا سہرا کس کے سر ہے تو ہماری توجہ خود بخود فورٹ ولیم کالج کے معمار اعظم ڈاکٹر جے بی گلکرسٹ کے نام نامی کی طرف مبذول ہو جائے گی جنھوں نے ۱۷۹۶ء میں Grammar of the Hindoostanee Language لکھ کر اردو دنیا میں نام پیدا کر لیا ہے تاہم اگر آپ تحقیق کا سرسلسلہ ڈاکٹر گلکرسٹ سے بھی کچھ پہلے کسی قواعد نویس کو ڈھونڈنا چاہیں تو پھر ہماری نظریں جے۔ فرگوسن (J. Ferguson) کی Dictionary of the Hindostand پر جا کر ٹھہر جائیں گی جس کے آغاز میں ایک چھوٹا سا Grammar of Hindostand Language کے نام سے رومن رسم الخط میں تحریر کیا گیا ہے جس کی تاریخ طباعت ۱۷۷۳ء ہے۔ جہاں تک بائبل کے ہندستانی ترجموں کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں بھی انگریز پادری بالخصوص Henry Martyn کا نام سرفہرست نظر آتا ہے جس نے ۱۸۱۴ء میں بائبل کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرکے خاص شہرت حاصل کر لی تھی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندستانی قواعد نویسی اور ترجمہ بائبل کی تاریخ میں ہمیں ہر پھر کے انگریز مستشرقین کے نام ہی نظر آتے ہیں لیکن جرمنی میں اردو مخطوطات کی توضیحی فہرست کی تیاری کے دوران مجھے کچھ ایسے مخطوطات ملے جن کے مطالعہ کے بعد یہ کہنے میں پس و پیش نہیں کہ ہندستانی قواعد نویسی اور بائبل کے اردو ترجموں کے سلسلے میں اولیت کا شرف انگریز مستشرقین کو نہیں بلکہ جرمن مستشرقین کو حاصل ہے۔ میں اس وقت اردو زبان کی قواعد اور لغات کے تدریجی ارتقا پر روشنی ڈالنا نہیں چاہتا بلکہ آپ کی خدمت میں ایک جرمن نژاد مسیحی مبلغ کا تعارف کرانا چاہتا ہوں جس نے آج سے قریب قریب ڈھائی سو برس پہلے اولڈ اور نیو ٹیسٹامنٹ کا ہندستانی زبان میں ترجمہ کرکے اور ان کے ساتھ ہندستانی زبان سکھانے کے لیے قواعد مرتب کرکے نہ صرف یورپ کے مسیحی مبلغوں کا کام آسان کر دیا بلکہ اردو والوں پر اردو کی بھی بڑی خدمت انجام دی۔ میرا اشارہ جرمن مسیحی مبلغ Benjamin Schultze کی طرف ہے جو ۱۶۸۹ء میں جرمنی کے ضلع Brandenburg میں Kustrin کے نزدیک ایک مقام Sonnenburg میں پیدا ہوا تھا۔ اسے شروع ہی سے دین مسیحی کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ غیر زبانیں سیکھنے کا بھی شوق تھا۔ یہ شوق بالآخر اسے کشاں کشاں ۱۷۱۹ء میں ہندستان لے گیا اور اس نے جنوبی ہند میں کارومنڈل کے ساحل پر سکونت اختیار کر لی۔ یہاں اس نے اپنی زندگی کے ۲۲ طویل سال عیسائیت کی تبلیغ اور ہندستان کی زبانیں تامل، تیلگو اور ہندستانی سیکھنے میں صرف کیے۔ مدراس کے قیام کے دوران اس نے لاطینی سے ہندستانی زبان میں توریت اور انجیل کا ترجمہ کرنا شروع کیا جو بالآخر ۱۷۴۰ء میں مکمل ہو گیا۔ اس کام کی تکمیل کے دو سال بعد ۱۷۴۲ء میں بنجمن شولتسے خرابی صحت کی بنا پر جرمنی واپس آ گیا اور کچھ دن Sonnenburg میں قیام کرکے اس نے ضلع سیکسنی میں واقع ایک مقام Halle میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس نے اپنی زندگی کے بقیہ ۱۸ سال ہالے میں بیٹھ کر ہندستان میں جرمن عیسائی مبلغین کی سرگرمیوں کی نگرانی کرنے اور علمی و مذہبی کاموں کی تصنیف و تالیف میں صرف کیے یہاں تک کہ ۱۷۶۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

Novum Testamentum Hindostanicum یعنی عہد نامہ جدید (انجیل) Ms. Or. 160 اور Psalterium Hindostanicum یعنی عہد نامہ عتیق (توریت) کے ہندستانی ترجمے دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہیں۔ اول الذکر مخطوطے میں ۲۲.۵ × ۱۸.۵ سینٹی میٹر کے ۳۳۶ اور موخرالذکر مخطوطے میں ۲۲.۵ × ۱۸.۵ سینٹی میٹر کے ۳۰۸ اوراق ہیں۔ ان نسخوں کا ترجمہ بظاہر صاف ستھرے نستعلیق میں لکھا ہوا ہے مگر الفاظ کا املا اور جملوں کی ساخت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہندستانی نثر ارتقا کے ابتدائی مراحل سے گزر رہی ہے اور اس کی تکمیل میں کافی مدارج باقی ہیں۔ ان نسخوں کے سرورق اور متون کو تحریر کرنے والا کاتب بھی کم سواد معلوم ہوتا ہے۔ وہ جگہ جگہ غلطیاں کرتا ہے مگر ان تمام خامیوں اور کمیوں کے باوجود جب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ یہ ہندستانی ترجمے ایک غیر اہل زبان عیسائی مبلغ کی کوششوں کا نتیجہ ہیں تو ہمارا سر فرط عقیدت سے اردو زبان کے اس اولین محسن کے سامنے جھک جاتا ہے جس نے آج سے پورے ۲۴۰ سال پہلے نامساعد حالات کے باوجود نہ صرف اس کٹھن مہم کو انجام دیا بلکہ Grammatica Indostanica کے نام سے ہندستانی زبان کی پہلی قواعد لکھ کر آنے والے محققوں کے لیے زمین ہموار کر دی۔

عہد نامہ جدید (انجیل) بارہ ابواب میں منقسم ہے اور ہر جلد کے شروع میں اس کا نام جلی حروف میں درج ہے مثلاً متی یوحنا کا انجیل، مرکوس کا انجیل، لوکاس کا انجیل وغیرہ۔ اس مخطوطے کے سرورق پر جلی مگر بھدے حروف میں یہ عبارت درج ہے: "اللہ بھی آدمی بھی بیٹے ... یسوع مسیحا کے اوپر لکھنا ہوا سو نوا قول کا کتاب ... چینا پٹن بندر میں ایک ہزار سات سو اکیالیس سال برس میں ہندستانی زبان میں پھیلانا ہوا" بہت ممکن ہے بنجمن شولتسے نے سرورق کی عبارت کو خود ہی لکھا ہو۔ بہرحال اتنی بات صاف ہو جاتی ہے کہ اس مخطوطے کی تکمیل چینا پٹن اور مدراس میں ۳۰ جون ۱۷۴۱ء کو ہوئی تھی اور دو سال کے بعد ۱۷۴۳ء میں شولتسے کے دوست اور مسیحی عالم Herrn Callenberg کی کوششوں سے ہالے سے زیور طبع سے آراستہ ہو کر شائع ہو گیا۔ لیکن نیو ٹیسٹامنٹ کے ہندستانی ترجمے سے کہیں زیادہ اہم دوسرا مخطوطہ ہے جس میں شولتسے نے اولڈ ٹیسٹامنٹ کے جستہ جستہ حصوں کا ترجمہ کرکے مخطوطے کے آخر میں ہندستانی زبان کی پہلی قواعد Grammatica Indostanica کو بھی شامل کر دیا ہے۔ یہ قواعد لاطینی زبان میں ہے اور ۲۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس قواعد کے آخر میں ایک تاریخ ترقیمہ بھی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ اس کی تکمیل ۳۰ جون ۱۷۴۱ء کو مدراس میں ہوئی تھی۔ برٹش میوزیم کے علاوہ ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانے میں بھی شولتسے کی مذکورہ قواعد کا مطبوعہ نسخہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قواعد شولتسے کے رفیق کار Callenberg کی نگرانی میں Schultzii Grammatica Hindostanica کے نام سے ۱۷۴۵ء میں ہالے سے شائع ہوئی تھی۔ شولتسے کی قواعد کا لاطینی سے انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا جس کا ایک قلمی نسخہ لندن کی انڈیا

آفس لائبریری میں موجود ہے۔ بلوم ہارٹ نے انڈیا آفس لائبریری کے ہندوستانی مخطوطات کی وضاحتی فہرست میں نشان ۲۰ پر اور ایتھے نے فارسی مخطوطات کی وضاحتی فہرست میں نشان ۲۸۵۵ پر اس ترجمہ کا حوالہ دیا ہے مگر یہ دونوں فہرستیں بھی مترجم کے نام اور تاریخ ترجمہ کے بارے میں خاموش ہیں۔ سر گریرسن (Sir Grierson) نے اپنے شہرہ آفاق علمی کارنامے Linguistic Survey of India کی جلد نہم میں شولتے کی مذکورہ قواعد کا سرسری سا حوالہ دیا ہے مگر انھوں نے بھی کسی مصلحت سے اس کے بارے میں تفصیلی روشنی نہیں ڈالی۔ ہاں صاحب موصوف نے ایک ولندیزی محقق John Joshua Ketelaer کی مرتب کردہ قواعد Lingua Hindostanica کی جی کھول کر تعریف کی ہے جو ۱۷۴۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ شولتے اور کٹیلر کی قواعدوں میں اوّلیت کا شرف کسے حاصل ہے؟ اگر سنِ اشاعت ہی وہ پیمانہ ہے جس کے ذریعہ اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے تو یقیناً کٹیلر کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کی قواعد شولتے کی قواعد سے چار سال قبل منظرِ عام پر آگئی تھی (یہ الگ بات ہے کہ شولتے اپنی قواعد کی تکمیل ۳۰ جون ۱۷۴۱ء کو مدراس میں کر چکا تھا) مگر سوال یہ ہے کہ زیادہ اہم یہ زاویۂ نگاہ ہے کہ علمی اور مادی نقطۂ نظر سے دونوں قواعد میں سے کون سی قواعد بہتر ہے۔

اگر ہم کٹیلر اور شولتے کی قواعدوں کا باہم دگر مقابلہ کریں تو نتیجہ کے طور پر ہمیں شولتے کی قواعد کو ترجیح دینا ہوگی۔ اس ترجیح کی مختلف وجوہ ہیں پہلی وجہ تو یہ کہ شولتے کی قواعد کٹیلر کے مقابلہ میں بحیثیت مجموعی زیادہ جامع اور ہمہ گیر ہے اور دوسری وجہ یہ کہ یہ قواعد لاطینی زبان میں مرتب کی گئی ہے جو اٹھارہویں صدی عیسوی میں یورپی عالموں، محققوں اور مستشرقین کی مشترکہ زبان سمجھی جاتی تھی اور تیسری وجہ یہ کہ یورپی محققین کی مرتب کردہ اوّلین قواعدوں میں یہی ایک ایسی قواعد ہے جس میں پہلی بار رومن رسم الخط کے ساتھ ساتھ عربی اور ہندی رسم الخط بھی استعمال کیا گیا ہے۔ شولتے کی Grammatica Hindostanica کے شروع میں قواعد اور مصنف کے پورے پورے نام، سن تالیف اور مقام تالیف کے بارے میں حوالے دیے گئے ہیں اس کے بعد اصل قواعد کا متن شروع ہوتا ہے۔ ابتدائی چند اوراق میں اردو ہندی حروف تہجی کا تعارف اور رومن رسم الخط میں ان کے مخارج کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اگلے چالیس اوراق میں لاطینی اور اردو الفاظ پر مشتمل ایک لغت فراہم کی گئی ہے جو اپنی نوعیت کی پہلی اور شاید آخری لاطینی اردو لغت ہے۔ اس لغت میں تین خانے ہیں۔ پہلے خانے میں لاطینی لفظ، دوسرے خانے میں لاطینی رسم الخط میں اس کا ہندستانی ترجمہ اور پھر تیسرے خانے میں اردو رسم الخط میں لاطینی لفظ کا اردو ترجمہ ہے۔ اس لغت سے نمونے کے طور پر آپ کی خدمت میں تین مثالیں پیش کرتا ہوں۔

(۱) خدا Deus Choda (۲) فرشتہ Angelus Firsta (۳) سورج Sol Suritsch

لاطینی اردو لغت کے بعد شولتے کی قواعد میں مفرد ہندستانی الفاظ، ان کے معنی، مشتق الفاظ کی گردانیں، ہندستانی گنتی اور ہندسے اور صرف و نحو کے ضروری اصولوں سے بحث کی گئی ہے مفرد الفاظ کی وضاحت کے بعد شولتے نے اپنی قواعد میں اردو جملے، ان کا لاطینی تلفظ اور پھر ان جملوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ بھی پیش کیا ہے اس قواعد کے آخری اوراق میں ہندستانی عبارت کو مبتدیوں کی مشق کے لیے لاطینی رسم الخط میں تحریر کیا گیا ہے تاکہ مبتدی اس سے پورا پورا استفادہ کر سکیں۔ اس قواعد کا مطالعہ ان محققین کے لیے ازبس ضروری ہے جو اردو زبان کی ابتدائی نشو و نما اور ارتقا پر کام کر رہے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ۱۹۷۷ء میں اردو ترقی بورڈ لاہور سے جمن شولتے کی قواعد کا انگریزی ترجمہ اور اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کوششوں سے شائع ہو گیا ہے۔

چوتھا اہم مخطوطہ کربل کتھا یا دہ مجلس ہے جس کو فضل علی فضلی نے محمد شاہ بادشاہ اور احمد شاہ بادشاہ کے عہد حکومت میں پہلے پہل ۱۱۴۵ھ میں تصنیف کیا تھا اور پھر ۱۱۶۱ھ میں اس پر نظر ثانی کی تھی یہ مخطوطہ مذہبی اور لسانی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا واحد نسخہ برلن کی اسٹیٹ لائبریری Staatsbibliothek میں نشان No. or Sprenger 178 کے تحت محفوظ ہے جو ۱۲×۲۰ سنٹی میٹر کے ۲۹۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ کربل کتھا کا نستعلیق بہت خوب صورت اور پاکیزہ اور سرخ و سیاہ روشنائی سے تحریر کیا گیا ہے کربل کتھا اصل میں ملا واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف روضۃ الشہدا کا اردو ترجمہ ہے جس میں امام حسینؓ اور ان کے افرادِ خاندان کی میدانِ کربلا میں شہادت کا حال قلم بند کیا گیا ہے مگر فضلی نے یہ ترجمہ کچھ ایسی لگن اور مہارت کے ساتھ کیا کہ بہت جلد ہی کربل کتھا کو ایک علاحدہ تصنیف کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ مخطوطے کے سرورق پر اس کا نام دہ مجلس مندرج ہے جو ممکن ہے ڈاکٹر اشپرنگر نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہو اس لیے کہ اس کے فوراً بعد ہی ڈاکٹر اشپرنگر کی تحریر میں ایک مختصر سی یادداشت قلم بند ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔

"The sacred history of the shy atos in ten lectures in Hindustanee intended to be read in the first ten evenings of Muharrem"

مخطوطے کے اصل متن کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا صحیح نام دہ مجلس نہیں بلکہ کربل کتھا ہے جس کا ذکر فضلی نے ورق ۵ب پر وضاحت کے ساتھ کر دیا ہے۔ کربل کتھا کا آغاز حمد و نعت، فاتحہ و درود اور احوال پنجتن پاک سے ہوتا ہے اور ایک طویل بیان کے بعد ورق ۲۳ب پر اس مخطوطے کا سالِ تصنیف اور نظر ثانی کا سال علی الترتیب ۱۱۴۵ھ اور ۱۱۶۱ھ مندرج ہیں۔ اس کے بعد مقدمہ ورق ۲۴ تا ۴۸ میں امام حسینؓ کے مصائب کا حال اور مجالس محرم کو منعقد کرنے کی غرض و غایت درج ہے۔ مجلس دہم (ورق ۲۴۹ تا ۲۸۲) میں امام حسینؓ اور ان کے اہلِ خاندان کی میدان کربلا میں شہادت کا حال اور خاتمہ (ورق ۲۸۲ب تا ۲۹۱) کی پانچ فصلوں میں ایک بار پھر سے شہادت امام کا حال قلم بند کیا گیا ہے۔ کربل کتھا کی مذہبی حیثیت ایک امر مسلّم ہے مگر اس کی لسانی اہمیت بھی کچھ کم نہیں اگر آپ کو اٹھارہویں صدی کی اردو نثر و نظم کا اچھا خاصا نمونہ دیکھنا ہو اور اسی کے ساتھ دو سو برس

پہلے کی اردو املا کا مطالعہ کرنا ہو تو اس مقصد کے لیے فضل علی فضلی کی کربل کتھا ماہرِ لسانیات کے لیے بہت دلچسپ تحقیقی موضوع بن سکتی ہے۔

خواتین و حضرات! اب تک میں آپ کی خدمت میں کچھ مذہبی اور کچھ نیم مذہبی قسم کے مخطوطات کا حال بیان کرتا رہا ہوں اب مذہبی دنیا سے نکل کر کچھ دیر اردو کے شعرائے متقدمین کی محفل میں شرفِ باریابی حاصل کریں۔ میری مراد فن تذکرہ نگاری سے ہے جس کا پہلا نمونہ برلن کی اسٹیٹ لائبریری میں محفوظ ہے یعنی میر تقی میر کا نکات الشعرا، دوسرا علی ابراہیم خاں خلیل کا گلزار ابراہیم، تیسرا مرزا علی لطف کا گلشنِ ہند، چوتھا امام ابوالقاسم قدرت اللہ قاسمی کا مجموعۂ نغز اور پانچواں شیخ غلام محی الدین قریشی مبتلا دہلوی کا طبقاتِ سخن۔ تذکرہ نگاری کی دنیا میں ان پانچوں تذکروں کی اہمیت برحق اور مسلم ہے۔ ان سب تذکروں کو ہندستان سے جرمنی منتقل کرنے کا سہرا بھی ڈاکٹر اشپرنگر کے سر ہے۔ میں شروع میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ ڈاکٹر اشپرنگر ہندستان سے ۱۹۷۲ مخطوطات اور مطبوعات لے کر جرمنی آئے تھے جن کی نادریت اور اہمیت کا ذکر انھوں نے جسے فخر و ناز کے ساتھ ان علمی شہ پاروں کی مطبوعہ فہرست Bibliotheca Sprengeriana کے مقدمہ میں کیا ہے مجھے اجازت دیجیے کہ ڈاکٹر اشپرنگر کے اس بیان کا ایک اقتباس ان ہی کے الفاظ میں آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں۔

I doubt whether one individual has brought to Europe so many oriental works as are contained in my collection. It is however not so much its extent, as its completeness, which renders it valuable............... I made it a point to have at hand ample materials of information on every subject. I am aware that a notion prevails in Europe that only the history of the Musulmans is worth while studying. But to claim an acquaintance with the history of a nation, without having mastered its literature --- to pretend for instance to be acquainted with ancient greece without having perused Homer / plato --- is so supremely ridiculous that it would be waste of time to refute such an error.

A complete knowledge of the habits, life / literature of Asia appears to me to be at the present juncture a most important consideration for Europe; not only will it complete the philosophy of history which ought to be founded exclusively on facts, but it will smoothen the path to that connexion between the East and West, which is inevitable and is proceeding in much more rapid strides than it is usually supposed.

اشپرنگر کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھیں سرزمین ایشیا کی تمام اصناف علم میں ادب اور ادبی موضوعات سے سب سے زیادہ دلچسپی تھی اس لیے ان کی باریک بین اور دور بین نگاہوں نے ہندستان سے ایسے ادبی شہ پاروں کا انتخاب کیا جن کی اہمیت اور افادیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اشپرنگر کے مجموعۂ مخطوطات میں میر تقی میر کا نکات الشعرا سرفہرست ہے جس کا نشان Bibl. Sprenger ۳۱۵ ہے یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور ۱۵×۲۵ سنٹی میٹر کے ۱۰۰ اوراق پر مشتمل ہے اس میں ۱۰۳ ریختہ شعرا کا حال اور ان کے کلام کا انتخاب درج ہے۔ اس نسخے کی کتابت پاکیزہ اور غلطیوں سے مبرا ہے۔ ریختہ کے اقسام، ان کی خصوصیات، لب و لہجہ اور شعری محاسن وغیرہ کے اجمالی ذکر کے ساتھ ساتھ میر نے اردو شعرا کے کلام پر جس منصفانہ اور بے باکانہ انداز میں تبصرہ کیا ہے وہ نکات الشعرا کو دوسرے تذکروں سے ممتاز کرنے کے لیے کافی ہے۔ میر نے نکات الشعرا کو ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) میں لکھنا شروع کیا تھا اور شعبان ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) میں پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ اس مخطوطے کے سرورق پر ایک مختصر سی یادداشت ہے جس میں تحریر ہے: "تذکرہ میر بتاریخ ششم دہم دسمبر ۱۸۵۲ء ایں تذکرہ از خودی کاتب رسید" بہت ممکن ہے نکات الشعرا کا یہ نسخہ اشپرنگر نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے نقل کروایا ہو اس لیے کہ ان کے اودھ کیٹلاگ میں ۱۰۵ سے ۱۰۸ تک پورے تین صفحات میں اس تذکرہ کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اس کی بعض فارسی عبارتوں کا انگریزی ترجمہ پیش کیا گیا ہے

برلن کے مجموعہ میں دوسرا تذکرہ گلزار ابراہیم ہے جسے نواب امین الدولہ علی ابراہیم خاں ناصر جنگ المتخلص بہ خلیل نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ حکومت میں ۱۷۸۴ء میں قلم بند کیا تھا۔ یہ تذکرہ بھی فارسی زبان میں ۲۱×۳۰ سنٹی میٹر کے ۲۴۷ اوراق پر مشتمل ہے اور برلن کی اسٹیٹس بیبلیو تھیک میں نشان No. or Fol. 1631 کے تحت محفوظ ہے۔ گلزار ابراہیم کی کتابت جلی نستعلیق میں کی گئی ہے مگر اس میں تاریخ کتابت کہیں درج نہیں ہے۔ علی ابراہیم خاں گلزار ابراہیم کے دیباچے میں رقم طراز ہیں کہ فارسی شعرا کے تذکروں خلاصۃ الکلام اور صحف ابراہیم کی تکمیل کے بعد احباب کے اصرار پر انھوں نے ریختہ شعرا پر مشتمل یہ تذکرہ مرتب کیا جس کی تیاری پر پورے بارہ سال صرف ہوئے اور بالآخر ۱۱۹۸ھ (۱۷۸۴ء) میں شاہ عالم بادشاہ کے عہد حکومت نواب آصف الدولہ کے عہد وزارت اور گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز کے دورِ گورنر جنرلی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ گلزار ابراہیم میں ۳۲۰ شعرا اردو ریختہ کا مختصر حال فارسی زبان میں قلم بند ہے اور شعرا کو حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ تذکرہ کا آغاز آفتاب سے ہوتا ہے جو شاہ عالم بادشاہ کا تخلص تھا اور یہ پر ختم ہوتا ہے۔

تیسرا تذکرہ جو برلن کی اسٹیٹس بیبلیو تھیک میں No. or. Sprenger 145 کے نشان کے تحت درج ہے وہ ہے مرزا علی لطف کا گلشنِ ہند یا تذکرۃ الشعرائے ہند جسے مرزا علی لطف نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۱ء) میں مرتب کیا تھا اس مخطوطے میں ۱۵×۲۶ سنٹی میٹر کے ۱۴۵ اوراق ہیں جو نستعلیق جلی میں قلم بند ہیں مرزا علی لطف گلشنِ ہند کی تالیف کی غرض و غایت

[illegible] ہوتے اس [illegible] کے دیباچے میں [illegible] ہیں۔

بادشاہ غازی کی بادشاہت میں اور [illegible] نواب وزیر اعظم ہندوستان نواب وزیر الممالک آصف الدولہ [illegible] خان بہادر ہزبر جنگ کی وزارت میں اور [illegible] نواب عماد الدولہ امیر الممالک گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز جلادت جنگ بہادر کی ریاست اور امارت میں علی ابراہیم خاں مرحوم نے یک تذکرہ شعرائے ہند کا عبارت فارسی میں لکھا ہے اور نام اس کا گلزار ابراہیم رکھا ہے ۱۱۹۸ھ اور ایک ہزار سات سو [illegible] عیسوی میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا۔ [illegible] مطلق [illegible] رونق انتزاع محفل معانی سخن کی جان [illegible] صاحب [illegible] مسٹر گلکرسٹ صاحب کی نظر مبارک سے [illegible] شاعروں کا احوال اس میں مجمل لکھا تھا ایک مدت سے صاحب [illegible] بات کا تھا کہ [illegible] اس کا مفصل زبان ریختہ میں کیا جائے تو [illegible] شاعر کی [illegible] اپنا جلوہ دکھائے تو نہایت طبع کی [illegible] ہو [illegible] اور [illegible] کیفیت بہت [illegible] گے۔

[illegible] گلکرسٹ کی فرمائش پر مرزا علی لطف نے اس کام کو بہ حسن و خوبی انجام دیا اور موصوف ہی کی فرمائش پر اس تذکرے کا نام گلشن ہند قرار دیا۔ گلشن ہند میں ۶۸ شعرائے ریختہ کا حال [illegible] کلام [illegible] ہے۔ تذکرے کا آغاز بادشاہ شاہ عالم متخلص بہ آفتاب سے ہوتا ہے اور [illegible] کے کلام پر ختم ہو جاتا ہے۔ مخطوطے کے آخر میں [illegible] لطف نے گلشن ہند کی تاریخ تصنیف ذیل کے دو شعروں میں دی ہے، مادۂ تاریخ ہے "رشک بہشت" جس سے ۱۲۱۵ھ برآمد ہوتے ہیں۔

[illegible] گل ہمیشہ بہار [illegible] کا ۔۔۔ کہتا ہے یوں خزاں سے کہ تو کیا بلشت ہے

[illegible] ۔۔۔ تاریخ اس کی [illegible] رشک بہشت ہے

شیرنگر نے ہندستان سے لائے ہوئے تذکروں میں سید ابوالقاسم دہلوی (قدرت اللہ قادری) [illegible] اور شیخ غلام محی الدین قریشی المتخلص بہ مبتلا و عشق کا طبقات سخن بھی قابل ذکر ہیں جو برلن کی شناٹس بلیوتھیک میں نشانات [illegible] کے تحت درج ہیں اور جن میں علی الترتیب [illegible] سینٹی میٹر کے [illegible] ورق اور [illegible] سینٹی میٹر کے [illegible] ورق پائے جاتے ہیں۔ مجموعۂ نغز اور طبقات سخن دونوں تاریخی نام ہیں اور سید تاریخ گفتہ مجموعہ نغز سے [illegible] اور طبقات سخن سے [illegible] برآمد ہوتے ہیں۔ مجموعۂ نغز میں [illegible] شعراء کے سوانحی خاکے [illegible] حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیے گئے ہیں جب کہ طبقات سخن دو حصوں یا طبقوں میں تقسیم ہے۔ حصہ اول [illegible] میں [illegible] شعرا کا حال اور حصہ دوم [illegible] میں فارسی شعرا کا حال اور کلام درج کیا گیا ہے۔ طبقات سخن بد قسمتی سے ناقص الطرفین ہے اور صفحہ [illegible] پر سلسلۂ کلام یک بارگی منقطع ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس مخطوطے کے بعض اوراق پر غالباً پانی میں بھیگ جانے کی وجہ سے روشنائی اس طرح پھیل گئی ہے کہ بعض شعروں کا پڑھنا دشوار ہے۔

تذکروں کے بعد اب میں آپ کی توجہ قصے کہانیوں پر مبنی مخطوطات کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ ہمارے مشن نظر مجموعے میں قریب قریب تمام قدیم داستانوں کی نگارشات شامل ہیں۔ مثلاً میر حسن دہلوی کا قصۂ چہار درویش یا باغ و بہار، میر محمد حسین عطا خاں تحسین کی نو طرز مرصع، میر بہادر علی حسینی کی نثر بے نظیر یا قصۂ حسن و عشق، سید حیدر بخش حیدری کی توتا کہانی، حکایات بید پائی کا ایک بامحاورہ ترجمہ جو محمد اعظم صدیقی [illegible] کو قصوں کا [illegible] ہے۔ قصے کہانیوں کے ضمن میں انوار سہیلی یا کلیلہ دمنہ کے ترجمہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جو سعادت یار خاں کی کاوشوں کا مرہون منت ہے۔ انوار سہیلی کے ترجمے کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اس نسخے کو کمپنی کے ایک فرانسیسی زمین دار موسیو لاکلاف [illegible] کے مطالعے کے لیے تصنیف کیا گیا تھا جسے ہندستانی زبان سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ یہ مخطوطہ قریب قریب ڈھائی سو سال پرانا ہے اور اپنے عجیب و غریب طرز املا اور نا پختہ مگر دلچسپ پیرایۂ بیان کے پیش نظر بلاشبہ ماہرین لسانیات کی توجہ کا مستحق ہے۔ زیر بحث مخطوطہ انوار سہیلی کی دوسری جلد ہے جو پانچویں باب سے شروع ہو کر چودھویں باب پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی پہلی جلد انڈیا آفس لائبریری لندن میں ہے جو پہلے باب سے شروع ہو کر چوتھے باب پر ختم ہو جاتی ہے۔ ان دونوں جلدوں کے مشترک طریقۂ املا، نفس مضمون اور آخر میں جلدوں کی ابوابی تقسیم کے پیش نظر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ دونوں مخطوطے اصل میں انوار سہیلی کی جلد اول اور جلد دوم ہیں جو استعداد زمانہ سے بچھڑ کر ایک لندن پہنچ گئی تو دوسری جرمنی میں رہ گئی۔

نثری نگارشات کے علاوہ جرمنی کے اردو مجموعۂ مخطوطات میں بہت سے شعرائے متقدمین کے دیوان بھی شامل ہیں۔ میں اپنے بیان کو ملک الشعرا نصرتی بیجاپوری کی تصنیف گلشن عشق سے شروع کرتا ہوں جس کا ایک بہت اچھا قلمی نسخہ برلن کی شناٹس بلیوتھیک میں نشان [illegible] کے تحت محفوظ ہے۔ اس مخطوطے میں [illegible] سینٹی میٹر کے ۲۱۴ اوراق ہیں اور جلی نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ نصرتی نے اپنی اس طویل مثنوی کو علی عادل شاہ دوم کے عہد میں ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء میں دکنی زبان میں منظوم کیا تھا۔ اس نسخے میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے کہ جس سے پتا چل سکے کہ اس کی کتابت کب ہوئی۔ سرزمین دکن کے ایک اور مایۂ ناز سپوت اردو شاعری کے باوا آدم ولی دکنی کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ بھی مجموعۂ شپرنگر میں شامل ہے جو برلن کی شناٹس بلیوتھیک میں نشان Ms. orient. Sprenger 1721 کے تحت درج ہے۔ اس میں ۱۳×۲۳ سینٹی میٹر کے ۱۶۸ اوراق ہیں جو صاف نستعلیق میں لکھے گئے ہیں۔ اس نسخے کا آغاز ایک غیر متعلق فارسی عبارت سے ہوتا ہے اور پھر آنحضرت اور ان کے صحابہ کی شان میں قصیدے ملتے ہیں۔ اس کے بعد غزلوں پر مبنی اصل دیوان شروع ہوتا ہے جس کا سلسلہ ورق ۱۲۰ کے بعد منقطع ہو جاتا ہے۔ دیوان ولی کے اس ناقص الآخر نسخے سے اس امر کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس کی کتابت کب ہوئی۔ ہاں کاغذ اور طرز کتابت کے پیش نظر اس نسخے کی قدامت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ آئیے اب دکن کو خیرباد کہہ کے دلی کا رخ کریں جس کے بارے میں ناخدائے سخن میر تقی میر کا خیال تھا کہ رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے۔ ان ہی منتخب روزگار ہستیوں میں ایک مرزا محمد رفیع سودا بھی تھے جن کے قلم کے بارے میں مشہور ہے کہ لوگ بادشاہ کی تلوار سے کم اور سودا کے قلم سے زیادہ ڈرتے تھے۔ سودا بلاشبہ بہت بڑے شاعر تھے اور ان کی کلیات میں قصیدے، مرثیے، رباعیات، اردو شاعری کا سرمایۂ حیات [illegible] بلکہ اٹھارہویں صدی کی تہذیبی تاریخ [illegible] کا ماخذ بھی ہیں۔ سودا کے دیوان کے چار قلمی نسخے ہمارے مجموعے میں شامل ہیں۔ ایک خاصا ضخیم اور بقیہ تین نسبتاً مختصر ہیں۔ ان چار دیوانوں میں سے صرف ایک کا ذکر کرنے پر اکتفا کروں گا جو ہائینل برگ کے Forschungsbibliothek میں نشان [illegible] کے تحت درج ہے۔ یہ نسخہ بقیہ نسخوں سے زیادہ ضخیم ہی نہیں بلکہ اس کے ہر باب کے آغاز میں مطلا نقش و نگار اور اس میں متعدد خوبصورت اعلیٰ قسم کے تصویریں بھی شامل ہیں۔ اس کی کتابت بھی پاکیزہ اور جاذب نظر ہے۔ عجب نہیں کہ یہ نسخہ نواب آصف الدولہ یا ہیر لکھنؤ میں مقیم برٹش ریزیڈنٹ رچرڈ جانسن کی خدمت میں پیش کش کے لیے ترتیب دیا گیا ہو۔ اس لیے کہ اس نسخے میں ان دونوں حضرات کی تعریف میں مثنوی و قصیدے موجود ہیں۔ سودا کے علاوہ ہمارے مجموعۂ شپرنگر میں اور بھی بہت سے متوسط درجہ کے شاعروں کے دواوین شامل ہیں جو سب کے سب برلن کی شناٹس بلیوتھیک میں محفوظ ہیں۔ یہاں ان نسخوں کا حال بیان کرنا تو ممکن نہیں، میں صرف نام گنانے پر اکتفا کرتا ہوں مثلاً دیوان میر سوز، دیوان جعفر علی حسرت، کلیات جرأت، دیوان تاباں، دیوان فارغ، دیوان پروانہ، دیوان کلاں خواجہ سلطان، دیوان صاحبقران، دیوان انشا، رنگین، اور دیوان کلیات تصنیف میر اکبر علی متخلص اختر۔ موخر الذکر نسخہ اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس کی کتابت بہت پاکیزہ ہے اور اس کے سر آغاز اور ہر باب کو خوبصورت نقش و نگارات سے مزین کیا گیا ہے۔

آخر میں تبرک کے طور پر اگر میں چند مثنویوں کے نام بھی لے دوں تو جرمنی میں اردو مخطوطات کا یہ ادھورا بیان شاید کسی حد تک مکمل ہو جائے۔ ہمارے مجموعے میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے چار نسخے موجود ہیں۔ ان میں ایک ناقص الآخر، تین مکمل نسخوں میں ہائیڈل برگ کے Forschungsbibliothek والے نسخے کو اس لیے افضلیت حاصل ہے کہ اس کی کتابت پاکیزہ اور خوشنما اور اس میں متعدد جاذب نظر رنگین تصویریں بھی موجود ہیں جن کی تعداد اٹھائیس تک پہنچ جاتی ہے۔ مثنوی سحر البیان کے علاوہ میر تقی میر کی مثنوی شعلۂ عشق، مثنوی دریائے عشق، نواب محبت خاں کی مثنوی اسرار محبت، عارف الدین خاں عاجز کی مثنوی لعل و گوہر، سراج الدین اورنگ آبادی کی مثنوی سراج یا بوستان خیال، وغیرہ ہمارے مجموعے میں شامل ہیں۔ لیکن ان مختصر مثنویوں سے کہیں زیادہ دلچسپ اور اہم وہ طویل مثنوی ہے جس کا مختصر ذکر ضروری ہے۔ میری مراد مثنوی یوسف و زلیخا اور کہناوت یا کہاوت سے ہے جو برلن کی شناٹس بلیوتھیک میں محفوظ ہیں۔ مثنوی لایک [illegible] کا نشان [illegible] ہے۔ [illegible] سینٹی میٹر کے ۱۲۱ اوراق پر مشتمل ہے۔ یہ خط نسخ میں تحریر ہے اور ہر ورق کے بالمقابل ایک تصویر ہے جو مثنوی کے متن کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ اس مثنوی کا موضوع [illegible] اور [illegible] ہے مولانا داؤد [illegible] کے قصۂ چندائن سے ماخوذ ہو جسے انھوں نے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ۷۷۹ھ (۱۳۷۸ء) میں تصنیف کر کے اس کے وزیر جہاں شاہ بن خان جہاں مقبول کی خدمت میں [illegible] کیا گیا تھا۔ ہمارے زیر بحث مخطوطے میں یہ قصہ ایک قدیم بولی میں [illegible] نظم کیا ہے جس کا سمجھنا آسان نہیں، تاہم پورک [illegible] اپنی کہانی فارسی میں [illegible] تصویر [illegible] جا سکتے ہیں جو ہر [illegible] بالمقابل دی گئی ہیں۔ بدقسمتی سے [illegible] سلسلۂ کلام یک بارگی ٹوٹ جاتا ہے مخطوطہ [illegible] نسخے کے متن اور تصویروں کو ماضی میں [illegible] نقصان پہنچا ہے [illegible] اوراق ضائع ہو گئے ہیں۔ جرمنی میں [illegible] مخطوطات کے سلسلے میں [illegible] آپ کو اس روداد کو ختم کرنے سے پہلے [illegible] ملک محمد جائسی کی تصنیف کردہ ہے اور یہ ۱۳۲ اوراق پر بہت پاکیزہ [illegible] نستعلیق میں [illegible] برلن کی شناٹس بلیوتھیک میں نشان [illegible] کے تحت محفوظ ہے۔ [illegible] کی تمام وضاحتی فہرستیں خاموش ہیں اور یورپ اور برصغیر ہند و پاک کے کتب خانوں [illegible] اس نسخے کی نشاندہی کرنے سے قاصر ہیں۔ ڈاکٹر [illegible] اسپرنگر اور [illegible] ملک محمد جائسی کی کہناوت یا کہاوت کے بارے میں محض چند سطری نوٹ لکھنے پر اکتفا کی ہے جس سے اس نسخے کے بارے میں [illegible] سمجھنے کی بجائے اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہناوت کے آخر میں فارسی زبان میں ایک ترقیمہ دیا گیا ہے جس میں تحریر ہے:

"تمام شد کتاب کہناوت من تصنیف ملک محمد جائسی بروز چہار شنبہ تاریخ ۲۳ شعبان المعظم سنہ ۔۔۔ جلوس صاحب قران ثانی شاہ جہاں بادشاہ غازی موافق ۔۔۔ ہجری کتبہ العبد [illegible] عبد الرحیم حسینی ساکن قنوج [illegible] [illegible] قوم کابینو [illegible] قاسم پور [illegible] سرکار قنوج [illegible] آمد"

کیا عجب ہے کہ یا لکت ملک محمد جائسی کی واقعی کوئی نو دریافت تصنیف ہو جس سے علمی دنیا ابھی تک پوری طرح واقف نہیں۔ اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے تو میں سمجھوں گا کہ جرمنی میں اردو مخطوطات کی تلاش و جستجو کی یہ خود عائد کردہ مہم کامیاب ہو گئی۔

(ماہنامہ کتاب نما ۔۔۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۔۔۔ ۱۹۸۲)

"آج اردو میں کلاسیکی ادب کا ایک قابل قدر سرمایہ موجود ہے اور اردو کے اچھے لکھنے والوں کی تخلیقات کا بیشتر حصہ تک محفوظ ہو سکا ہے۔ منشی نول کشور، شیخ مبارک علی، انڈین پریس (الہ آباد)، انجمن ترقی اردو ہند، ساقی، ادبی دنیا، الاجیت رائے، دار المصنفین، ادارہ ادبیات اردو، مکتبہ جدید، نگار (لکھنؤ)، عصمت (دہلی)، فروغ اردو، مکتبہ جامعہ، نرائن دت سہگل اور اسی قسم کے دوسرے اداروں کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں جو آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی کتابوں کی طباعت اور اشاعت میں پیش پیش رہے ہیں۔" (ڈاکٹر شکیل الرحمٰن)

افسانے

سعادت حسن منٹو
راجندر سنگھ بیدی
کرشن چندر
عصمت چغتائی

سہیل عظیم آبادی
غیاث احمد گدی
رام لعل
عابد سہیل

کلام حیدری
اقبال متین
رضوان احمد
شارق

سعادت حسن منٹو



نیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور نہ کبھی اس نے اسکول کا منھ ہی دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیشین گوئی کی تھی ——— "دیکھ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔" اور جب گاما چودھری نے اس سے پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا ——— "ولایت میں اور کہاں؟"

اسپین میں جنگ چھڑی اور ایک شخص کو پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے، دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتما رہا تھا۔ حقے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے متفکرانہ لہجے میں کہا:

"یہ کسی پیر کی بددعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو چھریاں چلتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بددعا دی تھی ——— جا، تیرے ہندستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے ——— اور دیکھ لو، جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی ——— "یہ کانگریسی ہندستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا یا وہ روس والا۔ جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے لیکن ہندستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بددعا بھی دی تھی کہ ہندستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی ہی راج کرتے رہیں گے۔"

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں مگر اس کے متنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے، وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ

گورے کے سُرخ سپید چہرے کو دیکھتا تو اُسے متلی سی آجاتی تھی۔ نہ معلوم کیوں؟ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریاں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی اور وہ شام کو اڈے میں آکر ہل مارکہ سگریٹ پیتے یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اس گورے کو جی بھر کے سنایا کرتا۔

"........" یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا "آگ لینے آئے تھے، اب گھر کے مالک ہی بن گئے۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں......"

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا، جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا وہ اپنے سینے کی آگ اگلتا رہتا۔

"شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی...... جیسے کوڑھ ہو رہا ہو بالکل مردار۔ ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ پہلے پہل جی میں آئی کہ ملعون کی کھوپڑی کے پرزے اڑا دوں لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے......"

یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیض کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔

"قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آئے۔"

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق دونوں بات چیت کر رہے تھے۔

"سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا۔ کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔"

"کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے۔ کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔"

ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بری طرح پیٹا کرتا تھا مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا "چل بیٹا۔ چل بیٹا۔ ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔"

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پر پہنچا کر اس نے انار کلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا "ہت تیری ایسی کی تیسی۔"

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلاف معمول وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا۔ بہت بڑی خبر۔ اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لیے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بیقراری کی حالت میں ٹہلتا

رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آرہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لاکر کھڑا کردیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو اپریل کو ہندستان میں نافذ ہونے والا تھا اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کرکے غور و فکر کررہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ "کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا" بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے ان مارواڑیوں کو گالی۔۔۔۔ غریبوں کی کھٹیاؤں میں گھسے ہوئے کھٹمل۔۔۔ نیا قانون ان کے لیئے کھولتا ہوا پانی ہوگا"

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہونچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں۔۔۔۔ سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہوجائیں گی۔

جب نتھو گنجا پگڑی بغل میں دبائے اڈّے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا "لا ہاتھ ادھر۔۔۔ ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہوجائے۔۔۔ تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں"

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے۔۔۔ مزے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کردیں۔ دوران گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا۔۔ "تو دیکھتا رہ! کیا بنتا ہے۔ یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کرکے رہے گا"

استاد منگو موجودہ سوویت نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اس لیے اس نے "روس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملادیا۔ اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں وہ انھیں "روس والے بادشاہ" کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "روس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کردیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا تھا۔ اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کررہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

"جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسا فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک سنا نہ دیکھا گیا ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی فیڈریشن بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں"

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو پیدا ہوئی چونکہ ان میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے اس لیئے استاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا۔ اور اس نے خیال کیا کہ یہ لوگ ہندستان میں نئے قانون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔۔۔ "ٹوڈی بچے"

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں "ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کرکے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور "ٹوڈی بچے" میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبہ کو اپنے تانگے میں بٹھاکر مزنگ جارہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سنا۔۔۔ "نئے آئین نے میری امیدیں بڑھادی ہیں اگر۔۔۔ صاحب اسمبلی کے ممبر ہوگئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی"

"ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آجائے"

"ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔"

"وہ بدکار گورے جو مارے مارے پھر رہے ہیں ان میں کچھ تو کمی ہوگی۔"

اس گفتگو نے منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی۔ اور وہ اس کو ایسی "چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ "نیا قانون...." وہ دن میں کئی بار سوچتا.... "یعنی کوئی نئی چیز" اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آجاتا جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدابخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی "نئے قانون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا مگر اس کے متعلق جو تصوّر وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا۔ اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہونچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہوگئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلاف معمول سرد تھا۔ اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جاکر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی.... وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی.... آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں، مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی، اور سب چیزیں پرانی نظر آرہی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چودھری خدابخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی..... ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے دکانیں بھی تو سب بند ہیں۔" اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا۔ "ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نیا قانون کیا نظر آئے گا۔"

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہونچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبہ کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے خوش پوش تھے مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں۔ اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے مگر استاد منگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری سے گذارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اس غیر مغلوب خواہش کے زیرِ اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی

سے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان لگا لگا کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہتا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آگیا کہ وہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا۔

"تو ہر وقت مُردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اُٹھ، ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دیگی"

استاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگا وتی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر کہا کرتی تھی ـــ "ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو"

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ وہ اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہئے تھا وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لئے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا۔ اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ ذہن کے اس ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا۔۔۔ "چلو یہ بھی اچھا ہوا شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔"

چھاؤنی پہونچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کے منزلِ مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تھا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال سے چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے تھوڑی دیر کے لئے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی۔ جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابلِ غور بات کو آئین جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ وچار میں تھا کہ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک "گورا" کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اس کے جی میں آیا کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا۔۔۔ "ان کے پیسے چھوڑنا بھی بے وقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیئے ہیں ان کی جیب ہی سے وصول کرنی چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں"

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور پلک جھپکنے کی دیر میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا:

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا۔ اور پاس ہی کے گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڈی کے بالائی حصے تک چلی آرہی تھی ایک لرزش کے ساتھ گہری ہوگئی، گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس "گورے"، کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب "گورے" نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رُخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا مڑ کے پائدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اُڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا اپنے سامنے کھڑے "گورے"، کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرّے ذرّے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا تھا گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصّے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگریٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا۔۔۔ "جانا مانگتا ہے یا پھر گڑبڑ کرے گا؟"

"وہی ہے" یہ لفظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

"وہی ہے" اس نے یہ لفظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہوگیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی۔ اسے طوعاً و کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پرزے اڑا دیئے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہوگیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوان ہی پر گرتا ہے۔

استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا "کہاں جانا مانگتا ہے؟"

استاد منگو کے لہجے میں اس کے چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا "ہیرا منڈی"۔

"کرایہ پانچ روپے ہوگا" استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سن کر گورا حیران رہ گیا۔ وہ چلایا "پانچ روپے۔ کیا تم۔۔۔؟"

"ہاں ہاں، پانچ روپے" یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھینچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔ "کیوں جاتے ہو یا بے کار باتیں بناؤ گے؟"

استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہوگیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی کو نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اور اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھوڑی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے اِدھر اُدھر سمٹ کر استاد منگو کے گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلانا

شروع کیا۔ اس کی چیخ و پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ یہ کہتا جاتا تھا:

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں۔۔۔ پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں۔۔۔ اب ہمارا راج ہے بچہ"

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا:

"وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے — اب نیا قانون ہے میاں — نیا قانون"

اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کی مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے دو سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ "نیا قانون، نیا قانون" چلاتا رہا، مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

"نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو — ؟ قانون وہی پرانا ہے" اور اس کو حوالات میں بند کر دیا۔ (ترقی پسند ادب گیتا کو بمبئی ۱۹۰۸ء)

• یقینی طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ فورٹ ولیم کالج میں جو مشین نصب تھی وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرکاری مشین تھی یا کوئی دوسری مشین تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب ٹائپ کے حروف ڈھلنے جا چکے تھے تو ایک سے زیادہ مطبع قائم ہو سکے تھے اس لیے اردو کا پہلا ذاتی مطبع مولوی اکرام علی نے قائم کیا تھا جو فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے۔ (اقتباس ناظمی) • یہ انکشاف جہاں تک میری رسائی ہو سکی ہے اردو کا پہلا مطبع (غالباً ٹائپ) ۱۸۰۱ء میں مقام کلکتہ قائم ہوا۔ پریس کا نام ہندوستانی پریس تھا اور اس کے مالک اکرام علی تھے۔ محمد عتیق صدیقی نے اپنی کتاب "ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)" میں ہندوستانی پریس کا زمانہ قیام ۱۸۰۲ء بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ۱۸۰۱ء کی تاریخ "اخبار نویسی" کے مصنف سید محمد اشرف کی وجہ سے غلط رواج پا گئی ہے۔ فورٹ ولیم کالج اور پریس کے قیام کی وجہ سے اردو میں تالیف، ترجمہ اور اشاعت کے کام کو بہت فروغ حاصل ہوا اور ملک میں کئی جگہ چھاپہ خانے کھلے۔

(شہباز حسین)



راجندر سنگھ بیدی

لاجونتی

"ہتھ لائیاں کملاں نی لاجونتی دے بوٹے ......"

(یہ چھوئی موئی کے پودے ہیں ری، ہاتھ بھی لگاؤ تو کمہلا جاتے ہیں)

——— (ایک پنجابی گیت)

بٹوارہ ہوا اور بے شمار لوگوں نے اُٹھ کر اپنے بدن پر سے خون پونچھ ڈالا. اور پھر سب مل کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے. جن کے بدن صحیح و سالم تھے، لیکن دل زخمی .....

گلی گلی، محلے محلے میں "پھر بساؤ" کمیٹیاں بن گئی تھیں اور شروع شروع میں بڑی تندہی کے ساتھ "کاروبار میں بساؤ" "زمین پر بساؤ" اور گھروں میں بساؤ" پروگرام شروع کر دیا گیا تھا لیکن ایک پروگرام ایسا تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تھی وہ پروگرام مغویہ عورتوں کے سلسلے میں تھا جس کا سلوگن تھا "دل میں بساؤ" اور اس پروگرام کی نارائن باوا کے مندر اور اس کے آس پاس بسنے والے قدامت پسند طبقے کی طرف سے بڑی مخالفت ہوتی تھی ———

اس پروگرام کو حرکت میں لانے کے لیے مندر کے پاس محلے "ملا شکور" میں ایک کمیٹی قائم ہو گئی اور گیارہ ووٹوں کی اکثریت سے سندر لال بابو کو اس کا سکریٹری چن لیا گیا، وکیل صاحب صدر، چوکی کلاں کا بوڑھا محرر اور محلے کے دوسرے معتبر لوگوں کا خیال تھا کہ سندر لال سے زیادہ جانفشانی کے ساتھ اس کام کو کوئی اور نہ کر سکے گا. شاید اس لیے کہ سندر لال کی اپنی بیوی اغوا ہو چکی تھی اور اس کا نام تھا بھی لاجو ——— لاجونتی.

چنانچہ پربھات پھیری نکالتے ہوئے جب سندر لال بابو اس کا ساتھی رسالو اور نیکی رام وغیرہ مل کر گاتے ——— "ہتھ لائیاں کملاں نی لاجونتی دے بوٹے ......" تو سندر لال کی آواز ایک دم بند ہو جاتی اور وہ خاموشی کے ساتھ چلتے چلتے لاجونتی کی بات سوچتا ——— جانے وہ کہاں ہو گی، کس حال میں ہو گی، ہماری بابت کیا سوچ رہی ہو گی، وہ کبھی آئے گی بھی یا نہیں؟ ..... اور پتھریلے فرش پر چلتے چلتے اس کے قدم لڑکھڑانے لگتے.

اور اب تو یہاں تک نوبت آ گئی کہ اس نے لاجونتی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا. اس کا غم اب دنیا کا غم ہو چکا تھا اس نے اپنے دکھ سے بچنے کے لیے لوک سیوا میں اپنے آپ کو غرق کر دیا. اس کے باوجود دوسرے ساتھیوں کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے اسے یہ خیال ضرور آتا ——— انسانی دل کتنا نازک ہوتا ہے. ذرا سی بات پر اسے ٹھیس لگ سکتی ہے، وہ لاجونتی کے پودے کی طرح ہے جس کی طرف ہاتھ بھی بڑھاؤ تو کمہلا جاتا ہے لیکن اس نے اپنی لاجونتی کے ساتھ بدسلوکی کرنے میں کوئی کسر بھی اٹھا نہ رکھی تھی. وہ اسے جگہ بے جگہ اٹھنے بیٹھنے، کھانے کی طرف بے توجہی برتنے اور ایسے ہی معمولی معمولی باتوں پر پیٹ دیا کرتا تھا.

اور لاجونتی ایک پتلی شہتوت کی ڈال کی طرح نازک سی دیہاتی لڑکی تھی. زیادہ دھوپ دیکھنے کی وجہ سے اس کا رنگ سنولا پڑ چکا تھا. طبیعت میں ایک عجیب طرح کی بے قراری تھی اس کا اضطرار شبنم کے اس قطرے کی طرح تھا جو پارہ کر اس کے بڑے سے پتے پر کبھی ادھر اور کبھی ادھر لڑھکتا رہتا ہے اس کا دبلا پن اس کی صحت کی خرابی ہونے کی دلیل نہ تھی ایک صحت مندی کی نشانی تھی جسے دیکھ کر سندر لال پہلے تو گھبرایا لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاجو ہر قسم کا بوجھ، ہر قسم کا صدمہ حتیٰ کہ مار پیٹ تک سہہ گزرتی ہے تو وہ اپنی بدسلوکی کو بتدریج بڑھاتا گیا اور اس نے ان حدوں کا خیال ہی نہ کیا جہاں پہنچ جانے کے بعد کسی بھی انسان کا صبر ٹوٹ جاتا ہے. ان حدوں کو دھندلا دینے میں خود لاجونتی بھی تو ممد ثابت ہوئی تھی، چونکہ وہ دیر تک اداس نہ بیٹھ

سکتی تھی اس لیے بڑی سے بڑی لڑائی کے بعد بھی سندرلال کے صرف ایک بار مسکرا دینے پر وہ اپنی ہنسی نہ روک سکتی تھی اور لپک کر اس کے پاس چلی آتی اور گلے میں بانہیں ڈال کر کہتی — "پھر مارا تو میں تم سے نہیں بولوں گی ......" صاف پتہ چلتا تھا وہ ایک دم ساری مارپیٹ بھول چکی ہے۔ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ مرد ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں بلکہ عورتوں میں کوئی بھی سرکشی کرتی تو لڑکیاں خود ہی ناک پر انگلی رکھ کر کہتیں —— لے وہ بھی کوئی مرد ہے بھلا، عورت جس کے قابو میں نہیں آتی ......" اور یہ مارپیٹ ان کے گیتوں میں چلی گئی تھی۔ خود لاجو گایا کرتی تھی۔ میں شہر کے لڑکے سے شادی نہ کروں گی۔ وہ بوٹ پہنتا ہے اور میری کمر بہت پتلی ہے۔ لیکن پہلی ہی فرصت میں لاجو نے گاؤں کے لڑکے سے لو لگا لی اور اس کا نام تھا سندرلال۔ جو ایک برات کے ساتھ لاجونتی کے گاؤں چلا آیا تھا اور جس نے دولہے کے کان میں صرف اتنا سا کہا تھا ——
"تیری سالی تو بڑی نمکین ہے یار۔ بیوی بھی چٹ پٹی ہوگی"۔ — لاجونتی نے سندرلال کی اس بات کو سن لیا تھا۔ مگر وہ یہ بات بھول ہی گئی کہ سندرلال کیسے بڑے بڑے اور بھدے بوٹ پہنے ہوئے ہے اور اس کی کمر کتنی پتلی ہے!

اور پربھات پھیری کے سمے ایسی ہی باتیں سندرلال کو یاد آئیں اور وہ یہی سوچتا۔ ایک بار صرف ایک بار لاجو مل جائے تو میں اسے سچ مچ ہی دل میں بسا لوں اور لوگوں کو بتا دوں —— ان بے چاری عورتوں کے اغوا ہو جانے میں ان کا کوئی قصور نہیں فسادیوں کی ہوسناکیوں کا شکار ہو جانے میں ان کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ سماج جو ان معصوم اور بے قصور عورتوں کو قبول نہیں کرتا انھیں اپنا نہیں لیتا —— ایک گلا سڑا سماج ہے اور اسے ختم کر دینا چاہیے ...... وہ ان عورتوں کو گھروں میں آباد کرنے کی تلقین کیا کرتا اور انھیں ایسا مرتبہ دینے کی پریرنا کرتا جو گھر میں کسی بھی عورت، کسی بھی ماں، بیٹی، بہن یا بیوی کو دیا جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا —— انھیں اشارے سے بھی ایسی باتوں کی یاد نہ جانے دینا چاہیے جو ان کے ساتھ ہوئیں۔ —— کیونکہ ان کے دل زخمی ہیں۔ وہ نازک ہیں، چھوئی

موئی کی طرح —— ہاتھ بھی لگاؤ تو کمہلا جائیں گے ...

گویا "دل میں بساؤ" پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے محلہ ملا شکور کی اس کمیٹی نے کئی پربھات پھیریاں نکالیں۔ صبح چار پانچ بجے کا وقت ان کے لیے موزوں ترین وقت ہوتا تھا نہ لوگوں کا شور، نہ ٹریفک کی الجھن۔ رات بھر چوکیداری کرنے والے کتے تک بجھے ہوئے تنوروں میں سر دے کر پڑے ہوتے تھے۔ اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہوئے لوگ پربھات پھیری والوں کی آواز سن کر صرف اتنا کہتے —— او! وہی منڈلی ہے! اور پھر کبھی صبر اور کبھی تنگ مزاجی سے وہ بابو سندرلال کا پروپیگنڈہ سنا کرتے۔ وہ عورتیں جو بڑی محفوظ اس پار پہنچ گئی تھیں گوبھی کے پھولوں کی طرح پھیلی پڑی رہتیں اور ان کے خاوند ان کے پہلو میں ڈنٹھلوں کی طرح اکڑے پڑے پڑے پربھات پھیری کے شور پر احتجاج کرتے ہوئے منہ میں کچھ منمناتے چلے جاتے یا کہیں کوئی بچہ تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں کھولتا اور "دل میں بساؤ" کے فریادی اور اندوہگیں پروپیگنڈے کو صرف ایک گانا سمجھ کر پھر سو جاتا۔ لیکن صبح کے سمے کان میں پڑا ہوا شبد بیکار نہیں جاتا۔ وہ سارا دن ایک تکرار کے ساتھ دماغ میں چکر لگاتا رہتا ہے اور بعض وقت تو انسان اس کے معنی کو بھی نہیں سمجھتا پر گنگناتا چلا جاتا ہے۔ اسی آواز کے گھر کر جانے کے بدولت ہی تھا کہ انھیں دنوں جبکہ مس مردولا سارا بھائی ہند اور پاکستان کے درمیان اغوا شدہ عورتیں تبادلے میں لائیں تو محلہ ملا شکور کے کچھ آدمی انھیں پھر بسانے پر تیار ہو گئے۔ ان کے وارث شہر سے باہر چوکی کلاں پر انھیں ملنے کے لیے گئے۔ مغویہ عورتیں اور ان کے لواحقین کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر سر جھکائے اپنے اپنے برباد گھروں کو پھر سے آباد کرنے کے کام پر چل دیے۔ رسالو اور نیکی رام اور سندرلال بابو کبھی "مہندر سنگھ زندہ باد" اور کبھی "سوہن لال زندہ باد" کے نعرے لگاتے اور وہ نعرے لگاتے رہے حتیٰ کہ ان کے گلے سوکھ گئے ......

لیکن مغویہ عورتوں میں ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں، جن کے ماں باپ، بہن بھائیوں نے انھیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر وہ مر کیوں نہ گئیں؟ اپنی عفت اور عصمت کو بچانے کے لیے

انھوں نے زہر کیوں نہ کھا لیا؟ کنوئیں میں چھلانگ کیوں نہ لگا دی؟ وہ بزدل تھیں جو اس طرح زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں۔ سیکڑوں ہزاروں عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے اپنی جان دے دی۔ لیکن انھیں کیا پتہ کہ وہ زندہ رہ کر کس بہادری سے کام لے رہی ہیں۔ کیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے موت کو گھور رہی ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں ان کے شوہروں تک انھیں نہیں پہچانتے پھر ان میں سے کوئی جی بیچ میں اپنا نام دہرا تی ـــــ سہاگ وتی ـــــ سہاگ والی ـــــ اور اپنے بھائی کو جم غفیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا کہتی ـــــ تو بھی مجھے نہیں پہچانتا بہاری؟ میں نے تجھے گودی میں کھلایا تھا رے ـــــ اور بہاری چلا دینا چاہتا تھا۔ پھر وہ ماں باپ کی طرف دیکھتا اور ماں باپ اپنے جگر پر ہاتھ رکھ کر نارائن بابا کی طرف دیکھتے اور نہایت بے بسی کے عالم میں نارائن بابا آسمان کی طرف دیکھتا جو در حقیقت کوئی حقیقت نہیں رکھتا جو صرف ہماری نظر کا دھوکا ہے۔ جو صرف ایک حد ہے۔ جس کے پار ہماری نگاہیں کام نہیں کرتیں۔

لیکن فوجی ٹرک میں مس سارا بھائی تبادلے میں جو عورتیں لائیں ان میں لاجو نہ تھی۔ سندر لال نے امید و بیم سے آخری لڑکی کو ٹرک سے اترتے دیکھا اور پھر اس نے بڑی خاموشی اور بڑے عزم سے اپنی کمیٹی کی سرگرمیوں کو دوچند کر دیا۔ اب وہ صرف صبح کے سمے ہی پربھات پھیری کے لیے نہ نکلتے تھے۔ بلکہ شام کو بھی جلوس نکالنے لگے اور کبھی کبھی ایک آدھ چھوٹا موٹا جلسہ بھی کرنے لگے جس میں کمیٹی کا بوڑھا صدر وکیل کالکا پرشاد صوفی کھنکاروں سے ملی جلی ایک تقریر کر دیا کرتا تھا اور رسالو ایک پیک دان لیے ڈیوڑھی پر ہمیشہ موجود رہتا لاؤڈ اسپیکر سے عجیب طرح کی آوازیں آتیں پھر کہیں نیکی رام محرر چوکی کچھ کہنے کے لیے اٹھتے لیکن وہ جتنی بھی باتیں کہتے اور جتنے بھی شاستروں اور پرانوں کا حوالہ دیتے اتنا ہی اپنے مقصد کے خلاف باتیں کرتے اور یوں میدان ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سندر لال بابو اٹھتا لیکن وہ دو فقروں کے علاوہ کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔ اس کا گلا رک جاتا اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ اور رو ہانسا ہونے کے کارن وہ تقریر نہ کر پاتا۔ آخر بیٹھ جاتا لیکن مجمع پر ایک عجیب طرح کی خاموشی چھا جاتی اور سندر لال بابو کی ان دو باتوں کا جو کہ اس کی دل کی گہرائیوں سے نکلی آتیں وکیل کالکا پرشاد صوفی کی تمام ناصحانہ فصاحت پر بھاری ہوتا لیکن لوگ وہیں رو دیتے اپنے جذبات کو آسودہ کر لیتے اور پھر خالی الذہن گھر کو لوٹ آتے۔

ایک روز کمیٹی والے سانجھ کے سمے بھی پرچار کرنے چلے آئے اور ہوتے ہوتے قدامت پسندوں کے گڑھ میں پہنچ گئے۔ مندر کے باہر پیپل کے ایک پیڑ کے نیچے ارد گرد سیمنٹ کے تھڑے پر کئی شردھالو بیٹھے تھے اور رامائن کی کتھا ہو رہی تھی۔ نارائن باوا رامائن کا وہ حصہ سنا رہے تھے جہاں ایک دھوبی نے اپنی دھوبن کو گھر سے نکال دیا تھا اور اس سے کہہ دیا ـــــ میں راجہ رامچندر نہیں جو اتنے سال راون کے ساتھ رہ آنے پر بھی سیتا کو بسا لے گا۔ اور رامچندر جی نے مہا ستونتی سیتا کو گھر سے نکال دیا۔ ـــــ ایسی حالت میں جب کہ وہ گربھ وتی تھی۔ ـــــ کیا اس سے بھی بڑھ کر رام راج کا کوئی ثبوت مل سکتا ہے ـــــ نارائن باوا نے کہا ـــــ یہ ہے رام راج! جس میں ایک دھوبی کی بات کو بھی اتنی ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔"

کمیٹی کا جلوس مندر کے پاس رک گیا تھا اور لوگ رامائن کی کتھا اور شلوک کا ورنن سننے کے لیے ٹھہر گئے تھے سندر لال آخری فقرے سنتے ہوئے کہہ اٹھا۔

"ہمیں ایسا رام راج نہیں چاہیے بابا۔"

"چپ رہو جی ـــــ تم کون ہوتے ہو؟ ـــــ خاموش!" مجمع سے آوازیں آئیں اور سندر لال نے بڑھ کر کہا ـــــ مجھے بولنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

پھر ملی جلی آوازیں آئیں ـــــ خاموش ـــــ ہم نہیں بولنے دیں گے" ـــــ اور کونے میں سے یہ بھی آواز آئی ـــــ "مار دیں گے۔"

نارائن بابا نے بڑی میٹھی آواز میں کہا ـــــ تم شاستروں کی مان مریادا کو نہیں سمجھتے سندر لال!"

سندر لال نے کہا ـــــ "میں ایک بات تو سمجھتا ہوں بابا ـــــ رام راج میں دھوبی کی آواز تو سنی جاتی ہے لیکن سندر لال کی نہیں۔"

انھی لوگوں نے جو ابھی مارنے پر تلے تھے اپنے نیچے سے پیپل کی

گرد نیں ہلادیں اور پھر سے بیٹھتے ہوئے بولے ——— "سنو، سنو، سنو ......"

رسالو اور نیکی رام نے سندر لال بابو کو ٹھوکا دیا اور سندر لال بولے ——— "شری رام نیتا تھے ہمارے۔ پر یہ کیا بات ہے بابا جی ——— انہوں نے دھوبی کی بات کو ستیہ سمجھ لیا، مگر اتنی بڑی مہارانی کے ستیہ پر وشواس نہ کر پائے؟"

نارائن بابا نے اپنی داڑھی کی کھچڑی لہکاتے ہوئے کہا ——— "اس لیے کہ سیتا ان کی اپنی پتنی تھی، سندر لال! تم اس بات کی مہانتا کو نہیں جانتے۔"

"ہاں بابا" ——— سندر لال بابو نے کہا ——— "اس سنسار میں بہت سی باتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں، پر میں سچا رام راج اسے سمجھتا ہوں جس میں انسان اپنے آپ پر بھی ظلم نہیں کر سکتا۔ اپنے آپ سے بے انصافی کرنا اتنا بڑا ہی پاپ ہے جتنا کسی دوسرے سے بے انصافی کرنا۔ آج بھی بھگوان رام نے سیتا کو گھر سے نکال دیا ہے ..... اس لیے کہ وہ راون کے پاس رہ آئی ہے ..... اس میں کیا قصور تھا سیتا کا؟ کیا وہ بھی ہماری بہت سی ماؤں اور بہنوں کی طرح چھل کپٹ کا شکار نہ تھی؟ اس میں سیتا کے ستیہ اور استیہ کی بات ہے یا راون کے وحشی پن کی جس کے دس سر انسان کے تھے لیکن ایک اور سب سے بڑا سر گدھے کا!"

"...... آج ہماری سیتا نردوش ہے گھر سے نکال دی گئی ہے ..... سیتا ...... لاجونتی .... اور سندر لال نے رونا شروع کر دیا۔ رسالو اور نیکی رام نے تمام وہ سرخ جھنڈے اٹھا لیے جس پر آج ہی اسکول کے چھوکروں نے بڑی صفائی سے نعرے کاٹ کر چپکا دیے تھے۔ اور پھر وہ سب "سندر لال بابو زندہ باد" ایک طرف سے آواز آئی ——— "شری رام چندر ———"

اور پھر بہت سی آوازیں آئیں ——— "خاموش! ——— خاموش!" اور نارائن باوا کی مہینوں کی کتھا اکارت چلی گئی۔ بہت سے لوگ جلوس میں شامل ہو گئے جس کے آگے آگے وکیل کالکا پرشاد اور حکم سنگھ، محرر چوکی کلاں جا رہے تھے اپنی بوڑھی چھڑیوں کو زمین پر مارتے اور ایک فاتحانہ سی آواز پیدا کرتے ہوئے ——— اور ان کے درمیان کہیں سندر لال جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہہ رہے تھے۔ آج اس کے دل کو بڑی ٹھیس لگی تھی ——— اور لوگ بڑے جوش کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گا رہے تھے ——— "ہتھ لائیاں کملان نی لاجونتی دے بوٹے!"

ابھی گیت کی آواز لوگوں کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ابھی صبح بھی نہیں ہو پائی تھی اور محلہ ملا شکور کے مکان ۴۱۴ کی بدھوا ابھی تک اپنے بستر میں کربناک سی انگڑائی لے رہی تھی کہ سندر لال کا "گرائیں" لال چند جسے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے سندر لال اور خلیفہ کالکا پرشاد نے راشن ڈپو لے دیا تھا، دوڑا دوڑا آیا اور اپنی گاڑھے کی چادر سے ہاتھ پھیلائے ہوئے بولا۔

"بدھائی ہو سندر لال"

سندر لال نے میٹھا گڑ چلم میں رکھتے ہوئے کہا ——— "کس بات کی بدھائی لال چند؟"

"میں نے لاجو بھابی کو دیکھا ہے۔"

"سندر لال کے ہاتھ سے چلم گر گئی اور میٹھا تمباکو فرش پر گر گیا ——— کہاں دیکھا ہے؟" اس نے لال چند کو کندھوں سے پکڑتے ہوئے پوچھا اور جلد جواب نہ پانے پر جھنجھوڑ دیا۔

"واگہ کی سرحد پر۔"

سندر لال نے لال چند کو چھوڑ دیا اور اتنا سا بولا ——— "کوئی اور ہو گی۔"

لال چند نے یقین دلاتے ہوئے کہا ——— "نہیں بھیا وہ لاجو ہی تھی لاجو ......"

"تم اسے پہچانتے بھی ہو؟" سندر لال نے پھر سے میٹھے تمباکو کو فرش پر سے اٹھاتے اور ہتھیلی پر مسلتے ہوئے پوچھا اور ایسا کرتے ہوئے اس نے رسالو کی چلم حقے پر سے اٹھا لی اور بولا "بھلا کیا پہچان ہے اس کی؟"

"ایک تیندولہ ٹھوڑی پر ہے، دوسرا گال پر ———"

"ہاں ہاں ہاں" اور سندر لال نے خود ہی کہہ دیا ———

تمیرا ملتے پر۔ وہ نہیں چاہتا تھا اب کوئی غدش رہ جائے اور پیام اسے لاجونتی کے جانے پہلے جسم کے سارے تینڈوے آ گئے تو اس نے بچپنے میں اپنے جسم پر تینڈولے اتنے تو ان ہلکے ہلکے سبز دانوں کی مانند تھے جو چھوئی موئی کے پودے کے بدن پر ہوتے ہیں اور جس کی طرف اشارے کرتے ہی وہ کمہلانے لگتا ہے بالکل اسی طرح ان تینڈولوں کی طرف انگلی کرتے ہی لاجونتی شرما جاتی ہے اور گم ہو جاتی تھی، اپنے آپ میں سمٹ جاتی تھی گویا اس کے سب راز کسی کو معلوم ہو گئے ہوں۔ اور کسی نامعلوم خزانے کے لٹ جانے سے وہ مفلس ہو گئی ہو ——— سندر لال کا سارا جسم ایک انجانے خوف، ایک انجانی محبت اور اس کی مقدس آگ میں پھنکنے لگا۔ اس نے پھر لال چند کو پکڑ لیا اور پوچھا۔

"لاجو واگہ کیسے پہنچ گئی ———؟"

لال چند نے کہا ——— ہند اور پاک میں عورتوں کا تبادلہ ہو رہا تھا نا ———"

"پھر کیا ہوا ———؟" سندر لال نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا ——— "کیا ہوا پھر؟"

رسالو بھی اپنی چارپائی پر اٹھ بیٹھا اور تمباکو نوشوں کی مخصوص کھانسی کھانستے ہوئے بولا۔ ——— "سچ مچ آ گئی ہے لاجونتی بھابی؟"

لال چند نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ——— واگہ سرحد پر سولہ عورتیں پاکستان نے دے دیں اور اس کے عوض سولہ عورتیں لے لیں ——— لیکن ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ہمارے والنٹیر اعتراض کر رہے تھے کہ تم نے جو عورتیں دی ہیں ان میں ادھیڑ بوڑھی اور بیکار عورتیں زیادہ ہیں۔ اس تنازع پر لوگ جمع ہو گئے اس وقت ادھر کے والنٹیروں نے لاجونتی بھابی کو دکھاتے ہوئے کہا ——— تم اسے بوڑھی کہتے ہو؟ ——— دیکھو ——— دیکھو تم نے جتنی عورتیں دی ہیں ایک بھی برابری کرتی ہے اس کی؟ اور وہاں لاجو بھابی سب کی نظروں کے سامنے اپنے تینڈولے چھپا رہی تھی۔"

پھر جھگڑا بڑھ گیا۔ دونوں نے اپنا اپنا 'مال' واپس لے لینے کی ٹھان لی۔ میں نے شور مچایا ——— لاجو ——— لاجو بھابی ——— مگر ہماری فوج کے سپاہیوں نے ہمیں ہی مار کر بھگا دیا اور لال چند اپنی کہنی دکھانے لگا، جہاں اسے لاٹھی پڑی تھی۔ رسالو اور نیکی رام چپ چاپ بیٹھے رہے اور سندر لال کہیں دور دیکھنے لگا۔ شاید سوچنے لگا۔ لاجو آئی بھی پر نہ آئی اور سندر لال کی شکل ہی سے جان پڑتا تھا جیسے وہ بیکانیر کا صحرا پھاند کر آیا ہے اور اب کہیں درخت کی چھاؤں میں زبان نکالے ہانپ رہا ہے۔ منہ سے اتنا بھی نہیں نکلتا ——— "پانی دے دو۔" اسے یوں محسوس ہوا، بٹوارے سے پہلے اور بٹوارے کے بعد کا تشدد ابھی تک کارفرما ہے۔ صرف اس کی شکل بدل گئی ہے۔ اب لوگوں میں پہلا سا دریغ بھی نہیں رہا۔ کسی سے پوچھو، سانبھر والا میں لہنا سنگھ رہا کرتا تھا اور اس کی بھابی بنتو ——— تو وہ جھٹ سے کہتا "مر گئے" اور اس کے بعد موت اور اس کے مفہوم سے بالکل بے خبر بالکل عاری آگے چلا جاتا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر ٹھنڈے دل سے تاجر، انسانی مال، انسانی گوشت اور پوست کی تجارت اور اس کا تبادلہ کرنے لگے۔ مویشی خریدنے والے کسی بھینس یا گائے کا جبڑا ہٹا کر دانتوں سے اس کی عمر کا اندازہ کرتے تھے۔

اب وہ جوان عورت کے روپ، اس کے نکھار، اس کے عزیز ترین رازوں، اس کے تینڈولوں کی شارع عام میں نمائش کرنے لگے۔ تشدد اب تاجروں کی نس نس میں بس چکا ہے۔ پہلے منڈی میں مال بکتا تھا اور بھاؤ تاؤ کرنے والے ہاتھ ملا کر اس پر ایک رومال ڈال دیتے اور یوں "گپتی" کر لیتے گویا رومال کے نیچے انگلیوں کے اشاروں سے سودا ہو جاتا تھا اب گپتی کا رومال بھی ہٹ چکا تھا۔ اور سامنے سودے ہو رہے تھے اور لوگ تجارت کے آداب بھی بھول گئے تھے۔ یہ سارا لین دین یہ سارا کاروبار پرانے زمانے کی داستان معلوم ہو رہا تھا جس میں عورتوں کی آزادانہ خرید و فروخت کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ ازبک ان گنت عریاں عورتوں کے سامنے کھڑا ان کے جسموں کو ٹوہ ٹوہ کے دیکھ رہا ہے اور جب وہ کسی عورت کے جسم کو انگلی لگاتا ہے تو اس پر ایک گلابی سا گڑھا پڑ جاتا ہے۔ اور اس کے اردگرد ایک زرد سا حلقہ اور پھر زردیاں اور سرخیاں ایک دوسرے کی جگہ لینے کے لیے

دوڑتی ہیں ...... از بیک آگے گزر جاتا ہے اور ناقابلِ قبول عورت ایک اعترافِ شکست، ایک انفعالیت کے عالم میں ایک ہاتھ سے ازار بند تھامے اور دوسرے سے اپنے چہرے کو عوام کی نظروں سے چھپائے سسکیاں لیتی ہے۔

سندر لال امرت سر (سرحد) جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے لاجو کے آنے کی خبر ملی۔ ایک دم ایسی خبر آ جانے سے سندر لال گھبرا گیا۔ اس کا ایک قدم فوراً دروازے کی طرف بڑھا لیکن وہ پیچھے لوٹ آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ روٹھ جائے اور کمیٹی کے تمام پلے کارڈوں اور جھنڈیوں کو بچھا کر بیٹھ جائے اور پھر روئے لیکن وہاں جذبات کا یوں مظاہرہ ممکن نہ تھا۔ اس نے مردانہ وار اس اندرونی کشاکش کا مقابلہ کیا اور اپنے قدموں کو ناپتے ہوئے چوکی کلاں کی طرف چل دیا کیونکہ وہی جگہ تھی جہاں مغویہ عورتوں کی ڈلیوری دی جاتی ہے۔

اب لاجو سامنے کھڑی تھی اور ایک خوف کے جذبے سے کانپ رہی تھی وہی سندر لال کو جانتی تھی اس کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا اور اب جب کہ وہ غیر مرد کے ساتھ زندگی کے دن بتا کے آئی تھی، نہ جانے کیا کرے گا؟ سندر لال نے لاجو کی طرف دیکھا۔ وہ خالص اسلامی طرز کا لال دوپٹہ اوڑھے تھی اور بائیں بکل مارے ہوئے تھی...... عادتاً محض عادتاً ـــــ دوسری عورتوں میں گھل مل جانے اور بالآخر اپنے صیاد کے دام سے بھاگ جانے کی آسانی تھی اور وہ سندر لال کے بارے میں اتنا زیادہ سوچ رہی تھی کہ اسے کپڑے بدلنے یا دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھنے کا بھی خیال نہ رہا وہ ہندو اور مسلمان کی بنیادی تہذیب کے بنیادی فرق ـــــ دائیں بکل اور بائیں بکل میں امتیاز کرنے سے قاصر رہی تھی اب وہ سندر لال کے سامنے کھڑی تھی اور کانپ رہی تھی ایک امید اور ایک ڈر کے جذبے کے ساتھ۔

سندر لال کو دھچکا سا لگا۔ اس نے دیکھا لاجونتی کا رنگ کچھ نکھر سا گیا تھا اور وہ پہلے کی بہ نسبت کچھ تندرست سی نظر آتی تھی۔ نہیں وہ موٹی ہو گئی تھی۔ سندر لال نے جو کچھ لاجو کے بارے میں سوچ رکھا تھا وہ سب غلط تھا وہ سمجھتا تھا غم میں گھل گھل کر لاجونتی بالکل مریل ہو گئی ہو گی اور آواز اس کے منہ سے نکالے نہ نکلتی ہو گی۔ اس خیال سے کہ وہ پاکستان میں بڑی خوش رہی ہے اسے بڑا صدمہ ہوا لیکن وہ چپ رہا کیونکہ اس نے چپ رہنے کی قسم کھا رکھی تھی اگرچہ وہ نہ جان پایا کہ اتنی خوش تھی تو پھر ملی کیوں آ گئی؟ اس نے سوچا شاید ہند سرکار کے دباؤ کی وجہ سے اسے اپنی مرضی کے خلاف یہاں آنا پڑا ـــــ لیکن ایک چیز وہ نہ سمجھ سکا کہ لاجونتی کا سنولایا ہوا چہرہ زردی لیے ہوئے تھا اور غم۔ محض غم سے اس کے بدن کے گوشت نے ہڈیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ غم کی کثرت سے موٹی ہو گئی تھی اور صحت مند نظر آتی تھی لیکن یہ ایسی صحت مندی تھی جس میں دو قدم چلنے پر آدمی کا سانس پھول جاتا ہے......

مغویہ کے چہرے پر پہلی نظر ڈالنے کا تاثر کچھ عجیب سا ہوا لیکن اس نے سب خیالات کا ایک اثباتی مردانگی سے مقابلہ کیا اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے کسی نے کہا ـــــ "ہم نہیں لیتے مسلمران (مسلمان) کی جھوٹی عورت۔"

اور یہ آواز رسالو، نیکی رام اور چوکی کلاں کے بوڑھے محرر کے نعروں میں گم ہو کر رہ گئی۔ ان سب آوازوں سے الگ کالکا پرشاد کی پھٹتی اور چلاتی آواز آ رہی تھی وہ کھانس بھی لیتا اور بولتا بھی جاتا۔ وہ اس نئی حقیقت، اس نئی شدھی کا شدت سے قائل ہو چکا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آج اس نے کوئی نیا وید، کوئی نیا پران اور شاستر پڑھ لیا ہے اور اپنے اس حصول میں دوسروں کو بھی حصے دار بنانا چاہتا ہے۔ ان سب لوگوں ـــــ اور ان آوازوں میں گھرے ہوئے لاجو اور سندر لال اپنے ڈیرے کو جا رہے تھے اور ایسا جان پڑتا تھا جیسے ہزاروں سال پہلے کے رام چندر اور سیتا کسی بہت لمبے اخلاقی بن باس کے بعد اجودھیا لوٹ رہے ہیں ایک طرف تو لوگ خوشی کے اظہار میں دیپ مالا کر رہے ہیں اور دوسری طرف انھیں اتنی لمبی اذیت پر تاسف بھی ہے۔

لاجونتی کے چلے آنے پر سندر لال بابو نے اسی شد و مد سے "دل میں بساؤ" پروگرام کو جاری رکھا اس نے قول و فعل دونوں اعتبار سے اسے نبھا دیا تھا اور وہ لوگ جنھیں سندر لال کی باتوں میں

خالی خولی جذباتیت نظر آتی تھی، قائل ہونا شروع ہوئے۔ اکثر لوگوں کے دلوں میں خوشی تھی اور بیشتر کے دل میں افسوس۔ مکان ۴۱۴ کی بیوہ کے علاوہ محلہ ملا شکور کی بہت سی عورتیں سندر لال بابو سوشل ورکر کے گھر آنے سے گھبراتی تھیں۔

لیکن سندر لال کو کسی کی اعتنا یا بے اعتنائی کی پروا نہ تھی۔ اس کے دل کی رانی آ چکی تھی اور اس کے دل کا خلا پٹ چکا تھا۔ سندر لال نے لاجو کی سورن مورتی کو اپنے دل کے مندر میں استھاپت کر لیا تھا اور خود دروازے پر بیٹھا اس کی حفاظت کرنے لگا تھا۔ لاجو جو پہلے خوف سے سہمی رہتی تھی، سندر لال کی غیر متوقع نرم سلوک کو دیکھ کر آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔

سندر لال لاجونتی کو اب لاجو کے نام سے نہیں پکارتا تھا، وہ اسے کہتا تھا "دیوی" اور لاجو ایک ان جانی خوشی سے پاگل ہوئی جاتی تھی۔ وہ کتنا چاہتی تھی کہ سندر کو اپنی واردات کہہ سنائے اور سناتے سناتے اس قدر روئے کہ اس کے سب گناہ دھل جائیں۔ لیکن سندر لال جو لاجو کی وہ باتیں سننے سے گریز کرتا تھا اور لاجو اپنے کھل جانے میں بھی ایک طرح سے سمٹتی رہتی۔ البتہ جب سندر لال سو جاتا تو وہ اسے دیکھا کرتی اور اپنی اس چوری میں پکڑی جاتی۔ اور جب سندر لال اس کی وجہ پوچھتا تو وہ "نہیں" "یونہی" "اونہوں" کے سوا کچھ نہ کہتی اور سارے دن کا تھکا ہارا سندر لال پھر اونگھ جاتا۔ ...... البتہ شروع شروع میں ایک دفعہ سندر لال نے لاجونتی کے سیاہ دنوں کے بارے میں صرف اتنا سا پوچھا تھا:

"کون تھا وہ؟"

لاجونتی نے نگاہیں نیچے کرتے ہوئے کہا —— "جماں"
پھر وہ اپنی نگاہیں سندر لال کے چہرے پر جما کر کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سندر لال ایک عجیب سی نظروں سے لاجونتی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لاجونتی نے پھر آنکھیں نیچی کر لیں اور سندر لال نے پوچھا۔

"اچھا سلوک کرتا تھا وہ؟"

"ہاں۔"

"مارتا تو نہیں تھا؟"

لاجونتی نے اپنا سر سندر لال کی چھاتی پر سرکاتے ہوئے کہا ——
"نہیں ...... اور پھر بولی:
"وہ مارتا نہیں تھا، پر مجھے اس سے زیادہ ڈر آتا تھا۔ تم مجھے مارتے بھی تھے پر میں تم سے ڈرتی نہیں تھی ...... اب تو نہ مارو گے؟"
سندر لال کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور اس نے بڑی ندامت اور بڑے تاسف سے کہا —— "نہیں دیوی! —— اب نہیں ...... ماروں گا ......"

"دیوی!" لاجونتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی۔

اور اس کے بعد لاجونتی سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی لیکن سندر لال نے کہا —— "جانے دو بیتی باتیں! اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟ اس میں قصور ہے ہمارے سماج کا جو تجھ ایسی دیویوں کو عزت کی جگہ نہیں دیتا۔ وہ تمہاری ہانی نہیں کرتا، اپنی کرتا ہے۔"

اور لاجونتی کے من کی من ہی میں رہی۔ وہ کہہ نہ سکی ساری بات اور چپکی دبکی پڑی رہی اور اپنے بدن کی طرف دیکھتی رہی جو کہ بٹوارے کے بعد اب 'دیوی' کا بدن ہو چکا تھا۔ لاجونتی کا نہ تھا —— وہ بہت خوش تھی —— بہت خوش۔ لیکن ایک ایسی خوشی میں سرشار جس میں ایک شک تھا اور وسوسے —— وہ لیٹی لیٹی اچانک بیٹھ جاتی جیسے اچانک انتہائی خوشی کے لمحوں میں کوئی آہٹ پا کر ایکا ایکی اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔

جب بہت سے دن بیت گئے تو خوشی کی جگہ پورے شک نے لے لی۔ اس لیے نہیں کہ سندر لال بابو نے پھر وہی پرانی بدسلوکی شروع کر دی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ لاجو سے بہت ہی اچھا سلوک کرنے لگا تھا۔ ایسا سلوک جس کی لاجونتی کو توقع نہ تھی ...... وہ سندر لال کی وہی پرانی لاجو ہونا چاہتی تھی جو گاجر سے لڑ پڑتی اور مولی سے مان جاتی —— لیکن اب لڑائی کا سوال ہی نہ تھا —— سندر لال نے اسے یہ محسوس کرا دیا جیسے وہ —— لاجونتی کوئی کانچ کی چیز ہو جو چھوتے ہی ٹوٹ جائے گی —— اور لاجو آئینے میں اپنے سراپا کی طرف دیکھتی اور آخر اس نتیجے پر پہنچتی کہ وہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے پر لاجو نہیں ہو سکتی۔ وہ بس گئی، پر اجڑ گئی ...... سندر لال کے پاس اس کے آنسو دیکھنے کے لیے آنکھیں نہ تھیں اور نہ آہیں سننے کے لیے کان! پربھات پھیریاں نکلتی رہیں اور محلہ ملا شکور کا سدھارک رسالو اور نیکی رام کے ساتھ مل کر اسی آواز میں گاتا رہا۔

"ہتھ لائیاں کملان نی لاجونتی دے بوٹے ......"

(اپنے دُکھ مجھے دے دو —— مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی —— ۱۹۶۲ء)

اک گذارش ہے بس اتنا کیجئے
جب کبھی فرصت ہو آیا کیجئے



PHONES : 269880
264981
ESTD. 1913

RIGHT PALACE
FOR
MUGHLAI FOODS
PHONES : 269880
264981
ESTD. 1913

KARIM'S
HOTEL
JAMA MASJID
DELHI-110006
PHONES : 269880
264981
ESTD. 1913

ORDERS
ARE ALSO
ENTERTAINED

ORDERS
ARE ALSO
ENTERTAINED

A GLORIOUS PALACE
FOR MUGHLAI
FOODS

عمدہ اور لذیذ
کھانوں کا مرکز
فون نمبر: ۲۶۹۸۸۰-۲۶۴۹۸۱
قائم شدہ ۱۹۱۳

FAMOUS FOR
BEST LUNCH
&
DINNER
ORDERS ARE ALSO ENTERTAINED
PHONES : 269880
264981
ESTD. 1913

ORDERS
ARE ALSO
ENTERTAINED

ORDERS
ARE ALSO
ENTERTAINED



ناشتے
میں
بکرے کی نہاری و پائے
عمدہ و لذیذ

SPECIALISTS IN:
SEEKH KABAB,
QORMA, ISHTOO,
CHICKEN, BIRYANI,
NARGISI KOFTA,
SHAMI KABAB,
ROMALI, NAN ETC.
PHONES : 269880
264981
ESTD. 1913

کریم ہوٹل جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶

کرشن چندر



جرا جری

جرا اور جری پونچھ کے پہاڑی علاقے میں چھانجل گاؤں میں رہتے تھے۔ چھانجل گاؤں علیا آباد روڑی کو جاتے ہوئے رستے میں پڑتا ہے۔ یہاں پر ایک کہستانی سلسلہ ختم ہوتا ہے اور دوسرا کہستانی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اور ان دونوں سلسلوں کے درمیان ایک تنگ، گہری سی گھاٹی میں ایک پہاڑی نالہ بہت زور شور سے بہتا ہوا پتھروں اور چٹانوں سے سر پٹکتا ہوا پونچھ کے میدانوں کی طرف چلا جاتا ہے، یہاں پر اس گہری گھاٹی کو پاٹ کر ایک لکڑی کا پل بنایا گیا ہے اور چھانجل گاؤں اس پل کے دونوں طرف اونچے نیچے ٹیکروں پر نالے کے دونوں طرف آباد ہوتا چلا گیا۔ جدھر جدھر نالہ چلتا ہے اُدھر اُدھر دھان کے کھیت جاتے ہیں اور گاؤں کے گھر، مردوں کے ہل، عورتوں کی محبت اور بچوں کی ہنسی جاتی ہے، اور زمین، پانی اور محبت کا ایک عجیب سا مثلث بنتا چلا جاتا ہے، اور اس مثلث میں کوئی کمی نہیں ہے کتنی معمولی سی بات ہے۔

جرا اور جری کی زندگیاں بھی اس معمولی سے دھڑے پر گذر رہی تھیں۔ جرا کا گھراٹ (پن چکی) نالے کے اس پار تھا۔ جہاں وہ اسی گھراٹ سے ملے ہوئے ایک چھوٹے سے گھر میں اپنی بوڑھی ماں اور باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ اور جری ندی کے اس طرف بھیڑ بکریاں چرایا کرتی تھی۔ دونوں کے بیچ میں لکڑی کا پل تھا جو چھانجل گاؤں کے دونوں حصوں کو ملاتا تھا اور پونچھ سے علیا آباد اور روڑی آتے جاتے مسافروں اور قافلوں کی آمد و رفت کے لیے بڑی آسانی بہم پہونچاتا تھا۔ سرِ شام کئی قافلے یہاں آکر پل کے دونوں طرف قیام کرنے کے لیے رکتے۔ پن چکی والے جرے سے آٹا پسوایا جاتا۔ جری کے بکروال باپ سے گائے بھینسوں کا دودھ طلب کیا جاتا۔ جری دودھ بھری مٹکی سر پر اٹھائے پل کے اس پار اور اُس پار سے اِس پار جاتی اور دن میں کئی بار جرے کے سامنے سے گذر جاتی۔ جو اس کی طرح سر پر بکرے کی کھال میں آٹا رکھے قافلے والوں کو آٹا پہونچانے جاتا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر کئی مرتبہ دیکھا تھا لیکن جانا تھا۔ دیکھنے اور جاننے میں بہت فرق ہے۔ اور پھر جرا اور جری بہت ہی معمولی قسم کے لوگ تھے۔ جری سانولے رنگ کی ایک لڑکی تھی۔ جس کی آنکھوں میں، نگاہوں میں، لبوں میں، چال ڈھال میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ وہ دن بھر اپنے باپ کے گلّے کی بھیڑ بکریاں ہانکتی، بھینسیں نالے کے کنارے کنارے چرایا کرتی اور دوپہر کو ندی کے تلّے کے درمیان جو چنار کا درخت کھڑا تھا اس کے سائے میں اپنے ڈھور ڈنگر لا کھڑا کرتی اور خود آرام سے کسی بھیڑ کے بچّے یا بکری کے میمنے کو گود میں لے کر یا تو سو جاتی یا پہاڑی گیت گایا کرتی۔ ایسے پہاڑی گیت جو اس کی طرح ہزاروں پہاڑی لڑکیاں شب و روز گاتی ہیں ان پہاڑی گیتوں میں بھی کوئی نئی بات نہ تھی۔ یہ پہاڑی گیت جری سے پہلے اس کے سامنے گائے گئے تھے۔ اور اس کی ماں نے اپنی ماں سے سیکھے تھے۔ اور اس کی ماں نے اپنی ماں سے... مطلب یہ کہ یہ گیت نئے نہیں تھے۔ اس میں جری نے ایک لفظ بھی اپنی طرف سے نہیں بڑھایا تھا۔ یہ گیت پہاڑوں کی طرح پرانے تھے اور دھان کے کھیتوں کی طرح جانے پہچانے تھے اور جرے نے ہزاروں لڑکیوں کے لبوں سے سنے تھے۔ اس لیے اچھے معلوم ہونے کے باوجود ان میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ خود جرا کہاں کا یوسف تھا۔ اس کے خد و خال موٹے اور بھدّے تھے رنگ کالا تھا۔ اور بلا وجہ

ہنسنے کی اس میں بہت بری عادت تھی۔ اس کے ہاتھ موٹے چوڑے اور چکلے تھے۔ اور وہ اکثر اپنی ٹانگیں جن پر بہت سخت اور کھردرے بال تھے بطخ کی طرح پھیلا کر چلتا تھا اور اپنے سر پر آٹے کی ڈیڑھ من کی کھال بہت آسانی سے رکھ کر پل کے اس پار سے اُس پار سے جا سکتا تھا۔ لیکن یہ بھی کوئی خاص بات نہ تھی، ہزاروں پہاڑی مرد شب و روز اس سے بھی زیادہ بوجھ اٹھاتے ہیں اس لیے جبری نے اس میں کوئی ایسی بات نہ دیکھی جو اسے اپنی طرف کھینچ سکتی۔

ہاں ایک صبح اس نے کچھ بہت عجیب و غریب سا محسوس کیا — معمولی سے معمولی فرد کی زندگی میں بھی ایک صبح ایسی آتی ہے جو بہت عجیب و غریب ہوتی ہے۔ حالانکہ اس دن صبح جبری نے پہلے پہل کوئی بات نہیں دیکھی۔ دوسری صبحوں کی طرح یہ بھی ایک صبح تھی۔ وہی گاؤں تھا وہی گھر تھا۔ جانڈی (مویشی خانے) سے جانوروں کے ڈکرانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ اٹھی۔ اس نے کھال میں ہاتھ ڈال کر دیکھا کھال میں آٹا نہیں تھا۔ اس نے دوسری کھال میں مکئی کے دانے بھرے اور صبح صبح ہی آٹا پسانے چل دی۔ کیونکہ اگر وہ پہلے جانوروں کو کھول دے گی تو آٹا کس وقت پسائے گی۔ اور صبح کا کھانا کب تیار ہوگا۔ اس کا باپ ابھی تک کھاٹ پر سویا ہوا تھا۔ وہ دبے پاؤں آنگن سے نکلی اور پل کی طرف ہولی۔ بالکل سیکڑوں ہزاروں لاکھوں صبحوں کی طرح آج بھی وہی صبح تھی، وہی رستہ تھا، وہی دھند لکا تھا۔ نالے کا وہی شور تھا، پُل کے تختے اسی طرح اوس میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بائیسواں تختہ اور پھر ستائیسواں تختہ اور پھر اٹھائیس سے تیس تک کے تختے پاؤں رکھنے میں ہلنے لگتے تھے۔ اور ہر بار اسے گمان ہوتا تھا کہ وہ اب گری، لیکن جانے کب سے یہ لکڑی کے پُل کے تختے ہل رہے تھے۔ اور ہلنے کے باوجود اپنی جگہ پر سلامت تھے۔ پہلے وہ لکڑی کے تختے گِنا کرتی تھی اور ہلتے ہوئے تختوں پر بہت احتیاط سے قدم رکھا کرتی تھی۔ لیکن اب اس نے یہ گنتی چھوڑ دی تھی۔ اب اس کے قدم خود بخود ہل رہے تیز تیز ہلتے جاتے اور ہلتے ہوئے تختوں پر خود بخود ہزاروں دِل سے دھیمے دھیمے ہٹتے جاتے تھے۔ قدموں نے تختوں کو پہچان لیا تھا۔ اور گنتی خود بخود اُن پر نقش ہو گئی تھی لیکن جبری کو اس تبدیلی کا کوئی احساس نہ ہوا کیونکہ یہ صبح دوسری صبحوں کی طرح جانی پہچانی یک رنگ اور ہموار تھی۔ وہ بہت آسانی سے پل پر سے گذر کر گھراٹ کے اندر چلی گئی۔

ہاں گھراٹ کے اندر جاتے ہی وہ ایک لمحے کے لیے بھٹکی اور کچھ ناامید سی ہو گئی، کیونکہ گھراٹ چل نہیں رہا تھا۔ جبرا چکی کے پاٹ کھولے، ہتوڑا اور کیلا ہاتھ میں لیے پاٹ کے دندانے درست کر رہا تھا۔ اس نے جبری کو اندر آتے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ دوسرے لمحے میں وہ نظریں نیچی کرکے کیلے کو ہتوڑے سے ٹھونک رہا تھا۔

جبری نے کہا: "آٹا پسانا ہے"

جبرے نے کہا: "تو پھر میں کیا کروں؟"

جبری نے کہا: "گھراٹ چلاؤ"

جبرے نے کہا: "کیسے چلاؤں۔ دیکھتی نہیں ہو۔ پاٹ کی دھار ٹھیک کر رہا ہوں"

جبری بولی: "لیکن مجھے جلد ہی واپس جانا ہوگا"

"ہاں سبھی یہ کہتے ہیں" جبرا بولا: "دس سال سے میں سن رہا ہوں گاؤں والوں سے۔ کوئی بھلا مانس یہ کہتے نہیں سنا گیا میں جلدی میں نہیں ہوں۔ تم ذرا ٹھہر کر آرام سے اطمینان سے آٹا پسا دو ایسا آج تک کبھی نہیں سنا"

جبرا بے اختیار ہنسنے لگا۔

جبری بولی: "تم مجھ پر ہنستے ہو"

"نہیں۔ یہ تو میری عادت ہے۔ سب جانتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتی ہو؟"

وہ پھر ہنسا۔

جبری کو بہت غصہ آیا۔ لیکن آٹا پسانا تھا۔ اور دور دور تک کہیں کوئی گھراٹ نہ تھا۔ اس لیے چپ رہی۔ جبرا کیلے اور ہتوڑے سے پاٹ ٹھیک کرتا رہا۔ ہتوڑے اور کیلے کی ضربیں نالے کے شور سے مل کر جبری کے کانوں میں ایک بے ہنگم گونج کا تاثر پیدا کرنے لگیں وہ اب کی لجاجت سے بولی۔ لیکن ایسی لجاجت جس میں دبا ہوا غصہ بھی شامل تھا: "میں کب آٹا پسا کے گھر جاؤں گی۔ کب روٹی پکاؤں گی۔ کب ڈھور ڈنگر کھول کر چرانے لے جاؤں گی۔ لوگوں نے ڈھور ڈنگر کھول بھی لیے ہوں گے۔

جرے کو جری کی نحیف آواز کی لجاجت پر بہت ترس آیا اس نے ہتوڑے اور کیلے کو اٹھا کے ایک طرف رکھ دیا۔ اور چکی کے پاٹوں کو احتیاط سے صاف کرنے لگا۔ ورنہ آٹے میں پتھر کے ذرے جائیں گے۔ یہی سوچ کر جری بھی اس کی مدد کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں پاٹ صاف ہو گئے۔ اب معاملہ اوپر کے پاٹ کو گھما کر نچلے پاٹ پر رکھنے کا تھا۔ جری نے پھر مدد کرنی چاہی۔

"ٹھہرو میں خود ٹھیک کروں گا"

"نہیں میں بھی" جری نے مدد کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو ادھر سے ہاتھ لا"۔

جری نے پاٹ کو ادھر سے سہارا دیا جدھر جرے نے اشارہ کیا تھا۔ دوسرے لمحہ میں جرے نے بہت چابک دستی سے پاٹ کو گھما کر نچلے پاٹ پر رکھ دیا۔ یکایک اس کے کانوں میں ایک زور کی چیخ سنائی دی۔

"کیا ہوا!" اس نے جری کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"میری انگلی!" جری بمشکل اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ جرے نے فوراً پاٹ کو اٹھا دیا لیکن اتنی ذرا سی دیر میں انگلی کی آگے کی پور کچلی جا چکی تھی اور اس سے لہو بہہ رہا تھا۔

"میں تم سے کہہ رہا تھا۔ تم پاٹ کے قریب مت آؤ۔" جرا غصے میں بولا۔ جری رونے لگی۔

"تم عورتوں کو رونے کے سوا اور کچھ آتا بھی ہے۔" جرا جری کا شانہ پکڑ کر گھراٹ کے باہر لے گیا۔ جہاں گھراٹ کا پانی پن چکی سے نکل کر آبشار بناتے ہوئے ایک ٹھنڈی کول کی صورت میں دور تک بہتے ہوئے نیچے ندی میں جا ملتا تھا۔ یہاں پر جنگلی سونف، ہینگ اور دھتورے کی جھاڑیاں تھیں۔ جری کے نتھنوں میں پہلے تو جنگلی سونف کی خوشبو آئی دھتورے کے پھولوں کی کڑوی خوشبو آئی۔ پھر جب جرے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے خون آلود ہاتھ کو کول کے ٹھنڈے پانی میں ڈال دیا تو اس کے دل و دماغ پر ایک عجیب خوشبو چھا گئی، جو میٹھی بھی تھی اور کڑوی بھی، اور نشیلی اور غنودگی آمیز بھی۔ ایسی عجیب خوشبو آج تک اس کے ذہن پر کبھی چھائی نہ تھی۔ فرطِ جذبات سے اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ اور اس کے احساسات کے بند بند ڈھیلے ہونے لگے اور اسے یہ معلوم نہ ہوا کہ کب جرے نے اس کی انگلی کا لہو صاف کیا۔ کب اس پر بوٹی کا لیپ کیا۔ کب اپنی قمیص پھاڑ کر اس پر کپڑے کا چیتھڑا باندھا اسے اس وقت ہوش آیا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ جرے کے کندھے سے لگی کھڑی ہے اور جرا اپنے ہاتھوں سے اس کی آنکھوں کے آنسو پونچھ رہا ہے اور اس سے بہت نرم سنہرے اور گہرے لہجے میں کہہ رہا ہے "جری او... جری او جری...."

جری یکایک اس کے کندھے سے الگ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ پہلے اس نے اپنی زخمی انگلی کی طرف دیکھا۔ پھر جرے کی طرف۔ پھر یکایک اس کی نگاہ سامنے پہاڑوں پر ٹھہر گئی اور اسے محسوس ہوا کہ پہاڑوں پر جنگل کھڑے ہیں جنگلوں میں درخت ہیں۔ درختوں پر انگور کی بیلیں ہیں۔ انگور کی بیلوں میں شہد کے چھتے ہیں۔ اور شہد کے چھتوں پر نیلا آسمان جھکا ہوا دھیمے دھیمے سانس لے رہا ہے۔ جری نے حیرت اور استعجاب میں گم ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھا اور اسے محسوس ہوا جیسے ہر روز ہونے والی پرانی صبح نہیں تھی یہ تو کوئی بالکل ہی نئی نویلی نازک نازک سی صبح تھی۔ دھنک کی طرح سہانی سجل اور سب رنگ، ایسی صبح جو آج تک اس کی زندگی میں کبھی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ وہی وقت تھا۔ وہی سماں تھا۔ وہی نالہ تھا۔ وہی سورج تھا۔ یکایک جری نے چونک کر جرے کی طرف دیکھا اور اس لمحے میں اسے احساس ہوا کہ نئی صبح سورج نہیں لاتا ہے آدمی لاتا ہے۔ جرے نے کہا "چلو آٹا پسا لو!"

کونسی نئی بات ہے جو پرانی نہیں ہو جاتی۔ جرے اور جری کی کہانی بھی پرانی ہو گئی۔ چند روز تک گاؤں کے بوڑھے بوڑھوں کی باتوں کا مرکز رہی۔ چند دنوں تک گاؤں کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے دلوں کو برماتی رہی۔ پھر جب جرے کے باپ نے اور جری کے باپ نے آپس میں مشورہ کر کے ان دونوں کے نکاح کے لیے ہاں کر دی تو بات ختم ہو گئی۔ معمولی سی بات تھی، معمولی سی محبت تھی، معمولی سے طریقے سے شروع ہوئی۔ اگلے موسم خزاں میں نکاح کے موقع پر انہی معمولی جانے پہچانے انداز میں ختم ہو جائے گی۔ اللہ اللہ خیر صلا!

لیکن جرا اور جری کے لیے بات ختم نہیں ہوئی۔ وہ تو ابھی شروع ہی ہوئی تھی۔ نکاح کے فیصلہ ہونے کے بعد جری کے باپ نے جری کا پن چکی پر جانا بند کر دیا کیونکہ یہی گاؤں کا رواج تھا۔ اب تو شادی کے بعد ہی جری وہاں جا سکے گی۔ جری جہاں کہیں جرے کو آتا دیکھتی تو وہ دور ہی سے گھونگھٹ نکال لیتی۔ یا منہ موڑ کر کھڑی ہو جاتی کیونکہ گاؤں کا یہی رواج تھا۔ رواج نے محبت کے جذبے پر بند ھ باندھ کر

اس میں گہرائی اور شدت پیدا کر دی۔ اب جری پل کے اُس پار تھی اور جرا پل کے اِس پار۔ کبھی کبھی وہ شام کے ڈھلتے سایوں میں اپنی پن چکی کے دروازے پر کھڑا ہو کر نیچے ندی کے تلے پر بھیڑ بکریاں چرانے والی جری کو دیکھتا، دیکھتا، دیکھتا ہی رہتا۔ یہاں تک کہ جری اس کی نگاہیں اپنے رخساروں پر محسوس کرنے لگی۔ ان کے گال تمتما اٹھے اور وہ اتنی دور ہی سے گھونگھٹ نکال بھیڑ بکریوں کو سونٹی مارنے لگی اور پن چکی کے دروازے پر کھڑا جرا ایک مست آواز میں گانے لگتا

کتیاں وے پار میرا چن وسدا
(ندی کے اس پار میرا چاند رہتا)

اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگتا۔ وہ بلاوجہ ہنستا تھا اور اب اور بھی بلاوجہ ہنسنے لگا تھا لیکن لوگ جو پہلے اس کی ہنسی کی وجہ نہیں سمجھتے تھے اب سمجھنے لگے اور اس لیے اسے معاف کر دیتے تھے۔

پھر ایک طویل انتظار کے بعد چنار کے شعلہ رخ پتوں والی خزاں آئی اور جرا اور جری کے گھر میں شادی کے شادیانے بجنے لگے، اور قبیلے کی عورتیں مختلف رسموں کو ادا کرنے کے لیے پل کے اِس پار سے اُس پار جانے لگیں اور اُس پار سے اِس پار آنے لگیں۔ پل پر آمد و رفت بڑھ گئی۔ کیونکہ اگر سنار کا گھر پل کے اِس پار تھا تو درزی کا گھر اُس پار تھا۔ اگر مانجھی پیر کا مزار اِدھر تھا تو نکاح خوانی والے مولوی ابراہیم کی مسجد اُدھر تھی۔ عجیب گہما گہمی کا عالم تھا۔ پہاڑی راستے بہت تکلیف دہ اور دشوار گزار تھے اس لیے دور دراز کے گاؤں سے دونوں قبیلوں کے رشتہ دار مرد اور عورتیں بیاہ سے کئی دن پہلے چھان جل میں آ گئے تھے اور جو نہیں آئے تھے انھیں بھی شادی سے چار دن پہلے ضرور پہونچنا تھا جس دن مانجھی پیر کے مزار پر نیاز دی جانے والی تھی۔

نیاز کے دن جرا خود سر پر پکوان اٹھائے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے گھر گھر نیاز بانٹتا رہا۔ اور بزرگوں کی دعائیں لیتا رہا۔ دن بھر ڈھلوانیں اترنے اور گھاٹیاں چڑھنے کے بعد وہ بالکل تھک گیا لیکن پھر بھی دن بھر بہت خوش رہا۔ کئی بار نیاز بانٹنے کے سلسلے میں اسے جری کے گھر کے سامنے سے گزرنا پڑا اور شریر لڑکیوں کی نگاہوں اور ان سے زیادہ ان کی شریر گالیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس نے ان گالیوں کا برا نہیں مانا۔ بلکہ ہر بار جری کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے ایک عجیب سی خوشی محسوس کی۔

آج اسے اس بات کا احساس بھی تھا کہ آج کے بعد وہ اب اس طرف اگلے چار روز کے لیے نہیں آ سکے گا اور آئے گا تو صرف شادی کے دن سہرا باندھ کر آ سکے گا۔ اس لیے اس کا جی چاہتا تھا کہ آج جتنی بار وہ اس گھر کے سامنے سے گزر لے اچھا ہے کیا ہوا اگر وہ جری کو نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اس کے سامنے سے تو گزر سکتا ہے۔ اس وقت اسے اس گھر کا ایک ایک کونہ پیارا معلوم ہو رہا تھا۔

اسی شام کو جب وہ پن چکی کے دروازے پر کھڑا شادی کے خوش آئند تصورات میں گم تھا، اس کے دوست دلاور نے پل پر سے بھاگتے ہوئے آ کر اسے بتایا کہ جری کے قبیلے کی عورتیں جری کو لے کے پیر مانجھی کے مزار پر چراغ جلانے کے لیے جا رہی ہیں۔ مانجھی پیر کا مزار پل کے اس پار تھا اور جرے کی پن چکی پل کے اتنی قریب تھی۔ اس لیے ان عورتوں کے گزرنے کا راستہ اس پل کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ اس لیے اگر جرا چاہے تو بغیر کسی تردد کے اپنے دروازے پر انتظار کر کے اپنی جری کو نیا لباس زیب تن کیے بچوں مزار کی طرف جاتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ جرا بے حد خوش ہوا اس نے اپنے دوست کو گلے سے لگا لیا۔ اور وہیں دروازے پر کھڑا کھڑا عورتوں کے جلوس کی راہ تکنے لگا

تھوڑی دیر کے بعد جب شام کا دھندلکا گہرا ہونے لگا تو جرا اور دلاور نے عورتوں کی ایک لمبی قطار کو پل کے اس پار چھانجل کی دور کی ٹیکری سے نکل کر پل کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ ابھی وہ عورتیں بہت دور تھیں اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں پھر ان عورتوں کے گانے کی آواز نالے کے دونوں طرف کھڑے پہاڑوں سے ٹکرا کر گونج پیدا کرتی ہوئی سنائی دینے لگتی۔ عورتیں اب بھی بہت دور تھیں۔ لیکن جرا اتنی دور سے بھی جری کی گہری سرخ رنگ کی شلوار اور قمیص پہچان سکتا تھا۔ اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا اور وہ بہت بے چینی اور بے قراری سے عورتوں کو گھاٹی پر چڑھتے ہوئے پل کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھنے لگا۔

عین اسی وقت آسمان پر دو طیارے نمودار ہوئے۔ ان کے شور اور گڑگڑاہٹ نے آس پاس کے پہاڑوں کو اپنی دہشت ناک گونج سے تھرا دیا۔ جرا اور دلاور نے آج تک ہوائی جہاز نہیں دیکھا

تھا۔ اس لیے انھوں نے اسے کوئی آسمانی بلا سمجھا۔ وہ دونوں خوف اور دہشت سے زمین پہ گر گئے اور اپنی آنکھیں بند کر کے خدا کو یاد کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک زور کا دھماکا ہوا۔ پھر دوسرا پھر تیسرا۔ پھر چوتھا۔ آخری دھماکے پر پل کا بیچ کا حصہ کڑکڑا کر نیچے نالے میں گر گیا۔ نالے کا پانی بلیوں اوپر اچھلا۔ دھرتی کانپی۔ پھر ہوائی جہازوں کی گونج دور ہوتی گئی آخر میں بالکل سناٹا چھا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب جیرے نے آنکھ کھولی تو اس نے دیکھا۔ کہ پل سے دور اس پار خوف زدہ عورتیں چٹانوں میں دبکی پڑی ہیں۔ کچھ غالباً بے ہوش ہو گئی ہیں۔ کچھ وحشی ہرنیوں کی طرح بھاگتی ہوئی واپس اپنے گھروں کو بھاگ رہی ہیں۔ وہ بھاگتا ہوا پل کی طرف دوڑا اور باہیں پھیلا کر چلا چلا کر کہنے لگا۔

جری..... او..... تم کہاں ہو؟

اس کی آواز دور دور تک پہاڑوں سے گونج کر لوٹ آئی اور پل پر بہت آگے نہ جا سکا۔ کیونکہ پل کا درمیانی حصہ ٹوٹ کر نیچے نالے میں گر گیا تھا۔

اس کے چند گھنٹوں بعد اس کے علاقے میں قبائلی پٹھان اور پاکستانی فوج کے جوان میجر عبدالعزیز کی قیادت میں آن پہنچے جیرے کی پن چکی بالکل پل پر ایک اچھے فوجی موقع پر واقع تھی۔ اس لیے انھوں نے اس پر قبضہ کر کے فوجی چوکی قائم کر دی۔ رات بھر پل کے دونوں طرف گولہ باری ہوتی رہی۔ مشین گنیں چلتی رہیں اور جب صبح ہوئی تو جیرے نے دیکھا کہ اس کا اپنا گاؤں آدھا اس طرف ہے اور آدھا اس طرف ہے اور بیچ میں دو سلطنتوں کی فوجیں حائل ہیں۔

جیرا سیاست کو بالکل نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن وہ اپنی شادی کو خوب سمجھتا تھا۔ اسے یہ تو پتہ نہیں چلا کہ ایسا کیوں ہوا۔ لیکن اسے یہ ضرور پتہ چل گیا کہ ایسا ہونے سے اس کی شادی ضرور رک گئی ہے اس کا اسے بہت غصہ تھا۔ بہت رنج تھا۔ لیکن وہ ایک غریب آدمی تھا۔ ایک ڈرا ہوا آدمی تھا۔ اس لیے دو دن تو اپنے غصہ کو دل کے اندر ہی چھپاتے ہوئے بے قراری سے تڑپتا رہا۔ آخر جب اسے کسی طرح چین نہ آیا تو وہ سپاہیوں کی منت سماجت کر کے کسی نہ کسی طرح میجر عبدالعزیز کے سامنے پہنچ گیا

میجر عبدالعزیز شکل و صورت سے نوجوان اور خوش گفتار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بہت دلجمعی سے جیرے کو اپنے پاس بلایا اور اس سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

"میں جیرا ہوں۔"

"جیرا؟ جیرا کسے کہتے ہیں؟"

"بڑے چھوٹے آدمی کو کہتے ہیں"

"لیکن تم تو چھوٹے نہیں نظر آتے۔ اچھے خاصے بڑے ... ہو۔"

میجر عبدالعزیز ہنسا۔ پھر رک کر کہنے لگا۔

"اچھا بتاؤ کیا کام ہے؟"

جیرے نے رک رک کر کہا "حضور کل میری شادی ہے!"

"اچھا تو کیا شادی کی دعوت دینے آئے ہو۔ ... آ ... گے بھئی کہاں ہے تمہاری شادی؟"

جیرے نے پل کے اس پار اشارہ کرتے ... وہاں....."

میجر پہلے تو حیرت سے دیکھنے لگا۔ پھر ... تھا نہیں ہے۔ پل ٹوٹا پڑا ہے۔ ... شادی کیسے ہو سکتی ہے؟

"لیکن کل میری شادی ہے حضور!" جیرے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا "کیا پل پھر نہیں بن سکتا۔ بیچ ہی میں سے تو ٹوٹا ہے حضور۔ اگر حضور ذرا سی کوشش....."

ارے بدھو۔ ہماری کوشش کو رد کرنے والے وہ سامنے چوکی جمائے بیٹھے ہیں۔ کیا سمجھتا ہے تو۔ اگر یہ پل صحیح سلامت ہوتا تو کیا ہم اس وقت تیری شادی کا تذکرہ سننے کے لیے یہاں بیٹھے رہتے۔ بوجھ میں نہ ہوتے؟

میجر عبدالعزیز نے ہاتھ کے اشارے سے جیرے کو رخصت کر دیا۔ مایوس ہو کر وہاں سے چلا آیا۔

اس کی نظر دور جری کے گھر پر گئی۔

کل اس کی شادی ہے۔

شادی کی رات جری کے گھر سناٹا تھا۔ اس کا باپ چپ چاپ اپنے بستر میں دبکا پڑا تھا۔ اس کے رشتہ دار گھاٹیوں اور ڈھلانوں سے ہوتے ہوئے اپنے اپنے گاؤں کو بھاگ گئے تھے۔ جری اکیلی اپنی بستر پر پڑی رو رہی تھی۔ چاروں طرف ایک گہری خاموشی تھی۔ کبھی کبھی گولیوں کے چلنے کی دھائیں دھائیں سنائی دیتی۔ پھر ہر طرف سناٹا چھا جاتا۔

اسی سناٹے میں جری دبے پاؤں اپنے گھر سے نکلی اور ندی کی طرف چلی۔ چھپتی ہوئی چٹانوں کی اوٹ میں سے گزرتی ہوئی وہ

نالے پر پہنچ گئی۔ وہ سوہنی نہ تھی۔ اس کے ہاتھ میں تیرنے کا مٹکا بھی نہ تھا۔ پھر بھی وہ دوسرے کنارے جانے کے لیے بے تاب ہو کر پانی میں گھس گئی۔ اگر اس کا محبوب ادھر نہ آسکتا تھا تو کیا ہوا وہ ادھر جائیگی

کیا ہوا اگر پل ٹوٹ چکا ہے اور پانی کے ریلے طوفانی ہیں۔ اور اسے بہا کر کبھی نیچے لے جاتے ہیں۔ کبھی چٹانوں پر پٹخ دیتے ہیں۔ پھر بھی وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں زخمی ہو چکے ہیں ٹخنوں اور گھٹنوں سے خون جا رہا ہے۔ لیکن آج شادی کی رات ہے اور وہ اپنے شوہر کے پاس ضرور جائے گی اور مولوی ابراہیم کی مسجد میں ضرور نکاح پڑھوائے گی۔ اور یہ نالہ اپنی تمام گھن گرج کے باوجود اسے جانے سے نہیں روک سکتا۔ وہ سیکڑوں بار اس نالے میں تیری ہے۔ بیسیوں بار اس نے اس کے پانی میں بہ جانے والی بھیڑ بکریوں کو بچایا ہے کیا وہ آج اپنی شادی میں نہیں جا سکتی۔ مانا کہ رات اندھیری ہے اور نالہ طوفانی اور خطرناک ہے۔ تو کیا ہوا۔ اس کے دل میں تو کوئی اندھیرا نہیں ہے۔ وہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہاں تو صرف یقین ہی یقین ہے

جبری کئی بار چٹانوں سے ٹکرائی — کئی بار گری اور ڈوبی غوطے کھانے لگی۔ آخر دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ اس کے جسم کا بند بند دکھ رہا تھا۔ جیسے ہر ہڈی چٹخ گئی ہو۔ اس کے دانت سردی سے کٹکٹا رہے تھے۔ پھر بھی اس نے اپنے حوصلے کو مضبوط کیا۔ اور آہستہ آہستہ دبک کر آگے بڑھنے لگی۔ یکایک ایک بھاری پتھر اس کے پاؤں کے نیچے سے پھسل کر دور نیچے تک کھائی میں آواز پیدا کرتے ہوئے گر گیا۔ جبری بہت مشکل سے گرتے گرتے بچی۔ یکایک اس کے کانوں میں آواز آئی۔

"ہالٹ، ہو کمز دیر!"

جبری چٹان کے نیچے دبک گئی۔ بہت دیر تک بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ لیکن اب بیٹھا رہنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ سردی سے اعضا اکڑے جا رہے تھے اگر وہ کچھ دیر اس چٹان کے نیچے دبکی رہی تو شاید سردی سے مر جائے گی۔ اس نے بہت مشکل سے چٹان کے نیچے سے اٹھنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھایا۔

عین اسی وقت ایک گولی ہوا میں تیرتی ہوئی آئی اور اس کی ہتھیلی کو چیرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ جبری ایک چیخ مار کے بے ہوش ہو گئی۔

جب جبری ہوش میں آئی تو اس نے آپ کو سپاہیوں کے نرغے میں پایا سپاہی اسے ہوش میں آتے دیکھ کر میجر عبدالعزیز کے سامنے لے گئے۔ میجر عبدالعزیز بہت غصے میں تھا۔

"تم نے رات کے وقت نالے کو پار کرنے کی کوشش کی؟"

جبری نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تم ہندستان کی جاسوس ہو؟"

"جاسوس کسے کہتے ہیں؟" جبری نے بہت معصومیت سے پوچھا

"اتنی بھولی مت بنو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ جاسوس کی سزا موت ہے؟" میجر عبدالعزیز غصے سے چیخا۔

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا! میں صرف پل ٹوٹ جانے کی وجہ سے نالے کو پار کر کے آئی ہوں"

"کیوں آئی ہو؟"

جبری نے سر جھکا لیا۔

"صاف صاف بتاؤ!"

جبری بہت نحیف آواز میں بولی "آج ... آج میری شادی ہونے والی تھی ... جبرے سے ... وہ پن چکی پر رہتا ہے۔ اسے بلا دو ... وہ مجھے پہچان لے گا۔ تمہیں سب بات بتا دے گا"

میجر سناٹے میں آ گیا۔ بہت دیر تک اس دبلی پتلی سانولی لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک سپاہی کو جبرے کو بلانے کے لیے بھیجا۔ سپاہی تھوڑی دیر کے بعد اکیلا واپس آیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جبرا رات سے غائب ہے۔

جبری کے چہرے پر خوف اور ڈر کے باوجود امید کی جو روشنی باقی تھی یکایک گم ہوتی ہوئی معلوم ہوتی۔ اس کے ہونٹ سسکیوں سے کانپنے لگے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن زبان اس کا ساتھ نہ دے سکی۔ اور وہ اسی وقت بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ ...

میجر عبدالعزیز نے حکم دیا، کہ اس لڑکی کی اچھی طرح نگرانی کی جائے اسے اچھی غذا اور دوا بہم پہنچائی جائے۔

یہ حکم دینے کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ اس کی روداد آپ کو صرف اس کہانی سے مل سکتی ہے۔ اس کی کوئی شہادت، کوئی ثبوت ہندستان اور پاکستان کے کسی اخبار سے مہیا نہیں کیا سکتا۔ نہ ان دونوں

ملکوں کے کسی فوجی ڈسپیچ سے اس کا پتہ چل سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس حد تک ناقابلِ یقین اور محیر العقول ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے کسی فرد کو مشکل ہی سے اس کا یقین آئے گا۔ مجھے خود اس کا یقین نہ ہوتا اگر خوش قسمتی یا بد قسمتی سے ان کرداروں سے نہ مل چکا ہوتا جنہوں نے یہ واقعہ خود مجھ سے بیان کیا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ میجر عبدالعزیز نے ایک خاص طریقے سے اپنی مخالف چوکی کے کمانڈر کیپٹن کپور چند سے گفتگو کی؟ کس طرح گفتگو کی؟ اسے بھی صیغہ راز میں رکھنا چاہتا ہوں۔ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس واقعہ سے بہت عرصہ پہلے عبدالعزیز اور کپور چند گارڈن کالج راولپنڈی میں ساتھ پڑھتے ہوتے تھے۔ برسوں ایک دوسرے کے ہم جماعت رہے۔ برسوں فوج میں بھی ساتھ رہے۔ پھر جب ملک تقسیم ہو گیا تو عبدالعزیز پاکستانی فوج میں چلے گئے اور کپور چند ہندوستانی فوج میں رہ گئے۔ آج اتفاق سے وہ اپنی پرانی دوستی کے باوجود ایک دوسرے کے مخالف چوکیوں پر مشین گنیں لیے بیٹھے تھے۔ ان کی گفتگو بہت دلچسپ تھی۔

عبدالعزیز: "پاکستان زندہ باد!"

کپور چند: "جے ہند جے ہند!"

عبدالعزیز: "ستا اوئے جنبیا!"

کپور چند: "ستا اوئے ڈڈوسا!"

عبدالعزیز: "تیرا ایک جاسوس ہم نے پکڑا ہے کیا بات ہے اب تجھے کوئی مرد جاسوسی کے لیے نہیں ملتا۔ جواب عورتوں کو بھیجنے لگا ہے۔ لیکن مرد ہو یا عورت۔ میں تو تیرے جاسوس کو گولی سے اڑا دوں گا۔"

کپور چند: "گھبراتے نہیں پیارے۔ ایک جاسوس ہم نے بھی پکڑ لیا ہے لیکن وہ عورت نہیں ہے۔ مرد ہے۔ اسلیے اسے گولی مارنے میں اپنے کو کوئی پریشانی نہ ہوگی۔"

عبدالعزیز: "اس جاسوس کا کیا نام ہے؟"

کپور چند: "پہلے تم اس جاسوسہ کا نام بتاؤ۔"

عبدالعزیز: "اس کا نام جری ہے۔"

کپور چند: "اس کا نام جرا ہے۔"

عبدالعزیز: "کالے رنگ کا، ناٹے قد کا مضبوط جسم کا آدمی ہے؟"

کپور چند: "ہاں ہاں وہی۔"

عبدالعزیز: "اسے وہ جاسوس نہیں ہے۔"

کپور چند: "تو پھر کون ہے؟"

عبدالعزیز: "جس لڑکی کو میں نے پکڑا ہے۔ وہ بھی جاسوس نہیں ہے۔"

کپور چند: "تم کیا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ ہمارے ساتھ تو خاصے عقلمند ہوا کرتے تھے۔"

عبدالعزیز: "ستا اوئے بَدو یا تھا۔"

اس کے بعد عبدالعزیز نے اسے ساری روداد سنائی۔ اور اب اس کہانی کے ٹکڑے جوڑنے میں بھی مزہ لینے لگے لیکن سب سے زیادہ لطف اس بات میں آیا کہ جس رات جری چھانگل کے اس پار سے تالے کو عبور کر کے ادھر آئی۔ اسی رات جرا بھی اپنی محبت سے بے چین بے قرار ہو کر ادھر سے ادھر چلا گیا۔

کپور چند: "گویا دونوں محبوب پھر الگ ہیں؟"

یہ کہہ کر کپور چند زور زور سے ہنسنے لگا۔ عبدالعزیز نے ذرا سنجیدہ ہو کر پوچھا۔ "اب کیا کرنا چاہیے؟"

کپور چند: "میرے خیال میں تو ایک دوسرے کی شادی کر دینی چاہیے تم اس لڑکی کو میرے ہاں بھجوا دو۔ میں گولی نہ چلانے کی بندوبست کرتا ہوں۔ آخر وہ لڑکی میرے علاقے کی ہے۔ شادی میرے علاقے میں ہوگی۔"

عبدالعزیز: "واہ یہ کیوں۔ دولہا میرے علاقے کا ہے۔ یہ شادی میرے علاقے میں ہوگی۔ تم اس پن چکی والے کو میرے یہاں بھیج دو"

کپور چند: "یہ مجھے منظور نہیں۔"

اس کے تھوڑی دیر بعد یہ سلسلہ گفتگو منقطع ہو گیا۔ لیکن دوسرے دن میجر عبدالعزیز اور کپور چند کی گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔

عبدالعزیز: "ارے وہ لڑکی بہت بری حالت میں ہے۔ ڈاکٹروں کے خیال میں اسے سخت شاک پہنچا ہے ...."

کپور چند: "اسے میرے ہاں بھیج دو۔ تم سے کہہ چکا ہوں۔"

عبدالعزیز: "بے کار بات کرتے ہو۔"

کپور چند: "تمہاری مرضی جے ہند!"

عبدالعزیز: "پاکستان زندہ باد .... مگر سنو ایک بات .... ایک

ترکیب اور سنو پل کا شمالی حصہ ہمارے قبضہ میں ہے جنوبی حصہ تمہارے پاس ہے۔ لیکن بیچ کا حصہ جو ٹوٹا ہوا ہے۔ وہ نہ پاکستان کے پاس ہے نہ ہندوستان کے پاس ہے۔ میری تجویز ہے کہ اس ٹوٹے ہوتے حصہ کو مکمل کرا کے۔۔۔"

کپور چند: "بہت خوب میں تمہاری چال سمجھتا ہوں"

عبدالعزیز۔ خدا کی قسم یہ کوئی چال نہیں ہے۔ تم چاہے مجھ سے قسم لے لو۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ دونوں کی شادی ضرور ہو جائے اور اس جگہ ہو جہاں میرا ضمیر صاف رہے۔ اور تم پر بھی کوئی حرف نہ آئے۔ یہ پل کی درمیانی جگہ سب سے اچھی رہے گی"

کپور چند: "اچھا۔ شادی کے بعد یہ پل پھر اڑا دیا جائے گا"

عبدالعزیز: "مجھے منظور ہے۔۔۔۔ لیکن دیکھو کسی کو پتہ نہ چلے۔۔۔۔ کھاؤ گارڈن کالج کی اس لڑکی کی قسم۔۔۔۔

کپور چند: "ہائے۔ کیوں اس کی یاد دلاتے ہو۔ یہ جری کیسی ہے

عبدالعزیز: "اس کی صورت نہ دیکھو۔ اس کا دل دیکھو۔۔۔"

کپور چند: "تو آج رات کو مولوی بلا بھیجو لیکن یہ یاد رہے کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو نہیں تو۔۔۔"

عبدالعزیز: "جانتے ہو کس غارت گر کی قسم کھائی ہے"

سلسلۂ گفتگو پھر منقطع ہو گیا۔

اس روز چھانجل کے لوگوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ پل کے درمیانی حصے کو چھانجل کے اس پار دونوں بسنے والے لوگوں نے اپنی محنت سے ٹھیک کر لیا۔ دونوں طرف کے سپاہی نہراتی لیے ہوتے گھوم رہے تھے۔ پل پر روشنی تھی اور نغمہ تھا۔ خوب صورتی تھی اور امن تھا۔ بندوقیں چپ تھیں۔ اور توپوں کے دہانے خاموش تھے۔ آج کوئی زخمی نہیں تھا۔ آج کوئی کسی کو گولی مارنے کے لیے آمادہ نہیں تھا چاروں طرف ایک عجیب فضا تھی۔ اور مولوی ابراہیم بہت ہی پاکیزہ لہجے میں قرآت سے خطبہ پڑھ رہا تھا

اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ۔

(نکاح میری سنت ہے اور جس نے بھی میری سنت سے انحراف کیا وہ میرا نہیں)

آج چھانجل کا پل کہیں نہیں ہے۔ مخالف فوجیں پل کے شمالی حصے پر مشین گنوں کے گھونسلے جمائے بہت ہی مستعدی سے لڑنے مارنے کو تیار بیٹھی ہیں۔

لیکن جبرا اور جری کی شادی ہو گئی ہے اور چھانجل کے لوگوں نے ایک اور پل بنا لیا ہے۔ یہ پل جو دلوں کے اندر سے گزرتا ہے اور جس کا کوئی تختہ نہیں ہلتا!

(کتابے کا کفن۔ بیسویں صدی پبلی کیشنز۔ نئی دہلی۔ ۱۹۶۱ء)



ہندستان کی پہلی مطبوعہ کتاب

مختصر بنگالی افسانہ — رابندر ناتھ ٹیگور

دستک

برسوں بعد اس نے اپنے محبوب کے دروازے پر دستک دی۔

آواز آئی ــــــ "تو کون ہے؟" اس نے کہا ــــــ "میں ہوں"

دروازہ حسب معمول بند رہا اور پوری خاموشی طاری رہی وہ مایوس ہو کر واپس آ گیا۔

برسوں بعد اس نے پھر اسی دروازے پر دستک دی۔

آواز آئی ــــــ "کون ہے؟"

اس نے جواب دیا ــــــ "جو تو ہے"

اور دروازہ کھل گیا

●●

عصمت چغتائی



دو ہاتھ

رام اوتار لام پر سے واپس آ رہا تھا، بوڑھی مہترانی ابا میاں سے چٹھی پڑھوانے آئی تھی، رام اوتار کو چھٹی مل گئی، جنگ ختم ہو گئی تھی نا! اس لیے رام اوتار تین سال کے بعد واپس آ رہا تھا، بوڑھی مہترانی کی چیپڑ بھری آنکھوں میں آنسو ٹمٹما رہے تھے۔ مارے شکر گذاری کے وہ دوڑ دوڑ کر سب کے پاؤں چھو رہی تھی، جیسے ان پیروں کے مالکوں نے ہی اس کا اکلوتا پوت لام سے زندہ سلامت منگوا دیا۔

بڑھیا پچاس برس کی ہوگی، پر ستّر کی معلوم ہوتی تھی، دس بارہ کچے پکے بچے جنے ان میں سے بس رام اوتار ہی بڑی منتوں، مرادوں سے جیا تھا، ابھی اس کی شادی رچائے سال بھر نہیں بیتا تھا کہ رام اوتار کی پکار آ گئی، مہترانی نے بہت واویلا مچائی مگر کچھ نہ چلی اور جب رام اوتار وردی پہن کر آخری بار اس کے پیر چھونے آیا، تو اس کی شان و شوکت سے بے انتہا مرعوب ہوئی، جیسے وہ کرنل ہی تو ہو گیا تھا۔

شاگرد پیشے میں نوکر مسکرا رہے تھے، رام اوتار کے آنے کے بعد جو ڈرامہ ہونے کی امید تھی، سب اسی پر آس لگائے بیٹھے تھے، حالانکہ رام اوتار لام پر توپ، بندوق چھوڑنے نہیں گیا تھا، پھر بھی سپاہیوں کا میلا اٹھاتے اٹھاتے، اس میں کچھ سپاہیانہ آن بان اور اکڑ پیدا ہو گئی ہوگی، بھوری وردی ڈانٹ کر وہ پرانا رام اوتار واقعی نہ رہا ہوگا، ناممکن ہے وہ گوری کے کرتوت سنے، اور اس کا جوان خون ہتک سے کھول نہ اٹھے۔

بیاہ کر آئی ہے، تو کیا مسمسی تھی گوری، جب تک رام اوتار رہا، اس کا گھونگھٹ فٹ بھر لمبا رہا۔ اور کسی نے اس کے رخ پر نور کا جلوہ نہ دیکھا، جب خصم گیا تو کیا بلک بلک کر روئی تھی، جیسے اس کی مانگ کا سیندور ہمیشہ کیلیے اڑ رہا ہو

تھوڑے دن روئی روئی آنکھیں لیے، سر جھکائے میلے کی ٹوکری ڈھوتی پھری، پھر آہستہ آہستہ اس کے گھونگھٹ کی لمبائی کم ہونے لگی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے یہ سارا بسنت رت کا کیا دھرا ہے کچھ صاف گو کہتے تھے، گوری تھی ہی چھنال، رام اوتار کے جاتے ہی قیامت ہو گئی، کمبخت ہر وقت ہی ہی، ہر وقت اٹھلانا، کمر پر میلے کی ٹوکری لے کر کانسے کے کڑے چھنکاتی جدھر سے نکل جاتی، لوگ بدحواس ہو جاتے، دھوبی کے ہاتھ سے صابن کی بٹی پھسل کر حوض میں گر جاتی، یا ورچی کی نظر توے پر سلگتی ہوئی روٹی سے اچٹ جاتی، بہشتی کا ڈول کنوئیں میں ڈوبتا ہی چلا جاتا۔ چپراسیوں تک کی بلا ٹنگی پگڑیاں ڈھیلی ہو کر گردن میں جھولنے لگتیں، اور یہ سراپا قیامت گھونگھٹ میں سے بان پھینکتی گزر جاتی، تو پورا شاگرد پیشہ ایک بے جان لاش کی طرح سکتے میں رہ جاتا، پھر ایک دم چونک کر وہ ایک دوسرے کی درگت پر طعنہ زنی کرنے لگتے، دھوبن مارے غصّے کے کلف کی کونڈی لوٹ دیتی چپراسن چھاتی سے چمٹے لونڈے کے بے بات دمو کے جڑنے لگتی۔

نام کی گوری تھی، پر کمبخت سیاہ بہت تھی، جیسے الٹے توے پر کسی پھوہڑیا نے پراٹھے تل کر چمکتا ہوا چھوڑ دیا ہو۔ چوڑی پھکنا سی ناک، پھیلا ہوا دہانہ، دانت مانجھنے کا اس کی سات پشت نے فیشن ہی چھوڑ دیا تھا، آنکھوں میں پلیوں کاجل تھوپنے کے بعد بھی دائیں آنکھ کا بھینگا پن اوجھل نہ ہو سکا، پھر بھی ٹیڑھی آنکھ سے نہ جانے کیسے زہر میں بجھے تیر پھینکتی تھی کہ نشانے پر بیٹھ ہی جاتے تھے، کمر بھی لچک دار نہ تھی، خاصی کٹھلا سی تھی، جھوٹن کھا کھا کر دنبہ ہو رہی تھی، چوڑے بھینس کے سے کھر، جدھر سے نکل جاتی کڑوے تیل کی سڑاند چھوڑ جاتی۔

ہاں آواز میں بلا کی کوک تھی، تیج تیوہار پر لہک کر کجریاں گاتی تو اس کی آواز سب سے اونچی لہراتی چڑھتی چلی جاتی۔

بڑھیا مہترانی یعنی اس کی ساس بیٹے کے جاتے ہی اس سے بے طرح بدگمان ہو گئی، بیٹھے بٹھائے احتیاطاً گالیاں دے دیتی، اس پر نظر رکھنے کے لیے پیچھے پیچھے پھرتی، مگر بڑھیا اب ٹوٹ چکی تھی، چالیس برس میلا ڈھونے سے اس کی کمر مستقل طور پر ایک طرف لچک کر دہیں تھم گئی تھی، ہماری پرانی مہترانی تھی، ہم لوگوں کے آنول نال اسی نے گاڑے تھے۔ جوں ہی اماں کے درد لگتے، مہترانی دہلیز پر آ کر بیٹھ جاتی اور بعض وقت لیڈی ڈاکٹر تک کو نہایت مفید ہدایتیں دیتی بلائیات کو دفع کرنے کے لیے کچھ منتر تعویذ بھی لا کر پٹی سے باندھ دیتی۔ مہترانی کی گھر میں خاصی بزرگانہ حیثیت تھی۔

اتنی لاڈلی مہترانی کی بہو یکایک لوگوں کی آنکھوں میں کانٹا بن گئی، چپراسن اور باورچن کی تو بات اور تھی، ہماری اچھی بھلی بھاوجوں کا ماتھا اسے اٹھلاتے دیکھ کر ٹھنک جاتا اگر وہ اس کمرے میں جھاڑو دینے جاتی، جس میں اس کے میاں ہوتے، تو وہ ہڑبڑا کر دودھ پیتے، بچے کے منہ سے چھاتی چھین کر بھاگتیں کہ کہیں وہ ڈائن ان کے شوہروں پر ٹونا ٹوٹکا نہ کر رہی ہو۔

گوری کیا تھی، بس ایک مرکھنا لمبے لمبے سینگوں والا بجار تھا، کہ چھوٹا پھرتا تھا، لوگ اپنے کانچ کے برتن بھانڈے دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر کلیجے سے لگاتے اور جب حالات نے نازک صورت پکڑ لی تو شاگرد پیشے کی مہیلاؤں کا ایک باقاعدہ وفد اماں کے دربار میں حاضر ہوا۔ بڑے زور شور سے خطرہ اور اس کے خوفناک نتائج پر بحث ہوئی، پتی رکھشا کی ایک کمیٹی بنائی گئی، جس میں سب بھاوجوں نے شدومد سے ووٹ دیے، اور اماں کو صدر اعزازی کا عہدہ سونپا گیا، ساری خواتین حسب مراتب زمین، پیڑھیوں اور پلنگ کی ادوائن پر بیٹھیں، پان کے ٹکڑے تقسیم ہوئے اور بڑھیا کو [illegible] اطمینان [illegible] سامنے میں دودھ دے کر بٹھایا [illegible] اور مقدمہ پیش ہوا

"کیوں ری چڑیل، تو نے بہو قطامہ کو چھوٹ دے رکھی ہے، کہ ہماری چھاتیوں پر کودوں دلے، ارادہ کیا ہے تیرا، کیا منہ کالا کرائے گی؟"

مہترانی بھری ہی بیٹھی تھی۔ پھوٹ پڑی۔ "کیا کروں بیگم صاحب، حرام کھور کو چار چوٹ کی مار بھی دئی ہے تو روٹی بھی کھانے کو نا دیئی۔ پر رانڈ میرے تو بس کی نہیں۔"

"ارے روٹی کی کیا کمی ہے اُسے" باورچن نے اینٹا پھینکا، سہارنپور کی خاندانی باورچن اور پھر تیسری بیوی — کیا تیہا تھا کہ اللہ کی پناہ! پھر چپراسن، مالن اور دھوبن نے مقدمہ کو اور سنگین بنا دیا۔ بے چاری مہترانی بیٹھی سب کی لتاڑ سنتی اور اپنی خارش زدہ پنڈلیاں کھجلاتی رہی۔

بیگم صاحب آپ جیسی بتاؤ ویسے کرنے سے موہے نا تھوڑی ہے، پر کا کروں کا رانڈ کا ٹینٹوا دبائے دیوں —؟

ٹینٹوا دبانے کے حسین خیال سے مہیلاؤں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی، اور سب کو بڑھیا سے بے انتہا ہمدردی پیدا ہو گئی۔

اماں نے رائے دی — "موئی کو میکے پھنکوا دے"

"اے بیگم صاحب، کہیں ایسا ہو سکے ہے؟" مہترانی نے بتایا بہو مفت ہاتھ نہیں آئی ہے، ساری عمر کی کمائی پورے دو سو جھونکے ہیں، تب مستنڈی ہاتھ آئی ہے، اتنے پیسوں میں تو دو گائیں آ جاتیں — مزے سے بھر کلسی دودھ دیتیں، پر یہ رانڈ تو دولتیاں ہی دیتی ہے۔ اگر اسے میکے بھیج دیا گیا، تو اس کا باپ اسے فوراً دوسرے مہتر کے ہاتھ بیچ دیگا، بہو صرف بیٹے کے بستر کی زینت ہی تو نہیں، دو ہاتھوں والی ہے، پر چار آدمیوں کا کام نبٹاتی ہے، رام اوتار کے جانے کے بعد بڑھیا سے اتنا کام کیا سنبھلتا، یہ بڑھاپا تو اب بہو کے دو ہاتھوں کے صدقے میں بیت رہا ہے۔

مہیلائیں کوئی نا سمجھ نہ تھیں، معاملہ اخلاقیات سے ہٹ کر اقتصادیات پر آ گیا تھا، واقعی بہو کا وجود بڑھیا کے لیے لازمی تھا۔ دو سو روپے کا مال کس کا دل ہے

کر پھینک دے، ان دو سو کے علاوہ بیاہ پر جو بنیے سے لے کر خرچ کیا تھا، جھجان کھلائے تھے، برادری کو راضی کیا تھا یہ سارا خرچ کہاں سے آئے گا، رام اوتار کی جو تنخواہ ملتی تھی وہ ساری ادھار میں ڈوب جاتی تھی، ایسی موٹی تازی بہو اب تو چار سو سے کم میں نہ ملے گی۔ پوری کوٹھی کی صفائی کے بعد اور آس پاس کی چار سو کوٹھیاں نمٹاتی ہے رانڈ کام میں چوکس ہے ویسے۔

پھر اماں نے الٹی میٹم دیدیا کہ "اگر اس لچّی کا جلد از جلد کوئی انتظام نہ کیا گیا تو کوٹھی کے احاطہ میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔

بڑھیا نے بہت واویلا مچائی۔ اور جاکر بہو کو منہ بھر بھر کر گالیاں دیں، جھونٹے پکڑ کر مارا پیٹا بھی، بہو اس کی زر خرید تھی۔ پٹتی رہی، بڑبڑاتی رہی، دوسرے دن انتقاماً سارے محلے کی دھجیاں بکھیر دیں۔ باورچی، بہشتی دھوبی اور چپراسیوں نے تو اپنی بیویوں کی مرمت کی، یہاں تک بہو کے معاملہ پر میری مہذب بھابیوں اور شریف بھائیوں میں بھی کھٹ پٹ ہوگئی، اور بھابیوں کے میکے تار جانے لگے، غرض بہو ہرے بھرے خاندان کے لیے سہی کا کانٹا بن گئی۔

مگر دو چار دن کے بعد بوڑھی مہترانی کے دیور کا لڑکا رتی رام اپنی تائی سے ملنے آیا، اور پھر وہیں رہ پڑا، دو چار کوٹھیوں میں کام بڑھ گیا تھا، سو بھی اس نے سنبھال لیا، اپنے گاؤں میں آوارہ ہی تو گھومتا تھا، اس کی بہو بھی نابالغ تھی، اس لیے گونا نہیں ہوا تھا۔

رتی رام کے آتے ہی موسم ایک دم لوٹ پوٹ کر بالکل ہی بدل گیا، جیسے گھنگھور گھٹائیں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ تتر بتر ہوگئیں، بہو کے قہقہے خاموش ہوگئے، کانسے کے کڑے گونگے ہوگئے، اور جیسے غبارے سے ہوا نکل جائے، تو وہ چپ چاپ جھولنے لگتا ہے، ایسے بہو کا گھونگھٹ جھولتے جھولتے نیچے کی طرف بڑھنے لگا، اب وہ بجائے بے نتھے بیل کے نہایت شرمیلی بہو بن گئی، جملہ مہیلاؤں نے اطمینان کا سانس لیا، اسٹاف کے مرد وے اسے چھیڑتے بھی تو وہ چھوئی موئی کی طرح لجا جاتی اور زیادہ آنکھ دکھلاتے تو وہ گھونگھٹ میں سے بھینگی آنکھ کو اور ترچھا کرکے رتی رام کی طرف دیکھتی جو فوراً بازو کھجاتا سامنے آکر ڈٹ جاتا بڑھیا پُرسکون انداز میں دہلیز پر بیٹھی، ادھ کھلی آنکھوں سے یہ طربیہ ڈرامہ دیکھتی اور گڑگڑی پیا کرتی، چاروں طرف ٹھنڈا ٹھنڈا سکون چھا گیا، جیسے پھوڑے کا مواد نکل گیا ہو

مگر اب کے بہو کے خلاف ایک نیا محاذ قائم ہو گیا، اور وہ محلے کی مردجاتی پر مشتمل تھا، بات بے بات باورچی جو اسے پراٹھے تل کر دیا کرتا تھا، کونڈی صاف نہ کرنے پر گالیاں دینے لگا، دھوبی کو شکایت تھی کہ وہ کلف لگا کر کپڑے رسّی پر ڈالتا ہے، یہ حرامزادی خاک اڑانے آجاتی ہے، چپراسی مردانے میں دس دس مرتبہ جھاڑو دلواتے، پھر بھی وہاں کی غلاظت کا رونا روتے رہتے، بہشتی جو اس کے ہاتھ دھلانے کے لیے کئی مشکیں تیار رکھتا تھا، اب گھنٹوں صحن میں چھڑکاؤ کرنے کو کہتی، مگر ٹالتا رہتا، تاکہ وہ سوکھی زمین پر جھاڑو دے تو چپراسی گرد اڑانے کے جرم میں اسے گالیاں دے سکے۔

مگر بہو سر جھکائے سب کی ڈانٹ پھٹکار ایک کان سنتی دوسرے کان اڑا دیتی، نہ جانے ساس سے کیا جاکر کہہ دیتی کہ وہ کائیں کائیں کرکے سب کا بھیجا چاٹنے لگتی، اب اس کی نظر میں بہو نہایت پارسا اور نیک ہو چکی تھی۔

پھر ایک دن داڑھی والے داروغہ جی جو تمام نوکروں کے سردار تھے۔ اور ابّا کے خاص مشیر سمجھے جاتے تھے، ابّا کے حضور میں دست بستہ حاضر ہوئے، اور اس بھیانک بدمعاشی اور غلاظت کا رونا رونے لگے، جو بہو رتی رام کے ناجائز تعلقات سے سارے شاگرد پیشے کو گندہ کر رہی تھی، ابّا نے معاملہ سیشن کے سپرد کر دیا، یعنی اماں کو پکڑوا دیا مہیلاؤں کی سبھا پھر سے چھڑی اور بڑھیا کو بلا کر اس کے لتّے لیے گئے۔

"اری نگوڑی خبر بھی ہے یہ تیری بہو قطامہ کیا گُل کھلا رہی ہے؟

مہترانی نے چندھرا کر دیکھا، جیسے کچھ نہیں سمجھتی غریب کہ کس کا ذکر ہو رہا ہے۔ اور جب اسے صاف صاف بتایا گیا کہ چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ بہو اور رتی رام کے تعلقات نازیبا حد تک بڑھ چکے ہیں، دونوں بہت ہی قابلِ اعتراض حالتوں میں پکڑے گئے ہیں۔ تو اس پر بڑھیا بجائے اپنی بہتری چاہنے والوں کا شکریہ ادا کرنے کے بہت چراغ پا ہوئی بڑی واویلا مچانے لگی کہ رام اوتر واہوتا تو ان لوگوں کی خبر لیتا جو اس کی معصوم بہو پر تہمت لگاتے ہیں، بہو نگوڑی تو اب چپ چاپ رام اوتار کی یاد میں آنسو بہایا کرتی ہے، کام کاج بھی جان توڑ کر کرتی ہے، کسی کو شکایت نہیں ہوتی، ٹھٹھول بھی نہیں کرتی، لوگ اس کے ناحق دشمن ہو گئے ہیں، بہت سمجھایا، مگر وہ ماتم کرنے لگی کہ ساری دنیا اس کی جان کی لاگو ہو گئی ہے۔ آخر بڑھیا اور اس کی معصوم بہو نے لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ تو کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ وہ تو سب کی رازدار رہے، آج تک اس نے کسی کا بھانڈا نہیں پھوڑا اسے کیا ضرورت جو کسی کے پھٹے میں پیر اڑاتی پھرے۔ کوٹھیوں کے پچھواڑے کیا نہیں ہوتا؟ مگر اس نے کسی کا میلا نہیں چھیڑا، ان بوڑھے ہاتھوں نے بڑے لوگوں کے گناہ دفن کیے ہیں، یہ دو ہاتھ چاہیں تو رانیوں کے تخت الٹ دیں۔ پر نہیں، اسے کسی سے لاگ نہیں، اگر اس کے گلے پر چھری دبائی گئی تو شاید غلطی ہو جائے۔ ویسے وہ کسی کے راز اپنے بوڑھے کلیجے سے باہر نہیں نکلنے دے گی۔

اس کا تیہا دیکھ کر فوراً چھری دبانے والوں کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ ... محلا میں اس کی پچ کرنے لگیں۔ بہو کچھ بھی کرتی تھی، ان کے اپنے قلعے تو محفوظ تھے، تو پھر شکایت کیسی!

پھر کچھ دن کے بعد بہو کے عشق کا چرچا کم ہونے لگا، لوگ کچھ بھولنے لگے۔ مگر تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ کچھ دال میں کالا ہے، بہو کا بھاری بھرکم جسم بھی دال کے کالے کو زیادہ دن نہ چھپا سکا۔ لوگ شد و مد سے بڑھیا کو سمجھانے لگے مگر اس نے ... بالکل اَڑن گھائیاں بتانے لگی۔ بالکل ایسی بن جاتی جیسے بالکل اونچا سننے لگی ہے۔

اب وہ زیادہ تر کھاٹ لیٹی بہو اور رتی رام پر حکم چلایا کرتی کبھی کھانستی چھینکتی باہر دھوپ میں آ بیٹھتی تو وہ دونوں اس کی ایسی دیکھ ریکھ کرتے جیسے وہ کوئی پٹ رانی ہو۔

بھلی بیویوں نے اسے بہت سمجھایا۔ رتی رام کا منہ کالا کر اور اس سے پہلے کہ رام اوتار لوٹ کر آئے، بہو کا علاج کروا ڈال، وہ خود اس فن میں ماہر تھی، دو دن میں صفائی ہو سکتی ہے۔ مگر بڑھیا نے کچھ سمجھ کر نہ دیا، بالکل ادھر ادھر کی شکایتیں کرنے لگی کہ اس کے گھٹنوں میں پہلے سے زیادہ اینٹھن ہوتی ہے، نیز کوٹھیوں میں لوگ بہت ہی زیادہ بادی چیزیں کھانے لگے ہیں، کسی نہ کسی کوٹھی میں دست لگے ہی رہتے ہیں، اس کی ٹال مٹول پر ناصحین جل کر مرنڈ ہو گئے، مانا کہ بہو عورت ذات ہے، نادان ہے، بھولی ہے۔ بڑی بڑی شریف زادیوں سے خطا ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کی اعلا خاندان کی معزز ساسیں یوں کان میں تیل ڈال کر نہیں بیٹھ جاتیں، پر نہ جانے یہ بڑھیا کیوں سٹھیا گئی تھی، جس بلا کو وہ بڑی آسانی سے کوٹھی کے کوڑے کی تہہ میں دفن کر سکتی تھی اسے آنکھیں میچے پلنے دے رہی تھی۔

رام اوتر وا کے آنے کا انتظار تھا، ہر وقت دھمکیاں تو دیتی رہتی تھی،

"آنے دے رام اوترا کو، کہاں گی، تو تیری پسلی ایک کر دیتے —"

اور اب رام اوتر وا لام سے زندہ واپس آ رہا تھا۔ فضا نے رانس روک لی تھی، لوگ ایک مہیب ہنگامے کے منتظر تھے۔

مگر لوگوں کو سخت کوفت ہوئی جب بہو نے لونڈا جنا اور بجائے اسے زہر دینے کے بڑھیا کی مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں، رام اوتار کے جانے کے دو سال کے بعد پوتا ہونے پر قطعی متعجب نہ تھی، گھر گھر پھٹے پرانے کپڑے اور بدھائی سمیٹتی پھری۔ اس کا بھلا چاہنے والوں نے اسے حساب لگا کر بہت سمجھایا، کہ یہ لونڈا رام اوتار کا ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر بڑھیا نے قطعی سمجھ کر نہ دیا، اس کا کہنا تھا، اساڑھ میں رام اوتار لام پر گیا، جب بڑھیا پیلی کوٹھی کے نئے انگریزی وضع کے

سنڈ اس میں گر پڑی تھی، اب چیت لگ رہا ہے۔ اور جیٹھ کے مہینے میں بڑھیا کو لو لگی تھی، مگر اِل بال بچ گئی تھی تبھی سے اس کے گھٹنوں کا درد بڑھ گیا — "دید جی پورے حرامی ہیں، دوا میں کھریا ملا کر دیتے ہیں۔" اس کے بعد وہ بالکل اصل سوال سے ہٹ کر خیلاؤں کی طرح اول فول بکنے لگتی، کس کے دماغ میں اتنا بوتا تھا، وہ بات اس کا تیاں بڑھیا کو سمجھاتا، جسے نہ سمجھنے کا وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

لونڈا پیدا ہوا تو اس نے رام اوتار کو چٹھی لکھوائی۔

"رام اوتار کو بعد چما پیار کے معلوم ہو کہ یہاں سب کشل ہیں، اور تمہاری کشلتا بھگوان سے نیک چاہتے ہیں۔ اور تمہارے گھر میں پوت پیدا ہوا ہے، سو تم اس خط کو تار سمجھو اور جلدی سے آ جاؤ۔"

لوگ سمجھتے تھے کہ رام اوتار ضرور چراغ پا ہوگا، مگر سب کی امیدوں پر اوس پڑ گئی، جب رام اوتار کا مسرت سے لبریز خط آیا کہ وہ لونڈے کے لیے موزے اور بنیائن لا رہا ہے، جنگ ختم ہو گئی۔ اور اب بس وہ آنے ہی والا تھا، بڑھیا پوتے کو گھٹنے پر لٹائے کھاٹ پر بیٹھی راج کیا کرتی، بھلا اس سے زیادہ حسین بڑھاپا کیا ہوگا کہ ساری کوٹھیوں کا کام ترت پھرت ہو رہا ہو۔ مہاجن کا سود پابندی سے چکا رہا ہو، اور گھٹنے پر پوتا سو رہا ہو۔

خیر لوگوں نے سوچا، رام اوتار آئے گا۔ اصلیت معلوم ہو گی، تب دیکھ لیا جائے گا، اور اب رام اوتار جنگ جیت کر آ رہا تھا، آخر کو سپاہی ہے، کیوں نہ خون کھولے گا، لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے، شاگرد پیشے کی فضا جو ہو کی تو تا چشمی کی وجہ سے سو گئی تھی، دو چار خون ہونے اور ناکیں کٹنے کی آس میں جاگ اٹھی۔

لونڈا سال بھر کا ہوگا، جب رام اوتار لوٹا، شاگرد پیشے میں کھلبلی مچ گئی، باورچی نے ہانڈی میں ڈھیر سا پانی جھونک دیا تاکہ اطمینان سے مچیٹے کا لطف اٹھائے، دھوبی نے کلف کا برتن اتار کر منڈیر پر رکھ دیا اور بہشتی نے ڈول کنویں کے پاس پٹک دیا۔

رام اوتار کو دیکھتے ہی بڑھیا اس کی کمر سے لپٹ کر چنگھاڑنے لگی، مگر دوسرے لمحے کھیسیں کاڑھے لونڈے کو رام اوتار کی گود میں دے کر ایسے ہنسنے لگی، جیسے کبھی روئی ہی نہ ہو۔

رام اوتار لونڈے کو دیکھ کر ایسے شرمانے لگا، جیسے وہی اس کا باپ ہو جھٹ پٹ اس نے صندوق کھول کر سامان نکالنا شروع کیا، لوگ سمجھے کھکری یا چاقو نکال رہا ہے۔ مگر جب اس نے ان میں سے لال بنیائن اور پیلے موزے نکالے تو سارے محلے کی قوت مردانہ پر ضرب کاری لگی —

ہت تیری کی، سالا سپاہی بنتا ہے، ہیجڑا زمانے بھر کا۔

اور بہو! سمٹی سمٹائی جیسے نئی نویلی دلہن، کانسی کی تھالی میں پانی بھر کر رام اوتار کے بدبودار فوجی بوٹ اُتارے اور چرن دھو کر پیے۔

لوگوں نے رام اوتار کو سمجھایا، پھبتیاں کسیں، اسے گاؤدی کہا، مگر وہ گاؤدی کی طرح کھیسیں کاڑھے ہنستا رہا، جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو۔ رتی رام کا گونا ہونے والا تھا، سو وہ چلا گیا۔

رام اوتار کی اس حرکت پر تعجب سے زیادہ لوگوں کو غصہ آیا، ہمارے ابا جو عام طور پر نوکروں کی باتوں میں دلچسپی نہیں لیا کرتے تھے، وہ بھی جز بز ہو گئے، اپنی ساری قانون دانی کا داؤ لگا کر رام اوتار کو قائل کرنے پر تل گئے۔

"کیوں بے، تو تین سال بعد لوٹا ہے نا؟"

"معلوم نہیں حجور، تھوڑا کم جیادہ .... اِتّا ہی رہا ہوگا"

"اور تیرا لونڈا سال بھر کا ہے۔"

"اِتّا ہی لگے ہے سرکار، پر بڑا بدماس ہے سسر۔" رام اوتار شرمائے۔

"ابے تو حساب لگا لے۔"

"حساب؟ ... کیا لگاؤں سرکار۔" رام اوتار نے مرگھلی آواز میں کہا۔

"ام لوئے پوچھتے یہ کیسے ہوا؟"

"اب جے میں کا جانوں سرکار .... بھگوان کی دین ہے"

"بھگوان کی دین! تیرا سر ..... یہ لونڈا تیرا نہیں ہو سکتا"

اتبا نے اسے چاروں اَور سے گھیر کر قائل کرنا چاہا کہ لونڈا حرامی ہے۔ تو وہ کچھ کچھ قائل سا ہو گیا، پھر مری ہوئی آواز میں احمقوں کی طرح بولا۔

"تواب کا کروں سرکار . . . . حرامجادی کو مین نے بڑی ماردی" وہ غصّے سے بپھر کر بولا۔

"ابے نرا اُلو کا پٹھا ہے تو . . . . . نکال باہر کیوں نہیں کرتا کمبخت کو۔"

"نہیں سرکار، کہیں ایسا ہوئے سکے ہے" رام اوتار گھگھیانے لگا۔

"کیوں بے؟"

"حجور، ڈھائی تین سو پھر دوسری سگائی کے لیے کاں سے لاؤں گا، اور برادری جمانے میں سو دو سو الگ کھرچ ہو جائیں گے۔"

"کیوں بے تجھے برادری کیوں کھلانی پڑے گی؟ بھولی بدمعاشی کا تاوان تجھے کیوں بھگتنا پڑے گا ——؟"

"جے میں نہ جانوں سرکار، ہمارے ہیں ایسا ہی ہووے ہے"

"مگر لونڈا تیرا نہیں رام اوتار . . . . . اس حرامی رتی رام کا ہے۔" اتبا نے عاجز آکر سمجھایا۔

"تو کا ہوا سرکار . . . . . . میرا بھائی ہوتا ہے رتی رام کوئی گیر نہیں، اپنا ہی کھون ہے۔"

"نرا الو کا پٹھا ہے۔" ابا بھنّا اٹھے۔

"سرکار، لونڈا بڑا ہو جاوے گا، اپنا کام سمیٹے گا" رام اوتار نے گڑگڑا کر سمجھایا۔ "وہ دو ہاتھ لگائے گا، سو اپنا بڑھاپا تیر ہو جائے گا۔" ندامت سے رام اوتار کا سر جھک گیا۔

اور نہ جانے کیوں، ایک دم رام اوتار کے ساتھ ساتھ ابا کا بھی سر جھک گیا، جیسے ان کے ذہن میں لاکھوں کروڑوں ہاتھ چھا گئے . . . . . . یہ ہاتھ حرامی ہیں نہ حلالی یہ تو بس جیتے جاگتے ہاتھ ہیں، جو دنیا کے چہرے سے غلاظت دھو رہے ہیں، اس کے بڑھاپے کا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔

یہ ننھے منّے مٹی میں لتھڑے ہوئے سیاہ ہاتھ دھرتی کی مانگ میں سیندور سجا رہے ہیں۔

(دو ہاتھ — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1965ء)

سہیل عظیم آبادی

گرم راکھ

مالی پودا لگاتا ہے۔ زمین کھود کر تھال باندھتا ہے۔ جڑوں میں پانی دیتا ہے۔ تیز ہوا اور دھوپ سے پودے کو بچاتا ہے۔ اور اس کا سارا وقت پودوں کی رکھوالی، اور اس فکر میں کٹ جاتا ہے کہ پودا پیڑ بن جائے اور پھل لائے پھر بھی وہ اتنا پریشان نہیں رہتا، جتنا پیڑ میں پھل آجانے پر رہتا ہے۔ مالی کا دھیان گھوم پھر کر پیڑ ہی میں لگا رہتا ہے اور جب پھل رس پر آنے لگتا ہے، تو پھر تو جیسے اس کی آنکھیں پیڑ ہی میں اٹک کر رہ جاتی ہیں۔ پیڑ کا خیال کم رہ جاتا ہے اسے بس ایک ہی فکر رہ جاتی ہے۔ پھل پیڑ سے اتار کر مالک کے گھر پہنچا دے۔

ردھیا کا حال بھی مالی جیسا تھا۔ پارو جب تک بچی تھی دن رات اس کی دیکھ بھال میں لگی رہتی تھی۔ وہ خوب کھائے پیئے اور کھیلے کودے۔ کہیں کھانسی زکام بھی نہ ہو، اچھی رہے اور بڑی ہوتی جائے۔ پھر کوئی اچھا گھر اور اچھا لڑکا مل جائے اور اس کا بیاہ ہو جائے، اور ایسا ہی ہوا پارو پانچ سال کی ہوئی تو ردھیا نے اچھا گھر اور اچھا لڑکا دیکھ کر بیاہ کر دیا اور کچھ دیر کے لیے بے فکر سی ہو گئی۔ اب جب جوان ہوگی اور اس کا مرد بھی جوان ہوگا، تو گونا کرا کے لے جائے گا۔ گھر بھی اچھا تھا، اور لڑکا بھی۔ لڑکے کا باپ کھاتا پیتا کسان تھا، اور لڑکا گاؤں کے اسکول میں پڑھتا تھا۔ لڑکے کے باپ نے کہا تھا کہ وہ اپنے لڑکے کو اونچی پڑھائی کے لیے شہر بھیجے گا۔ وہ بھی اپنی لڑکی کو پڑھائے۔ زمانہ بدل رہا ہے اور بیاہ کے بعد ردھیا نے پارو کو گاؤں کے پاٹھ شالے میں بھیج دیا تھا۔ ردھیا جانتی تھی کہ بیٹی کو سسرال کے لائق بنانا اس کا کام ہے کہ پھر اسے تکلیف نہ ہو اس سے زیادہ ردھیا کو او

ہلکا ہو گیا تھا اور اطمینان اور سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی، کہ پارو کی اٹھان ہر طرح اچھی تھی۔ دل لگا کر پڑھتی تھی، اور دل لگا کر گھر کے کام کرتی تھی۔ جو کام نہیں آتا تھا اسے سیکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ لڑکی کہاں ملنے اور سگھڑ بنے تو ماں کو اور کیا چاہیے۔

لیکن پارو جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی، ردھیا کو فکر نے پھر گھیرنا شروع کر دیا۔ بارہ سال کی ہو گئی تو اس نے پاٹھ شالے سے اٹھا لیا، اور بولی کہ بہت ہوا، اب زیادہ پڑھ کر کیا کرے گی، اور اس کی آنکھیں پارو کا پیچھا کرنے لگیں۔ وہ کیسے رہتی ہے، کیسے اٹھتی بیٹھتی ہے، کیسے آنچل رکھتی ہے اور کیسے ہنستی بولتی ہے۔ کس کس سے ملتی ہے۔ کیا کرتی ہے۔ اور کیوں جاتی ہے۔ ہر وقت اس ٹوہ میں رہتی کہ لڑکی کا کوئی قدم غلط تو نہیں اٹھ رہا ہے، یا اور کوئی ایسی بات تو نہیں کہ غلط قدم اٹھنے کا خطرہ ہو۔ پارو میں کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ بے کار ہی اتنی فکرمند ہے مگر پھر سب کچھ بھول جاتی، اور ہر وقت چوکنا سی رہتی وہ جانتی تھی کہ لڑکی پر جوانی آنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ جیسے رس پر آتے ہوئے پھل کو دیکھ کر اچھے بھلے آدمیوں کے منہ میں پانی آجاتا ہے، اور نیت ڈانواڈول ہو جاتی ہے اسی طرح جوان لڑکی کو دیکھ کر نوجوان اور جوان ایک طرف ادھیڑ عمر کے آدمیوں کی آنکھوں میں بھی شیطان ناچنے لگتا ہے۔ وہ خود بھی اس راہ سے گذر چکی تھی، اور اسے یاد تھا کہ اسے دیکھ کر کن کن لوگوں کی آنکھیں چمک اٹھتی تھیں، ہونٹ تھرانے لگتے تھے، اور چہرے کا رنگ بدلنے لگتا تھا۔

اسے اچھی طرح یاد تھا۔ اس کی ماں نے ایک بار کہا تھا جہاں کوئی جوان لڑکی ہوتی ہے، وہاں شیطان منڈلاتا رہتا ہے اور نوجوانوں کو کھینچ لاتا ہے۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ گاؤں کے مندر کے پجاری پنڈت ہردے ناتھ اس پر بڑے مہربان ہو گئے تھے۔ بچپن میں جب پرساد مانگنے جاتی تھی، تو تھوڑا سا پرساد دے کر بھگا دیتے تھے اور دوبارہ مانگنے پر ڈانٹ دیا کرتے تھے۔ مگر جب وہ چودہ سال کی ہو گئی تھی اور مندر جاتی تھی تو زیادہ پرساد دیتے تھے، اور دوبارہ مانگنے پر پرساد تو دیتے ہی تھے، ساتھ ہی کبھی اس کے سر پر اور کبھی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آشیرباد بھی دیا کرتے تھے۔ "ایشور تجھے سکھی رکھے"۔ لیکن آشیرباد دیتے وقت ان کی زبان لڑکھڑا جاتی تھی اور چہرے کا رنگ اڑا سا جاتا تھا، اور وہ اسے ایسی نظروں سے دیکھتے تھے جیسے وہ جنموں کے بھوکے ہوں، اور وہ ان کے سامنے لڈو بھرا تھال ہو۔ حالانکہ پنڈت جی کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ ان کی دونوں بیٹیاں عمر میں اس سے کئی کئی سال بڑی تھیں، اور پنڈت جی کی نیکی سارے گاؤں میں مشہور تھی کبھی انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو ان سے کسی کو کوئی شکایت ہوتی ہو۔ ان کو مندر اور اپنے گھر کے سوا اور کسی چیز سے مطلب نہیں تھا۔ شروع شروع میں تو بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ پنڈت جی اتنے مہربان کیوں ہیں، مگر ایک دن اس کی ایک سہیلی نے یہ بات اسے سمجھا دی تھی، اور اس نے مندر ہی جانا چھوڑ دیا تھا۔ رد ھیا کا بیاہ اسی وقت ہو گیا تھا، جب وہ پانچ سال کی تھی۔ اس وقت اس کے لیے بیاہ کا مطلب لال کپڑا، ڈھول باجا اور دولہا تھا۔ اسے اپنے اور دوسری لڑکیوں کے بیاہ میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوا تھا۔ بس اتنا کہ اپنے بیاہ میں لال کپڑے اس نے پہنے تھے، اور دوسروں کے بیاہ صرف تماشا دیکھنے کو ملا تھا۔ جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی تھی، بیاہ کا مطلب سمجھتی گئی تھی، اور ایک وقت ایسا آیا تھا جب اس پر نشہ سا چھایا رہتا تھا۔ وہ اپنے آپ سے جھجک اٹھتی تھی۔ اپنے آپ کو دیکھ کر عجیب سی کیفیت محسوس کرتی اور کبھی کبھی یہ کہ اس میں کوئی کمی ہے، اسے کچھ چاہیے جو نہیں مل رہا ہے، اور آپ ہی آپ اس کا جی بہت سی باتیں چاہنے لگتا تھا۔ کوئی اسے دیکھے۔ اس سے ہنس کر باتیں کرے، اور وہ بھی ہنس کر جواب دے۔ کبھی کبھی جیسے ہنسی اور خوشی اس کے دل کے اندر سے پھوٹ کر ابلنے لگتی، اور اس کا جی چاہتا کہ کوئی اسے چھیڑے اور ایسی باتیں کرے جسے اس کا دل سننا چاہے مگر وہ سن کر ڈانٹ دے۔ اور جواب نہ دے سکے۔ اور وہ خود شرما جاتی۔ کبھی اسے محسوس ہوتا کہ سارا بدن ٹوٹ رہا ہے انگ انگ مچل رہا ہے۔

اور ایسے وقت میں اس کا جی چاہتا کہ کوئی اس کی بوٹی بوٹی کو دبائے، اور ایسے دبائے کہ اس کا بدن دکھنے لگے۔ کوئی اس سے اپنے دل کی بات کہے، اور وہ کسی سے اپنے دل کی بات کہے اور بات لمبی ہوتی چلی جائے۔ کبھی کبھی اپنے دل کے اندر عجیب سی بے چینی محسوس کرتی، اور یہ نہیں سمجھ سکتی کہ یہ بے چینی کیوں ہے، اس کا دل کیا چاہتا ہے۔ اس وقت اس کا دل چاہتا کہ کوئی اس سے پیار کی باتیں کرے۔ ایسی ہی حالت میں ایک دن اس کی سہیلی پھولو نے پیچھے سے چپ چاپ آ کر اسے دبوچ لیا تھا، اور اسے بہت اچھا لگا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ بار بار کوئی اس کو اسی طرح دبوچتا رہے اور جب پھولو کا گونا ہوا تھا اور وہ لوٹ کر سسرال سے آئی تھی تو اس نے پھولو سے ایک ایک بات کرید کر پوچھی تھی، اور پھولو کی باتیں سن کر اسے بڑا مزا آیا تھا، کئی دن تک اس کا جی یہی چاہتا رہا تھا، کہ اب اس کا گونا بھی ہو جانا چاہیے اور اس کو اپنے مرد سے ملنا چاہیے اور اس کے بعد اس کی نگاہیں ہر مرد پر جھوم کر پڑتی تھیں۔ اور وہ یہ غور کرنے لگی تھی کہ کون اسے دیکھتا ہے اور کون نہیں، اگر کوئی مرد اس کی طرف توجہ نہیں دیتا تو اسے جیسے غصہ سا آ جاتا، اور اگر کوئی میٹھی میٹھی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلنے لگتی، اور اس کا دل جیسے پانی کے دھارے پر کنول کی طرح ہلنے لگتا، اور کچھ دنوں تک وہ اپنے خیالوں میں اس طرح ڈوبی رہی کہ یہ بھی خیال نہیں رہا کہ پاؤں کہاں پڑ رہا ہے، کئی بار تو وہ پھسلتے پھسلتے اور گرتے گرتے بچی، بس کسی طرح وہ بچ گئی۔ مگر

ورنہ پھسلنے اور گرنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔

ایک بار تو ایسا ہوا کہ گھر کے سارے لوگ کھا پی کر سونے والے تھے کہ باہر سے آکر بھائی نے کہا ایک راہی آگیا ہے، اور اس کے کھانے کے لیے کچھ چاہیے، راہی جوار ہی کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا، رات اندھیری تھی، اور اس کا گاؤں ابھی چھ میل دور تھا راستے میں دو ندیاں ملتی تھیں اور راستہ بھی سناٹا تھا اور اس کے دروازے پر ٹھہرنے کو آیا تھا، گاؤں کے لوگ ایسے اچانک آنے والے راہیوں کی خاطر کرنے کو ہر وقت تیار رہتے تھے، اور اس کے بھائی نے جلدی سے کھانا تیار کرنے کو کہا تھا، کھانا تھوڑی دیر میں تیار ہو گیا تھا اور ردھیا نے کھانا دیتے وقت دیکھا تھا کہ راہی خوبصورت نوجوان تھا، عمر چوبیس پچیس سال سے زیادہ نہ تھی، ردھیا کے بھائی نے بات چھیڑ دی تھی، کہ بے وقت کیسے آنا ہوا اور نوجوان نے بتایا تھا کہ اسے چھٹی دیر کر کے ملی ہے، اور وہ بھاگم بھاگ گھر جا رہا ہے، دو دن بعد اس کا گونا ہونے والا ہے۔

اس رات ردھیا کو نیند نہیں آئی تھی، اور وہ سوچتی رہی تھی کہ ایک نوجوان ہے، جو گونا کرانے کے لیے بھاگم بھاگ گھر جا رہا ہے، اور ایک اس کا مرد ہے جو کلکتہ سے گھر لوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا، اس کی ماں نے بلا بھیجا تھا، تو اس نے لکھ بھیجا تھا، کہ دو سال اور نہیں آسکتا، ماں خط لکھوا کر تھک گئی، کہ آکر گونا کرا لے، مگر وہ برابر ایک ہی جواب دیتا کہ ابھی دو سال اور نہیں آئے گا، اتنا روپیہ کمائے گا کہ مہاجن سے کھیت چھڑا لے اور بہن کا گونا کر سکے، اور اس کا دل جیسے ابل پڑا تھا، یہ کیسا آدمی ہے جسے کھیت کی فکر ہے، بہن کے گونے کی فکر ہے۔ مگر اپنی عورت کی فکر نہیں، جس کا ایک ایک پل اس کے انتظار میں کٹ رہا ہے، ایک نوجوان یہ ہے کہ جو بھاگم بھاگ گونا کرانے جا رہا ہے، مزے لے کر گونے کی باتیں کر رہا ہے، اور ایک اس کا ہے، مرے دل کا آدمی جو بار بار بلانے پر بھی آنے کو تیار نہیں، ردھیا نے اس کے سامنے کھانا رکھا تھا، تو نوجوان نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا تھا، ایسی نظروں سے جس کی پیاس ردھیا کو تھی، اور ردھیا کو نوجوان کا اس طرح دیکھنا بہت اچھا لگا تھا، اور وہ پلنگ پر پڑی پڑی اس نوجوان کے بارے میں دیر تک سوچتی رہی، اس کا گورا چٹا رنگ، گٹھا ہوا بدن اور تھکا ہوا چہرہ بار بار اس کی نظروں میں گھوم جاتا تھا، اور ردھیا نے سوچا تھا کیسا آدمی ہے، اپنی عورت اسے کتنی پیاری ہے، اسے گونا کر کے لانے کی کتنی بے چینی ہے، جو رات ہی کو چل پڑا اور اس کا دل بے ساختہ چاہا کہ اس کا مرد بھی اسی طرح اس کے لیے بے چین ہوتا، بیاہ ہوئے اتنے دن ہو چکے تھے کہ اسے مرد کی صورت بھی یاد نہیں تھی، نہ جانے اب وہ کیسا ہے، اس کی صورت شکل کیسی ہے، وہ بھی اسی نوجوان کی طرح ہٹا کٹا اور مضبوط ہے، یا چمپا کے مرد کی طرح بیمار اور مریل، اور اس کے دل کو دھکا سا لگا، اگر اس کا مرد چمپا کے مرد کی طرح مریل اور کمزور ہوا تو پھر کیا ہوگا اور ایک بار اس کا جی چاہتا تھا کہ نوجوان اسے ساتھ لے جاتا، اس نے سوچ لیا کہ سارے لوگ سو جائیں، تو نوجوان کے پاس جائے گی، اور کہے گی مجھے ساتھ لے چلو، مگر اس کا باپ دیر تک جاگتا اور کھانستا رہا تھا، اور خود سوچتے سوچتے، اس کو نیند آگئی تھی، اور جب اٹھ کر باہر جھانک کر دیکھا تو نوجوان جا چکا تھا، اس کے بعد بھی کئی دنوں تک اس نوجوان کی یاد اس کے دل میں مچلتی رہی تھی۔

دوسری بار جب اس کی چچیری بہن دکھیا کا مرد کلکتہ سے آکر ایک مہینہ رہ گیا تھا، اس کی بہن بیمار تھی اور ڈاکٹروں نے رائے دی تھی کہ اسے گاؤں لے جاؤ اور وہ اسے لے کر چلا آیا تھا، اس بہنوئی کو اس وقت اس نے دیکھا تھا جب چھوٹی تھی، اور جب دکھیا کا گونا ہوا تھا تو وہ اپنے نانی کے گھر گئی تھی، اب دو سال کے بعد وہ بہنی کو لے کر آیا تھا اور جوانی ردھیا پر ساون بھادوں کے بادلوں کی طرح جھوم کر آئی تھی، اور اس پر ہر وقت نشہ سا چھایا رہتا تھا، اس کے بہنوئی کی ہر بات گاؤں کے ہر مرد سے الگ تھی، صاف کپڑے سر میں تیل سے چمکتے ہوئے، انگریزی بال، مانگ نکلی ہوئی منہ میں پان اور بار بار بیڑی پینا، مزاج پر روپیہ خرچ کرنا اور بڑی بڑی باتیں کرنا، ایسی باتیں کہ گاؤں کے زمیں دار بابو گوبردھن سنگھ بھی ایسی باتیں نہیں کرتے تھے، اور نہ اتنے صاف ستھرے رہتے تھے، روپے پیسے کی باتیں اس طرح کرتا تھا

جیسے مٹی اور دھول کی، جیسے روپے پیسے کی اس کے پاس نہ کمی تھی، اور نہ کوئی قیمت اور بار بار اس کا زور سے ہنسنا۔ ردھیا کو بہت اچھا لگتا تھا، رنگ تو اس کا سانولا تھا، مگر چہرے میں کشش تھی، اور باتیں اتنی دل چسپ کرتا تھا کہ ردھیا کا دل چاہتا تھا کہ سنتی ہی رہے۔ ردھیا جب بہن کو دیکھنے جاتی تو اس کا بہنوئی کلکتہ کی باتیں چھیڑ دیتا، وہاں بڑے بڑے اور اونچے اونچے مکان ہیں، موٹر ہیں، ٹرام ہیں بڑے بڑے بازار ہیں، سنیما گھر ہیں، جن میں تماشے دکھائے جاتے ہیں، اور ان تماشوں میں لڑکے اور لڑکیاں پریم کرتے ہیں یہ پریم کبھی سپھل ہوتا ہے اور کبھی اسپھل، سنیما کی تصویریں آدمیوں کی طرح چلتی پھرتی اور بولتی ہیں، اور کبھی کبھی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ تماشے میں پریم کیسے ہوتا ہے، کس طرح جوان لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے، کس طرح اس کے گالوں کو چھوتا ہے اور کس طرح سینے سے لگا لیتا ہے، اور ردھیا کی سانس رکنے لگتی، اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اسی طرح سینے سے لگائے رہے، اور کبھی الگ نہ کرے اور وہ خود پگھل کر اس کی گود میں پھیل جائے، اور اس نے کئی بار اپنے آپ کو بہنوئی کی گود میں ڈال دیا، مگر ہر بار کسی نے اسے پکار لیا، یا اور کوئی دکھیا کو دیکھنے آ گیا، اور وہ جھنجھلا کر الگ ہو گئی، اس کے دل کی بات دل ہی میں رہ گئی، مگر یہ محسوس کرنے لگی کہ بہنوئی سے الگ نہیں رہ سکتی، وہ کبھی سوچتی کہ کلکتہ جادو کا شہر ہے، اور اس کا بہنوئی اس شہر کا شہزادہ، اور وہ کسی دن اسے ضرور اس جادو کے شہر میں لے جائے گا، لیکن دکھیا اچھی ہو گئی اس کا بہنوئی کلکتہ لوٹ گیا مگر اس پر جادو کر گیا، اس کا دل ہر وقت کلکتہ میں رہتا بے چین بے چین سا۔

دوسرے ہی سال اس کا گونا ہو گیا، اور وہ اپنی سسرال چلی آئی، جب گونا ہوا تھا، تو وہ بہنوئی کو یاد کر کے خوب روئی تھی، اس کا دل سسرال کے بدلے کلکتہ جانے کو چاہتا تھا مگر اسے سسرال جانا پڑا، اور نئی زندگی شروع ہو گئی، اس کا مرد بھولا، اس کے خوبیوں کا شہزادہ تھا، وہ ایک ہی دن میں بہنوئی اور کلکتہ کو بھول گئی، اسے ایسا معلوم ہوا کہ پہلی ساری باتیں جھوٹی تھیں اور اب جو ہے، وہ سچ ہے اس کا مرد نیک اور خوبصورت جوان تھا، اور بوڑھی ساس ماں کی طرح پیار کرنے والی چھوٹی نند بہن کی طرح لپٹی رہنے والی، اس کی ساس کا ایک بوڑھا بھائی جو صرف بہن اور بہن کے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے اپنا گھر بچوں کے حوالے کر کے چلا آیا تھا، گونا کے بعد اس کا مرد پھر کلکتہ بھی نہیں گیا، اور جانے کی اسے ضرورت بھی نہیں رہی تھی، کھیت مہاجن سے چھوٹ چکے تھے، اور بہن کے گونا کی بات پکی ہو چکی تھی ماں کی صحت گر چلی تھی، اور بیوی سے محبت بہت زیادہ تھی، گاؤں میں بھی اِدھر اُدھر نہیں جاتا تھا، بس کام کیا اور سیدھا گھر ردھیا کے پاس، گھر اور اس کی فکر، ساس جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی، اور دو بچوں کو چھاتی سے لگائے زندگی کے دن کاٹ رہی تھی، اس کی نیکی سارے گاؤں میں مشہور تھی اس نے ردھیا اور اپنی بیٹی میں کوئی فرق نہیں کیا۔ ردھیا نے اپنے گاؤں میں ساس بہوؤں کے بہت سے تماشے دیکھے تھے، لیکن اس کی ساس ماں سے بھی کچھ زیادہ محبت کرتی تھی، اور بھولا اس کا مرد تو صرف اسی کے لیے تھا کبھی کبھی وہ سوچنے لگتی تھی کہ کوئی اور مرد بھی اس کی طرح اپنی عورت سے پیار کرتا ہوگا، اس نے گاؤں میں دیکھا تھا مرد کس طرح اپنی عورتوں کو ڈانٹتے اور مارتے ہیں، کس طرح ستاتے رہیں۔ اور کس طرح دکھ دیتے رہیں، مگر اس کا مرد تو بغیر مسکرائے کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا، بس اس کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھتا تھا، اور جب اس کی ماں کی بیماری کی خبر آئی تھی اور وہ رونے لگی تھی، تو اس کا مرد اسے سمجھاتے سمجھاتے خود بھی رونے لگا تھا، اور دوسرے ہی دن اس کی ماں کے پاس چھوڑ آیا تھا، اور کبھی کوئی کڑی بات نہیں کہی تھی کبھی کبھی ردھیا سوچنے لگتی تھی کہ سچ مچ پنڈت جی کا آشیرباد ہی تو نہیں، اور اس کے ساتھ اسے ساری باتیں یاد آ جاتیں، اور اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھتا، پھر وہ پنڈت جی کی باتیں یاد کر کے مسکرانے لگتی اور سوچتی وہ سچ مچ دنیا کی سب سے سکھی عورت ہے۔

لیکن زندگی کو بدلتے دیر نہیں لگتی، ہوا کا ایک تیز جھونکا

چلتے چراغ کو بجھا کر گھر کو اندھیرا کر دیتا ہے، اس کے گونا کو کل دو سال ہوئے تھے، اور نند بھی گونا ہو کر سسرال جا چکی تھی اور پارو دو مہینے کی گود میں تھی۔ یکایک گاؤں میں ہیضہ پھوٹ پڑا، اور اس کا مرد رات بھر بیمار ہو کر اس دنیا سے چل بسا۔ ردھیا کی زندگی اندھیرے میں ڈوب گئی۔ اسے ایسا لگا کہ وہ اس جھٹکے کو سہار نہ سکے گی، رہ رہ کر اس کا دل بیٹھنے لگتا ایسا محسوس ہوتا کہ نہ جانے وہ کہاں چلی جا رہی ہے۔ اس کی زندگی اکارت ہے، جتنی جلدی ختم ہو جائے اچھا ہے، پھر ایک بار اس کی ساس نے سہارا دیا، بولی، بھگوان کو جو منظور تھا وہ ہوا۔ اب اس کی نشانی اس ننھی سی جان کا تو خیال کرو، اگر تم نے اپنے آپ کو نہ سنبھالا تو اس ننھی سی جان کا کیا ہوگا، اور یکایک جیسے ردھیا کی آنکھیں کھل گئی تھیں، پارو اس کی امیدوں کی ننھی کرن بن کر دل میں اتر گئی، اس میں نئی زندگی آگئی، اور اس نے طے کر لیا کہ جو بھی دل پر گذرے وہ بچی کو پال کر جوان کرے گی، اس کا بیاہ کرے گی، اور پھر اس روتے ہوئے گھر کو ہنسی خوشی کا گھر بنائے گی، اس کی ساس نے بھی یہی کیا تھا، وہ بھی پانچ سال سہاگن رہ کر بیوہ ہو گئی تھی، مگر اس نے ہمت کر کے بچوں کو پالا تھا، سب کا بیاہ کیا تھا، اب اس کی باری تھی۔ وہ ہمت نہ کرے گی، تو نہ بچی زندہ رہے گی، اور نہ بوڑھی ساس، اور چند ہی دنوں میں اس نے ہر بات کو جھٹک کر اپنے آپ سے دور کر دیا تھا، ساری ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے سر پر لے لیا تھا، سو بوڑھیوں میں ایک بوڑھی بن کر رہ گئی تھی۔ دن رات کھیت گھر اور بچی میں الجھی رہتی، اس کے علاوہ اس نے ہر خواہش کو اپنے دل سے نکال پھینکا —— جیسے کبھی تھی ہی نہیں حد تو یہ کہ مرجانے کی خواہش کو بھی جو مرد کے مرنے کے بعد اس کے دل میں گھر کر چکی تھی، جب تک جاگتی رہتی اور جب سونے جاتی تو سوچ کر کے کہ دوسرے دن اٹھ کر اسے کیا کیا کرنا ہے۔

مرد کے مرتے ہی ردھیا نے اپنی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال لیا تھا، ماں باپ بھی آئے تھے، اور دوسرے ناطے والے بھی اور سب نے ایک ہی رائے دی تھی، کہ ماں باپ کے گھر چلی جائے اور کچھ دنوں کے بعد دوسرا بیاہ کر لے، ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی، سترہ سال کی اور ساری زندگی باقی تھی، مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا، جیتے جی اس ڈیوڑھی کو نہیں چھوڑے گی مرنے والے کا نام نہیں مٹنے دے گی، ماں باپ کی باتوں سے اسے دلی رنج پہونچا تھا، اور اس کی باتوں سے ماں باپ کو اور وہ چلے گئے تھے، اس کی زندگی کا مقصد ایک ہی رہ گیا تھا پتی پریم کی یادگار بچی پارو کی دیکھ بھال، پالن پوسن بیاہ اور اس کی خوشی، سب نے اسے ایک ہی رائے دی تھی، مگر وہ پہاڑ کی طرح اپنی رائے پر قائم رہی، اس کا کلکتہ والا بہنوئی بھی آیا جس کی باتیں سن کر وہ جادو کی دنیا میں کھو جاتی تھی اس کی بہن دکھیا مر چکی تھی، اور دو بچے تھے، اس نے بھی کہا کہ پہاڑ جیسی زندگی، اکیلے کیسے کاٹے گی، اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس سے بیاہ کرنے کو تیار ہے ردھیا نے اسے سوکھا سا جواب دیا وہ تو پتی کی چتا پر جل مرنے کو تیار تھی، مگر بچی کی وجہ سے اس نے ایسا نہیں کیا، اب دوسرا بیاہ نہیں کرے گی، اس کی آتما کو دکھ نہیں پہونچائے گی، گھر کی مریادا کو مٹنے نہیں دے گی، مرنے والے کی یاد کی آگ میں ساری زندگی جلتی رہے گی، مگر پتی کے پریم اور گھر کے مریادا کو نہیں جلائے گی، پہاڑ چاہے اپنی جگہ سے ہٹ جائے، مگر وہ نہیں ہٹے گی، اور وہ کر دکھا دے گی، عورت اتنی کمزور نہیں، جتنا لوگ اسے سمجھتے ہیں، اس کی ساس نے جو کچھ کہا تھا، وہ اب کرے گی، ایک پل کے لیے اس کے قدم کبھی نہیں ہلے۔ اس نے کڑی محنت بھی کی، پارو کو بھی پال لیا، بیاہ بھی کر دیا، اور پڑھایا لکھایا بھی، بوڑھی ساس کی ماں کی طرح خدمت کی، اور اس طرح کبھی یہ کہنے کا موقع نہیں دیا کہ بیٹا مر گیا تو بہو نے خیال نہیں کیا، بلکہ ساس سب سے یہی کہتی کہ بیٹا اور بیٹی بھی اس کی اتنی سیوا نہ کرتے، اور گاؤں والے سب اس کی ایسی ہی تعریف کرتے، جیسے اس کی ساس کی۔

لیکن پارو جیسے جیسے جوان ہوتی گئی، ردھیا جیسے نیند سے چونکتی گئی، اب اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب تک نشے میں تھی، بیٹی ساس اور گھر کے سوا اسے اور کسی بات کا خیال ہی نہ تھا، مگر پارو کی جوانی نے اس کا نشہ ختم کر دیا تھا اور بہت سے

خیالوں کے بھوت اس کے چاروں طرح منڈلانے لگے تھے اس کی نظر چوبیس گھنٹے پارو پر ہی رہتی، جب وہ کسی کے گھر جاتی تو اسے ساتھ لے جاتی، اور جب پارو کہیں جانے کو کہتی تو خود اس کے ساتھ جاتی، جب دو چار لڑکیاں گھر میں آجاتیں، اور پارو ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتی تو ردھیا کاموں میں لگی رہنے پر بھی کان اسی طرف رکھتی۔ یہ لڑکیاں کیا باتیں کرتی ہیں، کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں، رشتے کا بھی کوئی مرد آجاتا، اور پارو سے باتیں کرتا تو ردھیا اس کے پاس پہونچ جاتی، اور کوئی بات نکال کر خود باتیں کرنے لگتی، ہر وقت ردھیا کو ایک ہی خیال رہتا کہ پارو کا گونا ہو جائے اور وہ اپنے گھر پہنچ جائے پھر اسے اطمینان ہو۔ اسے ہر وقت ایسا محسوس ہوتا، کہ آنگن میں رس بھرے پھل والا پیڑ ہے، اور چور اس کے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں، حالانکہ وہ خوب جانتی تھی کہ پارو سیدھی سادھی اور اچھی لڑکی ہے اس میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے ذرا بھی پریشانی ہو، وہ بھی دن بھر ماں کے ساتھ کاموں میں الجھی رہتی تھی، مگر ردھیا جانتی تھی، کہ یہ زمانہ ہی بہکا ہوا ہوتا ہے، قدم خود ہی لڑکھڑانے لگتا ہے، ذرا سی ٹھیس لگے، اور آدمی گر جائے اور جب وہ پارو کے بارے میں سوچتی تو اسے اپنے بیتے دن یاد آجاتے، کبھی کبھی وہ پارو کو دیکھتی تھی، کام کرتے کرتے یکایک پارو کا چہرہ دمکنے لگتا، دبی دبی مسکراہٹ چہرے پر چھا جاتی، پھر چہرہ لال ہو جاتا اور ہونٹ تھر تھرانے لگتے، وہ کام چھوڑ کر پلنگ پر بیٹھ جاتی اور دیر تک اکیلی پڑی رہتی۔ [illegible] حالت [illegible] طور پر اس [illegible] دن ہو جاتی، جب کوئی پارو کے گونے کی بات چھیڑ دیتا، اور ردھیا خود سوچ میں پڑ جاتی، اس کو اپنے دن یاد آنے لگتے، جب اس کا بھی یہی حال ہوتا تھا، ردھیا پارو کو بچپن سے اپنے ساتھ سلاتی تھی، بچپن میں وہ ہاتھ پاؤں پھینکتی تھی اور کبھی کبھی ردھیا کو چوٹ بھی لگ جاتی تھی، لیکن اب وہ کبھی کبھی اپنے سارے بدن کا بوجھ ردھیا پر ڈال دیتی اور نیند میں اس سے لپٹ جاتی۔ اس کی سانس تیز ہو جاتی تھی، ردھیا جانتی تھی یہی جوانی ہے، وہ بڑے پیار سے پارو کو الگ کر دیتی، لیکن کبھی کبھی پارو کے بدن کا بوجھ اسے خود بھی اچھا لگنے لگتا، اور وہ بہت سی باتیں سوچنے لگتی، کچھ پارو کے بارے میں اور کچھ اپنے بارے میں، اپنے دل کی ان چنگاریوں کو سلگتی، محسوس کرتی جن کو اس نے خود جلا کر اور راکھ بنا کر چھپا رکھا تھا، پارو جب سوتے میں انگڑائی لیتی اور بدن کو کھینچتی تو اسے معلوم ہوتا کہ خود اس کا بدن بھی ٹوٹ رہا ہے، ہڈی ہڈی اینٹھ رہی ہے، اور اس کی سانس تیز تیز چلنے لگتی تھی، ایسے میں جب پارو اپنے بدن کا سارا بوجھ اس پر ڈال دیتی، اور اس کی گرم گرم سانس ردھیا کے چہرے پر پھیلتی، پارو کے بھرے ہوئے سینے کا دباؤ اس کے سینے پر پڑتا تو اس کے سارے بدن میں سنسنی پھیل جاتی، اور وہ پارو کو اسی طرح سینے سے لگائے پڑی رہتی، بہت سی باتیں اس کے دماغ میں آتیں، اور اس رات اس کی نیند حرام ہو جاتی، بڑی بے چینی کے ساتھ رات کاٹ پاتی، اور دوسرے دن طبیعت خراب سی رہتی۔

کبھی کبھی ردھیا کو اپنے اوپر بڑا غصہ آتا تھا، اٹھارہ سال کی عمر میں وہ بیوہ ہو گئی تھی اس وقت اس نے اپنے دل کے اندر سے ساری باتیں نکال کر پھینک دی تھیں، تیرہ چودہ سال تک اس کا دل و دماغ سادہ کاغذ کی طرح تھا وہ بیٹی ساس اور گھر کے علاوہ ہر چیز کو بھلا چکی تھی، اپنے آپ کو بھی لیکن اب پارو کو دیکھ کر بہت سی باتیں یاد آنے لگتیں اور اپنے آپ کو ہر موقع پر موجود محسوس کرتی، اتنا زیادہ کہ اگر اس کی طرف کوئی دیکھتا تو، اس کی آنکھیں جھک جاتیں۔ اور اگر کوئی مرد دیکھتا تو سارے جسم میں لہریں دوڑنے لگتیں، ایک دن رشتہ کے ایک دیور نے مذاق میں کہہ دیا تھا، بھوجی ابھی تو خود جوان ہے، تیرا انگ انگ نکھرا ہوا ہے، ذرا آئینے میں اپنے کو دیکھ لے۔ تو ردھیا کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ گرم دھارے اس کے روئیں روئیں سے پھوٹ پڑے اور فوراً ہی برف سے زیادہ ٹھنڈے قطرے بن گئے، اس دن اس نے سچ مچ آئینہ دیکھا تھا، اور محسوس کیا تھا، اب بھی اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا، آنکھوں میں وہی پہلی سی چمک تھی پھر اس نے اپنے بدن کو دیکھا تھا، بانہہ بھرے بھرے سے تھے، اور سینے کا ابھار ویسا ہی تھا، کہ چولی کا بٹن کھینچتا اور ایسا لگتا کہ اب

ٹوٹ جائے گا، اور ردھیا کو ایسا لگا تھا کہ بس اب وہ پکڑا جانے والی ہے، اس نے گھبرا کر آئینہ رکھ دیا، اور دیوار سے لٹکی ہوئی بھگوان کرشن کی تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی تھی، اور دل ہی دل میں پرارتھنا کرنے کے بعد اس نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ پارو کا گونا ہو جائے اور وہ اپنے گھر پہونچ جائے، تو بوڑھی ساس کو لے کر ساتوں دھام کی تیرتھ یاترا پر چلی جائے گی، اور لوٹنے کے بعد رام نام جپ کر گزار دے گی، یہ جیون بھی سپھل رہے اور اگلا جیون بھی سپھل رہے۔

لیکن کچھ ہی دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی تھی، اور بھگوان کو بھی اور وہ گھبرا گئی تھی، کہ آخر اس کو کیا ہوتا جا رہا ہے، بیٹی جوان ہو گئی ہے، اب اس کا گونا ہوگا، وہ اپنی سسرال جائے گی، اس کے بچے ہوں گے وہ نانی بن جائے گی، اس کی گنتی بڑی بوڑھیوں میں ہونے لگے گی، اس سے کیا ہوتا ہے کہ اس کی عمر اب تینتیس سال تھی پھر اس کے ساتھ ایک خیال آ گیا، کہ اس کی بڑی بہن، اس سے تین سال بڑی تھی، اور ایک ہی سال پہلے اس کے بچہ ہوا تھا بڑی بہن تو دبلی پتلی اور مریل سی تھی، اور وہ خود بھری پوری جوان لگتی تھی، باہر کا کوئی آدمی اسے دیکھ کر پارو کو اس کی بیٹی نہیں کہہ سکتا تھا، زیادہ سے زیادہ اس کی چھوٹی بہن بتاتا، انجان تو انجان بہت سی ناطے کی عورتوں نے بھی ایسی ہی بات کہی تھی، اور وقت سے پہلے بیوہ ہو جانے پر افسوس کا اظہار کیا تھا، جب وہ پارو کو دیکھتی، اور لوگوں کی باتیں یاد کرتی تو اس کا دل جیسے ڈوبنے لگتا، اور محسوس کرتی کہ جوانی پارو پر آتی ہے اور نشہ اس پر چھایا رہتا ہے، جتنا سوچتی دل کو لپکتا ہوا پاتی، اور کبھی کبھی سوچتے سوچتے وہ ایسا محسوس کرتی کہ اس کی چھاتی پھٹ جائے گی، اور اس کا دل باہر نکل آئے گا، جب کوئی مرد اس سے کوئی معمولی بات بھی کرتا تو اسے معلوم ہوتا کہ اس کے کانوں میں رس گھول رہا ہے، جب بھی کوئی جوان مرد اس کے سامنے آ جاتا تو اس کی آنکھیں اس پر جھکی پڑتیں اور وہ اپنے کو بہت ہی بے سہارا محسوس کرتی۔

جب بھی وہ گھبرا جاتی، تو بھاگ کر بھگوان کی تصویر کے سامنے کھڑی ہو جاتی، اور تھوڑی دیر کے لیے، اسے کچھ سکون ملتا۔

پارو کے گونا کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی، گھر میں بہت سے ناتے والے بھرے تھے، ردھیا کی آنکھوں میں کچھ تکلیف تھی، رات کو سوتے وقت آنکھوں میں کاجل لگایا تھا، صبح کو نہا دھو کر سفید کپڑے پہنے بیٹھی تھی، رشتہ کے ایک نند نے شوخی سے ایک چٹکی لی، اور آہستہ سے کان میں بولی، بھوجی ان آنکھوں کی کٹار کس پر چلے گی، ذرا آئینہ میں تو دیکھ کاجل جلم ڈھا رہا ہے، ردھیا کو معلوم ہوا کہ اس کی نند نے بدن میں، بجلی کا تار چھوا دیا، اور سارے بدن میں ایک لہر سی دوڑ گئی اس کا دل الٹنے پلٹنے لگا، اور اس نے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سنبھالا اور نند کے جانے کے بعد موقع پا کر کمرے میں آئینہ دیکھنے گئی، اس کو محسوس ہوا کہ پندرہ سال پہلے کی ردھیا ہے، وہی چتون، وہی تیکھا پن وہی دمک اور وہی تازگی اپنی کاجل بھری آنکھیں اسے خود بھی بڑی خوبصورت معلوم ہوئیں اور دل میں جیسے بجلی سی کوند گئی، مریادا کے نام پر اس نے اپنی زندگی خواہ مخواہ برباد کر دی، اور اب بھی، ویسی ہی اداس زندگی کاٹے جا رہی ہے، اگر ماں باپ کا کہا مانتی، بہنوئی کا کہا مانتی تو آج ایسی زندگی اداس نہ ہوتی، زیادہ آرام اور دلچسپی کے ساتھ کٹتی، ایک بیٹی کی دیکھ بھال تو دوسرا بیاہ کر کے بھی کر سکتی تھی، اور وہ اپنے ضد پر پچھتانے لگی، اگر وہ کلکتہ والے بہنوئی سے بیاہ کر لیتی تو اس کا سارا غم دُھل جاتا، اور یہ کوئی بات بھی تو نہیں تھی، اس کی برادری میں بیوہ عورتوں کا بیاہ ہوتا ہی تھا، کوئی کچھ بولتا تو نہیں، اسے بہنوئی کی ایک ایک بات یاد آنے لگی، وہ ساری باتیں گونا سے پہلے اس نے کہی تھیں، اور وہ بھی جو اس کے بیوہ ہونے کے بعد کہی تھیں، اور اسے پچھتاوا ہونے لگا، بہنوئی کتنا اداس ہو گیا تھا، جاتے وقت اس کا چہرہ کتنا اترا ہوا تھا، اور اس سے ہمدردی کی ایک زبردست لہر اس کے دل میں اٹھی، اور وہ دیر تک پچھتاتی رہی، سوچتی رہی کہ اس نقصان کو کبھی پورا نہیں کر سکے گی۔

پارو کے گونا کی تیاریاں ہو رہی تھیں، برات آنے

بہار میں خود روزگار اسکیم کا افتتاح

اس اسکیم کے تحت صوبہ بہار میں تکنیکی تعلیم یافتہ بے روزگار افراد کو خود روزگار کے لئے امداد دی جائے گی۔ میکنیکل گریجویٹ، آئی ٹی آئی سے تربیت یافتہ، میڈیکل گریجویٹ اور ڈپلوما یافتہ بے روزگاروں کو [illegible] روپئے تک کی رقم بطور قرض دی جائے گی جب کہ وہ اپنا کوئی ذاتی کاروبار شروع کر سکیں۔ انجینئرنگ میں [illegible] کو [illegible] ڈپلوما یافتہ افراد کو [illegible] آئی ٹی آئی [illegible] ڈاکٹروں کو [illegible] روپئے کے قرضہ جات [illegible] بینکوں کے [illegible] دئے جائیں گے۔ اس سال [illegible] کے دوران [illegible] افراد کو اس اسکیم کے تحت فائدہ پہنچانے کا [illegible] روپئے [illegible] ہزار روپئے [illegible] دئے گئے ہیں [illegible] اسکیم کے تحت فائدہ پہنچانے والے [illegible] ترجیح دی جائے گی۔ اس اسکیم کے تحت دئے گئے قرضہ جات [illegible] کے حساب [illegible] لیا جائیگا حالانکہ اس میں کوئی ضمانت نہیں [illegible] دیہی علاقوں کے [illegible]

میں دو ہی چار دنوں کی دیر تھی، وہ اس کاموں میں لگی ہوئی تھی، مگر اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل کے سارے تار تیزی سے جھنجھنا اٹھے ہیں، اور دل کے اندر سے کوئی میٹھا میٹھا گیت ابل رہا ہے، جب بھی کوئی مرد اس سے کچھ پوچھنے آتا تو دیر تک اس سے باتیں کرتی رہتی، اور اس کے پاس سے اٹھنے کو اس کا دل نہیں چاہتا، اور جب وہ چلا جاتا، تو بھی کہہ دیتی، پھر آنا کام بہت ہیں، اور دل میں کہتی پارو کا گونا ہو جائے پھر اپنی اکیلی زندگی رہ جائے گی، اور جب گونا سے دو دن پہلے کلکتہ سے اس کا بہنوئی آ گیا تو معلوم ہوا کہ سارا گھر ناچ رہا ہے منہ سے کچھ بولتی تھی، اور دل میں کچھ سوچتی تھی، سوچتی تھی کہ پارو کا گونا ہو جائے گا، وہ اپنے گھر چلی جائے گی، پھر وہ آزاد ہو جائے گی، ایک بوڑھی ساس دیکھا جائے گا، وہ بھی پکا ہوا پھل ہے، کب ڈالی سے ٹپک جائے، پھر اپنا گھر اپنا راج۔

ایک ڈیڑھ سال سے ردھیا ایک ساتھ دو زندگیاں گذار رہی تھی، ایک زندگی وہ جسے سارے لوگ دیکھ اور جان رہے تھے، اور ایک وہ جسے وہی اکیلے جانتی تھی، جو نہ کسی کو معلوم ہو سکتی تھی، اور نہ جسے وہ ظاہر کر سکتی تھی، ایک زندگی وہ تھی جو طوفانوں سے ٹکراتی ہوئی مضبوط جہاز کی طرح آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی، اور وہ یہ بھی نہیں سوچ سکتی تھی، کہ کہاں جا کر رکے گی کبھی کبھی اسے اپنے اوپر غصہ آتا تھا اور کبھی کبھی پارو پر اور جب سوچنے بیٹھتی تو فیصلہ بھی نہیں کر سکتی کہ قصور اس کا اپنا ہے یا پارو کا۔

بہنوئی کو خود ہی خط لکھ کر اس نے بلایا تھا، وہ آیا تو اسی ٹھاٹ کے ساتھ، صاف کپڑے انگریزی بال اور پاؤں میں چمکیلا جوتا۔ ردھیا اور پارو کے لیے کپڑا بھی لایا، اور ملا تو اسی طرح، ردھیا کا دل کروٹیں بدلنے لگا، اب بھی وہ تگڑا اور ہنس مکھ تھا، بس کان کے پاس بالوں میں سفیدی آ رہی تھی۔ پہلے تو پارو کے گونا پر اس نے خوشی ظاہر کی، پھر پوچھنے لگا کہ اس کی بیٹی کے بیاہ میں کلکتہ جائے گی نا، ردھیا کا دل۔ کلکتہ چلنے کی بات اس کے منہ سے سنتے ہی کھل اٹھا۔ اور وہ بولی ضرور چلیں گے، اور اس کے دل نے کہا، جائیں گے کیسے

نہیں ہم تو تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں، تم ہی تو ایک ایسے آدمی ہو جس کو سچ مچ میری فکر اور پرواہ ہے، اور پھر اس کا دل دکھ گیا کیوں اسے ایسا سوکھا جواب دیا گیا، مرنے والا اب لوٹ کر تو آئے گا نہیں، بیاہ کر لیتی تو زندگی سکھ چین سے کٹتی، بے کار ہی سب کی بات ٹھکرا دی۔ اور کانٹوں میں زندگی کو گھسیٹتی رہی۔

ردھیا نے جو کچھ دھیلا دھیلا کر کے اکٹھا کیا تھا۔ دل کھول کر پارو کے گونا میں خرچ کرنے لگی، اور تھا بھی کون جس کے لیے بچا کر رکھتی۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ پارو کا گونا ہو جائے گا تو سب کچھ بیٹی داماد کے حوالے کر دے گی اور چپ چاپ رام نام جپے گی، اور زندگی گذار دے گی۔ لیکن جب گونا کا دن نزدیک آنے لگا تو سوچنے لگی۔ اب پارو کے سسرال چلی جانے کے بعد وہ کیا کرے گی، کس کے لیے کرے گی۔ اس کی زندگی کا کیا مقصد رہ جائے گا، اکیلی اس گھر میں بھوت کی طرح زندگی کے دن کیسے کاٹے گی، اس کی عمر بھی اتنی نہیں ہوئی تھی کہ اسے بوڑھی کہا جائے، اور اس کی صحت اس نے بار بار دیکھا اور سوچا تھا کہ بہتوں کی نظر اس پر ترچھی پڑتی تھی وہ تو اس نے اپنا ڈھنگ ہی بدل لیا تھا، اور وقت سے بہت پہلے ان کو بوڑھی بنا لیا تھا، ورنہ اب بھی بہت سے لوگ تھے جو اس کو اپنے گلے کا ہار بنانے کے لیے تیار تھے، اس نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا، مگر اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ پارو کے جانے کے بعد اس کی زندگی بنجر میدان بن کر رہ جائے گی، جس میں کہیں کوئی پھل والا پیڑ تو ایک طرف کہیں کوئی گھاس بھی نظر نہیں آئے گی، جب اس کا بہنوئی آ گیا تو اسے بڑا سہارا ملا، اور اس نے سوچا کہ اطمینان سے ہر طرح کی باتیں اس سے کرے گی، اور اپنی زندگی کا کوئی نقشہ بنائے گی، لیکن بیاہ کی بھیڑ بھاڑ میں اس سے دل کھول کر باتیں نہ ہو سکیں، جو بھی باتیں ہوئیں، پارو اور اس کے گونا کے بارے میں، نہ اس کو بات کرنے کی فرصت تھی اور نہ اس کے بہنوئی کو۔

آخر پارو کا گونا ہو گیا، اور پارو روتی ہوئی سسرال چلی

گئی، ردھیا کا دل جیسے بیٹھ گیا، اس کی ساری زندگی کی کمائی دوسرے کی ہوگئی، اس کا اپنا ہاتھ خالی رہ گیا، خوب روئی۔ آنسو تھمے پر رکتے ہی نہ تھے، پھر یہ سوچ کر ذرا سکون ہوا کہ اسی دن کے انتظار میں پلکوں میں راتیں کاٹ دیا کرتی تھی، کون لڑکی ساری زندگی ماں باپ کے گھر میں رہتی ہے، اور یہ اچھا بھی نہیں، لڑکی کی خوش نصیبی بھی یہی ہے کہ اپنا گھر بسائے، اور ماں باپ کی خوش نصیبی یہ ہے کہ بسا بسایا گھر دیکھے، اس میں لڑکی کی بھلائی ہے، اور ماں باپ کی بھی، اور یہ سوچ کر اسے سکون آگیا۔

گونا کے دوسرے ہی دن سے مہمان جانے لگے، مہمانوں کے جانے کے بعد ردھیا کو محسوس ہوتا کہ اس کے گھر میں سناٹا ہوتا جا رہا ہے، اور اس کو ڈر معلوم ہونے لگتا، کہ سارے مہمانوں کے چلے جانے کے بعد جب بالکل سناٹا ہو جائے گا، ایک وہ اور ایک بوڑھی ساس رہ جائے گی، تو اس گھر کی اور اس کی کیا حالت ہوگی، اور اکیلے پلنگ پر اسے نیند کیسے آئے گی، پارو تو دور جا چکی، اب وہ اکیلی ہی سوئے گی، اسے پارو کا سونا، اس کی گہری نیند یاد آتی۔ اور نیند کی حالت میں اس کی ہر حرکت اور جیسے سارے بدن میں سنسنی سی پھیل گئی، اور وہ سوچ سوچ کر گھبرانے لگی، کہ اکیلے اس کی زندگی کیسے کٹے گی۔

سارے مہمان چلے گئے، بس ایک دو اور تھے، جو جانے کی تیاریوں میں تھے، اس کے بہنوئی نے بھی کلکتہ جانے کو کہا تو ردھیا کے دل کو زور کا دھکا لگا، اس کے بہنوئی نے کہا تھا کہ اس کا اب جانا ضروری ہے، کلکتہ جیسے شہر میں اس کے بچے اکیلے ہیں، اور کام کا بھی نقصان ہوگا، اور اس نے بہنوئی کی خوشامد کی تھی، کہ دو تین دن اور رہ جائے پھر وہ بات کرے گی، اور وہ رک گیا تھا، اور ردھیا سوچ رہی تھی کہ اس سے کیا بات کرے گی۔ اور کس طرح اپنے دل کا حال اسے بتائے گی، اسے بار بار خیال آتا کہ اس نے اسے کتنا روکھا جواب دیا تھا، اور بہنوئی کتنا بھلا آدمی تھا کہ خط پاتے ہی اپنے بچوں کو چھوڑ کر آگیا تھا، اور سب تو گونا ہوتے ہی چلے بھی گئے، اور جو دو ایک تھے، وہ جانے والے ہی تھے، مگر وہ رکنے پر رک گیا تھا، اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر جائے، اور بہنوئی کے پاؤں پر سر رکھ دے اور کہے کہ اس سے غلطی ہوگئی تھی، عقل نہیں تھی معاف کر دے۔

دو دن اور بھی گذر گئے، لیکن جب تک ایک مہمان بھی رہا وہ اپنے بہنوئی سے بات نہ کر سکی، بس ادھر ادھر کی اوپر دل کی تھی، وہ دل ہی میں رہ گئی، جو کچھ کہنے کو سوچتی وہ سب اس کے دل کے اندر ہی دب کر رہ جاتا، ایک تو رات گئے تک لوگ آتے ہی جاتے رہتے، اور پھر یہ اطمینان نہیں کہ کب کون آئے، پھر اس کا بہنوئی بھی اتنی ہی باتیں کرتا، جو ضروری ہوتیں، اور کام میں لگا رہتا، کبھی اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی، جو ردھیا کا دل بڑھتا، اور ردھیا بھی دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیتی، جب بھی سامنے آتا، اور بات کرتا، تو کہتا کہ اب بچوں میں جی لگا ہوا ہے، بس انہیں کی فکر ہے، سب اپنے اپنے ٹھکانے لگ جائیں، تو اطمینان ہو، ردھیا کو اس کے ساتھ دلی ہمدردی تھی، وہ جانتی تھی کہ لڑکی پالنا کتنا کٹھن کام ہے اور اس بے چارے کی تو تین تین بیٹیاں تھیں، اور ان کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا، اس کی دوسری عورت بھی دو سال پہلے تین بچے چھوڑ کر مر گئی تھی۔ اس کا دل کہتا کہ کہے "اب میں چلوں گی، میں ان کی دیکھ بھال کروں گی، اب اس گھر میں میرا ہے بھی کون، جس کے لیے یہاں اکیلی گھلتی رہوں گی" لیکن ہر بار جیسے اس کے منہ پر مہر لگ جاتی شرم زبان کو پکڑ لیتی، اور کبھی اس کے اندر کی عورت جاگ اٹھتی، پہلے وہی کچھ بولے ورنہ دل میں کیا کہے گا، جب ہم نے بیاہ کرنے کو کہا، تو اینٹھ گئی تھی، اور اب پاؤں کی دھول بننے کو تیار ہے، اور کبھی یہ بھی ڈر لگتا کہ کہیں کوئی ایسی بات جواب میں کہہ دے جو پھر اس کو ساری زندگی منہ دکھانے کے لائق بھی نہ رہے، اور وہ دل ہی دل میں چپ رہی، کبھی سوچتی لوگ کیا کہیں گے، داماد کیا سوچے گا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد اس کے بہنوئی نے کہا کہ وہ صبح سویرے ہی چلا جائے گا، اور ردھیا کا ماتھا جیسے چکرا گیا کھانا کھا کر وہ تو باہر دروازے پر سونے چلا گیا، اور ساس بھی

کھا پی کر سوگئی، ادھر کئی دنوں سے بڑھیا کی طبیعت ڈھیلی تھی۔ ردھیا کام ختم کرکے پلنگ پر تھک کر چور پڑ گئی، مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی، پارو کو سسرال گئے پانچ دن ہو چکے تھے اور واپسی کی کوئی تاریخ مقرر نہیں ہوئی تھی، گھر سنسان ہو رہا تھا، سناٹے اور اکیلاپن کے احساس سے وہ تڑپ سی اٹھی اس نے دروازہ کھول کر باہر دیکھا، چاندنی کھلی ہوئی تھی اس کا بہنوئی سائبان میں سویا ہوا تھا، چاند کی کرنیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں، وہ بے خبر سو رہا تھا، ردھیا کا جی چاہا کہ اسے اٹھائے اور باتیں کرے "یہی وقت اس کے اطمینان کے ساتھ باتیں کرنے کا تھا، وہ دیر تک اسے دیکھتی اور سوچتی رہی مگر اس کے پاؤں جیسے جم کر رہ گئے، اس نے کئی بار ہمت کی کہ آگے بڑھے، اسے اٹھائے اور اسے ساری باتیں سمجھا دے کہ اب اس گھر میں اس کا کوئی بھی نہیں رہا، اور اب وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی، چاہے یہ گھر ہو یا کوئی اور اب وہ اس سے دور نہیں رہنا چاہتی، پہلے جو بیاہ کرنے سے انکار کر دیا تھا، تو غلطی کی تھی، اب پھر اس غلطی کو دہرانا نہیں چاہتی، اس نے پھر ہمت کی، قدم بڑھائے کہ اسے اٹھائے اور اس کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دے، اور اس کی گود میں پھیل جائے، ابھی وہ جوان تھی، اور زندگی کا لطف اٹھا سکتی تھی، اور وہ دونوں — دنیا کی پروا کیے بغیر ایک دوسرے کے ہو جائیں، اس نے ہمت کرکے قدم بڑھایا ہی تھا کہ یکایک اس کی ساس کی آواز آئی۔

"بہو ذرا پانی دو پیاس لگ رہی ہے"

اور وہ ایک جھٹکے سے مڑی، جلدی سے دروازہ بند کیا اور گلاس میں پانی لے کر ساس کے پاس پہنچی، بوڑھی ساس نے پانی کا دو گھونٹ پیا اور بولی۔

"بہو تو تپسیا کر رہی ہے، میری سیوا نہیں، اس جنم میں تجھے کچھ نہ ملا، اگلے جنم میں بھگوان اس تپسیا کا پھل ضرور دے گا"

اور ردھیا کا دل جیسے ہل گیا، سارا بدن تھر تھرانے لگا اور وہ کانپنے لگی، جیسے طوفان میں کوئی نازک ڈالی کانپے ساس نے دیکھا اور بولی۔

"بیٹی اب سو جا تو بہت تھکی ہوئی ہے"

"ردھیا ساس کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئی، بوڑھی نے پھر کہا۔

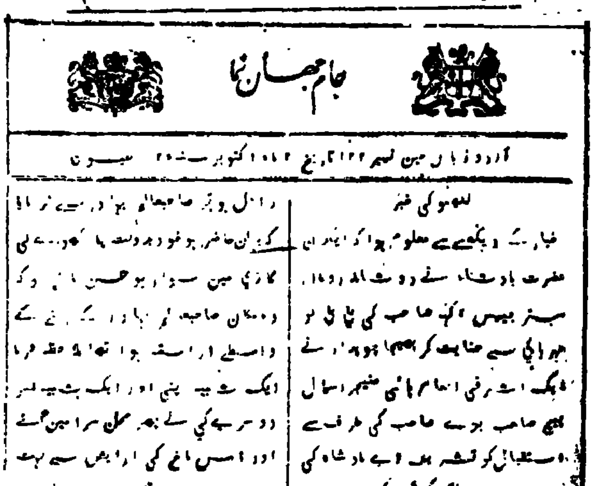
"جا سو جا بیٹی، تیرا حال دیکھ کر میرا دل ڈوبتا ہے"

ردھیا بولی۔

"ماں اب میں تمہارے پاس سوؤں گی" تم کو پکارنے میں تکلیف ہوتی ہے"

اور وہ ساس کے بستر پر ایک کنارے لڑھک گئی۔

(چار چہرے — نصرت پبلشرز لکھنؤ — ۱۹۷۷ء)


جام جہاں نما

لکھنؤ کی خبر

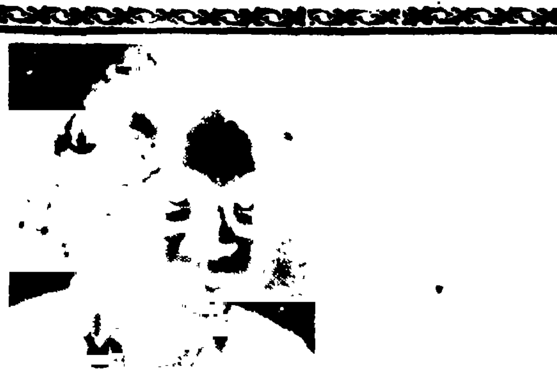
"جام جہاں نما" اردو کا پہلا اخبار

بقیہ قالین

ہاتھوں سے گر پڑے گا۔ اس نے انجانے میں اپنی امی کو دیکھا۔ جو یوں لیٹی ہوئی تھیں جیسے اٹھنا ان کے بس میں نہ ہو۔

(۱۹۶۸ء کے منتخب افسانے — نازش بک سینٹر دہلی — ۱۹۶۸ء)

غیاث احمد گدی



پہیہ

تیرہ برس کی عمر میں شادی شدہ لچھو نے جب دیکھا کہ اس کا شوہر ہر رات اس کی بجائے دلاری سے پاؤں دبواتا ہے، اور آدھی رات کو اس کو نیچے فرش پر دھکیل کر لیمپ بجھا دیتا ہے۔ اندھیرے میں صبح تک دلاری اس کے پاؤں دباتی رہتی ہے تو ایک دن وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل جاتی ہے اور پھر لوٹ کر خاوند کا منہ نہیں دیکھتی۔

"پھر کیا ہوتا ہے لچھو؟"

"لچھو نہیں لچھورانی کہو...." اس نے قطع کلام کرتے ہوئے پہلے اپنے نام کی طرف متوجہ کیا۔

"اچھا لچھورانی پھر تم نے کیا بتایا تھا؟" پھر لچھورانی کو الفت یکہ وان مل گیا تھا جس نے پسنجر کے ایک خالی ڈبے میں ایک گٹھری کے ساتھ اسے بھی گٹھری بنا نیند میں بے خبر پایا تھا اس نے لچھورانی کو جگایا اور پوچھا کہ کہاں جاؤ گی تو لچھو نے نیند اور سفر کی تھکان سے ٹوٹے ہوئے جسم کو سیدھا کرتے ہوئے غنودگی کے عالم میں کہا "گھر"۔

"پھر الفت یکہ وان نے مزید کچھ سوال اس پہ نہ کرنا مناسب سمجھا کہ اس کیفیت میں اسے معقول جواب کی قطعی توقع نہ تھی اور یکہ میں بٹھا کر اپنی جھونپڑی میں ایک بھاری گٹھری کی طرح ٹوٹی جھیلنگ چارپائی پر پٹک دیا تو وہ چونکی "ارے مجھے کہاں لے آئے ہو؟"

"گھر"، الفت نے اسی سادگی سے کہا اور چولھے کے پاس پہونچ کر آگ جلانے لگا۔

اس کے بعد لچھو نے اور کچھ نہیں پوچھا۔ لچھو کو ایک گھر چاہیے تھا اور اس کی مختصر سی زندگی میں —— اس کے خاندان کے پچھلے صدیوں کا روایتی تصور بھی یہی تھا۔ ایک چہار دیواری ہو جہاں کوئی ٹوٹی جھیلنگ چارپائی ہو نہ ہو ایک چولھا ضرور ہو اور اس کے بعد اگر کسی چیز کی ضرورت تھی تو بس اس کے اندر گھر والا بھی ہو۔ بغیر گھر والا کے گھر کا تصور نامکمل ہوتا ہے۔

الفت کی بیوی سال بھر ہوتے اللہ کو پیاری ہوئی تھی۔ الفت کے گھر میں بن گھرنی کے بھوت کا ڈیرہ لگ رہا تھا ایسے میں نزول رحمت سے فیض یاب نہ ہونا کفران نعمت ہے۔

لچھورانی اکثر مجھ سے ازدواجی زندگی سے متعلق ایک بہت پرانی گھسی پٹی مگر حقیقت سے قریب تمثیل پیش کرتی ہے۔ یعنی، یعنی زندگی ایک گاڑی ہے اور عورت و مرد اس کے دو پہیے..... لہٰذا دونوں پہیوں کا برابر اور متوازی ہونا از بس ضروری ہے ورنہ قدم قدم پر دھکے میں ٹھوکریں ہیں۔

چنانچہ چند مہینوں کے بعد لچھورانی کو یقین ہو گیا کہ یہ جو زندگی کی گاڑی وقت کی سڑک پر اچھلتی کودتی، اچھلتی پھاندتی جا رہی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ سڑک ہی خراب ہے بلکہ پہیے کچھ درست نہیں چھوٹے بڑے ہیں اور آپس میں لاگ نہیں کھاتے۔

بقول لچھورانی کے چند ہی مہینے کے بعد ہر روز وہ اس کی پٹائی کرتا کہ محاورتاً نہیں، سچ مچ اسے اپنی نانی یاد آنے لگتی منہ اندھیرے وہ یکہ لے کر گھر سے نکل جاتا اور رات گئے جب واپس آتا تو شراب کے نشے میں دھت پہلے کھانے کو گوشت روٹی مانگتا جب گوشت کھا چکتا اور روٹی پھینک چکتا تو لچھورانی کی طرف یوں متوجہ ہوتا گویا دن بھر کا قرضہ اتارنے کا وقت آگیا ہو پھر

جب تھک جاتا تو جھلنگا چارپائی پر یوں پڑ جاتا گویا سارے فرائض پورے ہوگئے ہوں۔ اودھر اطمینان سے اس امید میں بیٹھنے والی پھورانی کہ بعد ازاں عام شوہروں کی طرح محنت بھی کریں گے دیکھتے دیکھتے جب دیکھا کہ کنویں کا پانی ایک دم سے تارا ہوگیا ہے تو سوچتے سوچتے وہ ایک دن اس نتیجے پر پہونچی کہ ان تلوں میں تیل ہی نہیں رہا۔

او بڑکھابڑ سڑک پر چلتے چلتے الفت میاں کے یکّہ کا انجر پنجر ڈھیلا ہوگیا ہے اور اب تو خدشہ ہے کہ کسی دن سواریوں کو لیے دیتے دھڑام سے کسی کھڈ میں نہ جا گرے۔

پھورانی نے بتایا کہ گدری جی، بس اسی دن سے میں نے یہ جانا کہ یہ چارپائی پر گہری نیند سویا ہوا الفت یکہ وان جس کے ساتھ میں نے اپنی قسمت جوڑی تھی وہ نرا گوشت کا لوتھڑا ہے گوشت کا لوتھڑا۔

"پھر تم نے کیا کیا پھورانی؟"

پھر میں کیا کرتی، تھوک دیا اس کے منہ پر اور چلی آئی اس شہر میں....

جس شہر میں الفت میاں یکہ ہانکتا تھا وہیں اس کا ایک یار رہتا تھا۔ سدو۔ سدو اکثر الفت کے ساتھ اس کے گھر آیا کرتا تھا خصوصاً رات کے وقت جب شراب کے نشے میں چور ہوتا۔ وہ یکّے سے اُتار کر سہارا دیتے ہوئے اسے چارپائی پر لٹاتا۔ گھوڑی کو کھولتا یکے کو چھپّے تلے رکھتا۔ گھوڑی کو سانی لگا دیتا۔ پھر گھنٹہ دو گھنٹہ گھوڑی کو اتنی محبت سے مالش کرتا گویا گھوڑی الفت کی نہیں خود اس کی اپنی ہے۔

مالکانہ احساس کا یہ ارتقا تھا کہ رفتہ رفتہ اس نے خود پھورانی کو اپنی ملکیت سمجھنا شروع کر دیا۔ جس طرح وہ گھوڑی کو سانی لگاتا، گاڑی کو چھپّے میں رکھتا، چاہتا تھا کہ پھورانی کی بھی دیکھ ریکھ شروع کر دے۔

بلکہ ایک دن جب پھورانی سہ پہر کے وقت چھوٹے سے دھندلے آئینے کی مدد سے ماتھے پر بندیا لگا رہی تھی اس نے بتایا کہ بندیا ٹھیک جگہ پر نہیں لگ رہی ہے۔ پھورانی نے کہا تو منہ کیا دیکھتا ہے لگا دے۔"

سدو آگے بڑھ کر بندیا لگانے لگا اور دفعتاً اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور پھورانی نے محسوس کیا کہ بندیا سدو نے صرف پیشانی پر ہی نہیں سارے رخسار پر لگائی ہیں۔

"یہ کیا کر رہا ہے سدو؟"

"کچھ نہیں رانی بندیا...." سدو کی آواز حلق میں ٹوٹنے لگی اور وہ سرمستی کے عالم میں اس کی کمر کے گرد اپنے ہاتھ پھیرنے لگا۔

پھو بولی۔ میں نے محسوس کیا جیسے کوئی گھمن سانپ میری کمر کے گرد لپٹ گیا ہے۔ ذرا دیر کے لیے تو میں ڈری۔ پھر پل بھر میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ میں نے سدو کو ایسا دھکا دیا کہ وہ چکرا کر زمین پر جا گرا۔ تب پھر میں لپکی اور چاندی کے کڑے والے ہاتھ سے جو پیٹا جو پیٹا کہ اس کے حواس ٹھکانے آگئے

پھورانی نے کہا کہ گدری جی۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا میں اگرچہ اسے پیٹ رہی تھی اور وہ پٹ رہا تھا مگر مجھے ایک ڈر بھی تھا۔ اکیلا گھر ہے اور سدو پھر بھی مرد ذات ہے۔ مگر جب دیکھا کہ اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے گھگھیا کر مجھ سے معافی مانگنے لگا تو میرے ہاتھ رک گئے۔ اب کوئی ایسوں کو کیا مارے۔ اس وقت مجھے بڑی شدید نفرت ہوئی اور میں نے اس کے منہ پر بھی تھوک دیا۔

پھر یوں ہوا کہ پھورانی نے جس سدو کے منہ پر تھوکا تھا اس وقت جب اس کو الفت میاں کے کنگلے پن کا احساس ہوا اور ساری دنیا تیرہ و تار دکھائی دینے لگی تو روشنی کا مینار بن کر جو چیز اس کے سامنے آئی وہ سدو ہی تھا۔

وہ اس رات کے پچھلے پہر جب چاروں طرف ہو کا عالم تھا بلا کھٹکے گھوڑی کے چھپّے کے پاس آئی جہاں لید کے پاس ایک میلے ٹاٹ پر دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ سو رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے سدو کے شانے پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے جگایا۔ سدو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اس کے پاؤں پکڑ کر گھگھیانے لگا۔

"نہیں نہیں پھو اب تو مجھے معاف کر دے بہت ہوگیا

اب تو بخش دے“

لچھو رانی کو یوں لگا کہ پھر اس کے منہ پر تھوک دے۔ مگر اندھیرے کنوئیں میں یہی ایک رسی تھی جسے تھام کر وہ باہر آسکتی تھی۔ تو لگدی جی، چار برس میرے ساتھ رہتے ہوتے بھی وہ میرا خاوند نہ رہ سکا۔ اس سے مجھے بچہ بھی ہوا یعنی میری زندگی کے پیڑ میں پھل بھی لگا مگر میں نے برابر یہی سمجھا کیا کہ سدو میرا مرد نہیں میری جورو ہے۔ میری بیوی اور میں اس کا مرد ہوں جو دن بھر پان کی دکان میں کتھے چونے کا تماشا لگا کر پیسہ بناتی ہوں بازار سے سودا سلف لاتی ہوں۔ اپنے اور سدو کے لیے کپڑے خرید کر لاتی ہوں اور وہ بے چارا دن بھر شریف عورتوں کی طرح کھانا بناتا ہے، کپڑے صاف کرتا ہے، مسالہ پیستا ہے۔ اور کسی کسی دن جب میرا بدن بہت ٹوٹتا ہے تو وہ مالش بھی کرتا ہے۔

یہاں پہونچ کر لچھو رانی شرما جاتی اور آنچل سے منہ ڈھک کر ہنسنے لگتی۔

میں کہتا ساری کہانی میں لچھو رانی یوں تو تم ہر جگہ اپنے عورت پنے کا پتہ چھوڑتی آئی ہو مگر ظاہری طور پر یہیں عورت دکھائی دیتی ہو۔ اپنے دیس کی عورت۔

”کیا اپنے دیس میں عورتیں میرے جیسی نہیں ہوتی ہیں۔ کیا اس کے دو ٹانگیں، دو ہاتھ، ناک، آنکھیں... نہیں ہوتیں“

”ہوتی تو ہیں مگر کوئی عورت تمھاری طرح اپنے شوہر کا شوہر نہیں ہوتی اور اپنے شوہر سے بدن نہیں دبواتی“

”تو میں کیا کروں۔ وہ نکھٹو ہے بھی ویسا ہی“

پھر میں اچانک ایک الگ سوال کر بیٹھتا ہوں ”جو بھی سہی پر تم اس کے ساتھ خوش تو ہو؟“

لچھو رانی اس سوال کو سن کر کچھ دیر خاموش رہتی ہے پھر لمبی سانس لے کر میری طرف عجیب نظروں سے دیکھتی ہے

”پتہ نہیں جی، پر ایسا لگتا ہے جیسے مجھے کچھ اور چاہیے۔

بس یہی وہ مقام ہے جہاں میرا قلم رک جاتا ہے اور اپنے آپ میں یوں الجھ جاتا ہوں جیسے گھنے جنگل میں کھو گیا ہوں۔ لچھو رانی کی گرہستی کی گاڑی بڑے مزے میں چلی جا رہی ہے۔ سڑک بھی ہموار ہے اور دونوں پہیے بھی چھوٹے بڑے نہیں صرف اتنی سی چوک رہ گئی ہے غالباً دائیں طرف بایاں پہیہ لگ گیا ہے اور بائیں طرف داہنا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے بظاہر اس جگہ پہونچ کر کہانی مکمل ہو جاتی ہے۔ یعنی راجہ اور رانی مزے سے رہنے لگے ہیں۔ قصہ ختم اور پیسہ ہضم...

اگرچہ یہاں تک سوچنے کے بعد میں بظاہر افسانے کو اختتام تک پہونچا دیتا ہوں مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس تخیل طرازی میں مجھ سے کہیں بھول ضرور ہوتی ہے۔ کچھ چھوٹ رہا ہے۔ کوئی کمی پڑ رہی ہے گویا اس گہری زندگی میں کوئی موڑ آنا چاہیے۔ کوئی واقعہ۔ کوئی حادثہ... کوئی...

چنانچہ میں لچھو رانی پان والی کی کہانی نہیں لکھ پاتا میرے قلم کو، میری روح کو، لچھو رانی کی زندگی سے متعلق کسی انوکھے حادثے کا انتظار ہے۔ یہ حادثہ کب وقوع پذیر ہوگا، کن حالات میں ہوگا، پھر اس سے لچھو کی یکسانیت سے بہنے والی زندگی پر اور بعد ازاں میرے افسانے پر کیا ردعمل ہوگا۔ کیسے ہوگا۔

میں چند ہفتوں کے لیے آفس کے کام سے باہر چلا گیا۔ کام کی کثرت اور نئے لوگوں کے جھمیلے میں لچھو رانی اور اس کا افسانۂ زندگی تو کیا میں اپنے آپ کو بھول سا گیا۔ چند ہفتے گزار کے بعد جب واپس لوٹا تو رات مجھے ملیریا بخار نے آدبوچا۔ اکیلے گھر میں بخار اور درد کی شدت کے باعث ساری رات اور سارا دن میں نے خود فراموشی کے عالم میں گزار دیا۔ شام ہوتے ہوتے بخار ذرا کم ہوا تو سرہانے لچھو رانی کو پنکھا جھلتے ہوئے پایا۔

”میں نے صبح سویرے تالا کھلا ہوا دیکھا تو معلوم ہوا تم آگئے ہو... ذرا دن چڑھ لے تو تم خود آؤ گے سگریٹ پینے۔ بات دیکھتے دیکھتے دوپہر ہونے کو آئی بند دروازہ کھلا ہی نہیں تو میرے من میں شک ہوا۔ دیکھا تو تم سچ مچ مردہ سے پڑے ہو“

میں نے اٹھنا چاہا تو اس نے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”نہیں نہیں اٹھو نہیں۔ ڈاکٹر نے آرام کرنے کا مشورہ

دیا ہے۔"

ڈاکٹر کیسے آیا؟ میں نے گردن گھما کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ "کیا تم لائیں؟"

"نہیں جی ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے کہا اندر چل کر دیکھ لو۔" پھورانی نے یوں کہا گویا اپنے کو پس پردہ رکھنا چاہتی ہو۔

دس دنوں تک پھورانی نے میری خدمت کی۔ سارا سارا دن پنکھا جھلتی، ٹھنڈے پانی کی پٹی چڑھاتی۔ دودھ اور ساگو دانہ بنا کر دیتی اور ان سب سے بڑا کام یہ کرتی کہ تنہائی اور اجنبیت کے احساس کو دور دور تک بھٹکنے نہ دیتی۔ بلکہ راتوں کو جب کبھی میری نیند ٹوٹتی تو محسوس ہوتا گویا پھو ابھی ابھی یہاں سے اٹھ کر گئی ہے یا باہر دروازہ پر بیٹھی اونگھ رہی ہے۔

"یہ تم کیا کرتی ہو پھو! تمہاری دکان اور خراب ہوتی ہوگی اور سدو کی کمر کام سے دوہری ہوئی جاتی ہوگی۔"

سدو کو میں نے مار بھگایا۔ پھورانی نے بڑے اطمینان سے کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

آہن۔ میں نے محسوس کیا جیسے پھورانی کی گرہستی کی گاڑی دھڑام سے کھڈ میں گر پڑی ہو۔ میں نے پلٹ کر پھر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بدستور مطمئن تھا۔

"یہ کیسے ہوا؟"

"ہوا، تم اچھے ہو جاؤ تو بتاؤں گی۔"

پھورانی کے لہجے میں طمانیت سے میں بھی مطمئن ہو گیا۔ مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "پاؤں نہیں دبانے ہوں گے بے چارے نے۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔ اس موٹے کی قسمت ہی میں پاؤں دابنے لکھے تھے۔ مرد نام کی تو اس میں چیز ہی نہ تھی۔ میری دکان میں پان کھانے وہ پٹھان آتا تھا نا بڑی بڑی مونچھوں والا۔"

پھورانی کی دکان میں بڑی بڑی مونچھوں والا پٹھان پان کھانے کے علاوہ کچھ اور امید میں بھی آتا تھا۔ پھورانی محسوس بھی کرتی تھی مگر اتنا بھی نہیں۔ سوچتی جوان آدمی ہے دل لگی کر لیتا ہے۔

مگر ایک روز شام کے جھٹپٹے میں جب دکان میں اور کوئی گاہک نہ تھا اور پھورانی گوبر مٹی سے سامنے والا فرش پوت رہی تھی پٹھان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ باتوں باتوں میں نوبت یہاں تک پہونچ جائے گی اس کی پھو کو توقع نہ تھی اس نے سنبھالا لیا اور زور سے ایک جھٹکا مار کر پٹھان کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ اس نے پاس پڑی ہوئی جھاڑو اٹھائی اور ڈپٹ کر بولی۔

"خبردار جو آگے بڑھا۔"

مگر وہ پٹھان تاؤ میں تھا۔ اس نے لپک کر پھر کلائی پکڑ لی اور لگا جھنجھوڑنے۔ پھورانی مدافعت کر رہی تھی۔ مگر سدو راہ گیروں کی طرح صرف بیچ بچاؤ کی کوشش میں جٹا ہوا تھا۔ پھورانی نے بتایا کہ جی تب میں نے گالی دے دی۔ اور للکارا۔ پاس پڑی ہوئی لوہے کی چھڑ سے دے ایک۔ مگر یہ سن کر تو اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے چھڑ اٹھایا تو ٹھیک مگر اسی وقت پٹھان نے اسے ایک لات رسید کی اور وہ دور جا گرا۔

پھر ارے رے باپ رے باپ کہتا ہوا وہ جھونپڑی میں گھس گیا جیسے پھو کا اس سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو خیر سے راہ گیروں نے پٹھان کو مار بھگایا، ورنہ پتہ نہیں اس دن کیا قیامت گذرتی۔

قیامت تو اس دن گذری جس دن پھو میرے برتن مانجھ رہی تھی اور میں صحن میں کرسی پر بیٹھا کہانی لکھ رہا تھا۔ پھو نے راکھ بھرے ہاتھ کی پشت سے ماتھے پر آئی ہوئی بالوں کی لٹ کو اوپر پھینکتے ہوئے کہا۔

"یہ گھر بھی کتنا سونا سونا لگتا ہے۔ تم شادی کر لو۔"

"شادی، تو میری ہو چکی پھو تم جانتی ہو۔"

"پر بیگم جی یہاں رہتی تو نہیں۔ کیا فائدہ اس شادی کا۔"

میں نے کاغذ سے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ گویا میرے حالات

کافی متاثر تھی۔

"اب دیکھو نا تم اتنا بیمار پڑے۔ کوئی دیکھنے سننے والا نہ تھا۔ اگر تم کو کچھ ہو جاتا تو؟"

کچھ نہیں ہونے کا۔" ہم کہانی لکھنے والے بڑے بے حیا ہوتے ہیں پھر تم جو تھیں، کتنا خیال رکھا ہے میرا تم نے۔ تم نہ ہوتیں تو شاید میں اب تک مر کھپ گیا ہوتا۔"

اس نے پلٹ کر کہا، خدا نہ کرے..... تم جگ جگ جیو۔

اس کے پلٹ کر دیکھنے میں، اس کے لہجے میں، الفاظ میں کوئی رمز تھا۔ کوئی راز تھا۔ یہ عام انسانی جذبے سے کچھ اوپر کی چیز تھا۔ مگر میں نہ سمجھ سکا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا مجھے چھو کے گزر گیا مگر میں اسے چھو نہ سکا۔

تیسرے دن وہ میرے یہاں آئی اور میری کتابیں سجاتے ہوئے بولی "جانتے ہو جی لوگ کیا کیا باتیں بناتے ہیں۔... کہتے کہتے..... وہ رک گئی۔

"کیا کہتے ہیں لوگ؟" میں کہانی کے نقطۂ عروج پر پہونچ گیا تھا۔

"کچھ نہیں جی، تم نہیں سمجھو گے۔"

"اچھا،" میں نے بے خیالی میں کہا اور افسانوں کی دنیا میں کھو گیا۔

پھر ایک روز شام کے وقت جب چراغ جل چکے تھے اور موسم بارش کے باعث فضا خوش گوار ہو رہی تھی، لچھو رانی نہایت خوبصورت ساڑی میں ملبوس چہرے پر پاؤڈر لگائے مخموری چال چل کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"کیا بات ہے آج بہت خوش نظر آ رہی ہو؟"

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کیا فیصلہ کر لیا ہے؟" میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھتے کہا۔ آج لچھو رانی مجھے کچھ اجنبی سی دکھائی دے رہی تھی۔

"..... اس نے ہڑبڑا کر اپنے آپ کو سنبھالا۔" میں سوچتی ہوں کہ میں آپ کے یہاں سو یا بھی کروں — دن بھر تو ایک طرح سے رہتی ہی ہوں۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے لچھو رانی.....!"

"کیوں کا ہے نہیں ہو سکتا ہے۔ میں تمہارا کھانا بنا سکتی ہوں جھاڑو دے سکتی ہوں۔ برتن مانجھ سکتی ہوں۔ بستر تک تو لگا سکتی ہوں تو پھر یہ کیسے نہیں ہو سکتا۔"

لچھو کی منطق میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ پھر میں نے پلٹ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کے فیصلہ کن انداز کو دیکھ کر اور بھی دنگ رہ گیا۔

"مگر..... مگر"

"مگر کیا" وہ میری بوکھلاہٹ کا تماشہ مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھی "نہیں بھائی میں تو اب یہاں سے ٹلنے والی نہیں۔ کل صبح تک سارے ضروری سامان لے آؤں گی۔"

"لیکن کل میں مہینہ بھر کے لیے باہر جا رہا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں" وہ قطع کلام کرتے ہوئے اطمینان سے بولی "تب تو میرا یہاں رہنا اور ضروری ہے۔ آخر گھر کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ تمہارے پیچھے جانتے ہو آج کل کتنی چوریاں ہو رہی ہیں۔"

مناسب یہی معلوم ہوا کہ میں فی الحال خاموش رہوں میں نے ایک صندوق میں ضروری سامان رکھا اور چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو گیا۔

"ارے ابھی سے، جاؤ گے تو کل ہی نا۔"

"نہیں مجھے آج ہی جانا پڑے گا،" میں نے جیب سے کنجی نکال کر اس کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا "مہینہ بھر بعد آؤں گا۔"

اس کے بعد میں نے اس رات تو ایک دوست کے یہاں قیام کیا۔ دوسرے ہی دن شہر کے دوسرے رخ تقریباً تین میل کے فاصلے پر ایک مکان کرایہ پر لے کر اٹھ گیا۔

بہت دن ہو گئے غالباً چھ مہینے گذر گئے۔ لچھو رانی تاحال میرے ذہن پر کنکھجورے کی طرح قبضہ جمائے ہوئے تھی ایک روز میں بزاز کی دکان کے قریب سے گزر رہا تھا۔ ایک کھلی ہوئی فٹن سے کسی نے آواز دی۔ پلٹ کر دیکھا تو فٹن میں

ایک برقعہ پوش عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ "میں ہوں گدی جی، پھورانی"

پھورانی! یکایک میرا دل دھک سے ہوگیا۔ مجھے محسوس ہوا گویا میری اپنی زندگی کی گاڑی کھڈ میں گر پڑی ہو۔ پھو نے نقاب اُلٹ دی! اور کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔

"ڈروست جی میں نے شادی کرلی ہے"

"شادی کرلی پھو" میں نے کچھ ندامت کچھ اطمینان و مسرت سے کہا۔

اس کے چہرے پر بڑا گہرا میک اپ تھا۔ سرخی، پاؤڈر ہونٹوں پر گہری سرخ لپ اسٹک۔ اس کے جسم سے خوشبو پھوٹ رہی تھی اور مسرت سے اس کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں

"خوش تو ہو پھورانی؟"

"بہت" وہ گویا میرے سوال کی منتظر تھی، "میرا خاوند مرد ہے، بزدل نہیں۔ ڈرپوک نہیں۔ اتنی بڑی چھاتی ہے اس کی۔ گدی جی، جھگیڑو نہیں"

مجھے معلوم تھا ان سارے تیروں کا نشانہ میں ہی تھا۔ میں نے بے حیائی سے ہنستے ہوئے کہا "ہم کہانیاں لکھنے والے بڑے بزدل، بڑے کمزور ہوتے ہیں پھو۔ تمہاری گاڑی کا پہیہ تو "کہانا بہت مضبوط ہے..." اس نے برجستہ کہا اور نقاب چہرے پر اُلٹ لی "وہ آرہے ہیں تم جاؤ"

میں گاڑی سے الگ ہٹ گیا۔ ایک بزاز کی دکان سے کپڑے کا پیکٹ لیے ہوئے لمبا تڑنگا سرخ پٹھان جھومتا جھامتا فٹن کی طرف آرہا تھا۔

(اردو افسانے - نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا - ۱۹۷۴ء)

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

(غالب)



رام لعل

تین بوڑھے

جیسے کہ بزرگوں کی عادت ہوتی ہے مل جاتے ہیں تو اپنی اپنی جوانی کے قصّے لے بیٹھتے ہیں ـــ بڑے بڑے کارنامے کہ جو وہ بیوپار، ملازمت، شکار، جنگ یا محبت کے میدان میں انجام دے چکے ہوتے ہیں۔ اس روز بھی یہی ہوا، ستیہ دیو پرکاش نے اپنے پوتے کی شادی میں بچپن کے دو دوستوں کو دعوت نامے بھجوا دیے تھے، وہ دونوں ہی آ گئے تھے، کرم داد خان اور ہیڈ ماسٹر دیا ناتھ چاولہ، اب وہ تینوں ایک کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، ان کے سامنے میز پر چائے کے برتن رکھے تھے، اور سگریٹ بھی، لیکن وہ تینوں پوپلے ہونٹوں سے ایک ہی سگریٹ کے باری باری سے کش لے رہے تھے۔ ایک آدمی دو تین کش لگا چکتا تو وہ سگریٹ کو دوسرے آدمی کی طرف بڑھا دیتا اس کے بعد دوسرا آدمی بھی دو تین کش کھینچ کر سگریٹ کو تیسرے کے حوالے کر دیتا، یہ ان کی بہت پرانی عادت تھی، برسوں پرانی ان کا سگریٹ پکڑنے کا انداز بھی عجیب سا تھا۔

بند مٹھی میں جیسے کسی چڑیا کو قید کر لیا جاتا ہے، کچھ بچے کھڑکی پر چڑھ کر ان کا یہ تماشا دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے، جب بچوں کو اچانک ہنسی آ گئی تو تینوں بوڑھوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا پھر انہیں ڈانٹ کر وہاں سے بھگا دیا

ان کی باتوں میں وہ دخل انداز ہو گئے تھے۔

دیا ناتھ نے اپنے جھرّیوں سے بھرے ہوئے چہرے پر اچانک ایک تناؤ پیدا کر کے کہا ـــ "اپنی اسّی برس کی زندگی میں میں نے اپنی بیوی کی باتوں کو کبھی سچ نہیں مانا، اسی وجہ سے میری صحت بھی اچھی رہی ہے!"

یہ سن کر ستیہ دیو پرکاش کی ٹمٹماتی ہوئی بوڑھی آنکھوں میں بے پناہ چمک آ گئی، وہ ایک فیصلہ کن لہجے میں کہہ اٹھا۔

"یار، مرد کی صحت کا تعلق عورت کی باتوں پر یقین کر لینے سے ہرگز نہیں ہوتا، یار! اس کی صحت تو باتیں صرف سن لینے سے ہی خراب ہونے لگتی ہے۔ ویسے آپ لوگوں کو یاد دلانے کے لیے عرض کر دوں، میری بیوی فطرتاً کم گو تھی اتنی کم گو کہ اس کے حصّے کی ساری باتیں مجھ کو ہی کرنی پڑ جاتی تھیں!"

یہ کہہ کر وہ ٹھٹھا مار کر ہنس بھی پڑا اور جلدی سے کرم داد خان کے ہاتھ سے سگریٹ لے لی، کرم داد خان نے اس کی ہنسی کے بیچ میں ہی پٹھانوں کا سا مصنوعی غصّہ دکھا کر کہا ـــ "ارے بھائی تم لوگ عورت کی باتیں اور مرد کی صحت ـــ دو الگ الگ قصّے کیوں لے بیٹھے؟ پہلے ایک موضوع پر بحث ختم کر لو بائی! اس کے بعد ہی دوسرا اٹھانا! تب ہی تو اچھا انصاف بھی ہو سکے گا، اور ہمارا وقت بھی چٹکیوں میں کٹ جائے گا۔"

اب تینوں ہی کھل کھلا کر ہنسے، ہنستے ہنستے انھیں کھانسی کا دورہ بھی پڑ گیا، دیر تک کھانسنے اور اگالدان میں تھوکنے کے بعد کچھ پرسکون ہوئے تو ایک نئی سگریٹ سلگائی گئی، اور اس بات پر تینوں نے اتفاق ظاہر کیا کہ انھیں دراصل کسی بھی خاص موضوع میں دلچسپی نہیں ہے وہ تو محض وقت کاٹنے کی خاطر باتیں کر رہے ہیں، اور ایسا نہیں کریں گے تو انھیں خالی پا کر ننھے ننھے بچے ہی آ کر گھیر لیں گے، یہ نہیں ہوگا تو ان تینوں میں سے کسی نہ کسی کے بڑے لڑکے لڑکیاں ہی کرسیاں گھسیٹ کر پاس آ بیٹھیں گے اپنے اپنے پرابلم لے کر ـــ!

کوئی کہے گا ـــ "پاپا جی آپ نے فلاں فلاں کو انوی ٹیشن بھجوایا تھا نا ـــ فلاں نے تو جواب دے دیا ہے

وہ شام تک پہونچ جائے گا، لیکن فلاں نے بس گریٹنگز کے تار ہی بھجوا دیے ہیں! آپ کہیں تو فلاں کو ٹرنک کال پر پھر سے کہہ دوں ؟''

ڈیڈی آپ کے ہی کہنے پر ان کے ساتھ مارکیٹ چلی گئی تھی، لیکن وہی ہوا۔ انھیں کپڑے کی بالکل پہچان نہیں ہے کہنے لگے یہ سستی ہی چھ ساڑیاں خرید لو لیکن میں نے صرف چار ہی ساڑیاں ہیں، وہ بھی زیادہ قیمت کی، آپ کو دکھاؤں ؟''کوئی ادھیڑ بہن بھی وہاں آکر دھیرے سے بتاتیں ——"ہمارا رمیش ایک لڑکی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں ڈسکشن کر رہا ہے، دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں، آپ کی اجازت ہو تو لڑکی کے ماں باپ کے ساتھ بات چیت کروں! وہ دونوں بھی یہاں موجود ہیں!''

ان تینوں کو اس قسم کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کون آرہا ہے کون جا رہا ہے، کون کیا خریدنا چاہتا ہے کون کیا بیچنا چاہتا ہے، اور رشتے ناطے کی باتوں سے اب انہیں کیا سروکار؟ بچے جانیں اور ان کے ماں باپ۔ اسی قسم کی باتیں قریب قریب ہر کمرے اور برآمدے میں ہو رہی تھیں۔ جہاں بھی دو یا دو سے زیادہ آدمی جمع ہو جاتے تھے ستیہ دیو پرکاش نے اپنے دوستوں کے پہونچتے ہی اپنے بیٹوں، اور بہنوں اور لڑکیوں سے کہہ دیا تھا'' ہمیں کوئی ڈسٹرب نہ کرے، ہمارے لیے چائے اور سگریٹیں بھجوائی جاتی رہیں جب بارات چڑھنے کا وقت ہو جائے تبھی ہمیں باہر آنے کے لیے کہا جائے!''

شام ہوتے ہی بینڈ باجہ بجنے لگا۔ مہمانوں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ جو کوئی ان سے ملنے کے لیے ان کے کمرے میں لے آیا گیا، اس سے چند ہی لمحے رسمی سی گفتگو کر لی گئی، اس کے بعد ان کی باتیں پھر سے شروع ہو گئیں۔

ستیہ دیو پرکاش نے کہا —— ''بعض لوگ بڑھاپے کو ایک عذاب سمجھتے ہیں، لیکن ہم بوڑھے کس قدر خوش ہیں۔ کتنے مطمئن!''

ہیڈ ماسٹر چاولہ نے جواب دیا —— ''بیکن نے ایک جگہ کہا ہے —— جلنے میں پرانی لکڑی، پینے میں پرانی شراب اعتبار کرنے میں پرانے دوست اور مطالعے کے لیے پرانے ادیب ہی اچھے ہوتے ہیں۔''

کرم داد خاں نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا —— اے تم کو اپنا بڑھاپا کیوں تنگ کر رہا ہے! منہ سے تو کہتے ہو ہم بوڑھا نہیں ہے پر ہم دیکھتا ہے تم دونوں کے چہرے پر جھریوں کا جال تن گیا ہے! شیشہ نہیں دیکھتے تم لوگ ؟''

سڑک پر بینڈ باجے کی آواز اونچی ہو گئی۔ ان کے لیے اب بات تک کرنا مشکل ہو گیا۔ قریب قریب سب ہی باراتی تیار ہو گئے۔ وہ بھی کپڑے بدل کر تیار ہو گئے۔ لیکن کپڑے بدل کر بھی ان میں کوئی تبدیلی دکھائی نہ دی۔ عمر میں ہی ان کی شخصیت پر بےحد حاوی تھیں —— جتنے وقار جتنی دلکشی اور جس قدر سنجیدگی کی انھیں ضرورت تھی، وہ انھیں پہلے ہی حاصل ہو چکی تھی بڑے بچے انھیں دیکھ کر احتراماً جھک جاتے تھے، اور ادھر ادھر بھی ہو جاتے لیکن چھوٹے بچوں کو ان سے نہ جانے کیا دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ جہاں وہ جا کر کھڑے ہوتے وہ ان کے گرد جمع ہو جاتے ان کی طرف بڑے غور سے دیکھتے ان کی باتیں کان لگا کر سنتے، اور جب بھگا دیے جاتے تو دور جا کر ان کی نقل اتارنے لگتے، مٹھی میں سگریٹ کو پکڑ کر باری باری کش لینے کی عادت لی۔

جب بارات روانہ ہوئی تو انھیں سب سے پیچھے ایک موٹر میں بٹھا دیا گیا۔ پیدل چلنے سے منع کر دیا گیا، کیوں کہ اس سے ان کی صحت پر برا اثر پڑنے کا احتمال تھا۔ اگرچہ لڑکی والوں کا گھر بہت دور نہیں، اور ان بزرگوں کی شدید خواہش تھی کہ انھیں بارات کے ساتھ ساتھ پیدل ہی جانا چاہیے، بلکہ سب کے آگے آگے، لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی۔

بارات میں جتنے لوگ تھے قریب قریب سب ہی ناچ رہے تھے۔ وہ موٹر میں سے اچک اچک کر انھیں دیکھتے اور خوشی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے —— ایک دوسرے سے کہتے —— ''ان نالائقوں کو کیا معلوم ہم ان سے بہت اچھا ناچ سکتے ہیں۔''

''اپنی جوانی میں ہم کئی کئی گھنٹے لگاتار ناچتے رہے۔''

"اور کبھی تھکے نہیں!"

اور پھر وہ اپنے دوستوں کی شادی اور میلوں ٹھیلوں کے ان یادگار موقعوں کو یاد کرنے لگے جہاں انھوں نے واقعی اپنے کمالات کا مظاہرہ کیا تھا۔ ساتھ ساتھ اِن دوستوں کو بھی یاد کرنا نہ بھولے جو اب زندہ نہیں تھے، لیکن ناچنے میں بڑی صلاحیت کے مالک رہے تھے۔

اچانک ستیہ دیو پرکاش کو ایک بات سوجھی، اس نے سگریٹ کی پوری ڈبیا موٹر ڈرائیور کے حوالے کر دی اور کہا —— "لے بھائی تو بھی سگریٹ کے کش لگا، لیکن ہمیں گاڑی سے تھوڑی دیر کے لیے اتار دے۔ ہم تیری موٹر کے پیچھے پیچھے چھپ کر ناچتے ہوئے آئیں گے۔"

ان کے ساتھیوں کو بھی یہ تجویز پسند آئی، وہ تینوں موٹر سے اتر کر ناچنے لگے۔

ان کے قدم بہت دھیرے دھیرے لیکن بڑے نپے تلے انداز سے اٹھتے تھے۔ لگتا تھا انہوں نے کچھ پی رکھی ہے لیکن وہ ماضی کے نشے ہی میں سرشار تھے، مست تھے۔ کتنی دیر تک ناچتے رہے۔ موٹر کے پیچھے پیچھے ہی ناچتے ہوئے چلتے گئے۔ سایوں کی مانند! صرف ڈرائیور ہی مڑ مڑ کر انہیں دیکھتا اور حیران ہوتا رہا۔

ناچتے ناچتے اچانک ستیہ دیو کے سینے میں زور سے درد اٹھا۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ساتھیوں کے قدم بھی تھم گئے۔ انھوں نے جھک کر اسے دیکھا پھر ڈرائیور کی مدد سے اٹھا کر اسے موٹر میں ڈال دیا۔ ڈرائیور نے چاہا وہ ستیہ دیو کے لڑکوں کو جاکر خبر کر دے، لیکن کرم داد خان اور دیا ناتھ نے اسے منع کر دیا۔ اسے موٹر واپس لے چلنے کا حکم دیا۔

گھر واپس آکر ستیہ دیو پرکاش کو اسی کمرے میں پلنگ پر لٹا دیا گیا جہاں وہ دن بھر بیٹھے رہے تھے۔ ایک چادر ڈال دی گئی۔ وہ بالکل خاموش پڑا تھا۔ اس کی سانس رک چکی تھی۔ بدن دھیرے دھیرے ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا، لیکن اس کے ساتھیوں نے یہ خبر باراتیوں تک نہ بھجوائی۔ ڈرائیور کے ذریعے صرف اتنا کہلا بھیجا —— "ہمیں آرام کی ضرورت ہے۔ ہمارے لیے کھانا بھی یہیں بھجوایا جائے ——!"

باراتی رات کے دو بجے ڈولی لے کر واپس آئے۔ بینڈ باجے کی آواز پھر گونجنے لگی، کرم داد خاں اور ہیڈ ماسٹر دیا ناتھ چاولہ ابھی تک ستیہ دیو پرکاش کے پلنگ کے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دیا ناتھ ملٹن کا ایک مقولہ سنا رہا تھا —— "موت ایک سنہری کنجی ہے، جو آدمی پر ابدیت کا دروازہ کھول دیتی ہے۔"

کرم داد خان اسے کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی سگریٹ اس کے حوالے کی اور پگڑی کے ایک سرے سے اپنے آنسو پونچھنے لگا۔ فرش پر سگریٹوں کے بے شمار ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔

(اکھڑے ہوئے لوگ — مکتبہ دین و ادب لکھنؤ — ۱۹۷۳ء)

OOOOOOOOOOOOO



سب سے چھوٹا غم

اس نے تینوں طرف کی جالیوں میں بندھے ہوئے ہزاروں بلکہ لاکھوں دھاگوں کو دیکھا اور ان میں دس سوا دس سال قبل اپنے باندھے ہوئے دھاگے کو تلاش کرنے لگی۔

بائیں طرف والی جالی پر جس کے باہر گنبد کے پیلے پیلے پھول انبار ڈھیر تھے اور بہت سے دیے جل رہے تھے اس نے اپنے دھاگے کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اسے خوب اچھی طرح یاد تھا کہ اس طرف جالی کے بالکل کونے میں اس نے دھاگے میں ایک گرہ لگائی تھی اور پھر دوسری گرہ جاوید نے۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ ابھی اس کی انگلیاں پوری طرح گرہ لگا بھی نہ پائی تھیں کہ جاوید کی انگلیاں وہاں پہونچ گئی تھیں، اور انگلیوں کے اس لمس کے بعد جاوید اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرانے لگا تھا، اور وہ شرما کے نیچے دیکھنے لگی تھی۔

لیکن ان کا باندھا ہوا دھاگا کونسا تھا؟ اس لمحہ اسے خیال آیا کہ اس وقت اس جگہ شاید بہت زیادہ بھیڑ تھی اور جاوید نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا تھا اور وہ سامنے والی جالی پر چلی گئی تھی یہ سوچ کر اس نے درمیان والی جالی کا رخ کیا۔ لیکن قدم آگے بڑھنے سے قبل اس نے ایک بار پھر اس جالی پر نظر ڈالی جیسے وہ اپنا باندھا ہوا دھاگا پہچان ہی تو لے گی۔

دوسری جالی پر پہونچتے پہونچتے اسے ایسا لگا جیسے پہلی جالی پر جا کر اس نے غلطی کی تھی ... نے دھوکا دیا تھا، دھاگا تو اس نے یہیں باندھا تھا، بالکل کونے میں۔ لیکن یہاں بھی لاکھوں دھاگے بندھے تھے، کسی میں ایک گرہ تھی کسی میں دو۔ ان میں اس کا اپنا کونسا تھا؟ اس نے کونے کے دھاگوں پر ہاتھ پھیرا، آہستہ آہستہ جیسے جاوید کے ہاتھوں کے لمس سے وہ اپنے دھاگے کو پہچان ہی تو لے گی۔ لیکن کہیں خواہشوں کی گرمی تھی کہیں آرزوؤں کی نرمی اور کہیں مایوسیوں کی تاریکی اور مصائب کی سختی

اس نے دوسری بار اس کونے کے دھاگوں پر ہاتھ پھیرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایک دبلی پتلی، گوری چٹی سی عورت وہاں آگئی وہ کچھ دیر تو خاموش کھڑی جالی کو ٹک ٹک دیکھتی رہی۔ پھر اس نے دائیں طرف کی جالی میں لال دھاگا باندھا، مڑ کر عقیدت سے مزار کی طرف دیکھا اور آنسو پونچھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

وہ عورت جوں ہی باہر نکلی اس نے اس کے باندھے ہوئے دھاگے پر انگلی رکھ دی۔ اکتوبر کی ابتدائی تاریخوں میں جب دھوپ چھاؤں کے موسم کے باوجود مزار کے باہر وسیع و عریض آنگن کا ایک ایک پتھر تپ رہا تھا ایک سرد لہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ دھاگا سمٹا، پھر پھیلا اور دو آنکھیں بن گیا۔ رحم کی بھیک مانگتی ہوئی آنکھیں۔ دو لب بن گیا، خواہشوں کو گویائی عطا کرتے ہوئے لب

"اے شیخ تو نے بادشاہوں کی جھولیاں مرادوں سے بھر دی ہیں میری جھولی میں بھی ایک گلاب ڈال دے۔"

وہ اس جگہ کھڑے کھڑے کانپ گئی جیسے نیند سے اچانک کوئی کسی کو جگا دے یا کوئی بے حد بھیانک خواب سے جاگ پڑے اس نے اپنے دونوں طرف مسہری پر سوتے ہوئے دونوں بچوں کو ٹٹولنے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ لیکن اس کا بایاں ہاتھ محراب سے اور دایاں نہایت خوبصورت کپڑوں میں ملبوس ایک عورت سے ٹکرایا۔ کمر میں سونے کی کردھنی کانوں میں سونے کے بندے جن میں ہیرے چمک رہے تھے، گویا خواب سے جاگنے کے بعد حقیقت سے اس کا پہلا ٹکراؤ تھا۔ کھلتا ہوا گندمی بلکہ شاید گورا رنگ جس کو خوشحالی خوشیوں بھری زندگی نے اور بھی حسین بنا دیا تھا، بلکہ چمکا دیا تھا۔

اس عورت کو بھی بھلا کوئی غم ہو سکتا ہے؟ اس نے بالائی کی رنگت والے ملائم اور گداز ہاتھوں کو دیکھا۔ نظریں جھکا کر دونوں چھوٹے چھوٹے پیروں کو دیکھا، ایسے چھوٹے چھوٹے خوبصورت پیر جیسے انھیں بچپن

میں لوہے کے جوتے پہنا کر رکھا گیا ہو۔ پھر سر اُٹھا کر کنکھیوں سے ان بڑی بڑی آنکھوں کی طرف دیکھا جو تھوڑی دیر قبل اس کو ایسی لگی تھیں جیسے کسی نے گلاب کے کٹورے بھر دیے ہوں۔

لیکن اب یہ گلاب کے کٹورے چھلکنے ہی کو تھے۔ اور آنسوؤں کے دو قطرے دونوں کٹوروں کے کونوں سے ٹپک پڑنے کیلیے پرتول رہے تھے

اس عورت کو بھلا کیا غم ہوسکتا ہے؟ اس نے سوچا غربت اور مفلسی تو اس نے دیکھی ہی نہیں تھی۔ اولادیں یقیناً ہیں ورنہ اس قدر خوش بھلا رہ سکتی تھی۔ مانگ کا سیندور اور چوڑیاں اور بندے۔ جبھی تو کیا برا خیال آیا تھا اس کے دل میں خدا اسے سدا سہاگن رکھے۔ اور اس کے پتی کو عمر دراز کرے۔ لیکن کوئی زخم تو ضرور تھا۔ جیسے نہ دولت نہ شوہر، نہ آل، نہ اولاد، نہ خوبصورت کپڑے، نہ قیمتی زیور غرض کوئی نہ بھر پایا تھا، اور وہ یہاں چلی آئی تھی۔

اس نے ساڑی جس طرح باندھ رکھی تھی اسی طرح ساڑی باندھنا جاوید کو بھی پسند تھا۔ لیکن وہ اس طرح ساڑی باندھ ہی نہ پاتی تھی اسے اس بات سے ایک اور بات یاد آگئی اور اس کی اداس غمگین آنکھوں میں بھی ہنسی کی ایک چمک۔ پیدا ہوگئی۔

جاوید نے جب تاج محل میں ایک خوبصورت لڑکی کو بار بار پلٹ کر دیکھا تھا تو وہ اداس ہوگئی تھی۔ شادی کو ابھی چند دن ہی تو ہوئے تھے اور خلوتوں میں پیار محبت لٹانے والا جاوید جلوت میں اور وہ بھی اس کی موجودگی میں اس طرح ہرجائی ہوا جا رہا تھا۔ ویسے اس نے خود کو سمجھایا بھی تھا کہ ہر پرکشش اور خوبصورت چیز کی طرف نظر خود بخود اُٹھ جاتی ہے۔ لیکن بار بار مڑ مڑ کر دیکھنا بلا ارادہ تو نہیں ہوسکتا۔ اس نے کئی بار پلٹ پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا اور تاج محل کی پشت پر جمنا کے کنارے، جب وہ عورت مسجد کی طرف کھڑی تھی تو دریا کے اس پار قلعہ کی طرف دیکھتے ہوتے بھی اس نے نظریں چرا کر اس عورت کی طرف دیکھ لیا تھا۔

لیکن جاوید کی گفتگو کے انداز، برتاؤ، مسکراہٹ، ہنسی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد تاج کے حسن کے کسی پہلو کی طرف اس کی توجہ دلاتے ہوتے اس کے ہاتھ کو دھیرے سے چھو دینے کی اس کی عادت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ پھر یہ بات تو اسے ایک دن خود بخود سمجھ میں آگئی تھی کہ اس دن جاوید اس عورت کو نہیں بلکہ اسی ساڑی کو دیکھ رہا تھا جو وہ عورت ایک خاص طریقے سے باندھی ہوئی تھی۔

کہیں اس عورت کو ایسا ہی کوئی وہم کوئی بے نام غم تو نہیں! بے نام غموں کے تو ہم عورتوں کے پاس خزانے ہوتے ہیں جنھیں ہم لٹاتے نہیں بٹور بٹور کر رکھتے ہیں۔ خوشیوں کے لمحوں کو بوجھل بنانے کیلیے بے محابہ، بے ساختہ قہقہوں کو شائستہ بنانے کیلیے تنہائیوں کو زندگی کے آداب سکھانے کے لیے۔ لیکن ایسے بے نام غموں کے لیے کوئی اتنی دور تو نہیں چلا جاتا۔

وہ عورت جالی پر دھاگا باندھنے لگی، تو اس نے کنکھیوں سے اس کے چہرہ کا ایک بار پھر جائزہ لیا۔ اداسی کا ایک پردہ تو ضرور تھا آنکھیں اب بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ لیکن چہرہ کا میک اپ اسی طرح قائم تھا جیسے بیوٹی سیلون سے نکل کر سیدھے یہیں چلی آئی ہو۔ گرد و غبار کا ایک بھی نشان نہ تھا، ساڑی پر ایک بھی شکن نہ تھا۔ اس عورت نے دھاگے میں گرہ لگائی تو اس کی نظریں قدرتی رنگ میں رنگے ہوئے اس کے لمبے لمبے ناخنوں پر پڑیں جن کا یہ حسن یہ چمک دیکھ ریکھ اور گھرداری کے کاموں سے بے نیازی کے بغیر ممکن نہ تھا۔

دھاگے میں گرہ لگانے کے بعد اس نے ذرا سا جھک کر دونوں ہاتھ باندھ کر جیسے جالی کو ہی پرنام کیا۔ پھر مڑی اور مزار کے قریب جا کر کھڑے ہی کھڑے تقریباً ڈھیری ہوگئی اور ایسے پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ سارے بندھ ٹوٹ گئے بلکہ بہہ گئے۔ لیکن ان آنسوؤں نے اسے اور بھی خوبصورت اور بھی معصوم بنا دیا تھا۔ جب وہ باہر نکلی تو وہ بھی تجسس کے مارے مزار کے سرہانے تک آگئی، اس نے پرس کھولا دو بڑے بڑے نوٹ نکالے، پھر اور نوٹ نکالے اور درگاہ کے چندے کے بکس میں ڈال دیے۔ اور الائچی دانے لینے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ اسی طرح پھیلانے پھیلائے ہاتھ اوپر اٹھائے اور اپنا سر ہاتھوں پر ٹکا دیا۔ پھر دھیرے دھیرے سر اٹھایا۔ الائچی دانے ساڑی کے پلو میں ڈال کر پرس میں احتیاط سے رکھ لیے اور چلی گئی۔ چند قدم بعد اس نے پلٹ کر مزار کی طرف ایک بار پھر دیکھا اور سر جھکائے بلند دروازے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی۔

اب وہ اسی جالی کے پاس آگئی جہاں تھوڑی دیر قبل اس عورت نے دھاگا باندھا تھا۔ لیکن رنگ برنگے دھاگوں کے جنگل میں وہ اس کا دھاگا پہچان نہ سکی، اس کے غم کے راز تک نہ پہونچ سکی۔

اسی درمیان سیاحوں کا ایک ریلا درگاہ میں داخل ہوا۔ تو گائڈ نے رٹے رٹائے جملے دہرائے شیخ سلیم چشتی کی دعا سے اکبر کو جہانگیر نصیب ہوا۔ یہاں لوگ آتے ہیں اور دامن مراد بھرے جاتے ہیں۔

مزار کے باہر کی جالی پر ایک سیاح نے ہاتھ رکھا تو گائڈ نے نہایت آہستگی سے وہ ہاتھ ہٹا دیا۔ اور کہا "اس مزار کی جالی دنیا کے سارے مزاروں کی جالیوں سے خوبصورت ہے۔ کچھوے کی ہڈی پر سیپ کے کام کی دنیا میں اپنی آپ مثال ہے" یہ کہہ کر اس نے دیا سلائی جلائی تو مزار کی بیرونی دیوار کا وہ حصہ جس پر روشنی پڑ رہی تھی چمک اٹھا جھلمل کرنے لگا۔

سیاحوں کا ریلا چلا گیا۔ تو وہ پھر تقریباً تنہا رہ گئی۔ ایک بار پھر اس نے مزار کے قدموں کے سامنے کی جالی پر بندھے ہوئے دھاگوں پر ہاتھ پھیرا تو جاوید دروازہ کھول کر کمرہ کے اندر داخل ہو گیا۔ نشہ میں دھت، ٹائی کی گرہ ڈھیلی، بال بکھرے ہوئے، سوٹ شکن آلودہ، آنکھیں سرخ اور درد ناک چلّایا "میں کہتا ہوں یہ میرا گھر ہے یا کسی اور کا۔ دو دو گھنٹے چلاؤ تب کہیں جا کر دروازہ کھلتا ہے۔ نہ آیا کروں کہیں اور سو رہا کروں؟"

"ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے تک تو جاگ رہی تھی" اس نے دھیمے لہجہ میں کہا اور ٹائی کی گرہ کھولنے لگی۔

"ہونہہ جاگ رہی تھیں تھوڑی دیر پہلے تک، تو پھر مر کیوں گئی تھیں میرے آنے پر"

لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور کوٹ نرم نرم ہاتھوں سے اتار دیا اور ہاتھ کا سہارا دے کر اسے بستر پر لٹا دیا۔ پھر جوتوں کی ڈوری کھول جوتے اتارے، موزے اتارے اور بستر پر اس کی ٹانگیں پھیلا دیں۔

اب یہ بات ہر رات کا معمول بن گئی تھی۔ ویسے اسے دن میں سب کچھ حاصل ہوتا۔ عزت، دولت، کار، ملازم، اولادیں لیکن یہ سب کچھ ایک باریک دھاگے سے لٹکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یہ دھاگہ کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا تھا اگر اس کے خدشات صحیح ثابت ہوتے تو وہ کیا کرے گی۔ تعلیم یافتہ ہوتے کے باوجود دس بارہ برس تک اسطرح کی زندگی گزارنے کے بعد کیا وہ نئے سرے سے بالکل دوسری طرح کی زندگی شروع کر سکے گی۔

سوالیہ نشان پھیلا اور پھیلتا ہی گیا کہ ایک بوڑھی سی عورت نے دوسری عورت کی گود سے ایک بالکل چھوٹا سا بچہ لے کر مزار کے قدموں میں ڈال دیا۔ دونوں عورتوں نے جن کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے اسی جگہ بیٹھ کر سر کو اتنا جھکایا۔ اتنا جھکایا کہ سجدے کا گمان ہونے لگا۔ بوڑھی عورت اٹھی اور اس نے جالی کے پاس جا کر ایک دھاگے کی گرہ کھول دی۔ بچہ کو گود میں اٹھا لیا۔ دونوں نے ایک بار پھر عقیدت سے مزار کی طرف گردنیں جھکائیں اور مزار سے باہر نکل گئیں۔

اسی لمحہ اس کی نظر ماں کی گود میں مسکراتے ہوئے بچہ پر پڑی اور وہ خود بھی مسکرا دی۔

لیکن اس کی یہ مسکراہٹ عارضی تھی۔ ساری جالیوں پر محرومیوں تمناؤں، ناکامیوں کے آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے لاکھوں لاکھ دھاگوں کے درمیان ایک پھول کب تک اپنی شادابی برقرار رکھ سکتا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ کی مٹھی کھولی تو سرخ دھاگا پسینہ میں بھیگ چکا تھا۔ اب وہ جالی کے کسی ایسے کونے کو تلاش کرنے لگی جہاں اس نے قبل کسی نے دھاگا نہ باندھا ہو۔ لیکن ایسی کوئی جگہ نہ تھی۔ ہر جگہ ایک دو نہیں درجنوں دھاگے بندھے ہوئے اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے آنسو بہا رہے تھے۔ آنسوؤں کے اس سیلاب میں اس کے قطرہ کی بھلا کیا اہمیت گہرے زخم، غم واندوہ کے پہاڑ اور مصائب کے طوفان خیز دھارے جن کی یہ دھاگے علامت تھے۔ اسے اپنے غم کے مقابلے میں بے حد بڑے اور عظیم معلوم ہوئے۔

اس نے ایک بڑا دھاگا لیا اور جالی کے چاروں کونوں پر باندھ دیا۔ پوری جالی کو گھیر کر۔ سارے غموں، دکھوں اور تمناؤں کا احاطہ کیے ہوئے اب وہ رو پڑی۔ اس کی آنکھیں سمندر بن گئیں۔ اس نے آنسو پونچھنے کی کوشش کی اور رندھے ہوئے گلے سے بولی "شیخ، ان سب کی مرادیں بر آئیں تو میرا غم بھی ہلکا ہو جائے گا۔ اتنے بہت سے دکھوں کے بیچ میں کیسے خوش رہ سکوں گی"۔

باہر صحن کے پتھر اب بھی گرم تھے، سورج اب بھی آگ برسا رہا تھا۔ لیکن ان کا احساس کیے بغیر خاموش گردن جھکائے وہ اس طرح باہر نکل آئی جیسے اس کے دل کا سارا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔

سب سے چھوٹا غم — نصرت پبلشرز لکھنؤ — ۱۹۷۶ء

[redacted]

کلام حیدری



سخی

میں زکریا اسٹریٹ کے ایک گندے اور چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھا ہوا ہوں۔ سامنے سیاہ رنگ کے ٹیبل پر چھوٹی سی چائے کی پیالی رکھی ہے، جس میں تلخ قسم کی چائے پر بالائی پڑی ہوئی ہے۔ میرے ٹیبل کے سامنے ایک لمبا سا ٹیبل ہے جس پر کئی دوسرے لوگ بیٹھے ہیں۔ ان میں سے ایک کو میں پہچانتا ہوں، وہ جو شطرنجی ڈیزائن کی لنگی پہنے ہوتے ہے اور جس کی گنجی بجائے بٹن کے فیتے سے بند ہونے والی ہے۔ میں اسے صرف اس وجہ سے پہچانتا ہوں کہ وہ مجھ سے مہینے میں ایک بار منی آرڈر لکھواتا ہے۔ کبھی پچاس، کبھی چالیس اور کبھی سو بھی۔

یہ کہاں رہتا ہے، میں نہیں جانتا، کیا کرتا ہے، یہ بھی نہیں جانتا، منی آرڈر کہاں بھجواتا ہے، صرف میں جانتا ہوں۔ بی بی سکینہ معرفت شرافت حسین، بیڑی دوکان پورنیہ۔

اور میں نے اب چائے کی پیالی اپنے ہونٹوں سے لگا لی ہے۔ اور بالائی ہونٹوں سے الجھ رہی ہے۔ میں نے پھونک مار کر بالائی کو کچھ ہٹا دیا ہے اور تب پہلے گھونٹ کے ساتھ ایک میٹھی تلخ دھار حلق سے پیٹ میں اترتی ہوئی محسوس کر رہا ہوں، میں نے پیالی واپس طشتری میں رکھ دی ہے۔

بی بی سکینہ کے بارے میں مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ اس شطرنجی ڈیزائن کی لنگی والے کی بیوی ہے۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا نام مولا ہے۔ اور منی آرڈر لکھواتے وقت اپنا نام مولا بخش لکھواتا ہے۔ پہلے پہل جب میں نے اس سے منی آرڈر فارم پر لکھنے کے لیے اس کا پتہ پوچھا تھا تو اس نے اپنا نام مولا بخش بتایا اور کہا: معرفتی آپ اپنا ہی نام لکھ دیجیے چنانچہ میری معرفت روپیہ بھیجنے والے کے پتے سے بھی مجھے واقف ہی رہنا پڑا۔

میں نے چائے کی پیالی دوبارہ اٹھائی ہے۔ اور بالائی کو غور سے دیکھ رہا ہوں جو چائے میں عاشق ہوگئی ہیں ایک لمبا گھونٹ لیتا ہوں اور بالائی تھوڑی سی چائے سمیت میرے منہ میں چلی جاتی ہے۔ میں منہ چلانے لگتا ہوں۔

بی بی سکینہ کا شوہر پست قد کا گٹھا ہوا سیاہ فام آدمی ہے۔ جس کے کان کی لو تھوڑی سی کٹی ہوئی ہے اور گالوں کی دونوں جانب کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ چہرہ بڑا اور محنتی آدمی کا سا معلوم ہوتا ہے سینہ چکلا اور گردن بھری بھری مگر اوسط درجے کی لمبی ہے۔ آنکھوں میں چیاب ہے مگر جیسے وہ دھندلاہٹوں میں ہو۔ داہنے ہاتھ کی شہادت والی انگلی کا ناخن نوکیلا اور لمبا ہے۔

اور میں نے پیالی پھر ہاتھ میں لے لی ہے اور ہوٹل میں آنے والے دو افراد کو دیکھنے لگا ہوں جو دروازے کے پاس ہی رک گئے ہیں اور ہوٹل کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ایک کے سر پر "دلی والوں" جیسی ٹوپی ہے جو بے میل ہے اور دوسرا ننگے سر ہے اور بال الجھے الجھے ہیں۔ دونوں اندر آجاتے ہیں۔

اور میں نے چائے کا تیسرا اور آخری گھونٹ لے کر پیالی طشتری پر رکھ دی اور اسے میز کے ایک طرف کھسکا دیا۔

ہوٹل کا ریڈیو چیخ چیخ کر فلمی گانے سنا رہا ہے۔ اچانک وہ زور سے لڑکھڑاتا ہے اور ہوٹل کا نوجوان مالک جو ٹھڈی ہاتھوں پر رکھے کسی اردو اخبار کو جانے کب سے پڑھ رہا تھا' چونک کر ریڈیو کا بٹن گھمانے لگتا ہے۔

اور میں ان دونوں کو دیکھ رہا ہوں جو ابھی ابھی اس ہوٹل میں داخل ہو کر بیٹھے ہیں۔ اور دلی والوں کی ٹوپی پہنے

ہوئے شخص نے اپنے ساتھی سے کچھ مشورے کرنے کے بعد دو شیرمال اور دو سیخ کباب کا آرڈر دے دیا ہے اور ہوٹل کا لونڈا اس بڑے سے طاق نما سوراخ کے پاس کھڑا ہوا ہے جہاں سے ہوٹل کے باورچی خانے کا منظر دکھائی دیتا ہے۔

اور مولا بخش ایک کروٹ بیٹھے بیٹھے دوسرا پہلو بدل کر بیٹھ جاتا ہے اور باہر سے نظریں ہٹا کر وہ میری جانب دیکھنے لگتا ہے جیسے اسے میرے دیر تک بیٹھے رہنے پر تعجب ہو رہا ہو، میں اس کی ٹٹولتی نگاہوں سے بچ کر پہلو بدلتا ہوں۔

اب میرے انتظار کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔ جس اخبار کے ایڈیٹر نے مجھ سے یہاں ملاقات کرنے کا وعدہ کیا تھا اس کے آنے کی امید تقریباً ختم ہو چکی ہے اور ساتھ ہی ساتھ امید کی جس کرن کے سہارے میں نے تین روپے ساڑھے چودہ آنے میں پچھلے چار دن گذارے تھے وہ کرن اس ہوٹل میں جیسے گم ہو گئی اب وہ ایڈیٹر نہیں آیا جس نے مجھے ترجمے کا کام دینے کا وعدہ کیا تھا اور جس سلسلے میں میں نے سوچا تھا کہ کام ٹھیک ہوتے ہی کچھ ایڈوانس مانگوں گا جس سے زکریا اسٹریٹ کے ایسے ہوٹلوں میں کم از کم چند دن کھپ سکوں۔

دلی والوں کی ٹوپی پہنے ہوئے شخص کے آگے ایک شیرمال رکھی ہوئی ہے، اوپر کا سرخی مائل حصہ بے حد اشتہا انگیز ہے۔ اور کباب سے اٹھتا ہوا ہلکا ہلکا دھواں میں آسانی سے دیکھ سکتا ہوں۔

وہ ایڈیٹر ابھی تک نہیں آیا۔ اور میں سوچ رہا ہوں مولا بخش کی بیوی سکینہ کیسی ہوگی؟ اور اس کے کوئی بچہ ہے کہ نہیں اور اس وقت مجھے ایسا لگا کہ میں مولا بخش سے مخاطب ہو کر پوچھوں کہ اس کے کوئی بچہ ہے یا نہیں۔

میں نے اس سوال کو مہمل اور بے موقع خیال کرتے ہوئے اپنے ذہن سے نکال دیا ہے۔

اور اب وہ دلی والوں کی ٹوپی پہنے شخص اور اس کا ساتھی آدھی سے زائد شیرمال کھا چکے ہیں اور سیخ کباب سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو اب میں نہیں دیکھ سکتا۔ شاید اب دھواں اٹھ بھی نہیں رہا ہے۔

وہ ایڈیٹر اب نہیں آئے گا۔ اور میں نے چار دن یوں ہی بے کار گنوا دیے، ورنہ ان چار دنوں میں دوڑ دھوپ کی جا سکتی تھی، آفسوں کے چکر لگائے جا سکتے تھے، دکانوں کے خلیق مالکوں سے نوکری کی درخواست کی جا سکتی تھی، کوئی ٹیوشن ہی تلاش کی جا سکتی تھی، مگر چار روز تک اس اطمینان میں بیٹھے رہنے کے بعد ابھی اچانک اس متوقع کام سے مایوسی پر اب آگے چلنے کی جیسے صلاحیت ہی نہ رہی ہو۔

سکینہ کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ ہوگی اور بچہ بھی کوئی نہ ہوگا۔ یہ شرافت حسین کون ہوگا؟ اور تب میں سوچتا ہوں، یہ شرافت حسین مولا بخش کا رشتہ دار وغیرہ ہوگا، یا پھر دوست ہو سکتا ہے۔ اور سکینہ.....

اب یہ کیا تُک ہے کہ ایڈیٹر وعدے کے خلاف اب تک نہیں آیا ہے اور مجھے سکینہ کی عمر کی پڑی ہے، شرافت حسین اور سکینہ کی رشتے داری کی نوعیت کی فکر ہے، اور مولا بخش اور شرافت حسین کے تعلقات سے مجھے کیا تعلق ہے؟

اور اب وہ دونوں شیرمال کے بعد چائے بھی پی چکے ہیں۔ اور کاؤنٹر پر ہوٹل کا نوجوان مالک ان سے پیسے لے رہا ہے۔

اب تین بج رہے ہیں، گیارہ بجے سے تین بجے تک انتظار کرنے کے بعد میں نڈھال سا ہو رہا ہوں۔

یہ مولا بخش ہر ماہ کی ۱۲ تاریخ کو منی آرڈر ضرور لکھواتا ہے۔ ایک دو روز آگے یا پیچھے مگر پوری پابندی سے لکھواتا ہے۔

اور میں سوچ رہا ہوں، سکینہ ضرور خوبصورت ہوگی اور یہ جو مولا بخش کی آنکھوں میں چمک ہے وہ اسی جوان محبت کی چمک ہے۔ اور جو یہ چمک کسی قدر دھندلاہٹوں میں ہے وہ فراقِ یار ہے۔

تین روپے ساڑھے چودہ آنے تقریباً جدا ہو جانے کے بعد ایڈیٹر نہیں آیا تو اب کیا ہوگا۔ سوچ رہا ہوں یہ جو جیب میں اب فقط ساڑھے چھ آنے ہیں اس میں سے چھ پیسے یعنی ڈیڑھ آنے بھی جدا ہونے والے ہیں۔

اور میں اس پیالی کو دیکھ رہا ہوں جسے میں کب کا خالی کر چکا ہوں۔ مگر ہوٹل کے نوکر نے اسے ٹیبل پر سے اٹھایا نہیں

وہی وہ پیالی ہے جو مجھے مزید ڈیڑھ آنے سے محروم کردے اور میری جیب میں پانچ آنے رہ جائیں گے۔ اور کلکتہ شہر اور پارک سٹریٹ اور یہ دل کشا ہوٹل۔

دل سے مانتا ہو گا مولا بخش سکینہ کو جبھی تو ——

اور اب مولا بخش اپنی جگہ سے اُٹھ چکا ہے، اور مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے، اور اب وہ میرے قریب آگیا ہے اور کہہ رہا ہے "ہم کل آئیں گے جی۔ آپ رہیں گے نا۔"

میں اسے اثبات میں جواب دیتا ہوں، اور سوچتا ہوں، یہ کل منی آرڈر لکھائے گا اور کل صبح تک میری جیب میں پانچ آنے رہیں گے یا.....

میں اس وقت اپنی کوٹھری کی ایک چوکی پر پڑا ہوا ہوں، میرے سرہانے دو آنے پیسے تکیے سے دبے پڑے ہیں، اور میں رات دیر تک جاگنے سے گرانی سی محسوس کر رہا ہوں۔

اس کلینڈر کی جانب دیکھ رہا ہوں جو ہوا سے پھڑپھڑا رہا ہے، جس پر ایک امریکن عورت ہوائی جہاز کی سیڑھی پکڑے بڑے ہی قاتل انداز میں کھڑی ہے۔ میں امریکن کلینڈر..... میں منہ ہاتھ دھو چکا ہوں، بھوک لگ رہی ہے، بڑی احتیاط سے میں تکیہ ہٹاتا ہوں اور دو آنے اٹھا کر جیب میں رکھ لیتا ہوں۔ ڈوری پر ٹنگا ہوا پینٹ پہن لیتا ہوں۔

میں سوچ رہا ہوں، ٹیوشن کی تلاش میں نکلنا بہتر ہو گا۔ کچھ سہارا ہو جائے پھر اطمینان سے نوکری تلاش کروں گا اور تب سوچتا ہوں، انگریزی کی جو ڈکشنری پڑی ہے اسے بیچ کر کچھ پیسے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس خیال سے تقویت محسوس کرتا ہوں۔

اور میرے سامنے مولا بخش کھڑا ہے۔ اور میں اب منی آرڈر لکھ رہا ہوں، بی بی سکینہ۔ معرفت شرافت حسین بیڑی دکان پورنیہ.....

مولا بخش۔ معرفت..... ساٹھ روپے۔

اب میں منی آرڈر لکھ چکا ہوں، اور مولا بخش کے ساتھ ساتھ ہی کوٹھری میں تالا بند کر کے سڑک پر آگیا ہوں اور مولا بخش مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اسے آج مالک نے جلد ہی بلایا ہے۔ اس لیے وہ آج منی آرڈر نہیں لگا سکے گا۔ اور میں کچھ سوچ کر اس سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے فرصت ہے۔ وہ کہے تو منی آرڈر لگا دوں۔

"آپ....." وہ ہچکچاتا ہے مگر میں اسے ہمت دلاتا ہوں کہ آخر وہ بھی آدمی ہے، ایک کام ہی سہی اس کا کر دوں گا تو چھوٹا ہو جاؤں گا۔

مولا بخش جا چکا ہے اور میری جیب میں ساٹھ روپے ہیں اور منی آرڈر فارم ہے۔ اور میں ٹیوشن کی تلاش میں جا رہا ہوں

ابھی شام ہو گئی ہے اور میں دل کشا ہوٹل میں نہیں ہوں میں پارک سرکس میں ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں بیٹھا ہوں، میری میز پر ابھی ابھی بیرا نے ایک شیرمال، قورمہ اور سیخ کباب لاکر رکھا ہے اور میں بغور اس شیرمال کو دیکھ رہا ہوں جو بہت ملائم بے حد لذیذ اور خوبصورت نظر آرہی ہے۔

میرے ذہن میں اس ایڈیٹر کا خیال نہیں ہے جس نے مجھے ترجمے کا کام دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اور گیارہ بجے سے تین بجے تک اس کا انتظار کرنے کے بعد بھی وہ نہیں آیا۔ اور اس وقت زیادہ سے زیادہ سات بجے ہیں اور اس ہوٹل میں رونق بڑھتی جا رہی ہے۔ میں سوچتا ہوں اس ہوٹل تک میرے قدم کیسے آئے۔ کوئی ٹیوشن نہیں ملی، نوکری نہیں ملی۔ اور دفعتاً مجھے سکینہ کا خیال آتا ہے جس کے پاس اسی پابندی سے منی آرڈر بھیجا گیا ہے مگر جو اس کو نہیں ملے گا۔ ساٹھ روپے میری جیب میں پڑے ہیں اور منی آرڈر فارم میں نے کراؤن سینما کے سامنے پڑے ہوئے پیک کے گملے میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈال دیا ہے۔

میں شیرمال کھانے لگا ہوں اور مجھے خیال آیا ہے کہ اگر میں مولا بخش سے بیس پچیس روپے مانگ لیتا تو شاید وہ دے دیتا مگر مولا بخش کے سامنے دست سوال بڑھانے کے خیال سے مجھے بڑی ذلت محسوس ہو رہی ہے۔

یہ کباب کتنا خوش ذائقہ ہے۔ اور پیاز کے ان تراشوں کے ساتھ تو اس کا لطف ہی نرالا ہے۔

میں ڈلہوزی اسکوائر کے ایک آفس سے نیچے اتر رہا ہوں۔ پانچویں منزل سے اترتے ہوئے میرے پاؤں دکھنے لگے ہیں۔

اور ایسی کتنی ہی بلڈنگوں سے نامراد لوٹتے لوٹتے اب مجھے ایسا لگتا ہے جیسے نوکری نام کی کوئی چیز اس دنیا میں نہیں ہے۔

گرجا کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا اپنی تھکن دور کر رہا ہوں۔

میری جیب میں بائیس روپے کچھ آنے ہیں اور سکینہ کو منی آرڈر ابھی تک نہیں ملا ہے۔ بائیس روپے کتنی بڑی طاقت کا مظہر ہیں۔ میں سوچتا ہوں ابھی کچھ روز اور بھی چکر کاٹ سکتا ہوں۔ بائیس روپے اب بھی میرے پاس ہیں

اب میں چلنے لگا ہوں اور رخ کو لوٹولہ کی طرف کر دیا ہے۔ چلتے چلتے اس بلڈنگ تک آگیا ہوں جو جاپانی بمباری کی زد میں آئی تھی۔

میں وہاں پر آگیا ہوں جہاں اردو رسالوں کی دکان ہے اور میں اس سے آگے بڑھ گیا ہوں۔ سکینہ کا خیال مجھے آتا ہے۔ پھر مجھے اس کوٹھی کا خیال آتا ہے جو تھیٹر روڈ میں ہے اور جہاں مجھے ٹیوشن کے لیے آج شام کو بلایا گیا ہے۔ کیا پتا آج ٹیوشن مل ہی جائے۔

یہ ناخدا مسجد ہے، وہی زکریا اسٹریٹ، اس کے دروازے کے باہر ایک لاش اسٹریچر پر پڑی ہوئی ہے اور ایک نوجوان آواز لگا رہا ہے۔

"ایک غریب مرگیا ہے۔ کفن دفن کے لیے پیسے دے کر ثواب حاصل کیجیے۔"

میں قریب جاتا ہوں، میں چونک جاتا ہوں، میں پھر قریب جاتا ہوں — فیتے سے بندھی ہونے والی ایک کان کی کٹی ہوئی لو۔ مولا بخش — ؟ میں ہلکے سے اس کا نام لیتا ہوں۔ سکینہ کے پاس منی آرڈر پہونچنے سے پہلے یہ خدا کے یہاں پہونچ گیا۔ میں اس آواز لگانے والے نوجوان سے پوچھتا ہوں "یہ کیسے مرا ؟"

"ٹرک سے کچل کر۔"

نیچے کے دھڑ سے اس نے چادر ہٹا کر دکھایا۔ مجھے چکر آنے لگا۔ ناخدا مسجد ہے، مولا بخش ہے، جس کے کفن دفن کے لیے ایک آنے دو آنے راہ گیر چادر پر پھینکتے جا رہے ہیں۔

میرا ہاتھ جیب میں جاتا ہے۔ بائیس روپے کچھ آنے اس چادر پر پھینک کر جلدی جلدی جانے لگتا ہوں۔ وہ نوجوان مجھے غور سے دیکھتا ہے۔

میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ وہ نوجوان اب بھی مجھے غور سے دیکھ رہا ہے۔

('صفر' - دی کلچرل اکیڈمی گیا - ۱۹۷۵ء)

اخلاق ہندی

ترجمہ مفتی تاج الدین کی

مفرح القلوب کا مدرسہ جدید

کے لیے ہند میں نہدہ نوئیسان عظیم الشان

مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان مارکویس

ولزلی گورنر جنرل بہادر دام ظلہ کے کیا ہوا

میر بہادر علی حسینی کا حکم سے خداوند

نعمت جان گلکرسٹ

صاحب دام اقبالہ

کے

رہکے دنیا میں کیجیے وہ فکر — بعد کوئی کرے بہ خوبی ذکر

سنہ ۱۸۰۳ عیسوی مطابق

سنہ ۱۲۱۸

ہجری

ہندوستانی چھاپے خانے

میں چھاپا کیا ہوا

منشی غلام نبی

کا

(ہندستانی پریس کی دوسری چھپی ہوئی کتاب 'اخلاق ہندی' (۱۸۰۳ء) کا سرورق)

ابتدائی انیسویں صدی کی اخبار نویسی

"معزز لارڈ کی یہ خواہش معلوم ہوتی ہے کہ ہندستان کے اخباروں پر کسی قسم کی پابندی نہ عاید کی جائے۔ اگر واقعی ان کا یہی مطلب ہے تو کہنا پڑے گا کہ اس سے زیادہ کوئی اور وحشیانہ خیال ان کے ذہن میں نہ آیا ہوگا کہ انگلستان اور ہندستان کے اخباروں کے ساتھ یکساں قاعدے برتے جائیں۔ برِاعظم ہندستان میں اگر بلا اجازت نامہ حاصل کیے ہوئے اخبار جاری کرنے کی اجازت دے دی جائے تو سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔"

رائٹ آنریبل ہنری ڈنڈاس

۱۲ مارچ ۱۸۰۷ء

اقبال متین



قالین

ابی جب گھر کا قالین کہیں دے آئے تو شہزادی بہت اداس ہوگئی۔ یہ قالین کیا تھا ایک پھلواری تھی جو پیروں تلے بچھی رہتی۔ پیروں تلے روندی جاتی لیکن نہ پھول مرجھاتے نہ کلیاں بلکتیں۔

اس پھلواری کے ساتھ شہزادی کے ذہن میں اپنی امی کا تصور کچھ اس طرح گڈمڈ ہوگیا تھا کہ وہ قالین کی نسبت سوچتی تو امی ذہن میں در آتیں۔

آج سے اپنا کمرہ سونا سونا لگ رہا تھا۔ اس کی امی بھی لہلہاتی پھلواری کی طرح شگفتہ تھیں۔ پھر وہ ہو ر)۔ یعنی وہ تولد ہوئی۔ یعنی وہ دنیا میں آئی۔ پھر امی کی لہلہاتی پھلواری کی کوکھ سے پھوٹی ہوئی اس نوشگفتہ کلی نے انگڑائی لی تو لوگوں نے کہا۔ شہزادی بڑی ہوگئی۔ اور بڑی ہوتے ہوتے جو بات شہزادی کے ذہن میں جڑ پکڑ گئی وہ یہ تھی کہ امی قالین ہیں اور ہم سب انہیں روندتے پھرتے ہیں اور ان روندنے والوں میں اس کے ابی ہیں، وہ خود ہے پھر ولی میاں ہیں، پھر علی میاں ہیں، پھر مسلسل بکواس کرنے والی شبی ہے۔ پھر شبی سے دن رات لڑنے والی رتی ہے۔ جس کی چوٹی مو باف کبھی کھانے کی پلیٹ میں ملتی ہے، کبھی کتابوں کے بستوں میں، کبھی بڑی جڑی چیزوں اور کچرے میں۔ پھر اس کے بعد تو سلسلہ بڑا لمبا سا لگ گیا ہے۔ سوچو تو یوں لگے جیسے جوتیوں میں دال بٹ رہی ہو۔

جانے کیوں شہزادی کے ذہن میں ایسی اوٹ پٹانگ باتیں آتیں۔ اپنے ہی بھائیوں اور بہنوں کے بارے میں کچھ اس طرح سوچنا کہ دبی دبی نفرت جھنجھلاہٹ کا سبب بنے اسے کھلتا تھا۔

منّے چیختا، ٹنّے اودھم مچاتا اور چھوٹو الگ گھر سر پہ اٹھائے رہتا۔ اور امی بے چاری نحیف سی آوازیں سب کو ہٹاتیں اور قالین پر گٹھڑی بنی پڑی رہتیں۔

لیکن ابی جب سے قالین کہیں دے آئے تھے امی تخت پر ہی بغیر کچھ بچھائے یوں دراز ہو جاتیں جیسے ان کے بدن کو قالین کے پھول خار بن کر کھٹکتے تھے اور اب سخت تخت کی لکڑی نرم نرم گدی بن کر سکون پہونچاتی ہے۔

شہزادی نے جب ہوش سنبھالا تھا۔ اس وقت یہ قالین ڈرائنگ روم میں بچھتا تھا — جیسے ڈرائنگ روم کے فرش پر رنگ برنگی پھول بکھیر دیے گئے ہوں۔ قالین کے اطراف بید کی کرسیاں تھیں — بیچوں بیچ خوبصورت سی میز تھی۔ کرسیوں پر کشن تھے اور درمیانی میز پر امبرائیڈری کا میز پوش، کونے کے بک شلف پر ریڈیو رہتا تھا اور دیواروں پر مٹی کے رنگین واز تھے جن میں پلاسٹک کے پھول یوں لگتے تھے جیسے ابھی ابھی باغ سے توڑ کر سجائے گئے ہوں۔

لیکن ولی میاں اور علی میاں آئے تو لوگ کہتے تھے گھر کی رونق اور بڑھ گئی ہے۔

کیا خاک بڑھ گئی ہے۔ شہزادی دل ہی دل میں

سوچتی کیونکہ ابی ایک بار ریڈیو اٹھالے گئے تھے اور وہ ریڈیو لوٹ کر پھر نہیں آیا، کتنے دنوں تک تو امی کہتی رہیں کہ کل پرزے اس کے درست ہو رہے ہیں۔ اب یہ کل پرزے درست ہوں گے بھی یا نہیں شہزادی جان گئی تھی۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ اندر تخت پر بچھی ہوئی دری اور سوزنی پھٹ پھٹا کر رہ گئی تو قالین ڈرائنگ روم سے تخت تک آ پہونچا۔ اس وقت شمی اور ریمی نے گھر کی رونق اور بڑھادی تھی۔ اور آج تو یہ قالین بھی ابی کہیں اٹھالے گئے تھے جو تخت سے اٹھایا گیا تھا تو جادو کے قالین کی طرح ہواؤں میں اڑتا نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا اور امی کو دردیدہ ہو کر رہ گیا تھا اور شہزادی نے امی کو ننگے تخت پر سہارا دیکر لٹا دیا تھا اور وہ کراہ کر رہ گئی تھیں۔

گل بوٹے والے اس قالین سے امی کا تصور جانے کیوں شہزادی نے وابستہ کر رکھا تھا۔ اب وہ اپنی امی کو دیکھتی تو بس قالین بیچ میں آجاتا ایسی پھلواری بیچ میں آجاتی جس کے پھول کبھی امی کی سیج تھے۔

اسی دن شہلا آنٹی ملنے آئی تھیں تو شہزادی کو بڑا دکھ ہوا تھا۔ دکھ کیا ہوا تھا یوں سمجھو وہ کسی ایسے قصور پر شرمندہ تھی جو اس سے سرزد نہیں ہوا تھا۔ اس نے فوراً کہا تھا۔ ”ابی قالین آج ہی ڈرائی کلیننگ کو دے آئے ہیں۔“ اور شہلا آنٹی اپنے بابا اور بے بی کی انگلیاں تھامے اس تکلف سے تخت پر ٹک گئی تھیں جیسے بیٹھ نہیں رہی ہوں بلکہ کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوتی ہوں اور جب منے نے آنٹی کے بابا کو بھینچا تھا تو بابا نے منہ بسورتے ہوئے کہا تھا چھوڑ بھی کپڑے گندے ہوجائیں گے۔ اور شہزادی تڑپ کر رہ گئی تھی۔ اس نے دشمن کی نظر سے دونوں چھوٹے بھائیوں کو گھور کر دیکھا تھا۔ لیکن منے اور ننھے اس کی برہمی سے بے نیاز تھے۔

امی کو مگر کیا ہوگیا ہے۔ وہ کیوں ننھے اور منے کو نہیں ڈانٹتیں۔ شہزادی نے امی کے خلاف سوچا تھا۔ پھر جانے کیوں اُس کو اپنی امی پر ترس آگیا اور وہ وہاں سے کھسک گئی۔ لیکن کمرے میں آئی تو اس کا دوپٹہ اس کی آنکھیں خشک کر رہا تھا۔

شہلا آنٹی کے میاں جو ادھر کبھی نہیں آتے تھے امی نے بتایا تھا کہ ابی سے عہدے میں کم ہیں۔ تنخواہ میں کم ہیں۔ لیکن اللہ کا دیا سب کچھ ان کے گھر میں تھا آنٹی پہنے اوڑھے رہتیں بچے یوں پوشاک بدلتے جیسے ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان کا مالک ان کا باپ ہو۔ یوں سوچنا بھی شہزادی کو برا لگتا۔ کوئی سینے میں چٹکی بھر کر کہتا۔ تو کیوں جل رہی ہے۔ اور کہتا بھی کون کہنے والا اس کا دل ہی تو ہوتا۔

آنٹی بیٹھی امی سے ڈینگیں مارتیں۔ امی اتنا بڑا سا پیٹ سنبھال کر ہنستیں اور بڑھاوا دیتیں۔ لیکن شہزادی کو آنٹی کی باتوں کا یہ انداز کھل جاتا وہ دل ہی دل میں سوچتی۔ آنٹی جھوٹ کہتی ہیں لیکن نہیں آنٹی نے جھوٹ کب کہا تھا وہ خود دیکھ آئی تھی کہ انکے گھر ریڈیو تھا، بجلی کا پنکھا تھا، پانی گرم کرنے کا ہیٹر تھا۔ بجلی کی استری تھی، اسٹوو تھا۔ اور اب ۔ اور اب۔ بابا کے ڈیڈی اقساط پر فرج بھی لے رہے ہیں۔ بابا اور بے بی آئس کریم کھائیں گے۔

”کیوں ہے نا ننھو؟۔“

کھاؤ آئس کریم۔ اس میں ہمیں سنانے کی کیا بات ہے بھلا۔ شہزادی جی ہی جی میں راکھ کا ڈھیر بن جاتی۔ یوں لگتا جیسے کوئی کرید کر چنگاریاں ڈھونڈ رہا ہو۔ دو ہی تو بچے ہیں۔ اس پر آنٹی اتنا اتراتی ہیں۔ دونوں اسکول چلے جاتے ہیں تو آنگن سونا ہوجاتا ہے آنٹی یہ کبھی نہیں کہتیں اُن کے گھر وہ رونق کہاں جو ہمارے گھر ہے۔

تو پھر تو کیوں اسکول نہیں جاتی۔ جا سکتی ـــــ

توآج کالج میں ہوتی ؟۔ اور پھر پرسوں ہی تو علی میاں کا نام کٹ گیا۔ فیس ہی نہ دے سکے۔ ولی میاں تنہا تنہا اسکول گئے، کیسے اداس اداس سے اور شبی اور رمی نے تو اسکول کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ تو انہیں پڑھا لے خیر سے تو نے کچھ پڑھ تو لیا شہزادی۔ گھر کی رونق بڑھانے والوں میں تیرا نمبر تھا پانچواں لگتا تو تیرا بھی وہی حشر ہوتا جو شبی اور رمی کا ہو رہا ہے صبح اٹھو تو سونے تک یوں لگتا ہے جیسے ہمارے گھر ہی ساری دنیا سانس لیتی ہے گھر پر گھر کا گمان ہی نہیں ہوتا یوں لگتا ہے، تنگ گلی میں بلوائی گھس گئے ہوں اور سب پکار پکار کر اپنا حق مانگ رہے ہوں۔ اور ابی۔ ابی جیسے کانوں میں انگلیاں دھرے چھپتے پھر رہے ہوں۔ جیسے جیسے سب مانگوں کو پورا کرنا انہیں کا فرض ہے۔ جیسے رزق دینے والا قالین کی پھلواری میں سما کر آسمانوں میں کہیں اڑ گیا ہو۔ اور ابی اکیلے دنیا بھر کا بوجھ کندھوں پر اٹھا کر ہانپ رہے ہوں۔ اور شہزادی کا جی چاہتا امی سے پوچھے۔ امی تم اتنے ڈھیر سارے بچے کیوں پیدا کر رہی ہو —— لیکن امی پر پھر اس کو ترس آیا۔ ابی سے پوچھ لے۔ تجھ میں ہمت ہے تو ابی سے پوچھ لے۔ کوئی اسے اکساتا۔ اور یہ اکسانے والا کوئی دوسرا نہ ہوتا وہی اس کا ساتھی۔ وہی اس کا دل۔ پھر اس کا ذہن کیسی کیسی باتیں سوچتا۔ ایسی کچھ وبا چلے کہ سب کے سب کون سب۔ وہ خود۔ نہیں۔ امی نہیں۔ ابی، شبی، رمی، سارے کے سارے نام پلک جھپکانے میں اس کے ذہن سے بجلی کی رو ــــ کی طرح گزر جاتے اور دبی دبی چیخ اس کی زبان سے نکل جاتی۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں نہیں۔ کوئی نہیں۔ کوئی نہیں کوئی بھی نہیں۔

اور اسے یوں لگتا جیسے وہ اب رو پڑے گی۔ اور وہ بھاگی بھاگی اپنی امی کے پاس جاتی۔ امی اے امی۔ بستر لگا دوں تم کب تک یوں ننگے تخت پر۔

"ہاں بچھا دے بیٹا۔"

"پھر امی۔ کیا قالین!"

"آجائے گا سب آجائے گا۔"

اور کچھ ہی دن بعد جب امی دواخانے سے دودھ پیتی ننھی کو لے کر لوٹیں تو گھر میں خوش آمدید کہنے کے لیے تخت بھی نہیں رہ گیا تھا۔ اور ......

...... امی اس زچگی میں مرتے مرتے بچی تھیں۔ کسی نے ننھی کو دیکھ کر کہا تھا۔ بہت پیسہ خرچ کروا دیا اس نے۔ لیکن دونوں جانیں بچ گئیں۔ اللہ کا احسان ہے۔

اور شہزادی نے سوچا۔ قالین کا احسان کیوں نہیں ہے۔ تخت کا احسان کیوں نہیں ہے اور وہ بھی اپنی اوٹ پٹانگ سوچ کے چکر سے باہر ہی نکلی تھی کہ اسے شہلا آنٹی آتی ہوئی نظر آئیں۔

اس نے لپک کر شبی کو پکڑا۔ گھسیٹ کر کمرے میں لے گئی، قفل اور کنجی ہاتھ میں تھما کر کہا۔ بھاگ کر دروازے پر تالا ڈال دے۔ اور تو کہیں چھپ رہ۔ شہلا آنٹی آ رہی ہیں۔ وہ تالا دیکھیں گی تو لوٹ جائیں گی۔ تب تو نکل آنا، سمجھی۔

"سمجھ تو گئی، مگر کیوں؟"

"اگر مگر چھوڑو بھی اب۔ سب کچھ بعد میں بتلاؤں گی۔"

اور شبی بگٹٹ بھاگی، تو شہزادی نے چھوٹے بھائیوں کو منا سمجھا کر کہا کہ کوئی بھی آواز نہ نکلے اور سب کے سب کمرے میں خاموش بیٹھے رہیں — بس منٹ دو منٹ کی تو بات ہے۔ پھر وہ انہیں پاپڑ دے گی۔ بھنے ہوئے بھی تلے ہوئے بھی۔

اور جب سارے بچے کمرے میں جمع ہو کر فرش پر لیٹ گئے تو شہزادی کو یوں لگا جیسے قالین بچھا دیا گیا ہو۔ جس کے پھول مرجھا کر بے رنگ ہو گئے ہیں اور اب قالین اٹھے گا تو دھجیاں ہو کر



ایک ڈال کے پنچھی

رضوان احمد

شام کا جھٹپٹا تھا۔
شمشاد نے ربڑ کی غلیل سے ایسا نشانہ لگایا کہ منڈیر پر بیٹھی کبوتری کے گرد ناچتا ہوا کبوتر زمین پر آرہا۔ اس وقت کبوتری کی بے قراری کی حد و انتہا نہیں تھی۔

شمشاد کی ماں دوڑی ہوئی آئی اور اس نے کبوتری کی بے قراری دیکھی تو اسے غش آگیا۔

دس سال گزر گئے۔

اس پر بھی ایسی ہی بے قراری کا عالم تھا جب اس کے شوہر سلطان کی لاش اس کے دشمنوں نے گھر میں لاکر ڈال دی تھی سلطان جیسے کڑیل جوان کی خون آلود لاش سامنے پڑی تھی اور وہ سینہ پیٹ رہی تھی پانچ سالہ شمشاد ان کی اکلوتی نشانی تھا۔ اور وہ اسے سینے سے لگائے سسک رہی تھی۔

سلطان کے نام سے علاقہ کا بچہ بچہ کانپتا تھا لیکن اس روز شام کے جھٹپٹے میں جب وہ اپنے گھوڑے پر سوار گھر واپس آرہا تھا تو کئی اشخاص گنے کے ایک کھیت سے باہر نکل آئے۔ ان کے ہاتھوں میں بلّم، لاٹھیاں اور بھالے تھے۔ ایک نے للکار کر کہا۔

"سلطان آج بنا لڑے جانے نہ پاؤ"

سلطان تنہا تھا اس نے دشمن کو جھکائیاں دے کر نکلنا چاہا لیکن سب نے اسے گھیر کر مار لیا۔ اور لاش دروازے پر لاکر ڈال دی۔

زینب کی دنیا ویران ہوگئی۔ سارے سہارے لوٹ گئے اس نے سلطان کی آخری نشانی شمشاد کو بڑے پیار سے پالا لیکن اس کے بے جا پیار نے شمشاد کو بگاڑ دیا۔ وہ دن بھر گاؤں میں آوارہ گردی کرتا تھا۔ ربڑ کی غلیل پر اس کا نشانہ بہت پکا تھا۔

بے قرار کبوتری منڈیر پر مسلسل چکر لگا رہی تھی ——— جب زینب کو ہوش آیا تو بے اختیار اس کے ہاتھ اوپر کو اٹھ گئے۔

"اسے معاف کردو، یہ معصوم ہے۔ کچھ نہیں جانتا" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"کیا ہوا ماں ——— ؟" "کیا ہوا ؟"
شمشاد نے اس کے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔
"تم نہیں سمجھ سکتے بیٹا، تم نہیں سمجھ سکتے"

(مختصر کہانی نمبر   ماہنامہ روبی نئی دہلی   ۱۹۷۸)

شارق

ایک منٹ اور

جنوری کے آخری ہفتہ کی سرد رات ــــــ حضرت نظام الدین کا بس اسٹاپ اس نے بند گلے کے کوٹ کے تمام بٹن لگاکر، اونی ٹوپی کو سر پر اچھی طرح منڈھ لیا۔ جیب سے رومال نکال کر عینک کے شیشے صاف کیے۔ اسے دوبارہ ناک پر جمایا اور ایک نگاہ اپنے پورے جسم پر ڈالی۔ دن میں کئی بار بس سے سفر کرنے اور بھیڑ میں چڑھنے اترنے کے بعد بھی اپنے آپ کو صحیح سلامت دیکھ کر اطمینان کا لمبا سانس کھینچا۔ دستانے میں محفوظ داہنے ہاتھ سے بیگ سنبھالا اور بایاں ہاتھ جیب سے نکال کر کلائی پر نظر ڈالی۔ دس بجکر تین منٹ ہوتے تھے۔ گریٹر کیلاش جانے والی آخری بس آنے ہی والی تھی، جامع مسجد سے نو بجکر چالیس منٹ پر روانہ ہونے والی ۵۱۱ نمبر کی بس عام طور پر دس بج کر پانچ منٹ پر یہاں آتی تھی

رات کی چادر ہر لحظہ گف ہوتی جارہی تھی، مرکری روشنیاں سردی سے ٹھٹھر کر مریل ہوچلی تھیں، سڑک پر دور نشیب میں باغ خسرو کے قریب عرب کی سرائے کا چکر کاٹتی ہوئی متعدد ہیڈ لائٹس تاریکی کا سینہ چیرتی بڑھتی چلی آرہی تھیں ــــ اس نے پھر گھڑی دیکھی۔ دس بجکر چار منٹ ہوگئے تھے۔ آگے پیچھے دو بسیں آکر رکیں، پچھلی بس کی پیشانی پر انگریزی ہندسوں میں ۵۱۱ اور ہندی میں گریٹر کیلاش کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ بس اسٹاپ پر خود کو اکیلا محسوس کرکے اس نے جلدی سے قدم بڑھاتے بائیں ہاتھ سے ہینڈل تھام کر فٹ بورڈ پر قدم جماتے ہی تھے کہ کنڈکٹر کی سیٹی اور بس کا انجن دونوں ایک ساتھ چاق اٹھے۔ بس جھٹکے سے آگے بڑھ گئی اس نے ریزگاری کی تلاش میں جیب میں ہاتھ دوڑایا۔ انگلیاں کسی چیز سے ٹکرائیں۔ اسے خیال آگیا جیب میں ثریا کی گھڑی تھی۔ جو اس نے دو دن قبل اسے ٹھیک کرانے کو دی تھی۔ لیکن وہ اپنے دفتر کی سیڑھیاں اتر کر، سڑک پار کرکے اپنے شناسا گھڑی ساز کے پاس نہ جاسکا تھا۔ اب کل جمعرات ہے۔ ادھر کا بازار بند رہے گا۔ اس کا مطلب یہ کہ گھڑی پرسوں سے پہلے ٹھیک ہونے کے لیے نہیں جاسکتی، ہونہہ .... اس نے جیسے گھڑی کے خیال کو نہیں بلکہ گھڑی کو ہی جیب میں جھٹک دیا۔ دس دس کے تین سکے تلاش کرکے نکالے کنڈکٹر کی طرف بڑھا دیے۔ کنڈکٹر استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا اس کے اوپر پھر جھلاہٹ سوار ہونے لگی تیس پیسے میں یہ بس اپنی آخری منزل تک جائے گی اور اس سے کم کا ٹکٹ نہیں ملتا۔ پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، کہیں کا بھی ٹکٹ دیا جاسکتا ہے۔ وہ احتجاجاً خاموش رہا۔ کنڈکٹر نے بے خیالی میں یا اس کے سکوت سے نالاں ہوکر ٹکٹ دو جگہ سے پھاڑا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

اوپر کا راڈ تھامے ہوئے بس کے جھٹکوں کو شمار کرتا وہ آگے بڑھ آیا۔ بس تقریباً خالی تھی۔ سردی نے سب کو گھروں میں قید کردیا تھا۔ لیکن اسے تو دو دفتروں میں کام کرنے کے بعد اسی وقت لوٹنا ہوتا تھا۔ ساڑھے نو بجے مغربی نظام الدین میں اپنے دفتر سے چل کر پندرہ منٹ میں بس اسٹاپ تک آتا تھا۔ اور آخری بس پکڑ کر مول چند پہنچتا تھا اور پھر پندرہ منٹ پیدل چل کر ایک کمرے کے اس گھر کی سیڑھیاں چڑھتا تھا جسے اس کی مالکۂ مکان فلیٹ کہتی تھی۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ وہ رات کو صرف اس لیے گھر آتا ہے کہ صبح پھر آفس جانا ہے۔ بس ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ وہ اپنے جسم کا توازن کھو بیٹھا اور ایک سیٹ پر ڈھیر ہوگیا۔ کنڈکٹر نے آواز لگائی ــ "آشرم" ــــ نہ کوئی سواری اتری نہ چڑھی۔ بس غرّا کر آگے بڑھ گئی۔ ہینگنگ برج کے نیچے سے گزر کر بس چوراہے پر زاویۂ قائمہ پر گھومی اور اوور برج پر چڑھنے لگی۔ ایک شخص اٹھ کر اگلے دروازہ پر پہنچ گیا۔ نہرو نگر کے بس اسٹاپ پر بس اس طرح رکی جیسے چلتے چلتے ٹھوکر لگی ہو وہ شخص اتر گیا۔ ڈرائیور نے پیروں کا دباؤ بڑھایا غراہٹ پھر گونجی، لیکن ڈرائیور نے انجن بند کردیا

اور میٹھے بیٹھے گردن موڑ کر اعلان کیا کہ "کلچ کا تار ٹوٹ گیا ہے" مسافر بڑبڑانے لگے "ٹھیک کرو پنڈت جی" دو راضافہ ہونے سے کنڈکٹر کی شوریدہ آواز ابھری۔ اس نے بے بسی سے گھڑی کا سہارا لیا۔ سوا دس بجے تھے اب کیا ہوگا۔ نہ جانے یہاں کتنی دیر لگے۔ اب تو کوئی بس اور بھی نہیں آئے گی۔ اسے تو ابھی مول چند کے چوراہے سے ناشتے کے لیے انڈے خریدنے تھے۔ اس کے بعد گیتا مارکیٹ سے گذرتے ہوئے دودھ کی بوتل لینی تھی۔ انڈے والا دکان بڑھا ہی رہا ہوگا اور ٹافی والی دکان ٹھیک ساڑھے دس بجے بند ہوجاتی ہے۔ روزانہ آخری گاہک وہی ہوتا ہے۔ اب اگر بس کو یہاں دس منٹ بھی لگ گئے تو اس کا سارا پروگرام درہم برہم ہوجائے گا۔ جب وہ بس اسٹاپ پر اترے گا تو انڈے والا جاچکا ہوگا۔ دودھ اور ٹافی کی دکانیں بند ہوچکی ہوں گی۔ مکان کی مالکہ بھی پونے گیارہ بجے کی سیٹی کے ساتھ ہی باہر کے گیٹ میں تالا ڈال دیتی ہے پھر گھنٹوں چیخنا پڑتا ہے تب جاکر بڑبڑاتی ہوئی آتی ہے۔ سابقہ کرایہ داروں کے شریفانہ اطوار یاد کرکے اور اس کی بے قاعدگی پر شرمندہ کرکے گیٹ کھولتی ہے۔ انڈے نہیں ملیں گے تو ثریا علی الصبح اٹھ کر سبزی بنائے گی۔ ننھی حنا کو صبح ہی صبح سرہانے ٹافیاں رکھی نہیں ملیں گی تو اس کا منھ پھول جائے گا اور وہ اپنے توتلے منھ سے کہے گی "کہ ہم ابی سے نہیں بولتے" دن اور رات میں صبح کا یہی نصف گھنٹہ تو ہوتا ہے جسے وہ اپنی پیاری بیٹی کے ساتھ گزارتا ہے، اس میں بھی وہ روٹھی رہے گی۔ پھر صبح چھ بجے اٹھ کر دہلی ملک اسکیم کے ڈپو کی لائن میں لگنا پڑے گا ورنہ دودھ کہاں سے آئے گا۔ دودھ آنے میں دیر ہوگی تو ناشتہ دیر میں ملے گا۔ جلدی کی وجہ سے شیو کا پروگرام ملتوی کرنا پڑے گا۔ پھر بھی گھر سے نکلتے نکلتے اسے دیر ہوجائے گی۔ اور جب تک وہ رنگ روڈ کے بس اسٹاپ پر آئے گا تو بس کی قطار طویل ہوچکی ہوگی ان سب باتوں کا بالآخر نتیجہ ہوگا یہ کہ اسے دفتر پہنچنے میں دیر ہوجائے گی۔ اور دفتر جاکر باس کی تیز نظروں کا سامنا کرنا پڑیگا۔ باس جو اپنے برے دنوں کی سب عادتیں بھلا بیٹھا ہے مگر وقت پر آفس آنے کی عادت نہیں بدل سکا۔ کھٹ کھٹ کی آواز نے اس کی سوچ کو تار تار کر دیا۔ ڈرائیور نے بونٹ اٹھا دیا تھا اور شاید تار لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگلے ہی منٹ گاڑی کا انجن بیدار ہوگیا۔ اس نے پھر گھڑی دیکھی دس بجکر اکیس منٹ ہوئے تھے۔ گویا صرف چھ منٹ گزرے تھے لیکن یہ چھ [illegible] تھے۔ یہ چھ منٹ اس کے پورے پروگرام کا شیرازہ منتشر کرنے کی بھرپور قوت رکھتے تھے۔

ڈرائیور نے بس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں۔ بس بھاگی جا رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ بسیں دہلی کی زندگی کی کتنی سچی علامت ہیں تیز رفتار ادھر ادھر دیکھے بغیر سب کو پیچھے چھوڑنے کی کوشش میں دوڑتی بھاگتی۔ سارے بس اسٹاپ ایک شانِ بے نیازانہ کے ساتھ نظر انداز کرتے ہوئے ڈرائیور نے مول چند اسپتال کے سامنے بریک دبائے۔

وہ لپک کر اترا۔ لیمپ پوسٹ کے نیچے آکر گھڑی دیکھی دس بجکر اکتیس منٹ ہوئے تھے یعنی وہ صرف ایک منٹ لیٹ ہوا تھا۔ ضائع ہوجانے والے چھ منٹ میں سے پانچ منٹ ڈرائیور نے اپنی تیز رفتاری کے ذریعے بھاگتے ہوئے وقت سے واپس وصول کر لیے تھے۔ لیکن ان چھ لمحوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے خوف سے اس پر کتنے عالم گزر گئے تھے۔ ...

اس نے تیز تیز قدم بڑھا دیے۔ ابھی ایک منٹ کا حساب برابر کرنا تھا۔

(بیس نئی کہانیاں - نصرت پبلشرز لکھنؤ۔ ۱۹۷۷ء)

مختصر ترین افسانہ — **سہارا** — یوسف الشرقی

اس شام میں اپنی ننھی بیٹی کو گود میں اٹھائے گزر رہا تھا وہ میرے شانے پر سر ٹکائے اپنی چھوٹی چھوٹی بانہیں گردن میں ڈالے تھی۔

اچانک میرا پاؤں پھسلا میں منہ کے بل گرنے ہی والا تھا کہ بچی نے میری گردن کے گرد اپنی بانہوں کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا کہ۔

"پاپا ذرا ہے تھیں ——— میں نے آپ کو مضبوطی سے تھام لیا ہے" — اور جب میں سنبھل گیا تو بچی خوش تھی کہ اس نے مجھے گرنے سے بچا لیا ہے۔

••

محفل بہ محفل

تعارف

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
نسیم بک ڈپو لکھنؤ
غالب اکیڈمی، نئی دہلی
کتب خانہ عزیزیہ دہلی
بہار اردو اکیڈمی پٹنہ
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی
موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی
دی کلچرل اکیڈمی گیا
اسٹار پبلی کیشنز نئی دہلی
صدیقی اشاعت گھر نئی دہلی
نصرت پبلشرز لکھنؤ

شاہ اجمل اشاعت گھر الہ آباد
کتاب والا دہلی
دانش محل لکھنؤ
چمن بک ڈپو دہلی
صدیق بک ڈپو لکھنؤ
سوجیہ پرکاشن نئی دہلی
کتب خانہ اشاعت اسلام دہلی
انجمن تہذیب نسواں الہ آباد
مکتبہ دین و ادب لکھنؤ
مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ
مکتبہ الحسنات دہلی
خورشید بک ڈپو لکھنؤ
اہلوالیہ بک ڈپو دہلی

زمزم بک ٹرسٹ دہلی
بک امپوریم پٹنہ
الہ آباد بک ہاؤس الہ آباد
واجد علی شاہ اکیڈمی لکھنؤ
پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز نئی دہلی
مکتبہ ندوۃ العلما لکھنؤ
کتب خانہ حمیدیہ دہلی
ادارہ اشاعت دینیات نئی دہلی
مرکزی ادارہ تبلیغ دینیات دہلی
دارالمصنفین اعظم گڑھ
خدا بخش لائبریری پٹنہ
مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی
کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی
نئی روشنی پبلی کیشنز نئی دہلی
مکتبہ الرسالہ دہلی

○ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

مکتبے کی لگ بھگ ساٹھ سالہ تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۲۲ء میں اپنے قیام سے لے کر آج تک اس ادارے کی نوعیت تجارتی ادارے سے کہیں زیادہ بڑے تہذیبی، سماجی اور قومی ادارے کی رہی ہے۔ آزاد ہندستان کے پہلے وزیر اعظم کی طرح اس کے پہلے صدر مملکت آنجہانی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بھی مکتبے کی خدمات کا اعتراف ان لفظوں میں کیا تھا۔

"میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ نشر و اشاعت کے قابل قدر کارناموں سے باخبر ہوں۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں نے اسے شدید صدمہ پہنچایا، مگر اس نے از سر نو اپنا کام سابقہ حسن و خوبی کے ساتھ پھر شروع کر دیا۔"

ابتدائی دور میں مکتبہ جامعہ کی حیثیت ہماری قومی یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک ذیلی شعبے کی تھی، اسے شعبۂ تصنیف و تالیف کا نام بھی دیا گیا تھا اور اس نے بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بنیادی مقاصد اور اقدار کی حیثیت کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔ آزادی سے پہلے کے پچیس برسوں میں مکتبے کی تاریخ دراصل ہماری قومی تاریخ کے ایک اہم باب جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخ کا ایک باب ہے۔

جامعہ کے بانیوں میں ایسے سیاسی اور قومی رہنما اور ایسی برگزیدہ شخصیتیں تھیں جن سے علم و ادب تہذیب و تفکر کا اعتبار بھی قائم ہوتا ہے۔ مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی جوہر، حضرت شیخ الہند، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیتوں میں علم اور عمل دونوں کی روشنی ایک مرکز پر یکجا ہو گئی تھی۔ ہندی کے مشہور ہفتہ وار رسالہ ساپتاہک ہندستان نے ۱۹۵۴ء میں مکتبے کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے اس امر کی جانب توجہ دلائی تھی کہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ اور مکتبہ جامعہ نے ... جنہوں نے بابائے قوم کے افکار و اقدار کی ترویج و اشاعت کو اپنا نصب العین بنایا ہے۔ نہ تو ہندو مسلم اختلافات سے کوئی سروکار رکھا نہ ہندی اور اردو کے تنازعے سے۔ خود اشتہاری سے بے نیاز ہو کر یہ ادارہ تجارت کے بجائے سماجی خدمت کے ایک اہم مرکز کی خدمات انجام دیتا آیا ہے۔"

جامعہ ملیہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف نے برصغیر کے علماء اور ادیبوں کو بہت جلد اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ علی گڑھ تحریک کے بعد جامعہ کا شعبہ ایک نئے قومی، تعلیمی اور علمی تصور کی اشاعت کا دوسرا اہم موڑ تھا۔ مقصد یہ تھا کہ خالص علمی نوعیت کی کتابیں جو تجارتی ادارے اپنی مخصوص مصلحتوں اور مجبوریوں کے سبب نہیں شائع کر پاتے اس شعبے کی وساطت سے منظر عام پر آئیں۔ چنانچہ تاریخ فیروز شاہی کا ترجمہ، عربی کی مشہور لغت المنجد کا ترجمہ، تاریخ اسلام سے متعلق کتابوں کا ایک سلسلہ جو مولانا اسلم جیراج پوری مرحوم نے بہت عام فہم زبان میں ترتیب دیا تھا، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی کتاب بنیادی معاشیات اور ... تاریخ الدولتین، یہ تمام کارنامے جامعہ کے اسی شعبہ تصنیف و تالیف کی تحریک پر انجام پذیر ہوئے۔ یہ شعبہ ۱۹۲۰ء تک قائم رہا اور اسی سال جامعہ نے اردو اکیڈمی کے نام سے ایک نئے ادارے کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت تک جامعہ کو ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عابد حسین مرحوم اور پروفیسر محمد مجیب کی خدمات بھی میسر آ گئی تھیں۔

اب جامعہ کی علمی اور تعلیمی ... کا آغاز ہوا۔ نشر و اشاعت کے مقاصد میں مزید وسعت پیدا ہوئی اور ملک کی تاریخ، تہذیب، فکر اور روایت کے ساتھ ساتھ جدید دنیا کے ذخیرۂ علم سے استفادہ اور جدید زندگی کے مطالبات کے مطابق نئے علمی، فکری اور ادبی مذاق کو آسودہ کرنے والی کتابیں لکھوانے اور ترجمہ کرانے کا چلن عام ہوا۔ ڈاکٹر عابد حسین مرحوم، جناب سعید انصاری اور ڈاکٹر عبدالعلیم مرحوم کے ابتدائی تراجم اسی زمانے میں منظر عام پر آئے ... کتابیں موضوعات فکر و فلسفہ اور تاریخ و تہذیب کے مختلف شعبوں پر محیط تھے۔ ... رسالہ جامعہ سنجیدہ علمی اور سماجی موضوعات پر مضامین کی اشاعت میں مصروف تھا۔ اکیڈمی سال بہ سال علمی جلسے کرتی تھی جس میں ملک اور بیرون ملک کی مشہور شخصیتیں اعلا درجے کے خطبات پیش کرتی تھیں۔ خالدہ ادیب خانم کی تقریروں کا انگریزی اور اردو ترجمہ اکیڈمی کی انہی کوششوں کا ترجمان ہے۔

تعلیم، اصول تعلیم، تاریخ، فلسفہ، نفسیات، سیاسیات، معاشیات، مذہبیات، ادبیات سے متعلق اردو کی بعض انقلاب آفریں تصانیف اور تالیفات کا سلسلہ اسی زمانے میں سامنے آیا۔ اول نویسوں میں منشی پریم چند، ڈرامہ نگاروں میں ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب، شعراء

یہ، جگر اور جوش جیسی ممتاز شخصیتوں کے نام مکتبے کی اسی ابتدائی دور کی تاریخ سے وابستہ ہیں۔

اردو نثر کے دامن کو وسیع کرنے کے لیے مکتبے کے بزرگوں نے تراجم کی ضرورت اپنے [illegible] سے محسوس کی تھی۔ ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب مترجم کی حیثیت سے ہماری علمی روایت میں متعدد اضافے کر چکے تھے اور ان کی صلاحیتوں کا اعتراف ساری اردو دنیا میں کیا جانے لگا تھا۔ ایسی صورت میں فطری تھا کہ بابائے قوم مہاتما گاندھی اور معمار قوم پنڈت جواہر لال نہرو کی کتابوں کے اردو تراجم کی سعادت بھی سب سے پہلے مکتبے کے ہی حصے میں آئی۔ ان سیاسی قائدین نے بھی مکتبے کے مقاصد کی وسعت اور اس کے نصب العین کی عظمت کا اعتراف کیا جو اردو زبان و ادب سے کوئی گہرا جذباتی رشتہ نہیں رکھتے تھے۔ پرشوتم داس ٹنڈن، کاکا کالیلکر، اندر ودیا النکار اور مرارجی ڈیسائی نے مکتبے کے سلسلے میں اپنے تاثرات کا تحریری طور پر اظہار کیا ہے اس سے مکتبے کی قومی حیثیت کی تصدیق ہوتی ہے۔

۱۹۴۷ء تک مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک ذیلی شعبے کی حیثیت سے تقریباً سات سو کتابیں شائع کر چکا تھا۔ مگر تقسیم کے ساتھ رونما ہونے والی موجِ خوں مکتبے پر بھی گزری۔ یہ نقصان جانکاہ بھی ہے اور طولانی بھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے حسب ذیل الفاظ اسی سانحے کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

> ۴۷ء کے فسادات دہلی کا ایک افسوسناک حادثہ یہ تھا کہ جامعہ ملیہ کے مکتبہ کا تمام ذخیرہ جلا کر برباد کر دیا گیا۔ یہ مطبوعہ کتابوں کا ایک قیمتی ذخیرہ تھا جو جامعہ نے سالہا سال کی مسلسل محنت سے تیار کیا تھا۔
>
> نہایت خوشی کی بات ہے کہ یہ حادثہ جامعہ کے باہمت کارکنوں کو افسردہ خاطر نہ کر سکا۔ افسردگی کی جگہ اس نے سعی و محنت کی ایک نئی امنگ پیدا کر دی۔ چنانچہ اس کا شاندار نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔
>
> مکتبہ کی اس نئی سعی و محنت کا دور سنہ ۴۸ء سے شروع ہوا تھا۔ [illegible] کی قلیل مدت میں مکتبہ دو سو [illegible] کتابیں [illegible] از سر نو مرتب کر کے شائع کر چکا ہے اور پھر ایک نیا ذخیرہ کتابوں کا فراہم ہو رہا ہے۔
>
> مکتبہ نے اردو ہندی دونوں زبانوں کی کتابیں تیار کر کے شائع کی ہیں۔ عام مطالعہ کی ادبیات کے علاوہ ایک بڑی تعداد تعلیمی کتابوں کی ہے۔ تعلیم بالغان کے لیے اس کا اردو ہندی سلسلہ نہایت مفید ثابت ہو چکا ہے۔
>
> جامعہ نے یہ بہت اچھا کیا کہ اب مکتبہ کو ایک لمیٹڈ کمپنی کی حیثیت دے دی ہے:

مولانا آزاد مرحوم نے اس رائے کا اظہار ۶ ستمبر ۱۹۵۲ء کو کیا تھا۔ مکتبے کو ایک لمیٹڈ کمپنی کی حیثیت ۱۹۵۰ء میں ملی۔ اسے اس درجے تک پہنچانے میں مکتبے کے پہلے منیجنگ ڈائرکٹر جناب حامد علی صاحب مرحوم کی انتھک محنت کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم، عابد صاحب اور مجیب صاحب (جنھیں عرف عام میں جامعہ کے ارکان ثلاثہ کا نام دیا جاتا ہے) کی مساعی کا رول بہت نمایاں رہا ہے۔ اب مکتبے نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی روایات، اقدار اور مقاصد سے اپنا ربط قائم رکھتے ہوئے آزادانہ طور پر لائحہ عمل ترتیب دیا ہے۔ اردو کے ممتاز ترین ادیبوں، ملک کے مقتدر علما اور مشاہیر کی دلچسپی اور توجہ نے اس ادارے کو بہت جلد اردو کتابوں کی اشاعت کے سب سے بڑے مرکز کی حیثیت دے دی۔ شعر و ادب کی مختلف صنفوں سے تعلق رکھنے والے اہم ترین نام مکتبے کی اشاعتی سرگرمیوں، اس کے مقاصد کی سنجیدگی اور وقار کی ضمانت بن گئے۔ اپنے دور ثانی میں مکتبے نے اعلیٰ پایے کی کتابیں شائع کرنے کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب اور تعلیم بالغان کے مسئلے کی طرف خصوصی توجہ کی۔ درسی کتابوں کی اشاعت بھی مکتبے نے ایک مشن کے ساتھ شروع کی۔ حامد صاحب کی یونیسکو سے وابستگی کے بعد مکتبے کی سربراہی کا کام جناب غلام ربانی تاباں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ تاباں صاحب نے ان بنیادوں کو جنھیں حامد صاحب مرحوم کی بے لوث اور انتھک کوششیں استوار کر گئی تھیں، مزید استحکام بخشا۔ مکتبے کا ماہنامہ رسالہ پیام تعلیم بچوں کے ادب میں ایک نئی روشنی اور بصیرت کا نقیب بن گیا۔ مکتبے نے جو ریڈریں شائع کیں ان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ متعدد کتابوں کے اب تک پچیس تیس ایڈیشن نکل چکے ہیں اور مختلف صوبوں کے محکمہ تعلیمات نے انھیں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں پنجاب کے ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن نے حکومت سے یہ سفارش کی کہ چونکہ مکتبہ تجارتی مقاصد سے یکسر بے نیاز ہو کر یہ خدمت انجام

دے رہا ہے اس لیے مرکزی حکومت کا محکمۂ مالیات اس کی درسی کتابوں کو CONSIDERATION FEE سے مستثنیٰ کردے۔ مرکزی وزیر تعلیم نے اس امر کا اظہار کیا کہ تعلیم بالغان کے سلسلے میں مکتبہ اگر تمام ذمے داریوں کو قبول کرلے تو یہ مشن بہت جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے کیونکہ اردو کا کوئی بھی دوسرا ادارہ اس طرح کی خدمات کا اتنا وسیع تجربہ نہیں رکھتا۔ مکتبے کی اس خدمت کا اعتراف کم و بیش تمام ریاستی حکومتوں نے کیا اور ہندستان سے باہر ماریشس اور مشرقی افریقہ کے بعض ممالک میں بھی بڑے پیمانے پر اس سے فائدہ اٹھایا گیا۔

ریڈروں کے نیشنلائز ہوجانے کے بعد ایک دور ایسا بھی آیا جب مکتبے کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر مکتبے کے موجودہ جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں کی مسلسل جد و جہد، کارکنوں کے اشتراک، مکتبے کے خیر خواہوں کی توجہ اور سرپرستی کے نتیجے میں آج پھر مکتبہ بہت اعتماد اور مضبوطی کے ساتھ اپنے پیروں پر کھڑا ہے۔ ہر سال تقریباً اسی پچاسی نئی کتابیں اس ادارے سے شائع ہو رہی ہیں۔ ان میں بچوں کی کتابوں کا تناسب پینتیس کے قریب ہے۔ مکتبے کی ملک گیر حیثیت کے پیش نظر ہر صوبے کی اکیڈمی مکتبے کی مطبوعات پر انعام و اعزاز دیتی ہے۔ طباعت کے سلسلے میں گزشتہ پانچ برسوں سے مکتبہ ... قومی ایوارڈ حاصل کر رہا ہے۔ خوبصورت ... اور ... کتابوں کی اشاعت اور فروغ کے ... ناشر کی حیثیت سے ... مکتبے نے اب تک ... انعامات حاصل کیے ہیں۔ اور آندھرا پردیش اور مغربی بنگال کی حکومتوں نے اس کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

... سے قطع نظر مکتبے نے اپنے قیام کے ساتھ جن مقاصد کو مشعل راہ بنایا ... اس کے ... معیاری کتابوں کی اشاعت، سنجیدہ علمی موضوعات پر کام کرنے والوں کی پذیرائی، قومیت، رواداری اور روشن خیالی کے تصورات اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیادی روایات اور اقدار کی ترویج اور ترجمانی آج بھی اس ادارے کا نصب العین ہے۔ اس کے دونوں ماہنامے "پیام تعلیم" اور "کتاب نما" اپنے اپنے میدان میں علم و ادب کا ستھرا، سنجیدہ اور علمی مذاق عام کرنے کی جستجو میں مصروف ہیں۔

مجموعی طور پر مکتبے کا سفر ایک اعلا تہذیبی، تعلیمی، ادبی اور علمی نصب العین کا سفر ہے چنانچہ کامرانی کی کوئی بھی منزل اس کے لیے آخری منزل نہیں ہے۔

○ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ کا سب سے پرانا اشاعتی ادارہ ہے یہ بات ۱۹۲۵ء کی ہے جب جناب عبد الشہید صاحب نے اسے قائم کیا تھا۔ اس ادارہ کی پہلی کتاب "کائنات ادب" تھی۔ ادب کا ایک صاف ستھرا انتخاب۔ اس کا چھپنا تھا کہ ادارے کا اشاعتی سلسلہ چل پڑا۔ پھر تو یہ برسوں سے یونیورسٹی کی ادبی اور تدریسی ضروریات کو پورا کر رہا ہے۔ جب جامعہ اردو کا دفتر آگرے سے علی گڑھ آیا تو اس کے رجسٹرار جناب ظہیر الدین علوی کو درسی کتابوں کی ضرورت پیش آئی۔ یہ اردو زبان کے لیے بڑا نازک وقت تھا۔ اچھے اچھے ادارے چپ سادھے بیٹھے تھے۔ عبد الشہید صاحب نے یونیورسٹی کے مقتدر اساتذہ کی خدمات حاصل کیں اور تدریسی ضروریات کے پیش نظر کتابیں تیار کیں۔

عبد الشہید صاحب اردو سے محبت کرتے تھے۔ ان کے صاحبزادوں نے یونیورسٹی سے اعلا تعلیم حاصل کی جن میں سے دو نے تو سرکاری اور یونیورسٹی کی ملازمت کی طرف رخ کیا۔ لیکن اسد یار خاں اور احمد سعید خاں نے ایجوکیشنل بک ہاؤس کی باگ ڈور سنبھالی اور اسے آگے لے جانے کا بیڑہ اٹھایا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے والد کی روایات کو تازہ کریں۔ سب سے پہلے انہوں نے کتابوں کی طباعت اور ... گٹ اپ کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ انہوں نے لیتھو سے چھپوانے کے بجائے "ٹائپ" یا "فوٹو آفسیٹ" چھپوانا شروع کردیا۔ الہ آباد اور دہلی سے ہی کتابت کروانا اور وہیں چھپوانا خاصا مشکل کام تھا لیکن ان حوصلہ مند نوجوانوں نے چند ماہ کے اندر طباعت کے معیار کو بلند کردیا۔ انہوں نے ٹائٹل کی دیدہ زیبی کی طرف بھی خصوصیت سے توجہ دی۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے ان کی درسی کتابیں بہت خوبصورت اور صاف ستھری ہوگئیں۔

اس درمیان میں ایجوکیشنل بک ہاؤس نے ادبی کتابوں کی طرف توجہ دی۔ شروع شروع میں ہندستانی ادیبوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ چنانچہ انہوں نے پاکستان کے بعض ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں ان کی اجازت سے (معاوضہ دے کر) شائع کیں۔ یہ کتابیں توقع سے زیادہ مقبول ہوئیں۔ ان میں اقبال، فیض، وزیر آغا، ابو اللیث صدیقی، اور حسن عسکری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کلیات اقبال انھوں نے فوٹو آفسیٹ سے بہت خوبصورت اور کم قیمت پر شائع کی۔ اس کے بعد تو پھر اقبالیات

کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس نے اقبال سے متعلق بارہ کتابیں شائع کیں جن میں وقار عظیم، مولانا صلاح الدین احمد، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر ذاکر الحسن نقوی وغیرہ کی تصانیف شامل ہیں۔

غالبیات کے سلسلہ میں انھوں نے کئی کتابیں شائع کیں جن میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر خورشید الاسلام کی کتابیں قابل ذکر ہیں۔

لسانیات پر اردو میں حال ہی میں کام شروع ہوا ہے۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس نے ماہرین کی خدمات حاصل کیں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تصانیف شائع کیں۔

تنقیدی ادب کی اشاعت میں ایجوکیشنل بک ہاؤس نے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں اور ایسی کتابیں شائع کیں جو عام پڑھنے والوں کے علاوہ طلبا کے لیے بھی بے حد مفید ہیں۔ اردو کے ممتاز نقادوں کی کتابیں اس ادارے سے برابر شائع ہو رہی ہیں۔ جن میں مندرجہ ذیل نقادوں کی کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عبدالقادر سروری، وحید قریشی، وزیر آغا، وقار عظیم، خورشید الاسلام، شمیم حنفی، محمد حسن، منظر عباس نقوی، ظہیر احمد صدیقی، فضل امام، اختر انصاری، خلیل الرحمٰن اعظمی، رشید حسن خاں، حسن عسکری، ابواللیث صدیقی، عبادت بریلوی، سید عابد علی عابد، عتیق احمد صدیقی، ثریا حسین، اطہر پرویز اور ابن فرید وغیرہ۔

ایجوکیشنل بک ہاؤس نے تخلیقی ادب کے ضمن میں بھی خاطر خواہ توجہ دی اور ۱۹۸۱ء میں چند اہم کتابوں کی اشاعت کا پروگرام بنایا تخلیقی ادب میں دیوان غالب، کلیات اقبال، کلام فیض، مثنوی گلزار نسیم، مثنوی سحر البیان، امراؤ جان ادا، انار کلی، قرۃ العین حیدر کے چار ناولٹ وغیرہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ شائع کیں۔

پچھلے چند برسوں سے ادارہ ہذا نے افسانوی انتخاب کی اشاعت کا ایک پروگرام بنایا ہے جس میں پریم چند، سعادت حسن منٹو کے انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ "روشنی کی رفتار" اور ان کے چار ناولٹ "دلربا، سیتا ہرن، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو اور چائے کا باغ" ابھی حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ کرشن چندر کے افسانوں کا آخری مجموعہ بھی طباعت کے مراحل سے گزر رہا ہے۔

ایجوکیشنل بک ہاؤس کا ایک شاندار کام اس کا دو ماہی رسالہ "الفاظ" ہے جو پچھلے چھ سال سے پابندی سے شائع ہو رہا ہے اور اس کی مقبولیت دن دونی رات چوگنی بڑھ رہی ہے ابھی حال ہی میں اس نے دو جلدوں میں اپنا افسانہ نمبر شائع کیا ہے جس کی مجموعی ضخامت سوا پانچ سو صفحات ہے۔

یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ پچھلے دس سال سے ہندستان میں اردو کے کسی اور ادارے نے اتنی تعداد میں صف اول کے ادیبوں کی اتنی کتابیں شائع نہیں کی ہیں۔

ایجوکیشنل بک ہاؤس کی پندرہ کتابوں کو مختلف اکیڈمیوں سے انعامات مل چکے ہیں اس کے علاوہ اتر پردیش اور بنگال کی اردو اکیڈمیوں نے اسے شاندار طباعت کے انعام سے نوازا ہے۔ لکھنؤ میں ۱۹۷۹ء میں نیشنل بک ٹرسٹ دہلی اور یوپی اردو اکیڈمی کی جانب سے پہلی قومی اردو پبلشرز کی نمائش ہوئی۔ اس میں پہلا انعام ایجوکیشنل بک ہاؤس کو ملا۔

۱۹۸۱ء میں ایجوکیشنل بک ہاؤس نے ۱۵ کتابیں شائع کی ہیں، امید ہے کہ ۱۹۸۲ء میں یہ تعداد نہ صرف برقرار رہے گی بلکہ اس میں اضافہ ہوگا اور اسے اردو کے اور زیادہ مصنفین کا تعاون بھی حاصل ہوگا۔

ادارہ ہذا کا سب سے بڑا مسئلہ جس کا ذکر اکثر اسد یار خاں صاحب کرتے رہتے ہیں، پریس کا ہے۔ آفسیٹ مہنگا پڑتا ہے اور لیتھو گندہ، وہ اپنی زیادہ تر کتابیں الہ آباد میں "ون ڈائنگ" سے چھپواتے ہیں۔ "ون ڈائنگ" فوٹو آفسیٹ کے مقابلے میں بہت سستا پڑتا ہے اور طباعت کے معیار کے مطابق فوٹو آفسیٹ کے ہم پلہ۔ لیکن بدقسمتی سے الہ آباد میں صرف دو پریس اس طرز طباعت پر عمل کر رہے ہیں۔ اسی لیے ایجوکیشنل بک ہاؤس کی کتابوں کی طباعت میں غیر معمولی تاخیر ہوتی ہے اگر ون ڈائنگ کے چند پریس کھل جائیں تو مجھے یقین ہے کہ اردو طباعت کا معیار بھی بلند ہوگا اور کتابیں بھی زیادہ تعداد میں کم قیمت پر شائع ہو سکیں گی۔

کاش کہ مختلف ریاستوں کی اردو اکیڈمیاں اپنے اپنے یہاں کم از کم ایک ون ڈائنگ کا انتظام کر دیں تاکہ اردو کی طباعت لیتھو کی گندگی سے بچ جائے اور فوٹو آفسیٹ کی گرانی بھی قیمتوں پر اثر انداز نہ ہو اور طباعت کا اعلیٰ معیار قائم ہو۔ جو رقم اکثر صوبوں پر خرچ ہو رہی ہے اس سے یہ کام بآسانی ہو سکتا ہے۔ امید ہے کہ یہ ادارے اس تجویز پر غور کریں گے۔

نسیم بک ڈپو لکھنؤ

آج سے ۶۴ سال قبل نسیم بک ڈپو کی بنیاد صرف ۱۲ روپے سے اس کے بانی نسیم انہونوی نے رکھی تھی۔ سید محمد نسیم انہونوی انہونہ ضلع اناؤ میں ۱۹۰۹ء میں سادات کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں ایک مدت سے پیری مریدی کا سلسلہ جاری تھا۔ مگر نسیم انہونوی کے والد محترم نے "پیر" بننا پسند نہ کیا اور لکھنؤ آکر محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ اس وقت نسیم صاحب صرف چھ ماہ کے تھے۔ ان کی تعلیم لکھنؤ میں ہی ہوئی اور ۱۹۲۱ء میں انہوں نے اردو مڈل پاس کیا پھر پرائیویٹ طریقے سے فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ مڈل پاس کرنے ہی کے زمانے سے نسیم صاحب کو افسانے اور ناول لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور افسانے اور ناول لکھے لیکن کوئی چھپا نہیں۔ ابھی وہ انیس برس ہی کے تھے کہ لکھنؤ کے ایک مذہبی ادارے نے ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر انہیں اپنے ادارے کے ترجمان ماہانہ "انکشاف" کا ۱۹۲۸ء میں ایڈیٹر بنا دیا۔ نسیم صاحب نے اس رسالے کو ایک ادبی ماہنامے کی شکل دے دی اور اسے کافی مقبولیت حاصل ہو گئی۔ مگر ادارے نے ان کی پالیسی سے اتفاق نہیں کیا اور 'انکشاف' بند ہو گیا۔ 'انکشاف' کی ادارت کے سلسلے میں نسیم انہونوی کی ملاقات امین سلونوی سے ہوئی اور امین سلونوی کی معرفت شوکت تھانوی مرحوم سے اس اثنا میں نسیم صاحب سے علامہ نیاز فتحپوری کے بھی مراسم ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب 'انکشاف' بند ہوا تو نیاز صاحب کے مشورے سے نسیم صاحب نے خواتین کے لئے ایک ماہنامہ "حریم" جاری کیا جو اب تک پابندی سے ہر ماہ شائع ہو رہا ہے۔ نیاز صاحب نے نگار کے دفتر میں 'حریم' کے دفتر کے لئے بھی جگہ دے دی اور کئی مہینوں تک نسیم صاحب علامہ نیاز فتحپوری کے مشوروں سے مستفید ہوتے رہے۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں امین سلونوی اور شوکت تھانوی کے مشوروں سے نسیم صاحب نے ہفتہ وار 'سرپنچ' جاری کیا جسے بہت جلد کافی شہرت حاصل ہو گئی۔ شوکت تھانوی، ۴۷ء سے پہلے ہی لاہور کی ایک فلم کمپنی سے منسلک ہو کر جب لاہور چلے گئے تو خان محبوب طرزی سرپنچ کے ایڈیٹر ہوئے۔ اسی زمانے میں نسیم صاحب نے سرپنچ کا ایک ماہانہ ایڈیشن "سرپنچ فلم ایڈیشن" کے نام سے جاری کیا اور بہت جلد اردو کے فلمی رسالوں میں اسے ممتاز ترین جگہ حاصل ہو گئی۔ دہلی میں اس کا ایک بڑا دفتر بھی قائم ہو گیا لیکن ۴۷ء کے فسادات میں اسے جلا دیا گیا تو سرپنچ فلم ایڈیشن بند کرنا پڑا۔ 'سرپنچ' ویسے تو اب بھی شائع ہو رہا ہے مگر اس میں نسیم بک ڈپو کی شائع کردہ کتابوں کے اشتہارات ہی ہوتے ہیں۔ نسیم انہونوی نے ۱۹۲۸ء میں اپنا پہلا ناول "طرز زندگی" شائع کیا۔ یہ نسیم بک ڈپو کی پہلی کتاب تھی۔ شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ "موج تبسم" بھی نسیم بک ڈپو نے ۳۲ء میں شائع کیا اور اس کے بعد ان کی متعدد دوسری کتابیں بھی نسیم بک ڈپو سے شائع ہوتی رہیں۔ خان محبوب طرزی کے تقریباً ۸۰ ناول بھی نسیم بک ڈپو نے شائع کئے۔ اب اس بک ڈپو کی بنیاد مضبوطی سے قائم ہو چکی تھی اور نسیم انہونوی ناول نگار ہونے کے ساتھ اردو کے مشہور ناشر بھی بن گئے تھے۔ نسیم بک ڈپو ۲۸ء سے اب تک کم و بیش ایک ہزار کتابیں شائع کر چکا ہے۔ ان میں ناولیں بھی شامل ہیں اور اعلا پائے کی ادبی کتابیں بھی جن کے مصنف ملک کے ممتاز ادیب ہیں۔ علمی اور ادبی کتابوں کے علاوہ ملک کے ممتاز ناول نگاروں کے ناول، ڈراموں اور شاعری کے مجموعے اور دیگر مباحث پر بھی اس نے کثرت سے کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے بھی سینکڑوں دلچسپ کتابیں طبع کر کے ان میں پڑھنے کے شوق کو فروغ دیا۔ نسیم انہونوی خود ۲۵ ناولوں کے مصنف ہیں ان میں سے کئی ناول مثلاً کہکشاں وغیرہ بہت ہی مقبول ہوئے۔ ان کے یہ ناول خواتین میں خاص طور سے بہت مقبول ہیں اور بعض ناولوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ نسیم بک ڈپو کی خدمات کے اعتراف میں اترپردیش اردو اکاڈمی نے اردو کتابوں کی اشاعت کے لیے اول انعام سے نوازا ہے جو اس اعتبار سے اور بھی قابل فخر ہے کہ نہ تو اس ادارے کو کبھی حکومت یا دیگر افراد کی مدد ملی اور نہ اسے بڑی شخصیتوں کے تعاون کا فیض ملا۔

اس کی ترقی صرف اپنے بانی کی تنہا اور انتھک محنت و لگن کا نتیجہ ہے۔ نسیم انہونوی ایک عرصے سے تنفس کی شکایت میں مبتلا ہیں مگر جب تک وہ فراش نہیں ہو جاتے انتہائی پابندی سے وقت پر اپنے دفتر واقع لاٹوش روڈ لکھنؤ آتے ہیں اور رات گئے تک کام کرتے رہتے ہیں۔

○ غالب اکیڈمی نئی دہلی

ھندستان کے قلب شہر دہلی کے وسط میں محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء اور طوطیٔ ہند حضرت امیر خسرو کے مزار اور دوسری تاریخی عمارتوں کے جھرمٹ میں مرزا غالب کی ابدی آرام گاہ سے بالکل متصل غالب کے عہد اور اس دور کی تہذیب و معاشرت کا فعال و متحرک، بامقصد ادارہ غالب اکیڈمی، ہمدرد کے واقف متولی جناب حکیم عبدالحمید صاحب کا ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جو اردو زبان کے رشتے سے علمی و ادبی تاریخ میں آپ ہی اپنی مثال ہے اور موصوف کے ایک پرانے خواب کی خوب صورت تعبیر ہے۔

غالب اکیڈمی کے بانی صدر جناب عبدالحمید صاحب کو شروع سے ہی غالبیات سے غیر معمولی دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۵ء میں حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم اور آنجہانی پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی معیت میں غالب پر ٹھوس کام کرنے کے فیصلہ کے ساتھ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک قطعہ زمین بھی خرید لیا تھا لیکن ان دنوں چند ناگزیر حالات کی بنا پر ان کی اسکیم پر عمل نہ ہو سکا۔ لیکن ۳۳ سال بعد مرزا غالب کی صد سالہ برسی کے پروگرام نے ان کے اس پرانے تصور میں نئی زندگی اور نئی روح پیدا کر دی اور انہوں نے تین چار ماہ کے اندر ہی حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ اپنی شبانہ روز کاوش اور جدّوجہد سے اس دیرینہ تصور کو عملی جامہ پہنا دیا۔ چنانچہ ۲۲؍ فروری ۱۹۶۹ کو ۶ بجے شام اکیڈمی کی خوبصورت عمارت کا افتتاح صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ اکیڈمی کے افتتاح سے متعلق تقریب بھی اپنی مثال آپ ہی تھی جس کا اہتمام اکیڈمی سے متصل عرس محل میں کیا گیا تھا۔

دلی کی تاریخی بستی حضرت نظام الدین میں تین سو ساٹھ مربع گز قطعہ زمین پر غالب اکیڈمی کی چار منزلہ عمارت کی ترتیب و تزئین کا لطیف احساس گو دیکھنے والے کو بیرونی نظارہ سے ہی ہو جاتا ہے لیکن جب وہ اس میں منزل بہ منزل گھومتا ہے تو اسے آرائش جمال کی رعایت نظر آتی ہے۔

جہاں تک اکیڈمی کی ترتیب و تزئین کا تعلق ہے اس کے تہ خانہ میں آرٹ گیلری، گراؤنڈ فلور پر آڈیٹوریم اور دفتر، پہلی منزل میں آڈیٹوریم کی شہ نشین اور کنٹرول روم، دوسری منزل میں لائبریری، ریڈنگ روم اور شعبۂ فروخت کتب، تیسری منزل میں غالب اور ان کے عہد پر ایک میوزیم اور چوتھی منزل میں اردو کتابت اور خطاطی کا اسکول قائم ہے۔

آرٹ گیلری میں غالب کے اشعار پر ملک کے مشہور آرٹسٹوں کی بنائی ہوئی بیس عدد پینٹنگس رکھی گئی ہیں۔ اکیڈمی کے آڈیٹوریم میں دو پردوں پر مشتمل اسٹیج اور دو سو دس نشستوں کا انتظام ہے۔ اکیڈمی چونکہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے دہلی اور نئی دہلی کے وسط میں واقع ہے اس لیے اکیڈمی کا آڈیٹوریم نئے اور پرانے شہر کی ادبی و ثقافتی ضرورتوں کو کماحقہٗ پورا کر رہا ہے۔ اکیڈمی کی اپنی تقاریب اور پروگراموں کے علاوہ دوسرے اداروں اور تنظیموں کے جلسے بھی یہاں ہوتے ہیں۔

دوسری منزل میں اکیڈمی کی لائبریری ہے جہاں اس وقت تک کوئی ۵ ہزار کتابیں ہیں۔ ان کتابوں میں غالب اور غالبیات کی قدیم و جدید کتابیں، اخبارات و رسائل کے غالب نمبر اور غالب صدی کے موقع پر شائع ہونے والے سووینیرز بھی شامل ہیں ان کے علاوہ غالب سے متعلق مختلف موضوعات پر تقریباً ۲۰۰ فائل بھی کھولے گئے ہیں۔ لائبریری کے لیے کتابوں کے حصول میں کتابوں کی خریداری کے علاوہ وقتاً فوقتاً انگریزی اردو اخبارات میں غالب کے مدّاحوں سے اس امر کی بھی اپیل کی جاتی ہے، تاکہ غالب پر زیادہ سے زیادہ میٹریل جمع ہو سکے۔

جہاں تک اکیڈمی کے اشاعتی پروگرام کا تعلق ہے اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکیڈمی میں تحقیق و اشاعت کا کام بتدریج

اضافہ پذیر ہے اور یہ بات باعث مسرت ہے کہ اردو ادب میں اکیڈمی کی مطبوعات کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ اکیڈمی کی مطبوعات فی الحال تین شاعروں پر مشتمل ہیں۔ ۱۔ غالب، ۲۔ اقبال، ۳۔ مومن؛

اکیڈمی کی مطبوعات کے علاوہ اردو کی ترویج و ترقی کے لیے اکیڈمی میں قائم اسکول" خطاطی اور اردو ٹائپ" خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ جس میں اردو ٹائپ، اردو شارٹ ہینڈ اور کتابت اور خطاطی کی باضابطہ کلاسیں منظور شدہ نصاب کے مطابق ہو رہی ہیں۔

اردو ٹائپ رائٹنگ کلاس

یہ کلاس ستمبر ۱۹۷۳ سے چل رہی ہے اس کلاس کے سلسلے میں یہ بات غیر معمولی طور پر قابل اطمینان ہے کہ اس کلاس کے ذریعہ نہ صرف اردو بلکہ فارسی، سندھی، پشتو، کشمیری اور عربی ٹائپسٹوں کی قلت پر بھی قابو پایا جا رہا ہے۔

اردو کتابت کلاس

ترقی اردو بیورو کے تعاون سے اردو کتابت کی دو سالہ تربیتی کلاس مئی ۱۹۷۴ سے اکیڈمی میں قائم ہے۔ اس کلاس کے ذریعہ اب تک جو طلبا تربیت پا چکے ہیں وہ سب بارو زگار ہو چکے ہیں۔

خطاطی کلاس

یہ کلاس یکم نومبر ۱۹۷۶ سے قائم ہے۔ اس طرح اسے قائم ہوئے یہ پانچواں سال ہے۔ یہ کلاس معیاری کاتبوں کی اعلیٰ تربیت کے لیے دو سالہ خصوصی نصاب پر مشتمل ہے۔ اور پانچ طلبا پر مشتمل ہے۔

اردو شارٹ ھینڈ

ملک کے مختلف سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں اور تعلیمی اداروں میں ایسے لوگ درکار ہیں جو اردو مختصر نویسی میں اچھی رفتار رکھتے ہوں، لہٰذا اس ضرورت کے پیش نظر وزارت تعلیم کے اشتراک سے یکم مارچ ۱۹۷۷ سے ایک سالہ کورس پر مشتمل اردو شارٹ ہینڈ کلاس شروع کی گئی ہے۔

اکیڈمی کے دوسرے شعبوں کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکیڈمی کے قیام سے اب تک اس بارہ سال کی مدت میں یعنی ۲۲ر فروری ۱۹۶۹ سے ۱۹۸۱ تک اسٹاف کی نہایت کمی اور سرمایہ و وسائل کی قلت کے باوجود اکیڈمی میں جو کام ہوئے ہیں اور اسے ادب و ثقافت کا فعال مرکز بنانے کے لیے جو کوششیں کی گئی ہیں انہیں علمی و ادبی حلقوں میں پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بات موجب تشکر و امتنان اور باعث مسرت ہے کہ علامہ اقبال کا پیغام "شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن" حرف بہ حرف پورا ہو رہا ہے۔

○ کتب خانہ عزیزیہ دہلی

مفتی اعظم حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے داماد مولانا محمد سمیع اللہ قاسمی ؒ نے اپنی پر جوش سیاسی زندگی کے ساتھ ساتھ مارچ ۱۹۳۷ء میں کتب خانہ عزیزیہ کی بنیاد رکھی مولانا عالم اسلام کے عظیم مرکز دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل تھے اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ سے بیعت تھے اور والہانہ محبت کرتے تھے۔

انگریز سامراج کے خلاف ملک میں علمائے ہند نے میدان جہاد قائم کیا تھا مولانا بھی اس کے ایک جانباز سپاہی تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے معتمد تھے۔ پنڈت جی نے مولانا کو نہایت معقول مشاہرہ پر اپنے ساتھ وابستہ رہنے کی پیش کش کی مگر مولانا نے اس کو یہ کہتے ہوئے قبول نہیں کیا کہ میں شادی کر چکا ہوں۔ اپنے اہل و عیال کی کفالت کے لیے تجارت کروں گا اور سیاست کے میدان میں اپنے بزرگوں کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ سیاسی میدان کے علاوہ مولانا کی زندگی کا ایک روشن پہلو ان کی ادبی اور شعری سرگرمیاں تھیں جن کا مرکز خود ان کی دکان تھی۔ خود ادیب اور شاعر نہ ہوتے ہوئے شعر و ادب میں بے حد دلچسپی رکھتے تھے۔

یادگار داغ نواب سائل دہلوی، بیخود دہلوی، اور علامہ راز دہلوی کے علاوہ حسرت موہانی، احمق پھپھوندوی، ماہر القادری، شکیل بدایونی، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی پنڈت ہری چند اختر، بسمل سعیدی ٹونکی، نریش کمار شاد، قتیل شفائی، احسان دانش حفیظ جالندھری، مالک رام، روش صدیقی، ساغر نظامی، کامل نظامی دھرم پال گپتا وفا، مخمور سعیدی، جگن ناتھ آزاد، رعنا جگی، عرش ملسیانی نشور واحدی، مجروح سلطان پوری، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر،

انور صابری اور گلزار دہلوی کے علاوہ دہلی کے تمام مشاہیر ادباء اور شعراء مولانا محمد میاں صاحب سے محبت کرتے تھے اور تقسیم ملک سے پہلے بعض مرتبہ رات رات بھر محفلِ شعر و سخن گرم رہتی تھی۔

سیاسی میدان کے شہسواروں میں مولانا ابوالکلام آزاد، نیتاجی سبھاش چندر بوس، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، میر مشتاق احمد، مولانا حفظ الرحمن صاحب، مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی، مولانا احمد سعید صاحب، بیرسٹر آصف علی، پنڈت سندر لال، مولانا عبداللہ فاروقی اور مولانا امداد صابری کی مولانا مرحوم کو رفاقت حاصل رہی۔ مولانا کی دوکان کے باہر ایک لکڑی کی بینچ پڑی رہتی تھی جس پر مشاہیر اور اساتذہ بیٹھتے تھے، یہ بینچ آج بھی پڑی ہوئی ہے اور اسی طرح آج بھی ہر آنے والے کا استقبال کرتی ہے۔

کتب خانہ عزیزیہ کی مطبوعات میں سے خاص اور مشہور زمانہ کتاب تعلیم الاسلام ہے جو حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ رحمۃ کی تالیف ہے۔

یہ کتاب اسلام کے بنیادی عقائد اور روزمرہ پیش آنے والے ضروری مسائل پر مشتمل ہے۔ خدا نے اس کتاب کو جو قبول عام عطا فرمایا ہے وہ بہت کم کتابوں کو نصیب ہوا ہے۔ یہ کتاب دنیا کی تقریباً ہر اہم زبان میں پہنچ چکی ہے۔ کتب خانہ عزیزیہ اس کے اردو، انگریزی، ہندی اور گجراتی ایڈیشن شائع کر رہا ہے۔ اور دوسری ہندستانی زبانوں میں شائع کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس کتاب کے جملہ حقوق محفوظ ہیں لیکن اس کی مقبولیت اور زبردست فروخت کو دیکھتے ہوئے بعض غیر ذمہ دار تاجروں نے جعلی ایڈیشن شائع کیے جن کے خلاف کاپی رائٹ ایکٹ کے تحت کارروائی کی جا رہی ہے۔

اس کتاب کے علاوہ دوسری بنیادی دینی کتابیں مثلاً میری نماز، جواہر الایمان، ہمارا کلمہ، جنت کا ٹکٹ، ہر دل عزیز نماز، مکمل مترجم لیسنا القرآن، قاعدے، پارے وغیرہ کتب خانہ عزیزیہ کی مقبول عام و خاص مطبوعات ہیں۔ علاوہ ازیں یہ کتب خانہ ہندستان کے تقریباً تمام مشہور دینی اداروں کی مطبوعات اسٹاک کر کے اپنے خریداروں کو مہیا کرتا ہے۔

۱۹۴۸ء میں شکیل بدایونی کا مجموعہ کلام "دعنائیاں" پہلی بار کتب خانہ عزیزیہ نے شائع کیا۔

[redacted]

○ بہار اردو اکادمی ۔ پٹنہ

اردو زبان و ادب کی ہمہ جہت ترقی اور فروغ کے لیے مارچ میں درج ذیل اغراض و مقاصد کے تحت بہار اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ان مقاصد کی تکمیل کے لئے اکادمی ابتدا سے ہی برسرِ عمل ہے۔

اردو میں ادبی و علمی اہمیت کی طبع زاد کتابیں تیار کرانا اور انہیں شائع کرنا، ادب، سائنس اور دوسرے موضوعات پر دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرانا۔ بہار کے قدیم اردو ادب کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں پر ان کے مصنفین کو ہر سال انعام دینا، بہار کے شعراء اور مصنفین کو ان کی تخلیقات کی کتابی صورت میں اشاعت کے لیے مالی تعاون پیش کرنا، ریاست کے عوامی کتب خانوں کو، اردو کتابوں، رسالوں اور اخباروں کی خریداری نیز دیگر اخراجات کے لیے مالی امداد دینا، بہار کے ضرورت مند شعراء اور مصنفین کو مالی امداد مہیا کرنا، اردو ادب کی مسلسل خدمات کے اعتراف کے طور پر بہار کے اردو شاعروں اور ادیبوں کو خصوصی ایوارڈ پیش کرنا ساتھ ہی اردو کے ایسے ادیبوں اور شاعروں کو بھی ایوارڈ پیش کرنا جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ سیمینار، مذاکرے اور مشاعرے وغیرہ منعقد کرانا۔

• بہار اردو اکادمی سال بہ سال نئے نئے منصوبوں کو بروئے کار عمل لا کر اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کی سمت قدم بقدم آگے بڑھ رہی ہے۔ درج بالا مستقل اسکیموں کے علاوہ گذشتہ دو برسوں میں جو نئی منصوبہ بندی ہوئی ہے اس کا مختصر ساخاکہ حسب ذیل ہے۔

<u>اردو ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ تربیتی مرکز کا قیام :</u>
اس تربیتی مرکز کے قیام سے متعلق تمام مراحل طے پا چکے ہیں۔ اردو ٹائپ رائٹرز درآمد کر لیے گئے ہیں اور ان شاء اللہ ۱۰ فروری ۱۹۸۴ء سے یہ مرکز کام کرنے لگے گا۔ پہلے بیچ میں تیس طلباء و طالبات کو داخلہ دیا جا رہا ہے۔

طباعت واشاعت کے معیار میں بلندی اور کام میں تیزی:

طباعت واشاعت کے کاموں میں معیار اور تیزی لانے کے لیے اکیڈمی میں ابھی ایک جے پی آفسیٹ مشین درآمد کی گئی ہے اور ایک بڑی کامپیوٹ مشین کی خریداری کے لیے ہندستان کی مشہور کمپنی ایچ ایم ٹی کو ۱۰۷/۶۰ ایڈوانس کے ساتھ آرڈر دے دیا گیا ہے یہ پروجیکٹ تقریباً ۱۵ لاکھ روپے کے صرفہ سے ۱۹۸۳ء کے اواخر تک مکمل ہو جائے گا۔

سہ لسانی لغت کی تدوین اور اشاعت:

اب تک اردو میں جو لغت دستیاب ہیں وہ دو زبانوں کے ہیں۔ اکادمی سہ لسانی لغت تیار کر رہی ہے اور اس سمت میں تیزی سے پیش رفت ہو رہی ہے۔ اس کی اشاعت سے ترجمہ کے کاموں میں بڑی آسانی ہوگی۔ اس کی پہلی جلد وسط ۱۹۸۲ء تک مکمل ہو جائے گی جس میں انگریزی سے اردو پھر ہندی کے معنی ہوں گے۔

توضیحی لغت برائے ڈاکٹریٹ مقالات:

ہندستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں ڈاکٹریٹ ڈگریوں (اردو) کے لیے اب تک جتنے مقالے منظور ہوئے ہیں ان کی ایک توضیحی لغت مرتب کرنے کا کام نصف سے زیادہ مکمل کر کے شائع کر دیا جائے گا۔

فن خطاطی کا تحفظ اور اس کی ترویج:

گذشتہ چھ برسوں سے اکادمی فن خطاطی کی تربیت کے لیے ایک تربیتی مرکز حکومت ہند کے ترقی اردو بورڈ کے مالی تعاون سے چلا رہی ہے۔ پہلے صرف ۲۰ لڑکوں کو تربیت دی جاتی تھی لیکن اب گذشتہ برسوں سے اس تعداد میں اضافہ کر کے بیس خواتین کی تربیت کا کام بھی شروع کرایا گیا ہے زیر تربیت طلبا و طالبات کو ایک سو روپے ماہوار اسٹائپنڈ بھی دیا جاتا ہے۔

اکیڈمی کی نئی عمارت

اکادمی کے صدر محترم کی سعی جمیلہ اور اردو دوست وزیر اعلا بہار کی عنایتوں کی وجہ سے اکادمی کو ریاستی حکومت نے ایک معقول قطعہ اراضی دینے کی حامی بھر لی ہے انشاءاللہ جلد ہی یہ زمین حاصل ہو جائے گی اور عمارت کی تعمیر کی طرف پیش قدمی جا سکے گی تاکہ اکادمی جلد سے جلد اپنی عمارت میں منتقل ہو سکے۔ ہمارا بنیادی منصوبہ یہی ہے کہ اردو کی تعلیم اور اس کے چلن کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور اس قومی ورثہ کے ہم صرف امین نہ کہلائیں بلکہ اسے فروغ دینے والوں میں بھی ہمارا نام ہو۔

○ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی کا نام ہی کتاب کے اعلا اور معیاری ہونے کی ضمانت ہے۔ اس ادارہ نے نہ صرف اعلا پایہ کی ادبی کتابیں شائع کی ہیں بلکہ طباعت اور پیشکش کا بھی ایسا معیار قائم کیا ہے، جو دوسروں کے لیے لائق رشک ہے۔ یہ اشاعتی ادارہ اپنے پروپرائٹر محمد مجتبیٰ خاں یوسف زئی کے اعلا ادبی ذوق اور انتہائی بالیدہ جمالیاتی احساس کا ترجمان ہے۔ پچھلے چند برسوں میں اس ادارہ نے متعدد ایسی کتابیں شائع کی ہیں کہ ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں ان مطبوعات کی دھوم مچ گئی ہے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کا ایک خاص کارنامہ تقریباً ایک درجن چھوٹے بڑے سائز کی باتصویر لغات کی اشاعت ہے۔ یہ لغات انگریزی اردو، اردو انگریزی، عربی اردو اور اردو عربی زبانوں پر مشتمل ہیں تقریباً پچاس ہزار اردو الفاظ و محاورات کی آسان تشریح اور موزوں ترین متبادل مہیا کیے گئے ہیں ہر ہر لفظ پر اعراب لگائے گئے ہیں تاکہ صحیح تلفظ کیا جا سکے۔ تمام اہم مقامات اور اشیا وغیرہ کی ان گنت تصاویر نے ان لغات کو مزید اہم اور یادگار بنا دیا ہے یہ لغات بلاشبہ زبردست افادیت کی حامل ہیں اور ان کے کئی کئی اڈیشن نکل چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب "تاریخ ادب اردو"، "ارسطو سے ایلیٹ تک"، "ایلیٹ کے مضامین" اور "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" بھی اس ادارہ سے ہندستان میں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ پچھلے سال پروفیسر

گوپی چند نارنگ کی معرکہ آرا تالیفات' اردو افسانہ روایت اور مسائل' اور 'انیس شناسی' کو بھی شائع کرنے کا فخر اس ادارہ کو حاصل ہوا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی کتاب 'اقبال سب کے لیے' بھی پچھلے سال اسی ادارہ سے شائع ہوکر خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ ان کے علاوہ سر سید احمد خاں کا 'سفرنامہ پنجاب' مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی اور متاع سخن مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق بھی اسی ادارے کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہیں۔ زیر تکمیل اشاعتی پروگرام میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو کی دوسری جلد قدیم اردو لغت، دیوان نصرتی اور میر تقی میر پر پوری کتاب کا اعلان کیا جا چکا ہے پروفیسر گوپی چند نارنگ مرتبہ اقبال کا فن بھی عنقریب منظر عام پر آئے گی۔ اس کے علاوہ یہ ادارہ انجمن ترقی اردو ہند، ترقی اردو بیورو، نیشنل بک ٹرسٹ، پبلی کیشنز ڈویژن اور کئی دوسرے علمی اور ادبی سرکاری و نیم سرکاری اداروں، انجمنوں اور ادبی مرکزوں کا خصوصی تقسیم کار بھی ہے اور ان تمام اداروں کی کتابیں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس سے مل سکتی ہیں۔

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے مالک محمد مجتبیٰ خاں ۳۰ر مئی ۱۹۳۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ دریا گنج میں رہائش تھی اور نئی سڑک پر دکان تھی۔ ۱۹۴۷ء میں جب کوچہ پنڈت میں منتقل ہوتے تو دکان بھی چھوڑنی پڑی۔ معاشی حالات بے حد خراب تھے۔ مجبوراً تعلیم چھوڑ کر نئی سڑک پر کتابوں کی ایک دکان میں ملازمت اختیار کر لی اور پرائیویٹ طور پر تعلیم کا ذوق بھی پورا کرتے رہے۔ آبائی پیشہ تجارت تھا۔ اس لیے ملازمت کا سلسلہ ایک ہی دکان تک محدود نہیں رکھا بلکہ کئی جگہ ملازمت کر کے کاروباری تجربہ حاصل کیا۔ اس کے بعد سب سے پہلے سکنڈ ہینڈ کتابوں کی خرید و فروخت کا کام شروع کیا۔ کھیل کود کا شوق اسکول کے زمانے سے تھا چنانچہ زندگی کی جدوجہد کا مقابلہ کرنے میں اس سے مدد ملی۔ آٹھ سال تک فٹ بال کے کھلاڑی رہے۔ پہلوانی کا شوق بعد میں باڈی بلڈنگ میں بدل گیا اور اس میں اتنی ترقی کی کہ دو مرتبہ مسٹر دہلی، دو بار مسٹر نارتھ انڈیا اور ۱۹۷۰ء میں مسٹر انڈیا منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۰ء ان کی زندگی کا نیا موڑ ہے۔ اسی سال انہوں نے کتابوں کی طباعت و اشاعت کا کام شروع کیا۔ ابتدا میں دوسرے پبلشروں کیلیے کتابیں چھپواتے رہے، ۱۹۷۶ء میں ان کے تایازاد بھائی اور اردو کے مشہور مؤرخ ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب' تاریخ ادب اردو' جلد اول پاکستان میں شائع ہوئی تو ڈاکٹر جالبی کے مشورے پر اس کتاب کے ساتھ ہندستان میں انہوں نے اردو ادب کی دوسری کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس سلسلے کا نام ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس رکھا۔ محمد مجتبیٰ خاں نے ۱۹۷۱ء میں فوٹوگرافی سیکھی تھی۔ فوٹوگرافی کی یافت سے وہ کتابیں شائع کرنے میں بھی مدد لیتے ہیں اور کتاب کو حسین و جمیل بنانے میں بھی۔ چنانچہ انہوں نے اردو کتابوں کی کساد بازاری کے دور میں کتابوں کو معیاری شان اور پرکشش گٹ اپ سے شائع کرنے کی ایسی روایت قائم کر کے دکھائی جس کی دوسروں کو بھی پیروی کرنی چاہیے کیونکہ اردو ایشیا کی اہم زبان ہے اور اس کی کتابیں اسی طرح شائع ہونی چاہئیں جیسے دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی شائع ہوتی ہیں۔

اردو دنیا میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کی مطبوعات کی جو پذیرائی کی گئی ہے اور مجتبیٰ خاں کے کام کا جن الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے ان میں سے صرف ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ پچھلے سال پاکستان کے ممتاز محقق اور نقاد ڈاکٹر فرمان فتحپوری چند روز کے لیے ہندستان کے دورے پر تشریف لائے تھے، واپس جاکر نگار میں اپنے تاثرات بیان فرماتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا:

'مسٹر انڈیا کی عمر چالیس سے اوپر ہے لیکن تیس سے بھی کم لگتے ہیں۔ بیوی بچے والے آدمی ہیں اور جملہ ذمہ داریوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ قد اگرچہ دبتا ہوا ہے لیکن چہرے پر ہمہ وقت کھیلتی ہوئی مسکراہٹ اور صحت مند جسم کی شادابی نے ان کی شخصیت کو دل آویز اور پر وقار بنا دیا ہے۔ فوٹوگرافی ان کا شوق ہے اور کتابوں کی طباعت و اشاعت ان کا ذریعہ

معاش۔ دونوں شعبوں میں ان کے ذوق جمال اور نفاست طبع کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ چنانچہ ان کی کھینچی ہوئی تصویریں اور ان کی چھاپی ہوئی کتابیں ان کے تشخص کا وسیلہ بن گئی ہیں اور پورے ملک میں شہرت رکھتی ہیں۔

○ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی

موڈرن پبلشنگ ہاؤس کا قیام ستمبر ۱۹۷۹ء میں ہوا۔ اس ادارے نے جو پہلی کتاب شائع کی وہ شاہد احمد دہلوی کی "چند ادبی شخصیتیں" ہے۔ اس میں معروف شخصیتوں کے خاکے ہیں جنھیں "ماہنامہ ساقی" کے مدیر شاہد احمد دہلوی نے دلی کی ٹکسالی زبان میں لکھا ہے۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس پریم گوپال متل کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے جو اردو کے مستند اور صاحب الرائے ادیب اور شاعر گوپال متل کے فرزند ہیں۔ خدمت اردو کی لگن پریم صاحب کو ورثے میں ملی ہے۔ ظاہر ہے کہ موڈرن پبلشنگ ہاؤس کا قیام اسی لگن کا نتیجہ ہے ورنہ موجودہ حالات میں اردو کتب کی اشاعت سے کسی فوری منافع کی تو کیا امید ہو سکتی ہے یہ توقع بھی بمشکل ہی کی جا سکتی ہے کہ مسلسل محنت کے بعد کاروباری لحاظ سے کوئی خاص کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ بہر حال پریم گوپال متل اپنی دھن میں مست ہیں اور کیوں نہ ہوں آخر اس باپ کے بیٹے ہیں جسے بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے ہندستان میں اردو کا سرگرم ترین حامی قرار دیا تھا۔

موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۲۸ ماہ کی مختصر مدت میں اب تک ۴۴ کتابیں شائع کر چکا ہے، اور ان میں سے کئی کتابیں ایسے اہم موضوعات پر ہیں جن کی طرف کسی اشاعتی ادارے نے توجہ مبذول نہیں کی تھی یہاں تک کہ پاکستان میں بھی جہاں اردو کو قومی زبان کی حیثیت حاصل ہے، ان موضوعات پر کتابی صورت میں اب تک کچھ شائع نہیں ہوا ہے۔ یہ موڈرن پبلشنگ ہاؤس ہی ہے جس نے سب سے پہلے اردو میں میراجی (میراجی — شخصیت اور فن: مرتبہ کمار پاشی) اور منٹو (منٹو — شخصیت اور فن: مرتبہ پریم گوپال متل) پر کتابی صورت میں قابل قدر مواد مہیا کیا اور لوگوں کی توجہ ان اچھوتے موضوعات کی طرف مبذول کرائی۔ ان کتابوں کی اشاعت پر پاکستان کے مشہور مصنف اور رسالہ "اوراق" کے فاضل مدیر ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے ایک خط میں پریم گوپال متل کو لکھا ہے:

"مجھے میراجی اور منٹو پر آپ کی شائع کردہ دونوں کتابیں مل گئی ہیں سالنامہ "اوراق" میں ان پر تبصرہ شائع ہوگا۔ کتابیں بہت خوبصورت چھپی ہیں۔ مواد کے اعتبار سے بھی کتابوں کا معیار بہت بلند ہے۔ فی الواقعہ آپ لوگ بھارت میں اردو زبان اور اردو ادب کی گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ وہاں اردو کے چند بڑے ستونوں میں سے ہیں۔ مبارکباد"

میراجی اور منٹو کے ساتھ ہی ساتھ شخصیات پر ن۔م۔ راشد (ن۔م۔ راشد — شخصیت اور فن: مرتبین ڈاکٹر مغنی تبسم اور ڈاکٹر شہریار) ساحر لدھیانوی (ساحر لدھیانوی — ایک مطالعہ: مرتبہ مخمور سعیدی) اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی کتاب "آنکھیں ترستیاں ہیں" (خاکے) شامل ہے اور پاکستانی مصنفین میں ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کا مجموعہ "چوری سے یاری تک" اور "تنقید اور مجلسی تنقید" (تنقیدی مضامین)، پروفیسر نظیر صدیقی کی "میرے خیال میں" (تنقیدی مضامین) اور آمنہ صدیقی کی مرتبہ "افکار عبدالحق" بھی ہیں۔

پاکستان اور ہندستان میں یہ وبا عام ہے کہ پبلشر مصنفین سے اجازت لیے بغیر ان کی کتابیں شائع کر دیتے ہیں۔ ہندستانی پبلشر پاکستانی کتابیں اور پاکستانی پبلشر ہندستانی کتابیں — موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے اس سلسلے میں بھی بہت اچھی مثال قائم کی ہے یہ پاکستانی مصنفین کی کتابیں مصنفین یا ناشرین کی اجازت سے شائع کرتا ہے۔ "انتظار حسین کے سترہ افسانے" کے عنوان سے جو کتاب شائع ہوئی ہے اس میں انتظار حسین کے اجازت نامے کا عکس شامل ہے (اور غالباً ہندستان میں اجازت نامے کے ساتھ شائع ہونے والی یہ پہلی کتاب ہے) انتظار حسین اپنے اجازت نامے میں لکھتے ہیں:

"مجھے کتنی خوشی ہے کہ میرے افسانوں کا مجموعہ ہندستان میں شائع ہو رہا ہے۔ پریم گوپال متل کی مہربانی سے پہلی مرتبہ مجھے یہ شرف مل رہا ہے کہ میرا کوئی مجموعہ ہندستان میں شائع ہو رہا ہے۔ اس واسطے اب میری ملاقات نئے قارئین سے ہوگی اندے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ لکھنے والے کو کیا چاہیے، اچھے قارئین۔"

موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے ہر موضوع پر کتابیں شائع کی ہیں

شاعری، افسانہ، ناول، خاکہ انشائیہ، ڈرامہ، ان سب کا ذکر یہاں طوالت کا باعث ہوگا۔ یہاں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ پریم گوپال متل کو اردو سے جو محبت ورثے میں ملی ہے۔ اس کے تقاضوں کو وہ انہماک اور خاموشی سے پورا کر رہے ہیں۔ امید رکھنی چاہیئے کہ موڈرن پبلشنگ ہاؤس کی مطبوعات کی فہرست طویل سے طویل تر ہوتی جائے گی اور یہ ادارہ ہمیں ہندستان اور پاکستان کے مصنفین کی بہترین کتابیں مہیا کرتا رہے گا۔

○ دی کلچرل اکیڈمی (گیا)

آج ہندستان میں سرکاری اردو اکاڈمیاں بہت سی ریاستوں میں قائم ہو چکی ہیں جن پر سرکار لاکھوں روپے خرچ کر رہی ہے۔ سرکار کی سرپرستی میں چلنے والی یہ اردو اکیڈمیاں اپنے اپنے طور پر اردو کے لیے جو کچھ کر رہی ہیں اس کی خبر عوام تک پہونچتی رہتی ہے۔ ان کے کاموں کو مشتہر کرنے کے ذرائع بھی لامحدود ہیں۔

دی کلچرل اکیڈمی گیا کے قیام کا خیال اردو کے ان اکیڈمیوں کی پیدائش سے بہت پہلے جناب کلام حیدری کے ذہن میں آیا۔ انہوں نے نہ تو سرکاری امداد کی پشت پناہی کے بارے میں سوچا اور نہ ریاست بہار کی سرکار نے توجہ دلانے کے باوجود اس کی مدد کی جانب توجہ کی۔ درد دیش تو درد دیش ہوتا ہے اور جنوں کے امکانات کی وسعت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس لیے کلام حیدری نے محض چند معاونین کے سہارے کلچرل اکیڈمی (گیا) کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہفتہ وار "مورچہ" کا بھی اجرا کیا اردو پڑھنے والوں کو اس کا علم ہے کہ "مورچہ" پابندئ وقت کے ساتھ نہ صرف آج تک نکل رہا ہے بلکہ اس کے صفحات پر تاریخی ادبی مباحث بھی آج تک محفوظ ہیں۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد دی کلچرل اکیڈمی نے ماہنامہ "آہنگ" شائع کرنا شروع کیا۔ جس کی خدمات کا اعتراف ہندو پاک کے ادبی حلقوں نے منصفانہ اور فراخدلانہ طور پر کیا ہے۔ دی کلچرل اکیڈمی کے زیر اہتمام ملک کے مشاہیر شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کی درجنوں کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں جن میں کلیم الدین احمد، خلیل الرحمان اعظمی اور غیاث احمد گدی جیسے بہتیرے نام ہیں۔ کلچرل اکیڈمی نے اپنے ادبی رسالے "آہنگ" کے ذریعہ کئی باصلاحیت افسانہ نگاروں کو روشناس کرایا جو آج اردو افسانہ نگاری میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ یہ سودا گیا جیسی چھوٹی جگہ میں بہت مہنگا پڑا اور پڑ رہا ہے لیکن دی کلچرل اکیڈمی (گیا) لاکھوں روپے کے سہارے چلنے والی سرکاری اردو اکیڈمیوں کے مقابلے میں خدمات کے اعتبار سے سربلند ہے۔ سودا چاہے کتنا گراں پڑے کلام حیدری جیسے سودائی کو کب فکر ہوتی ہے کلچرل اکیڈمی کا اپنا پریس بھی ہے اور اشاعتی پروگرام کو تیزی سے پورا کرنے کی ہر سال کوشش کی جاتی ہے۔ ۸۲ء میں بھی اس ادارہ سے کئی اہم اور اچھی کتابیں شائع ہونے والی ہیں۔ ۱۹۸۲ء سے کلچرل اکیڈمی ۸۱ء کی مطبوعہ کتابوں کو نقد انعامات کا سلسلہ شروع کر رہی ہے۔ فی الحال پانچ ہزار روپے سالانہ تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

○ اسٹار پبلی کیشنز دہلی

ہندستان کی کتابی دنیا کا جہاں بھی ذکر آتا ہے وہاں اسٹار کا حوالہ جیسے ایک ضروری ہے۔ نہ صرف اردو کتابوں کی اشاعت میں بلکہ اس سے زیادہ اردو کتب کی غیر ممالک میں ایک نئی مارکیٹ بنانے کے نقطۂ نظر سے اسٹار پبلی کیشنز کا ایک اہم مقام ہے۔ آج اسٹار پبلی کیشنز کا ادارہ تین طرح سے اردو ادب اور اردو اشاعت کی خدمت کرنے میں سب سے آگے ہے۔

(۱) کم قیمت کی اسٹار پاکٹ بکس کے ذریعہ ہندستان اور غیر ممالک کے اردو قارئین کی خدمت۔

(۲) نئی دہلی میں ایک خوبصورت شوروم کے ذریعہ پورے ہندستان کی مطبوعات کی نمائش و تقسیم۔

(۳) ہندستان سے باہر تقریباً تیس ممالک میں اردو کتابوں کی تقسیم۔

اسٹار پبلی کیشنز کا قیام آج سے تقریباً ۲۳ برس پہلے ۱۹۵۸ء میں پرانی دہلی کی ایک تنگ گلی، گلی گڑھیا میں عمل میں آیا تھا جب پہلی مرتبہ اردو کی کم قیمت کی پانچ اسٹار پاکٹ بکس جن کی قیمت صرف ایک روپیہ فی کتاب تھی پیش کی گئیں۔ ساحر لدھیانوی، گلشن نندا، شکیل بدایونی جیسے مقبول اردو ادیبوں کی تصانیف اتنی معمولی قیمت پر پیش کرنے سے یہ ادارہ بہت کم وقت میں ہندستان کے اردو قارئین کے حلقہ میں مقبول ادارہ بن گیا۔ اور پھر اردو اسٹار پاکٹ بکس کا یہ سلسلہ باقاعدگی سے اشاعتی دنیا میں اپنا قدم جماتا گیا۔ چند ہی برس میں اسٹار پاکٹ بکس (اردو) کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچی اور ہند و پاک کے تقریباً تمام مقبول اردو مصنفین کی تصانیف اس سیریز میں پیش ہونے لگیں۔

نہ صرف اسٹار پاکٹ بکس میں بلکہ لائبریری ایڈیشن کی مجلد کتابوں میں بھی اس ادارہ کی طرف سے تقریباً ہر ماہ نئے اردو مطبوعات پیش کی جانے لگیں اور دس برس سے بھی کم مدت میں یہ ادارہ ایک مخصوص مقام حاصل کرکے اردو اشاعتی دنیا میں ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کرتا گیا۔ پاکٹ بکس کے علاوہ اس ادارہ نے تقریباً سب ہی مقبول و معروف ادیبوں کی تصانیف مجلد لائبریری ایڈیشن بھی پیش کی ہیں۔

اس ادارہ کا ایک اور کارنامہ دہلی اور نئی دہلی میں اردو کتب کی تقسیم کے لیے ایک خوبصورت شوروم قائم کرنا بھی ہے۔ آج نئی دہلی کے بارونق علاقے آصف علی روڈ میں ادارہ کی جانب سے اردو کتب کا ایک شوروم ہے جہاں نہ صرف اردو کتب بلکہ ہندی، پنجابی، گجراتی، بنگالی اور انگریزی کتب کا عظیم ذخیرہ ہے۔ یہ شوروم یورپ میں کتابوں کے شوروم کی طرز پر ہندستان بھر میں شاید پہلا اور واحد شوروم ہے جہاں کتب کے ساتھ ساتھ اسٹیشنری، گریٹنگ کارڈس اور بچوں کی کتب بھی فروخت کی جاتی ہیں۔

اسٹار پبلی کیشنز کا ایک اور اہم خدمت اردو کتابوں کی برآمد ہے۔ آج اس ادارے کی طرف سے دنیا کے تقریباً پچاس ممالک کو ہندستانی مطبوعات بھجوائی جاتی ہیں جن میں اردو کتب کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ ہندستان بھر میں شاید یہ واحد ادارہ ہے جو ہر سال لاکھوں روپے کی اردو کتب غیر ممالک میں بھجوا کر نہ صرف اردو زبان و ادب کی عظیم خدمت انجام دے رہا ہے بلکہ قیمتی غیر ملکی کرنسی بھی ملک کی بہبودی کے لیے کما رہا ہے۔

اس ادارے نے کئی ممالک میں ایسی نمائشوں کا اہتمام کیا ہے جن کی وجہ سے اردو مطبوعات کو دنیا کی عظیم لائبریریوں میں رکھا جانے لگا ہے۔ اس ادارہ کے منیجنگ ڈائریکٹر مسٹر امرناتھ اب تک تقریباً ۳۰ ممالک میں کتب کی برآمد کے سلسلے میں دورہ کر چکے ہیں اور کئی ممالک میں تو ہندستانی کتب کے لیے بالکل نئی مارکیٹ پیدا کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ابھی حال ہی میں وہ چین تشریف لے گئے تھے جہاں انہوں نے ہندستانی مطبوعات کی پہلی نمائش کا اہتمام کیا اور اس طرح اس ملک میں اب بہت بڑی تعداد میں ہندستان کی مطبوعات برآمد کی جا رہی ہیں۔

○ صدیقی اشاعت گھر نئی دہلی

۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک کے تیس سال کا زمانہ اردو والوں کے لیے صبر و استقلال، ان کی ہمت اور جد و جہد کی آزمائش کا زمانہ تھا۔ اردو زبان کی تعلیم کے ساتھ اردو صحافت بھی بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ اردو کتابوں کی اشاعت کی صورت بھی بڑی مایوس کن تھی۔ حق تو یہ ہے کہ اردو کتابوں کی تیاری، طباعت و اشاعت ایک گھاٹے کا سودا متصور ہوتی تھی لیکن اردو والوں کی صفوں میں کچھ ایسے مشاہیر بھی تھے جو قوم اور ملت کا درد محسوس کرتے تھے۔ جو سوچتا ہوا ذہن رکھتے تھے۔ جو اپنی زبان اور اپنی تہذیب کی فکر کرتے تھے اور اس کی بقا و فروغ کے جتن کرتے تھے۔ اس چاہ اور اس راہ میں انہوں نے زبردست تکالیف اٹھائیں۔ مصائب برداشت کیے اور طرح طرح کی قربانیاں دیں۔ آج جو کچھ ہمارے ورثہ میں آرہا ہے، بنیادی طور پر یہ انھیں بزرگوں کی دین ہے ان مشاہیر میں، مولانا عبدالوحید صدیقی مرحوم کا نام گرامی بھی ایک خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ روزنامہ "نئی دنیا" سے لے کر "ہما"، "ہدیٰ"، "ویکلی نئی دنیا اور صدیقی اشاعت گھر" بابائے اردو صحافت مولانا عبدالوحید صدیقی کی فکر کی دور رسی اور خدمت کی

پختہ کاری کی روشن مثالیں ہیں۔ موصوف کی نگرانی میں یہ ادارہ قائم ہوا اور مولانا کے لائق صاحبزادوں جناب احمد مصطفیٰ صدیقی راہی اور جناب خالد مصطفیٰ صدیقی اور شاہد مصطفیٰ صدیقی کے دیرینہ تجربات، مہارت، سلیقہ مندی اور مستقل مزاجی سے پروان چڑھ رہا ہے۔ آج ہندستان اور ہندستان سے باہر ہزاروں لاکھوں قدردانِ اردو، 'ہما' 'ہدیٰ' اور نئی دنیا جیسے ممتاز رسالوں اور صدیقی اشاعت گھر اور ان کی قابلِ قدر خدمات سے بہ حسن وخوبی واقف ہیں۔ اس ادارے نے اردو صحافت میں ایک نمایاں رول ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اردو کتابوں کی اشاعت اور ان کی پذیرائی کو عام کرنے میں بڑا اہم کردار نبھایا ہے۔

"ہما" اور "ہدیٰ" نے اپنی انفرادی خصوصیات کے ساتھ اور صحافت کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے تاریخ ساز خدمات انجام دے رہا ہے دونوں پرچے نہایت باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ خاص نمبروں کی اشاعت میں تو انہوں نے یادگار خدمات انجام دی ہیں اور معیاری و جامع خصوصی اشاعتوں کا ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔ جو مواد، معلومات، اور آفسیٹ کی دیدہ زیب طباعت و اشاعت کی جدید ٹیکنیک اور نئے معیاروں سے مزین اپنی نظیر آپ ہیں۔

صدیقی اشاعت گھر، اردو دنیا کے چند فعال اور مفید کام کرنے والے اشاعتی اداروں میں سے ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ادارہ مذہبی کلاسیکی، علمی، ادبی اور تاریخی روایات کا علمبردار ہے۔ ساتھ ہی اس نے مختلف ایسے اچھوتے موضوعات پر بھی دلچسپ اور اہم کتابیں شائع کی ہیں جن پر عام طور پر اردو میں کم ہی لکھا جاتا ہے۔ مرتبین اور منتظمین نے بطور خاص اس بات کا خیال رکھا ہے کہ قاری کو عام فہم اور سلیس اردو میں زیادہ سے زیادہ مواد ملے اور ادق و مشکل نکات بھی آسانی سے پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر اپنی وسعت اور گہرائی کے ساتھ واضح ہوتے جائیں۔ بعض کتابوں میں تو تصاویر کے ساتھ موضوع کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اتنے اہتمام اور قرینے سے شائع کی گئی کتابوں کی قیمتیں بھی اردو والوں کی قوت خرید کا لحاظ کرتے ہوئے رکھی گئی ہیں۔ یہ بات آج کی گرانی اور مہنگائی کے زمانے میں صرف صدیقی اشاعت گھر کا ہی حصہ ہے۔ جہاں تک مضامین اور موضوعات کے تنوع کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں انتخاب کے دوران افادیت اور مقصدیت کو ہی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس لیے تاریخی اور مذہبی موضوعات میں "ہمارے پیغمبر"، "مسلمان فاتحین" جیسی کتابوں کے ساتھ ساتھ بیماریوں کا روحانی علاج"، "بڑھاپا اور اس کا علاج"، اور "مغلانی بیگم کا نعمت کدہ" ایسی عوامی زندگی کی دلچسپی اور عام افادیت کی کتابیں بھی ملتی ہیں۔ ان کے علاوہ صدیقی اشاعت گھر کی مخصوص روایات کی کتابیں جیسے "شاہنامہ کربلا"، "کربلا سے کوفہ تک"، "ہمارے نبی"، "اللہ والیاں"، "اسلامی روزے"، "ہماری نماز"، "رہنمائے سفر حج"، "خدا کے دوست"، "کلمہ طیبہ کی برکت اور درود شریف کی فضیلت" جیسی کتب بھی خصوصی اہتمام سے شائع کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ "تعبیر خواب"، "رہنمائے عملیات" جیسی کارآمد مطبوعات بھی اردو کو صدیقی اشاعت گھر کی دین ہیں۔

یہ ساری مطبوعات اندرون ملک اور بیرون ملک میں بڑی دلچسپی سے خریدی اور پڑھی جاتی ہیں بعض کتابوں کی مانگ اتنی ہے کہ ان کے کئی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس ادارے کے پیش نظر مستقبل کا ایک جامع اشاعتی پروگرام بھی ہے۔ اس میں اعلا اور عمدہ کتابوں کی تیاری او اشاعت کے علاوہ ایک اپنی نوعیت کا گونا گوں دلچسپیوں کا مرقع پندرہ روزہ 'خوشنما' کا اجراء بھی شامل ہے، اس طرح یہ ادارہ جناب احمد مصطفیٰ صدیقی راہی اور جناب خالد مصطفیٰ صدیقی جیسے سلجھے ہوئے، اور طباعت و اشاعت کا دیرینہ اور ماہرانہ تجربہ رکھنے والے ذمہ داروں کی نگرانی میں فروغ پا رہا ہے۔ اردو دنیا کو اس قابل اعتماد ادارے سے مستقبل میں بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

○ نصرت پبلشرز۔ لکھنؤ

نصرت پبلشرز پچھلے دس بارہ برسوں سے اردو کی معیاری کتابیں شائع کر رہا ہے۔ اب تک جن حضرات و خواتین کی کتابیں اس ادارہ سے شائع ہو چکی ہیں ان میں کرشن چندر، ڈاکٹر محمد حسن ڈاکٹر شارب ردولوی ڈاکٹر ساجدہ زیدی، ڈاکٹر احسن رضوی، عمیق حنفی، بلراج کومل، بشیر بدر، رتن سنگھ، جوگندر پال، عابد سہیل، اقبال مجید، سلمیٰ صدیقی، قاضی عبدالستار، منظر سلیم، سہیل عظیم آبادی، یوسف ناظم، شکیلہ اختر، ڈاکٹر شمیم نکہت، ڈاکٹر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر عطیہ نشاط، ڈاکٹر عزیز فاطمہ، یوسف ناظم اور البیئر کا مو نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس ادارے سے شائع شدہ تقریباً ساری ہی کتابوں پر ان کے مصنفین کو ملک کی مختلف اردو اکاڈمیوں نے انعام واکرام

اور خوبصورت کتابیں شائع کرنے کے لیے اتر پردیش اردو اکاڈمی کا انعام متعدد بار مل چکا ہے ۱۹۸۲ء کے اشاعتی پروگرام میں ڈاکٹر عبد العلیم مرحوم، محمد علی صدیقی، ڈاکٹر عزیز فاطمہ عابد سہیل ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر شمیم نکہت، عمیق حنفی، ڈاکٹر نیر مسعود اور منظر سلیم کی تصانیف شامل ہیں۔

○ شاہ اجمل اشاعت گھر الہ آباد

دائرہ شاہ اجمل صدیوں سے علم و ادب کا مرکز رہا ہے جس کا ہر فرد شاعر اور مصنف گذرا ہے۔ اُن کی تصانیف شاہ اجمل لائبریری میں موجود ہیں جس کے مالک شاہ سید احمد اجمل سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل ہیں۔ ان بزرگوں کی تصانیف کی اشاعت کے لیے شاہ اجمل اشاعت گھر کے نام سے ایک ادارہ ۱۹۸۰ء میں قائم ہوا۔ اس ادارہ کی ملکیت میں عربی، فارسی اردو کے سیکڑوں مخطوطات موجود ہیں جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مخطوطات کی اشاعت کے لیے ایک کثیر رقم کی ضرورت ہے اور یہ ادارہ ایک اکیڈمی کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اس ادارہ کی مالی حالت اس قابل نہیں ہے کہ وہ تمام کتابوں کی اشاعت ایک ساتھ کر سکے۔ دائرہ کے اس خاندان میں اہلِ علم آج بھی موجود ہیں جن کی چند تصانیف شائع ہوئی ہیں۔ دائرہ کے اہل علم پر اہم تذکرہ "سراج منیر" سید اکمل اجملی تصنیف کر رہے ہیں جو جلد ہی شائع ہو گا۔ دائرہ کے بزرگ مولانا سید نذیر احمد الہ آبادی نے عربی کی مشہور و معروف کتابوں کے ترجمے کیے ہیں جو نایاب اور اہم ہیں۔ ان کی اشاعت زیر غور ہے۔ ۱۹۷۰ء میں انجمن اجملیہ کی بنیاد پڑی جس کے ذریعہ دائرہ کے بزرگوں کی منظوم اور نثری تخلیقات کی ترویج و اشاعت کا کام شروع ہوا۔ اور اہم ترین سیمنار، نشستیں، مشاعرے مسالمے وغیرہ منعقد ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں۔

○ کتاب والا۔ دہلی

یہ ادارہ پچھلے کئی سالوں سے کم قیمت پر اردو کی معیاری کتابیں چھاپ رہا ہے۔ اس ادارہ کے مالک اظہر حسین راہی تقریباً ۲۰ سال تک ایک پریس میں ملازم رہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ طباعت وغیرہ کی باریکیوں سے اچھی طرح واقف ہیں اور اپنی کتابیں بہتر سے بہتر انداز میں چھاپنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں پریس کی ملازمت کے بعد کچھ دنوں تک وہ پرنٹنگ ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے پھر مختلف ناموں سے پبلشنگ کا کام کرتے ہوئے اپنے ادارہ "کتاب والا" کی بنیاد ڈالی جو اب تک کئی مقبول و معروف مصنفین کی کتابیں معیاری انداز سے چھاپ چکا ہے۔ اس ادارہ سے تقریباً سات سال سے لگاتار ایک ماہانہ ڈائجسٹ "نیرنگ" جو خاص طور سے پاکستانی ڈائجسٹوں کا بہترین انتخاب اور عکس جمیل ہوا کرتا ہے۔

○ دانش محل لکھنؤ

بابائے اردو ڈاکٹر عبد الحق مرحوم اور ان کے مخصوص ادبی رفقاء کی بڑی خواہش تھی کہ لکھنؤ جیسے اردو کے مرکز میں ایک ایسا مثالی و معیاری کتب خانہ قائم کیا جائے جو نہ صرف اردو ادب کی معیاری، نادر و نایاب کتابوں کی فراہمی اور فروخت کا انتظام کرے بلکہ اردو کی علمی و ادبی دنیا سے مسلسل رابطہ بھی قائم رکھے ان مقاصد کے پیش نظر بابائے اردو کی سرپرستی و رہنمائی میں انہیں کے دست مبارک سے "دانش محل" کا افتتاح ۱۹۴۴ء میں بیرونی و مقامی دانشوروں مولانا آزاد سبحانی، سید ہاشمی فرید آبادی، مولوی بشیر الدین (اٹاوہ)، مولانا احمد الدین، مولانا ظفر الملک، پروفیسر سید احتشام حسین، ڈاکٹر عبادت بریلوی وغیرہ کی موجودگی میں کیا گیا۔ کتب خانے کے قیام کے ساتھ ساتھ ایک بزم دانشوراں، بھی قائم کی گئی۔ پروفیسر نور الحسن ہاشمی، حامد اللہ افسر، فرقت کاکوری اس کے ارکین و عہدیدار منتخب ہوئے۔ بزم دانشوراں کے جلسے ہفتہ وار ہوتے تھے ہر مکتب خیال کے ممتاز حضرات شرکت کرتے، افسانے، مقالے، اور مضامین پڑھے جاتے، مقامی حضرات کے علاوہ بیرونی حضرات بھی حصہ لیتے۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حسرت موہانی، احسان دانش، ظفر عمر، اختر اورینوی، مجنوں گورکھپوری، اختر انصاری، ام حفیظ سید، ڈاکٹر اعجاز حسین، ساغر نظامی، پروفیسر [illegible] (دہلی یونیورسٹی)، وغیرہ جیسے حضرات بزم دانشوراں اور دانش محل، کی حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں۔

[illegible] کتب خانہ تھی جس میں رہ بلکہ دانشوروں اور [illegible] اور نہ صرف برصغیر ہند و پاک کا مشہور و معیاری کتب خانہ تسلیم کیا جانے لگا بلکہ دوسرے ممالک [illegible] فرانس، جرمنی، امریکہ، روس، مصر، ایران، عرب [illegible] شام، انڈونیشیا وغیرہ میں بھی مقبول ہوتا گیا۔ آج دنیا کا ہر وہ ملک جہاں اردو کے نام لیوا موجود ہیں دانش محل ہی کی خدمات حاصل کرنے اور اس سے کتابیں خریدنے کو ترجیح دیتے ہیں، یہ صرف اس لئے کہ دانش محل کے مالک نسیم احمد تاجرانہ اصول پر نہایت محنت و دیانت کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ ان کی انھیں خصوصیات نے دانش محل کو معیاری، مثالی اور قابلِ اعتماد کتب خانہ اور طلبہ و اساتذہ اور دانشوروں کا مرکز بنا دیا ہے۔

○ چمن بک ڈپو دہلی

آزادیٔ ہند کے وقت چمن بک ڈپو اپنے ابتدائی دور سے گذر رہا تھا۔ شروع میں بچوں کے لیے اس ادارہ سے بڑی خوبصورتی اور سبق آموز کہانیوں کے مجموعے چھپتے رہے۔ وقت اور زمانے کے تغیرات اس ادارہ پر بھی اثر انداز ہوئے اور آہستہ آہستہ ادارہ نے ناولوں کی اشاعت کی طرف توجہ دینی شروع کر دی۔ ۱۹۷۲ء کے اوائل میں اس ادارہ میں ایک اور تبدیلی آئی یعنی اسی سال اچانک ناولوں کی اشاعت کا سلسلہ منقطع کر کے تنقیدی اور ادبی کتابوں کی اشاعت کا پروگرام بنایا گیا۔ اور تب سے یہ ادارہ مسلسل معیاری ادب کی بہترین تنقیدی کتب عوام کے لیے مہیا کر رہا ہے۔ ابھی یہ سلسلہ بڑے پیمانے پر چل رہا تھا کہ بک ڈپو کے بانی اخلاق احمد صاحب کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ ڈاکٹروں نے ان کو کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا قرار دیدیا۔ ایک طویل علالت کے بعد ۳۱ر جنوری ۱۹۸۰ء کو وہ اس جہانِ فانی کو چھوڑ کر اپنے معبودِ حقیقی کی گود میں چلے گئے اور ادارہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ اخلاق صاحب کے ہاں کوئی بالغ لڑکا نہیں تھا۔ لہٰذا بڑی لڑکی شاہین اخلاق کو اپنی بی۔ اے کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر بک ڈپو کی جانب توجہ مبذول کرنا پڑی کیونکہ حالات کا تقاضہ بھی یہی تھا۔ آہستہ آہستہ یہ کتب خانہ دوبارہ اپنی پرانی روش کی جانب بڑھنے لگا اور ایک بار پھر اس کتب خانہ کی اشاعتی سرگرمی میں تیزی آ گئی۔ آج یہ کتب خانہ پھر سے عوام کے دلوں پر چھانے لگا ہے اور اب یہاں سے ناولوں اور تنقیدی کتب کے ساتھ ساتھ معیاری ادبی کتب بھی شائع ہو رہی ہیں۔

○ صدیق بک ڈپو لکھنؤ

صدیق بک ڈپو امین آباد پارک لکھنؤ ہندستان کا ایک قدیم اور ممتاز اشاعتی ادارہ ہے جس کے بانی مولوی محمد صدیق صاحب ہیں جس کی باقاعدہ بنیاد ۱۹۱۶ء میں رکھی گئی۔ مولوی محمد صدیق ضلع لکھنؤ کے ممتاز زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آبائی وطن شاہ پور تھا۔ عربی کی تعلیم فرنگی محل لکھنؤ میں حاصل کی۔ اردو، ہندی، فارسی اور انگریزی پر مکمل عبور حاصل تھا۔ اردو زبان سے گہری وابستگی کی بنا پر اردو کتابوں کی اشاعت کا مرکز "صدیق بک ڈپو" کے نام سے قائم کیا۔ اپنی انتھک محنت اور جد و جہد سے اپنے کاروبار میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ بقول شوکت تھانوی اگر مولوی صاحب صوبہ پنجاب کو اپنی اشاعتی سرگرمیوں کا مرکز بناتے تو شاید ہندستان کے عظیم ترین پبلشر بن جاتے۔ انھیں کتابوں کی طباعت کا جو سلیقہ تھا وہ بہت کم پبلشروں کو نصیب تھا۔ بہرحال مولوی محمد صدیق صاحب نے چھوٹی بڑی لگ بھگ ..۵ کتابیں شائع کیں۔ بعض اہم اور معیاری موضوعات پر اور بعض ناول اور افسانے جیسے موضوعات پر تھیں۔ مزاج اور خیالات کے اعتبار سے وہ ابتدا ہی سے نیشلسٹ تھے اور کانگریس کے ایک ایسے سرگرم کارکن جن کو نہ صلے کی پرواہ اور نہ ستائش کی تمنا۔ ان کے حلقۂ احباب میں حافظ محمد ابراہیم سابق گورنر پنجاب، سی بی گپتا سابق چیف منسٹر یو پی، ترلوک سنگھ، یونس

سلیم، رفیع احمد قدوائی، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، جوش ملیح آبادی اور نیاز فتحپوری جیسی شخصیتیں شامل تھیں۔ تقریباً دس برس تک کانگریس حکومت کے محکمۂ تعلیم یوپی کے تعاون سے ماہنامہ "ترقی" کی اشاعت اور صحافت کا کام بھی کیا۔

اس کے علاوہ ادبی ماہنامہ "انتخاب" لکھنؤ "مشاعرہ" اور "سوتنتر راج" ویکلی کے اڈیٹر اور پبلشر رہے۔ ان کا سب سے بڑا علمی اور ادبی کارنامہ ان کی شائع کردہ سینکڑوں قسم کی فہرستیں تھیں، جس میں اردو کتابوں کا بڑے سلیقے سے تعارف کرایا گیا تھا۔ فہرستوں کو چار مرحلوں میں ترتیب دیا گیا۔ نام وار فہرست جس میں حروف تہجی کے لحاظ سے کتاب کا نام موضوع مصنف مؤلف یا مترجم کا نام، معیار طباعت، کاغذ کی قسم اور قیمت درج کی گئی۔ دوسرے مرحلہ میں "موضوع وار فہرست" تقریباً سو موضوعات کو بیس حصوں میں تقسیم کرکے علاحدہ علاحدہ فہرست تیار کی مثلاً منظومات، مجموعۂ کلام، دیوان، مثنوی، قصائد واسوخت، نعت ومنقبت، سلام ومراثی، رباعیات، مسدس وغیرہ جس میں مندرجہ بالا موضوع شامل کرکے فہرست نمبر ۱ طبع کی۔ تیسرے مرحلے میں "مصنف وار فہرست (مختصر)" کے نام سے شائع کی۔ جس میں دو ہزار مصنفین کی تمام تصانیف شامل کیں اور مصنفین کے نام حروف تہجی سے تحریر کرکے مصنف کی کتابوں کا موضوع، نام اور قیمت درج کی۔ چوتھے مرحلہ میں "مصنف وار فہرست" (تفصیلی) شائع کی جس میں تقریباً ڈھائی ہزار مصنفین کی کتابیں معہ مختصر تعارف درج کی گئیں۔ پہلی فہرست تقریباً ۵ سو صفحات پر ۱۹۴۰ء میں شائع کی گئی۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی، ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔

مولوی صدیق صاحب کی اردو خدمات کے تذکرے کے لیے ایک مستقل کتاب ترتیب دی جا سکتی ہے۔ مولوی صاحب ایک طویل علالت کے بعد ۱۹۷۴ء میں انتقال کر گئے لیکن ادارہ صدیق بک ڈپو ان کی خواہش کے مطابق اپنی بساط بھر ان نامساعد حالات میں بھی نشر واشاعت کا کام انجام دے رہا ہے۔

○ سلوچہ پرکاشن نئی دہلی

مشہور مورخ ٹوئن بی ایک جگہ لکھتے ہیں "مجھے پورا پورا احساس ہے کہ میں ایسی دنیا میں آباد ہوں جس میں سائنس اور ٹکنالوجی کو بھرپور دخل ہے اس کے باوجود میں سائنس سے اس حد تک ناواقف ہوں گویا میں یونان یا روم کا باشندہ ہوں آج کی دنیا کا شہری ہوں ہی نہیں" اگر ایسے بلند پایہ دانشوروں کو سائنس سے اجنبیت کا شدید احساس ہوتا ہے تو اوسط آدمی کی کیا بساط۔ دراصل فی زمانہ اس کی اشد ضرورت ہے کہ ہم سائنس کے تئیں اس طرح اجنبیت کے احساس سے نجات حاصل کریں۔ یہ تبھی ہو سکتا ہے جب سائنسی نظریات و تفکرات پر عام فہم زبان میں لکھنے پڑھنے کا چلن ہو۔ اس کے لیے ادیبوں و ناشروں دونوں کو سائنسی معلومات پر لکھنے اور کتابیں شائع کرنے کے کام کو بڑھانا ضروری ہے۔

یہ بڑی خوش کن بات ہے کہ سلوچہ پرکاشن نے آج سے ۲۸ برس پہلے "آج کی سائنس" (اندرجیت لال) شائع کی۔ اس کتاب کو یونیسکو سے ایک گرانقدر انعام بھی ملا۔ اور اس کی اتنی پذیرائی ہوئی کہ اس کے دو پنجابی ایڈیشن اور ایک اردو میں سستا ایڈیشن شائع ہوا۔ تین سال یہ کتاب ادیب ماہر (جامعہ اردو علی گڑھ) کے نصاب میں شامل رہی۔ سائنس نے آج کے آدمی کو حیرت، استعجاب اور تھرتھراتی سکلاہٹ کا جو نیا احساس بخشا ہے اور اس نے جو خود اعتمادی کی منزلیں طے کی ہیں اس کی پر لطف جھلکیاں اس کتاب میں قابل داد ہیں۔

۱۹۷۰ء میں حیوانیات پر "ببر شیر کی کہانی"، جو کہ قومی انعام یافتہ ہے اس ادارے نے شائع کی۔ اس کتاب میں مصنف کی انفرادیت اس کے شگفتہ اور آسان طرز بیان سے نمایاں ہوتی ہے اس کتاب کے بعد "ایٹم کی کہانی" کا جنم ہوا۔ اسے یوپی سرکار نے ایک انعام سے نوازا۔ یہ کتاب ایٹم کے بارے میں نظریات، ارتقا، تاریخ و تحقیق کو عام زبان میں پیش کرتی ہے۔

"سائنس ہندوستان" بارہ فکر انگیز مقالوں پر مشتمل ہے ادب اور زندگی سے سائنس کا تعلق اس کتاب کی اہم خصوصیت ہے اردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی اور بھرپور کتاب ہے اور یوپی سرکار سے انعام یافتہ ہے۔

"نیا ہندوستان" قومی انعام یافتہ کتاب ہے اس میں آزادی کے بعد کے دور کا سائنسی ارتقاء کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے اور سائنسی ترقیوں کی روداد بیان کی گئی ہے۔

سلوچہ پرکاشن نے جہاں منفرد معلوماتی اور مفید کتابیں شائع کیں اس کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار ایک آدھ کتاب عصری موضوع پر بھی شائع کی جیسا کہ سوامی رام تیرتھ "جو سوامی جی کی پہلی سولہ سالہ برسی پر شائع کی گئی۔ ان دنوں اس پرکاشن کی ایک کتاب "نغمۂ روح" طباعت کی منزل پر ہے اس میں اردو کی صوفیانہ اور غزلیہ شاعری کا چار سو سالہ انتخاب ہے۔ یہ انتخاب بھی اپنی نوعیت کا ہے اور اس ضمن میں شاذ ہی کوئی کتاب پہلے موجود تھی۔

○ کتب خانہ اشاعت الاسلام دہلی

جے ایس سنت سنگھ اینڈ سنز، کتب خانہ اشاعت الاسلام کا قیام ۱۸۹۰ء میں لاہور کے چوک متی لاہوری دروازہ میں عمل پذیر ہوا۔ اس کے بانی سردار سنت سنگھ تھے۔ سردار سنت سنگھ بہت ہی دور اندیش اور سیکولر مزاج انسان تھے (جنکے چند اصول و اقوال کو آج بھی مذکورہ فرم کے موجودہ کارکن اور دیگر قدیم ناشر بڑے جوش و خروش سے یاد کرتے ہیں) انہی کے زیر سرپرستی متحدہ پنجاب میں ڈیرہ اسمٰعیل خاں و بنّوں خاں میں بھی کتب خانے قائم کیے گئے جس کے مالک سردار سنت سنگھ کے بھائی تھے۔

سردار سنت سنگھ شروع سے مذہبی رواداری کے پیش نظر اس بات کے قائل تھے کہ دکان مذہبی اختلاف کی جگہ قطعی نہیں ہے اسی لیے انہوں نے بلاتفریق مذہب و ملت تمام مذاہب کی کتابوں کی اشاعت شروع کی پنجاب میں اردو کا عروج شروع سے ہی رہا ہے چونکہ اردو کا قومی و سرکاری زبان میں شمار تھا اس لیے اکثر مطبوعات اردو میں ہی شائع ہوا کرتی تھیں۔ اس ادارہ نے اردو عربی، فارسی، گورمکھی، ہندی، پنجابی میں کتب قرآن پاک گورو گرنتھ صاحب اور گیتا جیسی عظیم کتابوں کی اشاعت نہایت ہی اہتمام کے ساتھ شروع کی جس کی وجہ سے سردار صاحب کی شہرت و مقبولیت تمام مذاہب کے علماؤں میں تھی۔ چونکہ سردار صاحب کسی مذہب کے معاملہ میں قطعی دخل گوارہ نہیں کرتے تھے اس لیے ہر مذہب کے لوگوں کا مکمل اعتماد حاصل تھا۔

علاوہ مذہبی کتب کے دوسری اہم مطبوعات میں ٹکنیکل کتب کو افضلیت حاصل ہے۔ اس زمانے میں جبکہ صنعت کا تصور بہت ہی مخصوص طبقہ کے گمان و خیال میں رہتا تھا ایک ٹکنیکل رسالہ اس ادارہ سے شائع کیا جاتا تھا جس میں ٹکنیکل مسائل بابت صنعت کے جوابات دیے جاتے تھے تاکہ ابھرتی ہوئی صنعتوں کو بھی مفاد حاصل ہو اس رسالہ کے ایڈیٹر جناب برکت الحسن عسکر تھے، جن کی تصانیف کا شمار پچاس سے بھی زائد ہوگا۔ تقریباً ساری صنعتوں سے متعلق کتابیں لکھیں جن میں سے چند کتب سرکاری اسکولوں کے کورس میں بھی شامل تھیں علاوہ ازیں چونکہ یہ دور قصائص کا دور تھا اس لیے اس فرم نے ایک بہت بڑا ذخیرہ قصائص اور ڈراموں کا بھی چھاپ رکھا تھا جن میں سے چند مشہور مصنفین جیسے، پیراں دتا مکرّم ملکھی رام دولت رائے، آغا حشر کاشمیری، منشی تیرتھ رام فیروز پوری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اسلامی تعلیم و تربیت ترقی کا بنیادی راستہ ہونے کی وجہ سے سردار صاحب شروع سے ہی اس طرف متوجہ رہے۔ بچوں کا قاعدہ اور نصابی کتب کو خاص ان کی نگرانی میں ترتیب دیا جاتا رہا۔ مولوی غلام قادر حنفی صاحب (جو ایک نہایت ہی معتبر اور ماہر نصاب عالم تھے) کے ترتیب شدہ بنیادی قاعدہ سے لیکر اسلام کی گیارہویں کتاب تک ایک مکمل اسلامی سیٹ تھا ان دنوں کثرت سے انہیں کتابوں سے مدارس اسلامیہ میں تعلیم دی جاتی تھیں۔

پاکستان بننے سے قبل سردار سنت سنگھ کے فرزندوں میں سے ایک قابل ذکر نام ادارہ ہٰذا کے موجودہ نگراں جناب منوہر لال جی کا ہے۔ جن کی سرپرستی میں مختلف اقسام کی ڈکشنریاں اور لغات نیز دیگر درسی و مذہبی کتب کے علاوہ کاپی و جنرل ڈائریاں بھی شائع ہوئیں اس طرح ادارہ ہٰذہ کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوتی رہی۔ اسی زمانے میں آفتاب عالم پریس و کمرشیل پریس کا قیام عمل میں آیا۔

تقسیم وطن کے بعد آزاد ہندوستان میں ان نامساعد حالات میں جبکہ بیشتر اردو پبلشرز ہمت ہار کر دوسرا کاروبار

کرنے پر مجبور ہوئے اس ادارہ کے مالکان نے خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے اردو زبان میں خالص مذہبی و اصلاحی اور دینی کتابیں چھاپنے کا عزم صمیم قائم رکھا جو کہ قابل صد تعریف ہے۔ بگڑتے ہوئے حالات سے دو چار ہوتے ہوئے اس ادارہ کا قیام دہلی دریبہ کلاں میں ہوا اور آفتاب عالم پریس وکمرشیل پریس چوڑی والان دہلی موجودہ دکان کے قریب لے آیا گیا۔

۱۹۶۳ء میں جناب منوہر لال کے فرزندان بھی دکان میں کام کرنے لگے اور قرآن پاک و دینی کتب کی اشاعت کو فروغ دینے میں پیش پیش رہے۔ ۱۹۶۵ء میں دینی کتب کی برآمد کا سلسلہ شروع کیا گیا اور ۱۹۷۸ء میں اس فرم کو نمایاں برآمد کیلئے سرٹیفکٹ آف میرٹ کے انعام سے نوازا گیا۔ ۱۹۷۹ء و ۱۹۸۰ء میں سب سے زیادہ کتب کی برآمد کے عوض میں ادارہ ہذا کو اسپیشل ایکسپورٹ ایوارڈ حکومت ہند کی جانب سے عطا کیا گیا۔ ۱۹۸۲ء میں ایک ایسے سنہری قرآن پاک کی اشاعت کی گئی جسے پورے ہندوستان میں اولیت وافضلیت کا فخر حاصل ہے جس کا افتتاح جناب ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب وزیر مملکت حکومت ہند کے دست مبارک سے ہوا۔ بعدازاں اس قرآن پاک کو پانچویں عالمی وقومی نمائش میں دکھایا گیا جس کی زیارت کے لیے لوگ جوق در جوق آئے۔

آج اس ادارہ کی اہم مطبوعات میں قابل ذکر کتب بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی تصنیف کردہ ڈکشنریاں، لغت عربی انگریزی ڈکشنری معری، قرآن پاک وحمائل شریف مترجم قرآن مجید وحمائل شریف اور اردو وظائف و دیگر دینی کتب ونصاب کے علاوہ علمی واصلاحی کتب بھی شامل ہیں، ڈائریاں جنتری واسلامی کیلنڈر کا سلسلہ بھی بدستور جاری ہے خصوصاً قابل ذکر عربی دینی مطبوعات ہیں جن کی برآمد تمام عرب ممالک واسلامی دنیا میں کثرت سے کی جاتی ہے۔

○ انجمن تہذیبِ نو، الہ آباد

انجمن تہذیب نو الہ آباد کی تشکیل ۱۹۶۰ء میں ادب اور آدمی کے مشترک رشتوں کی تلاش و دریافت کی بنیاد پر ہوئی۔ گذشتہ ۱۲ سال سے ایک فعال ادارے کی حیثیت سے ٹھوس ادبی خدمات اور اردو زبان کی ترویج واشاعت میں یہ ادارہ، صالح اور صحت مند اور تعمیری ادب کو منظر عام پر لانے میں قابل تحسین کام انجام دے رہا ہے۔ انجمن تہذیب نو نے اپنے سفر کا آغاز یادِ احتشام سووینیر کے بعد جشن شعرائے الہ باد اور صد سالہ جشنِ اقبال سووینیر جیسے خوبصورت اور معیاری مجلّوں سے کیا۔

کتابوں کی اشاعت کے علاوہ اس کے اہتمام سے دو ماہی "انداز ے" گذشتہ دو سال سے منظر عام پر آرہا ہے۔ اس کا "سہیل عظیم آبادی نمبر" اپنی انفرادیت کے اعتبار سے یادگار نمبر سمجھا جاتا ہے۔ یہ ادارہ اشاعتی کاموں کے علاوہ کل ہند پیمانے پر سیمنار، سمپوزیم اور مشاعرے کے انعقاد میں بھی پیش پیش رہا ہے۔

صد سالہ جشنِ اقبال کے موقع پر "آل انڈیا اقبال سیمنار" نئی کہانی نئے مسائل" کے موضوع پر کل ہند سیمنار کا انعقاد انجمن تہذیب نو کا تاریخ ساز کارنامہ ہے۔ مئی ۱۹۷۹ء میں پاکستانی افسانہ نگار انتظار حسین اور احمد ہمیش کی آمد پر انجمن نے ایک شاندار نام افسانہ کا انعقاد کیا جو آج بھی اپنی نوعیت کا یادگار پروگرام سمجھا جاتا ہے۔ گذشتہ سال مشہور شاعر فیض احمد فیض کی آمد پر بھی انجمن نے عوامی سطح پر ایک شاندار جلسے کا اہتمام کیا۔ گذشتہ سال ہی اردو اکاڈمی لکھنو کے اہتمام سے منعقدہ "جشن فانی" کا انتظام بھی انجمن نے الہ آباد میں ہندی ساہتیہ سمیلن گراؤنڈ میں کیا جو انجمن کی کارکردگی کی ایک عمدہ مثال ہے۔ انجمن تہذیب نو کو باعمل اور فعال ادارے کی حیثیت سے برقرار رکھنے میں انجمن کے جنرل سکریٹری ذوالفقار صدیقی کی کوششوں کا زبردست ہاتھ ہے۔ ایسے کم لوگ ہیں جو ادیب و شاعر ہوتے ہوئے بھی ادب کے معاملہ میں بے حد سنجیدہ پائے گئے ہیں۔

ادارۂ تہذیب نو میں فکر وفن کا چراغ روشن رکھنے میں ڈاکٹر سید محمد عقیل کی ذاتی دلچسپی کو بھی کافی دخل ہے۔ اس انجمن کے دیگر اہم معاونین میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی نفر قریشی اسرار گاندھی فخر الکریم، عتیق الہ بادی، آفتاب احمد خاں، اشتیاق احمد خاں محمد وسیم صدیقی، وسیم حیدر اور رفیع اللہ انصاری کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں۔

○ مکتبہ دین وادب لکھنؤ

ستمبر ۱۹۶۰ء میں مولانا عبدالباری آسی کے صاحبزادے والی آسی نے مکتبہ دین وادب لکھنؤ کو محض اپنی تصنیف "ارمغان نعت" شائع کرنے کے لئے قائم کیا تھا، فارسی اردو عربی نعتوں کا چودہ سو سالہ انتخاب "ارمغان نعت" اتنا مقبول ہوا کہ اس کے مسلسل تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں دوسری کتاب "مقبول سلام" (سلاموں کا انتخاب) شائع ہوئی۔ اس کے بعد نعت گو شعرا کا انتخابی سلسلہ زیر اشاعت رہا جس میں سے مولانا احمد رضا خاں، بہزاد لکھنوی، حمید صدیقی، ساجد لکھنوی، عمر انصاری، بیکل اتساہی، شکیل بدایونی، نوشتہ کھنڈوی، عزیز سلونوی، مولانا ابوالوفا عارف، نازش پرتاپ گڑھی، ماہر القادری کی نعتوں کے انتخاب بے حد مقبول رہے۔ ان انتخابات کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ دیگر نعتوں کے مجموعے مثلاً "حریم رسالت" وغیرہ بھی بیحد پسند کئے گئے۔ مکتبہ دین وادب کی اشاعت کردہ کتاب "اردو شاعری رہبر ایشیا" (مہاتما گاندھی پر نظموں کا انتخاب) کی آج بھی مانگ ہے۔ ۱۹۶۴ء میں اسی طرز پر پنڈت جواہر لال نہرو پر بھی نظموں کا انتخاب "لعل وجواہر" شائع کیا گیا جس کے اب تک دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ مولانا عبدالباری آسی کی دو کتابیں "غالب کی شوخیاں" اور "رباعیات عمر خیام پر ایک تحقیقی نظر" بھی اس ادارہ سے شائع ہوئیں۔ ۱۹۶۶ء میں مکتبہ نے احمد جمال پاشا کی کتاب "اردو کے چار مزاحیہ شاعر" شائع کی۔ اس طرح اب تک لگ بھگ ڈیڑھ سو کتابیں اس ادارہ سے شائع ہو چکی ہیں۔ مکتبہ دین وادب سے حکومت کی منظور شدہ پالیسی کے تحت درجہ چہارم و پنجم کی درسی کتابیں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں "ابر معنی" (قادر صدیقی) پر یوپی اردو اکاڈمی سے ۵۰۰ روپے کا انعام بھی مل چکا ہے۔ اس ادارہ سے شائع شدہ پاکستانی شعرا کے مجموعے ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہیں خوبصورت کتابیں چھاپنے پر ۱۹۸۱ء میں مکتبہ دین وادب کو یوپی اردو اکیڈمی کی جانب سے ۱۵۰۰ روپے کا انعام بھی ملا ہے۔

○ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کی رہنمائی میں "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" کا قیام مئی ۱۹۵۹ء میں جن مقاصد کے تحت عمل میں آیا تھا وہ اہم ترین دعوتی واصلاحی مقاصد ہیں۔ مجلس ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ کی اس اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے جس کا احساس تمام عالم اسلام میں شدت کے ساتھ کیا جا رہا تھا اور اس کا نتیجہ تھا کہ صرف ملک کے مختلف حلقوں اور صاحب فکر دردمند مسلمانوں نے بلکہ بہت سے بیرون ممالک کے اہل دردمند اہل بصیرت اصحاب نے اس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا اور پذیرائی کی مجلس سے اس عرصے میں پانچ زبانوں اردو، عربی، انگریزی، ہندی اور بنگالی میں چھوٹی بڑی کل ۱۴۳ کتابیں شائع کی گئیں۔ ان میں سے اکثر کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ خدا کا شکر ہے کہ مجلس کی مطبوعات نے دینی اور علمی حلقوں میں خاص مقبولیت اور وقعت حاصل کرلی ہے اور اس کی شہرت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے چونکہ مجلس کا قیام کسی تجارتی ادارہ کی حیثیت سے عمل میں نہیں آیا ہے اور نہ ہی اس نقطۂ نظر سے اس کے کام کو انجام دیا گیا ہے لہٰذا اس کی راہ میں سرمایہ کی سب سے بڑی دشواری ہے مجلس کے پاس نہ تو اس کی اپنی عمارت ہے اور نہ ہی اس کا اپنا پریس، بلکہ وسائل کی کمی کے باعث مجلس کو اپنے وسیع اشاعتی پروگرام کی انجام دہی میں بڑی رکاوٹیں پیش آتی رہی ہیں

○ مکتبہ الحسنات دہلی۔

مولانا ابوسلیم محمد عبدالحئی صاحب نے سب سے پہلے یہ ادارہ رامپور میں قائم کیا جہاں اب تک ۲۰۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ آج جب کہ ہر طرف رومانی اور گندے لٹریچر کی بھرمار نے لوگوں کے ذوق مطالعہ کو انتہائی غیر سنجیدہ اور لذت پسند بنا دیا ہے ایسے ماحول میں بھی مکتبہ الحسنات نے نہایت کامیابی کے ساتھ ایسی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں خالص خدا پرستی کے اصولوں اور سنجیدہ دینی معلومات کی نشر واشاعت کے سوا اور کوئی چیز شامل نہ کی گئی جو اس مقصد سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ نیز اس مکتبہ

...ں دریہ نو قروں اور خواتین کے علاوہ ان علاقوں کے لوگوں نے بھی بہت فائدہ اٹھایا ہے جہاں اردو ... ہے۔ اس ادارہ سے پانچ رسالے بطول، الحسنات ... ہندی اور ہادی بھی شائع ہوتے ہیں جب سے یہ ادارہ منتقل ہوا ہے اس کے اشاعتی پروگرام میں اور تیزی آگئی ہے اردو کے علاوہ ہندی، انگریزی، اور دیگر زبانوں کی مطبوعات کا اشاعتی منصوبہ بھی ادارہ کے زیر غور ہے۔ دہلی دفتر کے انچارج عبدالمالک فہیم صاحب مکتبہ کی ہر نئی کتاب کو بہتر سے بہتر طور پر خوبصورت و دیدہ زیب گٹ اپ کے ساتھ پیش کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔

○ خورشید بک ڈپو لکھنو

۱۹۰۶ء میں یہ بک ڈپو امین آباد لکھنؤ میں قائم ہوا۔ کتب فروشی خاندانی پیشہ ہے۔ ان کے دوسرے کتب خانے کانپور، دہلی، کلکتہ اور کراچی میں ہیں۔ ان اداروں میں عربی، فارسی اور اردو کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ خورشید بک ڈپو لکھنؤ کی اب تک ۵۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک کتاب "ہماری دنیا ہمارا سماج" پر اعزازی سرٹیفکیٹ مل چکا ہے۔ موطا امام محمد (عربی) عکسی زیر ترتیب ہے جو بہت جلد شائع ہو رہی ہے۔ اس ادارہ سے زیادہ تر مذہبی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ خورشید بک ڈپو کی شائع کردہ "جنتری" اپنی نوعیت کی بہترین جنتری ہے عوام میں بے حد مقبول ہے۔

○ اہلوالیہ بک ڈپو دہلی۔

یہ بک ڈپو ۱۹۵۶ء میں جانکی ناتھ اہلوالیہ اور ترلوک چند اہلوالیہ کے باہمی اشتراک پر قائم ہوا۔ ۱۹۷۲ء میں ترلوک چند اہلوالیہ نے اپنا الگ ادارہ پرنس بک ڈپو کے نام سے قائم کر لیا اہلوالیہ بک ڈپو کی مطبوعات میں زیادہ تر ناول ہیں۔ جن کی تعداد تین سو سے بھی زیادہ ہے۔ ان میں سے گلشن نندہ، زلیخا حسین، مسرور جہاں، عارف مارہروی اور ضیا عظیم آبادی کے ناول بے حد مقبول ہیں۔ اور اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں ان کے

...بینا تاز، رفیعہ بٹ، یاسمین صوفی، تماثی علی ایلڈ... شریف پروین، عظمت رعنا کے ناول بھی اس ادارے سے شائع ہوئے ہیں۔ فکر تونسوی کے تین مجموعے پیاز کے چھلکے، آدمی، آخری کتاب بھی اس ادارے سے شائع ہوئے۔ فکر تونسوی کی نئی کتاب، فکریات، زیر طبع ہے۔

○ زم زم بک ٹرسٹ دہلی

زم زم بک ٹرسٹ کوئی بہت پرانا پبلشنگ ادارہ نہیں ہے مگر اس کی بنیاد پچھلے تیس سالہ پبلشنگ کے تجربہ پر رکھی گئی ہے ایک قلیل مدت میں یہ ادارہ دو کتابیں چھاپ چکا ہے اور چار کتابیں زیر طبع ہیں جن میں تذکرہ ایک ایسا پروجیکٹ ہے جو اردو کے اہل قلم کو خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں ہوں یکجا کرنے کا باعث بنے گا ادیبوں شاعروں، نقادوں اور صحافیوں کی ایک کثیر تعداد دنیا میں موجود ہے مگر انہیں یکجا کرنے کا کام آج تک تکمیل کو نہ پہنچ سکا زم زم بک ٹرسٹ اس عظیم کام کو انجام دے رہا ہے۔ چند سالوں میں اردو کو ایک ایسا عظیم ادبی انسائیکلوپیڈیا ملے گا۔ جو مختصر سوانح کا نمونہ ہوگا اور صحیح معنوں میں ایک مبسوط انسائیکلوپیڈیا کہلانے کا مستحق ہوگا۔

زم زم بک ٹرسٹ کا اصل مقصد اردو کے ادیبوں اور شاعروں اور دیگر تمام اہل قلم کی قلمی کاوشوں کو کتابی شکل میں لانا ہے اس مقصد کے لیے ادارہ نہ صرف یہ کہ تمام اہل قلم کی حوصلہ افزائی کرتا ہے بلکہ انہیں جزوی مالی تعاون بھی دیتا ہے۔ یہ کام ریاستوں کی اکیڈمی کے ذمہ ہے مگر ہر شخص کی پہنچ وہاں تک نہیں ہے۔ اس لیے زم زم بک ٹرسٹ کی صورت میں ملک کے ہر مصنف کو یہ موقع ملا ہے کہ اس کی کاوش کتابی شکل میں آسکے۔ ادارہ ایسی کتابوں کی نکاسی میں بھی بھرپور تعاون دیتا ہے، جو زم زم بک ٹرسٹ کی معرفت یا اس کی جزوی مالی مدد سے چھاپی جاتی ہیں۔ ادارہ زم زم بک ٹرسٹ کے زیر اہتمام ایک رسالہ محور کا اجراء بھی عمل میں آیا ہے۔

محور ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ ادبی حلقوں کے لیے بہت معلوماتی جریدہ بھی ہے جس میں ادبی حصہ کی نمائندگی ملک و بیرون ملک کے اہل قلم کر رہے ہیں اس کا پہلا شمارہ مئی ۱۹۸۵ء میں شائع ہو رہا ہے۔

○ بک امپوریم پٹنہ

۹ جون ۱۹۶۳ء کو مراد پور لین پٹنہ میں بک امپوریم کا قیام عمل میں آیا۔ ویسے اب تک اس ادارہ کی ایک ہی کتاب شائع ہوئی ہے مگر مدت قریب میں چند اچھی اور معیاری کتابیں اس ادارہ سے شائع ہونے والی ہیں۔ اس ادارہ میں نصابی، ادبی تحقیقی، تنقیدی ہر قسم کی کتابیں دستیاب ہیں۔ اردو کے تقریباً سارے معیاری رسائل، ہفتہ وار یہاں ملتے ہیں۔ یہ نہ صرف ایک تجارتی ادارہ ہے بلکہ ایک ادبی مرکز بھی ہے۔ جہاں شام کے وقت اکثر مقامی یا بیرونی شعراء و ادیب اکٹھے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی کسی خاص موضوع پر گرما گرم بحث بھی چھڑ جاتی ہے۔ ادارہ کے مالک حمید انور صاحب کی محنت، کوشش اور لگن کا نتیجہ ہے کہ آج پٹنہ میں بک امپوریم ادبی لحاظ سے سب سے زیادہ بھرپور ادارہ سمجھا جاتا ہے۔

○ الہ آباد بک ہاؤس۔ الہ آباد

یوں تو کہنے کو یہ ادارہ ۴۵ سال سے قائم ہے مگر چند ناخوشگوار واقعات کی بنا پر اس کی نشر و اشاعت کا کام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ ادھر کچھ عرصہ سے ادارہ کے مالک محمد احمد اور معاون محمد اختر انصاری کی مشترکہ کوششوں سے یہ ادارہ ایک بار پھر نشر و اشاعت کے میدان میں پوری مستعدی سے گامزن ہے۔ ۱۹۴۸ء سے پہلے خالص دینی کتابیں چھپتی تھیں۔ حیاۃ النبی، معجزاۃ النبی اس ادارے کی دو مشہور تصانیف ہیں اس دور میں حسرت موہانی، اکبر الہ آبادی کے کلام کا انتخاب بھی اس ادارہ نے شائع کیا۔ گذشتہ سال اظہر علی فاروقی کی کتاب اردو مثنوی ایک مطالعہ" ادارہ کی جانب سے بڑے اہتمام سے شائع ہوئی اور اب اشاعت کا سلسلہ بڑی تیزی سے جاری ہے۔

○ واجد علی شاہ اکاڈمی۔ لکھنؤ

واجد علی شاہ اکاڈمی ۱۹۷۷ء میں قائم ہوئی۔ اس اکاڈمی کا اولین مقصد انگریزی عہد کی مسخ شدہ تاریخ اودھ کو تحقیق و تفتیش کی روشنی میں از سر نو صحیح پس منظر میں روشناس کرانا ہے۔ اکاڈمی کی اب تک مطبوعات میں سے مثنوی حزن اختر، امجد علی شاہ، تاج دار اودھ، تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ، مسعود حسن ادیب فرد و فنکار کافی مقبول رہی ہیں۔ آئندہ اشاعتی پروگرام میں "واجد علی شاہ کے مراثی" جواب اودھ بلو بک، فسانۂ لکھنؤ، بیگم حضرت محل (ڈرامہ) اور "نواب وزیر علی خاں" (مرتبہ امجد علی خاں) زیر غور ہیں۔

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز نئی دہلی

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز اردو میں امداد باہمی طرز کا واحد اشاعتی ادارہ ہے جو اردو ادیبوں اور شاعروں کو ان کی تصانیف کی اشاعت میں امداد و تعاون دیتا ہے اور جس کا مقصد اردو قارئین کو معیاری کتب فراہم کرنا ہے۔

اس ادارے کا قیام ۱۹۷۲ء میں عمل میں آیا تھا جب اس نے اپنی پہلی کتاب مثنوی "جلوہ صد رنگ" شائع کی۔ لیکن حقیقتاً اس نے اردو میں معیاری کتب کی اشاعت کا پروگرام گذشتہ برس شروع کیا جبکہ اس نے ایک ساتھ تین کتابیں، "یادوں کے کھنڈر" (ناول، از نند کشور وکرم) "پرکٹی تتلی" (ناول، از ہنس راج رہبر) اور "پدمنی" (مثنوی از شرر فتحپوری) شائع کیں۔ سال رواں میں شرر فتحپوری کی مثنوی "نئی دنیا نیا آدم" شائع ہو چکی ہے اور عنقریب ہی دو کتابیں "کینوس کا صحرا" (افسانوں کا مجموعہ، از دیویندر اسر) اور "شعلۂ احساس" منظر عام پر آنے والی ہیں۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی کتابیں اشاعت کے مرحلے طے کر رہی ہیں۔ اس ادارے کی ۱۹۸۱ء میں شائع دو کتابوں یادوں کے کھنڈر (نند کشور وکرم) اور پرکٹی تتلی (ہنس راج رہبر) کو اتر پردیش یو پی اردو اکیڈمی سے ایک ایک ہزار روپے کا انعام ملا ہے۔

○ مکتبہ ندوۃ العلماء لکھنؤ

طویل تعلیمی تجربہ کے بعد دار العلوم کے منتظمین و معلمین اس نتیجہ پر پہنچے کہ نہ تو قدیم نصاب تعلیم اس عصر کی ضرورتیں پوری کر سکتا اور نہ اس سے علم و دین کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں، نہ کسی دوسرے

عرب ملک کا نصاب تعلیم یہاں کے حالات پر منطبق اور یہاں کے دینی عربی مدارس کے لیے سودمند ہو سکتا ہے۔ اگر ہندستان میں دینی عربی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا ہے، تو عربی مدارس کو اپنا مستقل نصاب تیار کرنا ہوگا، جس طرح ایک ملک کے لیے سیاسی خود مختاری اور معاشی خود کفالتی ضروری ہے، اسی طرح ایک علمی و دینی ادارہ اور نصاب تعلیم کے لیے علمی خود کفالتی ناگزیر ہے اور جس طرح ایک زمین کا تناور اور بارآور درخت اکھاڑ کر دوسری زمین پر نہیں لگایا جا سکتا اسی طرح ایک ملک کا نصاب اور ایک عہد کا تعلیمی ڈھانچہ دوسرے ملک اور دوسرے عہد میں نصب نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کام دراصل بہت پہلے کرنے کا تھا اور اس کے لیے تمام عربی مدارس کا تعاون اور تقسیم عمل کے اصول پر کام کا آغاز ضروری تھا۔ ضرورت اس کی تھی کہ مختلف موضوع اور مختلف فنون آپس میں تقسیم کر لیے جاتے اور مختلف علمی جماعتوں اور اداروں کے سپرد کر دیے جاتے، پھر باہمی مشورہ و اتفاق سے ان کو قبول کیا جاتا اور رائج کیا جاتا، ندوۃ العلماء نے یہ آواز بلند بھی کی۔ بعض اہل قلم نے مضامین بھی لکھے اور ان خطرات کو ظاہر کیا جو وقت کے اس فریضہ سے غفلت، قدیم نصاب پر جمود اور اسی طرح مستعجلانہ اور انفرادی ترمیم و تغیر سے دینی تعلیم کو لاحق تھے لیکن مسلمان وقتی عوامی تحریکوں اور مدارس جماعتی و اداری عصبیتوں کی وجہ سے اس حال میں نہیں تھے کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرتے، آخر ندوۃ العلماء کے کارکنوں اور خدمت گزاروں نے بنام خدا اس کام کو بطور خود شروع کیا جو ان کے نزدیک دینی تعلیم کی بقا کے لیے از حد ضروری تھا، اور جس سے امید ہوتی ہے کہ ہمارے عربی مدارس کو اس ملک میں زندگی کی ایک نئی قسط مل جائے گی اور وہ ترقی پذیر تعلیمی نظاموں کا ساتھ دے سکیں گے۔

○ کتب خانہ حمیدیہ دہلی

آزادی کے بعد جس طرح اردو بے حد کسمپرسی کی حالت میں تھی۔ بالکل اسی طرح دینی اور دوسری اردو کتب کے کاروبار کی بھی حالت بہت بری تھی۔ لوگ اس پیشے کو چھوڑ کر دوسرے پیشے اختیار کر رہے تھے لیکن اس زمانے میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ان ہی میں مولانا مہدی حسن صاحب کا نام بھی شامل ہے جنہوں نے اردو سے لگاؤ اور دینی جذبے سے سرشار ہو کر ۱۹۵۳ء میں کتب خانہ حمیدیہ کی بنیاد ڈالی۔

دارالسلطنت دہلی کے اردو بازار میں دو ہستیاں ایسی تھیں جن کے کتب خانے محض کاروبار کی جگہ نہیں بلکہ دور دراز سے آئے ہوئے افراد کے لیے مہمان خانہ کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ ان میں ایک نام مولانا سمیع اللہ قاسمی مرحوم کا اور دوسرا نام کتب خانہ حمیدیہ کے بانی مولانا مہدی حسن صاحب کا ہے۔ باہر سے آئے ہوئے تاجران بلا تکلف ان کے ہاں آتے۔ اپنا سامان رکھ کر دہلی گھومتے خریداری کرتے۔ ضرورت پڑنے پر وہیں سو رہتے اور جب دل چاہتا اپنا سامان لے کر روانہ ہو جاتے۔

مولانا مہدی حسن صاحب نے دہلی میں دینی اور مذہبی کتابوں کے معیار کو بلند کرنے میں ہمیشہ دلچسپی لی، مثلاً عمدہ سے عمدہ کتابت۔ اچھا کاغذ۔ روشن طباعت اور بالخصوص جلد بندی کا معیار بلند کرنے پر انہوں نے خصوصی توجہ دی۔ ان کا کہنا ہے کہ کتابت کی جلد ایسی بندھی ہوئی ہونی چاہیے کہ گاہک خریدنے کے بعد یہ نہ کہے کہ اس نے اردو کی کتاب خرید کر کوئی غلطی کی ہے۔

مولانا کے اس ذوق و شوق نے بھلے ہی اردو کی کتابوں کی طباعت اور اشاعت کو فائدہ پہنچایا ہے لیکن خود انھیں اس سے کافی نقصان پہنچا وہ عام تاجران کی طرح کاروباری اور پیران کی توجہ کم رہی اور معیار کے بلند کرنے پر زیادہ۔ نتیجہ کے طور پر کتب خانہ حمیدیہ نامساعد حالات کا شکار ہو گیا۔ اور مولانا کو ۱۹۷۷ء میں اپنی دوکان بند کرنی پڑی۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ اور گھر بیٹھ کر ہی کام شروع کر دیا۔

انہوں نے مصری عربی کی درسی کتابوں کی طباعت کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ وہ کتابیں تھیں جو طلبا کے لیے باہر سے منگائی جاتی تھیں۔ لیکن انہوں نے پہلی بار انھیں ہندستان میں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن۔ کتب خانہ حمیدیہ دن بدن آگے بڑھ رہا ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جو معیار ۱۹۵۳ء میں شروع کیا تھا اسے نہ صرف قائم رکھا۔ بلکہ اسے چار چاند لگائے اور بالآخر لوگوں نے اس کو قبول کیا اور سراہا۔

○ ادارۂ اشاعت دینیات نئی دہلی

تبلیغی تحریک کی روز افزوں ترقی کے ساتھ عوام میں دین کی طلب بھی پیدا ہونی شروع ہوئی اور عوام کو اسلام کی معلومات کے لیے صالح ترین لٹریچر کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ بستی حضرت

نظام الدین نئی دہلی میں اس تشنگی کو دور کرنے کے لیے کوئی کتب خانہ نہ تھا۔ اس لیے لوگوں نے بازار کی صحیح و غلط غیر مستند کتابوں سے اپنی پیاس بجھانی شروع کر دی یہ تقریباً ۱۹۵۵ء کا زمانہ تھا۔ منشی انیس احمد صاحب ۱۹۵۰-۵۱ء کے ڈیڑھ سالہ قیام مکہ معظمہ سے جو خالص تبلیغ دین کے لیے تھا واپس آچکے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ دین کی اس بڑھتی ہوئی طلب میں یہاں کے ماحول میں کوئی صالح ترین لٹریچر فراہم نہ کیا گیا تو یہاں آنے والے حضرات غیر مستند کتابیں پڑھ پڑھ کر بجائے رشد و ہدایت کے پھر گمراہی کے بحر ذخار میں غرق ہو جائیں گے، اور ترقی معکوس کا سلسلہ پھر شروع ہو جائے گا۔ اس ضرورت کے پیش نظر انھوں نے بنگلہ والی مسجد میں تبلیغی خدمات کے ساتھ اپنے گھر پر کتابیں رکھ کر لوگوں کو اچھی اچھی کتابوں کا تعارف کرانا شروع کیا۔

ادھر مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب بلند شہری ——— جو مصنف تصانیف کثیرہ ہیں یہاں سے کلکتہ کسی مدرسہ کی خدمات کے سلسلہ میں جانے والے تھے۔ موصوف آج کل مدینہ طیبہ میں مقیم ہیں اور آپ کا رات دن کا مشغلہ مطالعۂ کتب اور درس و تدریس سے کہیں زیادہ اردو اور عربی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ ہے۔ آپ نے منشی انیس صاحب کی ان اسلامی کتابوں کی فراہمی اور خرید و فروخت کی مساعی کو دیکھ کر ادارہ کی شکل دیدی اور موصوف نے ادارہ اشاعت دینیات کے نام سے یہ ادارہ اپنے مبارک ہاتھوں سے قائم فرمایا — اور اپنی تالیف میں یکے بعد دیگرے کتابیں طبع کرانے کا امر فرمایا۔ منشی انیس نے ان کی تصانیف کا طبع کرانا اپنے لیے نہ صرف سعادت سمجھا بلکہ ان کی اشاعت میں دل و جان سے سعی کرنی شروع کر دی سب سے پہلی کتاب اصحاب صفہ کے نام سے شائع کی اور اس کے بعد مرنے کے بعد کیا ہوگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں، امت مسلمہ کی مائیں اور اسی طرح ان کی بیشتر تصانیف طبع کرانا شروع کر دیں۔ ۱۹۵۸ء میں ——— شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ ——— کے فیوض و برکات کی

اشاعت کا کام منشی انیس صاحب نے لینا شروع کیا۔ اور ۱۹۶۰ء تک آپ کے مشہور عالم رسالے حکایات صحابہ، فضائل نماز، فضائل تبلیغ، فضائل ذکر، فضائل قرآن، فضائل رمضان کو کتابی شکل میں یکجا مجلد کر کے تبلیغی نصاب کے نام سے روشناس کرایا گیا۔ بعد میں جب حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فضائل درود شریف تالیف فرمائی تو اسی سیٹ میں فضائل درود کا بھی اضافہ کر دیا گیا اب اس وقت سے آج تک لاکھوں کی تعداد میں یہ کتاب مسجد، مسجد گھر گھر، لائبریری، مدارس، مکاتب اور عام مجالس میں پڑھی جانے لگی، اس کتاب کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ انگریزی، ہندی، حتی کہ فرانسیسی زبان میں بھی اس کتاب کے تراجم چھپ چھپ کر اس ادارہ کے ذریعہ عالم میں اشاعت پذیر ہونے لگے۔ اسی کے ساتھ فضائل صدقات اور فضائل حج جو نہایت دردانگیز اور پر تاثیر کتابیں ہیں تبلیغی نصاب جلد دوم کے نام سے طبع ہو کر منظر عام پر آئیں اور ان کے بھی دوسری زبانوں میں ترجمہ شائع ہوئے اسی گوناگوں ترقی کے تحت بمبئی میں اس ادارہ کی ایک برانچ وسط شہر میں قائم ہوئی جو مختلف … ، رہو بمبئی پر اپنی دیانت داری اور حسن معاملات کے لیے جنہیں ستارہ … جنوبی، مغربی اور وسطی صوبوں میں داد تحسین حاصل کر رہی ہے اب اس ادارہ کے پیش نظر پورے عالم میں قرآن مجید بلا ترجمہ اور مشہور معروف زبانوں میں اس کے تراجم کی طباعت کا پروگرام ہے۔

○ مرکزی ادارہ تبلیغ دینیات دہلی

مرکزی ادارہ تبلیغ دینیات تاریخی جامع مسجد دہلی کے سلسلے ۱۷ جولائی ۱۹۷۷ء کو قائم کیا گیا اور اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ ہندستان بھر میں چھوٹے اور متوسط طبقے کے تاجران کو دہلی اور دیوبند کے پبلشرز کی کتب منتقل اور مناسب تاجرانہ کمیشن پر ایک ہی ریلوے پارسل یا ٹرانسپورٹ کے ذریعہ روانہ کر دی جائیں تاکہ الگ الگ منگانے میں جنگی مزدوری اور ڈاک خرچ کے جو اخراجات زائد ہوتے ہیں ان میں کفایت ہو۔ قرآن مجید، بہشتی زیور، دینی تبلیغ اسلامی اور تاریخی کتابوں کی اشاعت

و مطبوعات کے لیے خاص طور سے سرمایہ کی فراہمی اور مہیا کرنے کی جدوجہد کی جا رہی ہے جو انشاءاللہ آئندہ بھی جاری رہے گی۔ ادارے کے سرپرست الأعلیٰ دہلوی اور ان کے صاحبزادگان تشکیل انجم اور جمیل انجم انتھک محنت اور ایمانداری سے کام چلا رہے ہیں۔

○ دار المصنفین اعظم گڑھ

دار المصنفین محض ایک اشاعتی ادارہ نہیں بلکہ ایک تحریک ہے اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا مرکز ہے جہاں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد طلبا کو تحقیق و تلاش، تصنیف و تالیف غور و مطالعہ اور توسیع معلومات کے لیے تیار کیا جا سکتا ہے ہندستان میں یہ پہلا مرکز ہے جو اس مندرجہ بالا مقصد کو سامنے رکھ کر قائم کیا گیا۔ اس تمام تحقیق تصنیف اور غور و مطالعہ کا مرکزی نقطہ "اسلامیات" ہے

دار المصنفین سے شائع ہونے والا مجلہ "معارف" اردو کے معروف ترین علمی مجلوں میں ہے۔ جس میں اسلامیات سے متعلق تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے علاوہ خالص ادبی موضوعات پر بھی اعلا مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ معارف نے مستشرقین کے پھیلائے ہوئے دام تزویر پر بھی خصوصیت سے نگاہ رکھی اور ان کے طرز تحقیق کی خامیوں کی گرفت کی۔

اس ادارے سے ہندستان کی شاید ہی کوئی بڑی شخصیت ہو جس کو لگاؤ نہ رہا ہو۔ موتی لال نہرو جب بھی اعظم گڑھ آتے دار المصنفین کے مہمان ہوتے۔ جواہر لال جی اس ادارے کے لائف ممبر تھے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کو کچھ اپنی علمی دوستی اور کچھ شبلی نعمانی مرحوم کی نسبت سے اس ادارے سے بہت دلچسپی تھی اور اس کا دستور اساسی بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ گاندھی جی بھی یہاں آئے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد جب دار المصنفین مالی مشکلات میں مبتلا ہو گیا تو پنڈت جواہر لال نہرو کے ایما سے مولانا آزاد مرحوم نے ساٹھ ہزار روپیہ کی رقم یک مشت ادارے کو عطا کی۔ رفیع احمد قدوائی مرحوم کو بھی ادارے سے بہت دلچسپی تھی۔ اور وہ مختلف صورتوں سے اس کی مدد کرتے رہے ان کے علاوہ اچاریہ نریندر دیو، بے پرکاش نرائن جی، سر تیج بہادر سپرو، لال بہادر شاستری، ہردے ناتھ کنزرو، رام بابو سکسینہ، فراق صاحب آصف علی، مفتی مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حسرت موہانی، غرض شاید ہی کوئی اہل علم یا اہم شخصیت بچی ہو جو اس ادارے میں نہ آئی ہو۔

دار المصنفین کو جن صاحبان قلم کی خدمت حاصل تھی ان میں مولانا عبد الباری ندوی، مولانا سعید انصاری، مولوی حاجی معین الدین، مولوی ابو الحسنات ندوی، مولوی سید نجیب اشرف ندوی، مولوی ابو الجلال ندوی، مولوی سید ریاست علی ندوی، مولوی شاہ معین الدین صاحب ندوی، ڈاکٹر محمد عزیر، مولوی سید ابو ظفر، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، مولوی محمد اویس ندوی، مولوی حافظ مجیب اللہ ندوی، مولوی ضیاء الدین اصلاحی کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ سب وابستگان دار المصنفین میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کے باہر کے اہل علم حضرات نے بھی دار المصنفین کو اپنی خدمات کا مرکز بنایا اور ان کی تصانیف یہاں سے شائع ہوئیں۔

جو کتابیں یہاں سے شائع ہوئیں ان میں سیرت کی کتاب کو خاص اہمیت حاصل ہے سیرت النبی کے علاوہ "سیر" کی دوسری کتابیں مثلاً سیر الصحابہ، خلفائے راشدین، مہاجرین، سیر انصار، سیر الصحابیات اور تابعین تبع تابعین پر کتابیں کئی کئی جلدوں میں شائع کی گئی ہیں، غالباً دنیا کی کسی زبان میں اس موضوع پر اتنی جامع کتابیں نہ ہوں گی سوانح مثلاً سیرت عائشہ، سیرت عمر بن عبد العزیز، حیات امام مالک، ابن رشد، ابن خلدون، امام رازی وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔

دار المصنفین کا دوسرا علمی اور اشاعتی کارنامہ تاریخ علوم و فنون کی اشاعت ہے اس کے علاوہ تاریخ اسلام متعدد جلدوں میں۔ تاریخ دولت عثمانیہ، تاریخ صقلیہ، تاریخ اندلس وغیرہ بھی شائع کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ہندستان کی تاریخ پر بھی کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا۔

حدیث کی اشاعت کا اہتمام بھی دار المصنفین کا ایک کارنامہ ہے۔ حدیث کے علاوہ فقہ، علم کلام، فلسفہ اور ادبیات پر کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ دار المصنفین نے ایک لغت بھی مرتب کی ہے۔

دار المصنفین کا مجلہ معارف ۱۹۱۶ء سے اب تک مسلسل جاری ہے اور ان ۶۶ برسوں میں اس کے تقریباً ۶۰ ہزار صفحات شائع ہوئے ہیں۔ جو اردو میں ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اگر اس کا انتخاب شائع کیا جائے تو بجائے خود ایک بڑی علمی خدمت ہوگی۔

یہ ادارہ ملک کے معتبر ترین اداروں میں سے ایک ادارہ ہے اور گویا اس وقت علمی تحقیق و تلاش کی آبرو ہے۔

○ خدابخش لائبریری پٹنہ

فارسی عربی اور اردو زبان و ادب کے بوجھل گوشے اور وہ بھولی بسری یادیں مخطوطات اور قدیم اخبارات و رسائل میں مدفون خدابخش لائبریری جیسے ذخیروں میں محفوظ ہیں جنہیں الا دکا پی ایچ ڈی ریسرچ کے ذریعہ اربابِ علم کے سامنے لانے کے بجائے خدابخش لائبریری نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے سہ ماہی جرنل میں تعارفاً، اقتباساً اور مدونًا زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیش کیا جاتا رہے۔ اس جرنل کی دوسری خصوصیت خدابخش لائبریری سالانہ خطبات کی اشاعت ہے جو عربی فارسی اردو یا علوم اسلامیہ کے کسی ماہر کے قلم سے ہوتے ہیں تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مشاہیر کی وہ آٹوگراف تحریریں شائع کی جاتی ہیں جو خدابخش لائبریری کے ذخیرے میں محفوظ ہیں۔ علاوہ ازیں مغلوں سے قبل کی اردو کا نمونہ اردو کا دوسرا قدیم ترین دیباچہ، صوفیہ بہار، بنگال و جونپور کے ملفوظات و مکتوبات پر سیر حاصل مضامین، خدابخش لائبریری اور اس کے بانی کے بارے میں تفصیلی مضامین اور اردو کے نادر اور اہم ادبی رسائل و جرائد کے نمائندے انتخابات (جن کے ساتھ ان رسائل و جرائد کے تمام و کمال مشتملات کا ایک مبسوط اشاریہ بھی شامل رہتا ہے) شائع کیے جاتے ہیں۔ خدابخش لائبریری کے عربی فارسی اور اردو کے قیمتی ذخیرے کے پیش نظر لائبریری کے نادر سرمایے کی اس جرنل کے ذریعہ پیش کش اس کی سب سے بڑی خصوصیت

وہ اہم مشاہیر جن کے کارناموں کو اس جرنل کے ذریعہ منظرِ عام پر لایا گیا ہے ان میں ملا علی قاری سیوطی، خان آرزو، علی ابراہیم خاں، شمس الدین فقیر، مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری، مولانا مظفر شمس بلخی، الکندی عنایت خاں راسخ مرزا جان طپش قابلِ ذکر ہیں۔ جرنل کے اب تک لکھنے والوں میں بیرسٹر قاضی عبدالودود، پروفیسر سید حسن عسکری، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر مختار الدین احمد، ڈاکٹر امیر حسن عابدی، ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی، رشید حسن خاں، ڈاکٹر نیر مسعود اور پروفیسر سید حسن جیسے لوگ شامل ہیں۔

جرنل کی خصوصی اشاعتیں۔ تدوین متن کے مسائل پر سمینار کے مقالات و مباحث، ڈاکٹر ذاکر حسین کے ذاتی خطوط، توبت رائے نظر کے ماہنامہ العصر لکھنؤ (۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۷ء) کا انتخاب (مع اشاریہ) چکبست کے ماہنامہ صبح امید لکھنؤ (۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۱ء) کا انتخاب (مع اشاریہ) ادیب العصر اور صبح امید کے انتخاب میں ۷۰ کے قریب مشاہیر کی وہ نگارشات ہیں جو دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ اور درخشاں، مہلت، نظم، تسنیم، ملال، کمال، شبلی، شرر، ذکاء اللہ، غالب، نظیر، اکبر، سرور، بقا، برق، اختر، کرامت حسین، اکبر حیدری رام موہن رائے، مسز نائیڈو، ٹیگور، مالوی، نول کشور اور اقبال پر معاصر اہل قلم کی دستاویزی تحریریں۔ لکھنے والوں میں تیج بہادر سپرو، موتی لال نہرو کشن لال کول، عبدالرزاق ملیح آبادی، الواسخر مودودی، ابوالکلام آزاد اور پریم چند جیسے لوگ شامل ہیں۔ اور یہ سب تحریریں ایسی ہیں جو ان مشاہیر کے کسی مجموعے میں اب تک نہیں آپائیں۔ علاوہ ازیں سوویت انقلاب پر ہندوستانی ردعمل قومی تحریک کی معاصر دستاویزیں اور اردو زبان و ادب کے متعدد بوجھل گوشے انتخابات سے سامنے آگئے ہیں۔ خدابخش سالانہ خطبات، جس کے لیے فارسی عربی علوم اسلامیہ اور ہند وسطی کے کسی مشہور عالم کو ہر سال زحمت دی جاتی ہے۔ اب تک کے چند اہم نام۔

پروفیسر نورالحسن، ڈاکٹر ہاشم امیر علی، پروفیسر وحید الدین، ڈاکٹر امیر حسن عابدی، پروفیسر مقبول احمد، ڈاکٹر ایم ایس گوانی، پروفیسر مسعود حسین خاں پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، پروفیسر سید حسن عسکری، آصف فیضی (مرحوم) زبیر صدیقی (مرحوم) سہ ماہی تحقیقی پرچے خدابخش لائبریری جرنل کی اشاعت۔ اب تک چار ہزار صفحات پر مشتمل ۲۰ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ تحقیقی کتابوں کی اشاعت نادر مخطوطات پر مشتمل اب تک ۵۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں شعراء کے تذکرے اور دواوین شامل ہیں، عربی فارسی اردو مخطوطات کی توضیحی فہرست۔ انگریزی زبان میں ۴۳ کیٹلاگ شائع ہو چکے ہیں جن میں دس پچھلے چند سال میں نظر ثانی کے بعد سامنے لائے گئے ہیں۔ علمی موضوعات پر سمینار، مثلاً آزادی کے بعد اردو کا علمی سرمایہ، آزادی کے بعد اردو ناول، تدوین کے مسائل اور بہار میں دانشوری کا ارتقاء اردو کے تمام علمی اور ادبی رسائل کا اشاریہ، ڈھائی لاکھ کے قریب کارڈ تیار ہو چکے ہیں۔ اسلامیانِ ہند کی مختلف علمی، ادبی، سیاسی، سماجی اور دینی سرگرمیوں کی دستاویزات جمع کرنے کا کام شروع کر دیا گیا ہے مکتوبات ذاکر حسین، ذاکر صاحب کے خطوط کی عکسی اشاعت لائبریری کے پیش نظر ہے

[redacted]

○ پروگریس پبلشرز ماسکو
(قائم شدہ ۱۹۳۱)

دنیا کا واحد اشاعت گھر ہے جو ۶۲ زبانوں میں ہر سال ۱۴۰۰ کتابیں شائع کرتا ہے جن کی مجموعی تعداد اشاعت ۶ کروڑ ۲۰ لاکھ جلدیں ہوتی ہیں۔

یہ ترجمہ شدہ ادب شائع کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا اشاعت گھر ہے جس کی مطبوعات دنیا کے ۱۴۰ ملکوں میں سوویت مطبوعات کی تقسیم کار تنظیم "میژدو نرودنایا کنیگا" کی معرفت جاتی اور فروخت ہوتی ہیں۔

۵۰ سالہ پروگریس پبلشرز ماسکو کا شعبۂ اردو، دارالاشاعت ترقی ۱۹۵۲ء سے اپنے قیام کے ۲۶ برسوں میں ۳۰۰ سے زیادہ کتابیں شائع کر چکا ہے جن میں سوویت ریاست کے بانی ولادیمیر لینن کی تصانیف اور ان سے متعلق کتابوں (مثلاً یہ ملیزا ئیوا کی "حیات لینن") اور ان کی سوانح عمری کے علاوہ ۴ جلدوں میں مارکس اور اینگلس کی منتخب تصانیف، سماجی اور سیاسی مسائل سے متعلق کتابیں مثلاً لیونتیف کی تصنیف "سیاسی معاشیات" "سیاسیات کے بنیادی اصول"، فلسفیانہ مسائل سے متعلق متعدد مطبوعات، اور دو ضخیم جلدوں میں اردو زبان میں اپنی قسم کی واحد کتاب "مختصر تاریخ عالم" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مختلف زبانوں میں یہ کتابیں مختلف ملکوں میں درسی کتابوں کی طرح استعمال کی جاتی ہیں اور پاکستان اور ہندوستان میں بھی معاشی، سیاسی اور سماجی، تاریخی مسائل کی تعلیم کے لیے انھیں درسی کتابوں کی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ روسی کلاسیکی ادیبوں اور سوویت بلند پایہ مصنفین کی شہرۂ آفاق تصنیفات کے ترجمے اردو زبان میں شائع کرنے کا شرف بھی دارالاشاعت ترقی ہی کو حاصل ہے۔ اردو پڑھنے والوں میں جن مطبوعات کو خاص طور سے مقبولیت حاصل ہوئی ان میں روس کے عظیم شاعر پوشکن کی نظموں کے منظوم ترجمے، پوشکن کی نثری اور منظوم تخلیقات کا مجموعہ، فیودور دوستوئیفسکی کے ناول "ایڈیٹ" اور "غریب لوگ"، لیو تالستائی کی خود نوشت "بچپن، لڑکپن، نوجوانی"، ان کے افسانوں کا مجموعہ "گھریلو مسرت اور دوسری کہانیاں"، میکسم گورکی کی سہ جلدی خود نوشت "بچپن"، "زندگی کی شاہراہ پر" اور "منزل کی تلاش" نیز ان کا عصر آفریں ناول "ماں"، نکولائی استروفسکی کا ناول "داروِ رسن کی آزمائش" جس نے بے شمار زبانوں کے قارئین کی کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ نوبیل انعام یافتہ میخائیل شولوخوف کا ۴ جلدی ناول "جب دھرتی جاگی"، فادییف کا ناول "قافلہ شہیدوں کا"، رسول حمزہ توف کی نثری تحریر "میرا داغستان" اور ان کی نظموں کے منظوم ترجمہ کا مجموعہ، آئیتماتوف کی "جمیلہ"، ازبکستان کی مشہور شاعرہ زلفیہ کی نظموں کا مجموعہ، وسطی ایشیا کی مختلف سوویت جمہوریتوں کے مصنفین کے ناول اور افسانوں کے مجموعے جو نئی زندگی کی تعمیر کی عکاسی کرتے ہیں اور نئے سماجی اور اخلاقی مسائل سے بحث کرتے ہیں۔

دارالاشاعت ترقی، ماسکو نے ہر عمر کے بچوں کے لیے بھی اردو میں بہت سی کتابیں شائع کی ہیں جو خوش رنگ تصویروں سے آراستہ اور طباعت کی خوبصورتی کی مثال ہیں۔ ان میں بچوں کے لیے پوشکن، لیو تالستائی، اکساکوف، مایاکوفسکی جیسے نامور ادیبوں کی تصنیفات شامل ہیں۔

حال میں دارالاشاعت ترقی نے اردو زبان میں جو کتابیں شائع کی ہیں یا اشاعت کے لیے تیار کی ہیں اور عنقریب شائع ہوں گی، ان میں سے چند یہ ہیں: لینن کی "منتخب تصانیف" (۱۲ جلدوں میں)، مارکس اور اینگلس کے مضامین کا مجموعہ "ہندستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷-۵۹ء"، اینگلس کی گراں قدر تصنیف "فائرباخ اور کلاسیکی جرمن فلسفے کا خاتمہ"، پلیخانوف کی تصنیف "مارکسزم کے بنیادی مسائل"، مارکس کی شخصیت اور فکر کی تشکیل کے برسوں کے بارے میں وولکوف کی کتاب "ایک عالمی دماغ کی پیدائش"، ۱۹۱۷ء کے عظیم اکتوبر انقلاب کے بارے میں امریکی صحافی جان ریڈ کا (جو ان دنوں پیٹرس برگ — موجودہ لینن گراد — میں تھے) آنکھوں دیکھا بیان "دنیا کو جھنجھوڑ دینے والے دس دن"، شولوخوف کے افسانوں کا مجموعہ "انسان کا مقدر" (جس میں اس عنوان کے طویل افسانے کے ساتھ دو دن

افسانے" سلسلے کی کہانیاں بھی شامل ہیں)، میکسم گورکی کے "منتخب افسانے" اور دسیوں دوسری کتابیں جن میں حسب دستور بچوں کے لیے کتابیں بھی ہیں۔

دارالاشاعت ترقی کی شائع کردہ اردو کتابیں پیپلز پبلشنگ ہاؤس (پرائیویٹ) لمیٹڈ، دہلی سے حاصل کی جا سکتی ہیں (۵۔ای۔ رانی جھانسی روڈ نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۵۵)

○ مکتبہ الرسالہ دہلی

ادارۃ الرسالہ (دہلی) ۱۹۷۶ء میں مولانا وحیدالدین خاں صاحب کی سرپرستی میں قائم ہوا مولانا وحیدالدین خاں صاحب عالم اسلام کے مشہور مفکر اور مصنف ہیں ان کی کئی درجن کتابیں مختلف اسلامی موضوعات پر چھپ چکی ہیں، ان کتابوں کے ترجمے اردو کے علاوہ ہندی، بنگلہ، تامل، گجراتی، ملیالم وغیرہ (ہندوستانی) زبانوں، نیز عربی، ترکی اور انگریزی زبانوں میں چھپ چکی ہیں مولانا موصوف کی ایک عربی کتاب الاسلام تیحدی (مذہب اور جدید چیلنج) لیبیا یونیورسٹی (طرابلس)، اور ازہر یونیورسٹی (قاہرہ) میں داخل نصاب ہے۔

مولانا موصوف کی سرپرستی میں ماہنامہ الرسالہ تقریباً چھ سال سے نکل رہا ہے۔ یہ رسالہ اردو کے دینی اور تعمیری رسالوں میں ممتاز ترین رسالہ بن چکا ہے۔ ظاہری خوبی اور مضامین دونوں اعتبار سے الرسالہ ایک منفرد نوعیت رکھتا ہے اور ملک کے اندر اور ملک کے باہر نہایت مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ الرسالہ کے منتخب مضامین کا عربی ترجمہ قاہرہ اور بیروت سے پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوتا ہے۔

ادارہ الرسالہ کے تحت تقریباً دو درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان کتابوں کی فہرست زیر نظر اشاعت میں کسی صفحہ پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کتابوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اسلام کی تعلیمات کو جدید سائنٹفک اسلوب میں پیش کیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ کتابیں جدید انسان کو بہت متاثر کرتی ہیں۔ اور کثرت سے لوگوں کے درمیان پھیل رہی ہیں۔

○ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی (قیام ۱۹۷۲ء)

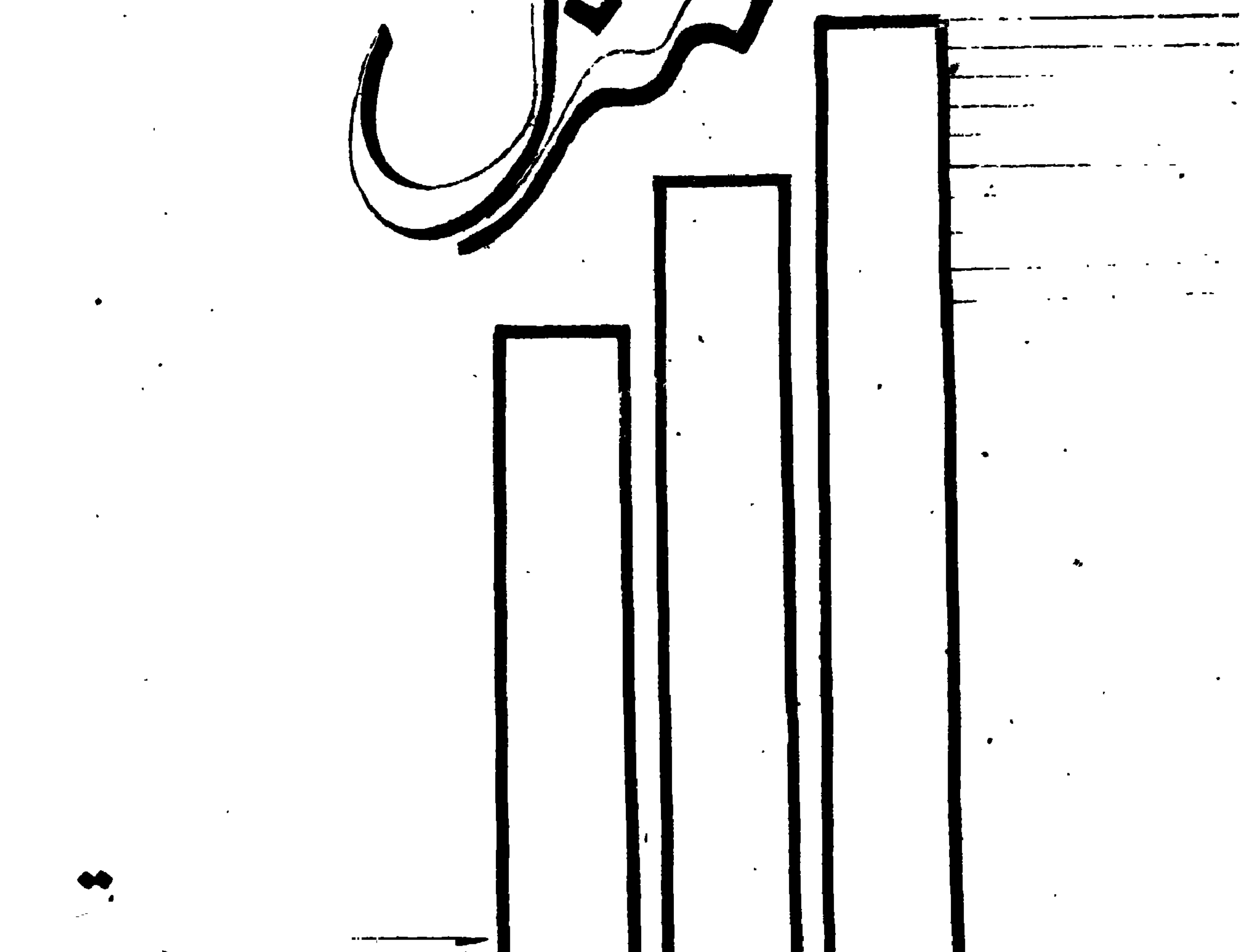
مرکزی مکتبہ اسلامی ایک علمی و تحقیقی ادارہ ہے جو اسلام کی حقیقی اور بے آمیز تعلیمات کو دورِ جدید کی زبان میں پیش کرنے اور اسلام کی روشنی میں آج کے معاشرے کے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے علمی کام میں مصروف ہے۔ جن مقاصد کے حصول کے لیے ادارہ کوشاں ہے وہ یہ ہیں۔

- اسلامی تعلیمات کو پوری تحقیق اور علمی تجزیے کے بعد جدید ترین اظہار کو اختیار کرتے ہوئے پیش کرنا اور تمدن، تاریخ، قانون، معیشت اور دوسرے دائروں میں جو مسائل درپیش ہیں ان کا حل اسلام کی روشنی میں پیش کرنا۔
- علمائے اسلام کے تحقیقی کارناموں کا ترجمہ، ترتیب نو، توضیح و تشریح اور اشاعت، اس طرح قدیم علمی خزانوں سے آج کے طالب علموں کی رسائی کا سامان کرنا۔
- عالم اسلام کے موجودہ مسائل اور مستقبل کے امکانات کے بارے میں صحیح اور حقیقت پسندانہ فہم پیدا کرنے کے لیے تحقیقی کام کرنا۔
- اسلامی موضوعات پر دورِ حاضر کے مسلم علمائے نمایاں کی وسیع اشاعت اور نفوذ کی خاطر دنیا کی اہم زبانوں میں بالخصوص اردو، انگریزی اور ہندی میں ان کے ترجمے اور اشاعت کا انتظام کرنا۔
- عام پڑھے لکھے لوگوں میں اسلامی تہذیب و تمدن، تاریخ اور مسلم دنیا کے موجودہ مسائل کا صحیح فہم پیدا کرنے کے لیے مناسب طرز کی عام فہم کتابوں کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا۔
- تعلیم کو مثبت اسلامی آہنگ دینے کے لیے اور اسلامی بنیادوں پر تشکیل شدہ ایک نئے نظام تعلیم کے ارتقا کی راہ ہموار کرنے کے لیے مختلف مراحل کی نصابی اور امدادی کتب کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا

○ نئی دنیا/ نئی روشنی پبلی کیشنز نئی دہلی

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر مولانا عبدالوحید صدیقی نے ۱۹۵۱ء میں بلیماران دہلی سے روزنامہ "نئی دنیا" جاری کیا تھا۔ اپنے دور کا اردو کا صف اول کا روزنامہ تھا بعض وجوہ کی بنا پر ۱۹۶۴ء میں بند ہو گیا۔ ۱۹۷۲ء میں مولانا نے اسے ہفت روزہ کی شکل میں نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے دوبارہ جاری کیا جو پوری آب و تاب کے ساتھ آج تک شائع ہو رہا ہے۔ اس کے موجودہ ایڈیٹر پرنٹر پبلشر مولانا کے صاحبزادے شاہد صدیقی ہیں۔ نئی دنیا دہلی کے تحت پبلشنگ کا ایک شعبہ نئی روشنی کے نام سے قائم کیا گیا جو اب تک متعدد دینی و ادبی کتابیں شائع کر چکا ہے۔

منزل بہ منزل



ہمارے غیر منظم مزدوروں کے لیے ... پاکستان ... سکیم

[illegible]

ناشرین و کتب فروش

دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، جامع مسجد دہلی
کتب خانہ انجمن ترقی اردو " " "
مدینہ بکڈپو اردو بازار " "
سینٹرل بکڈپو " " "
دینی بکڈپو " " "
کتب خانہ عزیزیہ " " "
کتب خانہ رشیدیہ " " "
مرکزی ادارہ تبلیغ دینیات " "
ندوۃ المصنفین " "
ادبی دنیا " " "
اہلوالیہ بکڈپو ۱۱۵۳ نیو روہتک روڈ پوسٹ بکس
موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ دریاگنج نئی دہلی
مکتبہ شان ہند فلیٹ نمبر ۶ انصاری مارکیٹ دریا گنج،
پنجابی پستک بھنڈار۔ دریبہ کلاں۔ دہلی
اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۱۴۹۱، گلی کوتانہ سوئیوالان دہلی
انجمن ترقی اردو ہند۔ اردو گھر۔ راؤز ایونیو نئی دہلی
مرکزی مکتبہ اسلامی۔ چتلی قبر۔ دہلی
گرین بکڈپو۔ ۱۱۶۲ پہاڑی املی دہلی
ساقی بکڈپو۔ اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی
ملن کمپنی۔ اردو بازار " "
ادارہ اشاعت دینیات حضرت نظام الدین نئی دہلی
تعمیر بکڈپو " " "
سلیم بکڈپو " " "
غالب اکیڈمی " "
نئی روشنی پبلی کیشنز حضرت نظام الدین ویسٹ مارکیٹ
صدیقی اشاعت گھر ۸ سینٹرل روڈ جنگپورہ بھوگل
خیر پبلی کیشنز ۲۹۱۰ لال دروازہ سرکیوالان لال کنواں

ربانی بکڈپو۔ لال کنواں دہلی
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس گلی عزیز الدین وکیل لال کنواں دہلی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی
ہمدرد سیلز۔ ہمدرد دواخانہ لال کنواں دہلی
الجمعیۃ بکڈپو۔ گلی قاسم جان اسٹریٹ دہلی
مکتبہ الرسالہ الجمعیۃ بلڈنگ "
سلوچ پبلیکیشن ۱۳ گل مہر پارک نئی دہلی
کتب خانہ حمیدیہ ۳۴۳ گلی گڑھیا جامع مسجد دہلی
چمن بکڈپو ۲۰۵ گلی گڑھیا بازار مٹیا محل دہلی
صنوحی پبلی کیشنز ۱۱۸۶ بلیماران دہلی
مکتبہ علم و فن ۵۱۰ مٹیا محل دہلی
بیسویں صدی پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ دریا گنج نئی دہلی
کادمبری پرکاشن اے ۴/۵ سدرشن پارک نئی دہلی
سمت نامہ پبلی کیشنز ۸/۴۸ راجندر نگر نئی دہلی
کرمانی پبلی کیشنز ۱۷۶۹ حوض سوئیوالان دہلی
نیشنل پبلشرز تلک نگر نئی دہلی
سطور پرکاشن ۱/۳۲۷۱ دہلی گیٹ نئی دہلی
معیار پبلی کیشنز K.2.C شیخ سرائے فیز ۲ نئی دہلی
اردو مجلس ۶۷۷ بازار چتلی قبر دہلی
خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی حضرت نظام الدین نئی دہلی
مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر نئی دہلی
ناز کتاب گھر، شاندار مارکیٹ چتلی قبر دہلی
پرنس بکڈپو ۴/۳ سی نیو روہتک روڈ نزد لبرٹی سینما قرولباغ
شار بک سینٹر آصف علی روڈ نئی دہلی
مکتبہ ذوق سلیم ۳۸۲۴ چوڑیوالان دہلی
کتاب والا ۲۷۹۴ پہاڑی بھوجلہ دہلی
گرگ اینڈ کمپنی ۴۸۴ کھاری باولی دہلی
نار پبلشنگ ہاؤس پہاڑی بھوجلہ اسٹریٹ دہلی
راج پال اینڈ سنز کشمیری گیٹ دہلی
سلطانیہ بکڈپو۔ آصف علی روڈ نئی دہلی
شمع بکڈپو۔ آصف علی روڈ نئی دہلی

شیریں انٹرپرائزز ۵ بیسمنٹ آشا دیپ ۹ ہیلی روڈ
ہمارا اردو پبلی کیشنز ۲۳۴۷ مٹیا محل دہلی
کتب خانہ اشاعت الاسلام چوڑیوالان دہلی
کتب خانہ رحیمیہ اردو بازار دہلی
لالہ لاجپت رائے اینڈ سنز سی ۲ کالکاجی نئی دہلی
نفیس بکڈپو ۴۲۳۵ کوچہ چیلان دہلی
پی کے بک آرگنائزیشن ۲۴ دلسی آنند نگر ۱۵ مدلوک
ہندوستانی کتب خانہ حضرت نظام الدین نئی دہلی
ہندپاکٹ بکس۔ دریا گنج نئی دہلی
ترقی اردو بیورو۔ ویسٹ بلاک ۸ آر کے پورم
مکتب رحمانیہ، دریا گنج نئی دہلی
ہمدم پبلی کیشنز ۳۴۳ ذاکر نگر جامعہ نگر نئی دہلی
پبلی کیشن ڈویژن۔ پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی
عصری آگہی پبلی کیشنز ۱/۱۲۱ رام نگر شاہدرہ دہلی
جیویلرز پبلشنگ ہاؤس ۵ رانی جھانسی روڈ نئی دہلی
عثمان بکڈپو۔ مینا بازار۔ شاہی گیٹ جامع مسجد دہلی
نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا ۵ اے گرین پارک نئی دہلی
سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن ۵
پنچشیل شاپنگ سینٹر نئی دہلی۔
زم زم بک ٹرسٹ بی کے ۱۲۰/ وشو کرما نگر شاہدرہ دہلی
پبلی کیشن ڈیپارٹمنٹ این سی ای آر ٹی شری اروبندو مارگ
مکتبہ دینیات آصف علی روڈ، نئی دہلی
غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ نئی دہلی
شعور پبلی کیشنز ۳۲۹۲ کوچہ روح اللہ خاں دریا گنج،
نازش بک سینٹر ترکمان گیٹ دہلی
ناظر پبلی کیشنز ۲۲۵ پنڈارا روڈ نئی دہلی
ساہتیہ اکیڈمی۔ رابندر بھون نئی دہلی
منوہر پرکاشن جے ۲۳ لاجپت نگر نئی دہلی
اعجاز پبلشنگ ہاؤس ۲۰۶۰ ناہر خاں اسٹریٹ
کتب خانہ مسعودیہ ۲۰۹۵ اردو بازار دہلی
صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز سی ۷ کرشن نگر دہلی
ادبی سنگم معرفت لبرٹی دیکل جامعہ نگر نئی دہلی
موڈرن انڈیا پبلی کیشنز گلی گڑھیا بازار مٹیا محل دہلی
سنٹرل نیوز ایجنسی کناٹ پلیس نئی دہلی
یو ایس ایس آر بک سنٹر کناٹ پلیس نئی دہلی
دین دنیا پبلشنگ ہاؤس جامع مسجد دہلی
تاج پبلشرز بیری والا باغ نئی دہلی
بک کارنر کناٹ پلیس نئی دہلی
کتاب بھون نزد کلاں محل دہلی
شاہد اکاڈمی ۔ مٹیا محل دہلی
اسلامی تبلیغی مشن ۔ گلی مٹیا محل دہلی
فرید بک ڈپو ۔ چتلی قبر دہلی
عاشقین بک ڈپو ۔ حویلی اعظم خاں ، دہلی
فانی بک ڈپو ۔ رنجیت نگر نئی دہلی
منصور بک ڈپو ۔ پہاڑی بھوجلہ دہلی
آستانہ بکڈپو ۔ سوئیوالان دہلی
رتن اینڈ کو ۔ دریبہ کلاں دہلی
اگروال بک ڈپو ۔ کھاری باؤلی دہلی
حنیفا بک ڈپو ۔ جامع مسجد دہلی
ورلڈ اسلامک پبلی کیشنز ۔ گلی کبابیان دہلی
سب رنگ کتاب گھر ۔ گلی قاسم جان دہلی
مکتبہ الحسنات ۔ پہاڑی املی دہلی
میر صلاح الدین حسام الدین اردو بازار جامع مسجد دہلی
ہمدرد ملت پبلی کیشنز ، ہمدرد مارگ لال کنواں دہلی ۶
اسلام اینڈ دی موڈرن ایج سوسائٹی جامعہ نگر نئی دہلی
شاہین پبلی کیشنز ۔ فلیٹ ۹۴ آل انڈیا ریڈیو ہاسٹل
گرزان روڈ نئی دہلی ۔
اسلامک پبلشنگ ہاؤس ۴۸۵ اردو بازار دہلی ۶

اترپردیش

نسیم بکڈپو ۴۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ
دانش محل ۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ
نصرت پبلشرز ۔ حیدری مارکیٹ امین الدولہ پارک لکھنؤ
واجد علی شاہ اکاڈمی ۵۶ کچا احاطہ لکھنؤ
رسالہ سرپنچ ۔ دارالاشاعت نسیم بک ڈپو لکھنؤ
حریم ۴۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ
صدیق بک ڈپو ۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ
الناس بک ڈپو ۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ
ادارہ فروغ اردو " "
مکتبہ دین وادب ۔ حیدری مارکیٹ امین الدولہ پارک لکھنؤ
کتابی دنیا ۔ نظیر آباد ۔ لکھنؤ
اردو پبلشرز " "
خورشید بک ڈپو نزد امین آباد ڈاکخانہ لکھنؤ
کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ
کتاب دان ۲/۴ بی ریور بینک کالونی لکھنؤ
تیج کمار بک ڈپو ۔ حضرت گنج لکھنؤ
رام کمار بک ڈپو " "
احباب پبلشرز ۔ مقبرہ عالیہ گولا گنج لکھنؤ
نایاب بک ڈپو ۔ نادان محل روڈ لکھنؤ
ہلال بک ڈپو ۔ کچہری روڈ لکھنؤ
اسلامی بک ڈپو ۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ
کتاب گھر ۔ نظیر آباد ۔ لکھنؤ
مجلس تحقیقات ونشریات اسلام پوسٹ باکس ۱۱۹ لکھنؤ
اردو اکادمی بلہرہ ہاؤس قیصر گنج لکھنؤ
مکتبہ رزاقی ۔ چوک لکھنؤ
مکتبہ اسلام ۔ ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ
مکتبہ فردوس ۔ مکارم نگر لکھنؤ
مکتبہ دارالعلوم ۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ
رفیق بک ڈپو ۔ طلاق محل ۔ کانپور
اسلامیہ بکڈپو " "
طلعت پبلی کیشنز مسلم کالج چمن گنج کانپور
حاجی غنی احمد بکسیلر ۔ مشن روڈ کانپور
کرانتی بک ڈپو ۲۵۶ نوین مارکیٹ کانپور
کتابستان ۳۰ چک الہ آباد
انجمن تہذیب نو بہادر گنج الہ آباد
شاہین پبلی کیشنز ۔ شوکت علی روڈ الہ آباد
مکتبۃ القرآن شوکت علی روڈ الہ آباد
شبستان شاہ گنج الہ آباد ۔
نکہت پبلی کیشنز ۔ رانی منڈی الہ آباد
شب خون کتاب گھر " "
رام نرائن بینی مادھو کٹرہ الہ آباد
پاسبان ۔ دائرہ شاہ اجمل ۔ الہ آباد
شاہ اجمل اشاعت گھر ۱۹۹ دائرہ شاہ اجمل الہ آباد
نفیس پبلی کیشنز ۔ شاہ گنج الہ آباد
گیتا پستک بھنڈار ۲۹ ہویٹ روڈ عقب بستی
ہوٹل الہ آباد
رائٹرس گلڈ ۔ ٹرنر ۲۸ ایونگ کرسچین کالج الہ آباد
اشرفی کتب خانہ ۔ بخشی بازار ۔ الہ آباد
نظامی کتابستان ۔ نخاس کہنہ ۔ الہ آباد
نیا ادارہ ۔ ۳۴ خسرو باغ روڈ الہ آباد
اردو کورس بکس ، دائرہ شاہ اجمل الہ آباد
کانپور بک ہاؤس ۔ لیڈر روڈ الہ آباد
ایوان پبلشرز ۔ نخاس کہنہ الہ آباد
شمع بک اسٹال چوک کلاک ٹاور سبزی منڈی الہ آباد
الہ آباد بک ہاؤس زیرو روڈ الہ آباد
مکتبہ دارالمصنفین ۔ مین بازار اعظم گڑھ
نعیم بک ڈپو ۔ صدر بازار پوسٹ مئوناتھ بھنجن اعظم گڑھ
کتابستان " "
رضوان بکسیلرز ۔ ڈاکخانہ مبارکپور مئوناتھ بھنجن "
شمیم بک ڈپو ۔ ڈاکخانہ سرائے میر ۔ اعظم گڑھ
کتاب سینٹر اعظم گڑھ
ہمدم بک ڈپو ۔ نزد پھاٹک پورہ چوک مبارکپور "
کتاب محل ۔ اعظم گڑھ

فرینڈس بک کارنر ۱۴۱ اسلامیہ مارکیٹ بریلی
قومی کتب خانہ بازار درزی چوک 〃
حافظ بک اسٹال اسٹیشن روڈ پیلی بھیت ۲۶۲۰۰۱
مکتبہ ناشر العلوم بنارا روڈ بجنور
مکتبہ علمیہ، قاضی منزل قاضی واڑہ میرٹھ
وجاہت علی بکسیلر نزد جامع مسجد دیوریہ
نیشنل بک ڈپو پوسٹ لار روڈ دیوریہ
نیا کتاب گھر تلسی مارگ دیوریہ
فرینڈس بک ڈپو ڈاکخانہ بھارگین اٹہ
راہی بکڈپو پل نزد لنگاباد اٹاوہ ۲۰۶۰۰۱
فتح پور بک ڈپو مسلم چوک فتح پور
مکتبہ جماعت اسلامی ترکاری منڈی فیض آباد
محمد شفیع بکسیلر چوک یادگار فیض آباد
موڈرن بک ہاؤس بہادر گنج شاہجہانپور
اسلامی بکس، مین گیٹ دارالعلوم دیوبند سہارنپور
ندیم بک سینٹر چوراہہ امر شان سول لائن علیگڑھ
ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی گیٹ علی گڑھ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ 〃
ادبی اکادمی آفتاب منزل شمشاد مارکیٹ 〃
انوار بک ڈپو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ 〃
شگفل بک ڈپو، شمشاد مارکیٹ 〃
کتب خانہ رحیمیہ دیوبند
〃 اعزازیہ 〃
〃 امدادیہ 〃
مکتبہ تجلی 〃
ادارہ القدیہ 〃
ملک پبلشرز 〃
مکتبہ فیض القرآن 〃
〃 دینیہ 〃
عظیم بکڈپو 〃
ادارہ دعوت القرآن 〃

مکتبہ تھانوی دیوبند
کتب خانہ قاسمی 〃
مکتبہ دانش 〃
ادارہ درس القرآن 〃
افغانی دارالکتب 〃
کتب خانہ فخریہ 〃
〃 محمودیہ 〃
ادارہ اسلامیات 〃
〃 علم وحکمت 〃
دارالکتاب 〃
مرکز ادب 〃
شاہ بک ڈپو 〃
جامعہ دینیات 〃
سالم کمپنی 〃
سردار بک اسٹال بس اسٹینڈ سلیم پور ۲۷۴۵۰۹ (دیوریہ)
فراست بکڈپو عقب مدینہ مسجد کھوکھران اسٹریٹ مرادآباد
کتب خانہ فخریہ بازار امروہہ گیٹ مرادآباد ۲۴۴۰۰۱
کتب خانہ عزیزیہ 〃 〃
اتحاد بک ڈپو۔ بساطی بازار جھانسی ۲۸۴۰۰۱
مکتبہ اسلامی ترکاری منڈی فیض آباد ۲۲۴۰۰۱
مکتبہ عزیزیہ لے ۳۳/۱۴۴ جیتن پالہ وارانسی
عبدالوحید بکسیلر دال منڈی 〃
مون جنرل ۳۷/۱ کھلاپار مظفرنگر
رامپور بک ڈپو بازار نصراللہ خاں رام پور
اورینٹل بک ڈپو 〃
مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی رامپور
سعید جنرل اینڈ بک اسٹال لاکھی گیٹ سہارنپور

مدھیہ پردیش

بھوپال بک ہاؤس۔ بدھوارہ۔ بھوپال
مکتبہ شرقیہ۔ ابراہیم پورہ 〃

پاپولر بک ڈپو۔ موتی مسجد بھوپال۔
فیو انڈیا بک ہاؤس۔ جہانگیر آباد بھوپال
سنٹرل بک ڈپو۔ ابراہیم پورہ 〃
اسٹوڈنٹس بک اسٹال ۱۴۴ ادوے پورہ اندور ۴۵۲۰۰۰
سیفی بک ڈپو نزد پاور ہاؤس منڈی بازار برہانپور
رشید بک ڈپو، منڈی بازار۔ برہان پور
پاپولر بک کارنر کھجوری بازار اندور
ذاہد بک ڈپو ۱۲ راجہ باڑہ چوک 〃
ہاشمی نیوز پیپر ایجنسی چھوٹی ملڈکری جبلپور
محسن بکڈپو ۹۰۸ راجہ باڑہ چوک 〃
ظفر بک ڈپو تال پارہ چوک۔ رائے پور
محمد حنیف بکسیلر اسلام پورہ حاتم ورکس روڈ پوسٹ
ساتا نوار دکھر گاؤں) ۴۵۱۱۱۱

بہار :

کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ ۸۰۰۰۰۴
بک امپوریم 〃 〃
پرویز بک ہاؤس 〃 〃
شکیل بک ڈپو 〃 〃
دانش کدہ دریاپور پٹنہ
بک ہاؤس 〃
عظیم الشان بک ڈپو سلطان گنج پٹنہ
پستک بھنڈار۔ گردنہ تر اروڈ پٹنہ
ودیا پیٹھ (مکتبہ اردو) سبزی باغ پٹنہ
امپیریل بک ڈپو پٹنہ
موتی لال بنارسی داس (ایوان ادب) اشوک راج پتھ پٹنہ
وینا پستک بھون (تعلیمی مرکز) خزانچی روڈ پٹنہ
بھارت بک ڈپو، اشوک راج پتھ پٹنہ
اقبال پبلشنگ ہاؤس۔ خزانچی روڈ 〃
بہار پبلشنگ ہاؤس۔ نیا ٹولہ پٹنہ
قاسمی بک ڈپو۔ بیربہور 〃

تیغ اسلامیہ کتب خانہ رمنہ روڈ پٹنہ
عاشق حسین اینڈ سنز نورانی منزل پٹنہ
زیور پبلیکیشنز۔ باقر گنج "
نیشنل بک ایمپوریم دودھ کٹورہ آرہ
ایم شرف الدین اینڈ سنز چوک آرہ
پیپر کارنر۔ ارار یہ کوٹ پورنیہ
کتب خانہ احمدیہ ارار یہ۔ "
قادری بک سینٹر شیخ محلہ سیوان
اسلامیہ بک ڈپو نیو مارکیٹ تاتار پورہ چوک
بھاگل پور سی ٹی
کمالیہ بک ڈپو۔ تاتار پورہ۔ بھاگلپور سی ٹی
ضیا بکڈپو۔ یارا پا۔ " "
بھارت بک ڈپو۔ پٹرول پمپ مین روڈ ہزاری باغ
شنکر بک اسٹال مین روڈ بیل ساند (سیتامڑھی)
شرقی بک سنٹر قلعہ گھاٹ دربھنگہ ۸۴۶۰۰۴
تاج بک ڈپو مین روڈ رانچی
سب رنگ کتاب گھر مینا روڈ رانچی
اصغر علی بکسیلر گنج نمبر ۲ بتیا (ویسٹ چمپارن)
سراج الحسن بکسیلر "
حیدر بک ڈپو محلہ گڑھ پورہ۔ بہار شریف
قومی کتب خانہ ملاری چوک پوسٹ لہری سرائے دربھنگہ
ایچ بی بکڈپو بہادر گنج "
الیس ایم زیڈ بک امپورٹر۔ معروف گنج گیا
اسلامیہ کتاب ہاؤس۔ مدرسہ اسلامیہ پوسٹ
رفیع گنج گیا۔
قومی بک ایجنسی۔ گھول سنگھ گیا
ساہتیہ سدن گوتم مارگ گیا
ظفر بک ڈپو جی بی روڈ "
بک فاؤنڈیشن نغمہ گیرنج سوراج پوری روڈ گیا
جمال بک ڈپو باری روڈ گیا
کلچرل اکیڈیمی۔ جگ جیون روڈ گیا۔

فرنیڈس نیوز ایجنسی۔ بلاقی روڈ گریڈیہہ
جاوید بک ڈپو۔ کالج روڈ بڑا بازار ہزاری باغ
آزاد کتاب گھر۔ ساکچی بازار جمشید پور
بہارا اسٹور۔ شاپ نمبر ۱۹ بلاک نمبر ۹ ساکچی بازار جمشید پور
آزاد بک اسٹور۔ سورت گنج نزد مسجد مدھوبنی
شمع بک اسٹال۔ اسٹیشن روڈ مظفر پور ۸۴۲۰۰۱
سب رنگ بک اسٹال موتی جھیل مظفر پور
تمثیل بک ہاؤس ڈاکخانہ کشن گنج پورنیہ
ہمارا کتاب گھر باگ دہرہ پوسٹ کدت ارایہ پورنیہ
اپنا کتاب گھر بڑا عیدگاہ۔ پورنیہ
یونیورسل بک اسٹال جنگی مسجد بتیا (ویسٹ چمپارن)
پاکیزہ اسٹور پورب سرائے مونگیر ۸۱۱۲۰۱

ویسٹ بنگال

عثمانیہ بک ڈپو ۱۰۴ لور چیت پور روڈ کلکتہ ۷۰۰۰۷۳
سوسائٹی بک پیلس ۷۷ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۷۰۰۰۰۱
نسیم بک ڈپو اینڈ لائبریری ۷۷ " "
دارالاشاعت اسلام " "
الوز بک ڈپو ۹۹/۱ اے لور چیت پور روڈ کلکتہ
جاوید بک ڈپو ۷۷ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ
ایم شبیر حسن اینڈ سنز ۱۰۳ رابندر سرانی "
شکیل بک ڈپو ۱۲۰/۱ لور چیت پور روڈ "
تاج بک ڈپو ۱۲/۱ لور چیت پور روڈ "
حاجی محمد سعید اینڈ سنز ۲۰ رفیع احمد قدوائی روڈ کلکتہ
صدیقیہ بک ڈپو ۱۰۷ لور چیت پور روڈ "
محمد الیاس ایجنٹ کولوٹولہ اسٹریٹ "
شمیم احمد پیپر مرچنٹ معرفت عبدالقادر ۲۸ فیرس لین میدان
مسجد کلکتہ
مظہر احسن بکسیلر اے ۴/۷ بار پورن روڈ کلکتہ
ویسٹ بنگال اردو اکیڈیمی ۱۸ ڈاکٹر سندری موہن ایونیو کلکتہ
اقدار کتاب گھر ۲۵/۱ شمس الہدیٰ روڈ کلکتہ ۷۰۰۰۱۷

ادارہ انشائے ماجدی ۱۴۷ رابندر سرانی کلکتہ ۷۰۰۰۰۷
تجمل حسین صاحب نیوز پیپر ایجنٹ ۱۲۰ لور چیت پور
روڈ کلکتہ
غلام مصطفی بکسیلر ۱۲ ذکریا اسٹریٹ کلکتہ
شاہین بک ڈپو جامع مسجد آسنسول (ویسٹ بنگال)
مکالمہ بک ڈپو۔ پکا بازار آسنسول "
ریاض بک ڈپو ۲ بی ایم بستی (تھرڈ لین) شب پور
ہاوڑہ (ویسٹ بنگال)
ایم آئی انصاری بکسیلر ۸ بی ایم بستی (تھرڈ لین) "
اعجاز بک ڈپو۔ ضیاء الاسلام ۱/۱۰ ایلے بی لین روڈ ہاوڑہ

اڑیسہ

بک لینڈ بخشی بازار کٹک ۷۵۳۰۰۱
نور محمد اینڈ سنز " " "
احمد بک ڈپو " " "
سی ٹی امپوریم " " "
انڈیا بک ہاؤس " " "
شیریں بک ڈپو بخشی بازار درشن روڈ کٹک
نورانی بک اسٹور پوسٹ بنجھار پور ضلع کٹک
حبیبی کتاب گھر نزد مدرسہ قادریہ حبیبیہ جامع مسجد سعید کٹک
سلطانیہ بک اسٹور ۵۰/۱ ایچ سیکٹر ۱۵ راؤرکیلا اڑیسہ

آندھرا پردیش

سلامت ٹریڈنگ کمپنی پوسٹ کدری آننت پور
نسیم بک اسٹال " "
عزیز الدین کوثر بک ایجنسی "
ایم جے بک اسٹال بس اسٹینڈ ٹیڈا پتری آننت پور
کمال اسٹورس بکسیلر اقبال روڈ احمد نگر
الیس ایم مستری نیوز پیپر ایجنٹ احمد نگر
سعیدہ بک ڈپو بڑا امام اسٹریٹ گنٹور
رحمانیہ بک ڈپو پوسٹ کانا گلہ "

حبیبیہ بک ڈپو پوسٹ کانگہ گنتور ۳
اسلامیہ بک ڈپو کرنول
ضیاء بک ہاؤس کرنول
سوار میگزین سینٹر نیو چاند ٹاکیز۔ کرنول
محمد علی بک ڈپو۔ مومن پورہ گلبرگہ ۴ (کرناٹک)
مکتبہ رفاہ عام آر نمبر ۲۲ درگاہ خواجہ نواز ،،
نصرت بک ایجنسی کوئن روڈ۔ انجمن بلڈنگ ہبلی
جمیل بک ہاؤس بھنڈی واڑہ بیس ہبلی
رفعت بک ایجنسی گانی گلی ہبلی
طاہر بک ایجنسی بھنڈی واڑہ ،،
ادبی ٹرسٹ بک ڈپو۔ عابد روڈ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
ادارۂ شعر و حکمت ۵-۸۶۵-۶-۱۱ لکڑی کاپل ۴
اردو اکیڈمی بک ڈپو آندھرا پردیش سیف آباد ،،
نیشنل بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
الیاس ٹریڈرس ۶۴۶-۲-۲۳ شاہ علی بنڈہ روڈ ،،
مکتبہ شعر و حکمت ۶۴۷-۲-۲۳ بازار نور الامراء حیدرآباد
زندہ دلان حیدرآباد ۴ مجر گاہ معظم جاہی مارکیٹ ،،
شالیمار پبلی کیشنز نیا ملک پیٹھ حیدرآباد
اسٹوڈنٹس بک ڈپو۔ چار مینار ،،
مینار بک ڈپو چار کمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
ہاشمی بک ڈپو۔ مچھلی کمان حیدرآباد
حیدر اینڈ سنز بکسیلر اینڈ پبلشرز مچھلی کمان ،،
کمرشیل بک ڈپو چار مینار حیدرآباد
حسامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان ،، ۲
آندھرا پردیش اردو اکیڈمی ہاؤس نمبر ۱۲/۱-۹-۵
عقب اے بی آفس) سیف آباد حیدرآباد ۴
بک ورلڈ بکسیلر چوک حیدرآباد
تاج بک ہاؤس مچھلی کمان ،،
نیو دکن بکسیلر مسجد چوک ،،
حیدری بک ڈپو چھتہ بازار ،،
پیوپلز بک اسٹال پیوپلز ٹوریل کالج گن فاؤنڈری ،،

سی ٹی بک ہاؤس مرلی دھر باغ جے این روڈ حیدرآباد
مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد
کوالٹی بک سینٹر چوک حیدرآباد
انصاری بک اسٹال ،، ،،
اسٹیٹ بکس ہاؤس کھمی گوڑا چورستہ حیدرآباد ۵۰۰۰۲۷
بک فیلڈ ۲/۲۴۴-۱-۱ بھولگل ،، ۵۰۰۰۰۱
تھنکرس انٹرنیشنل ۵۰ ہنڈرڈ فیٹ روڈ اندرا نگر بنگلور
اردو لائبریری سینٹر ۳ سی ٹی مارکیٹ بنگلور ۲
رضوان سرکولیٹنگ لائبریری ۱۲ چاندنی چوک روڈ ،،
مسلم بک ڈپو ۱۳ سی ٹی مارکیٹ بنگلور
بنگلور بک ہاؤس نمبر ۷ اخلاصی پلیاں مین روڈ بنگلور
ہمدرد بک ڈپو نمبر ۵ نیو مارکیٹ بنگلور سٹی
کمال بک سینٹر اردو لائبریری ۱۶ لارنس اسٹریٹ ملاگنڈا
پالیم بنگلور
بک لینڈ ۳۳ ادار بمبو بازار روڈ کراس بنگلور
دینی کتب خانہ کمبارپیٹ مسجد بنگلور ۲
محبوب بکڈپو عقب رسل مارکیٹ بنگلور ۱
آفتاب بک ایجنسی کلاس پالیم مین روڈ بنگلور ۲
جاوید بک ہاؤس چاندنی چوک کولار (میسور)
الیس اے ستار بکسیلر ،،
محبوب کتب خانہ تنظیم نزد مسجد بیجاپور (میسور)
الطاف بکڈپو بڑی کمان ،،
گلستاں ایجنسی اردو روز نمبر ۳۲ ۲۸ ساؤدی روڈ میسور
نعمان اینڈ سنز (بک سیلر) شیواجی روڈ میسور
آفتاب بک ڈپو عقب درگاہی مسجد ساؤدی روڈ میسور
عابد بک ڈپو حاجی پیر منزل ،، ،،
میرا حل حسین معرفت آزاد بک ہاؤس میسور
ایچ ایم عبدالعزیز بکسیلر اینڈ نوٹ وریڈر خیٹ سبھاش اسکوائر
حصار (میسور)
نظیر بک ڈپو ۳۰۳ ٹریپلیکین ہائی روڈ مدراس ۵
اے جے یو الیس بک ایجنسی اپارش ڈاکٹر وینکیٹ چلاآئر

اسٹریٹ مدراس ۶۰۰۰۰۱
گوہر ریس اینڈ بکڈپو ۳۴۴ ٹریپلیکین ہائی روڈ مدراس ۵
تامل ناڈو اردو پبلی کیشنز ماؤنٹ روڈ ،،
گوہر بکڈپو ٹریپلیکین ہائی روڈ ،،
مسٹر جمیل الدین احمد (بکسیلر اینڈ نیوز پیپر) جینٹ
نزد مسجد رت کلیورہ بدار ۵۸۵۴۰۱ (کرناٹک)
انڈیا بک ہاؤس کٹی دروازہ رائچور ۵۸۴۱۰۱ ،،
شاہجہاں بکسیلرس اسٹینڈ پوسٹ لنگ سوگر ۵۸۴۱۲۲
مانچور (کرناٹک)

جموں/کشمیر

راما اسٹیشنری مارٹ راج تلک روڈ جموں
رادھا کرشن آنند اینڈ کو۔ پکا ڈنگا ،،
لاجپت رائے چڈھا اینڈ سنز ،،
جے کے بکس ہاؤس ریزیڈنسی روڈ جموں توی
شیخ محمد عثمان اینڈ سنز گاؤ کدل سری نگر ۱۹۰۰۰۱
شیخ غلام محمد اینڈ سنز معصومہ بازار ،،
بک کارنر مولانا آزاد روڈ ،،
مکتبہ علم و ادب ریذیڈنسی روڈ ،،
کشمیری سلیس سنٹر بادشاہ چوک ،،
عبداللہ نیوز ایجنسی فرسٹ برج لال چوک ،،
سری نگر بک شاپ۔ بادشاہ چوک امیرکدل ،،
مکتبہ جماعت اسلامی نواب بازار۔ سری نگر
عالمگیر بک اسٹال عالمگیر بازار ،،
سکندر نیوز ایجنسی لال چوک ،،
جامعہ بک ڈپو۔ مجاہد منزل روڈ شاہی مسجد ،،
مکتبہ گلزار ابراہیم ،، ،، ،،
علی محمد اینڈ سنز بادشاہ بلڈنگ لال چوک ،،
کیپر برادرس لال چوک امیرکدل ،،
ہرنام داس اینڈ برادرس پبلشرز اینڈ بکسیلرز ڈوگرا جموں
چنی لال ستیش کمار بکسیلر مین بازار پونچھ جموں اینڈ کشمیر

غلام نبی خاں اینڈ سنز بکسیلر سہیگاہ بلڈنگ
تمسال مارکیٹ کشمیر
شانذر ڈبک اسٹال مہپتال روڈ مہدارا کشمیر
شاہین بک اسٹال اینڈ پبلشرز سری نگر
ادارۂ ادب ۶ ۹ سم حیاہ بگر سری نگر
مکتبہ اردو ادب صہبائی اسٹریٹ کبی حیاد نی بجو
مکتبہ معمار التسانیت نیو چوک اننت ناگ (جموں کشمیر)
روبل بک اسٹال اننت ناگ ، ،
محمد حسن بکسیلر ، ،
کالج بک ڈپو فرسٹ فلور سی بلڈنگ بارہ مولا ، ،
مکتبہ جماعت اسلامی بارہ مولا ، ، ،
ملہا جنرل اسٹور ، ،
جنرل بک اسٹال ، ،
مکتبہ ادبی مرکز ، ،
لونی نیوز ایجنسی بانڈی پور
ہل مین بکسیلر سعد پر واہ ،
برج لال پردیپ کمار بیار پونچھ ،
کپور بک کارنر ڈپو منٹو برج سوپور ،
میر برادرس بکسیلر منٹو برج سوپور
شاہ اینڈ کمپنی سوپور رجبے اینڈ لے
مکتبہ چراغ راہ نزد حاجی مسجد ریذ کراس روڈ سری نگر

مہاراشٹر اسٹیٹ

صدیق بک ڈپو بھنڈی بازار محمد علی روڈ بمبئی
ظفر بکڈپو ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳....۴
شمس بیلی کیشنز ۴۹ وی لے ویرانی مارگ بمبئی ۸
برگ اینڈ کو بکسیلر ۱۰۶ اسی پی ٹینک بمبئی ۸
خیابان پبلی کیشنز پرنس بلڈنگ ۱۹ ابراہیم رحمت اللہ روڈ
مہاراشٹر اردو اکیڈمی نیوز اینڈ سٹریٹ بلڈنگ ۸ ادنی منزل
دیل پبلی کیشنز ۸۰ احمل بھون نمبر ارجن ڈرائیو برج گیٹ بمبئی ۲
علی بکڈپو محمد علی روڈ بمبئی

کریمی پریس بک ایجنسی ۴... ۱۱ ایم حبیب روڈ بمبئی
این پی کتاب گھر نزد جے جے اسپتال بمبئی
عثمانیہ بک ڈپو بھنڈی بازار ،
تاج بک ڈپو محمد علی روڈ ،
مکتبہ جامعہ لمٹیڈ پرنس بلڈنگ جے جے اسپتال بمبئی
سعیدی بکڈپو بھنڈی بازار بمبئی
صادق کتب خانہ ،
اقبال بک ڈپو محمد علی روڈ ،
فیصل انٹرنیشنل بک ہاؤس جمال بلڈنگ تیسری منزل
ناگ دیوان اسٹریٹ بمبئی
ناز بک ڈپو بھنڈی بازار ،
جاوید بک ڈپو ہاشم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳....۴
اودرسیز بک سنیٹر معرفت ریلوے بلاک ۱۳ فلیٹ نمبر ۱
سانتا کروز بمبئی
سیماب اکیڈمی ۲۰۸ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی
حنیف بک ڈپو مومن پورہ ناگ پور
مکتبہ جماعت اسلامی بکسیلر محمد علی روڈ ناگپور
احباب بکڈپو مومن پورہ ،
لطیفیہ بک ڈپو محمد علی روڈ مومن پورہ ،
بھارت بک ڈپو کنیا گھاٹ ،
نفیس بک ڈپو ۴۲ ماگا بھائی جیل مارکیٹ پونہ سی ٹی
اسلم بک ڈپو ۱۹۱۵ بلنڈیل روڈ پونہ
آفتاب بک ڈپو قدوائی روڈ مالیگاؤں (ناسک)
سلمان اختر اینڈ برادرس بکسیلر ۸۵ نیا پورہ مالیگاؤں ،
اردو بک ایجنٹ ۸۵۴ نارتھ قصبہ کھولا پور
ناز بک ڈپو لتا کرنجا اورنگ آباد (مہاراشٹر اسٹیٹ)
فیس بکسیلر ۵۰۴ شکور وار پیٹھ شولاپور
سید علیم الدین نیوز پیپر ایجنٹ سٹی چوک اورنگ آباد
سعید بک ڈپو گاندھی چوک شاہ گنج ،
مقبول ناول گھر سٹی چوک ،
سعید بک ڈپو مومن پورہ تیجنا پیٹھ اکولہ

صدیق بک ڈپو ایلچ پور امراوتی
رشید ناول گھر کباڑی پورہ اورنگ آباد
اجنتا بک ہاؤس ناول گھر شاہ گنج ،
فرحان بک ایجنسی ۳۲۶ محمد علی روڈ مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳ ناسک
اسد بک ایجنسی پوسٹ عمرکھیڈ ضلع یوت مال
قادر بک اسٹال ۱۵ اکریم منزل پلٹن روڈ بمبئی ۱....۴
مکتبہ اسلامی ۶۷ او احمد محلہ تھانہ روڈ بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲
اسلم بک ڈپو ۱۹۱۵ بلنڈیل روڈ پونے ۴۱۱۰۰۱
مدینہ بک ڈپو نزد مسجد مدینہ اسلام پورہ مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳

راجستھان

گورنمنٹ کالج کوآپریٹو اسٹور لمٹیڈ اجمیر (راجستھان)
سُنّی کتاب گھر قندھاری واڑی بالسواڑہ ،
ویلیس ٹریڈرس مال پورہ ہاؤس لوہاروں کا کھورا
گھاٹ گیٹ جے پور (راجستھان)
مسکین بکڈپو بیوپاریوں کی مسجد موتی ڈونگری مسجد جے پور
ایس ایس بکسیلر سکار راجستھان
اودے پور بک اسٹور چیتک سرکل اودے پور
بک کارنر مہارانا بھوپال کالج اودے پور

گجرات

کلیم بک ڈپو عقب کریما پولیس اسٹیشن خاص بازار احمد آباد
لقمان بک ڈپو خاص بازار احمد آباد
شیرازی بک ڈپو استوریہ گیٹ احمد آباد
رضوان بُک سٹرس شاہ پور ناگوری واڑہ ،
بزم توفیق طائی اسٹریٹ محمود دروازہ بڑودہ
کلاسیکل لٹریچر نواب باڑہ پوسٹ باکس ۲۵ پٹن گجرات ۵۰۰۰۰

اخبار/رسائل

ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶
سنٹرل پوسٹ آفس بمبئی ۴....

جھنگ" دی کھیان اکیڈمی ریتہ ہاؤس جگیون روڈ گیا
سب رس" ادارہ ادبیات اردو پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۰
عظیم" اثر پبلی کیشنز کریم گنج گیا ۸۲۳۰۰۱
سابق" ۲۸ ایروڈا پلنہ ۸۰۰۰۰۱
مجلہ" مجلہ پبلی کیشنز مئو ناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱
جواز" ایم اسعد ڈ نیا پورہ مالیگاؤں ناسک ۴۲۳۲۰۳
سہ ماہی اتفاقات" کوٹ سڑک روڈ دہلی ۱۱۰۰۰۶
علمی تصویر یاسے ۲۲۴/۶-۰-۳ گرین پیلس حمایت نگر حیدرآباد ۵۰۰۰۲۹
سنہ" ۱۸۹۰ کوچہ چیلان دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
شب خون" ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد
نگارش" ۹ بیر بل روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴
کتاب نما" جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
بیسویں صدی، بیسویں صدی پبلی کیشنز دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
عکس نو" محلہ قلعدار فتح پور ۲۱۲۶۰۱
گلکدہ" رستم نول سہسوان (بدایوں)
جامعہ" جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
حریم" نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ
آستان کے تنکے" سی ایم وائی پبلی کیشنز ۴۷۷، ادی
اسٹریٹ تاڑ پیٹ وانمباڑی ۶۳۵۷۵۳
سمط" ۱۴ سید صالح لین کلکتہ ۷
دو ماہی الفاظ" ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ
علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
سہ ماہی ذخیرہ" اردو میگزین کاشانہ کنول جی ایم خان روڈ
کرسٹی احمد آباد ۳۸۰۰۲۱
پندرہ روزہ "تعمیر گام" ۹۲۲ روح اللہ خاں اسٹریٹ
دریا گنج دہلی ۱۱۰۰۰۲
پندرہ روزہ چنگاری" ۱۴۱/۳ رام نگر شاہدرہ دہلی ۱۱۰۰۳۲
سہ ماہی سائنس کی دنیا" پبلی کیشنز اینڈ انفارمیشن ڈائریکٹریٹ
ہلسا مگر روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۲
ماہنامہ روبی" روبی میگزین نیتاجی سبھاش مارگ
دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ (۸) الانصاف روڈ دریا گنج نئی دہلی

ماہنامہ شمع" آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
ماہنامہ ہمارا دور" ۳۲۷۴ شیا محل دہلی ۱۱۰۰۰۶
تخلیق نو اردو میگزین" ۵۰۴ دنیجر ہٹی ناکہ بھیونڈی (ایم ایس) ۴۲۱۳۰۲
سہ ماہی اکیڈمی. اتر پردیش اردو اکیڈمی ۱۸ آنند نگر روڈ
قیصر باغ لکھنؤ.
سہ ماہی الائی ابیڑھی والا گھر کٹرہ شباب خاں، اٹاوہ (یوپی)
گفتگو" ۴ گھیتان بھون جے ٹاٹا روڈ بمبئی
پرواز ادب" ایڈیٹر اردو سبھا شاد سہاگ پنجاب پٹیالہ
ہفتہ وار ہماری زبان" اردو گھر راؤز ایونیو نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
حیات" اجے بھون ۱۵ کوٹلہ مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
ماہنامہ پیام تعلیم" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
پندرہ روزہ آواز" پی ٹی آئی بلڈنگ سیکنڈ فلور نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
ماہنامہ نیا دور. پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ
ماہنامہ تعمیر ہریانہ" محکمہ تعلقات عامہ ہریانہ ایس سی او ۱۹۱
۱۸۹ اسکیئر ۱۷ سی چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۷
"آندھرا پردیش" محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ گرہ کلپ
مکرم جاہی روڈ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
"آجکل" پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
ماہنامہ یوجنا" پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
رسالہ شعور" ۹۲۳ کوچہ روح اللہ خاں دریا گنج نئی دہلی ۲
"معیار" کے ۳۰ سی شیخ سرائے فیز II نئی دہلی
ماہنامہ سوویت دیش" ایمبیسی آف یو ایس ایس آر ۲۵ بارہ
کھمبا روڈ نئی دہلی
ماہنامہ سوویت جائزہ" ایمبیسی آف یو ایس ایس آر " "
"اشاعت حق۔ دیوبند
"روزنامہ رہنمائے دکن" ۱۸۰ افضل گنج حیدرآباد ۵۰۰۰۱۲
"سیاست" جواہر لال نہرو روڈ پوسٹ بکس نمبر ۱۹۷ "
"انقلاب" ۱۵۶ ڈی ایچ دادا جی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۳۴
"ہند سماچار" سول لائن جالندھر ۱۴۴۰۰۱
"سیاست جدید" سیاست بلڈنگ سیاست اخبار روڈ چمن گنج

پوسٹ بکس نمبر ۱۴۸ کانپور ۲۰۸۰۰۱
ہفتہ وار عکاس" چیتر بھون ایونیو ساتویں منزل کلکتہ ۷۰۰۰۱۲
"روزنامہ الجمعیۃ" ۵۰۲ الجمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶
"ملاپ" ملاپ بھون ۸ اے بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی ۲
" - ملاپ روڈ جالندھر سٹی
پرتاپ" پرتاپ بھون بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی ۲
" - نہرو گارڈن روڈ جالندھر ۱۴۴۰۰۱
"تیج" ۸ بی بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
"شیر پنجاب" ۲۰۹/۲۱ ہیم کنت ہاؤس ۶ راجندر پلیس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸
"دیروزہ" مئو ناتھ بھنجن (یوپی)
"صدائے عام" مراد پور پٹنہ ۸۰۰۰۰۴
"سنگم" دریا پور "
"ساتھی" مراد پور "
"دیش پردیش" کلہڑیا ہاؤس اشوک راج پتھ پٹنہ ۴
"ان دنوں" سبکتا پہاری پٹنہ ۸۰۰۰۰۶
"قومی تنظیم" سبزی باغ ۸۰۰۰۰۴
"صداقت" " "
"پیغام نہرو" " "
"راہرو" پھلواری شریف "
"اتحاد وطن" سبزی باغ "
"ہمارا نعرہ" " "
"پیغام سچے" کلہڑیا ہاؤس "
"عظیم آباد ایکسپریس" سبزی باغ "
"پیغام اندرا" پھلواری شریف "
ہفت روزہ ایک قوم" پھلواری شریف پٹنہ ۴
"آئین نو" شریعت کالونی "
"کوہکن" سبزی باغ "
"لوک لہر" نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
"میرا پیغام" حیدرآباد ۵۰۰۶۵۹
"اورنگ آباد ٹائمز" "

ہفت روزہ 'ایک قوم' بھوتر لوکھر
روزنامہ 'پیام' ۷ ہمایوں باغ کانپور
" 'آج' مولانا آزاد روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۸
ہفت روزہ 'بلٹز' کلاس جی ٹیل اسٹریٹ بمبئی ۱
روزنامہ 'دعوت' سوئیوالان دہلی
" 'آبشار' فیرس لین کلکتہ
" 'منصف' حیدرآباد
" 'مسلمان' والاجاہ روڈ مدراس
" 'ندیم' ندیم روڈ بھوپال
" 'اردو ٹائمز' مولانا آزاد روڈ بمبئی
" 'قومی آواز' بشیشور ناتھ روڈ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱
" 'ہیرالڈ ہاؤس بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی ۲'
" شیام سدن اکزی بیشن روڈ پٹنہ
" " ۴ ، بی گورنمنٹ انڈسٹریل اسٹیٹ کاندیولی بمبئی
" 'افکار' بھوپال
" 'ہندستان' ۲۵۹ مولانا آزاد روڈ ناگپاڑہ بمبئی
ہفت روزہ 'ندائے ملت' ۹۹ گوئن روڈ لکھنؤ ۱
" 'رہنمائے ملت' ۱۰۲ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳
'مشعل آزادی' علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
پندرہ روزہ 'حق' سری نگر

غیر ملکی اخبار / رسائل

ماہنامہ 'ماہِ نو' ۳۲ اے حبیب اللہ روڈ لاہور
" 'تخلیقی ادب' ۳ ڈی ۲ پہ ناظم آباد کراچی ۷
" 'ماحول' ۴ نیڈل روڈ چاٹگام بنگلہ دیش
" 'اردو زبان' مکتبہ اردو زبان ریلوے روڈ سرگودھا
" ماہنامہ 'ادب لطیف' ۳۳ سی گلبرگ ۲ لاہور
" 'افکار' مکتبہ افکار۔ رابسن روڈ لاہور
" 'اوراق' چوک اردو بازار "
" 'نقوش' ادارہ فروغ اردو مال روڈ لاہور
" 'نیرنگ خیال' بی ۳۱ لیاقت روڈ راولپنڈی

ماہنامہ 'فنون' ۴ ۷ انار کلی لاہور
" 'جہاد' پوسٹ بکس نمبر ۴۴۲۳ ایران
" 'ندائے اسلام' " " ۳۴۴۳-۴۱ تہران ایران
ہفت روزہ 'چٹان' چٹان پرنٹنگ پریس ۸ میکلوڈ روڈ لاہور
" 'اخبار جہاں' کراچی
" 'مشرق' لاکسٹن پبلشرز لمیٹڈ ۴۲ کلیڈ دین روڈ لندن
این ۱۱ (یو۔ کے)
" 'صدائے وطن' ۳ بلال گنج لاہور
'خلیج ٹائمز' پوسٹ بکس نمبر ۱۱۲۴۳ دوبئی
روزنامہ 'نوائے وقت' ۴ ایم اے جناح روڈ عقب
مزار قائد ملت کراچی ۵
ہفت روزہ 'انقلاب' ۳۳ لیبورن ہاؤس ۶ ۱ اے
خوری ڈچ ہاؤس اسٹریٹ لندن ای ۱
" 'ملاقات' ۴۲ کلیڈ دین روڈ لندن این ۱۱ (یوکے)
" 'تعمیر' ۴ ۲ العباس مارکیٹ راولپنڈی پاکستان
" 'آتش فشاں' شبستان سینما بلڈنگ البرٹ وکٹر روڈ لاہور
روزنامہ 'جنگ' پوسٹ بکس نمبر ۵۲ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

اردو اکیڈمی

اترپردیش اردو اکیڈمی ۱۲ آر کے نٹن روڈ لکھنؤ
بہار اردو اکیڈمی ۸ بی شری کرشنا پوری پٹنہ ۴
راجستھان اردو اکیڈمی ۱۳ اکینار انائی ناٹس کارپوریشن
ٹرینٹ ماہمگا روڈ بنگلور ۵۶۰۰۰۲
مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی ۳/۸۶ ایر فیسر کالونی بھوپال
مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی جنرل ایڈمنسٹریٹیو ڈیپارٹمنٹ
نیو ایڈمنسٹریٹو بلڈنگ ۸ ادیں منزل بمبئی ۴۰۰۰۳۲
دہلی اردو اکیڈمی ڈیپارٹمنٹ آف لینگویجز دہلی ایڈمنسٹریشن
۵ علی پور روڈ دہلی۔
ویسٹ بنگال اردو اکیڈمی ۱۷ اسٹریٹ موہن ایونیو کلکتہ
آندھرا پردیش اردو اکیڈمی ۴۲۳۷ ۔ ۱۱ اے سی گارڈس حیدرآباد

یونیورسٹی / کالج

صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ
صدر شعبہ اردو ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ
صدر شعبہ اردو رانچی یونیورسٹی رانچی
صدر شعبہ اردو بھاگلپور " بھاگلپور
صدر شعبہ اردو مگدھ " گیا
صدر شعبہ اردو پنجاب " چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۴
" اردو فارسی اور پنجابی پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ
" اردو گورونانک دیو یونیورسٹی امرتسر
" " راجستھان " جے پور
" " کلکتہ " کلکتہ
" " بمبئی " بمبئی
" " گجرات " احمدآباد
" " مراٹھواڑہ " اورنگ آباد
" " الہ آباد " الہ آباد
" " فیکلٹی آف آرٹس ایم ایس یونیورسٹی بڑودہ
شعبہ عربی۔ کالی کٹ یونیورسٹی کالی کٹ
صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی
صدر شعبہ اردو کرناٹک " دھارواڑ
" " جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
" " گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور
" " اندور " اندور
" " حیدرآباد " حیدرآباد
" " لکھنؤ " لکھنؤ
" " کشمیر " سری نگر
" اردو و فارسی شری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی
" " اودے پور یونیورسٹی اودے پور
" " وکرم " اوجین
" " بنارس ہندو " وارانسی
" " علی گڑھ مسلم " علی گڑھ
" " گورنمنٹ کالج ٹونک راجستھان

صدر شعبہ اردو رضا کالج رامپور
〃 رانچی 〃 رانچی
〃 ایس ایس میموریل 〃 کنکے روڈ رانچی
〃 پٹنہ کالج پٹنہ
〃 بی این کالج 〃
〃 آر ڈی ایس کالج مظفرپور
〃 ایل ایس کالج بہار یونیورسٹی مظفرپور
〃 پوسٹ گریجویٹ کالج 〃 آف جموں جموں
〃 کریمیہ 〃 اندور
〃 ڈی این آر 〃 پوسٹ بھیماورم
ویسٹ گوداوری (آندھرا پردیش)
صدر شعبہ اردو کسان کالج سیوہ سرائے بہار شریف نالندہ
〃 انوگرہ نارائن میموریل کالج گیا
〃 بریلی کالج بریلی
〃 راونشا کالج کٹک (اڑیسہ)
〃 شری ایچ کے آرٹس کالج آشرم روڈ احمدآباد
〃 اردو ایس بی وینیس کالج مشن روڈ کٹک (اڑیسہ)
〃 فقیر موہن کالج بالاسور (اڑیسہ)
〃 بی جے بی کالج بھونیشور 〃
〃 جاجپور 〃 جاجپور 〃
〃 بھدرک 〃 بھدرک 〃

قلمکار

آل احمد سرور ۵ پروفیسرز کوارٹرز کشمیر یونیورسٹی سری نگر
اختر الایمان ۵۵ بینڈ اسٹینڈ ۱۲ آئین سنڈ باندرہ بمبئی
آنند نرائن مُلا انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر نئی دہلی
ابو محمد سحر ۳۹ مالویہ نگر بھوپال
اختر بستوی شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور
انور صدیقی۔ صدر شعبہ انگریزی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی
احمد جمال پاشا لٹاما افزا سیوان (بہار)
اقبال متین ۲-۳-۲۴۶/۴ یاقوت پورہ حیدرآباد

آصف الباحسن ۱۴۴ پٹودی ہاؤس کیننگ روڈ نئی دہلی
آغا رشید مرزا۔ ۱۴/۲ کانگرس اگزیبیشن روڈ کلکتہ ۱۷
اختر سعید اندرون اتوارہ بھوپال
عزرا فضل ۹۸ لورجیت پور روڈ کلکتہ
آزاد گلاٹی۔ گورنمنٹ کالج۔ نابھہ (پنجاب)
ابراہیم یوسف ۱۶ ایم روڈ امام گیٹ بھوپال
اخلاق اثر صادق منزل چوکی امام باڑہ 〃
افتخار امام صدیقی۔ مدیر شاعر دنیا تھوٹلیڈنگ بیر انٹرلہ
نزد شیو روشن ٹاکیز بمبئی
انل ٹھکر ۸۔ اشوک نگر ہبلی (کرناٹک)
ابو الکلام قاسمی۔ شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
اجمل اجملی سوویت لینڈ (اردو) ۲۵ بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
اسلم عمادی ۲۸/۱۱-۴-۱۰ ہمایوں نگر حیدرآباد ۵۰۰۰۲۸
الیاس احمد گدی۔ فتحپور لین۔ محلہ جھریا (بہار)
آنند موہن زتشی گلزار دہلوی۔ ایڈیٹر سائنس کی دنیا نئی دہلی
اسلم پرویز۔ شعبہ اردو۔ جواہر لال یونیورسٹی نئی دہلی
امر ناتھ۔ ڈائریکٹر اسٹار پبلی کیشن۔ آصف علی روڈ نئی دہلی
احمد سعید ملیح آبادی۔ ایڈیٹر روزنامہ آزاد ہند کلکتہ
اختر الواسع شعبۂ اسلامک و عرب ایرانین اسٹڈیز جامعہ ملیہ
اسلامیہ نئی دہلی۔
اطہر پرویز۔ سہ ماہی الفاظ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علیگڑھ
ابن فرید 〃
اسد یار خاں 〃
انیس اعظمی انجمن ترقی اردو ہند اردو گھر راؤز ایونیو نئی دہلی
اکمل اجملی ۱۹۹ دائرہ شاہ اجمل الہ آباد
اطہر عزیز۔ روزنامہ قومی آواز بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی
اندر جیت لال ڈی ۱۴ گل مہر پارک نئی دہلی ۱۱۰۰۴۹
آشفتہ چنگیزی۔ پی۔ب ۷۵۵۱ الریاض سعودی عرب
ارشد حسین گورو گوبند سنگھ ڈپارٹمنٹ آف ریلیجس اسٹڈیز
پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ۔
امام مرتضیٰ نقوی۔ محلہ گزری امروہہ ۲۴۴۲۲۱

اظہار اثر دالی ۵ ڈی ڈی اے کالونی نیو رنجیت نگر نئی دہلی
احمد یوسف بکرشیل امپوریم۔ صدر گلی پٹنہ ۸
اعجاز علی ارشد۔ شعبہ اردو بی این کالج پٹنہ ۴
آذر بارہ بنکوی۔ محلہ کٹڑہ امام باڑہ بارہ بنکی
انور سجاد۔ لاہور، پاکستان۔
انور عظیم ۔ یو این ایس آر انفارمیشن سنٹر بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی
اوپیندر ناتھ اشک ۵ خسرو باغ روڈ الہ آباد
نور قاں ۷۴ ہیمن خاں اسٹریٹ دوسری منزل کمرہ نمبر ۳۴ بمبئی ۸
ابو الفیض سحر ۱۱۲/۲ جنگپورہ بی متھرا روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴
امیر اللہ شاہین ۶۸ سوامی پاڑہ میرٹھ
آزاد گلاٹی شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج نابھہ
ابو ذر عثمانی شعبہ اردو رانچی یونیورسٹی رانچی
احمد سجاد۔ شعبہ اردو۔ رانچی یونیورسٹی۔ رانچی
اسلم آزاد۔ شعبۂ اردو۔ پٹنہ یونیورسٹی۔ پٹنہ
امیر قزلباش ۱۱۰ اے نظام الدین ایسٹ نئی دہلی
احتشام اختر شعبہ اردو۔ پوسٹ گریجویٹ کالج کوٹہ
بلراج کومل سی ۱۰۳ کالکاجی نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹
بشیر نواز۔ محلہ گھاٹی اورنگ آباد (مہاراشٹر)
بشیر بدر۔ سی ۵۶ نیچ گزھی۔ میرٹھ
بشیشر پردیپ ۔ ۸ گلستان کالونی۔ لکھنؤ
بلراج مینرا ۹۲۲ کوچہ روح اللہ خاں دریا گنج نئی دہلی
بمل کرشن اشک۔ شعبہ انگریزی۔ ایم ڈی یونیورسٹی رہتک
تنویر احمد علوی صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی
تنہا تماپوری۔ درنگم پیٹ ۵۸۵۲۲۰ (گلبرگہ) کرناٹک
پرکاش فکری۔ پیلس رُلی ڈورانڈہ رانچی ۸۳۴۰۰۲
پروانہ ردولوی۔ روزنامہ پرتاپ بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی
پرواز اصلاحی، احمد سیلر ہائی اسکول ٹھکر روڈ بمبئی
جیلانی بانو۔ ۱۰۸ اے معظم پورہ۔ حیدرآباد
جوگندر پال اے ۵۸۷ کرشیٹر کیلاش ۱۱ نئی دہلی ۴۸
جگن ناتھ آزاد شعبہ اردو جموں یونیورسٹی جموں کشمیر
جاوید حبیب ایڈیٹر ہجوم دہلی ۳۳ ذاکر نگر جامع نگر نئی دہلی ۲۵

جلال الدین اسلم قومی آواز بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی
عزت الاکرام۔ رام باغ۔ مرزا پور (یوپی)
حامدی کشمیری۔ ۲۹۶ جواہر نگر سری نگر (یوپی)
حمید سہروردی۔ شعبہ اردو۔ لوگن کالج سیپیڈ سہارا نگر
حسن نعیم ڈی ۵۸ سادھنا کیلشیئم پارٹ ۱ نئی دہلی ۴۹
حبیب کیفی عائشہ منزل کوارٹر نمبر ۳ عقب جہاں پناہ
جودھپور (راجستھان)
حنیف کیفی۔ شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی
حمیدہ سلطان۔ جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (دہلی
برانچ) علمی منزل کوچہ پنڈت دہلی ۶
حیات اللہ انصاری ۲/۲۸ بی ریور بینک کالونی لکھنؤ
حمید الماس کمرہ نمبر ۱۲۵۵/۳ دوسری منزل قران
باک جیا نگر۔ بنگلور ۵۶۰۰۱۱
حیات لکھنوی۔ ۱۱ امیہ ہال پنچ کوئیاں روڈ نئی دہلی
حکیم منظور۔ برک کا پنج نمبر ۱۱ کوچہ سمندر خاں جموں
توی (کشمیر)
حامد حسین۔ ای ۲/۸۴ پروفیسرز کالونی بھوپال ۳
خواجہ احمد عباس فلومینا لاج چرچ روڈ جوہو بمبئی ۵۴
خواجہ احمد فاروقی۔ ۸۰ کیولری لائن دہلی ۱۱۰۰۰۷
خلیق انجم جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر
راؤز ایونیو نئی دہلی۔
خورشید الاسلام۔ بدر باغ۔ علی گڑھ
خواجہ ذکی احمد۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس گلی عزیز الدین
وکیل لال کنواں دہلی
خورشید جہاں اشرف شعبہ اردو بی ڈی ایس کالج نہرو
باغ۔ ۸۲۵۳۰۱
خواجہ عبد الغفور ۱۲ بیتا دیشا اپارٹمنٹ جنرل جگناتھ
بھوسلے مارگ بمبئی ۱
خزاں جیند لیم۔ بی ۶۵ ڈی ڈی اے کالونی (رہائشی)
نارائنا دہلی ۶۸
خلش دہلوی ۵-۱ منجو محل ۴۱ پالی ہل روڈ باندرہ بمبئی ۵۰

دلیپ سنگھ ناسر بی ۵۳/۳ جنگ پوری نئی دہلی ۱۱۰۰۵۸
رام لال ۳۹ آر ملٹی اسٹوری چار باغ لکھنؤ
رشید حسن خاں الف ۷ ماڈل ٹاؤن دہلی ۱۱۰۰۰۹
رشید الدین مددگار مترجم (اردو) نظامت ترجمہ حمایت
نگر حیدرآباد ۲۹
رشی پٹیالوی ۱۵/۲۱۵۰ چنڈی گڑھ (پنجاب)
راہی قریشی شعبہ اردو۔ ایس بی کالج گلبرگہ (کرناٹک)
رتن سنگھ فلیٹ نمبر ۶ ایس چندر نگر مارکیٹ لکھنؤ
رمضان احمد چیف ایڈیٹر عظیم آباد ایکسپریس (باقر گنج پٹنہ)
راج نرائن راز ۲۹ پٹیل نگر (ایسٹ) نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸
رونق دکنی ای بی۔ ۴۱ کلاس روڈ ایگریکو جمشید پور
رفعت سروش اے ۴/۱۲ پنڈارا روڈ نئی دہلی
رضا نقوی واہی ۱۷/۵ گردنی باغ پٹنہ
رام کرشن مضطر ۷/۸ پنت نگر جنگپورہ ایکسٹنشن نئی دہلی ۱۴
رفعت نواز۔ محلہ گھاٹ۔ اورنگ آباد (ایم ایس)
رام پرکاش راہی بی ۵۸ پنڈارا روڈ نئی دہلی
رشید افروز بینک آف بڑودہ میرٹھ کینٹ
رحمٰن راہی شعبہ کشمیری کشمیر یونیورسٹی سری نگر (جاپانیڈک)
رضی الدین صدیقی۔ طاہر پورہ۔ سدھ پور (گجرات)
زاہدہ زیدی ۲۲۔ ذاکر باغ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
زبیر رضوی اسسٹنٹ ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو رام پور
سردار جعفری میٹا محل فلیٹ نمبر ۱۰ دوسرا فلور لکھمن جی سیٹ
روڈ بمبئی ۲۶
ساجدہ زیدی۔ گل برگ دودھ پور سول لائن علی گڑھ
سلیمان اطہر جاوید۔ شعبہ اردو ایس وی یونیورسٹی تروپتی (اے پی)
سید ظہیر الدین دسنوی انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن
اینڈ ریسرچ ہمدرد نگر تغلق آباد نئی دہلی
ساغر نظامی ۲۵۹ / ۱۱ سی پنڈارا روڈ عقب ایلڈ لین
نئی دہلی ۱
سری نواس لاہوٹی۔ سکریٹری انجمن ترقی اردو حیدرآباد
سکندر علی وجد بن ہکی روڈ اورنگ آباد ۴۳۱۰۰۱

ساحر ہوشیار پوری ۸۸۲ نیا محلہ پل بنگش دہلی ۶
سلطان اختر ہوم (جیل) ڈیپارٹمنٹ سلولر سکریٹریٹ
سید فضل المتین شرقی دروازہ درگاہ شریف اجمیر
سلام بن رزاق ۸/۴۸ بی قریش نگر کرلا بمبئی ۷۰
سریندر پرکاش ۳/۱۳ ایم ای ایس کالونی بمبئی ۸۸
ایس اے رحمٰن II الف ۲۱۸ گلی تال والی پہاڑ گنج
شاہ ابو الخیر مارگ دہلی ۶
شمس الرحمٰن فاروقی ۸/۵ ڈی II کاکا نگر نئی دہلی
شمیم حنفی شعبہ اردو۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی
شارب ردولوی ڈی ۸/۵ ماڈل ٹاؤن دہلی ۹
شہاب جعفری شعبہ اردو خالصہ کالج دہلی
شفیق فاطمہ شعری ممتاز کالج ملک پیٹ حیدرآباد
شاذ تمکنت ۳-۷ اعظم پورہ حیدرآباد (اے پی)
شفیقہ فرحت ۳/۱۸۳ دریاد ہار بھوپال
شمیم نکہت ڈی ۸/۵ ماڈل ٹاؤن دہلی ۹
شارق۔ قومی آواز۔ بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی
شمیم فاروقی پروگرام ایگزیکیوٹو آل انڈیا ریڈیو پٹنہ
شاہد ماہلی۔ سی ۲/۷ صفدر جنگ ڈیولپمنٹ ایریا
حوض خاص نئی دہلی۔
ش ک نظام کلاز اسٹریٹ جودھپور (راجستھان)
شہریار فیصل ولا سر سید نگر علی گڑھ
شکیل الرحمٰن ۱۵ جواہر نگر سری نگر (کشمیر)
شفق۔ کبیر گنج سہسرام (بہار)
شوکت حیات۔ ڈاکٹر مہابیر لوچنگ مہندرو گھاٹ پٹنہ
شہباز حسین۔ ترقی اردو بورڈ آر کے پورم نئی دہلی
صغیر احمد صوفی ۹/۱۱۷ تھامسن روڈ۔ ریلوے کالونی نئی دہلی
صلاح الدین پرویز پی ب ۱۵۵۱ الریانی سعودی عرب
صغریٰ مہدی۔ شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی
ضیا فتح آبادی ۳۱۸ بی راجوری گارڈن دہلی ۲۷
ضمیر حسین۔ شعبہ اردو فارسی ذاکر حسین کالج اجمیری گیٹ
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۶

ظہیر غوری بدیقی شعبۂ اردو فارسی جین کالج آرہ بہار
ظ انصاری ۳۴ شیرین ۱۳ کولابہ روڈ بمبئی ۵ ۔۔۔۴
ظہیر فاضل لاچپی معرفت ریلوے آؤٹ ایجنسی نبرادہ یا گنج
ظہیر احمد صدیقی شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی
جمیل صدیقی معرفت بک امپوریم پٹنہ
ظفر بنگالوی ۲۵ اے شمس الہدیٰ روڈ کلکتہ ۱۷
ظفر پیامی لے ۱۹ گل مہر پارک نئی دہلی
ظفر ادیب مکتبہ قصر اردو۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی
ظفر سہیلی ——————
ظفر غوری ۲۴۴ سرائے کا استھان کوٹہ (راجستھان)
عزیز قیسی فلیٹ ۵ مون کرافٹ اپارٹمنٹس آف
کارٹر روڈ بمبئی ۵۰
عصمت چغتائی۔ ایکلوٹ پہلا منزلے روڈ چرچ
گیٹ دہلی ۱۔۔۔۴
علقمہ شبلی ۵/۹ وین اسٹریٹ پہلی منزل کلکتہ ۱۶۔۔۔
عبدالقوی دسنوی شعبۂ اردو۔ سیفیہ کالج بھوپال
عبدالمغنی۔ دارقی گنج۔ عالم گنج پٹنہ
عابد رضا بیدار۔ ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ
علی حماد عباسی شعبۂ اردو شبلی کالج اعظم گڑھ
عفت موہانی ۵۶۵-۱-۱۴ سیتارام پیٹھ حیدرآباد ۲
عطیہ پروین منیجر ایجنڈ ڈیولپمنٹ بنک لال گنج رائے بریلی
عبدالحق شعبۂ اردو۔ دہلی یونیورسٹی دہلی
عتیق حنفی۔ اسٹیشن ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ
عابد سہیل کیسر مارکیٹ لکھنؤ
علی باقر ۱۹ دکشن پورم جواہر لال یونیورسٹی نئی دہلی
علی جواد زیدی۔ صدر یوپی اردو اکادمی آر کے ٹنڈن
روڈ قیصر باغ لکھنؤ
عادل منصوری ۲ منصوری سوسائٹی عقب ٹول ناکہ
سرکھیج روڈ احمد آباد ۵۱ ۔۔۔۳۸
عوض سعید ۶ ۵۹ مالے پلی حیدرآباد ۱
عبداللہ کمال معرفت مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ محمد علی روڈ

عبدالرحیم نشتر کامٹی، ناگپور
عبیدالرحمٰن ہاشمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
عبدالصمد تپش لکھنٹیا۔ تیلکو سرائے
امانت صدیقی فلیٹ نمبر ۶ احاطہ ناظر قمر امین جاوید لکھنؤ
عظیم اقبال گنج۔ ابتیا مغربی چمپارن بہار
عنوان چشتی شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی
غیاث احمد گدی۔ منیجر لین جھریا (بہار)
غلام ربانی تاباں ذاکر نگر (جامعہ نگر) نئی دہلی
غیاث اقبال شعبۂ اردو پریسیڈنسی کالج مدراس
غلام نبی خیال۔ ریذیڈنسی روڈ، سری نگر
فضل امام۔ شعبۂ اردو، راجستھان یونیورسٹی جے پور
فضیل جعفری بی ۲۳/۳ چوتھا منزل گرو نگر جے پی روڈ
اندھیری بمبئی ۵۸
فیاض رفعت پروگرام ایگزیکٹو آل انڈیا ریڈیو کیتھو میر نگر
فضا ابن فیضی مئوناتھ بھنجن (یوپی) ۲۷۵۱۰۱
فیروز عابد۔ بیت القاسم ۲/۱۳-۱۱ ٹیپار گیان لین کلکتہ
فرحت احساس۔ ہجوم دیکھی ۳۳ اے ذاکر نگر جامعہ نئی دہلی
فرحت قمر بنگلہ ہاؤس تیسری گلی جامعہ نگر نئی دہلی
فضل تابش، سکریٹری ایم پی اردو اکیڈمی پروفیسر کالونی
بھوپال
فرحت قادری معروف گنج گیا
فکر تونسوی ڈی۔ ۵ گل مہر پارک نئی دہلی ۴۹ ۔۔۔۱۱
فوق کریمی۔ کوچہ عبدالکریم علی گڑھ
قرۃ العین حیدر ۵ ہزاری باغ نیتھ روڈ جوہو ولے پارلے
اسکیم بمبئی ۴۹ ۔۔۔۴
قاضی سلیم (ممبر لوک سبھا) ۸۷ ساؤتھ ایونیو نئی دہلی ۱۱۔۔۱
قاضی عبدالستار۔ آنند بھون سول لائنس علی گڑھ
قمر رئیس سی ۱۶۶ دویک وہار دہلی ۳۲
قمر جہاں شعبۂ اردو سندرو تی مہیلا کالج بھاگلپور
قیصر قلندر بی ۱۰۶ کرزن روڈ اپارٹمنٹ نئی دہلی ۱۱۔۔۔۱
قاضی عبدالودود۔ ادارۂ تحقیقات اردو سلطان گنج پٹنہ ۴

قیصر سرمست ثریا منیس، یاقوت پورہ حیدرآباد ۲
قمر اقبال روشن گیٹ کریم کالونی اورنگ آباد مہاراشٹر
قمر احسن ائمہ پنڈ کمیشن ۵ ویں منزل لوک نائک بھون
خان مارکیٹ نئی دہلی۔
کلیم الدین احمد۔ نائب صدر بہار اردو اکیڈمی سری
کرشن پوری پٹنہ ۴
کرشن موہن بی ۲۴ ۱۲ پنڈارا روڈ نئی دہلی
کرامت علی کرامت۔ رحمت علی بلڈنگ دیوان بازار کٹک
کمار پاشی ۱۷/۳۳ دہلی گیٹ نئی دہلی
کوثر چاندپوری ہمدرد ریسرچ کلینک اینڈ نرسنگ
ہوم آصف علی روڈ نئی دہلی
کشمیری لال ذاکر ۱۳۶ سیکٹر ۱۹ اے چنڈی گڑھ صوبہ پنجاب
کمال احمد صدیقی چیف پروڈیوسر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی
کاوش بدری، الگپا چیٹیا کالج آف ٹیکنالوجی گنڈی مدراس
کنور مہندر سنگھ بیدی ۷۵ ویسٹ گریٹر کیلاش نئی دہلی
کامل قریشی شعبۂ اردو کے ایم کالج یونیورسٹی کیمپس دہلی
کے کے کھلر ۲/۶ بی راجوری گارڈن نئی دہلی ۲۷ ۔۔۔۱۱
کنور سین اے ۴۷، ویسٹ پٹیل نگر ۸ ۔۔۔۱۱
کرشن کمار طور۔ ایریا منیجر ہماچل پردیش ٹورازم
کارپوریشن دھرم شالہ (ہماچل پردیش)
کیف احمد صدیقی ۹۰ شیخ احمد سیتاپور ۲۶۱۰۰۱
کلام حیدری چیف ایڈیٹر آہنگ جگمون روڈ گیا
کیفی اعظمی جانکی کٹیر بمبئی
کلیم عاجز شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ
کمال جعفری فلیٹ نمبر ۹/۴ آل انڈیا ریڈیو ہاسٹل
کرزن روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
کاظم علی خاں ۲۰۱ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳
گوپی چند نارنگ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی
گوپی ناتھ امن ۴۷۷ دریا گنج عقب ہنڈیا پارک دہلی ۶
گلزار دہلوی۔ ایچ ایس ۲۵ کیلاش کالونی نئی دہلی ۴۸
گیان چند جین شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

کمپیل متل معرفت ... پلیٹ ہاؤس کو اکرٹ ... پاکیزہ
محمد حسن ذہنی ماڈل ٹاؤن دہلی ۱۱۰۰۰۹
ملک ... ڈیفنس کالونی نئی دہلی ۱۱۰۰۲۴
محمد الفضل اللہ ۸۵ ... سر سید نگر علیگڑھ
محمود سعیدی ... ترکمان گیٹ دہلی
مہدی پرتاپ گڑھی معرفت اکبر ... پرتاپ گڑھ
مجتبیٰ حسین بی ۹ ... مالویہ نگر نئی دہلی ۱۷
مناظر عاشق ہرگانوی موضع ہرگانواں ڈاکخانہ
ریکبیہ ضلع مونگیر
محسن ... سکٹر ... رکے پورم نئی دہلی
مظہر امام ۔ پرتاپ پارک فلیٹ ریسی ڈینسی روڈ
سری نگر ۱۹۰۰۰۱
مظفر حنفی ... جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
مصحف اقبال توصیفی ۱۲-۲-۸۳۱۰ ... حیدرآباد
ممتاز راشد بلاک نمبر ... مریم بائی
ٹرسٹ بلڈنگ درگاہ اسٹریٹ ماہم بمبئی
محمد تسنیم گورنمنٹ ... کالج قلعہ میدان ... (بہار)
محمد زماں آزردہ شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی سری نگر
محمد یوسف ٹینگ سکریٹری کشمیر اکیڈمی آف آرٹس کلچر
اینڈ لنگویجز سری نگر
موہن چراغی اسسٹنٹ ایڈیٹر قومی آواز بہادر شاہ ظفر
مارگ نئی دہلی
محمد ... جوائنٹ ایڈیٹر قومی آواز ...
... لکھنؤ
معین احسن جذبی، ذاکر باغ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
مسعود مرزا ... علی گڑھ ...
محمد علوی ... احمد آباد
موہن ... شاہدرہ دہلی
م ک مہتاب ... پوری نئی دہلی ۱۱۰۰۹۳
متی موہن ... مارکیٹ ... کالونی
نئی دہلی ۱۱۰۰۴۹

مغنی تبسم ۳-۴-۲۰۲ ... بازار نورالامرا حیدرآباد ۲۴
مصور سبزواری ... ڈاکخانہ ... گوڑگاؤں ہریانہ
منظر اعظمی شعبہ اردو جموں یونیورسٹی جموں
مرزا ... خاں معرفت ... گیا
مشتاق علی شاہد معرفت ...
نسیم انہونوی نسیم بکڈپو ... لاٹوش روڈ لکھنؤ
... پرتاپ گڑھی ... پرتاپ گڑھ ... یوپی
... ۳۱۱۰۰۲
...
... فیروزپور
... بجنور یوپی
... ٹیگور ...
... یونیورسٹی روڈ لکھنؤ
... رکیم آباد
... ادارہ انوار ... دیوبند
... نئی دہلی
... بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی
... یونیورسٹی ...
... ۵۰۰۰۰ ...
... یونیورسٹی ... کالج ...
... کوٹھی ... کالونی ...
... ایوان اردو ... حیدرآباد ۵۰۰۰۴۸
... رسول آباد احمد آباد
وارث علوی ... زیوئیر کالج احمد آباد
... یونیورسٹی علی گڑھ
... مارکیٹ لکھنؤ
... پوری نئی دہلی ۱۱۰۰۰
... بازار رانچی
... پلاٹ نمبر ۱۲ بانڈرہ ... گلشن بمبئی
یوسف سرمست ۳ ... حیدرآباد
یعقوب قریشی ... حیدرآباد ۵۰۰۰۴۸

پاکستانی اشاعتی ادارے

آئینہ بک ڈپو۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور
آئینۂ ادب۔ زیر مسلم مسجد۔ انار کلی لاہور
احباب اعظم۔ لاہور
احسان اکیڈمی۔ لاہور
ادارۂ ادب نو۔ لاہور
ادارۂ ادبیات ... مسلم مسجد ... لاہور
ادارۂ پنجاب ... لاہور
ادارۂ فروغ اردو ایبک روڈ لاہور
ادارۂ فکر و ادب۔ لاہور
ادارۂ مصنفین پاکستان ... روڈ لاہور
ادارۂ مطبوعات۔ لاہور
ادارۂ نو۔ زیر مسلم مسجد۔ لاہور
ادبی دنیا قائد اعظم روڈ لاہور
ادبی لائبریری۔ لاہور
اردو بکسٹال قائد اعظم روڈ لاہور
اردو مرکز۔ سرکلر روڈ۔ لاہور
اسلامی اکیڈمی۔ لاہور
اشاعت منزل۔ بن روڈ۔ لاہور
اکادمی پنجاب۔ کوپر روڈ۔ لاہور
الایمان۔ زیر مسلم مسجد۔ لاہور
التحریر۔ کبیر اسٹریٹ اردو بازار۔ لاہور
الجامعہ۔ نزد نعمت کدہ ہوٹل سرکلر روڈ۔ لاہور
الحمرا اکیڈمی۔ ہوونگ روڈ نیلا گنبد انار کلی لاہور
المثال۔ نپیر روڈ۔ لاہور
انار کلی کتاب گھر لاہور

اردو کی اولین کتابیں

- اردو ادب کی سب سے پہلی داستان میرامن کی "باغ و بہار" ہے۔
- اردو کی سب سے پہلی تمثیلی (رمزیہ) کتاب ملا وجہی کی "سب رس" ہے۔
- اردو کا پہلا شہادت نامہ فضل علی فضلی کا "کربل کتھا" ہے۔
- اردو کی سب سے پہلی رزمیہ شاعری کی کتاب محمد نصرت علی نصرتی کی "علی نامہ" ہے۔
- اردو کا سب سے پہلا تذکرہ میر تقی میر کی کتاب "نکات الشعرا" ہے۔
- اردو کی سب سے پہلی نثری کتاب خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی "معراج العاشقین" ہے۔
- اردو کا سب سے پہلا ناول ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب "مراۃ العروس" ہے۔
- اردو کا سب سے پہلا خطوط کا مجموعہ مرزا اسداللہ غالب کا "اردوئے معلیٰ" ہے۔
- اردو کا سب سے پہلا ڈراما امانت کا "اندر سبھا" ہے۔
- اردو کی سب سے ضخیم کتاب "طلسم ہوشربا" ہے۔
- اردو کا سب سے پہلا سفرنامہ محمد یوسف کمبل پوش کا "عجائبات فرنگ" ہے۔
- اردو کی سب سے پہلی آپ بیتی محمد جعفر تھانیسری کی "کالا پانی" ہے۔
- اردو کی سب سے پہلی خود نوشت سوانح ظہیر دہلوی کی "داستان غدر" ہے۔
- اردو کی سب سے پہلی تنقیدی کتاب خواجہ الطاف حسین حالی کی "مقدمہ شعر و شاعری" ہے۔
- اردو کی سب سے پہلی یادداشت رشید احمد صدیقی کی "آشفتہ بیانی میری" ہے۔
- اردو کی سب سے پہلی تقابلی تنقید کی کتاب شبلی نعمانی کی "موازنۂ انیس و دبیر" ہے۔
- اردو کی سب سے پہلی سوانح خواجہ الطاف حسین حالی کی "یادگار غالب" ہے۔
- اردو کی سب سے پہلی جلائی جانے والی کتاب ڈپٹی نذیر احمد کی "امہات الامہ" ہے۔

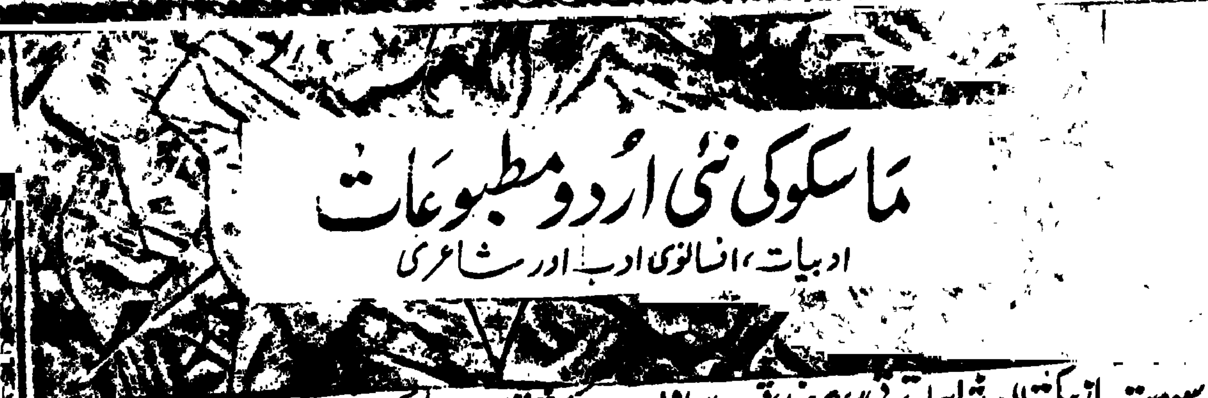
مرتب: مجید بیدار

بقیہ "میں کتاب ہوں"

مگر تم سے روز ملونگی مجھے تم سے ہمدردی ہے، تم سے محبت ہے، تم سے پیار ہے، میری اس ہمدردی کو کوئی نہیں ختم کر سکتا، میری محبت کو کوئی نہیں بدل سکتا، میرے پیار کو کوئی نہیں چھین سکتا۔

ہمدردی اہم شئے ہے
محبت لافانی جذبہ ہے

پیار امر ہے۔
ہمیشہ رہا ہے، ہمیشہ رہے گا، اچھا شب بخیر۔



ماسکو کی نئی اردو [redacted] عات

ادبیات، افسانوی ادب اور شاعری

ایڈیٹ ۔ ایف دوستووسکی ۔ قیمت ۱۸/- روپے

اس کتاب میں درد سے بھرپور تصورات اور ان اخلاقی مسائل کی نوعیت و اہمیت نے جو اس میں بیان کیے گئے ہیں مصنف کو ہمارے ادب کی ایک انوکھی شخصیت بنا دیا ہے جس کے خیالات کا دائرہ حال تک محدود نہیں بلکہ مستقبل بھی اس کی سمت آیا ہے۔ یہ بات دوستووسکی کے ہمعصر روسی طنز نگار میخائیل سالتیکوف شیدرین نے کہی تھی جنھوں نے پہلی بار اس ناول کو وہ اہمیت دی جس کا یہ مستحق تھا۔

آفتاب نو ۔ اے ۔ ابوبکر قیمت ۲/۵۵ روپے

ممتاز سوویت داستانی ادیب احمد خاں ابوبکر کا یہ ناول جیر کی نام کے ایک گاؤں کے بارے میں ہے جہاں پن بجلی گھر کی تعمیر کے ساتھ دنیا ہی بدل گئی۔ کہانی کا پلاٹ خوبصورت دوشیزہ سلطنت اس کے محبوب مراد اور مراد کے والد آشور علی کے گرد گھومتا ہے جو گاؤں کے ایک محترم بزرگ ہیں نئے حالات میں ان سب کی زندگیاں بدل گئی ہیں۔

پانی کا قطرہ ۔ سونے کا ذرہ ۔ قیمت ۳/۵۰ روپے

ترکمانیہ کے چار ادیبوں کی کہانیوں کے اس مجموعے میں پانی موضوع سخن ہے۔ ریگستان قراقم میں صدیوں تک پانی اور سونا ہم پلہ سمجھا جاتا رہا اور اب یہ خواب حقیقت میں بدل گیا ہے سوویت اقتدار کی بدولت جس نے وسط ایشیا کی زندگی بدل دی۔

مہ و سال آشنائی ۔ فیض احمد فیض ۔ قیمت ۵/- روپے

شہرۂ آفاق اردو شاعر فیض احمد فیض کے مضامین اور بعض نظموں کا مجموعہ۔

دوسرا سفر ۔ تیمور پولاتوف ۔ قیمت ۶/۲۵ روپے

ازبکستان کے اس ہونہار نوجوان ادیب نے اپنی ان کہانیوں کو رومانی داستانیں کہا ہے کیونکہ ان میں بلا کی ڈرامائیت ہے اور یہ کہانیاں عجیب و غریب کرداروں کے آپسی ربط اور انتہائی داستانیں سناتی ہیں۔

جرنیلوں کی کہانیاں ۔ دمیتری مامن ۔ سبریاک قیمت ۴/۲۵

دمیتری مامن ۔ سبریاک سائبیریا کی لوک کہانیوں سے اچھی طرح واقف ہیں ان کہانیوں کی بنیاد پر انھوں نے بچوں کے لیے دلچسپ داستانیں ترتیب دی ہیں جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔

خیالات اور دل ۔ این ۔ اموسوف ۔ قیمت ۵/- روپے

ایک عظیم سوویت سرجن، سائنسداں اور محقق نکولائی اموسوف اس کتاب میں ایک اچھے ادیب کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں انھوں نے دل کے آپریشنوں اور لاتعداد کرداروں کی نہایت سنائی ہے کہانی اس لیے اور دلکش ہے کہ ان واقعات میں خود کہانی نگار شریک رہا ہے۔

شعر و شاعری ۔ الیکساندر پوشکن ۔ قیمت ۵/۴۰ روپے

شہرۂ آفاق روسی شاعر پوشکن کی منتخب نظمیں دو جلدوں میں شائع کی گئی ہیں جن سے اس عظیم شاعر کے مرتبے اور عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

[redacted] دنیا کا معاشی اور سیاسی جغرافیہ

اے ۔ اسپدچنکو قیمت ۵/۵۰ روپے

اس کتاب میں عام قارئین کے لیے پوری دنیا کی معاشی اور سیاسی تصویر پیش کردی گئی ہے کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں عمومی طور پر دنیا کا احاطہ کیا گیا ہے اور دوسرا حصہ بعض بڑے ملکوں اور خطوں سے متعلق ہے۔

سوویت یونین کی مختصر تاریخ ۔ اے الیکسیف اور دوسرے ۔ قیمت ۴/- روپے

سوویت یونین کی اس مختصر تاریخ میں اس دور سے جب قدیم روس، قفقاز اور وسط ایشیا میں لوگوں نے بسنا شروع کیا لیکر آج تک کے دور کا احاطہ ہے روسی سلطنت ریاست کا قیام روس میں سرمایہ کاری کی نشوونما اور پرولتاریہ کی ان انقلابی تحریکوں کے آغاز کی داستان کے ساتھ ساتھ جن کے نتیجہ میں اکتوبر کا عظیم سوشلسٹ انقلاب کامیاب ہوا ان کارناموں کا ذکر بھی شامل ہے جو دنیا میں مزدوروں اور کسانوں کی اولین ریاست نے پچھلے ۶۰ برسوں کے دوران سوشلزم اور کمیونزم کی تعمیر کے سلسلے میں حاصل کی ہیں۔

QAUMI AWAZ

NEW DELHI

(PREMIER URDU DAILY) REGD No. D-(C)944

URDU BOOKSELLERS & PUBLISHERS NUMBER Rs.

...ted and Published by YASHPAL KAPOOR for and on behalf of Associated Journals Limited at the QAUMI AWAZ PRESS, Herald House, Bahadur Sh... M... New ... 110002